سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
بازیگر
دوسرا حصہ
PDFBOOKSFREE.PK

ہماری آمد کی کسی کو خبر نہیں تھی۔ ہم وہاں اچانک پہنچے تو اڈے میں کھلبلی مچ گئی۔ شولی نے مجھے کندھوں پر اٹھا لیا۔ نصیب میاں نے میری بلائیں لے لیں۔ "اے واہ میاں! سبحان اللہ! ایسی بھی کیا ستم گری، نہ نامہ نہ پیام، نہ سلام، نہ کلام۔ قسم جنتی بیگم کی، استاد نواب کو کسی پہلو چین نہیں تھا۔ آہیں بھرتے تھے۔" نصیب میاں نے میرے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

اڈا اجڑا اجڑا معلوم ہوا لیکن تھوڑی ہی دیر میں آدمیوں سے بھر گیا۔ ہر شخص مجھ سے گلے مل رہا تھا اور میری عدم موجودی میں جھجل کی کیفیت بیان کر رہا تھا۔ کانتے نے بمبئی میں مجھے سچ بتایا تھا۔ جلد ہی مجھے خود بھی اندازہ ہو گیا کہ اڈے کا وہ حال نہیں ہے جو پہلے تھا۔ کئی آدمی پیسہ دینا بند کر چکے تھے۔ سونا گاچھی کے علاقے پر استاد نبو خاں نے پوری طرح قبضہ جما لیا تھا۔ اُدھر گھوشی پہلے ہی موجدار کے اڈے پر قابض تھا۔ دور دراز کے چھوٹے موٹے اڈے بھی پیسہ دیتے ہوئے آنا کانی کرنے لگے تھے اور کہتے تھے کہ جب استاد جھجل اس طرف کی خبر ہی نہیں لیتا تو وہ کیوں اُسے علاقے کی آمدنی میں شریک کریں۔ جھجل کے سامنے شکایتوں کا دفتر کھل گیا۔ اُسے بتایا گیا کہ علاقوں میں گشت کرنے والے آدمی بھی حساب میں صاف نہیں رہے۔ پیسہ درمیان ہی میں اُڑا جاتے ہیں۔ جھجل کے بمبئی جانے کے بعد حالات اور خراب ہو گئے تھے۔ گھوشی کی غداری کا ذکر سب کے ہونٹوں پر تھا۔ جھجل کے اڈے کے کئی پرانے آدمی گھوشی سے مل گئے تھے۔

دوسرے دن شہر میں دُور دُور تک یہ خبر پھیل گئی کہ جھجل لاڈلے کے ساتھ واپس آ چکا ہے۔ شام کو استاد نبو خاں تمام رقم لے کے خود حاضر ہو گیا۔ اُس نے جھجل سے معذرت طلب کی اور رقم کی ادائی میں تاخیر کے مختلف عذر تراشے۔ جھجل نے کچھ نہیں کہا۔ رقم نصیب میاں کو دے دی گئی۔ رات تک لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ دو ہی دنوں میں رُکی ہوئی اچھی خاصی بڑی رقم جمع ہو گئی اور اڈے کی پرانی رونق رفتہ رفتہ بحال ہونے لگی۔ کانتے بمبئی سے آنے کے بعد اب تک الگ تھلگ رہا تھا۔ وہ بھی کچھ سرگرم ہو گیا۔ اُس نے جھجل سے ایک ہزار روپے کے جولین کے نام بمبئی روانہ کر دیے اور منی آرڈر میں سختی کے ساتھ یہ تاکید کر دی کہ یہ روپے صرف جولین خرچ کرے گی۔ وہ جولین کے سلوائے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ کپڑے میلے ہو گئے تھے لیکن کانتے انھیں اتارتا نہیں تھا۔ جامو فیض آباد جانے پر مصر تھا۔ جھجل نے اُسے نہیں جانے دیا۔ اڈے کے دوسرے لوگ اُس کی خاطر تواضع میں مصروف تھے۔ نبو خاں اُسے اپنے ساتھ سونا گاچھی لے گیا تھا۔ شولی، سانٹے، لیلا لالہ وغیرہ سب میرے گرد جمع رہتے تھے۔ نصیب میاں اِدھر سے اُدھر تھرک رہے تھے۔ جب بھی کوئی شخص پیسے لے کے آتا، وہ چلاتے "استاد برکت ہی برکت ہے۔ ساری برکت چشم بد دُور لاڈلے میاں کی ہے۔ استاد نواب! ذرا ایک بکرا تو منگوا لو۔"

دو دن تک یہی ہنگامہ رہا۔ جھجل زیادہ تر لوگوں کی باتیں سنتا اور اُن سے ملتا رہا۔ وہ خود عموماً خاموش ہی رہتا۔ تیسرے دن صبح ہی صبح جھجل

میرے ساتھ اُس مدرسے میں گیا جہاں مولوی محمد شفیق سے مجھے اور کورا کو لے گئے تھے۔ صدر مدرس بجھل سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئے اور مولوی محمد شفیق کا سامان دکھانے پر آمادہ ہو گئے۔ وہ سامان ایک الماری میں ابھی تک بند تھا۔ وہاں کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوئی۔ مولوی شفیق کے سامان سے ایک کاپی نکلی۔ کاپی میں تعویذ لکھے ہوئے تھے اور کلکتے کی مختلف دکانوں کے پتے بھی درج تھے۔ بجھل نے صدر مدرس سے وہ کاپی عاریتہً طلب کی۔ انھوں نے بڑی حیل وحجت کے بعد اُسے کاپی دے دی۔ میں کورا کے سارے کپڑے لے جانا چاہتا تھا مگر مدرس نے کاپی ہی بڑی مشکل سے دی تھی۔ وہ کپڑے اصل میں فہمیدہ کے تھے مگر کورا نے بھی انھیں پہنا تھا۔ اُن میں کورا کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ میں نے سوچ لیا کہ کسی دن رات کو یہاں آ کے انھیں چوری کر لوں گا۔ تالا بہت معمولی تھا۔ ایک جھٹکے میں کھل سکتا تھا اور مدرسے میں کوئی خاص پہرا بھی نہیں رہتا تھا۔ دوپہر تک بجھل مولوی صاحب کی کاپی کے پتوں پہ جا جا کے اُن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر کسی کو بھی مولوی صاحب کا پتہ معلوم نہیں تھا۔ سب یہی کہتے تھے کہ انھوں نے ایک عرصے سے اُن کی شکل نہیں دیکھی ہے، نہ اُن کے متعلق کچھ معلومات رکھتے ہیں۔

اُس دن رات کو بجھل نے خلافِ توقع اپنے تمام اڈوں کا نگراں استاد جامو کو بنا دیا۔ بجھل کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ اُس کی عدم موجودگی میں جامو اور جامو کی عدم موجودگی میں کانتے اور لالہ اڈے کا کام سنبھالیں گے۔ کانتے کی طرح لالہ کا ہاتھ بھی چاقو میں بہت رواں تھا۔ سب نے یہ اعلان حیرت سے سُنا کیونکہ بہت سے لوگوں کو امید تھی کہ بجھل جامو کے بجائے لاڈلے کو متعین کرے گا۔ کانتے نے مجھے بتایا کہ جامو بے حد اصرار کے بعد کلکتے میں رُکنے پر تیار ہوا ہے اور اُس نے لکھنؤ کے کپتن خاں کو اطلاع دے دی ہے کہ وہ فیض آباد میں اُس کے چھوٹے بھائی جمرو کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ فیض آباد کا اڈا یوں بھی محفوظ تھا۔ وہاں کلکتے اور بمبئی کی طرح آپس میں اختلافات پیدا ہونے کا زیادہ امکان نہیں تھا۔ شہر بھی چھوٹا تھا اور جامو کی گرفت سخت تھی۔

صرف چار دن میں اڈے کے معمولات مکمل طور پر اپنی ڈگر پہ آ گئے۔ نصیب میاں کو روزنامچے میں اندراج کرنے کے کام سے سر اُٹھانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ تقریباً اڈے سے کترانے والے سبھی لوگ واپس آ چکے تھے مگر گھوشی نہیں آیا تھا اور آنے والے لوگ گھوشی کے بارے میں عجیب عجیب باتیں بیان کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ بجھل یا جامو اُسے خود بلائیں گے اور کہیں گے کہ یا تو وہ اڈا چھوڑ دے ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے۔ موجمدار کا اڈا یا تو بجھل کے اڈوں میں شامل نہ ہوتا اور شامل ہو گیا تھا تو اُسے واپس نہیں جانا چاہیے تھا۔ اِدھر بجھل تیزی سے اپنے کام نمٹا رہا تھا اور اپنے معتبر آدمیوں کو بُلا کے مختلف ہدایتیں دے رہا تھا۔ بجھل نے خاص خاص لوگوں کے سوا شاید کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ میرے ساتھ واپس جا رہا ہے۔ میں شولی یا سارٹے کو ساتھ لے کے روز سویرے سویرے اڈے سے نکل جاتا تھا اور دوپہر کو واپس آ جاتا تھا۔ شولی رات کو مجھے ساز پہ گانا سناتا تھا۔ اُس کی آواز پہلے سے کہیں زیادہ نکھر گئی تھی۔ یہاں بھی میرا کوئی اور کام نہیں تھا۔ دن بھر گلی گلی پھرتا اور شام کو اڈے واپس آ کے اِدھر اُدھر کی باتیں سنتا رہتا۔ ایک دن مجھے جیلر صاحب نظر آ گئے۔ وہی جیلر صاحب جو مجھ پہ بہت مہربان تھے اور جن کی لڑکی سونیا کو میں نے جیل میں پڑھایا تھا۔ اتفاق سے جیلر صاحب کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ میں نے راستہ بدل لیا۔ اُس دن رات کو کئی آدمیوں نے دبے دبے لہجے میں بجھل کو آمادہ کرنا چاہا کہ وہ گھوشی کے سلسلے میں کوئی قدم اُٹھائے، اس سے اڈے کی بدنامی ہو رہی ہے۔ بجھل نے ہُوں ہاں کر کے ٹال دیا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بجھل کے لیت ولعل کی وجہ کیا ہے۔ اگر وہ خود گھوشی کا سامنا کرتے ہوئے کتراتا تھا کہ گھوشی پہ چاقو اُٹھانا اُس کے لیے سُبکی کی بات ہے تو وہ کسی کو بھی بھیج سکتا تھا۔

پانچویں دن صبح صبح سب جاگ گئے تھے۔ بجھل نہا رہا تھا اور نصیب میاں روزنامچے پر پنسل سے لکیریں کھینچ رہا تھا۔ باقی لوگ بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ میں چپکے سے دروازے سے نکل گیا۔ گلی میں آتے ہی مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر میں موجمدار کے علاقے میں تھا۔ میں نے ٹیکسی اڈے کی عمارت کے دروازے پر رکوائی۔ دروازے پہ جو لوگ موجود تھے، انھوں نے مجھے دیکھا تو کچھ اندر کی طرف دوڑے اور دوسرے میری جانب لپکے۔ وہ سب مجھے جانتے تھے۔ "گھوشی کہاں ہے؟" میں نے اُن میں سے ایک سے دریافت کیا۔

"اندر ہے۔" سندر نے آگے آ کے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔

"اُس سے کہو کہ لاڈلا ملنے آیا ہے۔"

سندر نے اپنے شانے سکوڑ لیے اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا پھر اُس نے اپنے قریب کھڑے ہوئے آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً اندر کی طرف بھاگا مگر وہ ابھی ڈیوڑھی میں تھا کہ گھوشی کو آتا ہوا دیکھ کے پلٹ پڑا۔ گھوشی کے پیچھے کئی آدمی تھے۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ "لاڈلے!" گھوشی نے دُور ہی سے مجھے پکارا اور میرے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔ "کیا ہے لاڈلے؟" وہ نخوت سے بولا۔

"گھوشی! میں تجھ سے ملنے آیا ہوں۔ شاید تُو نے سُنا نہیں کہ ہم لوگ واپس آ گئے ہیں؟" میں نے بلند آواز میں کہا۔

"میں نے سُن لیا تھا۔" وہ منہ بنا کے بولا۔

"اس وقت میں تجھ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ سیدھے سبھاؤ اڈا واپس کر دے۔ میں زیادہ بات نہیں کروں گا۔ تُو نے اڈا زور سے نہیں لیا ہے، تُو نے بجھل بھائی کے ساتھ نیچ پنا کیا ہے۔ تُو نے استاد بجھل کی خاموشی غلط سمجھی اور یہ بھی غلط سمجھا کہ میں مر گیا ہوں۔ میں تیرے سامنے زندہ موجود ہوں۔ اچھی طرح اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔"

"استاد بجھل اڈا سنبھالنے کے کام کا نہیں رہا۔ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔" گھوشی نے تلملا کے کہا۔ "اور یہ اڈا موجمدار سے استاد بجھل نے نہیں لیا تھا، تُو نے لیا تھا۔ تُو چلا گیا تو اڈے پر بجھل کا کوئی حق نہیں تھا۔ موجمدار کے ٹیم بھی یہ اڈا نہیں چلاتا تھا۔ میں اپنے گرو کا اڈا اس طرح برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اُدھر بجھل بیٹھا حقہ گڑگڑ کرتا رہے اور اِدھر آدمی ہاتھ سے نکلتا رہے۔ اُدھر بجھل منہ پھُلائے گردن ڈالے بیٹھا رہے اور اِدھر سالا مکڑی جالا بُنتا رہے۔ اڈے کو زنگ لگ گیا تھا لاڈلے! میں نے استاد سے بار بار بولا پر استاد نے دھیان نہیں دیا۔ میں نے اڈا لے لیا تب بھی استاد منہ پہ تالا مارے رہا۔"

"زبان سنبھال کے بات کر گھوشی! اب استاد بجھل کے لیے تُو نے ایک لفظ بھی اُنھیں منہ سے نکالا تو تیری زبان کاٹ لوں گا۔ بے کار کے بہانے مت کر۔ یہ اڈا میں نے استاد بجھل کو دیا تھا تو اُس سے چاقو کے بل پر ہی واپس لے سکتا تھا۔ تُو نے شہدا پن کیا۔ تو اُچکا ہے گھوشی! بجھل نے تیرے ساتھ کیا زیادتی کی تھی؟ وہ تجھے اپنا سب سے قریب کا آدمی سمجھتا تھا۔ تیری آنکھ میں سُوّر کا بال ہے۔ تُو بیمار ہو جائے یا بوڑھا ہو جائے تو کیا تیرے ساتھی تیری زندہ لاش نوچنے لگیں۔ تُو استاد بجھل کو بوڑھا کہتا ہے۔ چل میرے ساتھ چل۔ میں تجھے اُس کا بڑھاپا دکھاؤں گا۔ بجھل کے اور تمام اڈے بھی تیرے ہو جائیں گے لیکن تجھے تیری ماں کی قسم ہے، تو بھاگنا مت۔ بجھل پہ چاقو اُٹھانا۔ ہم میں سے کوئی نہیں بولے گا۔ چل۔" میں نے اُسے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"تُو بِن بات کی اڑی کر رہا ہے۔" وہ سیدھا کھڑے ہوتے ہوتے بولا۔ "میں کیوں جاؤں؟ بجھل کو آنا ہوتا تو خود آتا۔ تُو اُس کے حق میں نہیں بولے گا تو اور کون بولے گا۔ پر میری بات سُن لاڈلے! جھگڑا مت کر۔ میری جگہ تُو ہوتا تو تُو بھی یہی کرتا۔ بجھل کا ٹیم جا چکا ہے۔"

"بجھل کا ٹیم جا چکا ہے اور تُو نے یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ تیرے ساتھ احسان کرنے والے کا ٹیم کیوں جا رہا ہے۔ تو گدھ کی طرح اُس کے قریب منڈلاتا رہا کہ کب استاد گردن ڈالتا ہے۔ گھوشی! جو کبھی نہیں ہوتا، تُو نے وہ کیا ہے۔ اب تیرا کیا خیال ہے؟ اڈا واپس کرتا ہے بجھل کو یا مجھے؟ اور سُن لے، اب وہ جامو بھی آ گیا ہے جو اڑتی مکھی پہ چاقو ملائے تو اُسے دو کر دے۔ میں کوئی اور بات سننا نہیں چاہتا۔ تُو نے بُرا کیا ہے۔ جو اپنی غلطی مان لے، وہ بڑا آدمی ہوتا ہے۔ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ اڈا واپس کر دے۔ بجھل کو یہاں آنے کی تکلیف نہ دے۔ تُو خوار ہو گا۔ پانی بھی نہیں ملے گا گھوشی! اب ہم میں سے کوئی تجھ پر چاقو نہیں اُٹھائے گا۔ استاد بجھل ہی تجھ سے نمٹے گا۔"

"تُو کہنا کیا چاہتا ہے؟" وہ تندی سے بولا۔

"تُو سمجھنا نہیں چاہتا ورنہ میری بات بالکل صاف ہے۔ میں تیرے پاس آیا ہوں۔ تجھے سمجھ جانا چاہیے۔ چل میرے ساتھ چل اور استاد سے معافی مانگ لے۔ وہ تجھے معاف نہیں کرے گا لیکن میں اُس سے کہوں گا تو وہ میری بات ٹالے گا بھی نہیں۔ جلدی سے فیصلہ کر لے۔"

کچھ دیر بعد ہم اڈے پہنچ گئے۔ میری تلاش میں کئی آدمی دوڑ چکے تھے۔ میں نے گھوشی کو بجھل کے سامنے کھڑا کر دیا۔ بجھل نے منہ پھیر لیا۔ "اِسے معاف کر دو بجھل بھائی!" میں نے عاجزی سے کہا۔ "میں اِسے اسی لیے لایا ہوں۔ میری خاطر معاف کر دو۔"

"لاڈلے!" بجھل دہاڑنے لگا۔ "تُو اِس کمینے کے پاس کیوں گیا تھا؟"

"گھوشی سے غلطی ہو گئی بجھل بھائی! غلطی کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ ہم سب اپنی زندگی میں اچھی غلطیوں سے دوچار رہتے ہیں۔ تم تو کہتے تھے کہ جو واپس آئے اُس کے لیے دل کھلا رکھنا چاہیے۔ گھوشی نے میری بات کا لحاظ کیا کہ میرے ساتھ چلا آیا۔"

"اگر تُو نے اِسے بخش دیا ہے تو پھر مجھ سے کیوں پوچھتا ہے۔" وہ کرب سے بولا۔ "پر تُو ایسی باتیں مت کیا کر۔"

گھوشی نے تیزی سے بڑھ کے بجھل کے پیر پکڑ لیے۔ بجھل بگڑا رہا۔ گھوشی مچلنے لگا۔ بجھل نے اُس کے گال پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ گھوشی اُس کی چھاتی سے لپٹ گیا۔ "قسمت کا اچھا ہے گھوشی کہ لاڈلے تیرے پاس پہنچ گیا۔ میں جامو کو تیرے پاس بھیجنے ہی والا تھا۔ ذرا شہر والوں کو بھی پتہ چل جاتا کہ استاد جامو کون ہے۔ جامو اب اِسے تُو ہی سنبھال۔" بجھل نے اُسے ایک ہاتھ سے دھکا دیا۔ دوسری طرف سے جامو نے گھوشی کو بڑھ کے گلے سے لگا لیا۔

دوپہر کو ڈاکیے نے ایک خط بجھل کے سپرد کیا۔ بجھل نے اُسے میرے حوالے کر دیا۔ وہ زرّیں کا خط تھا۔ زرّیں نے بجھل کو آداب و تسلیمات کے بعد اُس کی خیریت پوچھی تھی اور لکھا تھا کہ "میری معرفت ظہیر کے نام بمبئی سے ایک خط آیا ہے۔ میں نے خط کھول کے نہیں دیکھا ہے۔ اسے کسی تاخیر کے بغیر آپ کے پاس بھیج رہی ہوں۔ یہ خط کسی مس جولیا نے لکھا ہے۔ یقیناً ظہیر بمبئی میں رہے ہوں گے۔ آپ چاہیں تو اسے کھول لیں۔ شاید ظہیر اس طرف آنے ہی والے ہیں۔ انھوں نے اسی خیال سے میرا پتہ دیا ہو گا۔ ممکن ہے وہ کلکتے میں آپ کے پاس پہنچ گئے

راایسا ہے تو مجھے فوراً مطلع کیجیے اور اُن سے میرا آداب کہیے۔
ی بیٹی۔ زرّیں۔"

خط کے ساتھ میرے نام ایک لفافہ بھی تھا۔ میں نے جلدی ے پھاڑ کے دیکھا۔ وہ انگریزی میں ایک دو سطری خط تھا، جولین سلام کے بعد اُس نے لکھا تھا: "میں یہ تحفہ واپس کر رہی ہوں۔ ں کے ساتھ۔ جولین۔"

جولین نے چیک واپس کر دیا تھا۔ وہ خط بھی اُس کے ہمراہ تھا نے وکیل کی ہدایت پر بینک کو لکھا تھا تاکہ جولین کو اپنے اکاؤنٹ ے منتقل کرتے ہوئے کوئی پریشانی نہ ہو۔ میں نے دونوں خط زہ کر دیے اور میرا جی چاہا کہ میں خود کو بھی ریزہ ریزہ کر لوں۔ کاش ے اپنے ہاتھ سے یہ چیک دے کے آتا یا کوئی ایسی ترکیب کرتا یہ اُس کے نام منتقل ہو جاتا اور اُسے اطلاع بینک کے ذریعے گر کوئی کسی کی چیز لینے پر تیار نہ ہو تو کون اُسے جبیٹ سکتا ہے۔ ں نے نہ جانے کیا سمجھ کے چیک واپس کر دیا۔ اب میں اُسے کس طرح سکتا تھا۔ وہ تو اتنی دُور ہو گئی تھی۔

تجّل وہاں ایک دن اور ٹھہرا۔ اسٹیشن پر نصیب میاں، کانتے ولی گھوشی اور رجا مو موجود تھے۔ ہمارے ساتھ بہت مختصر سامان تھا۔ بستر بند اور ایک سوٹ کیس۔ تجّل سفید کرتے پاجامے اور واسکٹ ہوں تھا۔ اُس نے مراد آباد تک کا ٹکٹ خریدا۔ میں نے منع کیا کہ باد جانا بے سود ہے کیونکہ وہاں میں ایک ایک آدمی سے مولوی ق کے بارے میں معلوم کر چکا ہوں مگر تجّل نے میری بات نہیں سنی۔ نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ کچھ عجب نہیں تھا کہ اس عرصے میں مولوی ب واپس آ گئے ہوں یا اُن کے کسی عزیز کو اُن کا اتا پتا معلوم ہو گیا جیسے جیسے مراد آباد قریب آتا گیا، میرے خون کی گردش تیز ہوتی گئی۔ رے دن تین بجے سہ پہر کو ہم مراد آباد اسٹیشن پر اُترے۔ میرے پاؤں اکڑ ے تھے۔ اسٹیشن کے سامنے ہی مسافر خانہ تھا۔ تجّل ساتھ نہ ہوتا تو میں ن سے سیدھا مولوی صاحب کے محلّے کی طرف نکل پڑتا۔ تجّل کو شیو ے اور کپڑے تبدیل کرنے میں دیر لگ گئی۔ میں نے یہ کام منٹوں ں کر لیا۔ چائے میں اور وقت لگ گیا۔ مسافر خانے کے باہر ہی تانگوں ایک قطار کھڑی تھی۔ ہم دونوں پہلے تانگے میں بیٹھ گئے۔ اسٹیشن سے ض گنج کا راستہ دو ڈھائی میل کے قریب ہو گا۔ دوپہر کے سینما چھوٹے ے اس لیے اسٹیشن روڈ کی سڑک پر خاصی بھیڑ تھی۔ مغرب کی اذان ے وقت ہم فیض گنج میں داخل ہوئے۔ مجھے وہ گلی اچھی طرح یاد تھی ولوی شفیق رہتے تھے۔ گلی میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ میونسپلٹی کا بتی والا آدمی ، پر چڑھ کے بتی جلا رہا تھا۔ مولوی شفیق کے مکان میں دھیمی روشنی ہو ی۔ تجّل نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ میرے اشارے پر اُس نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے زور سے آنکھیں بند کر لیں۔ اندر سے ایک ادھیڑ عمر آدمی برآمد ہوا۔ مولوی صاحب وہاں نہیں تھے۔ وہ بھلا کیوں ہوتے۔ اُس مکان کے بعد ہم نے کئی مکانوں پر دستکیں دیں۔ ہر جگہ سے ایک ہی جواب ملا۔ اُن کے اعزا مولوی صاحب کو تقریباً فراموش کر چکے تھے۔ رات کو دس بجے ہم مسافر خانے واپس آ گئے اور صبح ہوتے ہی پھر نکل کھڑے ہوئے۔

ہم نے شاہی بازار میں برتنوں کی مختلف دکانوں پر بھی مولوی صاحب کے متعلق معلوم کیا۔ مدرسۂ امدادیہ، جامعۂ قاسمیہ اور مراد آباد کے تمام بڑے مدرسوں میں جا جا کے پوچھا۔ تین دن تک ہم اسی طرح کوچے کوچے پھرتے رہے۔ مولوی صاحب کی عادتیں، اُن کے مشاغل اور اُن کے مزاج وغیرہ کے بارے میں تو بہت کچھ معلوم ہو گیا لیکن کسی شخص نے پلٹ کے اُن کی خبر نہیں لی کہ وہ اچانک کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ برتنوں کی کچھ دکانوں سے کئی شہروں کے دکان داروں کے پتے ضرور معلوم ہو گئے جہاں سے مولوی صاحب برتنوں کے آرڈر بک کرتے تھے۔ تجّل نے ایک سادہ کاپی اور قلم خرید کے مجھے دے دیا تھا۔ کوئی خاص بات ہوتی تو وہ مجھے نوٹ کرنے کا اشارہ کر دیتا۔

مراد آباد سے چلتے ہوئے میں نے تجّل سے کچھ روپے لے کے ارجمند بیگم کی بیٹی فرخ کے لیے مٹھائی اور دیگر چیزیں خریدیں لیکن میں راستے ہی سے لوٹ آیا کہ پتہ نہیں ارجمند بیگم کس حال میں ہو۔ اب تو وہ مجھے بھول بھی گئی ہو گی اور بھول گئی ہو گی تو بھولے ہی رہنے دیا جائے۔ جتنے کم آدمیوں سے ملا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ میں نے مٹھائی مسافر خانے کے باہر کھڑے ہوئے فقیروں کو دے دی اور فرخ کے کھلونے بھی انھی میں تقسیم کر دیے۔ سات کو ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ تجّل کا خیال تھا کہ اب مولوی صاحب کو اُن علاقوں میں تلاش کیا جائے جو تبت سے دُور ہیں۔ مولوی صاحب کو کورا نے تمام باتیں بتا دی ہوں گی اس لیے وہ اُسے لے کے کسی ایسی جگہ منتقل ہوئے ہوں گے جہاں اُن کے کسی جاننے والے کے پہنچنے کا امکان نہ ہو اور جہاں کورا اپنی تلاش میں پھرنے والے تبت کے لوگوں سے بھی دُور رہے۔ ہم دلی آ گئے اور دلی سے مدراس جانے والی ریل میں بیٹھ گئے۔ تجّل سے جرح کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ مولوی صاحب کہیں بھی ہو سکتے تھے۔ مدراس شہر میں میں نے بھی مولوی صاحب کو تلاش کیا تھا مگر تجّل نے چند مفروضے بنا لیے تھے۔ اُس کا خیال یہ بھی تھا کہ مولوی صاحب نہ کسی گاؤں میں ہوں گے، نہ کسی بڑے شہر میں۔ وہ ایک اوسط درجے کے شہر میں ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ کسی بڑے شہر میں ہوتے تو مراد آباد کے کسی شخص کو اس مدت میں ضرور دکھائی دیتے کیونکہ برتنوں کی تجارت کے سلسلے میں مراد آباد کے لوگ ہندوستان کے تقریباً تمام شہروں میں جاتے ہیں۔ مولوی صاحب کے پاس کوئی خزانہ نہیں تھا اس لیے انھوں نے اپنی گزر بسر کے لیے کوئی نہ کوئی صورت ضرور اختیار کی ہو گی اور کورا کی حفاظت کی وجہ سے وہ کوئی بڑا کاروبار بھی نہیں کر سکے ہوں گے نیز انھوں نے محنت مزدوری کا پیشہ بھی نہیں اپنایا ہو گا کیونکہ یہ اُن کی عمر اور مزاج کے خلاف ہے۔ وہ کوئی بُردبارانہ اور سنجیدہ کام کرتے ہوں گے مثلاً کسی مدرسے میں پڑھاتے ہوں گے۔ کسی مسجد میں امام ہوں گے اور اُن کی کوئی چھوٹی موٹی دکان بھی ہو سکتی ہے یا وہ کمیشن ایجنٹی کا کام کر رہے ہوں گے۔ تجّل پہلے انھیں جنوبی ہند کے تمام چھوٹے شہروں میں تلاش کرنا چاہتا تھا۔ مدراس اُس کی منزل نہیں تھی۔

ہم دو مہینے تک مدراس، ٹراونکور، کوچین، میسور، بنگلور اور آس پاس کے تمام شہروں میں گھومتے رہے۔ چند شہر چھوڑ کے باقی میں مسلمانوں کی آبادی نہ ہونے کی برابر تھی۔ یہاں جتنے مدرسے تھے، مسجدیں تھیں اور مسلمانوں کے دوسرے ادارے تھے۔ وہ سب ہم نے دیکھ لیے تھے۔ ہر قسم کے تاجر سے بھی بات کر لی تھی۔ میسور سے ہم اورا دوپہ آ گئے۔ کرنول، رائے چور، اڈونی، گلبرگہ، بیدر، نظام آباد، اورنگ آباد، سکندر آباد وغیرہ سے گزرتے ہوئے ہم تیسرے مہینے حیدر آباد دکن پہنچ گئے۔ جنوبی ہند کی شاید ہی کوئی چھوٹی بڑی بستی رہ گئی ہو جہاں ہم نہ گئے ہوں۔ ان شہروں میں ابا جان کا بھی کوئی پتہ نہ چلا۔ اتنے طویل سفر کے بعد بھی تجّل کے چہرے پر تھکن نہیں تھی۔ میں نے اُس سے کئی بار کہا بھی کہ وہ کہاں تک اُن کھوئے ہوئے لوگوں کی تلاش میں دوڑ دھوپ کرے گا۔ وہ واپس چلا جائے مگر تجّل نے ہر بار مجھے جھڑک دیا۔ پھر میں نے کہنا ہی بند کر دیا۔

راستے میں ہمیں طرح طرح کے واقعات پیش آئے۔ بنگلور میں ہمارا بستر بند چوری ہو گیا، کئی جگہ لوگوں نے ہماری جیب کاٹنے کی کوشش کی، ہمیں غلط راستوں پر ڈال دیا گیا، کالج کے طلبہ کے ایک گروہ نے جو پکنک منانے حیدر آباد جا رہا تھا، ریل میں تجّل کا مذاق اُڑایا اور اُسے سیٹ سے اُٹھا دیا۔ غرض چاقو نکالنے کی ضرورت کئی جگہ پیش آئی مگر تجّل تو جیسے چاقو اپنے ساتھ لایا ہی نہیں تھا۔ وہ اڈوں اور پاڑوں سے دُور دُور رہا۔

میں حیدر آباد پہلے بھی آ چکا تھا لیکن جب ہم اس طرف آ ہی نکلے تھے تو ایک بار پھر قسمت آزما لینے میں کیا حرج تھا۔ حیدر آباد خاصا بڑا شہر اور مسلمانوں کا مرکز تھا۔ تجّل کسی شہر میں داخل ہوتے ہی جس انداز سے انھیں ڈھونڈتا تھا، اُس سے ہر جگہ اُمید کی ایک کرن نظر آتی تھی۔ یہ بات تو اب بالکل طے ہو گئی تھی کہ حیدر آباد سے نیچے جنوبی ہند کے تمام علاقے میں مولوی صاحب اور ابا جان ابھی نہیں گئے۔ ہم نے جگہ جگہ لوگوں کو زریں کا پتہ بھی دے دیا تھا کہ اگر انھیں کوئی ایسا شخص نظر آئے تو وہ فوراً مطلع کر دیں۔ پتے کے ساتھ ہم نے ٹکٹ لگے ہوئے لفافے بھی کثیر تعداد میں تقسیم کیے تھے۔ حیدر آباد میں ہمیں قیام کیے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ پہلے مرحلے میں ہم نے تمام مدرسے، لائبریریاں اور خانقاہیں دیکھ لی تھیں۔ حیدر آباد کے نواح میں گولکنڈا کا علاقہ، حسین ساگر اور قطب شاہی مزارات کے قریب کی تمام مسجدوں میں بھی جا کے پوچھ لیا تھا۔ فلک نما کی چاؤشوں کی بستی میں بھی احتیاطاً ہو آئے تھے۔ اب صرف دکانیں اور بازار دیکھنے تھے۔

اُس دن شام کو ہم چار مینار سے شاہ گنج کی طرف جا رہے تھے۔ یہاں عموماً چھوٹی دکانیں تھیں۔ ہر دس بارہ دکانوں میں سے کسی دکان پر رُک کے ہم انھیں پوچھ لیتے۔ تجّل ایک بازار کی مختلف قسم کی دکانیں منتخب کرتا تھا۔ مثلاً چمڑے کی کوئی دکان، برتنوں کی، جنرل مرچنٹ کی کوئی دکان۔ مولوی صاحب کسی بھی قسم کا کاروبار کرتے ہوں، اُس سے متعلقہ دکان داروں سے اُن کا رابطہ ضرور ہونا چاہیے تھا۔ ہم دور کھڑے انتظار کرتے رہتے کہ گاہک ہٹیں تو ہم دکان پر پہنچیں۔ بعض اوقات بہت دیر ہو جاتی تھی۔ پھر ہمیں کوئی معمولی چیز خریدنے کے بہانے دکان دار سے بات کرنے کا طریقہ اختیار کرنا پڑتا تھا۔ بعض دکان دار ہماری پوری بات ہی نہیں سنتے تھے جیسے ہم اُن کے پاس بھیک مانگنے آئے ہوں۔ وہ بیزاری سے کہتے تھے کہ بابا! گراہکی کا ٹائم ہے، سوختے کے وقت آؤ۔ البتہ بعض دکان دار بہت شرافت سے پیش آتے تھے۔ تجّل ایک بازار میں ایک قسم کی کم از کم دو دکانوں پر ضرور جاتا تھا۔

ہم نے شاہ گنج کا بازار تقریباً سارے کا سارا دیکھ لیا تھا۔ وہاں سے ہم طوائفوں کے بازار محبوب کی مہندی آ گئے۔ جب ہم ایک بالا خانے کے نیچے سے گزر رہے تھے تو آگے ہمیں شور سنائی دیا۔ گل فروشوں کی ایک دکان کے سامنے بھیڑ لگی ہوئی تھی اور چیخ پکار مچی ہوئی تھی۔ لوگ اُچک اُچک کر ہجوم کے درمیان دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم ایسے ہجوموں پر ہمیشہ ایک سرسری نظر ڈال لیتے تھے۔ چاہے وہ مداری کا تماشا ہو رہا ہو یا لڑائی جھگڑا۔ ہم وہاں پہنچے تو مار پٹائی ہو رہی تھی۔ وہ دو نوجوان لڑکے تھے۔ ایک کی عمر تو بہت کم تھی، یہی کوئی پندرہ سولہ کا ہو گا۔ دوسرا اکیس کا ہو گا۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے۔ اُن کی زبانوں سے گالیاں بھی جاری تھیں۔ لوگوں نے جھجکتے جھجکتے بیچ بچاؤ کی کوشش کی مگر جب انھیں ناکامی ہوئی تو وہ تماشا دیکھنے لگے۔ چھوٹے لڑکے کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اُس نے بڑے لڑکے کے بال پکڑ رکھے تھے اور بڑا لڑکا اُس کے پیٹ میں لات مار رہا تھا۔ ہجوم کو ایک نظر دیکھنے کے بعد تجّل نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا لیکن میرے قدم وہیں جم گئے تھے، پتھر کے ہو گئے تھے، میری آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

چھوٹا لڑکا جہاں گیر تھا۔ میں اُس کا چہرہ کیسے بھول سکتا تھا، وہ میرا چھوٹا بھائی تھا۔

میں نے تجّل کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور جھپٹ کے درمیان میں کود پڑا۔

تھا، جہاں گیر کی پیشانی سے خون چھوٹ رہا تھا اور اس کی آنکھیں
بند ہوئی جا رہی تھیں۔ مجھے اپنی طرف بڑھتا
دیکھ کے لڑکا چیخا۔ وہ درمیان میں دخل نہ دینے کی تلقین کر رہا تھا
ن اس کی بات پوری ہونے سے پیشتر ہی میں نے اس کے کولھے
ٹھوکر مار دی تھی۔ میں جہاں گیر کو اگر کھینچ کر اس سے علیحدہ کرتا تو لڑکا
ں دوران میں اسے دو چار ضربیں اور لگا دیتا۔ جہاں گیر مزید ضربوں کا
حمل معلوم نہیں ہوتا تھا اس لیے میں نے جاتے ہی اسے جہاں گیر
ے دور کرنے کی کوشش کی۔ وہ دونوں ایک ساتھ زمین پر گر گئے۔
ہاں گیر بھی اس کی جھونک میں زمین پر آ گیا تھا کیونکہ اس نے ابھی تک
ڑکے کے بال نہیں چھوڑے تھے۔ میں نے اس کی گردن پکڑ کے
ھینچا تو اسے بال چھوڑنے پڑے۔ میں اسے لے کے جلد سے
جلد بھیڑ سے دور ہو جانا چاہتا تھا مگر لڑکے نے ایک لمحے میں پھرتی
سے اٹھ کے میری کمر پہ پوری طاقت سے سر مار دیا۔ اگر سامنے ہجوم نہ ہوتا
میں اوندھے منہ سڑک پر جا گرتا۔ لوگوں نے مجھے سنبھال لیا۔ ہر شخص اپنی
بولی بول رہا تھا: "بس کر بس کر، جانے دے مولے!" ایک طرف سے کسی
بوڑھے کی پھٹی ہوئی آواز گونجی۔

لڑکے کا نام مولا تھا۔ ہجوم میں بہت سے لوگ اسے جانتے تھے۔
وہ بار بار اس کا نام لے کے اسے سمجھانے بجھانے کے لیے آوازیں لگا
رہے تھے مگر کسی نے اس کا ہاتھ نہیں پکڑا۔ مولا نہیں مانا۔ مجھے ڈر تھا
کہ جہاں گیر نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے یا معاملہ بڑھتا ہوا دیکھ کے فرار
ہونے کی کوشش نہ کرے۔ میں نے بہت احتیاط کی تھی۔ یہ شارع عام
ں اور علاقہ بھی بالا خانوں کا تھا۔ مولا کے کچھ اور ساتھی بھی وہاں موجود
ہو سکتے تھے لیکن مولا کے لیے میری ضرب ناکافی ثابت ہوئی۔ جہاں گیر
کی پیشانی سے خون ابل رہا تھا۔ میری آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ مجھے سامنے
کی چیزیں صاف نظر نہیں آ رہی تھیں۔ مولا دہاڑتا ہوا دوبارہ میرے پیچھے
لپکا اور اس نے پشت سے میری واسکٹ پکڑ لی۔ میں نے جہاں گیر پہ
اپنی گرفت قائم رکھی تھی۔ وہ مسلسل مجھ سے خود کو چھڑانے کی تگ و دو کر رہا
تھا۔ اس کا ہاتھ تھامے تھامے میں نے مولا سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ اس
اثنا میں تجمل بھی، ہجوم چیر کے آگے آ چکا تھا اور خاموش کھڑا تھا۔ میں
نے جہاں گیر کو اس کی طرف دھکیل دیا پھر پلٹ کے قدم بڑھاتے کہ مولا
کو کمر سے پکڑ کے زمین پہ پٹخ دوں مگر تجمل میرے اور اس کے درمیان
لیا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے میرا بازو جکڑ لیا۔ مولا نے دیوانہ وار تجمل
کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور کچھ دیکھے بغیر دہشت زدہ انداز میں اس
کی ٹھوڑی پر مکا مارا۔ وہ بری طرح گالیاں بک رہا تھا۔ تجمل نے حرکت
نہیں کی۔ وہ مجھے اور جہاں گیر کو اپنی آڑ میں لیے ہوئے جما کھڑا رہا۔ مولا
نے تجمل کے سینے پر پے در پے گھونسے مارے: "اسے چھوڑ دے
چاچا!" اس نے چلا کے کہا: "اس رنڈی کے جنے کو چھوڑ دے۔" میرے
کانوں میں آگ بھڑک اٹھی۔ میں تجمل کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑا کے
اس کی طرف جھپٹا مگر تجمل نے ٹانگ مار کے مجھے زمین پر گرا دیا اور
دوبارہ پکڑ کے جھڑکنے لگا۔ مولا خود ہی اچانک رک گیا۔ وہ تجمل کو چند
ہی گھونسے مار سکا۔ اسے شاید تجمل کا چہرہ دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ
پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے پیچھے ہٹتے ہی، ہجوم میں سے بہت سے لوگ
ہماری جانب بڑھے۔ بعض نے جہاں گیر کی پیشانی صاف کرنی چاہی مگر
تجمل نے انھیں روک دیا اور جہاں گیر کا ماتھا اپنے دامن سے خشک کیا۔
تجمل جہاں گیر کی طرف متوجہ تھا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد ہی میں نے
مولا کی تلاش شروع کر دی۔ مجھے ذرا سی دیر ہو گئی۔ مولا فرار ہو چکا تھا۔

اوپر بالا خانوں پہ کھڑی ہوئی عورتوں میں سے کسی نے کپڑا
پھینک دیا تھا۔ تجمل نے اپنے ہاتھ سے جہاں گیر کے پٹی باندھی۔ آگے
کچھ دور نکڑ پہ ایک انگریزی شفاخانہ تھا۔ ہمارے ساتھ کئی آدمی چلے۔
پھر ابھی کمپونڈر جہاں گیر کی مرہم پٹی کر رہا تھا کہ ایک برقع پوش عورت
بے تابی سے مطب میں داخل ہوئی اور نقاب الٹ کے جہاں گیر سے
لپٹ گئی: "یہ کیا ہو گیا رجو!" وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

وہ اکیلی نہیں تھی۔ ڈاکٹر کے اشارے پر اس کے ساتھ آنے
والے دونوں آدمیوں نے اسے جہاں گیر سے جدا کیا۔ دونوں آدمیوں
کی وضع قطع سے ان کے پیشے کا صاف پتہ چلتا تھا۔ میرا دل ڈوبنے
لگا۔ میں نے غور سے عورت کو دیکھا مگر وہ فرخ، فریال یا فارحہ میں
سے کوئی نہیں تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کی ایک گوری چٹی عورت تھی۔ اس کا
ناک نقشہ ترشا ہوا تھا۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا مگر خاندان کی کوئی
ایسی عورت میرے ذہن میں محفوظ نہیں تھی۔ وہ جہاں گیر کو رجو کے
نام سے مخاطب کر رہی تھی۔ یک بارگی خیال آیا کہ کہیں مجھے دھوکا تو
نہیں ہوا ہے مگر اتنا بڑا دھوکا میری آنکھیں نہیں کھا سکتی تھیں۔ وہ
یقیناً جہاں گیر تھا۔ میرا چھوٹا بھائی، جب میں گھر سے نکلا تھا تو اس کی
عمر آٹھ نو سال سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ اسی کا چہرہ تھا۔ اب وہ بڑا ہو گیا
تھا۔ سولہ سترہ سال کا دبلا پتلا لمبا سا لڑکا۔ اس کا قد میری طرح اٹھ رہا
تھا لیکن اس کی آنکھیں ابھی تک کچی کچی تھیں۔ وہ پٹ پٹاتی نظروں سے
ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ عورت اس کے برابر تپائی پہ بیٹھی ہوئی اس کے
کپڑوں سے گرد جھاڑ رہی تھی اور شکایت کر رہی تھی کہ وہ اسے اطلاع
دیے بغیر گھر سے کیوں نکلا: "میں مولا اور اس کے حمایتیوں کو دیکھ لوں گی۔
دیکھ لینا، وہ پھر کبھی اس گلی میں نظر نہیں آئیں گے۔" وہ بلند آواز سے
کہہ رہی تھی: "وہ مجھے نہیں جانتا ہے رجو! میں نواب بہادر سے کہہ دوں تو
عمر بھر جیل میں سڑتا رہے۔ تم... تم نے اس بدمعاش کی بات پر کان
ہی کیوں دھرے تھے۔ تم راستہ بدل دیتے یا سر جھکائے چلے آتے۔"

"وہ خود ہی میرے سامنے آ گیا۔" جہاں گیر نے شکستہ آواز میں کہا۔

"خیر اب کے وہ بچ کے نہیں جائے گا۔" عورت غصے سے بولی۔

میرا سر گھوم رہا تھا۔ جہاں گیر کے ماتھے پر پتھر کا کوئی کونا لگ
گیا تھا اور زخم کی کچی بن گئی تھی۔ کمپونڈر مرہم پٹی سے فارغ ہو گیا تو
عورت نے ریشمی رومال میں بندھے ہوئے پیسے نکالے مگر تجمل ڈاکٹر
کو پہلے ہی فیس ادا کر چکا تھا۔ عورت کی آنکھیں ممنونیت سے چمکنے لگیں۔
جہاں گیر نے سرگوشی میں اسے بتا دیا تھا کہ ہمی دونوں نے درمیان میں
پڑ کے معاملہ رفع دفع کرایا ہے۔ عورت نے دبے دبے لفظوں میں ہمارا
شکریہ ادا کیا۔ جب وہ جہاں گیر کو اپنے ساتھ لے جانے لگی تو میں نے
تجمل کی طرف نظر کی۔ تجمل نے آنکھیں میچ لیں۔ چلتے وقت جہاں گیر
نے ہم دونوں کو سلام کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ میں اسے گھورتا رہا۔
مطب کے اندر کئی مریض موجود تھے اور باہر ابھی تک گلی کے چند
لڑکے کھڑے تھے۔ گلی میں آتے ہی عورت نے نقاب ڈال لیا اور
اپنے دونوں آدمیوں کے ساتھ ایک طرف چل دی۔ جب وہ کچھ آگے
بڑھ گئی تو ہم بھی کچھ فاصلے سے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ میرے
قدم ڈگمگا رہے تھے۔ گلی میں خاصی چہل پہل تھی۔ تجمل ساتھ نہ ہوتا تو
میں جہاں گیر کو عورت کے ہاتھ سے ضرور چھین لیتا۔ کچھ دور جا کے
جہاں گیر نے پیچھے مڑ کے دیکھا اور عورت کو کوئی اشارہ کیا۔ عورت نے
تیزی سے گردن گھمائی۔ پیچھے ہم آ رہے تھے۔ اس کی چال میں ذرا سی
لرزش پیدا ہوئی مگر وہ جلد ہی سنبھل کے نپے تلے قدموں سے آگے
بڑھتی رہی۔ اس کے بعد ان میں سے کسی نے منہ پھیر کے ہمیں دیکھنے
کی ضرورت نہیں سمجھی۔ "کیا یہ وہی ہے؟" تجمل نے آہستگی سے پوچھا۔

"ہاں وہی۔" میں نے بے چینی سے کہا: "وہ جہاں گیر ہے مگر
اس کے ساتھ جو عورت ہے اسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

وہ چپ ہو گیا۔ عورت دوسری گلی میں مڑ گئی۔ ہم نے اپنی رفتار
تیز کر دی۔ اس علاقے میں چھوٹے بڑے، نئے پرانے دو دو تین تین
منزلہ مکانات تھے۔ جس گلی میں عورت داخل ہوئی تھی، وہ زیادہ بڑی
نہیں تھی۔ ہمارا اور اس کا فاصلہ بھی کم ہو گیا تھا۔ کوئی دو سو قدم چلنے
کے بعد وہ ایک حویلی نما مکان کے پاس جا کے ٹھیر گئی۔ مکان کا رنگ و
روغن تازہ تھا۔ اوپر کی دونوں منزلوں پر شہ نشینیں بنی ہوئی تھیں۔ مکان
کے آس پاس بھی کئی مکانات تھے جو تقریباً ایک ہی طرز کے تھے مگر
گلی میں اس سے نمایاں کوئی اور مکان نہیں تھا۔ ہم دور ہی سے دروازہ
دیکھ کے دوسری طرف نکل گئے۔ تجمل نے میری انگلیوں میں اپنی انگلیاں
پھنسا رکھی تھیں۔ میرے ہاتھ سرد پڑے ہوئے تھے۔ تجمل مڑ کے پھر
چوڑی گلی میں آ گیا اور جدھر جہاں گیر کو ہم نے پہلی بار مولا سے دست
بہ گریباں دیکھا تھا، اس جگہ سے نزدیک ایک تنگ ہوٹل میں آ بیٹھا۔
ہوٹل ایک دکان میں واقع تھا۔ بیٹھنے کے لیے ادھر ادھر تپائیاں
پڑی ہوئی تھیں۔ دیواریں کالی تھیں۔ دیگوں کے پاس بیٹھے ہوئے
ہوٹل کے آدمی نے ہمیں پہچان لیا اور مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا
استقبال کرتے ہوئے بیرے کو میز صاف کرنے کا حکم دیا۔ ہماری آمد پہ
ہوٹل میں بیٹھے ہوئے کئی لوگوں کی نگاہیں ہماری جانب اٹھنے لگیں۔
ممکن ہے ان میں سے بعض نے ہمیں کچھ دیر پہلے دیکھا ہو۔ "تم یہاں
کیوں آ گئے؟" میں نے دہشت سے پوچھا۔

"ذرا دیر ٹھیر۔" وہ درشتی سے بولا۔

"کہیں وہ پھر نہ نکل جائے۔"

"نہیں۔" تجمل اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولا: "اتنی جلدی نہیں۔"

"تم نے اس عورت سے بات کیوں نہیں کی؟" میں نے
مضطرب لہجے میں کہا۔

"لاڈلے!" وہ تنک کے بولا: "چین سے بیٹھا رہ۔"

شاید تجمل کو میرے یقین پر شبہ تھا۔ آٹھ سال سے زیادہ
ہو گئے تھے لیکن گھر کے ایک ایک آدمی کا چہرہ میری آنکھوں میں
نقش تھا۔ میرے پیچھے گھر ہی میں بہت بڑی تبدیلی ہو گئی ہو گی اسی لیے
جہاں گیر مجھے نہیں پہچانا۔ ہوش کا جتنا زمانہ میں نے اسے دیکھتے ہوئے گزارا
تھا، اتنا وقت اسے نہیں ملا تھا۔ وہ مجھے بھول سکتا تھا مگر میں اسے کیسے
بھول جاتا۔ یہ وہی جہاں گیر تھا جس کے کپڑے گندے ہو جاتے تھے تو میں
انھیں بدل دیتا تھا۔ میں اکثر اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتا تھا۔ وہ
روز مجھے اپنا سبق سناتا تھا۔ جب بھی گلی میں نکل جاتا تو میں اس کے کان
پکڑ کے اسے گھر واپس لاتا۔ وہ مجھ سے روٹھ جاتا تھا۔ امی سے رو رو کے
میری سختیوں کی شکایت کرتا تھا۔ جب کورا گھر میں آئی تھی تو وہ بہت خوش
خوش تھا۔ ہر وقت اسی کے گرد منڈلاتا رہتا تھا۔ مجھے یاد آیا، اس نے امی
سے کہا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے کورا کو اپنے گھر میں روک لے۔ اس نے
کورا کو گڑیا باجی کا لقب دیا تھا۔ کبھی کبھی وہ اتنی ذہانت کی باتیں کرتا تھا
کہ امی اور ابا جان دنگ رہ جاتے تھے۔ اسے یہاں اس بازار میں دیکھ کے
میرے ذہن میں ہر لمحے ایک نیا وسوسہ اٹھ رہا تھا۔ تجمل کو علم نہیں تھا کہ مجھے
ایک ایک پل کاٹنا دوبھر ہو رہا ہے۔ بیرا بالائی سے بھری ہوئی چائے کی
پیالیاں میز پہ رکھ گیا۔ میرا جی چاہا کہ میں پیالی تجمل کے منہ پہ مار دوں۔ اسے
اس وقت چائے کی طلب ہو رہی تھی۔

تجمل نے مجھ سے چائے پینے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ میری چائے
دیکھتے دیکھتے ٹھنڈی ہو گئی۔ تجمل نے دو تین گھونٹوں میں پیالی حلق میں انڈیل
لی تھی۔ ابھی ہمیں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ سامنے کی تپائی سے
ایک شخص سرکتا، جھجکتا ہوا ہمارے پاس آیا: "کیا پردیسی ہو حضت؟" اس
نے لفظ چباتے ہوئے کہا۔ تجمل نے اثبات میں سر ہلایا

"اِپن نے پہلے ہی جان لیا تھا کہ پردیسی سیّاں ہو۔" وہ تیزی سے بولا۔ "لڑکا بالو کو بچا لیا حضت! مولا بے ہوش کر کے دم لیا۔ اِدھر کسی میں اتنا زور نہیں تھا کہ کبیرے شاہ کے مُرغے پر ہاتھ ڈالتا۔ رجّو کی قسمت اچھی تھی کہ آپ لوگ وقت پر پہنچ گئے۔ ایک بات بولیں؟" وہ اپنا چہرہ ہمارے قریب کرتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ "آزو بازو سے ہوشیار رہنا، مولا نے کبیرے شاہ سے جا کے بولا ہوگا۔ بھروسا نہیں کہ کبیرا کلدار سمجھ کے جیب بٹھیالے۔"

"تمھارا کیا مطلب ہے؟" تجمل نے بھاری آواز میں کہا۔

"کام کی بات بولتا ہوں سرکار! چکر میں اِدھر آ کے پھنس گیا ہوں۔ بیس سال اِدھر مغز مارتے ہوئے ہو گیا۔ یہ زمین سُسرا پاؤں سے چپک گیا ہے۔ مطلب صاف ہے۔ اِس طرف ناگ پوری سانپ کبیرے شاہ کا سکّہ چلتا ہے۔ حالی بھی نہیں چلتا، کلدار بھی نہیں چلتا۔" وہ اِدھر اُدھر دیکھ کے ہنس کر بولا۔ حیدرآباد میں ریاستی سکّوں کو حالی اور انگریزی چھاپ کے سکّوں کو کلدار کہتے تھے۔ دونوں سکّے ایک ساتھ رائج تھے۔ ہمیں کلدار کہنے سے اُس کی مراد تھی کہ ہم ریاست سے باہر کے لوگ ہیں۔

"اور یہ لڑکا کون تھا؟" تجمل نے تلخی سے پوچھا۔

"یہ رجّو تھا۔ رجّو نواب زادہ، سُریلی خانم کا بیٹا۔"

"سُریلی خانم! نواب زادہ!" تجمل اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ہاں سُریلی خانم!" وہ اشتیاق سے بولا۔ "خانم کا نام اب سُریلی خانم ہی پڑ گیا ہے۔ وہ کوئل کی طرح کوکتی ہے۔ نواب عالم تاب بہادر نے اُسے سُریلی خانم کا خطاب دیا تو یہی نام پڑ گیا۔ اب بس قسمت والوں ہی کو سُریلی کے گلے کا جادو دیکھنے کو ملتا ہے۔"

"کیوں؟ کیا وہ محفل نہیں سجاتی؟"

"ہے ہے۔" وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کے سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ "جب سے اُس نے گانا بند کیا ہے، اِدھر بازار آدھا رہ گیا ہے۔ اب وہ صرف دربار سرکار میں جا کے گاتی ہے۔ میں کیا بولوں! ایک زمانہ تھا کہ دُور دُور سے لوگ اُس کا جلوہ دیکھنے اور اُس کی آواز کی شراب پینے آتے تھے۔ خانم نے کئی سال ہوئے اپنی دکان بند کرلی ہے۔ ایسی چلمن ڈالی ہے کہ لوگ دیدار تک کو ترس جاتے ہیں۔ اب تو صرف ٹھمرا تاڑی ہی رہ گیا ہے۔ خیر اب بھی لوگ ہیں۔" وہ کسمسا کے بولا۔ "بازار کبھی بند نہیں ہوتا۔ اِس پنجرے میں روز نیا نیا پنچھی آتا ہے۔ ابھی بولو حضت! کہیں چلنا ہے؟" وہ زیرِ لب مسکراہٹ سے بولا۔ "آج کل تو بازار میں رونق آئی ہوئی ہے۔ کل ہی بنارس سے ایک نئی مینا آئی ہے۔"

"کیا یہ لڑکا رجّو، خانم کا بیٹا ہے؟"

تجمل کے استفسار پہ اُس نے منہ بنایا۔ "لوگ ایسا ہی بولتے ہیں۔ سُریلی خانم بھی اُسے بیٹا ہی کہتی ہے۔ ابھی کوئی ڈیڑھ سال ہوتے، بازار کے لوگوں نے اس لڑکے کو خانم کے ساتھ دیکھا تھا۔ ہوگا کسی نواب ہی کے نطفے سے۔ سُریلی نواب سے کم کسی آدمی کو گھاس نہیں ڈالتی... صورت شکل سے بھی رجّو نواب زادہ لگتا ہے۔ بچّو کی ناک ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔ کسی سے ملتا جلتا نہیں۔ زیادہ تر گھر میں پڑا رہتا ہے۔ خانم نے اُسے پڑھانے لکھانے کا بھی گھر ہی پہ انتظام کیا ہے۔ صبح ایک مولوی اور شام کو پتلون کوٹ پہنے ہوئے ایک عیسائی ماسٹر آتا ہے۔ عرصے سے خانم مہینوں مہینوں کے لیے بڑے بڑے راجوں مہاراجوں نوابوں کے بلاوے پہ گانے کے لیے جاتی رہی ہے۔ وہیں کسی نواب سے آشنائی ہو گئی ہوگی۔ لوگ بولتے ہیں کہ سُریلی نے اُسے اپنی ماں کے پاس بھوپال میں رکھا ہوا تھا۔ ماں مر گئی تو لڑکے کو پھر اِدھر اپنے پاس لے آئی۔ پہلے چھپاتی تھی۔ اب اُسے چھپانے کی ضرورت نہیں، نواب بہادر کے ہاں سے اُسے اتنا مل جاتا ہے کہ کئی پشتیں چلا سکتی ہے۔ کچھ چڑی مار یہ بھی بولتے ہیں کہ خانم کی جاتی جوانی نے انگڑائی لی ہے۔ لڑکے کو تیار کر رہی ہے۔ اندر کا حال نیلی چھتری والا جانتا ہے۔ لڑکے کی اُٹھان..."

"بس کرو۔" تجمل نے ترشی سے اُس کی بات کاٹ دی۔

"کیا حضت!" وہ ناگواری سے بولا۔ "آپ ہی کی بات کا جواب بول رہا تھا۔"

"کیا خانم اکیلی رہتی ہے؟" میں نے اضطراب سے پوچھا۔

لیکن تجمل اُس کا جواب سننے سے پہلے ہی اُٹھ گیا تھا۔ اُس نے کُرتے کے اندر بنڈی کی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کے اُس شخص کی ہتھیلی پہ رکھ دیا اور مٹھی بند کردی۔ وہ آدمی تیزی سے پلکیں جھپکانے لگا۔ اُس نے جھک کے دو مرتبہ ہمیں سلام کیا۔ ہم ہوٹل سے باہر آگئے تو وہ بھی تیزی کے ساتھ چبوترے سے کود گیا۔ "کہیں چلیے گا نہیں؟" وہ مذبذب سے بولا۔

"نہیں۔" تجمل نے سر جھٹک کے انکار کر دیا۔

"پھر رات کو آئیے گا؟" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

"ہاں، شاید آجائیں۔"

"میں اسی ہوٹل کے آس پاس ملوں گا۔" اُس نے گردن خم کرتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔ "نہیں نظر آؤں تو خلیفہ جا کے پوچھ لیجیے گا۔ یہاں سب لوگ بندے کو اسی نام سے پکارتے ہیں۔ منٹاں میں حاضر آجاؤں گا۔ لطف نہ آجائے تو گردن کٹا دیجیے گا۔ دیر تک یاد رکھیے گا کہ کسی خادم خلیفہ جمّا سے ملاقات ہوئی تھی۔" وہ اسی طرح کی باتیں کرتا ہوا ہمارے ساتھ چلتا رہا اور ہم سے ہوٹل کا پتہ پوچھنے لگا۔ تجمل نے کچھ نہیں بتایا اور جب برہمی کا اظہار کیا تو وہ واپس ہو گیا۔

△ ہم محبوب کی مہندی کے ملاقے سے نکل آئے۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ بس اسٹینڈ پہ آتے آتے کھمبوں کی روشنیاں جل گئیں۔ تجمل کے کُرتے کے دامن پہ جہاں گیر کے خون کے دھبّے پڑے ہوئے تھے۔ اُس نے

کپڑے بدل لیے اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ میں اُس کی صورت دیکھتا اور اپنی بوٹیاں نوچتا رہا۔ راستے بھر اُس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے اب اپنے آپ سے ڈر لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میرا سارا جسم کیچڑ میں سَنا ہوا ہے اور مکھیاں بھنک رہی ہیں۔ خانم کے ہاں جانے میں تجمل کے پس و پیش کی وجہ اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ شاید تجمل میرا لحاظ کر رہا تھا کہ وہاں جانے کے بعد مجھے اور نہ جانے کیا کیا دیکھنا اور سننا پڑے۔ کچھ وقت گزر جائے گا تو سب کچھ دیکھنے اور سننے کے لیے میری آمادگی بڑھ جائے گی لیکن تجمل کو یہ خیال نہیں رہا تھا کہ میرا سینہ بہت کشادہ ہے، وہ پھٹے گا نہیں۔ فتّی کو بھری محفل میں سولہ سنگھار کیے ہوئے بیٹھے دیکھ کے بھی میری آنکھوں نے بینائی نہیں کھوئی تھی۔

کمرے میں تجمل کی گہری سانسوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ ہمیں آئے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ جہاں گیر کا چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا، وہ مجھ سے چند ہی میل دُور تھا۔ اتنے لمبے سفر کے بعد کہیں اُس کی صورت نظر آئی تھی جب پیروں میں گٹّے پڑ گئے تھے اور اُمید کے چراغ کی لَو روز بہ روز کم ہوتی جا رہی تھی، اب بھی مجھے اُس کی صرف ایک جھلک نصیب ہوئی تھی۔ میں اُسے اچھی طرح دیکھ بھی نہیں سکا تھا۔ تجمل وہاں سے واپس چلا آیا تھا اور اب دوبارہ جانا ہوا بھی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ پاؤں پھیلائے پلنگ پہ لیٹا ہوا تھا لیکن سو نہیں رہا تھا۔ بہت دیر بعد اُس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور مجھے کرسی پہ بے حس و حرکت بیٹھا ہوا دیکھ کے کروٹ بدلنے لگا۔ "تو بھی کچھ کمر سیدھی کرلے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ میں نے ہنکاری بھری۔ وہ تھکے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ "کیا سوچ رہا ہے بے!"

"کیا سوچ سکتا ہوں۔" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا تمھیں اب بھی شبہ ہے کہ وہ جہاں گیر نہیں ہے؟"

"مجھے پہلے بھی شبہ نہیں تھا۔"

"تو پھر کیا ہے۔ تم وہاں سے واپس کیوں چلے آئے؟"

"اندھیرا ہو گیا تھا۔ اندھیرے میں وہاں جانا ٹھیک نہیں تھا۔"

"کیوں؟ کیا کوئی ہمیں روک لیتا۔"

"تیری تو مت ماری گئی ہے لاڈلے!" وہ اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ "جہاں گیر ایک گھر میں رہتا ہے، سڑک پہ نہیں۔ ہو سکتا ہے اس وقت خانم ملنے سے انکار کر دیتی اور اُسے معلوم ہوتا کہ ہم وہی لوگ ہیں جنھیں اُس نے تھوڑی دیر پہلے دیکھا تھا تو وہ شبہ کرتی۔"

"تو کیا ہوتا؟"

"کچھ نہ ہوتا، پر بہت کچھ ہو بھی سکتا تھا۔"

"کیا ہو سکتا تھا۔ ہم بتا سکتے تھے کہ ہم جہاں گیر سے ملنے آئے ہیں۔"

"لاڈلے! تو اب بڑا ہو گیا ہے، کیسی ننھی ننھی باتیں کرتا ہے۔" وہ جھنجلا کے بولا۔ "ابھی ہمیں صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ جہاں گیر، خانم کے ہاں رہتا ہے اور تُو نے خلیفے کی زبان سے سُن ہی لیا ہے کہ خانم اُس کا کتنا خیال رکھتی ہے۔ ہر آدمی زمین پہ اپنی جگہ گھیرتا ہے لاڈلے! کوئی بڑی کوئی چھوٹی۔ آدمی پیڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔ بیروا کسی کی جڑیں بہت پھیلی ہوتی ہیں، کسی کی اُوپر ہی اُوپر ہوتی ہیں۔ پیڑ اکھاڑنے سے پہلے اُس کی جڑوں کا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ ہمیں وہاں طریقے سے جانا چاہیے۔ لپڑ دھپڑ میں نہیں، سوچ سمجھ کے۔ کیا یہ ٹھیک ہوتا کہ ہم ایک دو گھنٹے بعد ہی وہاں چلے جاتے۔ خانم بازار میں بیٹھتی ہے۔ بازار کی عورت کی آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ فرض کر، خانم اُس وقت ملنے سے انکار کر دیتی تو کیا ہم چاقو نکال لیتے؟ فیل مچاتے؟ ننٹا کرتے؟ کیا اس طرح جہاں گیر پہ اچھا اثر پڑتا؟ جو باتیں سامنے کی ہیں، انھیں کیوں پوچھتا ہے۔ خانم کو شبہے میں ڈالنے سے بات خراب ہو سکتی تھی۔ زبردستی ایک ایسی عورت کی دہاڑی نہیں ہونی چاہیے جس نے جہاں گیر کو پناہ دی ہے اور اُسے اپنے بیٹے کی طرح رکھتی ہے۔"

"کیا معلوم، وہ کس طرح اُس کے پاس ہے۔"

"یہی بات تو میں تجھ سے بولنا چاہتا ہوں۔ ہمیں کچھ پتہ نہیں۔ پہلے ہمیں کچھ پتہ ہونا چاہیے۔ میں پہلے جہاں گیر سے ملنا چاہتا ہوں لیکن ہم وہاں جہاں گیر کے باہر نکلنے کی آس میں کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ جگہ دوسری ہے اور ہمارا مطلب کچھ اور ہے۔ اندھیرے میں اندھا ہی جا سکتا ہے۔ ابھی ہمیں نہ جانے اور کہاں کہاں جانا پڑے۔ وقت جیب میں رکھا ہوا نہیں ہوتا پر اسے جیب میں رکھے ہوئے پیسے سے زیادہ سنبھال کے خرچ کرنا پڑتا ہے۔ مجھے پتہ ہے لاڈلے! تیرے دل پہ آری چل رہی ہے، پر جانی! یہ آری تو چلتی رہے گی ساری زندگی ایسا ہی ہوتا ہے۔ سکھ پل بھر سے زیادہ نہیں ہوتا اور زندگی بس پل پل بھر ہوتی ہے۔ کچھ سمجھ آئی تیرے دماغ کی انگیٹھی میں؟"

میں چپ رہا۔ کچھ ایسی ہی باتیں میرے ذہن میں بھی آئی تھیں لیکن میرا دل نہیں مانتا تھا۔ ہو سکتا ہے، خانم نے جہاں گیر کو بہت کچھ سمجھ لیا ہو۔ مجھے اتی یاد آرہی تھیں۔ اتی کی رُوح بہت بے کل ہوگی۔

"لیکن خانم کے دروازے پہ جانے کے بعد کل بھی یہی صورت پیش آئی تو؟..." میں نے منتشر لہجے میں کہا۔

"شاید ایسا نہ ہو۔"

"فرض کرو، ایسا ہی ہوا؟"

"تو پھر کچھ اور سوچیں گے۔"

"جو کل سوچنا ہے، وہ ابھی کیوں نہیں سوچ لیتے؟"

"لاڈلے! کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے جہاں گیر کو کھوج لیا ہے۔

اور بھی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب میرا مغز مت کھا۔ جا کچھ آرام کر لے۔ کھانا نہیں کھائے گا؟ مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

"تم کھا لو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"چھوڑ، پھر میں بھی نہیں کھاتا۔"

"میرا جی بالکل نہیں چاہ رہا۔"

اُس نے چادر تان لی۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ بہت دیر ہو گئی۔ اُس نے کروٹ نہیں بدلی۔ میں نے دروازہ کھول کے بیرے کو آواز دی اور اُس سے کھانا لانے کے لیے کہا۔ کھانا آ گیا۔ میں نے اُسے اُٹھایا۔ وہ جاگ ہی رہا تھا۔ میں اُس کے ساتھ بیٹھ کے روٹی اپنے منہ میں ٹھونستا رہا۔ اُس نے فیرنی کی پلیٹ میرے آگے کر دی۔ میں نے بہ مشکل تمام اُسے بھی حلق سے اتار لیا۔ میری طرح وہ بھی ساری رات بستر پر کسمساتا رہا لیکن صبح کے قریب اُس کی آنکھ لگ گئی۔ بچھل نے میرے سوال کا صحیح جواب نہیں دیا تھا۔ یقیناً اُس کے ذہن میں کچھ اور اندیشے بھی پل رہے تھے۔ صبح ہوئی تو اس نے اُٹھنے میں دیر لگا دی حالانکہ وہ روز سویرے سویرے اُٹھ جاتا تھا۔ ہوٹل سے نکلتے نکلتے دھوپ چڑھ گئی۔ بس میں جانے کے بجائے اُس نے نام لیے بغیر محبوب کی مہندی کا وہ راستہ پیدل ہی طے کیا۔ ہم بازار میں داخل ہوئے تو دوپہر ہو چکی تھی۔ بچھل کا رُخ خانم کے مکان کی جانب تھا۔ اُس کی گلی میں پہنچتے ہی میرے پیروں میں لرزش ہونے لگی۔ سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔ رگوں میں ٹھنڈی بجلی سی دوڑنے لگی۔ بچھل کے اشارے پر میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ممکن ہے اندر سے جہاں گیر برآمد ہو جائے لیکن وہ نہیں آیا۔ جس شخص نے دروازہ کھولا تھا، وہ انھی میں سے ایک تھا جو کل خانم کے ساتھ دواخانے آئے تھے۔ ہمیں دیکھ کے اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھیل گئیں۔ اُس نے متجسس انداز میں ہمیں سلام کیا۔ "خانم ہیں؟" بچھل نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"خانم اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہیں۔"

"اُن سے بولو کہ دو پردیسی ملنے آئے ہیں، کچھ کام ہے۔"

"لیکن خانم نے ملنا جلنا بند کر دیا ہے۔" اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تم خانم کو جا کے بولو۔ ہم کو یہیں سے جواب مت دو۔"

"آپ وہی لوگ ہیں نا جنھوں نے کل رجّو میاں کی مدد کی تھی؟" اُس نے کسی قدر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کو خانم سے کیا کام ہے؟"

"اُن سے بولو کہ ایک ضروری کام ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ رجّو میاں خانم کے بیٹے نکلے۔ اب وہ کیسے ہیں؟"

"اچھے ہیں۔ ہلکا سا بخار ہے۔"

"پھر ہم انھیں بھی دیکھ لیں گے۔ جاؤ، تم کھڑے کیوں ہو؟" بچھل نے ترشی سے کہا۔ "ہمیں اُمید ہے کہ تم جا کے بولو گے تو خانم ہم سے ضرور ملیں گی۔"

"مگر... مگر میں اُوپر جا کے کیا بتاؤں۔ خانم ناراض ہوتی ہیں۔ آپ کام بتائیں، میں اُن سے جا کے بول دوں گا۔"

"کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے، ہم نے خانم کا بہت ذکر سُنا ہے۔ کیا وہ پردیسیوں سے ملنے سے انکار کر دیں گی؟ ہم خانم کا زیادہ وقت نہیں لیں گے اور نہ ہم خانم سے کل رجّو میاں کی مدد کرنے کی اجرت لینے آئے ہیں۔ اس بات سے بے فکر رہو۔"

"اب خانم کہیں آتی جاتی نہیں ہیں۔ اگر ایسا کوئی کام ہے تو میں یہیں سے جواب دے دیتا ہوں۔ خانم صرف چند خاص جگہوں پر جاتی ہیں۔"

"ہم کو یہ جان کاری ہو گئی ہے۔ ہم خانم کو کہیں چلنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ تم بحث مت کرو۔ اُن سے جا کے بولو کہ ہم حیدرآباد سے آئے ہیں تو اُن سے ملے بغیر نہیں جائیں گے۔"

اُس کے ہونٹ پچک گئے۔ اُس نے کھڑے کھڑے کئی پہلو بدلے اور دروازہ بند کر کے اندر چلا گیا۔ ہم باہر انتظار کرتے رہے۔ بے اختیار میں نے بچھل کا بازو پکڑ لیا۔ مجھے چکر سا آ رہا تھا۔ بچھل میری کمر تھپکنے لگا۔ واپس آنے میں اُسے کئی منٹ لگ گئے۔ اُس نے اندر آنے کے لیے راستہ چھوڑ دیا اور ہمیں ڈیوڑھی سے ملحق ایک بڑے کمرے میں بٹھا دیا۔ مونڈھے پر بیٹھ کے میری سانس پھولنے لگی۔ یہ ایک بڑا کمرہ تھا۔ خانم کے آدمی نے روشن دان کھول دیے۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ چھت اور دیواروں پر پچی کاری کی گئی تھی اور ان میں لگے ہوئے چھوٹے چھوٹے شیشے کے ٹکڑے روشنی میں چمکنے لگے تھے۔ سامنے ایک تخت پر قالین بچھا تھا اور گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ باقی تین اطراف مونڈھے اور آرام کرسیاں تھیں۔ تخت کے اُوپر دیوار میں گھڑی نصب تھی۔ وہ ٹک ٹک کر رہی تھی۔ بچھل میرے برابر ہی بیٹھا تھا۔ "لاڈلے! چاقو باز!" وہ سرگوشی میں بولا۔ "زبان اپنے منہ ہی میں رکھنا۔"

کوئی پندرہ منٹ بعد قریب ہی کہیں سے چوڑیاں بجنے کی آواز آئی۔ میں سنبھل کے بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد تخت کے قریب کے دروازے سے خانم نمودار ہوئی۔ اُس کے پیچھے وہ آدمی بھی تھا۔ خانم نے گردن خم کر کے اور ہاتھ اُٹھا کے آداب کیا۔ آج وہ کل سے بالکل بدلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سفید غرارہ اور نیلا جمپر پہنے ہوئے وہ کوئی ملکہ معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کا سر ہرے دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ کلائی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ کانوں میں آویزے لٹک رہے تھے۔ وہ پاؤں لٹکا کے تخت پر بیٹھ گئی۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اُس نے کئی بار ہم دونوں کو غور سے دیکھا اور اُس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم پھیل گیا۔ "معاف کیجیے، آپ کو زحمت ہوئی۔ کل میں رجّو میاں کو دیکھ کے بہت پریشان ہو گئی تھی، آپ کا شکریہ بھی ٹھیک طرح ادا نہیں کر سکی۔ اگر آپ وقت پر نہ پہنچ جاتے تو اُس کم بخت نے کسر کون سی چھوڑ دی تھی۔" وہ متانت سے بولی۔ اُس کی آواز بہت اچھی تھی۔

"ہم رجّو میاں کا شکریہ وصول کرنے نہیں آئے۔" بچھل نے ٹھیری ہوئی آواز میں کہا۔ "اُس وقت رجّو میاں کی جگہ کوئی اور ہوتا تب بھی شاید ہم یہی کرتے۔"

"اس محلّے میں کوئی اور ایسا نہیں کرتا۔" خانم افسردگی سے بولی۔ "مولا، رجّو سے خار کھاتا ہے۔ پہلے وہ یہیں میرے پاس ملازم تھا۔ بچپن ہی سے اُس نے عادتیں بگاڑ لیں۔ روز تنگ کرتا تھا۔ رجّو میاں ہر وقت اُس کی شکایت لے کے میرے پاس آتے تھے۔ میں نے اُسے نکال دیا۔ اُس وقت سے وہ اور شیر ہو گیا۔ میں کبھی رجّو میاں کو تنہا باہر نہیں بھیجتی تھی حالانکہ وہ اس بات سے بہت گھٹتا ہے۔ کہتا ہے آپی! میں بچہ تو نہیں ہوں، مجھے اکیلا جانے دیجیے مگر یہ ماحول تو آپ جانتے ہی ہیں۔ میں بھی نہ جانے کس مجبوری میں یہاں ٹکی ہوئی ہوں۔ جلد ہی یہاں سے نکل جاؤں گی۔ لوگ چین نہیں لینے دیتے۔ مولا کو اس علاقے کے ایک بدمعاش شاہ کبیرا نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ شاہ کبیرا بہت سنگ دل آدمی ہے۔ پہلے بھی وہ ایک بار مولا، رجّو کو پریشان کر چکا ہے۔ اس بار تو حد ہو گئی۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں۔ میں نے اپنے آپ کو اِس چار دیواری میں بند کر لیا ہے۔ دو ایک ہی جگہ آنا جانا ہوتا ہے۔ شاہ کبیرا مجھ سے اس بات پر بدظن ہے کہ میں اُس کے بلاوے پر اُس کے گھر کیوں نہیں جاتی۔ میں نے کئی بار عاجزی سے کہا کہ مجھے اب معاف کر دو لیکن یہاں اس علاقے میں شاہ کبیرا کا حکم چلتا ہے۔ وہ تو کچھ نواب بہادر کی بات ہے اور کچھ میں بھی ان لوگوں کا خیال رکھتی ہوں۔ بہت مشکل سے زندگی بسر ہو رہی ہے۔" وہ جھرجھری لے کے بولی۔ "معاف کیجیے، میں نے ایک ساتھ اتنی باتیں کر لیں اور آپ سے کچھ پوچھا بھی نہیں۔ بس دل بھرا ہوا تھا، زبان نہیں رکی۔ ارے شجاعت میاں!" اُس نے اپنے ساتھ آنے والے آدمی کو مخاطب کیا۔ "ٹکر ٹکر میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو، مہمانوں کے لیے کچھ چائے وغیرہ کا انتظام کرو۔ یہ تو کھانے کا وقت ہے۔ آپ لوگوں نے ابھی کھانا تو نہیں کھایا ہوگا؟"

"نہیں نہیں۔ کھانے وانے کا تکلف مت کرو سُریلی خانم! ہاں، چائے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" بچھل نے نرمی سے کہا۔

شجاعت اُٹھنے لگا تو خانم کی آواز نے اُسے پھر روک لیا۔ "خاص دان بھی لیتے آئیو اور ذرا ادھر شبنم سے کہہ دو کہ وہ رجّو میاں کو دوا دے دے۔ وقت ہو گیا ہے۔"

شجاعت کو حکم دینے کے بعد وہ ہماری طرف متوجہ ہوئی لیکن اُس کے کچھ کہنے سے پہلے بچھل نے کہا۔ "کیا رجّو میاں کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟"

"نہیں، خدانخواستہ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے مگر احتیاط بہتر ہے۔ اچھا ہے، دو تین خوراکیں پی لیں۔ یہ انگریزی دوا اثر بھی تیز کرتی ہے۔ کل تک اللہ نے چاہا تو بھلا چنگا ہو جائے گا۔"

"تم رجّو میاں سے بہت پیار کرتی ہو۔"

"رجّو میاں میری زندگی ہے۔" وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔ "اُس کے لیے میں نے اپنے آپ کو محدود کر لیا ہے۔ نواب بہادر کے بڑے احسانات ہیں اس لیے میں اُن کا کہنا نہیں ٹال سکتی۔ رجّو میاں کے بعد مجھے کوئی شے عزیز ہے تو صرف موسیقی۔ میں اب بھی ریاض کرتی رہتی ہوں لیکن میں نے نواب بہادر سے کہہ دیا ہے کہ میری جائیداد کا انتظام کر دیجیے۔ اب میں رجّو میاں کو لے کے زیادہ دنوں تک اس ماحول میں نہیں رہ سکتی۔ وہ ٹال رہے ہیں۔ ایک دن ضرور آمادہ ہو جائیں گے۔ پھر مجھے کچھ سکون مل جائے گا۔"

"رجّو میاں! تمھارے.... تمھارے...." بچھل نے جھجک کے کہا۔

"وہ میرا بیٹا ہے۔" خانم نے تیزی سے اُس کی بات مکمل کر دی۔ "مجھے آپی کہتا ہے۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ یوں تو اپنے بچّوں کی سبھی تعریف کرتے ہیں۔"

"وہ بہت اچھا ہے اور جی دار بھی ہے۔ مولا اُس سے ڈیڑھ گنا ہے، پر رجّو خوب زور کر رہا تھا۔"

"جی کی کیا پوچھیے، بس جی ہی جی ہے۔ دھان پان ہے اور روز بہ روز بانس ہوتا جا رہا ہے۔ میں کہتی ہوں تم ذرا اپنی جان بناؤ۔ تب یہ جی داری بھی اچھی لگے گی، مسکرا کے خاموش ہو جاتا ہے۔ کھانا تو بہت ہی کم کھاتا ہے۔ ہر وقت کچھ سوچتا رہتا ہے۔"

"کیا سوچتا رہتا ہے؟" بچھل نے تجسس سے پوچھا۔

"معلوم نہیں کن خیالوں میں گم رہتا ہے۔ میں ایک بار شملے گئی ہوں۔ سوچتی ہوں کچھ دنوں کے لیے اُسے وہیں لے جاؤں گی لیکن یہاں سے تو جان چھوٹے۔" وہ کچھ کھو سی گئی پھر چونک کر بولی۔ "ارے میرا دماغ بھی ٹھکانے نہیں ہے۔ میں نے آپ سے پوچھا ہی نہیں کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"ہم کلکتے سے آئے ہیں۔" بچھل نے آہستگی سے جواب دیا۔

"کلکتے سے۔" اُس نے دہرایا۔ "کہیے، کیسے زحمت کی؟"

"بس خانم، تم سے ملنے چلے آئے۔" بچھل نے لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ "تمھارا بہت چرچا سُنا تھا۔"

"میرا کیا چرچا، رسوائی کا ذکر سُنا ہوگا۔"

"رسوائی کیسی، ہم ان باتوں کو نہیں مانتے۔ جو جہاں ہے، پتہ نہیں وہ وہاں کیوں ہے۔ خانم! تم بہت سمجھ دار عورت ہو۔ تمھارے رنگ روپ کی طرح تمھارا دل بھی صاف ہے۔ تمھیں دیکھ کے اور مل کے اچھا لگا۔"

"آپ کا حسنِ نظر ہے۔" خانم کی نظریں جھک گئیں۔ سر سے اُس کا

دوپٹا ڈھلک گیا تھا، وہ اُس نے فوراً درست کرلیا۔ "آپ لوگوں کا شغلہ؟ یہاں کہاں قیام ہے؟ حیدرآباد کب آنا ہوا؟ مجھے بھی اتنی دیر بعد یہ باتیں سوجھ رہی ہیں۔"

"یہاں آئے ہوئے کئی دن ہو گئے۔ ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے ہیں اور رہا کام۔۔! تو خانم کام نہ پوچھو تو بہتر ہے۔"

"کیوں؟ بھلا آپ ایسا کون سا کام کرتے ہیں؟"

"ابھی تو گلی گلی گھومنا ہی کام ہے۔"

"دُنیا کی سیر کر رہے ہیں۔ سب سے خوب صورت کام ہے۔"

"ہاں دُنیا دیکھ رہے ہیں۔"

"یوں آپ کا مستقل مشغلہ؟ اگر بتانا مناسب سمجھیں؟"

"کیا بولیں۔ نہ پوچھو تو اچھا ہے۔ کبوتر اُڑاتے ہیں۔ بازیاں کھیلتے ہیں زور آزوری اپنا کام ہے۔ جہاں زبان کام نہیں کرتی، وہاں ہتھیار چلاتے ہیں۔ بس یہی اُچھل کود آنکھ مچولی کرتے رہتے ہیں۔"

"خوب! ضرور کوئی جاگیردار ہوں گے۔ آپ بہت بذلہ سنج ہیں۔ سب کچھ بتا کے بھی کچھ نہیں بتایا اور یہ آپ کے ساتھ کون صاحب ہیں؟"

"یہ میرا رجّو ہے۔" بجّل نے میری کمر پہ دھپ مارتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔" وہ کسی قدر تعجب سے بولی۔ "یعنی یہ آپ۔۔۔ یہ آپ کے۔۔۔"

"تم اسے یہاں میرے ساتھ دیکھ کے حیران ہو گی پر جو لوگ آگے پیچھے اور ایک دوسرے سے چھپ کے کہیں آتے ہیں، وہ ساتھ آئیں تو کیا بُرا ہے۔ میرا اس کا معاملہ کچھ دوسرا ہے خانم!"

"جی۔!" خانم کی آنکھیں جلنے بجھنے لگیں۔

"اسے اچھی طرح دیکھو خانم! میں اسے تمھارے سپرد کرنے آیا ہوں۔"

"میرے سپرد کرنے؟"

"ہاں خانم! اسے بھی رجّو میاں کی طرح سمجھ لو۔ ساری بات سمجھنے ہی کی ہوتی ہے۔ اس کی بہت سی عادتیں رجّو میاں سے ملتی جلتی ہیں۔ یہ بھی اُلجھا اُلجھا رہتا ہے۔ ہر وقت سوچتا رہتا ہے۔ تم نے غور نہیں کیا کہ اس کی پیشانی اور آنکھیں رجّو میاں سے کتنی ملتی ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" خانم نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"میں کوئی بہت عجیب بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تمھارے رجّو کے لیے ایک تحفہ لایا ہوں۔ وہ اسے دیکھ کر خوش ہو گا۔ یہ بھی رجّو کے لیے کل سے مچل رہا تھا۔ یہ بھی اچھا لڑکا ہے۔ ذرا ضدی اور نٹ کھٹ ہے۔ غصہ جلدی آجاتا ہے۔ یہ دونوں مل جائیں گے تو شاید ان کی تنہائی دور ہو جائے گی۔"

"بخدا! میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ان حالات میں، میں یہی بول سکتا ہوں خانم! میں نے اس پر بہت سوچا اور یہی فیصلہ ہوا کہ میں اپنے لاڈلے کو تمھارے سپرد کردوں۔ یہ ایک سے دو ہو جائیں گے۔ تمھارے دو جوان بیٹے۔ کیا یہ بات اچھی نہیں ہو گی؟ خانم! مجھے پتہ ہے کہ تم رجّو کے لیے کیا کیا سوچتی ہو گی۔ اُس کی خوشی کے لیے تم بڑے سے بڑا کام کرسکتی ہو۔ رجّو میاں کو بھی بلا لو اور پوچھو کہ کیا اُسے یہ دوسرا بھائی پسند ہے؟ میرا خیال ہے، وہ انکار نہیں کرے گا۔"

خانم کا چہرہ لال ہو گیا۔ "خدا کے لیے آپ صاف صاف بات کیجیے۔" وہ لرزیدہ آواز میں بولی۔ وہ کبھی مجھے دیکھتی تھی، کبھی بجّل کو۔

"میں بہت صاف بات کر رہا ہوں خانم! اس میں کوئی لاگ لپیٹ، چھل فریب نہیں ہے۔ میری بات پر یقین کرو۔ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں، میں اپنے اوسان میں ہوں۔ میں تم سے یہ نہیں بول رہا ہوں کہ تم رجّو میاں کو میرے حوالے کردو۔"

اُسی لمحے شجاعت رنگین خوان پوش سے ڈھکی ہوئی تھالی ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے اندر آیا۔ اُس نے تھالی خانم کے آگے رکھ دی۔ وہ ابھی کرسی پر بیٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ خانم نے اُسے کمرے سے باہر جانے کا حکم دے دیا۔ شجاعت چلا گیا تو وہ سراسیمہ آواز میں بولی۔ "بے شک آپ یہ نہیں کہہ رہے ہیں مگر کوئی اس طرح کیسے کہہ سکتا اور کرسکتا ہے۔"

"جس طرح میں کہہ رہا ہوں اور کر رہا ہوں۔"

"معاف کیجیے۔" وہ ترشی سے بولی۔ "یہ دل آزاری ہے۔"

"نہیں خانم! ایسا مت بولو، ایسا نہیں ہے۔ ہم کل رات بھی تمھارے پاس آسکتے تھے پر نہیں آئے۔ مجھ کو شبہ تھا کہ اس وقت تم شاید نہ ملو اور گھبرا کے کوئی ایسا قدم نہ اُٹھا لو جو رجّو میاں کے لیے، اُدھر اپنے لاڈلے کے لیے اور خود تمھارے لیے اور پریشانیاں کھڑی کردے۔ ان معاملوں میں ایسی گھبراہٹیں ہو جاتی ہیں۔ پھر بولو۔ میری کیا کوشش ہونی چاہیے تھی کہ مجھے تم سے بات کرنے اور تم کو سمجھانے کا موقع مل جائے۔ خانم! تم رجّو میاں کو ہمیشہ دیواروں، پردوں اور پنجرے میں بند نہیں رکھ سکتیں۔ تمھیں اپنے اُوپر بھروسا ہونا چاہیے کہ تم نے رجّو میاں سے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ اُس کو سچ ہی سچ دیا ہے۔ اب ایک اچھی صورت سامنے آئی ہے۔ ذرا سوچو، رجّو میاں کتنے خوش ہوں گے اور اسے دیکھو یہ مائی کا لال کتنا بے تاب ہے، رجّو میاں شریف زادے ہیں۔ وہ اُس عورت کو کیسے بھول سکتے ہیں جس نے اُن کے سکھ کے لیے اپنے سکھ جلا دیے ۔۔۔۔ خانم! بھلا اس میں جھجکنے اور گھبرانے کی کیا بات ہے؟"

خانم کی آنکھیں ساکت ہو گئیں۔ اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔

"رجّو میاں کو بلاؤ خانم! بلاؤ خانم! اُسے آواز دو۔" خانم نے اپنا چہرہ چھپا لیا اور سسکنے لگی۔

"میں تم سے رجّو میاں کو لینے نہیں آیا ہوں۔" بجّل نے کہا۔ "میں نے پہلے بول دیا ہے۔ تمھیں پتہ نہیں، ہم کہاں کہاں سے گھومتے ہوئے آئے ہیں، کچھ میرے لاڈلے کا بھی خیال کرو، رجّو میاں کی خاطر۔ اُس کی خاطر تمھارے لیے ہر بات سے بڑی ہے۔"

"کیا۔۔۔ کیا یہ رجّو میاں کے؟۔۔۔" خانم پھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"ہاں خانم!"

"مگر۔۔۔ مگر رجّو میاں نے مجھے کبھی نہیں بتایا؟"

"یہ بھی کسی کو کچھ نہیں بتاتا تھا۔"

خانم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ چند لمحوں تک خاموشی طاری رہی۔ خانم پتھر کی طرح گنگ ہو گئی تھی۔ بجّل کی آواز پہ وہ جیسے سوتے سوتے چونک پڑی۔ "کیا سوچنے لگیں خانم؟"

"کچھ نہیں۔" وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

"کیا مجھے کچھ اور بولنے کی ضرورت ہے؟"

"نہیں نہیں۔" خانم نے روتے ہوئے کہا اور ایک دم تخت سے اُٹھ گئی۔ اُس نے دوپٹے کے پلّو سے آنسو پونچھے اور بوجھل قدموں سے اندر چلی گئی۔ میری سانس سینے میں اٹکنے لگی اور آنکھوں کے سامنے دُھندسی چھانے لگی۔ بجّل نے میرا سر پکڑ کے جھنجوڑ دیا۔ خانم فوراً ہی واپس آگئی۔ اُس کا سر جُھکا ہوا تھا۔ جہاں گیر اُس کے ساتھ نہیں تھا۔

"چائے بناؤ خانم!" بجّل نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

خانم نے ہڑبڑا کے کسی معمول کی طرح تھالی سے سرپوش ہٹایا۔ اُس کی اُنگلیاں لرز رہی تھیں۔ اُس نے پھلوں، خشک میووں اور نمکین چیزوں کی پلیٹیں ہمارے سامنے رکھ دیں اور چائے بنانے لگی۔ خانم شکر گھول رہی تھی۔ اندر سے دفعتہً کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ جہاں گیر ہی تھا۔ وہ تیزی سے آرہا تھا مگر ہمیں دیکھ کے ٹھٹک گیا۔ پھر اُس نے ہم دونوں کو سلام کیا اور خانم کے برابر تخت پر بیٹھ گیا۔ "کیوں آپی! " اُس نے تیز لہجے میں پوچھا۔ "آپ نے مجھے بلایا تھا؟"

"ہاں!" خانم نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ صاحب تم سے بات کرنا چاہتے تھے۔" خانم نے نگاہیں اُٹھا کے ہماری جانب اشارہ کیا۔

"اچھا۔" وہ کچھ مضطرب سا ہو گیا۔ "مگر آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ کچھ پریشان پریشان ہیں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" خانم نے مرتعش ہونٹوں سے مسکرانے کی کوشش کی۔ "تم مہمانوں سے بات کرو۔ دیکھو، یہ کہتے ہیں، یہ تمھارے لیے ایک اچھی خبر لائے ہیں۔"

"کیسی خبر۔" وہ مچل کے بولا۔ "ضرور مولا کی بات ہو گی مگر آپی! میں اُس سے خود نمٹوں گا ورنہ۔۔۔ ورنہ مجھے۔" وہ ہمیں دیکھ کے کچھ کہتے کہتے چُپ ہو گیا اور چند ثانیے ٹھیر کے بولا۔ "مگر آپ کیا خبر لائے تھے؟"

"خبر کیا، ہم تو تمھیں دیکھنے آئے تھے رجّو میاں!" بجّل نے کہا۔ "اِن سے ملو، یہ لاڈلا ہے۔ میں تمھیں اِس سے ملانے لایا تھا۔ کل سے جب سے اس نے تمھیں دیکھا ہے، یہ تمھارا حال پوچھنے اور تمھیں دیکھنے کو کہہ رہا تھا۔"

"اچھا۔" وہ پٹ پٹاتی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ "میرا جی خود بھی ان سے ملنے کو چاہ رہا تھا۔ میری وجہ سے انھیں بہت تکلیف ہوئی۔ مولا نے ان کی کمر میں کئی بار زور سے سر مارا تھا اور اُس نے آپ پر بھی ہاتھ اُٹھایا تھا۔ میں نے آپی سے رات بھی کہا تھا، آپی افسوس کر رہی تھیں۔ آپ کو کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں رجّو! ویسے اپنے سارے گریبان رفو کیے ہوئے ہیں۔"

"ہاں۔" وہ حیرت سے بولا۔ "پھر آپ ہر جگہ اسی طرح درمیان میں آجاتے ہوں گے۔ کیا پہلے بھی آپ کو مولا جیسے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے؟" بجّل آہستہ آہستہ سر ہلانے لگا۔ جہاں گیر جوشیلے لہجے میں بولا۔ "مگر مولا ذلیل ہے، وہ بدمعاش ہو گیا ہے۔ کسی دن میں اُسے۔۔۔ میں اُسے۔۔۔"

"جانے دو اس ذکر کو رجّو میاں! اتنا غصے نہیں ہوتے۔ اُسے معاف کردو۔" بجّل کی آواز اُس پہ غالب آگئی۔ "یہ بتاؤ کہ تمھارا پورا نام کیا ہے؟"

"پورا نام؟" وہ سٹ پٹا کے بولا۔ "ظفر علی۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا مگر جہاں گیر نے اپنا نام ظفر علی ہی بتایا تھا۔ میں نے بے چینی سے بجّل کو دیکھا۔ وہ پُرسکون تھا۔

"اور ابّا کا نام؟" بجّل نے مسکرا کے پوچھا۔

"کیوں۔؟" وہ تندی سے بولا۔ "یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"یوں ہی، ممکن ہے، وہ ہمارے کوئی جاننے والے ہوں۔"

"یہ آپ کیسے کہہ رہے ہیں؟"

"کیا تمھارے ابّا سے ہماری جان پہچان نہیں ہوسکتی، ذرا بتاؤ تو۔۔۔"

"منوّر علی۔" اُس نے تیزی سے کہا۔ میرا سر پھٹنے لگا۔

"کیا کہا؟ صفدر علی؟" بجّل نے پوچھا۔

"جی۔۔۔ جی نہیں۔" وہ حواس باختہ سا ہو گیا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولا۔ "منوّر علی۔ میں نے منوّر علی کہا ہے۔"

"میں نے سُن لیا ہے۔ کوئی بات نہیں۔" بجّل نے ہنس کے کہا اور میرا شانہ پکڑ کے بولا۔ "چلو بابر زماں خاں! یہ جہاں گیر نہیں ہیں، یہ تو رجّو میاں ہیں۔"

جہاں گیر اُچھل کے تخت سے کھڑا ہو گیا۔ "کیا یہ۔۔۔۔ یہ بابر زماں خاں ہیں؟" اُس کی آواز بھرّا رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ آندھی کی طرح مجھ پہ جھپٹا اور میرے قریب آ کے مجھے گھورنے لگا۔ اُس کی

آنکھیں اُلٹ گئی تھیں۔ وہ چکرا کے گرا ہی چاہتا تھا کہ میں نے بڑھ کے اُسے سنبھال لیا اور اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میرا سینہ گرجنے لگا۔ میں نے اپنے ہونٹ کاٹ لیے لیکن مجھے خود پہ اختیار نہیں رہا۔

پتہ نہیں کتنی دیر بعد خانم نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا۔ جہاں گیر کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ اُس کا چہرہ شرابور تھا۔ وہ ہڑک رہا تھا۔ کبھی میرے ہاتھ چومتا تھا، کبھی انھیں آنکھوں سے لگاتا تھا۔ میں اُسے نوچ کھسوٹ رہا تھا۔ خانم ہماری کمر پہ ہاتھ رکھے ہوئے ہمیں تخت پر لے آئی۔ اُس نے اپنے دوپٹے سے میرا اور جہاں گیر کا چہرہ خشک کیا۔ جہاں گیر نے اُس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور زار و قطار رونے لگا۔ خانم اُسے سمجھانے لگی۔ اُس نے ہم دونوں کو پانی پلایا اور ہمارے سر اپنے سینے پر رکھ کے خود بھی سسکنے لگی۔

تجّل اور خانم کی موجودی میں جہاں گیر نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا اور نہ خود کچھ بتایا۔ وہ تو بار بار میری صورت دیکھتا اور سکتے میں رہ جاتا تھا۔ اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ میں ہوں۔ اس کی تصدیق کے لیے اچانک وہ میرے ہاتھ زور سے پکڑ لیتا اور میرے سینے سے چمٹ جاتا۔ جو اُس کا حال آج تھا، وہ میرا کل سے تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں میں آنسو کب سے بند کر رکھے تھے۔ تمام رات بستر پہ لوٹتا رہا تھا، تمام رات میں نے اُس کی آہٹیں محسوس کی تھیں۔ خانم ہمیں اوپری منزل کے ایک آراستہ کمرے میں لے آئی۔ اُس نے شجاعت کو حکم دیا کہ وہ ہمارا سامان ہوٹل سے لے آئے۔ تجّل نے منع نہیں کیا۔ نہ جانے کس وقت خانم نے ڈھیر ساری مٹھائی منگوالی تھی۔ نیاز کے بعد اُس نے ہم سب کا منہ میٹھا کرایا۔

خانم اور تجّل کمرے سے چلے گئے تو جہاں گیر میری صورت دیکھ کے پھر بلکنے لگا۔ میں نے اُس کا سر اپنی گود میں چھپا لیا۔ اُسے چپ کرانے کی میں نے بہت کوشش کی مگر اُس کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ "چپ ہو جا منے! میں اب آگیا ہوں۔" میں اُسے جتنا سمجھانے کی کوشش کرتا، اُس کی آنکھیں اتنی ہی اُمڈ آتی تھیں۔ اتنا تو مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خانم کے ساتھ گھر میں اکیلا ہے۔ میرے ذہن میں اور بے شمار باتیں بھی منڈلا رہی تھیں مگر میں نے جہاں گیر سے کچھ پوچھنے کی جلدی نہیں کی۔ اُس کے جوابات سے مجھے ڈر لگتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے اُسے کریدا تو سب سے پہلے وہ مجھ سے پوچھے گا کہ میں ان سب کو چھوڑ کے گھر سے کیوں چلا گیا تھا۔ میں اُسے کیا بتاتا کہ وہ جو ایک خوف زدہ سی گڑیا اُس رات گھر میں اُتری تھی، وہ مجھے لے گئی تھی۔ وہ روٹھ کے کہیں چلی گئی، مجھے اکیلا چھوڑ گئی۔ میں منے کو کیا بتاتا کہ میں کہاں رہا، میں نے اتنے بہت سے دن کہاں گزارے۔ منا کسی کو راکو لے کے گھر سے نکلتا تو میری بات اُس کی سمجھ میں آتی۔

میرے کان سن ہو گئے جب جہاں گیر نے ہچکیوں کے دوران میں خود ہی مجھے بتانا شروع کیا کہ اُس کے ساتھ کیا کچھ پیش آیا۔ وہ کوئی تین سال پہلے گھر والوں سے بچھڑ گیا تھا۔ ایک سال وہ شہروں شہروں گلی گلی انھیں ڈھونڈتا رہا۔ پھر اُس کے پیروں نے جواب دے دیا اور وہ بھوپال کے ایک نواب کے ہاں ملازم ہو گیا۔ نواب اُس کا خیال رکھتا تھا۔ وہیں خانم سے اس کی ملاقات ہوئی اور خانم نے اُسے نواب سے مانگ لیا۔ اس کے بعد وہ خانم کے ساتھ یہاں آگیا۔ اس دوران میں بھی وہ مسلسل ابا جان کی تلاش میں لگا رہا مگر وہ اُسے کہیں نظر نہیں آئے۔ ابا جان نے اُس کے گھر واپس آنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ وہ میرٹھ میں تھے کہ ایک دن جب وہ گھر کے کسی کام سے باہر نکلا تو شہر میں ہلڑ مچ گیا۔ ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ جہاں گیر کو گھر جانے کا راستہ نہیں ملا۔ پولیس نے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ شہر میں گولیاں چل رہی تھیں اور چاقو گھونپے جا رہے تھے۔ جہاں گیر پولیس اور بلوائیوں کے ڈر سے شہری حدود سے باہر آگیا۔ وہاں سے اُسے ایک متعصب بلوائی بہ جبر اپنے گھر لے گیا۔ اُس نے جہاں گیر کو سخت اذیتیں پہنچائیں۔ اُسے تین دن تک بھوکا رکھا اور ننگا کر کے بید سے مارا۔ وہ اُسے مذہب بدلنے پر مجبور کرتا تھا مگر ایک دن جب اُس بلوائی کو پولیس پکڑ کے لے گئی تو جہاں گیر کو وہاں سے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ اس اثنا میں ابا جان گھر چھوڑ کے جا چکے تھے۔ وہ محلّے میں ہر ایک سے اُن کا پتہ پوچھتا پھرا لیکن ابا جان محلّے میں کسی سے ملتے ہی نہیں تھے۔ وہ اپنا پتہ بتا کے بھی نہیں گئے۔ انھوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ جہاں گیر فسادات میں مارا گیا۔ ممکن ہے انھوں نے اُسے تلاش کیا ہو مگر جب اُس کا کوئی پتہ نہ چلا ہو تو مایوس ہو گئے ہوں۔ وہ کسی ایک جگہ نہیں ٹھہرتے تھے۔ تین مہینے اس شہر میں، چار مہینے اُس شہر میں۔ میرٹھ میں آئے ہوئے انھیں دو مہینے سے زیادہ نہیں ہوئے تھے۔ بمبئی میں مولوی اکرم نے جو باتیں ابا جان کے متعلق بتائی تھیں، جہاں گیر بھی وہی دہرا رہا تھا۔ ابا جان ایک کمرے میں بند ہو جاتے تھے اور دن بھر کاغذات پر جھکے انھیں پڑھتے یا کچھ لکھتے رہتے تھے۔ اُن کے اِرد گرد موٹی موٹی کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کھانے پینے کا انھیں کوئی ہوش نہیں تھا۔ گھر کا کوئی فرد اُن سے شکایت کرتا تو وہ ہمیشہ یہی کہتے کہ بس چند دنوں کی بات اور ہے پھر سارے دُکھ دُور ہو جائیں گے، ہم ایک محل بنائیں گے، آگے پیچھے ملازموں کی فوج ہو گی۔ ایک دن آئے گا کہ ہمیں دنیا میں کسی چیز کی کمی نہیں ہو گی۔ ابا جان رات کو دیر سے کمرے سے نکلتے اور پلنگ پر آ کے بھی یا تو گم سم رہتے یا بڑبڑاتے رہتے۔

جہاں گیر نے نیچی نظروں اور دبے دبے لہجے میں مجھے فمی کے گھر سے غائب ہو جانے کا واقعہ بھی بتایا۔ ابا جان اُس کے بعد بہت چڑچڑے ہو گئے تھے۔ ہمیشہ فرخ، فریال اور فارعہ کر جھڑکتے رہتے تھے۔ اکبر اُن کے سامنے جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ انھوں نے اسکول کی کتابیں گھر میں لا کے رکھ دی تھیں اور کہا تھا کہ وہ خود پڑھایا کریں گے مگر انھیں کبھی فرصت نہیں ملی۔

پہلے فمی سب بہن بھائیوں کو پڑھاتی تھی۔ وہ چلی گئی تو یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ ابا جان کبھی کبھی گھر سے نکلتے تھے۔ واپس آتے تو اُن کے ساتھ کتابوں کا ڈھیر ہوتا۔ وہ کتابیں گھر میں اُن کے سوا کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ کبھی واپس آتے تو اُن کی جیب میں ایک بڑی رقم ہوتی۔ فرخ اور فریال دس بار اُن سے کہتیں کہ پیسے ختم ہو گئے ہیں تو وہ کان دھرتے اور ایک پہر کے لیے گھر سے نکل جاتے۔ اُن کا خط بڑھ جاتا تھا، کپڑے گندے ہو جاتے تھے انھیں خبر ہی نہیں ہوتی تھی۔ گھر میں سب کو ہدایت تھی کہ پڑوسیوں سے زیادہ میل جول نہ رکھا جائے۔ کوئی ملنے آئے تو اُسے دروازے ہی سے ٹال دیا جائے۔ انھوں نے فرخ، فریال اور فارعہ پر کڑی پابندیاں عاید کر دی تھیں۔ جس محلّے میں وہ رہتے، لوگ انھیں شک کی نظروں سے دیکھتے۔ کئی مرتبہ سب نے طے کیا کہ اب کے ابا جان باہر جائیں گے تو وہ یہ کاغذات جلا دیں گے پھر نہ کاغذات ہوں گے، نہ ابا جان ان میں سر کھپائیں گے مگر ابا جان کے خوف کی وجہ سے کوئی ایسا نہیں کر سکا۔ انھوں نے بہت دعائیں مانگیں۔ فرخ ہر نماز کے بعد دعا مانگتی تھی، اُس نے بہت سی منتیں بھی مان رکھی تھیں۔ ابا جان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ وہ روز بہ روز اور زیادہ مستغرق رہنے لگے۔ بار بار گھر اور شہر بدلنے کے سبب اُن کے پاس سامان بھی بہت کم رہ گیا تھا۔ ابا جان کی رازداری کے خیال سے جہاں گیر نے خانم کو اپنا صحیح نام نہیں بتایا تھا۔ ابا جان کا نام بھی غلط بتایا تھا اور اپنے گھر سے بچھڑنے کی ایک فرضی داستان سُنا دی تھی۔

جہاں گیر کہہ رہا تھا کہ وہ ان تین برسوں میں کبھی پوری نیند نہیں سویا۔ اُسے بُرے بُرے خواب آتے ہیں، راتوں کو وہ ہڑبڑا کے اُٹھ جاتا ہے اور چیخنے لگتا ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ سُریلی خانم ایک طوائف ہے اور گانا سنانے کے لیے نواب صاحب کے ہاں مہمان ہے لیکن ایک خانم ہی تھی جس نے اُس پر سب سے زیادہ توجہ دی۔ اُس نے اُس کے کپڑے بنوائے، ڈاکٹر سے علاج کرایا۔ وہ ہر وقت اُس کا خیال رکھتی تھی اسی لیے وہ خانم کے ساتھ چلا آیا۔ اُس کے کپڑے پھٹ گئے تھے اور جیب میں ایک دمڑی نہیں تھی۔ نواب صاحب کے ہاں سے اُسے کھانا مل جاتا تھا اور چار آنے روز۔ ان چار آنوں میں نہ تو وہ کہیں جا سکتا تھا، نہ آ سکتا تھا اور نہ پڑھ سکتا تھا۔ اُس نے پیسے جوڑ جوڑ کے رکھے۔ نواب صاحب کے بچے اُسے مارتے تھے۔ یہ سب خانم نے دیکھا تھا۔ جب خانم نے اُسے بلا کے اُس کے بارے میں پوچھا تو وہ رونے لگا۔ خانم نے اُسے بہت پیار کیا اور اُسی وقت کہا، "اب تم میرے ساتھ چلو گے۔" جہاں گیر خانم کی باتیں کرتے نہیں تھکتا تھا، جیسے میں اُسے ڈانٹوں گا کہ وہ ایک طوائف کے ساتھ کیوں چلا آیا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ فمی اُس کی بہن بھی ایک ناچنے گانے والی تھی اور اُس کا بڑا بھائی سات سال جیل میں گزار کے آیا تھا۔ اُس نے کئی قتل کیے تھے۔ اُس نے کلکتے کے ایک بہت بڑے بدمعاش موجدار کو ٹھکانے لگا دیا تھا اور وہ بمبئی شہر کے کئی پارٹوں کا استاد رہ چکا ہے۔ اُس کی جیب میں ہمیشہ ایک چاقو ہوتا ہے۔ جہاں گیر والہانہ انداز میں خانم کا ذکر کر رہا تھا۔ شاید وہ غیر شعوری طور پر مجھے یہ جتانا چاہتا تھا کہ میری زبان سے خانم کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے جس سے اُس کی سبکی ہو۔ کوئی بات ایسی نہ ہو کہ خانم کے سامنے اُسے سر اُٹھانے میں جھجک ہو۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اُس نے کئی دفعہ یہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا مگر خانم کے خیال سے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ نہ جانے آپی کیا سمجھیں۔ وہ بہت روئیں گی، کھانا پینا بند کر دیں گی۔ وہ آپی کی نظروں سے ذرا بھی دُور ہو جائے تو وہ پریشان ہو جاتی ہیں، اگر وہ کہیں چلا گیا تو آپی زندہ نہیں رہیں گی۔ اُس نے آپی سے بہت سے وعدے کیے تھے اور آپی نے اُس سے۔

جہاں گیر کہتا تھا کہ گھر میں بس کوئی دن ہی ایسا جاتا تھا جب میرا تذکرہ نہ ہوتا ہو۔ ابا جان نے تو میرے جانے کے چند دن بعد ہی مایوسی کا اظہار کر دیا تھا۔ کچھ دن اور گزر گئے اور میں گھر واپس نہیں پہنچا تو انھوں نے اعلان کر دیا کہ میں مر چکا ہوں، زندہ ہوتا تو ضرور واپس آجاتا۔ ابا جان کا خیال تھا کہ میں جس لڑکی کے ساتھ گھر سے نکلا ہوں، لوگ اُسے تلاش کر رہے ہوں گے اور اُس کے ڈھونڈنے والوں نے مجھے مار ڈالا ہو گا۔ وہ بتا رہا تھا کہ میرے جانے سے امّی کا بُرا حال تھا۔ وہ ابا سے ہمیشہ لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں۔ پھر ابا کاغذات میں گم ہو گئے اور انھوں نے بتدریج گھر میں دلچسپی لینا کم کر دیا۔ امّی ہر وقت اُن سے کہتی تھیں کہ وہ گھر کی طرف دھیان دیں اور میری تلاش کے لیے دوڑ دھوپ کریں مگر ابا جان کچھ دن تک تو مجھے اِدھر اُدھر ڈھونڈتے رہے، پھر گھر میں بند ہو گئے۔ انھوں نے رشتے داروں سے ملنا بھی منقطع کر دیا۔ امّی کی صحت گرتی گئی۔ وہ بہت دُبلی ہو گئی تھیں۔ ہر وقت مجھے یاد کرتی رہتی تھیں اور آسمان کی طرف دیکھتی رہتی تھیں۔ ساری ساری رات وظیفے پڑھتی تھیں۔ انھیں یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن میں ضرور واپس آجاؤں گا۔ پھر وہ ایسی بیمار پڑیں کہ پلنگ سے نہیں اٹھیں۔ آخری وقت بھی اُن کی زبان پر میرا ہی نام تھا۔ کہتی تھیں کہ بابر آئے تو کہنا تیری ماں نے بہت انتظار کیا۔ امّی کی موت کے بعد چند روز کے اندر اندر ابا جان نے زمینیں بیچ دیں۔ چپ چپاتے گھر کا سودا کر لیا۔ میں نے جہاں گیر کو روکا نہیں تاکہ جتنے طعنے دینے ہوں وہ ایک ہی بار دے لے۔ میں نے درمیان میں ایک بات بھی نہیں پوچھی۔ وہ خود ہی سب کچھ کہتا اور سینہ خالی کرتا رہا۔ امّی کے ذکر پہ اُس کی آواز حلق میں پھنس گئی، کہنے لگا "مجھے خوب یاد ہے، امّی نے آخری وقت میرا ہاتھ تھام کے کہا تھا کہ جب تک تیرا بڑا بھائی واپس نہیں آتا، تو اپنے آپ کو اس گھر کا رکھوالا سمجھنا، میں یہ سارا گھر تجھ پہ چھوڑ کے جا رہی ہوں۔ امّی نے سبھی کو تاکید کی تھی کہ اپنے باپ کا خیال رکھیں اور بھائی کو تلاش کرتے رہیں، ایک نہ ایک دن وہ ضرور مل جائے گا۔ وہ نہ آئے تو اُسے اپنی امّی کا واسطہ دینا۔ وہ کتنا

ہی روٹھا ہوا ہو واپس آجائے گا اور اُس کے ساتھ وہ لڑکی ہو تو اُسے عزت سے گھر لانا۔ امّی نے تمّی سے بھی کہا تھا کہ وہ اب اس گھر کی ماں بہن سب کچھ ہے۔ نہ تو تمّی، امّی کی بات پوری کر سکی نہ میں۔" جہاں گیر کہہ رہا تھا "پتہ نہیں اب وہ سب کہاں اور کس حال میں ہوں۔ اکبر بہت چھوٹا ہے گھر کا سودا کون لاتا ہوگا؟"

معلوم نہیں جہاں گیر نے اور کیا کیا کہا اور کتنے طمانچے مارے۔ میرے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ شاید اُس کی آواز میں بھی دم نہیں رہا تھا۔ وہ چپ ہو گیا اور میری صورت دیکھنے لگا۔ میری آنکھیں چھلک رہی تھیں اور جسم تھر سا ہو گیا تھا۔ "بھائی جان! آپ کہاں چلے گئے تھے؟" وہ سسکتے ہوئے بولا۔ میں نے اُسے جواب نہیں دیا۔ وہ مجھے جھنجوڑنے لگا۔ "آپ کیوں روٹھ گئے تھے؟"

"مت پوچھ منّے!" میں نے اُس سے فریاد کی۔ "کچھ نہ پوچھ، سمجھ لے کہ اس عرصے میں میں مر گیا تھا، میں دوبارہ زندہ ہوا ہوں۔"

جہاں گیر خاموش ہو گیا لیکن چند ہی لمحوں بعد سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ایک بات بتا دیجیے، وہ کہاں ہیں؟"

"وہ نہیں ہے۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ کھو گئی۔"

"کھو گئیں! کہاں؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم منّے! چپ ہو جا۔"

اُس نے پھر مجھے تنگ نہیں کیا، اپنی زبان سی لی۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ ہم دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ جہاں گیر نے اپنا سر میرے شانے پر ٹکا دیا تھا۔ خانم نے کمرے میں آ کے روشنی کی اور ہمیں اُٹھا کے کمرے سے باہر لے گئی۔

باہر کے کسی مکان سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ وقفے وقفے سے گھنگرو بجنے لگتے تھے اور طبلے کی تھاپ تیز ہو جاتی تھی۔ خانم کو اس کا احساس ہوا تو اُس نے کھڑکی بند کر دی۔ ہم سب اوپری منزل کے صحن میں بیٹھے تھے۔ وہاں کئی گملے رکھے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹا باغیچہ سا تھا۔ سائبان کے تھموں پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں اور رات کی رانی کی خوشبو سے فضا مہکی ہوئی تھی۔ ایک بوڑھی اور ایک نوجوان خادمہ سامنے چوکی پر بچھے ہوئے دسترخوان پر کھانا لگا رہی تھیں، طرح طرح کے کھانے۔ جہاں گیر کا چہرہ آنسوؤں سے دُھل سا گیا تھا جیسے کئی دنوں کی بارش کے بعد دھوپ نکلے۔ خانم نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ وہ نارنجی ساڑی میں ملبوس تھی اور خوش خوش نظر آ رہی تھی۔ خادماؤں کو ہدایت دینے کے کام سے فارغ ہو کے وہ میرے پاس آ بیٹھی اور چپکے چپکے جہاں گیر کی باتیں کرنے لگی۔ وہ مجھے بتا رہی تھی کہ اب جہاں گیر کی صحت بہت ٹھیک ہے۔ پہلے تو اُس کی ہڈیاں ہی ہڈیاں نظر آتی تھیں۔ اُس نے اُسے شہر کے سب سے بڑے ڈاکٹر، ڈاکٹر برہان کو دکھایا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اگر وہ کچھ اور دیر سے آتی تو جہاں گیر کو دق ہونے کا اندیشہ تھا۔ مجھ سے اُس کا شکریہ ادا نہیں کیا جا سکا۔ میری زبان سے ایک لفظ بھی نہیں چھوٹتا تھا۔ جب ہم کھانا کھانے کے لیے چوکی پر آئے تو وہ سمجھی کہ میں تکلف کر رہا ہوں۔ اُس نے مجھل سے میری شکایت کی۔ "ہاتھ پیر کھول لاڈلے!" وہ برہمی سے بولا۔

"ہاں! بھائی جان!" جہاں گیر چہک کے بولا۔ "میٹھے چاول کھائیے۔ آپ کو میٹھے چاول بہت پسند ہیں نا؟"

اُسے اب تک یاد تھا۔ امّی میرے لیے بطورِ خاص خشکے میں میٹھا ڈال دیا کرتی تھیں۔ ممکن ہے، فرخ نے اُسے بتایا ہو۔ خانم نے چاولوں کی تھال میرے آگے کر دی۔ میرے حلق میں لقمے اٹک رہے تھے اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے امّی آج ہی مری ہیں اور یہ اُن کی موت کا کھانا ہے۔

کھانے کے بعد خانم نے ہمیں قہوہ پلایا اور رات کو دیر تک وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ شہر میں اچھے گھریلو ملازموں کا قحط، ملازموں کے سلسلے میں اپنے تجربے۔ اُسے شکایت تھی کہ رواداری اُٹھ گئی ہے اور لوگ بہت سفلے ہو گئے ہیں۔ اُس نے میرا پلنگ بھی جہاں گیر کے کمرے میں بچھوا دیا تھا لیکن جہاں گیر میرے پلنگ پہ آ کے اور مجھ سے چمٹ کے لیٹ گیا۔ خانم شاید روزانہ اُس کی پیشانی پہ بوسہ دے کے رخصت ہوتی تھی۔ شب بخیر کہتے وقت اُس نے جہاں گیر کے ساتھ میری پیشانی پر بھی اپنے ہونٹ ثبت کیے اور مسکراتی ہوئی اوجھل ہو گئی۔ آدھی رات تک جہاں گیر خوابیدہ لہجے میں مجھے گھر کی باتیں سناتا رہا۔ پھر میرے بازو پر سر رکھ کے سو گیا۔ میں اُس کے بال سنوارتا اور اُس کا چہرہ تکتا رہا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ بالکل آٹھ سال پہلے کے منّے کی طرح، میں نے اُس کے بہت سے پیار لیے۔ مجھے یاد تھا کہ وہ سوتے میں ٹانگیں بہت مارتا تھا۔ جب وہ ایسا کرتا تو میں غصّے سے اُسے اُٹھا کے امّی کی چارپائی پہ ڈال دیا کرتا۔ اب بھی وہ ٹانگیں چلا رہا تھا۔ میں نے اپنا رُخ بدل لیا، اُس کی ٹھوکریں میرے منہ پر ہی لگنی چاہیے تھیں۔

ابھی ہر سو گہرا اندھیرا ہی طاری تھا کہ مجھے دروازے پر دستک کا احساس ہوا۔ میں یوں ہی آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ پہلے تو میں سوچتا رہا کہ اِس وقت کون ہو سکتا ہے۔ چوتھی پانچویں دستک پر میں نے اُٹھ کے دروازہ کھول دیا۔ وہاں خانم موجود تھی۔ "کیا وہ جاگ گیا ہے؟" اُس نے آہستگی سے پوچھا۔

"نہیں، وہ سو رہا ہے۔" میں نے تذبذب سے جواب دیا۔

وہ سیدھی کمرے میں چلی آئی اور جہاں گیر کے سرہانے بیٹھ کے اُس کے گال تھپ تھپانے لگی۔ جہاں گیر فوراً ہی اُٹھ گیا۔ "آپی! آج تو نیند آ رہی ہے۔" اُس نے خانم کے گلے میں بانہیں ڈال کے کسمساتے ہوئے کہا۔

"نہیں، بالکل نہیں، شجاعت اُٹھ چکا ہے۔ بستر چھوڑو گے تو نیند بھاگ جائے گی۔ بس جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" خانم نے اُس کے بازو ہلاتے ہوئے

اُسے بستر سے اُٹھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پوری طرح بیدار ہو گیا تو خانم چلی گئی۔ جہاں گیر نے مجھے جاگتا دیکھ کے سو جانے کا مشورہ دیا اور کہا کہ وہ ایک دو گھنٹے بعد واپس آ جائے گا۔ اُس نے بتایا کہ وہ روز صبح کسی ملازم کے ساتھ چہل قدمی کے لیے جاتا ہے۔ جب وہ نہا دھو کے باہر آیا تو میں بھی تیار ہو گیا تھا۔ میں نے شجاعت کو منع کر دیا اور اُسے اپنے ساتھ لے کے گھر سے نکل گیا۔ ہم چار مینار تک آ گئے۔ اُس کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے مجھے اپنا قد بڑا اور وزن زیادہ محسوس ہو رہا تھا، جیسے میں ایک دن میں بہت بڑا ہو گیا ہوں۔ راستے میں جہاں گیر مجھے عمارتوں اور راستوں کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔ "یہ خلوتِ مبارکہ ہے، یہ مکّہ مسجد ہے، وہ سامنے چار کمان ہے اور یہ شفاخانۂ عثمانیہ ہے۔" میں ان راستوں سے پہلے بھی گزر چکا تھا لیکن میں نے اُس کے سامنے اپنی معلومات کا اظہار نہیں کیا۔ جیل سے چھوٹنے کے کچھ دنوں بعد ہی میں مولوی محمد شفیق کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور میں نے کوئی گلی نہیں چھوڑی تھی۔ اخبار میں اشتہار بھی چھپوایا تھا۔ اُس وقت بھی جہاں گیر یہیں ہوگا۔ کاش وہ مجھے اُسی وقت نظر آ جاتا مگر میں ہر گھر میں گھس کے تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایسے ہی کسی گھر میں کورا بھی چھپی ہوتی ہوگی۔ باہر سے کسی کو کیا خبر ہو سکتی ہے کہ اندر کون ہو سکتا ہے۔ ہم نے جنوبی ہند کی تمام بستیوں میں اُنھیں پوچھ لیا تھا۔ ممکن ہے ابّا جان کی طرح کورا اور مولوی صاحب نے بھی اپنا نام تبدیل کر لیا ہو اور وہ خود بھی نہ چاہتے ہوں کہ کوئی تلاش کرتا ہوا اُن تک پہنچ جائے۔ ممکن ہے ابّا جان کی طرح مولوی صاحب نے بھی مجھے مرا ہوا سمجھ لیا ہو اور کورا کو بھی یہ باور کرا دیا ہو مگر پھر کورا کیسے زندہ رہی ہوگی۔ جس طرح امّی جان مر گئیں، وہ بھی... وہ بھی، "نہیں نہیں۔" میں نے اپنا منہ کھسوٹ لیا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ جہاں گیر بھی میرے ساتھ ہے اور ہم سڑک پر چل رہے ہیں، وہ پریشان ہو گیا اور حیرانی سے پوچھنے لگا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔

میری خجالت اُسے مطمئن نہیں کر سکی۔ وہ اور مضطرب ہو گیا اور گھر واپس چلنے پہ اصرار کرنے لگا۔ اُس نے خانم کا عذر کیا کہ اب وہ اپنی صبح کی ریاضت سے فارغ ہو گئی ہوگی اور ہماری راہ تک رہی ہوگی۔ یوں بھی اندھیرا چھٹ گیا تھا اور ہمیں واپس ہو جانا چاہیے تھا۔ محبوب کی مہندی کے علاقے میں پہنچتے پہنچتے اکّا دکّا دکانیں کھل گئی تھیں۔ خانم ناشتے پر ہمارا انتظار کر رہی تھی اور بیٹھک میں مجھل گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اس طرح تخت پر بیٹھا تھا جیسے اُسے یہاں آئے ہوئے بہت دن گزر گئے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی۔ خانم نے مجھل کے لیے حقّے کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ یقیناً حقّہ وہاں پہلے سے موجود ہوگا یا گھر کا کوئی ملازم شوق کرتا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ خانم نے ہماری عدم موجودگی میں دو بکرے ذبح کرائے ہیں۔ دھوپ چڑھی اور اُتر گئی۔ مجھل دن بھر گھر ہی میں پڑا رہا۔ شام کو کہیں وہ باہر نکلا۔ اُس نے جہاں گیر کو بھی ساتھ لے لیا۔ میرا خیال تھا کہ گھر سے باہر آنے میں اُس کا کوئی مقصد ہوگا مگر وہ جہاں گیر کا ہاتھ تھامے شہر کے خوب صورت علاقے عابد شاپ روڈ، باغِ عامّہ کا ایک لمبا چکر کاٹ کے اور نام پلی کے ایک مدراسی ہندو کی دکان سے چاٹ مسالہ کھا کے گھر چلا آیا۔

خانم کے ہاں ٹھیرے ہوئے ہمیں کئی دن گزر گئے۔ اس دوران میں ایک رات نواب عالم تاب نے اُسے اپنے محل طلب کیا۔ خانم نے معذرت کر لی کہ اُس کے ہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ شجاعت کا کہنا تھا کہ خانم نے نواب بہادر کے ہاں جانے سے پہلی بار انکار کیا ہے۔ صبح و شام جب ہم گلیوں سے گزرتے تھے تو چھجوں، کھڑکیوں اور شہ نشینوں پر بیٹھی ہوئی عورتیں ایک دوسرے کو اشارے کرتی تھیں، اُن میں سے کئی عورتوں کی خانم کے ہاں آمد و رفت تھی اور جہاں گیر بھی اُن سے خوب واقف تھا۔ وہ آتے جاتے ہوئے اُنھیں سلام کرتا تو وہ مسکرا کے جواب دیتیں۔ کچھ دعائیں دیتیں اور کچھ اُس سے اپنے گھر میں آنے کے لیے اصرار کرتیں۔ بازار کے بہت سے لوگ بھی جہاں گیر کو بخوبی جانتے تھے اور اُس کے سلام کا جواب نہایت سرگرمی سے دیتے تھے، رات کو گلیوں میں دن کا سماں ہو جاتا تھا۔ گلیاں پھولوں سے مہک جاتی تھیں۔ عورتیں رنگ برنگے کپڑے بدل لیتی تھیں۔ اُن کے کپڑوں میں ٹنکے ہوئے سلما ستارے روشنی میں دمکتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے روشنی اُن کے چہروں سے پھوٹ رہی ہو۔ اُن کے لبوں پہ اور آنکھوں میں مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ رات کو ہم باہر نکلنے سے پرہیز کرنے لگے۔ میں نے مجھل سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ اب اُس کا ارادہ کیا ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ اس سلسلے میں خود سوچ رہا ہوگا مگر اُس کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ میں جہاں گیر کو جلد سے جلد یہاں سے لے جانا چاہتا تھا مگر خانم کے خیال سے میری زبان نہیں کھلتی تھی اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُسے لے کہاں جاؤں گا۔

ایک دن شام کو گھر واپسی کے وقت خلیفہ جمّا نے ہمارا راستہ روک لیا۔ اُس نے جہاں گیر کے سامنے اوٹگی بونگی باتیں شروع کر دیں۔ "کیا حضت! آپ نے تو بالا ہی بالا کام کر لیا؟" اُس نے چھوٹتے ہی کہا اور آنکھ مار کے بولا۔ "کون سا منتر پھینکا تھا جادوگر بالما نے! اِدھر چرچا ہے کہ سُر کی ملکہ راگ بھول گئی ہے۔" مجھل نے جب تک اُس کی مٹھی میں دو روپلے نہیں رکھے، اُس کی زبان کو تالا نہیں لگا پھر بھی اُس کے دانت کھل کھلاتے رہے اور اُس کی معنی خیز نظریں دور تک ہمارا تعاقب کرتی رہیں۔ اُسے زیادہ باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا تھا مگر اُس کی ان اچٹتی ہوئی باتوں سے ظاہر تھا کہ بازار میں خانم کے اجنبی مہمانوں کے متعلق حیرانی ہے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب میں صبح کے سوا باہر نہیں نکلا کروں گا۔ صبح بازار میں بہت سکون ہوتا تھا۔ گلیاں تقریباً سنسان پڑی رہتی تھیں مگر مجھل نے آنا جانا بند نہیں کیا۔ وہ جہاں گیر کو لے کے کسی وقت بھی گھر سے چل پڑتا تھا۔ نتیجتہً مجھے بھی اُس کے ساتھ جانا پڑتا۔ گھر سے باہر جانے

کے لیے ان گلیوں کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔
دن میں خانم کے ہاں کئی لڑکیاں آتی تھیں۔ جہاں گیر نے مجھے بتایا تھا کہ خانم ان لڑکیوں کو گانے کا ریاض کراتی ہے۔ جب سے ہم آئے تھے، خانم نے یہ سلسلہ بھی بند کر دیا تھا۔ لڑکیاں اب بھی آتی تھیں مگر وہ دن بھر گھر کے کاموں میں لگی رہتیں یا ایک کمرے میں بند ہو کے خود ہی مشق کیا کرتیں۔ ایک لڑکی کا نام نیساں تھا۔ وہ دن بھر ہماری خاطروں میں لگی رہتی۔ اُس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ رنگ چمپئی تھا۔ چھوٹے چھوٹے دانت تھے۔ وہ ہر لمحے اس طرح شرماتے اور بدن چراتے ہوئے نظر آتی تھی جیسے اُس کی کوئی چوری پکڑلی گئی ہو یا جیسے کسی نے اُسے گدگدی کر دی ہو یا کسی نے اُس کے کان میں کوئی بے حجاب بات کہہ دی ہو۔ بھورے بالوں کی چوٹیاں اُس کے شانوں پہ لہراتی رہتی تھیں۔ اُس کا قد نہ بڑا تھا، نہ چھوٹا۔ وہ بہت شائستہ تھی۔ جب وہ گھر آتی تو سب سے پہلے تجھل کو تسلیمات کرتی، پھر خانم کو، پھر مجھے، پھر جہاں گیر کو۔ شام کو وہ اپنے گھر چلی جاتی۔ اُس کے جانے کے بعد گھر میں ایک کمی سی محسوس ہوتی تھی۔ کئی بار میرے جی میں آئی کہ نیساں سے بات کروں۔ کیا وہ بھی کچھ اور بڑی ہو کے اپنے پیروں میں گھنگرو باندھے گی؟ ابھی تو وہ اس قدر شرماتی ہے، پھر اتنے مردوں میں کیسے بیٹھے گی۔ اُس کے حلق سے تو آواز بھی نہیں نکلے گی لیکن نمی بھی تو نیساں کی طرح تھی۔

ہمیں یہاں آئے ہوئے دس دن سے اوپر ہو چکے تھے۔ راستے میں کئی بار مولا سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ ہم دونوں کو ساتھ دیکھ کے اُس کی نگاہوں میں چمک آ جاتی تھی لیکن وہ چُپ رہا اس لیے میں نے بھی ہاتھ اُٹھانا مناسب نہیں سمجھا حالانکہ میرے ذہن سے وہ گالی نہیں نکلی تھی جو اُس نے جہاں گیر سے لڑائی کے دوران میں امّی کو دی تھی۔ تجھل بھی کئی مرتبہ اُسے اِدھر اُدھر بازار میں بیٹھا ہوا دیکھ چکا تھا اور اُس نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ میں ان گلیوں سے کان بند کیے اور نظریں جھکائے ہوئے گزرا کروں۔ میں نے یہی کوشش کی تھی اور تجھل نہ کہتا تب بھی جہاں گیر کے ساتھ بازار میں گزرتے ہوئے مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ چلتے وقت اگر موقع ملا اور بعد میں خانم پہ کوئی آنچ آنے کا اندیشہ نہ ہوا تو میں مولا سے ضرور ملوں گا۔ ان دنوں مولا کے متعلق جہاں گیر اور خانم نے اتنی باتیں بتا دی تھیں کہ مجھے خود ہی اُسے راستے میں روک لینا چاہیے تھا۔

میں نے بہت ضبط کیا مگر مولا سے ضبط نہیں ہوا۔ صبح صبح میں جہاں گیر کے ساتھ سیر سے واپس آتا تھا۔ وہ تین روز سے مسلسل مجھے ایک جگہ بیٹھا ہوا نظر آتا۔ اُس دن سویرے مولا نے پہلی بار اپنی زبان کھولی۔ ہم اُس کے قریب سے گزرے تو اُس نے بڑی پھبتی کر ایک گالی دی اور زمین پر تھوک دیا۔ گالی ذومعنی تھی۔ یہاں تک بات ٹھیک تھی۔ میں نے جان بوجھ کے اسے کانوں کا دھوکا سمجھا لیکن پھر اُس نے اونچی آواز میں خانم کے متعلق ایک پھبتا ہوا گندہ فقرہ چست کیا۔ میرے قدم رکنے لگے۔ جہاں گیر کے کان بھی تیز تھے۔ اُس نے بھی فقرہ سن لیا ہوگا۔ میں نے درگزر کیا لیکن دوسری صبح مولا حسبِ معمول پھر اپنی جگہ بیٹھا تھا۔ اگرچہ جہاں گیر نے اُس روز گلی کے دوسری طرف سے گھر واپس آنے کو کہا تھا لیکن میں نے راستہ نہیں بدلا۔ میں اُسی گلی سے گھر کی طرف آیا جدھر مولا روزانہ ہمارا انتظار کرتا تھا۔ اُس نے ہمیں دُور سے دیکھتے ہی منہ سے سیٹی بجائی اور جب ہم اُس کے سامنے پہنچے تو اُس نے پھر اپنی زبان گندی کی۔ مجھ سے آگے بڑھنا دوبھر ہو گیا۔ مولا چاہتا بھی یہی تھا کہ میرا خون آزمائے۔ تاہم خانم کی رسوائی سے میرے ہاتھ اینٹھنے لگے۔ اِدھر جہاں گیر نے بھی میرا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ ہم کوئی چھ سات قدم آگے چلے ہوں گے کہ ایک دم جہاں گیر بلبلانے لگا۔ مولا نے پیچھے سے پتھر مارا تھا۔ پتھر جہاں گیر کی گردن پر لگا اور خون پھوٹ پڑا۔ میں نے جہاں گیر کو ایک طرف کیا۔ وہ مجھے روکنے لگا۔ مولا اکیلا نہیں تھا۔ جب اُس نے سیٹی بجائی تھی تبھی مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ اُس کے دو ساتھی اور بھی تھے جو اُس سے کچھ دُور اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے تھے اور مجھے پلٹتا دیکھ کے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے اُن کے آنے کا انتظار کیا۔ "کیا بچو! آنکھیں دکھا رہا ہے؟" مولا نے اپنا سر جسم سے آگے کر کے ہنستے ہوئے کہا۔

میرا اُن کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اُس کے دونوں ساتھی بھی اُس کے آزو بازو کھڑے ہو گئے۔ میں نے جواب دینے کے بجائے باری باری اُن کی طرف دیکھا۔ تجھل نے جیل میں مجھے بتایا تھا کہ مقابل کی جگہ تبدیل کرنا ضروری ہو تو نگاہوں سے کام لینا چاہیے۔ وہ اپنی جگہ سے ضرور حرکت کرے گا اور جب وہ نسبتاً موافق موقع پر آ جائے تو اپنی نگاہ ٹھیرا لینی چاہیے۔ میں نے یہی کیا۔ وہ مجھے گھور رہے تھے۔ دونوں ساتھی مولا کے کچھ اور قریب ہو گئے۔

"کیا چاہتا ہے مولا!" میں نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"یہ معشوق اپن کا ہے۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ اُس کا اشارہ جہاں گیر کی طرف تھا۔ میرا خون رگوں میں اُبلنے لگا۔ مجھے اُس سے کوئی بات ہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں نے سوچا جیب سے چاقو نکال کے اس کی زبان کاٹ لوں۔ "اُس دن کے دھوکے میں نہ رہنا بچو! وہ تیرا باپ بیچ میں آ گیا۔" وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "مار بھول گیا گیدڑ! رجو کو چھوڑ دے تو کو ابھی خود بھی......"

جہاں گیر نے میرا کرتا پکڑ لیا تھا۔ میں نے چیخ کر اُسے ایک جگہ کھڑے رہنے کا حکم دیا۔ مولا کی آواز حلق میں رہ گئی۔ میں دونوں ہاتھ سیدھے کیے ہوئے اُس کی گردن کی طرف جھپٹا۔ مجھے یقین تھا کہ اُس کے دونوں ساتھی کچھ آگے بڑھ کے میرے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کریں گے لیکن میرا ارادہ مولا کی گردن پکڑنے کا نہیں تھا۔ میں نے مولا کے قریب پہنچ کے اپنے دونوں ہاتھ پھیلانے کے لیے جھٹکا دیا۔ دونوں ہاتھ اُس کے ساتھیوں

کی گردنوں پر ایک ساتھ پڑے۔ دونوں زمین پر گر گئے۔ اُن کی طرف دیکھے بغیر میں نے تیزی سے مولا کے پیٹ میں گھٹنا مارا۔ وہ دائیں بائیں اپنے ساتھیوں کو دیکھنے کی چوک کر بیٹھا تھا اور غضب میں آ کے مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ گھٹنا لگتے ہی وہ پیٹ پکڑ کے زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ اکہری ہڈی کا تھا۔ میں اُسے کمر سے پکڑنے کے لیے دوبارہ آگے بڑھا مگر اُس کا ایک ساتھی زمین سے اُٹھ گیا۔ اُس کی گردن پہ ضرب شاید ٹھیک طرح نہیں لگی تھی۔ اُس نے بائیں جانب سے میرے جبڑے پر گھونسا مارا۔ یہ دیکھ کے مولا کی ہمت بھی بڑھی۔ اُس کے اُٹھنے سے پیشتر ہی جہاں گیر اُس کا گریبان پکڑ کے اُس سے اُلجھ گیا تھا۔ جہاں گیر کو اُس سے علیحدہ کرنے میں چند لمحوں کے لیے میری توجہ ہٹ گئی اور مولا کا ساتھی مجھے دو تین ضربیں لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ مجھ سے لپٹ گیا تھا اور مجھے گرانے کے لیے زور کر رہا تھا۔ میں نے اُس کی خواہش پوری کی اور اُسے ساتھ لے کے زمین پر آ پڑا۔ ایسے موقع پر سب سے پہلے نیچے پڑے ہوئے آدمی کے کولھے اور سر پہ زور دے کے اُسے قابو میں رکھنا ہوتا ہے۔ اُس نے ایک ہاتھ سے میری ٹھوڑی پر ہتھیلی سے دباؤ ڈالا اور دوسرا ہاتھ مُکے لگانے کے لیے آزاد رکھا۔ اُس نے اپنا جسم زیادہ اوپر نہیں اُٹھایا تھا۔ اُٹھاتا تو میرے دونوں کھلے ہوئے ہاتھ زیادہ آسانی سے کام کرتے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اُسے خود سے اور نزدیک کر لیا اور اُس کی کمر بازوؤں سے جکڑ لی۔ اب اُس کی میری حالت ایک جیسی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ میں نیچے تھا اور وہ اوپر۔ مجھے جلدی تھی۔ جہاں گیر اور مولا میری نظروں سے اوجھل تھے۔ مولا کے ساتھی کے لیے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میری ٹھوڑی پر رکھا ہوا اُس کا ہاتھ ہم دونوں کے سینے کے درمیان پھنس گیا تھا۔ اُس نے ٹھوڑی چھوڑ دی تھی اور اپنے کھلے ہوئے ہاتھ سے میرے کان پر گھونسے مار رہا تھا۔ میں نے پوری طاقت سے اپنے دائیں شانے پر زور دیا۔ وہ سمجھا کہ میں اس جانب سے پلٹنا چاہتا ہوں چنانچہ اُس نے بھی اپنا سارا زور اسی طرف صرف کر دیا لیکن مجھے بائیں شانے سے پلٹنا تھا۔ ہم دونوں جھونک میں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تین چار لڑھکنیاں کھا گئے۔ بہرحال اُس کا وزن کم تھا۔ جہاں جھونک کمزور پڑی میں نے وہیں اپنے آپ کو گرا لیا۔ نیچے آنے سے وہ اپنے حواس برقرار نہیں رکھ سکا۔ اُس نے اُچھل کود شروع کر دی۔ اُس سے یہی توقع تھی۔ میں نے دوبارہ اُسے اپنے جسم سے نہیں چمٹایا بلکہ اُس کے پنجوں میں پنجہ ڈال کے اُس کے پیٹ پر جم کے بیٹھ گیا۔ میں کچھ اوپر اُٹھا تو اُس نے یہ جانا کہ میں کھڑا ہو رہا ہوں لیکن جسم ڈھیلا چھوڑ کے میں دوبارہ کہیں اوپر سے گرنے کے انداز میں اُس پر بیٹھ گیا تھا۔ پھر سہ بارہ یہی ہوا۔ میں نے یہ عمل کئی بار دہرایا۔ وہ چیخنے لگا۔ اُس کی انتڑیاں پچک گئی ہوں گی۔ اُس کی آنکھیں اُبلنے لگیں تب میں نے اُسے چھوڑ دیا۔

چند ثانیوں کی تاخیر ہو گئی۔ اُدھر مولا نے جہاں گیر کا دانت توڑ دیا تھا۔ جہاں گیر کی توجہ میری ہی طرف ہو گی ورنہ وہ اتنی جلدی مار کھانے والا نہیں تھا۔ کاش میں اُسے اپنے بارے میں پہلے بتا دیتا۔ میں نے مولا کو پیچھے سے پکڑ کے پہلے جہاں گیر کو اُس سے دُور ہونے کی ہدایت کی۔ جہاں گیر دُور ہو گیا تو میں نے مولا کی کمر سے ہاتھ ہٹا لیے۔ وہ جیسے ہی میری طرف پلٹا، میں بیٹھ گیا اور اُسے لیے ہوئے اوپر اُٹھا۔ پھر میں نے اُسے زمین پر لوٹنے میں دیر نہیں کی۔ اُس نے کھڑے ہونے کی ہمت کی۔ میری ٹھوکروں نے اُس کا توازن بگاڑ دیا۔ میں نے اُس کے منہ پر اتنے طمانچے مارے کہ خون کی دھار بہہ نکلی۔ میں اُسے وہیں ختم کر دیتا اگر جہاں گیر درمیان میں نہ آ جاتا۔ مولا کے ساتھی بھاگ گئے تھے۔ اِردگرد تماشا دیکھتے ہوئے راہ گیروں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا تھا حالانکہ مولا تڑپ رہا تھا مگر اُس کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔

جہاں گیر نے راہ گیروں میں سے کوئی آدمی تجھل کو بلانے کے لیے گھر کی طرف دوڑا دیا تھا۔ تجھل نہیں آیا مگر جب ہم گھر والی گلی میں داخل ہوئے تو خانم شجاعت کے ساتھ تیزی سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ زمین پر پڑے رہنے کی وجہ سے میرے تمام کپڑے گندے ہو گئے تھے۔ جہاں گیر کے منہ سے خون جاری تھا لیکن اُس کے پیر ٹیک رہے تھے۔ وہ میرے بازو سے چمٹا جا رہا تھا۔ خانم نے گلی ہی میں واویلا شروع کر دیا۔ جہاں گیر اُسے گھر میں لے گیا۔ بیٹھک میں تجھل حقہ پی رہا تھا۔ میں نے بولا تھا "خانم! مت جاؤ۔" وہ بلند آواز سے بولا۔ "وہ آتے ہی ہوں گے۔ سب ٹھیک ہے نا؟" اُس نے مجھ سے مخاطب ہو کے پوچھا۔ "نہیں مانتے حرام کے جنے۔"

"نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"چل کپڑے بدل لے، ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

"وہ تین تھے آپی!" جہاں گیر حیرت بھری آواز میں بولا اور خانم کو ساری داستان سنانے لگا۔ خانم نے آنکھیں بند کر کے اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

"اب میں ایک دن بھی یہاں نہیں ٹھیروں گی۔" وہ وحشت سے بولی۔ "چاہے اس گھر کا انتظام ہو یا نہ ہو۔ میں لمبے ارجی بائی ہی کو دے دوں گی۔ مجھے پہلے ہی اس کا اندیشہ تھا۔"

"خانم!" تجھل کی آواز گونجی۔ "جلدی مت کرو، اطمینان سے چلیں گے۔"

"کیسا اطمینان!" وہ ہذیانی انداز میں بولی۔ "آپ نے دیکھا نہیں کہ یہ کس طرح واپس آئے ہیں۔ میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔"

"انھیں کیا ہوا ہے۔" تجھل نے غنودہ آواز میں کہا۔

"اور کیا کسر رہ گئی تھی۔ معاف کیجیے آپ تو یہیں بیٹھے رہے۔ اگر انھیں کچھ ہو جاتا! آپ اُن لوگوں کو نہیں جانتے۔ میں ایک عرصے سے

یہیں رہتی ہوں۔"

"خانم! اتنا نہیں گھبراتے۔" تجمل دھیمے لہجے میں بولا۔

"کیسے نہ گھبراؤں۔ آج وہ تین تھے، کل چھ ہو سکتے ہیں، پرسوں دس۔ بازار میں کوئی اُن کے منہ نہیں لگتا۔ سب کو معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"جیسے تمہاری مرضی خانم! ہم تو کب سے جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔" تجمل نے تندی سے کہا۔ "تم جیسا چاہو کرو، پر جلدی میں نقصان ہو سکتا ہے۔ میں تم سے اتنا ہی بول سکتا ہوں۔"

"آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔" خانم نے لجاجت سے کہا۔

"جو میں بولتا ہوں وہ تم بھی سمجھا کرو۔"

خانم نے تجمل کی طرف سراسیمگی سے نگاہ اُٹھائی، اُس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلے مگر لرز کے رہ گئے۔ وہ تجمل کی بات سے مطمئن نہیں تھی۔ اُن کے درمیان ہونے والی باتیں میرے لیے نئی تھیں۔ انھیں سُن کے مجھے بے کلی ہونے لگی۔ صاف ظاہر تھا کہ تجمل کے اتنے دنوں تک یہاں ٹھہرے رہنے کا کوئی سبب ہوگا اسی لیے میں نے اُسے پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا جب بھی میں اس سلسلے میں سوچتا تھا، میرا دماغ بند ہونے لگتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ تجمل کا بھی یہی حال ہوگا۔ میرا کوئی ٹھکانا ہوتا اور جہاں گیر سے ملنے کے بعد گھر تک پہنچنے کی کوئی صورت نکلتی تو میں یقیناً خانم سے درخواست کرتا کہ وہ ہمارے ساتھ ہی رہے چونکہ وہ پہلی ملاقات میں بازار کی زندگی ترک کرنے کا اظہار کر چکی تھی اور اُس نے اپنے گھر کے دروازے تماشائیوں کے لیے بند کر دیے تھے۔ خانم کہیں جانے کی بات کر رہی تھی لیکن کہاں؟ ناشتے کے بعد کچھ دیر کے لیے مجھے اور تجمل کو تنہائی کا موقع ملا۔ میں اُس سے پوچھ سکتا تھا مگر اب تک میں نے اس بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا تو اب بھی کیا ضرورت تھی۔ تجمل نے جو کچھ طے کیا ہوگا، سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔

دوسرے دن صبح نیساں بیٹھک میں آئی تو اُس کا چہرہ بیماروں جیسا لگ رہا تھا۔ وہ ایک کونے میں کھڑی ہو گئی۔ تجمل نے چونک کے اُس کی طرف دیکھا اور مضطرب آواز میں پوچھا۔ "کیا بات ہے نیساں بیٹا! یہ تو نے جلدی اپنے گالوں پر کیوں مل لی ہے؟"

نیساں سسکنے لگی۔ تجمل فوراً تخت سے اُتر کے اُس کے پاس گیا اور اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے پوچھنے لگا۔ "کیا کسی نے تجھے کچھ کہہ دیا ہے؟ رحیماں سے لڑائی تو نہیں ہو گئی؟"

وہ سر جھکائے اور شدت سے رونے لگی۔ "کیا بات ہے؟ بھلا مجھے نہیں بتائے گی؟ تو تو مجھے بابا کہتی ہے۔" وہ اُسے اپنے بازو میں سمیٹتا ہوا تخت پر لے آیا۔ "بتا شہزادی!"

نیساں نے بمشکل تمام سر اُٹھا کے میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں سُرخ آنسو بھرے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرے سامنے بات کرنا نہیں چاہتی۔ مجھے خدشہ ہوا کہ وہ جہاں گیر کی کوئی بات ... میں اُٹھنے لگا تو تجمل نے مجھے بٹھا لیا اور نیساں سے بولا۔ "لاڈلے سامنے ہی بول دے، مت گھبرا، میرا اس سے کوئی پردہ نہیں ہے۔ ہاں تو تو جب بولنے پر آتی ہے تو مینا کی طرح بولتی ہے۔"

"آپی نے ارجی بائی سے بیعانہ لے لیا ہے۔" وہ اٹک اٹک کے ...

"اچھا! پھر کیا ہوا؟" تجمل نے تجسس سے پوچھا۔

"ابھی ابھی ارجی بائی واپس گئی ہے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔ "... تمام سامان سمیت مکان کا سودا کر لیا ہے۔ میں نے اُن کی باتیں ... ہیں۔ تین چار دن میں وہ باقی پیسے دے دے گی پھر آپی چلی جائیں گی ... نے آپی سے کہا کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے۔ انھوں نے مجھے ... دیا۔ آپی کے بغیر میرا جی نہیں لگے گا، آپ ہی اُن سے کچھ کہیے بابا! ... کی بات وہ بہت مانتی ہیں، میں انھیں کبھی تنگ نہیں کروں گی۔ جو ... گی، کروں گی۔ میں نے اُن سے بہت کہا لیکن وہ کہتی ہیں کہ یہ کسی ... نہیں ہے۔"

تجمل چپ ہو گیا پھر افسردگی سے بولا۔ "آپی ٹھیک بولتی ہیں ... آپ بھی یہی کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں نیساں! تیری ماں ابھی زندہ ہے، وہ کس طرح تجھے ... ساتھ بھیج دے گی، یوں بھی تو کب تک اپنی آپی کے ساتھ رہے گی۔ لڑ... پرائے گھر کی ہوتی ہیں۔"

"مگر مجھے معلوم ہے کہ مجھے کسی گھر میں نہیں جانا۔"

تجمل نے جواب نہیں دیا۔ "یہ ممکن نہیں ہے نیساں!" وہ تلملی ...

"کیوں ممکن نہیں ہے بابا!"

"نیساں! تو اب اتنی بچی نہیں ہے۔"

"بابا! میں آپ لوگوں کے ساتھ بالکل ایک لونڈی کی طرح ... اور کبھی کسی سے کوئی شکایت نہیں کروں گی، آپ مجھے ساتھ لے چل... دیکھیے۔ منع مت کیجیے گا۔ میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں، مجھے یہ سب ... نہیں لگتا۔"

"میں تجھ سے کیا بولوں، میرے بس میں کچھ نہیں ہے۔"

"آپی بھی یہی کہتی ہیں مگر آپ چاہیں تو مجھے لے جا سکتے ..."

"کیسے؟ کیسے نیساں!" تجمل نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"آپ مجھے خرید لیجیے بابا! میں عمر بھر آپ لوگوں کی خدمت کر...

تجمل گم سم ہو گیا۔ "کیا کہہ رہی ہے رے!"

"ہاں بابا! آپ مجھے خرید سکتے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔" تجمل تیزی سے سر ہلانے لگا۔ "ایسے خراب ... جو تو سوچ رہی ہے دوسرے بھی اسی طرح سوچیں، تبھی یہ ممکن ہے۔ تو آپ کیوں نہیں سوچتے، آپ تو میری اتنی تعریفیں کرتے ہیں۔"

"تو بہت اچھی ہے نیساں!" تجمل اُلجھ کے بولا۔ "پر میں کیا سوچوں۔ میں خانم سے بات کروں گا۔ میں تجھ سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا، اب مجھ سے کچھ مت پوچھنا، تجھے خود پتہ چل جائے گا۔"

وہ منتیں کرنے لگی اور اُس کے آنسو بہتے رہے۔ تجمل نے ہامی نہیں بھری۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ "نیساں مت رو۔" میں نہ جانے کیوں بیچ میں بول پڑا۔ میری آواز بھرا گئی تھی۔ تجمل نے تیز نظروں سے مجھے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ دروازے پر کسی کی آہٹ ہوئی تو نیساں گھبرا کے اُٹھ کھڑی ہوئی اور چُنری سے منہ چھپائے بیٹھک سے بھاگ گئی۔ جہاں گیر اندر آیا تھا۔ اُسے تجمل کے پاس چھوڑ کے میں اوپری منزل پر اپنے کمرے میں چلا آیا اور بستر پہ گر پڑا۔ میرا جسم اچانک ٹوٹنے لگا تھا اور سینے میں جلن سی ہو رہی تھی۔ بہت دیر ہو گئی تو خانم مجھے پوچھنے کے لیے کمرے میں آئی۔ مجھے اُس کی آمد کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اُس نے میری کلائی پر ہاتھ رکھا تو میں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ وہ میرا حال پوچھنے لگی اور سمجھی کہ مَولا سے جھگڑے کے دوران میں مجھے کوئی اندرونی چوٹ آگئی ہے۔ میں نے اُس سے نیساں کے متعلق بات کرنا چاہا مگر لفظ میری سمجھ میں نہیں آئے۔ مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ مجھے اُس سے کیا کہنا چاہیے اور آخر کس بنیاد پہ میں اُس سے نیساں کا ذکر چھیڑوں۔ تجمل نے نیساں کو منع کر دیا تھا۔ خانم پہلے ہی جواب دے چکی تھی میرے درمیان میں دخل دینے کا کیا محل تھا۔ ٹھیک ہے، نیساں کی قسمت میں جو لکھا ہے، اُسے کون روک سکتا ہے۔ قمی کی قسمت میں جو لکھا تھا، وہ پورا ہوا۔ میں نے قسمت کی بات کبھی نہیں مانی تھی لیکن اب اسے ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ خانم میری طبیعت کی طرف سے مطمئن ہو کے چلی گئی۔ میں وہیں کمرے میں لیٹا رہا۔ میرا دم گھٹ رہا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے میرے جسم پر بہت سی مکڑیوں نے جالے بُن لیے ہوں۔ جہاں گیر کے ملنے کے بعد مجھے اور ناتوانی محسوس ہونے لگی تھی۔ اُس کی صورت دیکھتے وقت میرا دل بیٹھنے لگتا تھا اور سر میں دھواں سا بھر جاتا تھا۔ نیساں نے کمرے میں آ کے دوپہر کے کھانے کی اطلاع دی۔ میں نہ جاتا تو خواہ مخواہ کا تماشا بنتا۔ کھانے کی چوکی پر نیساں بھی ہمارے ساتھ بیٹھی تھی۔ بار بار میری نگاہیں اُس کی طرف اُٹھ جاتی تھیں، وہ کوئی دُلھن معلوم ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنی چُنری سر سے آگے کر لی تھی تاکہ کوئی اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکے مگر وہ اپنے ہاتھ نہیں چھپا سکی۔ اُس کی لانبی لانبی اُنگلیاں بے قرار تھیں۔ سہ پہر کو تجمل قیلولے کے لیے لیٹ گیا اور جہاں گیر دوسرے کمرے میں ماسٹر سے پڑھنے چلا گیا۔ میں مونڈھے پر بیٹھا ہوا اپنے ناخن کُریدتا رہا۔

پھر مجھ سے بیٹھا نہیں گیا۔ میں نے ایک ارادہ کر لیا تھا۔ جتنا میں سوچتا تھا، اتنا ہی وہ میرے ذہن پر اور اُبھرتا جاتا تھا۔ میں نے اُوپر جا کے اپنا سامان ٹٹولا، کپڑے پہنے اور کسی کو بتائے بغیر باہر آ گیا۔ مجھے زیادہ دُور نہیں جانا پڑا۔ جب میں زینہ طے کر کے دوسری منزل پہ پہنچا تو ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں شوکت آرا سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے دروازے سے ملحق ایک کمرے میں لے گئی۔ فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ دیواروں کا رنگ گلابی تھا۔ چند منٹ بعد ہی صاف ستھرے لباس میں گندمی رنگ کی ایک ادھیڑ عمر عورت نمودار ہوئی۔ اُس نے مجھے تسلیمات کی اور ساڑی کا پلّو شانے پہ درست کر کے بولی۔ "فرمائیے کنیز کو کیوں یاد فرمایا ہے؟"

میں نے کہا۔ "میں نیساں کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"خدا کرے آپ نیساں کی شکایت لے کے نہ آئے ہوں۔"

"نہیں ایسی بات نہیں، میں کچھ اور بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں تو ڈر گئی تھی۔" وہ جُھرجُھری لے کے بولی اور تعجب آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ "فرمائیے! پھر بھلا نیساں کی کیا بات ہو سکتی ہے؟"

"آپ نیساں خانم کو دے دیجیے۔" میں نے جھجک کے کہا۔

"وہ خانم ہی کی ہے۔" اُس نے بے ساختہ جواب دیا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ خانم جلد ہی یہاں سے جانے والی ہیں۔ نیساں کی خواہش ہے کہ وہ خانم کے ساتھ ہی چلی جائے۔"

اُس نے ایک گہری سانس لی اور پہلو بدلنے لگی۔ "میں آپ کی بات نہیں بوجھ سکی؟" اُس کی آواز بجھی ہوئی تھی۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نیساں کو خانم کے حوالے کر دیں اور اُس کی جو قیمت آپ کے ذہن میں ہو، مجھے بتا دیں، میں ادا کر دوں گا۔"

اُس کے لبوں پر ایک لمحے کے لیے مسکراہٹ اُبھری۔ "اچھا! یہ بات ہے، کیا سُرلی خانم نے آپ کو بھیجا ہے؟" وہ مجھے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"نہیں، خانم کو نہیں معلوم کہ میں یہاں آیا ہوں اور نہ شاید خانم آپ سے اس سلسلے میں بات کرنا مناسب سمجھیں۔ میں اپنی مرضی سے آیا ہوں۔"

وہ کچھ سوچنے لگی اور بوجھل آواز میں بولی۔ "میں نے نیساں کے لیے کبھی ایسا نہیں سوچا، میں معذرت کرتی ہوں۔"

"لیکن نیساں کے لیے آپ نے ایک بات تو ضرور سوچ رکھی ہے کہ آپ دو ایک سال بعد اُسے محفل میں بٹھائیں گی۔"

"ہاں! نیساں خانم سے اسی کی تربیت لے رہی ہے۔ اُس کی اُٹھان اچھی ہے اور اللہ نے اُسے آواز کے حُسن سے بھی خوب نوازا ہے۔ خانم نے اُس پہ بہت محنت کی ہے مگر میں اُسے خانم کو کیسے دے سکتی ہوں، خانم تو ایسی دس لڑکیاں حاصل کر سکتی ہے۔"

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں، آپ کو پتہ ہوگا کہ خانم نے اپنے آپ کو محدود کر لیا ہے اور اب وہ مکمل طور پہ یہ زندگی ترک کر رہی ہیں۔ نیساں کو یہاں سے لے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُسے آپ سے چھین کے خود فائدہ اُٹھایا جائے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ نیساں کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا، نیساں خود بھی یہ نہیں چاہتی۔ نیساں سے آپ کی جو توقعات وابستہ ہیں، وہ میں پیشگی پوری کیے دیتا ہوں۔ کیا آپ یہ پسند نہیں کریں گی کہ نیساں کسی گھر میں رہے؟"

"کہاں! کہاں میاں؟" وہ اُداسی سے بولی۔ "اب یہ باتیں پُرانی ہو گئی ہیں، بظاہر اب بھی اچھی لگتی ہیں۔"

"آپ جس طرح چاہیں یقین کر لیں۔ سب سے بڑا یقین وہ قیمت ہے جو میں آپ کو ادا کر سکتا ہوں، کچھ اور مت سمجھیے۔ مجھ پہ اعتبار کیجیے۔"

"میاں! آپ کی عمر ابھی کم ہے۔ آپ نے زمانہ نہیں دیکھا، آپ پہلے کچھ اور سوچ لیجیے، پھر میرے پاس آیئے گا اور ویسے بھی میں نیساں کو اس طرح کیسے کسی کو دے سکتی ہوں، میری تمام آرزوئیں اُس سے بندھی ہوئی ہیں۔ ابھی مجھے اپنے لگائے ہوئے پودے کی بہار تو دیکھ لینے دیجیے۔ مجھے ایسی بات پر مجبور مت کیجیے جو میرے اختیار میں نہ ہو اور جس کا تصور بھی میرے خواب و خیال میں نہ ہو۔ نیساں کو ابھی اپنی تربیت پوری کر لینے دیجیے، پھر دیکھیے گا۔ نیساں چار صاحبانِ ذوق کے درمیان بیٹھے گی تو مجھے بھی اُس کی قیمت کا اندازہ ہوگا۔ ابھی نہ میں آپ سے کچھ کہہ سکتی ہوں اور نہ آپ اُس کی قدر و قیمت صحیح طور پہ پرکھ سکتے ہیں۔ یہ بات یہیں رہنے دیجیے۔ ویسے خانم کے لیے میری جان حاضر ہے، آپ اُس کے مہمان ہیں تو میرے بھی سر آنکھوں پر۔"

"میں فیصلہ کر کے آیا ہوں اور مایوس واپس جانے نہیں آیا۔ ممکن ہے آپ کے ذہن میں کوئی اور بات ہو، وہ نکال دیجیے۔ بہتر ہے آپ نیساں کو نیلام پہ نہ چڑھائیں۔ نیلام کی آخری بولی آپ اپنے تصور میں طے کر لیجیے۔ میں مول تول نہیں کروں گا اور دوبارہ آپ سے التجا کروں گا کہ نیساں اگر یہ زندگی پسند نہیں کرتی تو آپ بھی اُس پہ رحم کیجیے۔"

"میاں! میرے لیے یہ بات بڑی اچانک ہے، مجھے سوچنے کے لیے وقت دیجیے، میں اس طرح کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی، بھلا اپنے جگر کے ٹکڑوں کو کوئی اس طرح کیسے جُدا کر سکتا ہے۔"

"اور جگر کے ٹکڑوں کو اِس طرح دکان پر بھی نہیں سجایا جاتا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن ہم یہاں بیٹھ کے اور کیا سوچ سکتے ہیں۔ میں آپ کو نہیں جانتی، آپ کون ہیں، کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، کیا کرتے ہیں، آپ نے اپنے بارے میں کچھ بتائے بغیر اتنی ڈھیر ساری باتیں کر دیں۔"

"خانم، آپ ٹالنے والی باتیں نہ کریں۔ آپ یہاں تجربے نہیں دیکھتیں، جیب دیکھتی ہیں۔ پھر یہ تمام باتیں پوچھنا بے کار ہے۔ نیساں بازار میں بیٹھے گی، بازار میں رکھی جانے والی ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ وہ مجھے بتا دیجیے اور اِدھر اُدھر کی بات مت کیجیے۔ آپ کا ارادہ نیساں کو بازار میں لانے کا نہیں ہوتا تو میں آپ کے پاس نہ آتا۔"

"آپ بہت، بہت عجیب نوجوان ہیں۔" وہ ترشی سے بولی۔ "فرض کیجیے، میں انکار کر دیتی ہوں کہ میں نیساں کے بارے میں ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔"

"میں جانتا ہوں، آپ کا انکار محض حجت ہے۔ جو قیمت آپ کو رفتہ رفتہ ملے، وہ ایک ساتھ مل جائے تو یہ سودا بُرا نہیں ہے۔ فرض کیجیے نیساں ہی انکار کر دے۔"

"اُس کی یہ جرأت نہیں۔" وہ خفا ہو کے بولی۔

"لیکن کسی دوسرے میں یہ جرأت ہو سکتی ہے۔"

"آپ دھمکی دے رہے ہیں؟" اُس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

"دھمکی کیسی! میں آپ کو منہ مانگی رقم ادا کرنے کو کہہ رہا ہوں۔"

"آپ نے بھلا اُس کے لیے کیا سوچا ہے۔" وہ برہمی سے بولی۔

"یہ بتانا آپ کا کام ہے۔"

"میں نے آپ سے کہہ دیا، میں نے کچھ نہیں سوچا۔"

"تو سوچ لیجیے، میں یہیں بیٹھا ہوں۔"

"نہیں، آپ پھر کسی وقت آیئے۔"

"آپ بتا دیجیے، کسی جھجک کے بغیر بتا دیجیے۔"

"میں کیا بتاؤں۔" وہ سر جھٹک کے بولی۔

"کچھ بھی، جو آپ مناسب سمجھیں۔ میں آپ سے کسی رعایت کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ آپ خانم کا خیال بھی مت کیجیے۔"

"مجھے تنگ نہ کیجیے۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"بتایئے، بتایئے؟"

"یہ کیسی زبردستی ہے۔"

"کوئی زبردستی نہیں، آپ کچھ کہہ کے تو دیکھیے۔"

"آپ...... آپ پچاس ہزار دے سکتے ہیں؟"

"میں آپ کو ساٹھ ہزار دوں گا۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "سودا پکا، نیساں اب میری ہے۔ میرے پاس نقد رقم نہیں ہے لیکن میں چیک دے رہا ہوں۔ آپ کل صبح کسی بھی بینک میں یہ چیک داخل کر دیجیے اور بینک والے سے کہہ دیجیے کہ وہ جلد از جلد یہ چیک بمبئی بھیج دے۔ اُسے بمبئی سے تار سے جواب آ سکتا ہے کہ میرا چیک ٹھیک ہے یا نہیں۔ ہم ابھی چار پانچ روز تک یہیں ہیں، اُس وقت تک آپ کو رقم مل جائے گی۔ نیساں اب یہاں واپس نہیں آئے گی اور جب تک آپ کو رقم نہیں مل جاتی، ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ آپ نیساں سے خانم کے ہاں آ کے مل سکتی ہیں۔" میں نے چیک بک جیب سے نکالی اور چیک بھر کے اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ شوکت آرا کے ہاتھوں پہ کپکپی طاری تھی۔ اُس کی آنکھیں حیرت سے ساکت ہو گئی تھیں۔ میں چلنے لگا تو وہ حواس باختہ انداز میں اُٹھی اور لڑکھڑاتی زبان میں مجھے روکنے لگی۔ میں زینے سے نیچے اُتر آیا۔

میں واپس پہنچا تو بیٹھک میں سبھی میرا انتظار کر رہے تھے حالانکہ مجھے آنے جانے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ جیسے ہی موقع ملا، میں نے نیساں سے کہہ دیا کہ وہ آج سے اپنے گھر نہیں جائے۔ اُس کی پتلیاں جگمگانے لگیں، مجھے شبہ تھا کہ شوکت آرا، خانم سے ملنے نہ آ جائے مگر وہ نہیں آئی۔ اندھیرا ہونے تک نیساں موجود رہی تو خانم نے اُسے ٹوکا۔ نیساں کو جواب دینا مشکل ہو گیا۔ خانم نے اُسے بُرا بھلا کہا لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی۔

"چلی جائے گی آپی۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ابھی یہ تین چار روز یہیں رہے تو کیا حرج ہے۔"

"کوئی حرج نہیں لیکن شوکتی نہ جانے کیا سوچے گی۔"

"نیساں نہیں پہنچے گی تو وہاں سے خود کوئی لینے آ جائے گا۔"

"پر تو کہاں گیا تھا رے؟" تجمل نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میں یہیں قریب ہی گیا تھا۔" میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

ابھی تجمل کچھ اور کہنے والا تھا کہ شجاعت ہانپتا ہوا اندر آیا اور خانم کے پاس جا کے کہنے لگا۔ "شاہ کبیر آیا ہے۔"

"کبیر!" خانم نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ "وہ کیوں آیا ہے؟" وہ ہماری طرف سراسیمگی سے دیکھنے لگی۔

"پتہ نہیں۔ بولتا ہے خانم سے ملنا ہے۔"

"اکیلا ہے؟"

"نہیں، وہ تینوں بھی ساتھ ہیں۔"

"کہنا اس وقت خانم باہر گئی ہوئی ہیں، تم نے کہہ تو نہیں دیا کہ میں اندر گھر میں موجود ہوں۔"

"نہیں، میں نے کہا، میں دیکھ کے بتاتا ہوں۔"

"تم اُن سے جا کے یہی کہہ دو کہ میں کہیں گئی ہوئی ہوں۔"

"مل آؤ خانم! پوچھ لو کہ وہ کیا بولنا چاہتا ہے۔" تجمل نے بلند آواز میں کہا۔ "نہیں جاؤ گی تو وہ دوبارہ آئے گا۔"

"میں پہلے ہی ڈر رہی تھی۔" وہ میری طرف دیکھ کے بولی۔ "سرالانے نہ جانے کیا کیا کان بھرے ہوں گے۔ میں اُس کے دوبارہ آنے سے پہلے کچھ رقم بھجوا دوں گی، پھر شاید وہ نہیں آئے۔"

"رقم دینے کی کیا ضرورت ہے، پہلے اُس سے جا کے بات کرو، بولو تو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" تجمل نے نرمی سے اُسے سمجھایا۔

"میں آپ سے بار بار کیا کہہ رہی ہوں۔ یہ لوگ بہت تخریبی ہیں، اِن میں فتنہ بھرا ہوا ہے۔ بات بات پہ چاقو نکال لیتے ہیں اور زبان پہ تو انھیں قابو ہی نہیں۔ اب نواب بہادر سے کچھ کہنے کے لیے بھی میرا منہ نہیں پڑے گا۔ میں نے دو مرتبہ اُن کا ہرکارہ واپس کر دیا ہے۔ آپ کا اُن کے سامنے جانا مناسب نہیں، اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے، اس وقت کسی طور سے یہ بلا ٹل جائے تو بہت ہے۔"

"خانم، جتنا ڈرو گی، اتنی ہی بات خراب ہوگی، مجھے ساتھ نہیں لے جانا، مت لے جاؤ۔ تم خود جا کے بات کرو۔"

"اُف خدا۔" خانم اپنا ماتھا پکڑے بیٹھی رہی۔ پھر لرزیدہ آواز میں بولی۔ "اگر اُس نے بابر میاں کو پوچھا یا رجو میاں کو بلایا تو آپ مت بھیجیے گا۔ میں کہہ دوں گی، دونوں گھر پہ نہیں ہیں، جب تک میں نہ آ جاؤں آپ سب یہیں رہیے۔"

"نہیں، وہ بلائے تو انھیں بلا لینا، جو بات ہو وہ ایک ہی بار ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔ وہ انھیں کھا نہیں جائے گا۔"

"وہ بہت بُرا ہے۔"

"تو یہ بھی آدمی کے بچے ہیں۔"

"چند روز تک، اب چند روز ہی کی تو بات ہے۔"

"نہیں خانم۔" تجمل نے پہلی بار سختی سے کہا۔

"اچھا آپ یہیں بیٹھے رہیے، جیسا کچھ ہوگا، میں کسی عذر سے درمیان میں آ کے آپ کو بتا دوں گی۔" خانم سٹ پٹا کے بولی اور شجاعت کے ساتھ بیٹھک سے باہر چلی گئی۔ اُس کے جاتے ہی تجمل نے نیساں سے کہا، وہ یہ دیکھ کے آئے کہ خانم نے شاہ کبیر کو کس جگہ بٹھایا ہے۔

"برابر والی چھوٹی بیٹھک میں ہی وہ اسے بٹھا سکتی ہیں۔" نیساں کی آواز بھی لرز رہی تھی۔ جہاں گیر گنگ ہو گیا تھا۔ میں نے تجمل سے پوچھا کہ کیا میں خانم کے پاس چلا جاؤں؟ اُس نے انکار کر دیا۔

"بیچارہ لاڈلے۔" وہ تلخی سے بولا۔

نیساں بیٹھک سے چلی گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ حواس باختہ بھاگتی ہوئی آئی۔ "وہ کہتے ہیں کہ بابر بھائی کو ہمارے سامنے لاؤ۔ آپی منتیں کر رہی ہیں۔ شاہ کبیر بہت غصے میں معلوم ہوتا ہے۔ میں نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کے اُن کی کچھ باتیں سُنی ہیں۔ وہ اُونچی آواز میں بول رہا ہے اور خانم کی کوئی بات نہیں سُن رہا ہے۔"

تجمل کھڑا ہو گیا۔ اُس نے مجھے اشارہ کیا۔ جہاں گیر بھی ساتھ چلنے لگا۔ تجمل نے اُسے منع کیا لیکن وہ نہیں مانا۔ ہم تینوں ایک ساتھ چھوٹی بیٹھک میں داخل ہوئے۔ خانم تخت پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ مونڈھوں پر چار آدمی موجود تھے۔ اُن کے درمیان جو شخص سب سے نمایاں تھا، وہی شاہ کبیر ہوگا۔ اُس کی بڑی بڑی مونچھیں اوپر اُٹھی ہوئی اور آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ لمبے بال پیچھے کی طرف لوٹے ہوئے تھے اور کئی گندھی ہوئی چوٹیاں شانوں پہ جھول رہی تھیں۔ گلے میں سونے کی زنجیر، کان میں کالا ڈورا، ٹھوڑی

و کا نشان، قد زیادہ بڑا نہیں تھا مگر جسم ٹھکا ہوا تھا، اُس نے ململ کا پیلا
ا اور لٹھے کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ رنگ سُرخی مائل سیاہ، لمبی ناک اور بڑا سَر،
پہ نظر پڑتے ہی خانم بوکھلا کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ شاہ اور اُس کے
تھیوں نے گردن موڑ کے ہمیں دیکھا اور اُن کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے۔

"کیا بات ہے خانم؟" جھّل نے ہلکی آواز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں، یہ شاہ کبیرا ہیں۔" وہ کانپتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اِس
تے کے خاص آدمی ملنے کے لیے آئے ہیں اور یہ... یہ میرے مہمان ہیں۔"

"ان میں وہ لڑکا تو نہیں جس نے مَولا اور اُس کے ساتھیوں پر
ر اُٹھایا تھا؟" شاہ کبیرا کی بھاری آواز کمرے میں گونجی۔

خانم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا تم اُس سے ملنا چاہتے تھے شاہ؟" جھّل نے پوچھا۔

"ہاں اس لونڈے کی صورت دیکھنا ہے۔"

"دیکھ لو شاہ! خوب اچھی طرح دیکھ لو، یہی ہے وہ۔"

"آپ لوگ اندر بیٹھیے، میں ابھی آتی ہوں۔" خانم نے التجا کی۔

"خانم بات بولو، شاہ کبیرا کیا چاہتا ہے۔" جھّل نے بگڑتے ہوئے
میں کہا۔ "شاہ کبیرے! خانم نہیں بتائے گی، تم بولو۔"

"سُریلی خانم!" شاہ کبیرا نے منہ بنا کے پوچھا۔ "یہ کون لوگ ہیں؟"

"یہ میرے مہمان ہیں، یہ آپ لوگوں کو نہیں جانتے۔" وہ گھگھیا
بولی۔ "اسی لیے......"

"خانم! ہم اپنے آپ کو جنوانے آئے ہیں۔"

"آپ اندر چلیے، میں خود ان سے بات کرتی ہوں۔"

"ایسی کیا بات کر رہی ہو؟"

"خدا کے لیے آپ چلے جائیں۔" خانم عاجزی سے بولی۔

"تم ہی بولو شاہ کبیرے! عورت سے کیا بات کرتے ہو۔"

"بول دے بھئی۔" شاہ کبیرا نے بے پروائی سے اپنے ایک ساتھی
م دیا۔ "انھیں بھی بول دے۔ خانم کے مہمانوں کا کچھ تو خیال رکھنا پڑے
ہ ختم کر۔"

شاہ کبیرا نے جس آدمی کو اشارہ کیا تھا، وہ بھن بھنانے لگا۔ "شاہ کبیرے
سی آدمی پہ پہلی بار سبازار میں ہاتھ اٹھایا گیا ہے۔" وہ میری طرف دیکھ
قے سے بولا۔ "اسے بازار میں سب کے سامنے، شاہ، مَولا اور اُس کے
ھیوں سے معافی مانگنی پڑے گی۔"

"ورنہ کیا ہو گا؟"

"ورنہ اسے اُٹھا لیا جائے گا۔"

"اور کوئی بات؟"

"اور خانم مکان کے سودے کا پندرھواں حصہ شاہ کبیرے
ے گی، یہاں بکنے والے تمام مکانوں کا یہی ہوتا ہے اور جانے سے
پہلے خانم شاہ کبیرے کے ہاں مجرا کرے گی۔"

"اور کچھ؟"

"بس یہی۔"

"نہیں، کوئی اور بات ہو تو بولو۔"

"بس یہی۔"

"اور اگر خانم ان سب سے انکار کر دے۔"

شاہ کبیرا ہنسنے لگا۔

"نہیں نہیں بولو، پھر کیا ہو گا؟"

"پھر بُرا ہو گا۔"

"کیا بُرا ہو گا؟"

"پھر خانم کا یہاں سے نکلنا مشکل ہو سکتا ہے۔ اس چھوکرے کا
یہ مکھڑا ابھی داغ دار ہو جائے گا اور بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

"تم لوگ کس برتے پہ یہ بات کر رہے ہو؟"

شاہ کبیرا دوبارہ ہنسنے لگا، اُس کا ساتھی جلدی سے بولا۔ "شاہ کبیرا
یہاں کا بادشاہ ہے، بادشاہ کس برتے پہ بات کرتا ہے۔" اُس نے چاقو
نکال کے اُچھالا اور اُس کی دھار پہ انگلی پھیرنے لگا۔

"میں خانم کی طرف سے تمھاری تمام باتوں سے انکار کرتا ہوں۔"

"نہیں نہیں۔" خانم ہذیانی انداز میں بولی۔

"تم کون ہوتے ہو خانم کے معاملے میں بولنے والے۔"

"ہم اس علاقے کے لوگ ہیں۔"

"زیادہ بک بک مت کرو۔" شاہ کبیرے نے اپنے ساتھی کو جھڑک
دیا۔ "میں نے بول دیا ہے کہ ہم کو خانم کے مہمانوں کا خیال کرنا چاہیے۔"

"جاؤ شاہ کبیرے! جو دل چاہے کرو، خانم کی طرف سے میں نے
جواب دے دیا ہے۔"

خانم نے اپنا چہرہ سینے میں چھپا لیا۔

"کیوں خانم! کیا یہی تمھارا جواب ہے؟"

"نہیں۔" خانم پھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے تمھاری سب باتیں
منظور ہیں، میں پندرھواں حصہ بھی تمھیں دے دوں گی اور میں۔ میں جانے
سے پہلے تمھارے ہاں ایک دن ضرور آؤں گی لیکن..... میں۔ تم بار بار یہاں
کو مت بلاؤ۔"

"نہیں خانم! پھر ان سے ایک یہ رعایت بھی کیوں لے رہی ہو۔"
جھّل نے تنک کے کہا۔ "شاہ کبیرے، ہم کو تمھاری تیسری بات بھی منظور
ہے۔ اب ہم کیا بولیں، ہم بھی خانم کے مہمان ہیں، کچھ اس کا حق بھی ہم پر
ہے۔ بولو، تم کہاں لے جانا چاہتے ہو؟ کس چوراہے پر؟"

شاہ کبیرے کو جواب دینے میں تامّل ہوا۔ وہ تیکھی نظروں سے جھّل
کو گھورنے لگا۔ اُس کے کچھ کہنے سے پہلے اس کا ساتھی نخوت سے بولا۔ "میرا
کے ہوٹل پر چلو۔"

"چلو! چل بھئی لاڈلے! شاہ کبیرا کی بات مان لے۔ مان لے ملنگ،
نرم گرم چلتا ہے، ہم کو کون سا ادھر رہنا ہے۔ خانم! تم بے فکر رہو، ہم لوگ
شاہ کے ساتھ جاتے ہیں اور ابھی واپس آجاتے ہیں۔ شاہ کا تاج سَر پہ
رہنے دو، چلو شاہ!"

"نہیں شاہ۔" خانم رو پڑی۔

شاہ کبیرا کچھ متذبذب ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کی طرف
دیکھا اور ایک جھٹکے سے اُٹھ گیا۔ "بھگتے! مَولا کو میرا کے ہوٹل پہ لے کے آ،
اُن دونوں اُٹھائی گیروں کو بھی ساتھ پکڑ لانا۔"

خانم نے شاہ کبیرے کا دامن پکڑ لیا۔ "خانم! بھیک مت مانگو۔"
جھّل نے چیخ کر کہا۔ "ہم مرنے نہیں جا رہے ہیں۔ شاہ کبیرا زبان کا اتنا
ڈھیلا نہیں ہو گا۔ لاڈلا دو ہاتھ اُٹھا کے اور دو لفظ منہ سے بول کے صحیح
سلامت واپس آجائے گا۔ شاہ کبیرا کی بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ یہ اِس
کی ناک کا سوال ہے۔ شاہوں کی ناک سدا اُونچی ہوتی ہے۔ کیوں شاہ!
یہی تمھاری خواہش ہے؟"

شاہ نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

جھّل دروازے پہ آگیا تھا۔ شاہ کے تینوں ساتھی بھی کھڑے
ہو گئے تھے۔ میں نے جہاں گیر کو سختی کے ساتھ وہیں ٹھیرنے کی تاکید
کی۔ ہم سب گھر سے باہر آگئے۔ ہوٹل سے کچھ آگے ایک تنگ چور رستہ
تھا۔ کبیرے کا ایک آدمی پچھلی گلی سے مُڑ گیا تھا۔ آگے آگے شاہ، اُس کے
پیچھے اُس کے ساتھی اور اُن کے پیچھے ہم چل رہے تھے۔ جہاں جہاں سے
شاہ گزرا، لوگوں نے رستہ چھوڑ دیا اور نظریں چُرانے لگے۔ بہت سوں
نے اُسے سلام کیا۔ جواب میں شاہ نفی کے انداز میں گردن ہلا دیتا تھا۔
بالاخانوں پہ کھڑی ہوئی عورتیں اندر چلی گئیں۔ جو باہر رہیں، وہ ایک دوسرے
سے کانا پھوسی کرنے لگیں۔ کسی نے شاہ کو اُوپر آنے کا اشارہ کیا۔ کسی نے
نشانہ لگا کے ایک پھول اُس کے چہرے پہ مارا۔ گلی کے تقریباً تمام لوگ ہم
سے واقف ہو گئے تھے۔ صبح مَولا سے جھگڑے کی خبر بھی شاید سارے ہی
بازار میں پھیل گئی ہو گی۔ لوگ پہلے شاہ کو دیکھتے تھے پھر ہمیں۔

میرا کے ہوٹل پہ آ کے شاہ کبیرا رُک گیا۔ ہوٹل کے مارواڑی مالک نے
فوراً ایک کُرسی گلی میں ڈال دی۔ اُس کے باقی دو ساتھی تپائی پر بیٹھ گئے۔ ہم نہیں
بیٹھے اور نہ شاہ کبیرا نے ہمیں اس کا حکم دیا۔ ہم ہوٹل کے آگے ٹاٹ کے سائبان
کے نیچے کھڑے رہے۔ ہوٹل کا ایک بیرا شاہ کے پیر دبانے لگا۔ گلی کے
دونوں اطراف بالاخانے تھے اور یہ جگہ نسبتاً زیادہ آباد تھی۔ نچلی منزلوں
کے دروازوں، کھڑکیوں اور کوٹھوں پہ لوگ تاکا جھانکی کرنے لگے تھے۔ ہوٹل
میں موجود گاہک بھی اپنی اپنی نشستوں سے اُٹھ کے چبوترے پہ کھڑے
ہو گئے تھے۔ ہوٹل کے مالک نے آنکھوں آنکھوں میں شاہ کے ساتھی سے
پوچھنے کی کوشش کی کہ شاہ کی برہمی کا کیا سبب ہے۔ اس پہ وہ گرجنے
برسنے لگا۔ "شاہ کبیرے کا ہر آدمی شاہ کبیرے کی جگہ ہوتا ہے۔ کسی سے
کوئی شکایت ہو تو اپنے باپ شاہ کبیرے سے بولو، اس سے بدلے بنا
اپنے آپ فیصلہ کرنا شاہ کبیرے کی بے عزتی ہے، یہ چھوکرا حرام زادہ شا
کے آدمی مَولا کے آگے آیا ہے۔"

"ٹھیک بولتے ہو کالے دادا، پر ادھر سالا گلی کا سارا لوگ اس بات
خیال رکھتا ہے۔ ابھی اپن نے خود کتنا بار شاہ کو بولا ہے۔ شاہ نے ایک
دم ہر ٹیم اپن کی بات سُنا۔" ہوٹل کا مالک خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "زا نول
ابھی شاہ، چھوڑ دو، اس کو معاف کر دو۔"

"جان بچا گیا مارواڑی سیٹھ ورنہ سالے کا ہڈی بھی دکھائی نہیں دیتا۔" و
شخص جس کا نام ہوٹل والے نے کالا لیا تھا، تھوک کے بولا۔

ہم نے کچھ نہیں کہا۔ شاہ کے آدمی گندی گندی گالیاں بکتے ر
مچاتے رہے۔ وہ چاروں طرف دیکھتے تھے جیسے سب سے مخاطب ہو
اُن کی نشا بھیڑ لگا رہا تھا۔ پہلے تو لوگ سہمے سہمے دُور دُور رہے لیکن جب
کی جانب سے اُن کے کھڑے رہنے پہ کسی ناراضی کا اظہار نہیں کیا گیا
رفتہ رفتہ اُن کی تعداد بڑھتی گئی۔ بازار کا وقت شروع ہو رہا تھا۔ بازار میں
والے تماش بین بھی اس بھیڑ میں شامل ہو گئے۔ گلی میں شاہ کے آدم
کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ ہوٹل کا گراموفون بند کیا جا چکا تھا۔ یکایک
پولیس والے بھی آگئے۔ شاہ نے صرف اپنی پتلیوں کو جنبش دی تھی کہ و
گئے۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اور کسی کسی جگہ روشنیاں جل گئی تھیں۔ بھگت
واپس آگیا۔ اُس کے ساتھ مَولا اور کئی آدمی بھی تھے۔ ان میں وہ لڑکے
موجود تھے جو صبح مَولا کے ساتھ نظر آئے تھے۔ مَولا سے اپنے پیروں
کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ گردن سے لٹکے ہوئے کپڑے میں اُس کا ہا
جھول رہا تھا۔ دوسرے ساتھی کا بھی یہی حال تھا۔ انھیں شاہ کے روبر
کر دیا گیا۔ شاہ کی پُشت پر بھی بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ ایک
نے مَولا کی کمر پہ دھپ مار کے اُسے سیدھا کھڑے ہونے پہ مجبور کیا
گرتے گرتے بچا۔

"یہی تھا وہ؟" کبیرے کے ایک دوسرے آدمی نے میری طر
انگلی اُٹھا کے پوچھا۔ "اسے پہچان لے۔" مَولا نے مُردنی سے ہاں
کبیرے کا آدمی مُڑ کے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "چھوکرے! آگے بڑ
بازار کا ٹیم ہو گیا ہے۔"

"شاہ کبیرے! اپنا لاڈلا نہیں مانتا۔" جھّل نے اُونچی آواز
"بولتا ہے اِس بے عزتی سے بہتر ہے کہ شاہ سے لڑتے لڑتے
دے دوں۔"

شاہ کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ اُس نے اُچھل کے کُرسی چھو
جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اُس کا سر تھرانے لگا۔ اُس کے سات

اُس کے ساتھ چند قدم آگے بڑھے۔ "ٹھہرو شاہ!" تجمل نے چیخ کر کہا "یہ بولتا ہے شاہ جھوٹا شاہ ہے۔ اس میں دم خم نہیں ہے۔ خالی پیلی ٹنگ جماتا ہے۔ نہ اُس سے چاقو چلانا آتا ہے اور نہ علاقہ سنبھالنا۔ اُس نے علاقے کے سارے لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ بولتا ہے کہ شاہ کو اس جگہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔" ابھی تجمل نے اپنی بات ختم نہیں کی تھی میں نے چاقو نکال لیا۔ "اس کا کہا مان لو شاہ! یہ تمھیں بھرے بازار میں کی دے رہا ہے۔ اس کی زبان اور ہاتھ پیر کاٹ لو۔ اور یہ کوئی غلط بات یں کر رہا تم نے بھی کبھی اسی طرح یہاں کھیل تماشا کیا ہوگا۔ یہ بولتا ہے کہ اہ کو مجھ سے معافی منگوانی ہے تو چاقو کے زور پہ منگواتے سب بات ٹھیک ں ہوتا ہے۔ ابھی تم اس کو سمجھو یہ میرے قابو میں نہیں ہے لیکن ایک ت سن لو۔ تمھارے جواب دینے سے پہلے تمھارے کسی آدمی نے کوئی بول کی تو یہاں خون ہی خون ہوگا۔ تم میں سے ایک بھی واپس نہیں جا سکے گا۔" ل کا لہجہ اکھڑ گیا تھا۔ "شاہ بولو! کیا بولتے ہو؟"

شاہ کا چہرہ بگڑ گیا۔ اُس کے دو تین آدمی چاقو کھولے ہوئے مجھ پر پٹنا چاہتے تھے وہ تجمل کی آواز سن کے ٹھہر گئے۔ "کیوں شاہ؟ اپنے ام آدمیوں کو حکم دو کہ وہ اِس کی بوٹی بوٹی کر دیں تاکہ سب کو اس بات کا ین ہو جائے کہ شاہ کبیرا کس برتے پہ بادشاہت کرتا ہے۔ بے عزتی ں ہونا ہے تو شاہ پھر اِس مافق کیوں نہ ہو، بازار کے لوگ بھی دیکھ لیں گے شاہ نے ایک چھوکرے کو کس طرح مارا۔"

"چپ ہو! اس پہ چاقو اٹھانا بے عزتی ہے۔" شاہ کبیرا گرج کے بولا۔

"تو مجھ پہ اٹھاؤ، پھر اس کی حسرت دل میں باقی رہے گی، بہتر ہے، اہ پہلے اسے ختم کر دو، پھر مجھ کو دیکھنا۔"

"چھوکرے سے بولو، مان جائے۔"

میں نے جیسے ہی شاہ کی طرف چاقو لہرایا، جہاں گیر بھیڑ کاٹتا آکے میرے بازو سے لپٹ گیا۔ میں نے اُسے دھکیل دیا۔ "میں ان طرف سے تم سے معافی مانگتا ہوں۔" وہ شاہ کے سامنے ہاتھ جوڑ کے ا ہو گیا۔

تجمل نے جہاں گیر کو کھینچ لیا اور اُس کے گال پر ایک طمانچہ رسید "کیوں شاہ! قبول ہے؟ جلدی بولو یا پھر اسی طرح واپس چلے جاؤ۔ ار کے لوگ اِسے بھی تمھاری بڑائی سمجھیں گے۔"

"میں اس کی حسرت ضرور پوری کروں گا۔" شاہ غرانے لگا۔

"لیکن پہلے اپنے آدمیوں سے وصیت کر جاؤ۔"

"تو اس چھوکرے سے پوچھ لے کہ اس کی کوئی آخری خواہش ہے؟" اہ کبیرا نے بپھر کے کہا۔ "اسے پانی پلا دو۔"

"یہ لال پانی پینے کا عادی ہے۔"

"نہیں شاہ!" مجمع میں سے ایک لرزتی ہوئی نسوانی آواز آئی۔ وہ خانم تھی۔ خانم برقع کے بغیر چلی آئی تھی۔ وہ شاہ کے پیروں پر گر گئی۔ شاہ نے اُسے ٹھوکر مار دی اور ایک جھرجھری لی جیسے جانور جسم کی دھول جھاڑ رہا ہو۔ میری طرف سینگ مارنے کے انداز میں آیا۔ وہ مجھ سے اتنا قریب ہو گیا کہ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ چند ہی انچ رہ گیا ہوگا۔ اُس نے بائیں ہاتھ سے میرا سینہ ٹھونکا۔ میں نے بھی یہی عمل کیا۔ شاہ کبیرا ایک جھٹکے میں مجھ سے دُور ہو گیا۔ اُس نے ایک طرف ہاتھ پھیلایا۔ کسی نے چاقو اچھالا جو شاہ نے اِس طرح اُچک لیا جیسے شکرا اپنا شکار جھپٹ لیتا ہے۔ وہ چاقو تانے میرا انتظار کرنے لگا۔

اسی لمحے تجمل نے چاروں طرف نظر گھما کے بالا خانوں پر اور گلی میں کھڑے ہوئے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "تم سب آنکھیں کھلی رکھنا اور شاہ کو جتنا دیکھنا ہے، دیکھ لو۔ اِس کے بعد یہ مورت تمھیں نظر نہیں آئے گی۔ مجھ کو پتہ ہے تم سب اِسے دوبارہ دیکھنا چاہتے ہو یا نہیں۔"

شاہ نے تجمل کی بات پر یکسر توجہ نہیں دی۔ وہ میری طرف متوجہ تھا۔ شاہ نے اپنا چاقو ہتھیلی اور کلائی سے اس طرح چپکا لیا تھا کہ نظر نہیں آتا تھا۔ مجمع میں سوئی بھی گرتی تو آواز آتی۔ میں نے پہل کی اور شاہ کی طرف بڑھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ میں پلٹ کے دوبارہ یہی عمل دہرایا شاہ پھر جھک گیا۔ میرا مقصد وار کرنا نہیں تھا۔ صرف شاہ کی پھرتی کا اندازہ لگانا تھا۔ اس میں اچھی خاصی پھرتی تھی۔ اس نے بھی بھڑنے کی جلدی نہیں کی۔ میں نے زیادہ چستی اس لیے نہیں دکھائی تھی کہ شاہ فوراً میرے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کر سکے۔ اُس کی خواہش یقیناً یہ ہوگی کہ وہ پہلے ہی حملے میں میرے ہاتھ سے چاقو چھین لے مگر جہاں اتنے لوگ موجود ہوں، وہاں یہ بے احتیاطی نہیں کی جا سکتی۔ شاہ اپنی خواہش کے باوجود ہر احتیاط کا خیال رکھے گا۔ میری نظریں پوری طرح شاہ اور اُس کی ایک ایک حرکت پر مرکوز تھیں۔

شاہ کے آدمیوں کے لیے شاہ کے خلاف فوراً کوئی فیصلہ ہونا اُن کی برہمی کا سبب بن سکتا تھا۔ مجھے کسی ایسے داؤ کا موقع ملنا چاہیے تھا کہ شاہ کے ساتھی بعد میں کسی قسم کا شکوہ نہ کریں۔ شاہ نے دو تین بار اُچھل کے میرے وار بہ آسانی خالی دے لیے تو میں اُس سے کچھ دُوری پر کھڑا ہو کے اُسے گھورنے لگا۔ پھر میں نے دونوں ہاتھ پھیلا لیے اور شاہ پہ یہ ظاہر کیا کہ میں چاقو مارنے کا دائرہ وسیع کر رہا ہوں اور میری مراد اُس کے بچنے کی جگہ تنگ کرنا ہے۔ یہ کوئی چوڑی گلی نہیں تھی۔ لوگوں کے گھیرے کے درمیان جو جگہ چھوٹی تھی، وہ کم تھی۔ اس طرح آگے بڑھنے میں شاہ کا ردِ عمل یہی ہو سکتا تھا کہ وہ میرے بازوؤں کے دائرے میں چلا آئے اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کر سکوں، وہ خود ہی بڑھ کے

میرے سینے پر چاقو رکھ دے۔ میں نے دو قدم ہٹ کے خود کو اس کے مقابل کیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ شاہ آگے آنے کا خطرہ مول نہ لے اور کسی دوسری طرف نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔ شاہ کو لمحوں میں اپنے آئندہ اقدام کے بارے میں جو بات مجھے سمجھانی تھی، اُس نے اُسے اسی طرح سمجھا جس طرح میں چاہتا تھا۔ اس میں اُس کے لیے خطرہ کم، میرے لیے زیادہ تھا۔ کوئی بھی یوں ایسی تنگ جگہ پر ہاتھ کھول کے مقابل کو براہِ راست سینے تک آنے کا موقع نہیں دے گا۔ میں نے اُسے اس کا موقع دیا تھا تاکہ وہ مجھ سے تیز آگے بڑھ سکے اور یقین کرے کہ جب وہ میرے سینے میں چاقو کی نوک پیوست کرے گا۔ میں اپنے پھیلے ہوئے ہاتھ سمیٹ کے اُس کے کولھے پر چاقو نہیں مار سکوں گا۔ اس وقت میری گرفت کمزور پڑ جائے گی یا میں بوکھلا جاؤں گا۔

وہ میرے اس بچکانہ داؤ کا یقین کر چکا تھا کیونکہ ابھی تک میرے بارے میں اس کی رائے جمی نہیں تھی۔ اُسے میری خوش فہمی سے فائدہ اُٹھانا چاہیے تھا۔ اُس نے چاقو بائیں ہاتھ میں لے لیا اور اپنا ایک ہاتھ ۴۵ ڈگری کے زاویے سے اُٹھائے ہوئے مجھ پہ لپکا۔ اُس کا رُخ سیدھا میری چھاتی کی طرف تھا لیکن اگر میں اسی داؤ پہ قائم رہتا جس کا تاثر میں نے شاہ کو دیا تھا تو اُسے نشانہ لگانے میں دیر نہ ہوتی۔ اِس صورت وہ کسی قدر ترچھا ہو کے اور جسم کو خم دے کے چاقو مارتا تاکہ میں جوابی وار کروں تو میرے چاقو بردار بائیں ہاتھ کی رسائی اُس کے جسم تک نہ ہو سکے اور میں کوئی پینترا بدل لوں تو وہ آسانی سے دائیں جانب نکل جائے۔ وہ ہر طرح مطمئن ہو کے جست لگا کے آگے آیا۔ اِدھر وہ بڑھا، اُدھر میں، لیکن وہ جھک کے میرے سینے پہ چاقو گھونپنے ہی کو تھا کہ میں بھی اچانک جھک گیا اور میں نے نیچے سے اُس کا چاقو والا پہنچا پکڑ لیا۔ شاہ ایک لمحے کے لیے سکتے میں پڑ گیا پھر چنگھاڑنے لگا۔ اُس نے اپنا پہنچا چھڑانے کی بہت تگ و دو کی۔ میرا چاقو والا ہاتھ آزاد تھا۔ شاہ نے اُسے معذور کرنے کے لیے میری کلائی پکڑ لی اور میری نس پہ ناخن کا دباؤ ڈال دیا۔ میں نے بھی اُس کا پہنچا مروڑنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ نے اپنا ناخن نس سے ہٹا لیا۔ میں پکڑی ہوئی کلائی کے باوجود اُس کے شانے پر نوک ضرور چبھو سکتا تھا مگر میں نے یہ نہیں کیا۔ میرے جی میں آئی کہ اپنا چاقو پھینک دوں لیکن اِس طرح اُس کی ساری توجہ میری بجائے اپنا پہنچا چھڑانے پر مبذول ہو جاتی اور فیصلہ جلد ہی ہو جاتا۔ شاہ کو مجھ سے اتنی تیزی کی توقع نہیں ہوگی۔ فاصلہ بہت کم تھا۔ اُس کے سان و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ میں اتنے کم فاصلے پر زاویہ بدل لوں گا۔ وہ اپنے جسم کی پوری طاقت صرف کر رہا تھا اور گالیاں بھی بک رہا تھا۔ میری ماں اور بہنیں اتنی ہی ارزاں ہو گئی تھیں کہ کوئی بھی انھیں گالی دے دیتا تھا۔ شاہ اپنا

پہنچا نہیں چھڑا سکتا تھا۔ چاقو پر اُس کی گرفت مضبوط تھی مگر نہ وہ موجدار تھا نہ تیواڑی۔ میں نے اُسے دھکا دے کے اُس کا پہنچا چھوڑ دیا۔

مجھے یقین تھا کہ شاہ کے حملوں میں شدت آ جائے گی اور وہ شور بھی زیادہ مچائے گا۔ لوگوں کو اس بات پر حیرت ہوئی ہوگی کہ میں شاہ کے پہنچے سے اتنی آسانی سے کیوں دست بردار ہو گیا۔ میں نے تجمل کی طرف نظر کی تھی۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند نہیں کی تھیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ شاہ مجھ پہ پے در پے وار کرنے لگا۔ میں کبھی اِدھر کبھی اُدھر کبھی نیچے بیٹھ کے، کبھی اُٹھ کے بمبئی کے جھنگا استاد کی طرح اُسے دائرے میں گھماتا رہا۔ وہ ہواؤں میں ہاتھ مارتا رہا۔ اُس کی سانس پھول گئی تھی اور ماتھے سے پسینہ بہنے لگا تھا۔ وہ بار بار چاقو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتا اور مجھے فریب دینے کی کوشش کرتا۔ کبھی وہ چیتے کی طرح دہاڑ کے جھپٹتا لیکن اُس کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ بے شک اُس نے میری آستین پھاڑ دی تھی لیکن وہ چاقو میری جلد تک نہ پہنچا سکا۔ "بس لاڈلے! آنکھیں تھک گئی ہیں۔" مجھے تجمل کی آواز سنائی دی۔ "یہ جلدی کر، لوگوں کو کام پر بھی جانا ہے۔"

"کیا کروں؟" میں نے اُس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا کیونکہ اِس دوران میں صرف ایک شخص دیکھا جا سکتا تھا اور وہ تھا شاہ کبیرا۔ مجھے اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ کون کہاں کھڑا ہے؟ جہاں گیر اور خانم کا کیا حال ہے؟ شاہ کا پہنچا پکڑنے کے بعد میں نے ایک ہی لمحے کے لیے تجمل کو دیکھا تھا۔ جہاں گیر اور خانم میں سے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔

"کاٹ دے۔" تجمل نے پُرسکون آواز میں جواب دیا۔

یہ سُن کے میں نے مدافعت ختم کر دی۔ اور اُس کے وار سے پہلو بچا کے ایک کونے میں چلا گیا۔ تجمل نے جس بات کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ آسان نہیں تھی۔ میرے سامنے کوئی اور شخص نہیں، شاہ کبیرا تھا، اِس علاقے کا سب سے چابک دست آدمی۔ تجمل کی ہدایت پر مجھے بہت احتیاط سے عمل کرنا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی دھار کا چاقو تھا اور وہ اچھے خاصے داؤ پیچ بھی جانتا تھا۔ درمیان میں خود ہی داؤ پہ داؤ نکل آتے ہیں لیکن تمام امکانی داؤ نظر انداز کر کے کسی ایک داؤ کا موقع تلاش کرنا مشکل کام ہے۔ اس اثنا میں ذرا بھی اُنیس بیس ہو جائے تو سارا معاملہ اُلٹا ہو سکتا ہے۔ مجھے سب سے پہلے اُس کا چاقو چھیننا تھا۔ اِس کی تدبیر ایک تو وہ تھی جو میں نے تیواڑی کے ساتھ کی تھی کہ اپنا چاقو پھینک کے اُس کا دھیان بٹا دوں مگر چاقو ایک بار ہاتھ سے نکلنے کے بعد دوبارہ حاصل کرنے میں دُشواری پیش آ سکتی تھی اور مجھے چاقو کی ضرورت تھی۔

شاہ کبیرا کچھ سوچ کے سنبھل گیا تھا۔ اب کے میں اُس کی طرف گیا۔ کبیرا نے مجھے بڑھنے دیا مگر میں درمیان ہی میں رک کے اُلٹے قدموں

اپنی جگہ لوٹ آیا۔ کبیرے نے اپنا ہاتھ سیدھا کر کے چاقو آگے کر لیا تھا۔ میں جتنی تیزی سے آیا تھا۔ اتنی تیزی سے ترچھا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقفے میں کبیرا وار کرنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ اُس نے مدافعت کا انتہائی آخری حربہ اختیار کیا تھا۔ اُس نے پیچھے اور دائیں بائیں کچھ جگہ اپنے لیے محفوظ رکھی تھی۔ تاکہ اُسے حرکت کرنے میں آسانی ہو۔ اُس کا دوسرا ہاتھ لٹکا ہوا تھا۔ مجھے ہر طور اُس کا دراز ہاتھ پکڑنا تھا اور یہ تبھی ممکن تھا جب میری جانب سے اُس کے دماغ میں کسی اور داؤ کا شبہ نہ پیدا ہو جائے۔ میں نے چند فٹ آگے بڑھ کے فاصلہ کم کیا اور چاقو اس انداز میں تان لیا جیسے اُس پر صحیح نشانہ لگانے کے لیے پر تول رہا ہوں اور قریب جانے کے بجائے اپنی جگہ ہی سے اُس پر چاقو اچھال دوں گا۔ اُسے مجھ سے اس گھٹیا حرکت کی توقع نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن وہ خود اوچھا آدمی تھا۔ اُس نے یہی جانا کہ میرا ارادہ اب دُور ہی سے تاک کے چاقو پھینکنے کا ہے۔ جواب میں وہ خود ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اُس کا ہاتھ پہلے ہی دراز تھا۔ ایسا کرنے کے لیے اُسے اپنا ہاتھ پیچھے کر کے نشانہ بھی قائم کرنا تھا۔ اُس نے اُسی پر عمل کیا۔ جیسے ہی اُس کا ہاتھ پیچھے کی طرف گیا میں نے جست لگائی اور آناً فاناً چاقو دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔ شاہ کبیرا گڑبڑا گیا۔ یہ دیکھ کے اُس نے اپنا ہاتھ پھر آگے کرنا چاہا لیکن میں نے اُس کے سینے کی طرف چاقو سیدھا کر کے دوسرے ہاتھ سے اُس کا پہنچا پکڑ لیا تھا۔ اُس نے بھی میرا چاقو والا ہاتھ گرفت میں لے لیا تھا اور اُسے اپنے سینے سے دُور کرنے کی فکر میں تھا مگر نوک اُس کے سینے میں پیوست تھی۔ اُس کے لیے اُسے اپنے جسم کو کوئی بڑی جنبش دینے میں اندیشہ تھا۔ میں نے دباؤ بڑھایا تو اُس نے اپنا چاقو چھوڑ دیا اور غیر متوقع طور پر میری ناک پر مکا مارا۔ میں لڑکھڑا گیا۔ میری ناک سے خون نکل آیا تھا۔ میں نے اُسے دوبارہ چاقو نہیں اُٹھانے دیا۔

ہتھیار سے محروم ہو جانے کے بعد بھی شاہ کبیرا ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ میں نے اپنا چاقو پھینکنے سے احتراز کیا۔ اصولاً یہ لازم بھی نہیں تھا حالانکہ جی یہی چاہتا تھا۔ شاہ کبیرا کے دونوں ہاتھ اب آزاد تھے۔ وہ دوبارہ میرا ہاتھ پکڑنے میں کامیاب ہو جاتا تو اپنے دونوں ہاتھوں کا زور ڈال سکتا تھا۔ میں اُس کے قریب ہوتا رہا اور اُس کے اُچھلنے کودنے کی جگہ محدود کرتا رہا تا آں کہ ایک جگہ میں نے دانستہ اپنا ہاتھ پکڑا دیا۔ اُس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے جکڑ لیا۔ میں نے چاقو چھوڑ دیا لیکن چاقو زمین پر نہیں گرا۔ وہ میرے دوسرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ میں نے اُسے اُس کے پیٹ میں چبھو کے جھٹکے سے کھینچا۔ اُس کا ازار بند کٹ چکا تھا۔ پنجل نے یہی کہا تھا۔

شاہ کبیرا یک لخت زمین پر بیٹھ گیا۔

زمین پر جیسے ایک گٹھری پڑی ہوئی تھی۔ اُس نے بُری طرح اپنا جسم سکوڑ لیا تھا۔ میں اُس کے پاس چاقو لیے کھڑا رہا۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔ چند لمحوں تک وہ اُسی طرح سمٹا اور بندھا ہوا منہ چھپائے گلی کے فرش سے چمٹا رہا پھر اچانک کسی دیوانے کے مانند اُٹھا اور ایک طرف مجمع میں جا گھسا۔ لوگ اُس کے لیے جگہ چھوڑتے ہوئے ایک دوسرے پر گر گئے۔ اس کے بعد مجھے اس کی صورت نہیں دکھائی دی۔

کسی نے میرا شانہ ہلایا تو میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ پنجل میرے پیچھے کھڑا تھا اور اُس کے ہاتھ میں شاہ کبیرا کا چاقو تھا۔ اُس نے چاروں طرف گھوم کے چاقو دکھایا۔ کوئی شخص آگے نہیں آیا پھر اِدھر پنجل نے چاقو بند کیا، اُدھر ایک ساتھ کئی چاقو پنجل کے پیروں پہ گرے اور ہجوم میں ایک شور اُٹھا۔ ہوٹل کے مارواڑی مالک نے دوڑ کے میری ٹانگیں پکڑ لیں۔ ”واہ مائی باپ!“ وہ اپنا سر مارتے ہوئے بولا۔ ”اپن کو جوتا مارو۔“ وہ اپنے گالوں پر طمانچے مارنے لگا۔ ”اپن کو بخش دو دادا!“

اُس نے نہ جانے اور کیا کہا۔ جہاں گیر آ کے مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ پاس ہی خانم بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ میں نے بے اختیار اپنا بازو پھیلا دیا۔ وہ میرے پہلو سے لگ گئی اور میرے شانے پر سر رکھ کے ہچکیاں لینے لگی۔ میں صرف اتنا دیکھ سکا کہ کالے دادا پنجل سے گلے مل رہا ہے اور مَولا ہوٹل کے چبوترے کے نزدیک بے سُدھ پڑا ہے پھر کسی ایک کا چہرہ دکھائی دینا مشکل ہو گیا۔ بالاخانوں کی عورتیں چیخ پکار مچا رہی تھیں اور اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے لوگ مجھ پہ ٹوٹ پڑنے کے لیے بے تاب تھے۔ خانم کی موجودی کی وجہ سے وہ میرے نزدیک آ کے ٹھہر گئے۔ کوٹھوں پر کھڑی ہوئی کئی عورتوں نے اپنے کانوں اور بالوں سے ہار پھول نوچ کے میری طرف پھینک دیے تھے اور ایک ساتھ کئی عورتوں کا غول بھیڑ کاٹتا ہوا اندر آ گیا تھا۔ انھوں نے خانم کو گھیر لیا۔ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ خانم چیختی چلاتی اور مجھے کھینچتی ہوئی باہر لے آئی لیکن ہمارے پیچھے لوگوں کا ہجوم کم نہیں ہوا۔ اچانک مجھے پنجل کا خیال آیا۔ وہ ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ میرے قدم منجمد ہو گئے۔ میں نے بے چینی سے مڑ کے دیکھا۔ وہ آ رہا تھا اور شاہ کبیرا کے آدمیوں کی جلو میں آ رہا تھا۔

لوگ ہمارے ساتھ خانم کی گلی تک چلے آئے۔ بڑی بیٹھک کھول دی گئی۔ پنجل کئی آدمیوں کے ہمراہ وہاں جا کے بیٹھ گیا۔ خانم مجھے اُوپر لے گئی۔ میری آستین کبیرا نے چیر دی تھی۔ مجھے کچھ احساس ہی نہیں رہا۔ میں نے خانم کے سامنے کُرتا اتار دیا۔ خانم میرے بازو ٹٹولنے لگی لیکن جسم پر زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اُس کی کپکپاتی ہوئی اُنگلیاں میری گردن اور بالوں میں مچل رہی تھیں۔ جہاں گیر میرے گھٹنوں پر سر رکھے مجھے گھور رہا تھا

جیسے میری شکل بدل گئی ہو۔ اُس کی آنکھوں کی چمک کبھی تیز ہو جاتی کبھی مدھم پڑ جاتی۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ وہ تو بس ٹکر ٹکر مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے سوچا، اُس سے کہوں منّے! آنکھیں بند کر لے۔ اس طرح مت دیکھ۔ جہاں گیر کو بھی گھر سے نکلے ہوئے کئی سال ہو گئے تھے۔ جو باتیں آدمی گھر میں دیر سے سمجھتا ہے وہ باہر جلدی سمجھ لیتا ہے۔ جہاں گیر میں بھی بہت سمجھ آ گئی تھی۔ اب اُس کی مونچھیں پھوٹ رہی تھیں اور گالوں پر روئیدگی اُبھر رہی تھی۔ اُس نے اپنے طور پہ بہت کچھ قیاس کر لیا ہو گا کہ اُس کا بھائی اتنے دنوں تک کہاں رہا۔ اُس نے مجھ سے اس بابت پوچھا بھی تھا مگر میں نے ٹال دیا تھا۔ اب وہ ضرور کڑیاں ملا رہا ہو گا۔ میں نے سوچا، اُسے بتا دوں کہ میں نے جیل میں تعلیم بھی حاصل کی ہے، میری فرسٹ کلاس آئی تھی۔ مجھے فکر ہو رہی تھی کہ جہاں گیر مجھ سے خوف زدہ تو نہیں ہو گیا ہے۔

نیساں گرم گرم چائے لے آئی تھی۔ میں نے جہاں گیر کی نگاہیں منتشر کرنے کے لیے نیساں سے پوچھا کہ اُسے لینے کے لیے اُس کے گھر سے کوئی آیا تو نہیں تھا۔ نیساں نے نفی میں جواب دیا۔ اُس کے جواب سے مجھے کچھ سکون ہوا۔ خانم مجھے کچھ دیر آرام کرنے کا مشورہ دے رہی تھی لیکن میں نیچے چلا آیا اور جہاں گیر کو بھی اپنے ساتھ لیتا آیا۔ بیٹھک میں پنجل اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو سب کھڑے ہو گئے اور مجھ سے بغل گیر ہونے کے لیے لپکے۔ اِن میں کالے دادا بھی تھا۔ اُس نے مجھے زور زور سے بھینچ لیا۔ میرے گالوں کو بوسہ دیا اور میری اُنگلیاں چومیں۔ اُس نے جہاں گیر کو بھی اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ رات کا کھانا بھی ان سبھوں نے خانم کے ہاں کھایا اور پنجل سے صبح اڈّے پر آنے کا وعدہ لے کے رخصت ہو گئے۔ وہ اڈّے اور شاہ کبیرا کے متعلق بہت سی باتیں کرنا چاہتے تھے لیکن پنجل نے غالباً جہاں گیر کی وجہ سے ہر بات آنے والی صبح پر ملتوی کر دی۔

دوسرے دن صبح خلافِ توقع خانم سحر خیزی کے لیے ہمیں اُٹھانے نہیں آئی۔ وقت پر میری آنکھ خود ہی کُھل گئی اور میں حسبِ معمول جہاں گیر کو لے کے نکل گیا۔ رات کو بھی سوتے وقت وہ گُم سُم رہا تھا۔ خانم نے بھی کوئی خاص بات نہیں کی تھی۔ کھانے کے دوران بھی خاموشی طاری رہی تھی۔ خانم بہت گھبرائی گھبرائی نظر آتی تھی۔ شاید اُسے خدشہ لاحق ہو گا کہ شاہ کبیرا مشتعل ہو کے واپس نہ آ جائے اور کوئی دوسری رُکاوٹ درمیان میں پیش نہ آ جائے۔ میں اُس سے یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ کبیرا کی واپسی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ اب نہیں آئے گا۔ وہ ضرور پوچھتی کہ میں یہ بات اتنے وثوق سے کیوں کہہ رہا ہوں۔ میرے پاس کوئی جواب نہ ہوتا۔

راستے میں کئی بار میں نے جہاں گیر سے بات کرنے کا ارادہ کیا لیکن سارا راستہ یوں ہی گزر گیا۔ آج مَولا اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ گلیوں میں ایسے کئی آدمی ملے جنھوں نے بڑھ کے ہم دونوں کا حال پوچھا۔ اُس دن ہم زیادہ دُور نہیں گئے تھے۔ جلد ہی گھر واپس پہنچ گئے۔ خانم پریشان تھی۔ سویرے سویرے شاہ کبیرے کے چند آدمی پنجل کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ خانم نے مجھ سے کہا بھی کہ میں ذرا جا کے دیکھوں۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ وہ جلد ہی واپس آ جائے گا۔ ناشتے کے بعد نیساں نے چپکے سے میرے کان میں آ کے بتایا کہ اُس کی ماں آئی ہوئی ہے۔ میں نے اُسے ہدایت کی کہ اگر وہ واقعی ہمارے ساتھ جانا چاہتی ہے تو اپنی ماں سے صاف صاف کہہ دے۔ وہ سہمنے لگی اور بولی کہ میں اپنی ماں کے سامنے اتنی بڑی بات نہیں کہہ سکتی، میں نے کہا کہ پھر وہ خاموش رہے۔ نیساں کی سمجھ میں میری بات کچھ آئی، کچھ نہیں آئی۔

میں نے نیساں کو سمجھا بجھا کے بھیج دیا تھا لیکن شوکت آرا کے آنے کی اطلاع سے مجھے خود بے چینی ہونے لگی تھی۔ سارے بازار میں خبر ہو گئی تھی کہ خانم کے ہاں ٹھہرے ہوئے مہمانوں میں سے ایک نے شاہ کبیرا پہ چاقو اُٹھایا ہے۔ جب شوکت آرا کو یہ پتہ چلا ہو گا کہ یہ وہی شخص تھا جو ایک دن پہلے اُسے چیک دے کے گیا ہے تو اس نے میرے بارے میں رائے بدل دی ہو گی۔ رات بھر اُس نے سوچا ہو گا۔ یوں بھی وہ کہاں آمادہ تھی۔ آخر وہ نیساں کی ماں ہے۔ نیساں کے سلسلے میں کوئی فیصلہ کرنے کا حق اُسے یا خود نیساں ہی کو ہے۔ نیساں میں ہمت نہیں ہے۔ فی الحال میں بھی گھر واپس جانے کی ہمت نہیں تھی ورنہ وہ گھنگروؤں کی زنجیر توڑ کے چلی جاتی مگر جاتی کہاں! ایسی لڑکیاں پھر کہاں جا سکتی ہیں۔ میں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا کہ شاہ کبیرا کے واقعے کے بعد نیساں کی ماں اپنی رائے بدل سکتی ہے لیکن کبیرا سے معافی مانگنے کے بجائے مر جانا زیادہ بہتر تھا۔

معلوم نہیں کہ وہ کیوں آئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ نیساں کو دیکھنے آئی ہو یا یہ بھی ممکن تھا کہ رات بھر شوکت آرا نے حساب کتاب لگایا ہو کہ وہ جلدی میں کہیں گھاٹے کا سودا تو نہیں کر گئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں رقم میں اضافہ کر دوں گا۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ وہ خانم سے محض تصدیق کے لیے آئی ہو۔ خانم اَن جانے میں کچھ بھی کہہ سکتی ہے۔ کاش میں اُسے پہلے ہی بتا دیتا۔ میں نے طے کیا کہ اگر بات نہیں بنی تو میں کرشنا جی کی ساری دولت شوکت آرا کو دے دوں گا۔ میری جگہ کرشنا جی ہوتے تو وہ بھی یہی کرتے۔ یہ سب کچھ وہ میری خوشی کے لیے کر کے گئے تھے۔

ابھی نیساں کو گئے دیر نہیں ہوئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ خود درمیان میں جا کے دو ٹوک بات کر لوں کہ خانم مجھے آواز دیتی

ہوئی وحشت زدہ سی کمرے میں داخل ہوئی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ جہاں گیر نچلی منزل پر مولوی صاحب سے پڑھنے گیا تھا۔ میں کمرے میں اکیلا ہی تھا۔ خانم آتے ہی خفگی سے کہنے لگی: "یہ تم نے کیا کیا؟ مجھے بھی نہیں بتایا!" میں نے لاعلمی ظاہر کی تو اُس کی آواز تیز ہوگئی: "آخر تم نے اتنی بڑی رقم اُسے کیوں دے دی؟"

میں نے آہستگی سے کہا: "آپی! اُس نے یہی طلب کیا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے کچھ روپے بڑھا دیے۔"

"ایسا ہی تھا تو تم مجھ سے کہتے اور دیکھتے کہ میں اُسے کتنے میں تیار کرلیتی۔ تم وہاں اکیلے کیوں چلے گئے؟"

"اب چھوڑیے آپی! آدمی کی قیمت روپوں میں نہیں لگائی جا سکتی۔ نیساں بہت پیاری لڑکی ہے، وہ بہت معصوم ہے اور یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ جو شوکت آرا کی قسمت میں لکھا تھا، وہ اُسے مل گیا۔ وہ اُس کی ماں بھی تو ہے۔ یہ بھی تو دیکھیے کہ وہ اپنی بیٹی کی جُدائی کے لیے تیار ہوگئی ہے۔" میں نے ڈھلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ماں!" وہ چیخ کے بولی: "کس کی ماں۔ وہ ماں ہوتی تو اپنی بیٹی کے لیے اتنی جلدی فیصلہ نہ کرتی۔ کوئی ماں اپنی بیٹی کو اس طرح جُدا نہیں کرتی۔ نیساں کی ماں نہ جانے کہاں ہوگی۔" میں حیرت سے اُس کا چہرہ دیکھنے لگا: "میں اُس سے چیک واپس لے رہی ہوں۔" خانم نے برہمی سے کہا۔

"نہیں آپی! میں اُس سے وعدہ کرچکا ہوں۔"

"مگر تم نے مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا؟"

"مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے اچھا بھی نہیں لگتا تھا۔" میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔

"میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر آپ نیساں کو ساتھ رکھنے پہ تیار نہیں ہوں گی تو میں اُسے کہیں اور چھوڑ آؤں گا۔ آپ جہاں گیر، نجھل بھائی اور نیساں کو کچھ مت بتائیے گا۔ نیساں ہمیشہ اپنے آپ کو بوجھ سمجھے گی۔ روپے کا کیا ہے۔ روپے اور آجائیں گے۔ اگر شوکت آرا اپنی مرضی کے مطابق نیساں کو محفل میں بٹھاتی تو کیا وہ اس سے زیادہ حاصل نہیں کرسکتی تھی؟"

"کرسکتی تھی۔" خانم تیزی سے بولی: "مگر بعد میں نیساں کے تمام دُکھ بھی تو اُسے اُٹھانے پڑتے۔ وہ سُولی پر بھی تو لٹکی رہتی۔ وہ نیساں پر خرچ بھی تو کرتی اور کچھ دنوں بعد نیساں ہی اُس کے دھن دولت کی مختار ہوتی۔ نیساں کی زبان اور دیدے کھُلتے تو شوکتی کے دل پہ آرے بھی تو چلتے۔ محفل میں بیٹھی ہوئی لڑکی پر ہزار نظریں پڑتی ہیں اور کسی وقت بھی کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ وہاں کوئی ایک آدمی نہیں آتا۔ تم نے نہ جانے اُس سے کس طرح بات کی۔ تم اُن لوگوں کو نہیں جانتے۔ تم نے یہ کیا کردیا؟"

"جانے دیجیے آپی! دیکھیے نیساں آپ سے کتنی محبت کرتی ہے۔ وہ ہمارا کتنا خیال رکھتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے جہاں گیر کے کپڑے بھی وہ دھوتی ہے۔ اس دن مَولا سے جھگڑے کے درمیان جہاں گیر کی قمیص پھٹ گئی تھی تو وہی اُسے سی رہی تھی۔"

"لڑکیاں گھر کا کام کرتی ہی ہیں۔"

"اور لڑکیاں گھر ہی کا کام کرتے ہوئے اچھی بھی لگتی ہیں۔"

خانم نے مجھ پہ بہت زور دیا کہ میں چیک منسوخ کردوں، وہ شوکت آرا سے نئے سرے سے بات کرے گی۔ میں نے خانم سے التجا کی کہ اب وہ اس سلسلے میں شوکت آرا سے کوئی بات نہ کرے۔ خانم بہت جز بز ہوئی اور مجھے شکایتی نظروں سے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ میں اوپر بیٹھا نیساں کا انتظار کرنے لگا۔ بہت دیر ہوگئی۔ نیساں نہیں آئی۔

نجھل سہ پہر کو تھکا ہوا سا گھر واپس آیا۔ شاہ کبیر کے واقعے کو ایک دن گزر چکا تھا۔ خانم اور جہاں گیر کے ابھی تک رخسار مرجھائے ہوئے تھے۔ شام کو کالے دادا مٹھائی کے ٹوکروں سے لدا پھندا گھر میں داخل ہوا۔ خانم بھی وہیں بیٹھی تھی۔ کالے دادا اُس سے معافی مانگنے لگا۔ خانم کے ہونٹوں پہ لرزہ طاری ہوگیا۔ کالے دادا نے فوراً اپنا چاقو نکال کے خانم کے پیروں میں رکھ دیا اور بولا کہ خانم اُس کے لیے جو سزا تجویز کرے وہ اُس کے لیے تیار ہے۔ خانم نے اپنے پیر سمیٹ لیے اور سر جھکائے چپ بیٹھی رہی۔ کالے دادا نے اُس سے درخواست کی کہ وہ کچھ دن اور ٹھہر جائے۔ خانم نے لب نہیں کھولے۔ وہ خود ہی کہنے لگا کہ بیعانہ واپس کیا جا سکتا ہے۔ ہم چوگنا ارجی بائی کو لوٹا دیں گے لیکن خانم نے ہامی نہیں بھری۔ اُس نے کالے دادا کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ کالے دادا مایوس ہو کے نجھل کے پیر دابنے لگا۔

اُسی رات خانم نے اپنا ہلکا پھلکا سامان سمیٹنا شروع کردیا۔ اُس نے اپنے بہت سے کپڑے لوگوں میں بانٹنے کے لیے علیحدہ کردیے۔ نیساں اُس کی مدد کر رہی تھی۔ اُسے یقین آگیا تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ چل رہی ہے۔ اُس کے قدم زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ وہ پورے گھر میں اس طرح بھاگی بھاگی پھر رہی تھی جیسے بہت دنوں بعد اپنے میکے جا رہی ہو۔ وہ میری طرف دیکھ کے شرمانے لگتی تھی۔ پانی لاؤں، چائے لاؤں، پان لاؤں۔ جب بھی اُسے میرے سامنے آنے کا موقع ملتا، وہ یہی تکرار کرتی رہتی۔ میں ہر بار اُس سے کچھ نہ کچھ منگوا لیتا تھا۔ کام کر کے اُس کا شہابی رنگ دہکنے لگتا تھا۔ اُس کی سانس ہمیشہ پھولی پھولی رہتی تھی۔ چُنری اِدھر جاتی

تھی، بال اُدھر بکھرے ہوئے ہوتے تھے۔ اتی تتی کو ایسی حالت میں دیکھ کے ہمیشہ ٹوکتی تھیں: "کتنی تھیں ساری دیوانی! ذرا دوپٹا تو سر سے ٹکا کے رکھا کر، اور یہ کیسی اُلٹی سیدھی چلتی ہے۔ اوسان میں رہا کر۔" وہ بھی ہرنی کی طرح گھر میں چوکڑیاں بھرتی پھرتی تھی۔

دوسرے ہی دن ارجی بائی نے خانم کو مکان کے باقی روپے یک مشت ادا کردیے۔ اُسے ضرور شُبہ ہوگیا تھا کہ دیر ہو جانے سے خانم کا ارادہ بدل سکتا ہے۔ اُس دن نواب بہادر کا ہرکارہ اُن کا ایک پیغام لے کے خانم کے پاس آیا۔ اُس نے نواب بہادر کی طرف سے پہلے خانم کو ایک طشت پیش کیا۔ طشت میں سلمیٰ ستاروں سے ٹکا ہوا ریشمی جوڑا، سونے کی چوڑیاں، گلوبند، سُرخ نگینے کی انگوٹھی، گلاب کے تازہ پھول رکھے ہوئے تھے۔ نواب بہادر نے خانم کو بُلایا تھا اور یہ وضاحت کردی تھی کہ وہ گانے کے لیے نہیں بُلا رہا ہے بلکہ خانم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہے۔ خانم نے نواب کے تحائف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے طشت ہرکارے کو واپس کردیا اور بولی: "کنیز پر پہلے ہی نواب بہادر کے بہت احسانات ہیں۔ اب کنیز کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ نواب بہادر کو میری تسلیم کہنا اور کہنا کہ میں انھیں کبھی نہیں بھولوں گی لیکن کنیز نے اپنے بارے میں ایک فیصلہ کرلیا ہے۔ خدا نواب بہادر کا اقبال قائم رکھے۔ کہنا کہ اُن کی تمام باتیں میرے دل پر نقش ہیں مگر کنیز اپنی حیثیت سے خوب واقف ہے۔"

مجھے پتہ بھی نہیں چلتا کہ کوئی آیا تھا اور خانم نے اُسے واپس کردیا۔ میں اُس وقت کمرے میں نجھل کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ نیساں چپکے سے کمرے میں آگئی اور جیسے ہی موقع ملا، مجھے باہر آنے کا اشارہ کرنے لگی۔ میں اُوپر چلا آیا۔ نیساں زینے سے ملحق کوٹھری میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ اُس نے ہانپتے کانپتے یہ تمام باتیں مجھے بتائیں اور پریشانی سے کہنے لگی: "اگر نواب بہادر نے آپی کو روک لیا تو.....! وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔"

"ہوا کریں۔" میں نے تُرشی سے کہا۔

اندھیرے کی وجہ سے میں نیساں کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ زینے میں کوئی بھی آسکتا تھا۔ میں اُس کا شانہ تھپتھپا کے نیچے اُتر آیا۔ بیٹھک میں خانم نجھل سے اصرار کر رہی تھی کہ اب جتنی جلدی ممکن ہو یہاں سے چلنا چاہیے۔ نجھل نے اُسے تحمل کی تلقین کی اور کہا کہ ایک دو دن تک اُس کا یہاں رہنا کچھ ضروری ہے مگر خانم کا اصرار بڑھتا گیا۔ ابھی ہمیں کم سے کم ایک دن اور رُکنا چاہیے تھا۔ میں نے شوکت آرا سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک اُسے بینک سے رقم مل جانے کا یقین نہیں ہو جائے گا، میں نیساں کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا لیکن یہ تو میری اور شوکت آرا کی بات تھی۔ نجھل یہاں اور ٹھہرنے کو کیوں کہہ رہا تھا؟ یقیناً اڈے پہ کسی گڑبڑ کا اندیشہ تھا۔ خانم کے اچانک اصرار پہ نجھل کچھ گھٹا گھٹا سا نظر آتا تھا اور خانم پر جیسے ایک ایک لمحہ گراں گزر رہا تھا۔ اُس کے لہجے میں لرزش تھی۔ نجھل کچھ دیر سوچتا رہا پھر اُس نے شجاعت کے ذریعے کالے دادا کو اڈے سے بُلوا لیا اور اُسے بتایا کہ ہم سب ابھی پہلی گاڑی سے جانا چاہتے ہیں۔ کالے کو یقین نہیں آیا۔ وہ ابھی کچھ دن اور ٹھہرنے کے لیے نجھل سے ضد کرنے لگا۔ میں نے بیچ میں بولنا چاہا کہ کل تک کے لیے جانا ملتوی کردیا جائے، کل تک شوکت آرا کے چیک کا جواب بمبئی سے ضرور آجائے گا۔ ہمارے جانے کی خبر روپوش نہیں رہ سکتی تھی۔ شوکت آرا کے کانوں میں بھنک پڑ گئی تو وہ نیساں کے آڑے آسکتی ہے مگر خانم بھی کسی سبب ہی سے گھر سے جلد از جلد نکل جانے پہ زور دے رہی تھی۔ شاید نواب کے ہرکارے سے کوئی ایسی بات ہوئی تھی جسے نیساں بھی نہیں سُن سکی۔ گاڑیوں کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ خانم کو اِس کا بھی احساس نہیں تھا۔ میں نے پھر اپنی بات اپنے آپ تک محدود رکھی۔ اب یہی ہوسکتا تھا کہ شوکت آرا نہ مانے تو میں ایک دن کے لیے رُک جاؤں، نجھل چاہے کچھ کہے، میں نیساں کے ساتھ اُس کے گھر ٹھہر جاؤں گا۔ خانم اور جہاں گیر نجھل کے ہمراہ چلے جائیں۔ ممکن ہے مجھے ایک دن کے بجائے دو دن لگ جائیں۔ ایک دو دن بعد جہاں وہ بتائیں گے، میں اُن کے پاس آجاؤں گا۔ میرا چیک بالکل درست تھا۔ دستخط بھی میں نے دوبار کرڈالے تھے اور رقم کے اندراج میں پوری احتیاط برتی تھی۔ شوکت آرا نے زیادہ فیل مچایا تو مجھے بھی اب نرمی سے پیش آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سوہ شاہ کبیر کے واقعے کا حال سُن چکی ہوگی اور مجھ سے زیادہ لے دے نہیں کرے گی۔ پھر خود نیساں اُس کے ہاں رہنے پر کہاں آمادہ تھی۔

خانم نے ارجی بائی کو بُلوا کے گھر کی چابیاں اُس کے حوالے کردیں۔ کالے دادا اور اُس کے ساتھیوں نے ہمارا مختصر سامان اپنے ہاتھوں میں اُٹھا لیا۔ نیساں اور خانم دونوں نے سیاہ بُرقعے پہن رکھے تھے۔ کالے بُرقعے میں نیساں کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ گلیوں میں اس وقت بہت بھیڑ تھی۔ ہر طرف سے گانے بجانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ خانم کا سامان آگے چلا گیا تھا، پیچھے پیچھے ہم روانہ ہوئے اور بازار کے باہر مین روڈ پر کھڑی ہوئی دو موٹروں میں بیٹھ گئے۔ ان موٹروں کا انتظام کالے دادا ہی نے کیا تھا۔ چلتے وقت خانم کی بوڑھی ملازمہ خانم کے گلے لگ گئی تھی۔ اُس کی بیٹی اُلفت بھی پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔ خانم کے دونوں ملازم شجاعت اور امنی موٹر تک ہمیں پہنچانے آئے۔ خانم نے انھیں وہیں سے واپس کردیا حالانکہ وہ اسٹیشن چلنا چاہتے تھے۔ خانم نے اُن سب کو معقول رقم دے دی تھی۔ جب موٹریں روانہ ہوئیں تو میرے اوسان بحال ہوئے۔ اب یہ خطرہ نہیں رہا تھا کہ شوکت آرا درمیان

بس آجائے گی۔ بس اتنی سی بات تھی کہ گاڑی کے انتظار میں ہمیں اسٹیشن پہ نہ ٹھیرنا پڑے۔ اس کا بھی امکان کم تھا۔ بجھل نے کالے دادا کو حکم دیا تھا کہ اس وقت جو بھی گاڑی حیدر آباد سے باہر جاتی ہو، ہم اسی سے روانہ ہو جائیں گے۔ بیٹھک میں کالے دادا اور بجھل کے درمیان ہونے والی گفت گو سے پہلی بار مجھے یہ پتہ چلا تھا کہ بجھل دلّی کی طرف جانا چاہتا ہے۔ دلّی کی گاڑی کا وقت نہیں تھا۔ کاچی گوڑا اسٹیشن سے ہمیں اورنگ آباد کے لیے گاڑی مل سکتی تھی۔ وہاں بمبئی سے آنے والی گاڑی ہمیں دلّی کی طرف لے جاتی۔ ہم کاچی گوڑا اسٹیشن پہ اُتر گئے لیکن ابھی ہم پلیٹ فارم پہ پہنچے بھی نہیں تھے کہ پولیس کی ایک گاڑی تیزی سے آکے رُکی۔ اُس کے پیچھے ایک بڑی سیاہ موٹر کار تھی۔ لمحوں میں پولیس والے گاڑی سے اُتر گئے اور سیدھے ہماری طرف بڑھنے لگے۔ دفعتہً خانم کی چیخ نکل گئی۔ "نواب بہادر!" اُس نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔ "آخر انھیں خبر ہو گئی۔"

"کیسے خبر ہو گئی؟" بجھل نے چونک کے پوچھا۔

"وہ۔ وہ یہاں آگئے ہیں۔" خانم نے حواس باختگی سے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ پولیس ہمارے اطراف آکے ٹھیر گئی تھی۔ چند ثانیوں بعد موٹر سے سفید شیروانی میں ملبوس ایک دراز شخص برآمد ہوا۔ اُس کا جسم بھاری نہیں تھا۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی، آنکھیں بڑی بڑی۔ سر پہ ترکی ٹوپی، چال میں وقار۔ عمر پینتالیس سال سے زیادہ نہیں ہو گی۔ اُس کے ساتھ دو اشخاص اور تھے جو اُس کے خاص ملازم معلوم ہوتے تھے۔ نواب بہادر آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہمارے پاس آگیا۔ خانم نے اپنی نقاب اُٹھا دی تھی۔ "آپ!" وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے بولی۔ "آپ یہاں کیسے آگئے؟"

"ہم تمھیں لینے آئے ہیں خانم!" نواب نے پُر سکون لہجے میں کہا۔

"کہاں؟" خانم سٹ پٹا کے بولی۔

"محل میں۔" نواب نے ٹھیرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"کیا ہرکارہ آپ کے پاس نہیں پہنچا؟ میں نے آپ کو پیغام بھجوا دیا تھا۔ اور اپنی معذوری ظاہر کر دی تھی۔"

"ہمیں معلوم ہو گیا ہے لیکن ہم تم سے اس سلسلے میں کچھ بات کرنے کے خواہش مند تھے اس لیے خود یہاں چلے آئے۔"

"میں نے پیغام رساں پر ہر بات واضح کر دی تھی۔" خانم تیز مُردگی سے بولی۔ "آپ نے کیوں زحمت کی؟"

"ہم تمھارے لیے بہت سی زحمتیں اُٹھا سکتے ہیں۔"

"آپ کی نوازشیں مجھ پہ بے پناہ ہیں لیکن کنیز نے جو عرض کیا ہے اُسی پہ قائم رہنا چاہتی ہے۔ کنیز اس شہر سے رخصت ہو رہی ہے۔"

"ہم دیکھ رہے ہیں۔" نواب نے ہماری طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "سمجھنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ بخدا ہمیں یقین نہیں آتا کہ تم اس طرح اچانک ہم سے دُور ہو سکتی ہو۔"

"مجبوری کچھ ایسی ہی ہے۔" خانم نے مدھم آواز میں کہا۔

"ہم وہی تو جاننا چاہتے ہیں۔ کیا تم ہمیں نہیں بتاؤ گی؟"

"آپ نہ پوچھیے اور ایسی کوئی خاص بات بھی نہیں ہے۔"

"پھر بھی ہم یہ جاننے کے لیے بے تاب ہیں کہ تم نے ہمیں اطلاع دیے بغیر اتنی عجلت میں یہ فیصلہ کیوں کر لیا۔ جہاں تک بازار ترک کرنے کا تعلق ہے ہم کون سا اسے پسند کرتے تھے۔ ہم نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم جب چاہو چلی آنا، ہمارے دروازے کھلے ملیں گے۔ تم اُدھر کیوں نہیں آئیں؟ آخر ہم سے کون سی لغزش ہو گئی ہے؟"

"ہے ہے۔ آپ سے کوئی لغزش کیوں ہوتی۔ لِلّٰہ ایسی باتیں مت کیجیے۔ خدا گواہ ہے کہ کنیز کے دل میں آپ کا کیا مرتبہ ہے۔" خانم بے بسی سے بولی۔

"تو پھر تم نے ہم سے یہ بے اعتنائی کیوں برتی خانم! اس کا کوئی سبب تو ضرور ہو گا۔ ہم فردِ جرم سننے آئے ہیں۔ اگر تم ہمیں کچھ بتائے بغیر چلی گئیں تو ہمیں چین نصیب نہیں ہو گا اور تم ہمیں کس کے آسرے پہ چھوڑ کے جا رہی ہو؟ کیا تمھیں یاد نہیں رہا، ہم نے اپنے بارے میں تم سے کیا کچھ نہیں کہا تھا۔ ہم تمھاری ہر مجبوری ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں بتاؤ۔ ہم تمھارے لیے نہ جانے کیا کیا کر سکنے پر قادر ہیں۔"

"اس قدر نادم نہ کیجیے کنیز کے شانوں پر پہلے ہی بہت بوجھ ہے۔"

"ہمیں بتاؤ خانم! ہم سے کچھ مت چھپاؤ۔"

"میں آپ کو کیا بتاؤں۔" خانم بے بسی سے بولی۔

"کوئی خوف مت کرو، ہم تمھارا خوف ہی تو دُور کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ہمیں پہچانو، ہم ہر دیوار ڈھا دیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ فیصلہ تمھارا نہیں ہو گا۔"

"میرا ہی ہے۔" خانم تیزی سے بولی۔ "کوئی اور اس میں شریک نہیں ہے۔ کوئی دیوار نہیں، کچھ بھی نہیں۔"

"نہیں۔" نواب نے افسردگی سے کہا۔ "ہم کس طرح یقین کر لیں؟"

"میں آپ سے کہہ رہی ہوں۔"

"ہمیں شبہ ہے کہ یہ تم کہہ رہی ہو خانم! ہم بھی کچھ ارادہ ہی کر کے آئے ہیں۔ ہم تمھیں یوں کیسے جانے دیں ورنہ جو چند لوگ اس شہر میں ہمارا نام لیتے ہیں، انھیں ہم کیا منہ دکھائیں گے۔ تمھاری چارہ گری اگر ہمارے بس میں نہیں تو ہمیں اپنا نام بدل لینا چاہیے خانم! گھبراؤ مت، احتیاطاً ہم اسی لیے پورے انتظام سے آئے ہیں۔ یہ لوگ۔" نواب بہادر نے ہمارے اطراف کھڑے ہوئے پولیس کے لوگوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "یہ لوگ ہمارے اشارے کے منتظر ہیں اور ہم تمھارے اشارے کے۔ تم ہی کہہ سکتے تھے۔ کہو تو اس سے زیادہ بھی کر گزرنے کے لیے آمادہ ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" خانم خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"ہم کچھ بھی نہیں کہہ رہے ہیں۔" نواب نے کہا۔ "صرف اتنی بات کہہ رہے ہیں کہ ابھی ہم اس شہر میں موجود ہیں اور تم نے زندگی صرف اپنے محل میں مقید ہو کے نہیں گزاری ہے۔ خانم! تم زبان نہیں کھولو گی تو ہمیں مجبوراً بعض ناروا باتوں کے لیے قدم اُٹھانا پڑے گا۔ تمھاری زبان بندی کی صورت میں ہم یہی کر سکتے ہیں۔ ہمیں اتنا اختیار حاصل ہے اور ہم زندہ ہیں۔ جن لوگوں نے تمھیں اس اقدام پر مجبور کیا ہے، انھیں تم سے ہمارے تعلق کا پاس رکھنا چاہیے اور اگر انھوں نے نہ رکھا تو ہم بھی نہیں رکھیں گے۔"

"اگر آپ کچھ اور سمجھ رہے ہیں تو غلط ہے۔ میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ یہ سب کچھ میرے ایما پر ہے۔ میں نے اپنے لیے یہی بہتر سمجھا ہے۔"

"لیکن.... لیکن ہم اسے تمھارے لیے بہتر نہیں سمجھتے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص اپنے متعلق بہتر ہی سوچا کرے۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ہم تم سے بے خبر رہے ہیں۔ تم سامنے نہیں ہوتیں تو کیا ہم سے دُور ہو جاتی ہو۔ ہمیں اندازہ ہو گیا ہے کہ تم کن اندیشوں میں اُلجھ گئی ہو۔ ہمارا بھی کچھ فرض ہے۔ اپنے عزیز لوگوں کے لیے بسا اوقات ناپسندیدہ رویّے بھی اختیار کرنے پڑتے ہیں۔"

"جو آپ سوچ رہے ہیں، ایسا نہیں ہے میں کہہ رہی ہوں، ایسا نہیں ہے۔"

"گاڑی پلیٹ فارم پر لگ چکی ہے۔" دفعتہً بجھل نے ایک قدم آگے بڑھ کے نرم آواز میں خانم کو ٹوکا۔

"گاڑیاں روز جاتی ہیں۔" نواب نے درشتی سے کہا۔ "ہمارے حکم کے بغیر گاڑی حرکت میں نہیں آسکتی اور ہم اپنے معاملات میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتے۔"

"خانم بھی اپنے معاملات میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتی۔"

"آپ خدا کے لیے خاموش رہیے۔" خانم بجھل سے عاجزی کے ساتھ بولی۔

"خانم! ان لوگوں کو بتا دو کہ ہم کیسی باتیں سننے کے عادی ہیں اور ہمیں کون سا لہجہ پسند ہے۔" نواب نے برافروختگی سے کہا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ جو ہم نہیں چاہتے تھے، وہ ہم سے سرزد ہو رہے گا۔ ہمیں معاف کر دینا۔ اگر ہمیں یہ یقین نہ ہوتا کہ تم بعد میں ہمیں معاف کر دو گی تو ہم اُلٹے قدموں واپس چلے جاتے۔" نواب نے یہ کہتے ہی گردن خم کر کے پولیس کو اشارہ کیا۔ خانم بلک پڑی۔ ایک ساتھ کئی پولیس والے ہماری جانب لپکے انھوں نے دیکھتے دیکھتے دونوں اطراف سے کالے دادا اور اُس کے تین ساتھیوں کے شانوں کے علاوہ میرے شانے بھی زور سے پکڑ لیے مگر بجھل نے اچانک اپنے کندھے زور سے جھٹکے اور اس سے پہلے کہ پولیس والے اُسے دوبارہ قابو میں کرتے، نواب کی چھاتی میں بجھل کا چاقو چبھا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اُس نے نواب کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ نواب کی آنکھیں پھٹ گئیں اور اُن میں انگارے سے دہکنے لگے۔ اُس نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن بجھل کی گرفت سے اپنا بازو نہیں چھڑا سکا۔ اِدھر کئی پولیس والوں نے پیچھے سے بجھل کو کھینچنا چاہا، بجھل کھنچا مگر نواب بہادر بھی ساتھ کھنچا چلا آیا۔ "ہٹ جاؤ۔" بجھل نے گرج کے کہا۔ "نواب صاحب! انھیں روک لو ورنہ...." پولیس خود پیچھے ہٹ گئی۔ "نواب بہادر! ہم بھی یہ نہیں چاہتے تھے۔" بجھل نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اگر ہمیں بھی بعد میں خانم کے معاف کر دینے کا یقین نہ ہوتا تو ہم لوٹ جاتے۔ آپ نے خانم کی بات سمجھنے اور سننے پر دھیان نہیں دیا۔ آپ عزّت دار آدمی ہو۔ عزّت والے اس طرح سے نہیں آتے اور اپنی بات یوں نہیں منواتے۔ پہلے ان لوگوں سے بولو کہ یہاں سے چلے جائیں پھر ہم سے بات کرو۔ اگر آپ اپنی عزّت شان لٹانے اِدھر آسکتے ہو تو نواب! اپنے پلّے بھی کچھ ہے اور جن کے پاس کم ہوتا ہے انھیں اُس کے جانے کی اتنی فکر بھی نہیں ہوتی۔ ہتھیلی پر رکھی ہوئی چیز کسی وقت بھی گر سکتی ہے۔ ان کو حکم دو کہ یہاں سے دُور ہو جائیں۔ اِن کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے دل میں آپ کے لیے بہت درجہ ہے۔ خانم نے ہم کو ایسا ہی بولا تھا۔ خانم کوٹھے سے چلی آئی ہے نواب! یہ دکان بند کر آئی ہے۔ اب اس سے کوئی بات بولنی ہے تو اِس کا خیال کر کے بولو۔"

"ہم خانم ہی کے خیال سے اِدھر آئے ہیں۔ ہمارا خانم کا رشتہ دُکان کا رشتہ نہیں ہے۔" نواب نے مشتعل لہجے میں کہا۔ "ہمارے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ تم اِس گستاخی کی سزا کا تصوّر نہیں کر سکتے، جو تم کر رہے ہو۔"

"ہم کو اس کا دُکھ ہے، پر ہم کو ایسی گستاخیاں کرنے کی عادت ہے۔ ہم نے آپ کی شان کا پورا لحاظ کیا ہے۔ آپ بھی ہم بے شان، بے عزّت لوگوں کا کچھ لحاظ کرو۔ ابھی ہماری ایک بات سنو، آخری بات۔ گاڑی جانے والی ہے۔ اگر آپ کے دل میں کوئی کھٹکا ہے تو ہم خانم کو آپ کے ساتھ کرتے ہیں، آپ اس سے علیحدہ میں بات کر لو لیکن اس سے پہلے ان لوگوں کو یہاں سے ہٹا دو۔ اور سُن لو کہ اس کے بعد تم نے خانم پہ کوئی جبر کیا تو ہم وہ کریں گے جس کا تم بھی تصوّر نہیں کر سکتے۔ خانم اگر ہاں کہہ دیتی ہے تو ہم تمھارے پیروں پر سر رکھ دیں گے۔ پھر تم جو چاہے ہمارا کرنا، ہم کچھ نہیں بولیں گے۔ ہماری طرف سے خانم پوری طرح آزاد ہے۔"

نواب گُنگ ہو گیا۔ چند لمحوں تک وہ سکتے کے عالم میں خانم کو گھورتا رہا پھر کہیں دُور سے آتی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیوں خانم! یہ ہم کیا

[...]ن رہے ہیں؟"

خانم پر غشی طاری تھی۔ جہاں گیر نے اُسے سنبھالے رکھا تھا۔ اسٹیشن پر چاروں طرف بہت سے لوگ کھڑے ہوئے ہم لوگوں کو اچک اچک کے حیرت سے دیکھ رہے تھے اور پولیس کی وجہ سے اِدھر آنے سے ہچکچائے ہوئے تھے۔ نواب نے مضمحل انداز میں پولیس والوں کو اسٹیشن سے جانے کا اشارہ کیا۔ تجمل نے اُس کی چھاتی سے چاقو ہٹا لیا۔ "جاؤ خانم! نواب صاحب سے بات کرو۔"

خانم کو بات کرنے کا یارا نہیں تھا۔ وہ سسک رہی تھی۔ نواب بہادر کی نظریں اُسی پہ جمی ہوئی تھیں۔ خانم کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ تجمل نے ہم سب کو پلیٹ فارم سے جانے کا حکم دیا اور خود بھی کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ جہاں گیر نے اُس کا حکم نہیں مانا۔ تجمل نے اُسے اپنے پاس کھینچ لیا۔ میں بھی گیٹ کے پاس ٹھہر کے دُور سے اُنھیں دیکھتا رہا۔ نواب بہادر خانم کے رو بہ رو ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اُن کے درمیان شاید کوئی بات نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد نواب نے شیروانی کے بٹن کھولے اور موتیوں کی مالا گلے سے اتار کے خانم کے ہاتھوں پر ڈال دی اور تیزی سے پلٹ کے واپس جانے لگا۔

زرّیں کی حویلی کے بڑے دروازے پہ آ کے تانگا ٹھہر گیا۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ ہمیں شام ہی کو یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا مگر گاڑیاں ہر جگہ تاخیر سے روانہ ہوئی تھیں۔ حویلی کی سڑک پر اور گرد و پیش سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گھنے درختوں کی وجہ سے اندھیرا اور بڑھ گیا تھا۔ حویلی کے دروازے پر بوڑھا پہرے دار اونگھ رہا تھا۔ تانگے کی آواز سے وہ ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے لاٹھی سنبھال لی۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ وہ دلّو تھا۔ استاد جامو نے اپنے ایک پرانے ساتھی کو حویلی کی پہرے داری پہ تعینات کر دیا تھا۔ جن میں وہ جامو کے اڈّے پہ لڑکوں کو مشق کراتا تھا۔ سب سے پہلے تجمل تانگے سے اُترا۔ دلّو نے جیسے ہی اُسے دیکھا، لاٹھی چھوڑ کے تجمل کی طرف دوڑا اور اُس کے گلے سے لپٹ گیا۔

ہم تین دن سے مسلسل سفر کر رہے تھے۔ حیدرآباد میں تجمل کی زبانی دلّی جانے کے ذکر ہی سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کہاں جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں نے کوئی اعتراض اس لیے نہیں کیا تھا کہ ہمیں کہیں نہ کہیں تو جانا ہی تھا۔ جیسے جیسے منزلیں کم ہوتی جا رہی تھیں میرے اعصاب سُن ہوتے جا رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں اپنے گھر شہر گیا جا رہا ہوں۔ کوئی ڈیڑھ سال بعد آج میں پھر اُس کی حویلی کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ بڑی حویلی جو اُس نے میرے نام کر دی تھی۔ زرّیں اب نہ جانے کیسی ہو گئی ہو گی۔ ممکن ہے وہ بدل گئی ہو۔ تین چار مہینے پہلے جب میں کلکتے میں تھا تو اُس نے جولین کا خط روانہ کیا تھا۔ خط سے تو ایسا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ بمبئی میں کاتنے بھی ہر وقت اُس کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت ناراض ہو گی۔ میں نے اُسے اپنی خیریت کا ایک خط بھی نہیں لکھا تھا۔ دلّو نے بڑا دروازہ پورا کھول دیا اور عمارت کے اندر کی طرف چیخ پکار کرتا ہوا بھاگا۔ حویلی کے احاطے میں قدم رکھتے ہی میرے دل پہ ہول سا طاری ہونے لگا۔

عمارت کا دروازہ کھلنے سے پہلے آواز آئی۔ "کون ہے؟"

وہ اُسی کی آواز تھی۔ اضطراب آمیز مرتعش سی۔ "کون ہے؟" اُس نے دوبارہ پوچھا۔

"دروازہ کھولو رانی بٹیا! دیکھو کون آیا ہے۔" دلّو نے اونچی آواز میں کہا۔ "تمھارے بابا آئے ہیں، تجمل بھائی۔"

"میں ہوں زرّی بٹیا!" تجمل تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا اور ہلکی روشنی میں زرّیں کا کانپتا ہوا سراپا نمودار ہوا۔ وہ ایک لمحے تک وہیں مبہوت کھڑی رہی۔ پھر وحشت سے چبوترے کی سیڑھیاں پھلانگ کے تجمل کے سینے سے لگ گئی۔ "بابا آپ!" وہ سراسیمگی سے بولی۔

"ہاں رے۔" تجمل نے اُس کی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔ "میں تو سمجھا تھا، تُو مجھے پہچانی نہیں۔"

"آپ نے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟"

"تُو خواہ مخواہ پریشان ہوتی، ہمارا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔" تجمل اُس کے بازو دباتے ہوئے بولا۔ "اور یہ تُو کیسی ہو گئی ہے؟ گوشت اور کم کر لیا رے! کتنی دُبلی ہو گئی ہے سب خیریت تو ہے؟ تُو نے میری بات نہیں مانی۔"

"بابا! آپ اتنے دنوں تک کہاں تھے؟" وہ اُس کے سینے پر مچلنے لگی۔

"شکایتیں بعد میں کرنا، دیکھ میں تیرے لیے کس کس کو لایا ہوں۔"

"ظہیر کہاں ہیں؟" وہ بے تابی سے بولی۔

"لاڈلا!" تجمل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ بھی آیا ہے۔"

"سچ!" وہ تقریباً چیختے ہوئے بولی اور تجمل سے جدا ہو کے ہم لوگوں کی طرف جھپٹی۔

"ارے پیچھے کیوں منہ چھپائے کھڑا ہے سامنے آ لاڈلے کہیں کے!" تجمل نے زور زور سے کہا۔ زرّیں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے سامنے آ کے چونک کے رک گئی۔ اُس کی پلکیں تھرا رہی تھیں۔ "اس سے تو بعد میں ملنا۔ اِدھر دیکھ، یہ خانم ہے۔" تجمل کی آواز پہ وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں خانم کی طرف مڑ گئی اور اُس نے خانم کو جھجکتے، اٹکتے ہوئے آداب کیا۔ "اور یہ نٹ کھٹ چھوکری نیساں ہے۔" نیساں شرم سے دُہری ہو گئی۔

"اور اسے پہچان۔" تجمل جہاں گیر کو اپنے پہلو میں بھینچتے ہوئے بولا۔

"یہ..... یہ بھلا کون ہو سکتا ہے؟" جہاں گیر نے سلام کے لیے ہاتھ اُٹھایا۔ زرّیں اُسے حیرت بھری نظروں سے تکنے لگی۔ "چل، اندر چل۔" تجمل ایک جانب سے اُسے دوسری جانب سے جہاں گیر کو سمیٹتا ہوا اُوپر چڑھ گیا۔

حویلی کی ساری روشنیاں جلا دی گئی تھیں۔ زرّیں کی خادمائیں اور ملازم بھی شور سن کے جاگ گئے تھے۔ وہ بوڑھی ملازمہ میری بلائیں لے رہی تھی جو کلکتے میں زرّیں کے ساتھ فلیٹ میں رہتی تھی۔ ہم سب ایک بڑے کمرے میں آ گئے تھے۔ زرّیں نے حویلی خوب سجا کے رکھی تھی، خود بکھری ہوئی تھی۔ دیواروں کا رنگ نیا نیا تھا۔ کارنس پہ تمام چیزیں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ چھت میں ایک بڑا فانوس لٹک رہا تھا اور فرش پر سُرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ تجمل دیوان پر نیم دراز ہو گیا تھا۔ خانم اور نیساں سامنے ایک ساتھ، ایک دوسرے سے چپکی ہوئی بیٹھ گئی تھیں، زرّیں نے اندر جاتے ہی حکم دینے شروع کر دیے تھے۔ "بابا! آپ نے کھانا تو نہیں کھایا ہو گا؟" وہ کئی بار یہ پوچھ چکی تھی، عجب اوٹ پٹانگ سی باتیں کر رہی تھی۔ کہنا کچھ چاہتی تھی، منہ سے کچھ اور نکل جاتا تھا۔

"بیٹھ جا، تسلّی سے بیٹھ جا۔" تجمل نے جب اُسے ڈانٹا تو کہیں اُس کی زبان تھمی لیکن پھر اُس نے چائے بنانے کا حکم دیا۔ "بابا کا حقہ بھی تیار کر لینا، تمباکو رکھے رکھے سوکھ گیا تھا۔ میں نے تین دن پہلے ہی منگوایا ہے۔ بابا! آج صبح ہی سے مجھے لگ رہا تھا کہ آپ آنے والے ہیں۔"

"روز تجھے ایسا لگتا ہو گا۔"

"بابا! میں ہر دوسرے تیسرے روز کلکتے خط لکھتی تھی۔ جامو بھائی اور کاتنے ہر بار یہی جواب دیتے تھے کہ بس وہ آنے ہی والے ہیں پھر ایک مہینہ ہوا کہ اُن کا خط بھی کم کم آنے لگا۔" میں نے زرّیں کو اتنا بولتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی پتلیاں متحرک تھیں، نظروں کو قرار نہیں تھا۔ کبھی مجھے دیکھتی تھی، کبھی جہاں گیر کو، کبھی خانم کو اور کبھی نیساں کو۔ صبح تک کوئی نہیں سویا۔ زرّیں نے نہیں پوچھا کہ ہمارے ساتھ کون کون ہے۔ تجمل نے اُن کے بارے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ میں تیرے لیے ایک بڑی اور ایک چھوٹی بہن لایا ہوں۔

نیند کا پتہ ہی نہیں چلا۔ فیض آباد اسٹیشن پر اُتر کے سب کے چہروں پہ تھکن سوار تھی۔ بیٹھے بیٹھے نیساں اور خانم کی پنڈلیاں دُکھنے لگی ہوں گی۔ میں تو ہر اسٹیشن پہ اُتر کے مسافروں کو دیکھ آتا تھا۔ میرے ساتھ جہاں گیر بھی ہوتا، کبھی کبھی تجمل بھی۔ شاید ہی کوئی ایسا مسافر ہو جس پہ میری نظر نہ گئی ہو۔ میں ہر ڈبے میں جھانک کے بھی دیکھ لیتا تھا۔ ہر دفعہ میں یہ طے کرتا کہ اب کے نہیں جاؤں گا لیکن جیسے ہی کوئی اسٹیشن آتا، میں پھر نیچے اُتر جاتا۔ ہر جگہ یہ گمان ہوتا تھا کہ شاید اُن میں سے کسی کی صورت دکھائی دے جائے لیکن تمام آدمی کبھی ایک جگہ اکٹھے نہیں ہوتے۔ ایسا ہوتا تو پھر کسی کو کسی کا ڈھونڈنا اتنا عذاب نہ ہوتا۔

نیساں کی چمکیلی آنکھیں زرّیں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ زرّیں کو کس طرح ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی نئی دُلھن کو دیکھتا ہے۔ خانم دیر تک بُرقع پہنے بیٹھی رہی، زرّیں کو اچانک اُس کا خیال آیا تو وہ اُن دونوں کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔ جب وہ واپس آئیں تو اُن کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ خانم نے لباس تبدیل کر لیا تھا اور زرّیں کے پاس بیٹھی چپکے چپکے نہ جانے کیا کیا باتیں کرنے لگی تھی۔ نیساں کان لگائے سن رہی تھی۔ کبھی میری جانب اُس کی نگاہ آتی تو آنکھوں میں ستارے سے چمکنے لگتے۔ جب زرّیں کو یہ معلوم ہوا کہ جہاں گیر میرا چھوٹا بھائی ہے تو پہلی مرتبہ اُسے اعتبار ہی نہیں آیا مگر جب اُس نے جہاں گیر کو غور سے دیکھا تو اُس کے چہرے کے رنگ تیزی سے بدلنے لگے۔ جہاں گیر میں نمّی کی بڑی مشابہت تھی اور مری ہوئی نمّی کو زرّیں نے بے شمار مرتبہ دیکھا تھا۔ اُس کی لاش اسی کمرے سے پیوستہ کمرے میں رکھی گئی تھی۔ جہاں گیر زرّیں کی نگاہوں کا ہدف بنا کسمساتا اور جھینپتا رہا۔ خانم نے اشارے سے اُسے اپنے پاس بُلا لیا۔ وہ زرّیں اور خانم کے درمیان سکڑ کے بیٹھ گیا۔ میں وہاں سے اُٹھ کے باہر آ گیا۔

دن نکل رہا تھا۔ صبح کی خنک اور مدھم روشنی حویلی کے در و بام پر چھائی ہوئی تھی۔ مجھے یہاں کی ایک ایک جگہ معلوم تھی۔ آگے باغ تھا۔ میں نے باغ میں جانے کا ارادہ کیا لیکن میرے قدم خود بہ خود اُس کمرے کی طرف اُٹھ گئے جہاں کبھی میں رہتا تھا۔ کمرے کی ترتیب وہی تھی۔ سامنے وہی پلنگ تھا جس پر میں سویا کرتا تھا۔ بستر پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور آس پاس میزوں پر کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ دیوار پر وہی بڑی گھڑی آویزاں تھی جس کا گھنٹا سن کے مجھے یہاں حبس محسوس ہونے لگتا تھا اور میں ہر لمحے حویلی سے باہر نکلنے کی تدبیریں سوچتا رہتا تھا۔ تجمل نے باہر جانے کے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ میں نے کمر پلنگ سے ٹکائی ہی تھی کہ مجھے فوراً احساس ہو گیا، یہاں اب زرّیں سوتی ہے۔ اُس کی خوشبو بستر میں بسی ہوئی تھی۔ میں نے بے اختیار تکیے میں منہ چھپا لیا لیکن اسی لمحے مجھے ایسا لگا جیسے کوئی اندر آ رہا ہے۔ میں بھاگ کے باہر دالان میں چلا آیا اور آرام کرسی پر ہانپنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں زرّیں کی خادمہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی اِدھر آ نکلی۔ اُس نے ناشتہ تیار ہونے کی اطلاع دی۔ میں وہاں پہنچا تو تجمل زرّیں سے کہہ رہا تھا۔ "بٹیا! اتنے دنوں میں تُو کتنی باؤلی ہو گئی ہے۔ تجھے ناشتے اور کھانے کی پہچان بھی نہیں رہی۔" ہمارے درمیان ایک لمبا دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ زرّیں نے نہ جانے کیا کیا بنوا لیا تھا۔ تاہم سب نے کھُل کے کھایا۔ ہم نے ابھی چائے نہیں پی تھی کہ ایک ملازمہ نے جمرو کے آنے کی خبر دی۔ زرّیں نے بتایا کہ وہ روز صبح آ کے مجھے پوچھتے ہیں۔

مہینے ڈیڑھ مہینے بعد لکھنؤ سے کبّن خاں بھی آجاتے ہیں اور حویلی ہی میں ٹھہرتے ہیں۔ کلکتے میں جب تجّھل نے جامو اُستاد کو اپنے اڈّے کا نگراں بنایا تھا تو یہاں فیض آباد میں جمرو نے اپنے بڑے بھائی کا اڈّا سنبھال لیا تھا۔ جامو نے اپنے دوست کبّن خاں کو خط لکھ دیا تھا کہ وہ جمرو کا خیال رکھے اور گاہے گاہے فیض آباد جاتا رہے۔ تجّھل زرّیں کو بیٹھک میں چائے بھجوانے کا کہہ کے باہر چلا گیا۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے بیٹھک میں پہنچ گیا۔ جمرو ہمیں دیکھ کے اُچھل پڑا۔ اُس کی عمر میرے برابر ہی ہو گی۔ تجّھل نے اُس کی انگلیاں مروڑیں، کولھے پہ ہاتھ مارے اور سر کے بال کھینچ لیے۔ "کیسا ہے بالم تو۔ او سجنی سدا سہاگن تیری کھوپڑی سے نکلی یا ابھی تک چمٹی ہوئی ہے؟"

جمرو نے نظریں نیچی کرلیں۔ تجّھل نے اُسے بیٹھنے کو کہا۔ زرّیں چائے لے کے اندر آئی تو جمرو دوبارہ اپنی نشست سے اُٹھ گیا اور بھرّائی آواز میں بولا: "بہن جی! مبارک ہو، اُستاد آ گئے۔"

زرّیں زیرِ لب مسکرانے لگی اور جمرو سے بولی: "جمرو بھائی! اب آپ جامو اور کانتے بھائی کو بلا لیجیے اور ہاں کبّن بھائی کو بھی۔ میں بھی آج انھیں خط لکھتی ہوں۔"

"بس بس" تجّھل نے ڈپٹ کے کہا: "مجھ سے پوچھے بنا انھیں خط پتر مت لکھنا اور جمرو! تو اس کی باتوں میں نہ آنا۔"

"نہیں بابا! بلا لیجیے جامو بھائی کو گئے ہوئے کتنے دن ہو گئے۔"

زرّیں نے شکایتی لہجے میں کہا: "سب آجائیں گے تو بہت اچھا لگے گا۔"

"ہاں ہاں دیکھیں گے بٹیا! ابھی ذرا ٹھہر۔" تجّھل نے نرمی سے کہا اور جمرو سے اڈّے کے متعلق پوچھنے لگا۔ دوپہر کے کھانے تک وہ وہیں ٹھہرا رہا۔ اُس کے واپس نہ پہنچنے کے سبب اڈّے کے کئی آدمی بھی اِدھر آگئے تھے۔ اُدھر دلّو نے شہر بھر میں خبر کردی ہو گی۔ سہ پہر تک بیٹھک میں بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو گئے۔ جمرو تجّھل کے منع کرنے کے باوجود اُس کا جسم دباتا رہا۔ کسی اور نے اُس کی جگہ لینے کی کوشش کی تو جمرو تیار نہیں ہوا۔ سب نے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ اندر سے چائے، گلوریاں آتی رہیں اور حقّہ چاروں طرف گھومتا رہا۔ اُن میں بہت سے لوگ مجھے جانتے تھے، میں ان سے واقف نہیں تھا۔ فتّی کے کفن دفن کے دن مجھے اتنا ہوش ہی نہیں تھا کہ اُن کی صورتیں یاد رکھتا۔ تجّھل حالانکہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا مگر وہ اُن کے درمیان بیٹھا انہماک سے اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ امین آباد میں چکوری بالو کا ہنگامہ، نواب اچھے اور چودھری رام پرشاد کا قتل، کبّن خاں اور کلان پور کے اُستاد دھیرا کی لڑائی، کان پور میں پولیس کی دہشت، وحیدا کا جیل سے فرار، کتنے لوگ جیل میں ہیں، کتنوں کا وارنٹ جاری ہے وہ جگہ جگہ کے واقعات اُسے سنا رہے تھے اور اُن وارداتوں میں آزمائے جانے والے داؤ انھیں ازبر تھے۔ اُن کی باتیں اتنی دلچسپ اور حیران کن تھیں کہ میں بھی وہیں بیٹھا سنتا رہا۔ میں نے اندر جا کے جہاں گیر، خانم یا نیساں میں سے کسی کا حال نہیں پوچھا کہ انھیں اس نئی جگہ آنے کے بعد کیا محسوس ہو رہا ہے۔ نیساں کا جی تو نہیں گھبرا رہا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ اُسی کی فکر تھی۔

سہ پہر ہو رہی تھی مگر کوئی اُٹھنے کا نام نہیں لیتا تھا بلکہ اُن کی تعداد بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر نئے آنے والے کے لیے تجّھل کو اُٹھنا اور گلے ملنا پڑتا تھا۔ گفتگو کے دوران میں اتفاق سے تجّھل کو کہیں جماہی آگئی۔ جمرو اچانک بھڑک اُٹھا: "اِنے تم لوگوں کو کچھ خیال بھی ہے۔ یہاں بیٹھے بیٹھے اُستاد کا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔" وہ ناراضی سے بولا: "منہ اُٹھائے چلے آتے ہو ٹِنک ٹِنک ٹِنک۔ اُستاد کو کیا اس بوچڑ خانے میں بٹھاؤ گے؟ جاؤ، جا کے اڈّے کی کچھ صفائی دھلائی کرو۔ رات کا کھانا اُستاد اڈّے ہی پہ کھائیں گے۔ ہر قسم کا انتظام ہونا چاہیے۔"

تجّھل نے جمرو کی گردن دبوچ لی اور اُسے اپنے زانوؤں پہ جھکا کے اُس کی پیٹھ پر زور زور سے ہاتھ مارنے لگا۔ جمرو نے حرکت نہیں کی۔ وہ دم سادھے پڑا رہا۔ تمام لوگ کھڑے ہو گئے تھے اور جمرو کے اعلان کے بعد بہت عجلت میں نظر آنے لگے تھے۔ جمرو بھی انھی کے ساتھ چلا گیا۔

میں اندر گیا تو مجھے اپنی بینائی پر شبہ ہوا۔ خانم سادہ کپڑوں میں پلنگ پر بیٹھی زرّیں کی چوٹی گوندھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کے وہ چپ ہو گئیں۔ زرّیں نے جھٹ دوپٹا اپنے سر پہ رکھ لیا اور بدن سمیٹ کے بیٹھ گئی۔ جیسے مائیوں میں بیٹھی ہو۔ "بابر میاں! تم بھی کچھ آرام کرلو۔ طبیعت خراب ہو جائے گی۔" خانم آہستگی سے بولی۔

"جی آپی!"

"اُسی کمرے میں۔" زرّیں مجھے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"وہاں تو اب تم قابض ہو۔" میں نے مسکرا کے کہا۔

وہ شرما گئی، اُس کی آواز جھن جھنانے لگی: "میں اپنے پرانے کمرے میں چلی گئی ہوں۔"

"نیساں کہاں ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہ نہیں مانی۔ باورچی خانے میں گھسی بیٹھی ہے۔ کہتی تھی کہ بابر بھائی کے لیے اپنے ہاتھوں سے میٹھا بناؤں گی۔"

زرّیں تیکھے لہجے میں بولی جیسے اُسے میرا اصل نام معلوم نہیں ہوا بلکہ اُس نے میری کوئی چوری پکڑ لی ہے۔ معلوم نہیں صبح سے اُن کے درمیان کیا کیا باتیں ہوئی ہوں۔ خانم نے کیا کہا ہو اور زرّیں نے اسے کیا کچھ بتایا ہو۔ ظاہر ہے وہ ایک دوسرے کا چہرہ تو نہیں دیکھتی رہی ہوں گی۔

ممکن ہے خانم نے اپنے بارے میں اُسے تمام باتیں بتا دی ہوں کہ وہ بالاخانے سے اُتر کے آئی ہے اور نیساں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ چھپانے سے کیا حاصل تھا۔ بعد میں زرّیں کو یہ بات معلوم ہوتی تو اُسے بہت اچنبھا اور دُکھ ہوتا۔ خانم نے اپنے بارے میں کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رکھی ہو گی اور زرّیں نے ایک لفظ نہیں کہا ہو گا۔ اُن دونوں کے تیوروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ زرّیں بھی ایک مرتبہ اس منزل سے گزری تھی۔

دُور سے کوئی دیکھے تو ایسا لگتا تھا کہ خانم زرّیں کی بڑی بہن ہو۔

حویلی کا موسم بدل گیا تھا۔ نیساں چہچہاتی ہوئی ہر گوشے میں پھرتی تھی۔ جہاں گیر پہ بھی اب کہیں آنے جانے کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ فیض آباد کی سڑکوں پہ کبھی میرے ساتھ اور کبھی تجّھل کے ساتھ گھومتا رہتا تھا۔ ویسے حویلی ہی اتنی بڑی تھی کہ کہیں باہر جانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اچھا خاصا بڑا باغ تھا۔ کمروں کا ایک سلسلہ تھا۔ ایک کونے سے آواز لگاؤ تو دوسرے کونے میں نہیں پہنچتی تھی۔ لائبریری میں زرّیں کے ابّا جان کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ اِس دوران میں زرّیں نے بھی اُس میں خاصا اضافہ کرلیا تھا۔ تیسرے ہی دن جہاں گیر کا تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا گیا۔ زرّیں نے اُسے الٰہ آباد سے انٹرینس کرانے کے لیے جمرو سے کہہ کے ایک ساتھ دو دو ماسٹروں کا انتظام کرا دیا تھا۔ نیساں کے لیے علیحدہ ماسٹر رکھا گیا۔ بعض اوقات زرّیں خود اُسے پڑھانے لگتی تھی۔ خانم نے اپنے زیورات اور نقدی زرّیں کے حوالے کرنا چاہا لیکن زرّیں نے حویلی کی تمام چابیاں اُس کے آگے ڈال دیں۔ صبح جب خادمہ کھانا پکانے کے لیے سبزی گوشت پوچھنے آتی تو زرّیں خاموش بیٹھی رہتی۔ پھر مجبوراً خانم ہی کو بتانا پڑتا۔ ہمارے آنے کے تیسرے ہی دن کبّن خاں لکھنؤ سے آگیا تھا اور حویلی ہی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تجّھل عموماً جامو کے اڈّے چلا جاتا۔ کسی کسی دن وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتا۔ جہاں گیر نے کئی بار اُس کے ساتھ جانے کی ضد کی مگر تجّھل کبھی اُسے اپنے ساتھ اڈّے نہیں لے گیا۔ جہاں گیر اتنا بچہ نہیں تھا، کچھ کچھ اُسے بھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ تجّھل بابا کا کیا کاروبار ہو سکتا ہے۔ صبح سویرے ہی سے بیٹھک میں لوگ آنے شروع ہو جاتے۔ تجّھل نے جہاں گیر کو اس وقت بیٹھک تک آنے سے روک دیا تھا لیکن جہاں گیر کئی لوگوں کو جان گیا تھا۔ کبّن خاں تو اُسے ہر وقت اپنے پہلو سے لپٹائے رکھتا۔ زرّیں بھی اڈّے کے کئی آدمیوں کے سامنے آتی تھی۔

جب میں نیساں اور خانم کو ایک ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھتا تو مجھے جولین بہت یاد آتی۔ ہمیں آئے ہوئے پندرھواں دن تھا کہ بمبئی سے چمپا کا خط آیا۔ اُس نے ہماری خیریت دریافت کی تھی اور لکھا تھا کہ اگر ظہیر تک میرا پیغام پہنچ سکے تو اُسے بتا دینا کہ تمھارا خط نہ آنے سے بہت تشویش ہے۔ اُس نے زرّیں سے درخواست کی تھی کہ اگر اُسے میرے بارے میں کچھ معلوم ہو تو وہ اُسے ایک دو سطری خط لکھ دے۔ جولین کی طرف سے کوئی پیغام نہیں تھا۔ حالانکہ خط انگریزی میں تھا اور جولین ہی نے اُسے لکھا ہو گا۔ یہ خط تجّھل نے بھی سُنا اور چپ بیٹھا رہا۔ زرّیں نے اُس سے اجازت چاہی کہ کیا وہ اُسے جواب لکھ دے؟ تجّھل نے انکار نہیں کیا۔

سترھویں دن رات کو وہ اڈّے سے جلد واپس آگیا۔ میں نے اُس سے بات کرنے کا ارادہ کیا۔ جہاں گیر اپنی نئی زندگی سے بہت خوش معلوم ہوتا تھا اور تن دہی سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ خانم اُس کے ساتھ ہی تھی اور ہر وقت اُس کی دیکھ بھال میں لگی رہتی تھی۔ جہاں گیر کے سلسلے میں زرّیں نے خانم کی بہت سی ذمّے داریاں کم کر دی تھیں اور میں نے بہت غور سے دیکھا تھا کہ نیساں کی پیشانی پر کوئی لکیر تو نہیں کھنچی ہے لیکن وہ ہمیشہ چہکتی رہتی تھی۔ تجّھل نے خانم کے لیے ایک ستار منگوا دیا تھا۔ خانم نے اسے قبول نہیں کیا، بولی کہ وہ اب اسے چھونا نہیں چاہتی لیکن تجّھل نے یہ کہہ کے اُس کی بات مسترد کر دی کہ اب وہ اپنی خوشی کے لیے گایا کرے، اپنے لیے گایا کرے۔ تجّھل نے اُس پر زور دیا کہ اُسے اپنا ریاض جاری رکھنا چاہیے۔ اُس نے خانم کو بتایا کہ حیدر آباد میں ایک دن صبح اُسے خانم کا گانا سننے کا موقع ملا تھا۔ اُس وقت خانم ریاضت کر رہی تھی۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے خانم نے صبح سویرے بند کمرے میں ریاضت شروع کر دی ہو۔ میں تجّھل سے کہنا چاہتا تھا کہ میں اب جا رہا ہوں اور میرے ساتھ اُسے چلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کھوئے ہوؤں کو میں خود ہی ڈھونڈتا رہوں گا، وہ اپنے اڈّے واپس چلا جائے اور جامو کو فیض آباد بھیج دے۔ یہاں اُس کے اڈّے کے لوگ اُس کی کمی بُری طرح محسوس کرتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا، اُس سے کہوں گا کہ تین چار مہینے بعد میں فیض آباد آتا رہوں گا اور ان لوگوں کے ساتھ کچھ دن رہ کے پھر چلا جایا کروں گا۔ مجھ سے کوئی کام نہیں ہو گا کیونکہ میرا جی کسی کام کو نہیں چاہتا۔ میں پہلے ابّا جان کے ٹکڑوں پہ پلتا رہا، پھر جیل میں مجھے مفت کا کھانا ملتا رہا۔ بمبئی میں کرشنا جی جب تک دوبارہ نہیں ملے تھے، مجھے چند روز مزدوری کرنی پڑی تھی۔ پھر کرشنا جی مجھے گھر لے گئے۔ میں زرّیں سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ خانم، نیساں اور جہاں گیر کے لیے جتنی رقم چاہے، مجھ سے لے لے۔ میری بات سن کے وہ زہر کھا لیتی یا کبھی میرے سامنے نہ آتی۔ سو اُس سے اس قسم کی بات کرنا ہی بے کار تھا۔

ممکن ہے تجّھل یہ سمجھتا ہو کہ جہاں گیر کے ملنے کے بعد میں اُس

کی خاطر اب کہیں آنے جانے کی بات نہیں کروں گا۔ اُس نے یہاں آ کے اب تک جانے کا نام نہیں لیا تھا۔ شاید مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ کھوئے ہوئے لوگ اتفاق سے مل جاتے ہیں۔ کرشنا جی نے تمام دُنیا میں خط لکھے تھے۔ کیا نتیجہ نکلا؟ تجمل نے اتنی دوڑ دھوپ کی کیا حاصل ہوا؟ رف جہاں گیر ملا، وہ نہیں ملی۔ جہاں گیر کو تو میں پہلے بھی چھوڑ کے چلا آیا تھا۔ آدمی کا سینہ، اُس کی آنکھیں اُس کے پاس ہوتی ہیں اور اُس آدمی کی آنکھوں اور سینے میں کیا کچھ ہوتا ہے یہ وہی جان سکتا ہے۔ میں یہاں بیٹھا لوگوں کی صورتیں دیکھتا رہتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرا سینہ بجھ گیا ہے۔ تجمل مجھے صبر و ضبط کی تلقین کرتا تھا کرشنا جی بھی یہی کہتے تھے۔ انہیں کیا اندازہ تھا کہ اُن کی باتیں سُننا بھی میرے لیے سب سے بڑا ضبط ہے۔ اگر یہ لوگ میری جگہ ہوتے تو ان کے سر پھٹ جاتے مگر یہ میری جگہ ... کیوں؟ ۔ قمی پانچ ہزار میں بک گئی تھی۔ نیساں کی قیمت ساٹھ ... تھی۔ کاش اُس کی بھی کوئی قیمت ہوتی۔ پھر میں کہیں ڈاکا ڈال لیتا، میں کچھ بھی کر لیتا، ایسا ہوتا تو کتنا آسان ہو جاتا۔

اب اُس کے لیے صرف کرنے کو میرے پاس ایک ہی چیز رہ جاتی تھی اور وہ بھی بار بار ہاتھ سے نکل جاتی تھی۔ شاید کبھی وقت مہربان ہو جائے اور اُس کا سایہ کہیں نظر آ جائے۔ یہاں اس طرح گھر میں بیٹھا میں اپنے بالوں کی جوئیں ہی نوچ سکتا تھا۔ جو لمحے اِدھر اُدھر ضائع ہو گئے۔ اس میں میری کوئی خطا نہیں تھی۔ وہ سُنے گی تو مجھے معاف کر دے گی۔ اپنی طرف سے میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا تھا۔ اب جتنی دیر ہو رہی تھی، ہر وقت یہ خدشہ رہتا تھا کہ اور دیر نہ ہو جائے۔ تجمل بھی کچھ سوچ رہا تھا۔ اچھی طرح یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ اس وقت اُس سے کی جانے والی بات بے سود نہیں جائے گی، میں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے تو کیا بولے گا، کل پرسوں چل دیں گے۔" وہ پُرسکون آواز میں بولا۔ "یہی بولنا چاہتا تھا؟"

"ہاں! مگر تم میرے ساتھ کیوں جاتے ہو؟"

"کیا تو مجھے اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتا؟"

"نہیں! یہ بات نہیں ہے۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "مجھے تمھارا ہی خیال ہے۔ تمھیں اڈے سے دُور ہوئے بہت دن ہو گئے۔ تمھیں اب وہاں جانا چاہیے۔"

"اڈے کی بات مت کر، یہ کہہ کہ تو اکیلا ہی جانا چاہتا ہے۔"

"نہیں نہیں۔" میں نے گھبرا کے کہا۔ "غلط مت سمجھو۔"

"پھر ساتھ چلیں گے۔" وہ فیصلہ کُن انداز میں بولا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے سانس لے کے کہا۔ "تمھاری مرضی مگر کب چلو گے؟"

"میں نے بول دیا نا، کل پرسوں۔" وہ ناگواری سے بولا۔ میں چپ ہو گیا۔ کچھ دیر حقہ گڑگڑانے کے بعد وہ کہنے لگا کہ اب دکن کی طرف جانا بے کار ہے۔ اُس کی رائے تھی کہ اب بھی ہمیں پروگرام بنا کے چلنا چاہیے۔ ہم جنوبی ہند سارے کا سارا دیکھ چکے تھے۔ اگر حیدرآباد میں جہاں گیر نہ ملتا تو ہم حیدرآباد سے اُوپر کی طرف ہی جا سکتے تھے۔ تجمل کا خیال تھا کہ مولوی محمد شفیق شمالی ہند میں مُرادآباد سے قریب کہیں ہوتے تو کسی نہ کسی کو ضرور نظر آتے۔ اِسی کے پیشِ نظر اُس نے جنوبی ہند کے انتہائی دور دراز حصوں میں سفر کیا تھا۔ تجمل نے وسطی ہند جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میرے لیے ہر جگہ یکساں تھی، وہ کہیں بھی ہو سکتی تھی۔ دوسرے دن صبح تجمل نے جمرو کو بتا دیا کہ وہ کل یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ گھر میں بھی خبر ہو گئی اور زرّیں نے بھی سُن لیا۔ سب کے چہروں پہ بادل سے چھا گئے۔ جہاں گیر تجمل کے پاس آ کے رونے لگا۔ دوپہر کے کھانے پر خانم نے تجمل سے درخواست کی کہ وہ ابھی جانے کا ارادہ ملتوی کر دے۔

"تم بولتی ہو تو میں رُکا جاتا ہوں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" تجمل نے ملائمت سے کہا۔ "جتنی جلدی ہم جائیں گے، اتنی جلدی واپس آ جائیں گے۔" خانم نے اس کے بعد اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

شام کو میں باغ میں بیٹھا ہوا تھا۔ نیساں میرے پاس آ گئی اور جھکی جھکی پلکوں سے وہی بات دُہرانے لگی جو خانم نے تجمل سے کہی تھی۔ میں نے اُسے پاس بٹھا کے سمجھایا کہ مجھے بہت ضروری کام ہے۔ میں نے اُسے تاکید کی کہ زرّیں اور خانم کی کوئی بات اُسے بُری لگے تو وہ دل پہ میل نہ لائے۔ گھر میں کسی نہ کسی سے کوئی بُری بات ہو ہی جاتی ہے۔ وہ کبھی خانم کی شکایت زرّیں سے یا زرّیں کی شکایت خانم سے نہ کرے۔ نیساں بولی کہ مجھے تو خود ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ میری کوئی بات آپی یا خانم کو بُری نہ لگ جائے۔ میں نے کہا۔ پگلی! آپی اور خانم بہت سمجھ دار ہیں۔ بڑوں کا کام نظر انداز کرنا اور معاف کرنا ہوتا ہے اور ان سے بھی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے اُداس مت ہو جانا۔ چھوٹی بن کے رہنا اور انھیں بڑی سمجھ کے چُپ ہو جانا۔ اب یہی تمھارا گھر ہے۔ نیساں شکایت کرنے لگی کہ زرّیں باجی مجھے کام نہیں کرنے دیتیں۔ میں نے کہا۔ ٹھیک ہی کرتی ہیں۔ گھر میں نوکر اور نوکرانیاں موجود ہیں تو تمھیں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمھارے لیے پڑھنے کا کام کیا کم ہے۔ اس سے نمٹ جاؤ تو خوب کام کرنا، پھر زرّیں بھی منع نہیں کرے گی۔ بولی، میرا جی یہ چاہتا ہے کہ میں ہر وقت زرّیں باجی کے پاس بیٹھی رہا کروں۔ وہ بہت اچھی ہیں۔ پھر ایک دم

پوچھنے لگی کہ کیا آپ اُن سے ناراض ہیں؟ میں نے کہا نہیں، ناراض ہوتا تو میں تمھیں یہاں کیوں لاتا۔ کہنے لگی، مجھے ایسا ہی لگتا ہے، تو پھر ان سے بات کیوں نہیں کرتے؟ میں نے کہا، کرتا کیوں نہیں ہوں۔ ولی، ایسے بات تھوڑی کرتے ہیں، وہ تو ہر وقت آپ کا خیال رکھتی ہیں۔ بتانے لگی کہ زرّیں نے میرے لیے بہت سے کپڑے بنوائے ہیں۔ ترین کپڑے کی شیروانیاں، چکن کے کُرتے وہ خود اپنے ہاتھ سے سی رہی ہے۔ نیساں مجھے بتانے لگی کہ جب بھی میرا ذکر آتا ہے، زرّیں خاموش ہو جاتی ہے یا بات بدل دیتی ہے یا وہاں سے اُٹھ کے ہی چلی جاتی ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ میں اُس کے لیے کیا لاؤں؟ نے جواب دیا کہ بس آپ آ جائیں۔ اللہ کرے آپ جس کام کے لیے رہے ہیں، اُس میں پوری کامیابی ہو۔ میں نے اُس کے ہاتھ چوم لیے۔ نیساں کی آنکھیں بھر آئیں۔ کہنے لگی، بابر بھائی! میں آپ کے لیے روز دعا کروں گی۔ میں نے کہا، بہت سے لوگ دعائیں کرتے ہیں مگر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کہنے لگی، دیکھیے گا، میری دُعائیں بہت قبول ہوتی ہیں۔ میں نے کے گھر دعا مانگی تھی، دیکھیے قبول ہو گئی۔

میں اسی لیے دن بھر یا تو بیٹھک میں بیٹھا رہا تھا یا پھر اِدھر باغ آ گیا تھا کہ ایک ہی دن کی بات ہے۔ گھر کے لوگوں کے سامنے کم آیا جائے مگر مجھے نیساں نہ جانے کہاں کہاں تلاش کرتی ہوئی یہاں آ گئی۔ تجمل اُس دن اڈّے نہیں گیا۔ لوگ اُس سے ملنے یہیں آتے رہے۔ ت کا کھانا بھی تجمل نے بیٹھک میں نہیں کھایا۔ اُن لوگوں کو وہیں بھجوا دیا ا۔ اِدھر ہم سب ساتھ بیٹھے تھے۔ جہاں گیر، تجمل اور میں ایک طرف ر وہ تینوں دوسری طرف۔ کسی سے کھایا نہیں جا رہا تھا، بس سب ٹونگ رہے تھے۔ مجھے کچھ ایسا لگا جیسے ان کی خاموشی کی وجہ میں ہوں۔ میں وہاں سے آیا۔ ایک رات اور باقی تھی، کل کسی وقت جانا ہی تھا۔ کیا پتہ پہلی ہی منزل پہ وہ مل جائے۔ سوچتے سوچتے میرا ذہن نہ جانے کہاں کہاں جا پہنچا۔ نے دیکھا کہ وہ ایک بہت بڑے، عالی شان محل میں بیٹھی ہے، کنیزیں باندیاں اُس کی خدمت میں حاضر ہیں مگر فوراً مجھے احساس ہوا، اگر وہ کسی محل میں ہوئی تو میری رسائی اُس تک کس طرح ہو سکے گی۔ پر وہ محل میں یا جھونپڑی میں، جب اُسے یہ معلوم ہو گا کہ اُس کے دروازے پہ کون ہے تو وہ ہزار بندھن توڑ کے لڑکھڑاتی ڈگمگاتی میرے پاس آ گی اور میں جب اُسے دیکھوں گا! میں نے کتنی بار سوچا تھا کہ جب میرے سامنے آئے گی تو میرا کیا حال ہو گا۔ مجھ سے اپنے پیروں پر کھڑا جائے گا، میری آنکھیں جل جائیں گی۔

کمرے میں کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ میں جیسے سوتے سے پڑا۔ زرّیں اندر آئی تھی۔ اُس کے ہاتھوں میں بہت سی چیزیں تھیں۔ وہ اُس نے میز پر ایک طرف رکھ دیں اور میرے نزدیک آ کے آہستگی سے بولی۔ "یہ سامان ساتھ لیتے جانا۔"

وہ اِدھر آئی اور اُدھر جانے لگی۔ "بیٹھو۔" میں نے بہ مشکل تمام کہا۔

"رات خاصی ہو گئی ہے۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"اچھا۔" میں نے حواس باختہ لہجے میں کہا۔ "کیا بہت وقت ہو گیا؟"

"کیا تم سو گئے تھے؟"

"نہیں نہیں۔" میں نے سیدھے ہو کے کہا۔ "میں جاگ رہا تھا۔"

"میں چلتی ہوں۔" وہ سرگوشی میں بولی۔

"کیوں؟" میں نے تذبذب سے کہا۔ "بیٹھو۔"

اُس نے پلکیں اُٹھا کے مجھے دیکھا۔ میں اسی لیے یہاں آنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ زرّیں کی آنکھیں خشک نہیں ہوئی ہوں گی، میرے جانے سے اور بھر آئیں گی۔ وہ اپنے مخصوص لباس میں میرے سامنے کھڑی تھی۔ یہ کپڑے اُس کے بدن پہ بہت سجتے تھے۔ تنگ موری کا پاجامہ، پشواز اور ہرا دوپٹا۔ اُس کے کانوں میں آویزے لٹک رہے تھے۔ یہ آویزے اُسے خانم نے دیے تھے۔ خانم نے منیہارن کو بلوا کے اُس کی کلائیاں چوڑیوں سے بھروا دی تھیں اور نیساں نے اُس کے ہاتھوں پہ مہندی سے نقش و نگار بنائے تھے۔ ٹھوڑی پہ کالا تل بھی نیساں ہی نے بنایا ہو گا کہ کہیں اُسے نظر نہ لگ جائے۔ وہ اس طرح بے حس و حرکت کھڑی تھی جیسے ایک رنگین مجسمہ ہو، جیسے ابھی اس میں جان ڈالنے کی کسر رہ گئی ہو۔ سرو قد۔ گورا کا قد بھی اتنا ہی بڑا ہو گیا ہو گا۔ میرے جی میں آئی کہ میں اُسے شانوں سے پکڑ کے پلنگ پہ بٹھا دوں اور اُس سے کہوں کہ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ ضرور وہ کہے گی، لاؤ۔ میں دباتی ہوں۔ پھر میں اُس کے ہاتھ تھام لوں گا اور اُن سے اپنا چہرہ چھپا لوں گا۔ اس طرح وہ رات بھر میرے پاس بیٹھی رہے گی۔ میرا جی چاہا کہ وہ میرا سر اپنے زانوؤں پہ رکھ لے یا اپنے سینے میں چھپا لے تاکہ میں خوب رو سکوں لیکن میں اس کی صورت دیکھتا رہا۔ میرا گلا بند ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑی رہی۔ پھر جب جانے لگی تو میں اُسے روک بھی نہیں سکا۔ تمام لفظ، ہیچ معلوم ہوتے تھے۔ میرے ذہن میں بے شمار باتیں منڈلا رہی تھیں پر میری زبان پہ جیسے فالج گر گیا تھا۔ وہ چلی گئی۔ میں نے کچھ دیر اور ٹھہرنے کے لیے اُسے آواز دینا چاہا۔ دروازے پہ جا کے اُس نے ایک بار مُڑ کے دیکھا۔ میری آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ چشم زدن میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ ابھی دالان ہی میں ہو گی۔ میں نے اُس کے پیچھے بھاگنے اور اُس کا راستہ روکنے کا ارادہ کیا مگر اُسے روک کے مجھے کیا کہنا چاہیے کہ میں نہیں جاتا، میں رُکا جاتا ہوں یا میں اُسے یہ اطمینان دلانے کی کوشش کروں کہ جلد واپس آ جاؤں گا اور اسے بلاخیریت کے خط بھی لکھتا رہوں گا۔ بس وہ میرا انتظا

کرتی رہے اور اُسے میری قسم کہ ایک آنسو بھی نہ بہائے۔

میں دروازے کی جانب تیزی سے بڑھا۔ اُس کی چوڑیوں کی بازگشت دالان میں گونج رہی تھی۔ وہ دالان سے گزر کے آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی لیکن باہر آ کے میرا جسم پتھر ہو کے رہ گیا۔

دوسرے دن گیارہ بجے ہم فیض آباد سے چل کے لکھنؤ اور کان پور کے راستے سے جھانسی آ گئے۔ جھانسی سے للت پور، گوالیار، بھوپال، دھول پور، اُجین، اجمیر، اندور، امراوتی، رائے گڑھ۔ نام بھی یاد نہیں رہے تھے۔ چار مہینے تک ہم وسطی ہند کے کونے کونے میں پھرتے رہے۔ ابا جان بھوپال کے علاوہ اجمیر اور گوالیار میں بھی ٹھیرے تھے۔ اس کے بعد اُن کا کوئی نشان نہیں ملا۔ جنوبی ہند کی طرح ہم نے اپنی دانست میں کوئی بستی نہیں چھوڑی۔ جہاں ریلوں کے راستے نہیں تھے، وہاں ہم نے لاری سے سفر کیا۔ جہاں لاری بھی نہیں جاتی تھی، وہاں ہم گھوڑوں اور خچروں پر چلتے رہے۔ جہاں مسجدیں اور مدرسے تھے، جہاں بھی کوئی چھوٹی سی بستی تھی، دکانوں، لائبریریوں، محلّوں کے چودھریوں اور مدرسوں سے پوچھ گچھ کی۔ جہاں جہاں بھی اُن کے ملنے کا امکان ہو سکتا تھا ہم وہاں گئے۔ پھر ایک دن تجمّل نے اچانک وسطی ہند میں اور آگے جانے کے بجائے شمال مشرق کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا مگر سی پی سے راج پوتانہ قریب تھا۔ ہم دوسرے راستوں سے ہوتے ہوئے پھر اجمیر واپس آ گئے۔ تجمّل نے اس بار بھی وہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ہاں حاضری دی اور ایک دن تک مزار کے احاطے میں پڑا رہا۔ اجمیر سے ہم جودھ پور آ گئے۔ جودھ پور سے بیکانیر اور بیکانیر سے جیسلمیر۔ جیسلمیر راج پوتانے کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو عصر کا وقت تھا۔ سامنے جو مسجد نظر آئی، ہم اُس کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ نمازی باہر آ رہے تھے۔ ہم نے انھیں روک کے پہلے ابا جان کا حلیہ بتایا۔ ابا جان اپنا صحیح نام کہیں نہیں لیتے تھے۔ نمازیوں نے ایسے حلیے کے کسی شخص کو جاننے سے لاعلمی ظاہر کی۔ میں نے پھر اکبر کا حلیہ بیان کیا اور بتایا کہ اُن کے ساتھ تین لڑکیاں بھی ہوں گی مگر وہ ابا جان یا گھر کے کسی اور آدمی سے واقف نہیں تھے۔ پھر میں نے اُن کے سامنے مولوی محمد شفیق کا نام لیا۔ اُن کا رنگ، قد اور ناک نقشہ بتایا۔ مولوی شفیق کا حلیہ سن کے وہ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے اور ایک بزرگ شخص نے آگے بڑھ کے بھاری آواز میں کہا: "میاں! تم انھیں کیسے جانتے ہو؟"

میرا سر گھومنے لگا۔ یکایک تجمّل نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے کھینچ لیا اور خود اُن کے سامنے ہو کے بولا: "بڑے صاحب! کیا وہ یہیں ہیں؟"

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟" بزرگ آدمی [illegible] سے کہا: "میں نے پوچھا تھا کہ آپ انھیں کیسے جانتے ہیں؟"

"ہم اُن کے کچھ لگتے ہیں۔" تجمّل نے تنک کے کہا۔

"میں یہی تو پوچھ رہا ہوں بھائی کہ آپ اُن کے کیا لگتے ہیں!"

"ہم اُن کے رشتے دار ہیں۔"

"رشتے دار ہیں۔" بزرگ نے اپنے ساتھی نمازیوں کی طرف دیکھ کے دُہرایا۔ اُس کے لہجے میں حیرت تھی: "کیا رشتے داری ہے آپ کی [illegible]"

"بڑے صاحب! آپ ہمیں یہ بتائیے کہ وہ کہاں ہیں؟ یہیں ہیں یا کہیں اور؟" تجمّل نے برہمی سے کہا۔

"آپ اُن سے کب سے نہیں ملے؟" ایک دوسرے شخص نے [illegible]

"بہت دن ہو گئے، برس بیت گئے، آٹھ برس سے بھی زیادہ [illegible] کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں: "لیکن آپ لوگ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں [illegible] بات کا جواب دو؟"

"آپ کی بات کا کیا جواب دیں۔" بوڑھے آدمی نے ٹوٹتی [illegible] آواز میں کہا: "آپ لوگ کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"مراد آباد سے۔"

"جیسلمیر کب آئے؟"

"کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔"

"آپ کو اُن کا پتا کس نے دیا تھا؟"

"ہم انھیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آ گئے ہیں۔"

مجھے اپنے سامنے کھڑے ہوئے لوگ دُھندلے نظر [illegible] تھے۔ تجمّل نے میرے پنجے میں سختی سے اپنی انگلیاں پھنسا رکھی تھیں [illegible] پولیس والوں کی طرح نہ جانے کیسے کیسے سوال کر رہے تھے۔ جیسے [illegible] صاحب کے بارے میں نہیں، کسی مجرم کے بارے میں پوچھ رہے ہوں [illegible] جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا، مجھے چکر سا آ رہا تھا۔ "آپ بولتے کیوں [illegible] میں نے ہذیانی انداز میں کہا: "مولوی صاحب کہاں ہیں؟"

"تو چپ رہ۔" تجمّل نے زور سے میرا پنجہ مروڑ دیا اور تھکے ہوئے [illegible] میں بولا: "کیا اب وہ یہاں نہیں رہتے؟"

"نہیں بھائی!" بزرگ آدمی نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا: "آئیے [illegible] آئیے۔ آپ لوگ کہاں ٹھیرے ہوئے ہیں؟"

"ابھی کہیں نہیں اور نہ کہیں ٹھیرنے کا ارادہ ہے۔ ہم صرف مو[illegible] سے ملنے آئے تھے۔ آپ اُن کا پتا جانتے ہو تو ہمیں بتا دو۔"

"خدا بہتر جانتا ہے، بڑی لمبی کہانی ہے۔ آئیے، میرے ساتھ [illegible] آپ مولوی صاحب کے عزیز ہیں تو میرے بھی عزیز ہیں [illegible] ہیں تو کیا ہوا، اُن کے دوست اور بہی خواہ یہاں کم نہیں ہیں۔ سڑک [illegible]

[illegible]اؤں۔ چلیے، گھر چلیے۔ زیادہ دور نہیں ہے۔"

تجمّل نے گردن جھکا لی: "آلا ڈلے!" اُس نے میری کمر پہ ہاتھ رکھ کے [illegible] کی: "سنبھل کے رہ، یہ نہ جانے کیا سمجھیں گے۔"

بزرگ آدمی کا گھر مسجد سے کوئی پچاس قدم دور ہوگا۔ کئی نمازی بھی ہمارے [illegible] گئے۔ میری ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ وہ چھوٹی اینٹوں سے بنا ہوا قدیم [illegible] ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ بزرگ نے اندر جا کے چند لمحوں بعد بیٹھک کا [illegible] کھول دیا۔ وہاں زیادہ سامان نہیں تھا۔ اونچے پایوں کا ایک پلنگ [illegible] میں چند کتابیں، تین چار شکستہ کرسیاں، مونڈھے اور جا نماز۔ اس کے سوا کچھ نہیں [illegible] دل جیسے کسی نے جکڑ لیا۔ بوڑھا آدمی چارپائی پہ بیٹھ کے گہری گہری [illegible] لینے لگا، اُس نے آنکھیں موند لیں اور زیرِ لب کوئی آیت تلاوت کی [illegible] ٹھیرے لہجے میں بولا: "آپ حضرات کا نام؟"

"اِس کا نام ظہیر اور میرا اکبر خاں ہے۔" تجمّل نے تیزی سے کہا۔

"میرا نام منیر علی ہے۔ مولوی صاحب مجھ پہ بہت کرم کرتے تھے۔ وہ میرے [illegible] بھی تھے، مربی بھی۔ وہ برابر والے مکان میں رہتے تھے، آپ ہماری باتوں [illegible] نے ہوں گے لیکن کچھ ایسی ہی بات تھی جو آپ سے اتنا کچھ پوچھنا پڑا۔ کسی [illegible] ے پہ کچھ نہیں لکھا ہوتا۔ کوئی بات ناگوار گزری ہو تو مجھے معاف کر دیجیے۔"

"کچھ نہیں بڑے صاحب!" تجمّل نے دھیمی آواز سے کہا: "یہ نرم گرم چلتا [illegible] آپ مولوی صاحب کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے؟"

"کیا بتاؤں، کیا نہ بتاؤں۔" منیر علی ہاتھ ملتے ہوئے بولے: "آپ نے آنے [illegible]ت دیر کر دی۔" میری سانس اکھڑنے لگی۔ "گزشتہ رمضان کی بات ہے [illegible]وان روزہ تھا، سحری کے بعد مولوی صاحب معمول کے خلاف نماز [illegible] نہیں آئے۔ نماز کے بعد ہم چند لوگ اُن کی خیریت دریافت کرنے [illegible] گھر پہنچے کہ خدانخواستہ اُن کی طبیعت تو ناساز نہیں ہے۔ پہلی دفعہ تھا کہ مولوی صاحب نے ناغہ کیا ہو۔ جب سے یہاں آئے تھے، پابندی [illegible] وقت پر پہنچ جاتے تھے۔ ہم نے آوازیں لگائیں، اندر سے کسی نے جواب [illegible]یا۔ ہمیں فکر لاحق ہوئی۔ کنڈی کھٹ کھٹانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو [illegible] کھلا ہوا تھا۔ ہم نے پھر بھی آوازیں دیں مگر اُدھر کوئی ہوتا تو جواب دیتا۔ [illegible] ہوئی بچی کو ہم نے حقیقتِ حال جاننے کے لیے ڈرتے ڈرتے مکان [illegible] بجا، وہ سہمی ہوئی واپس آئی اور پھر جب ہم نے خود اندر جا کے دیکھا تو [illegible] اُجڑا ہوا تھا۔ سامان تتر بتر تھا اور کوئی ذی نفس وہاں موجود نہیں تھا۔ [illegible] یہ کیا حال ہوا۔ رات کو تراویح کے بعد وہ ہمارے ساتھ ہی گھر واپس گئے [illegible] تراویح سے سحری کے دوران یہ سب کچھ گزر گیا۔ مولوی صاحب بہت [illegible] کا گلا بیٹھ گیا۔

"اور پھر اُن کا کوئی پتا نہیں چلا؟"

منیر علی نے مایوسی سے سر ہلایا: "نہیں بھائی! اِدھر اُدھر کئی جگہ آدمی [illegible] کچھ معلوم نہیں ہوا۔"

"اُن کے ساتھ اور کوئی بھی رہتا ہوگا؟" میں نے پھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں میاں! اُن کی ایک بیٹی بھی اُن کے ساتھ رہتی تھی، آپ تو اُسے جانتے ہوں گے۔ کیسی نیک سیرت بچی تھی، کبھی اونچی آواز سے بولتے نہیں سُنا۔ پلکیں ہمیشہ جھکی ہی دیکھیں۔"

"کیسی تھی وہ؟" میرا سارا جسم کپکپانے لگا تھا۔ میں اُٹھ کے کھڑا ہو گیا پھر میں نے ہانپتے ہوئے پوچھا: "وہ..... اُس کا نام؟....."

تجمّل نے اُٹھ کے میرے شانے پر زور دے کے مجھے دوبارہ مونڈھے پر بٹھا دیا: "اِس کا مطلب ہے۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا: "اب تو وہ اچھی بڑی ہو گئی ہوگی۔"

"ماشاءاللہ۔ خدا اُس کا نگہبان ہو۔" منیر علی نے جھجکتے ہوئے کہا اور مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔

"وہ دونوں ہی چلے گئے؟" تجمّل نے اُلجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"چلے کیا گئے، کیا کہا جا سکتا ہے۔ جانا اِسے کہتے ہیں بھلا؟ خدا اُنھیں اپنی امان میں رکھے۔ جہاں رہیں، خوش رہیں۔ ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں۔ طرح طرح کے خیال آتے ہیں، کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ رات کو ہم سے خوب اچھی طرح باتیں کرتے رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ مسجد کی چٹائیاں بوسیدہ ہو چکی ہیں، اُنھیں بدلوا دیا جائے تو بہتر ہے۔ ہم سے ناراض ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا اور کوئی بھلا اس طرح اچانک ناراض ہوتا ہے۔ جب سے گئے ہیں، مدرسہ بھی ویران ہو گیا ہے۔ بچے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اُن کی پڑھائی کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ اب کسی دوسرے کا پڑھایا ہوا اُن کے پلّے ہی نہیں پڑتا۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتے تھے، جانا ہوتا تو مجھ سے ذکر ضرور کرتے۔ اور بھائی! صاف بات تو یہ ہے کہ کوئی یوں گھر سے نہیں نکلتا، وہ بھی جوان بچی کے ساتھ۔"

"وہ اپنے بارے میں کیا بتاتے تھے؟" تجمّل نے آہستگی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ یہاں آئے تھے تو بچی ساتھ تھی۔ تھوڑا سا سامان تھا۔ سب سے پہلے مجھ سے اُن کی مُلاقات ہوئی۔ اُنھوں نے کہا کہ میں یہاں اس شہر میں رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے وہ پہلی ہی نظر میں بھا گئے تھے۔ میں نے کہا بسر و چشم برابر کا مکان خالی کیے دیتا ہوں، آپ یہیں رہیے۔ بس رہنے لگے۔ مجھ سے کہا کہ مجھے کوئی روزگار بھی فراہم کر دو۔ میں نے اپنے ایک شناسا عبداللہ بھائی کے ہاں بات کرا دی۔ عصر کے بعد وہاں چلے جاتے تھے۔ مغرب کی نماز وہیں پڑھتے تھے اور عشا سے پہلے واپس آ جاتے تھے۔ حساب کتاب کا کام تھا۔ عبداللہ بھائی نے چند ہی مہینوں میں تنخواہ بڑھا دی۔ ادھر ہم لوگوں نے اُن کا کچھ انتظام مدرسے سے کروا دیا تھا۔ امامت کا وہ ایک پیسہ نہیں لیتے تھے۔ کبھی زبان سے کچھ نہیں کہا۔ قسم ہے جو کبھی ایک حرف بھی شکایت کا ادا کیا ہو۔ عبداللہ تو اُن کے جیسے مرید ہو گئے تھے۔ وہ انھیں اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتے تھے لیکن مولوی صاحب آمادہ نہیں ہوئے۔ میری منجھلی لڑکی زہرہ اور نرجس دونوں ہم جولیاں تھیں۔

اب وہ ہر وقت اُس کی یاد میں روتی رہتی ہے۔ میں اُسے کیا سمجھاؤں کہ وہ کہاں گئی ہے اور کب واپس آئے گی۔"

"نرجس! کیا اُس کا.... اُس کا یہی نام تھا۔" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"ہاں۔ مولوی صاحب اُسے نرجس ہی کے نام سے پکارتے تھے۔" منیر علی نے جواب دیا۔ "نرجس کو خدا نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا اور تمام صفاتِ حسنہ بھی اُسے ودیعت کر دی تھیں۔ وہ مولوی صاحب کی آنکھوں کا سکھ تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے مولوی صاحب زندہ ہی اُس کے لیے ہوں۔ مسجد، مدرسے اور ملازمت سے جو وقت بھی ملتا، مولوی صاحب بچّی کے ساتھ گھر ہی میں گزارتے۔ اُن کا بس نہیں چلتا تھا کہ مزید وقت کہاں سے نکال کے گھر میں گزاریں۔ ملنے جُلنے میں وہ بہت محتاط تھے۔ تقریبات میں شرکت سے پرہیز کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بہت سے لوگوں کو شکایت بھی ہوتی لیکن مولوی صاحب ایسے لہجے میں اُن سے معذرت کرتے کہ پھر کچھ کہا نہیں جاتا تھا بلکہ خود شرمندہ ہونا پڑتا تھا۔ بچّی کا بھی یہی عالم تھا۔ دو تین گھروں میں جانے کے سوا وہ گھر سے قدم نہیں نکالتی تھی، وہ بھی کبھی کبھار۔ محلّے کی بچیاں خود ہی اُس سے ملنے، اُسے دیکھنے آجاتی تھیں۔ ہم لوگوں نے کئی بار اشارۃً مولوی صاحب کی توجہ اس طرف دلائی کہ آپ نرجس کو ہمارے گھر کیوں نہیں بھیجتے، وہ مسکرا کے رہ جاتے تھے۔ کہتے تھے، بھیّا! تم کچھ اور مت سمجھنا لیکن اُسے ایک لمحے کے لیے اپنے سے جُدا کرنا مجھے گوارا نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ ہم اُن کے مزاج کے عادی ہو گئے تھے۔ ہم نے اُن سے شکوہ کرنا ہی ترک کر دیا تھا۔ ہم نے محسوس کر لیا تھا کہ ہماری ایسی باتوں سے وہ اُداس ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اور تو سب کچھ برداشت تھا مگر اُن کی پیشانی پر بل نہیں دیکھے جاتے تھے۔"

منیر علی بولتے بولتے رُک گئے اور معذرت کر کے اندر چلے گئے۔ اندر سے کسی نے دروازے پر دستک دی تھی۔ دستک کے ساتھ چوڑیوں کی آواز بھی آئی تھی۔ اُن کے جاتے ہی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں نے مولوی صاحب کی باتیں شروع کر دیں۔ مجّل خاموشی سے سُنتا رہا۔ منیر علی جس لڑکی کا ذکر کر رہے تھے، میرا دل کہتا تھا، وہ کورا کے سوا کوئی نہیں ہوگی۔ مولوی صاحب نے یہاں آکے اُس کا نام بدل دیا ہوگا۔ میرے کان کورا کا ذکر سُن رہے تھے۔ وہ اِس بیٹھک میں آتی ہوگی۔ مجھے یہ سب ایک خواب معلوم ہو رہا تھا۔ میری آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی اور میری رگیں جیسے کوئی کھینچے لے رہا تھا۔ منیر علی واپس آئے تو اُن کے ہاتھوں میں میٹھی اور نمکین چیزوں سے بھری ہوئی تام چینی کی دو پلیٹیں تھیں۔ اُنھوں نے پلیٹیں سامنے رکھ دیں اور اصرار کرنے لگے کہ ہم کچھ کھائیں۔ مجّل نے دال سیو لونگ لیے لیکن مجھ سے ہاتھ نہیں بڑھایا گیا۔ منیر علی نے زیادہ اصرار کیا تو مجّل نے آہستگی سے کہا۔ "بڑے صاحب! اِس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"نصیبِ دشمناں، کیا بات ہے؟" منیر علی شائستگی سے بولے۔ "آب و ہوا بدلنے سے یہی ہوتا ہے۔ یہ علاقہ بھی کم لوگوں کو راس آتا ہے مگر یہ تیل میں تلی ہوئی چیزیں نہیں ہیں، گھر کی ہیں۔ کچھ کھا لو میاں! اللہ نے چاہا تو کچھ نہیں [ہوگا]۔"

"نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "میرا جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"تو یہ لڈو کھا لو۔ تِل کے ہیں۔ میری بیٹی زہرہ نے بنائے ہیں۔ مو[لوی] صاحب بھی بڑے شوق سے کھاتے تھے۔" منیر علی نے پلیٹ میرے آ[گے کی]۔

"نہیں، نہیں۔" میری آواز رُندھنے لگی۔ "آپ.... آپ کیا بتا[رہے تھے]۔ مولوی صاحب جیسلمیر کب آئے تھے؟" مجّل نے نرمی سے پو[چھا]۔

"تین سال سے کچھ زیادہ ہوئے ہوں گے۔" منیر علی نے تذبذ[ب سے] جواب دیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کے کہا۔ "مجھے خوب یاد ہے، [پچھلا] رمضان تو اُنھوں نے یہیں گزارا۔ یہ تیسرا ہی تھا نا؟" دوسرے لوگوں [نے سر] ہلا کے تائید کی۔

"آپ لوگوں نے اُنھیں کہاں کہاں ڈھونڈا؟" مجّل نے پوچھا۔

"اِدھر اجمیر، بیکانیر، جے پور اور اُدھر میرپور، خیرپور، سکھر، نواب شا[ہ]، نزدیک و دُور جتنے شہر تھے، جہاں جہاں لوگ جاتے رہے، اُنھیں تلاش کرتا [رہا]۔"

"آپ نے پولیس کو بھی بتایا؟"

"ہاں بھائی! یہ بھی کیا۔ کئی بار تھانے کوتوالی کے چکّر لگائے۔ [شہر] کے بااثر لوگوں کو درمیان میں ڈالنے کی کوشش کی مگر کوئی نتیجہ نہیں [نکلا]۔ اُن کا سامان ایک کوٹھری میں بند کر کے تالا ڈال دیا گیا۔ میں نے ابھی [تک اُن] کے لیے مکان خالی رکھا ہے۔ وہاں جاتے ہوئے بھی ہول آتا ہے۔ میری [بیوی] وہاں روز جھاڑو دیتی ہے۔ پگلی کہتی ہے کہ وہ لوگ اچانک آگئے تو [دیکھیں گے] کہ گھر کتنا گندا رکھا تھا۔"

"جس دن سویرے مولوی صاحب دکھائی نہیں دیے، اُس سے [پہلے] لوگوں نے اُن کے پاس کسی کو آتے جاتے تو نہیں دیکھا تھا؟"

"پولیس نے بھی ہم سے یہ سوال کیا تھا مگر ہم نے کسی ایسے شخص [کو نہیں] دیکھا۔ تین سال کی مدت میں اُن سے کوئی ملنے نہیں آیا۔ دونوں مکا[نوں میں] ایک دیوار ہی تو حائل ہے۔ اِس طرف کی اونچی آواز اُس طر[ف جاتی ہے]۔ بیچ میں خواتین کے لیے آنے جانے کے لیے کھڑکی بنی ہوئی ہے۔ [کوئی آتا تو] ہمیں ضرور خبر ہوتی۔"

"اور یہاں مولوی صاحب سے کن کن لوگوں کا مِلنا جُلنا تھا؟"

"جہاں تک میرے علم میں ہے، مسجد کے نمازیوں، محلّے کے لو[گوں اور] عبداللہ بھائی کے ہاں آنے جانے والوں کے سوا اُن کا کوئی جان[نے والا نہیں تھا]۔ میں نے آپ سے کہا نا کہ وہ خود ملنا ملانا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ [میں تو یہ] کہوں گا کہ وہ کترانے کی حد تک لوگوں سے الگ تھلگ رہتے [تھے۔ ایک آدھ دعوت] میں اُنھیں مدعو بھی کیا گیا۔ شاید دو ایک ہی بار گئے ہوں۔ بس [گھر میں بند رہتے] ہوتے تھے۔ تین سال میں صرف ایک بار وہ بھی ڈھائی دن کے [لیے باہر گئے]۔ یہ اُن کے جانے سے کوئی ڈیڑھ دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ یہ ایک دفعہ اجمیر شریف چلنے کے لیے آمادہ ہو گئے تھے۔ میرا خیال [تھا کہ وہ اکیلے چلے جائیں گے اور ہمیں] چھوڑ دیں گے مگر اُنھوں نے نرجس کو بھی ساتھ لے چلنے کی خواہش ظاہر [کی]۔ لہٰذا میں نے گھر سے اپنی دونوں بچیوں کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ ہم [اجمیر] شریف سے [جمعرات کو لوٹے تھے، یعنی سفر کے] چوتھے ہی دن واپس آگئے تھے۔"

"[اُن کے] جانے سے ڈیڑھ مہینے پہلے؟" مجّل نے تکرار کی۔

"جی ہاں۔" منیر علی نے آنکھیں میچ کے جواب دیا۔

"اور اجمیر شریف کے سوا آپ کہیں نہیں گئے؟"

"نہیں، کچھ وقت تو آنے جانے میں گزرا، باقی اجمیر شریف میں۔" منیر علی [نے] جھجک کے کہا۔ "سفر سے واپسی پر وہ بہت خوش تھے۔ میں نے کہا کہ اب [کبھی کبھی گھر] سے باہر نکلا کیجیے، طبیعت بہلی رہے گی۔ اُنھوں نے وعدہ کیا تھا کہ عید بعد میر[ے سا]تھ دلّی چلیں گے اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ پر حاضری دیں گے۔"

مجّل خاموش بیٹھا کچھ دیر تک سوچتا رہا اور اندر سے آیا ہوا دودھ [کا] شربت پیتا رہا۔ پھر میرا بازو تھام کے اُٹھنے لگا۔ "بڑے صاحب! اب ہم پھر [کسی] وقت آئیں گے۔ آپ کا ہم نے بہت وقت لیا، اب ہمیں اجازت دو۔"

"[کیسی باتیں کرتے ہو] صاحب! دوبارہ آنے کا کیا سوال۔ آپ یہیں میرے ساتھ رہیں گے۔ [یہ گ]ھر چھوٹا ہے مگر میں آپ کو کہیں اور نہیں ٹھہرنے دوں گا۔ آپ کا سامان [کہ]اں رکھا ہے؟"

"تھوڑا سا سامان تھا، وہ ہم نے ایک دکان پر رکھوا دیا تھا۔ آپ کی مہربانی۔ [ہمیں] جانے دو، ہم پھر آئیں گے۔"

"نا صاحب! یہ نہیں ہو سکتا، آپ جیسلمیر میں ٹھہرے تو میرے غریب [خا]نے پر ٹھہریں گے۔ میرے آپ سے کئی رشتے نکلتے ہیں۔ ایک تو آپ مولوی [صا]حب کے عزیز ہیں، اس شہر میں مجھ سے زیادہ کوئی اُن سے قریب نہیں تھا۔ [دوس]رے آپ میرے ہم ملت ہیں۔ تیسرے سب سے پہلے آپ کی مجھی سے بات [ہوئ]ی ہے۔ انکار کیا تو میں سمجھوں گا کہ آپ نے مجھے کسی لائق نہیں سمجھا۔"

مجّل نے بہت منع کیا مگر منیر علی ضد کی حد تک اپنی بات پر اڑے [رہے]۔ مجّل جز بز ہو کے آخر آمادہ ہو گیا۔ منیر علی نے اُسی وقت ہم سے دُکان کا [پتا] پوچھ کے ایک آدمی روانہ کر دیا کہ وہ اُن کا نام لے کے ہمارا سامان اُٹھا لائے۔ [باقی] لوگ رات کو آنے کا کہہ کے رخصت ہو گئے۔ اندھیرا ہونے لگا تھا۔ جب [منی]ر علی اندر چلے گئے تو مجّل میرے قریب آگیا اور مجھے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ "لاڈلے! [میں ج]انتا ہوں، تجھے کیا لگ رہا ہوگا پر ذرا اپنے آپ کو تھام کے رکھ، جانو! سب [تیر]ی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوئی بات اُوپر تلے ہو گئی تو اُسی کی بدنامی ہوگی۔ [یہ لوگ] اچھا بُرا سوچنے میں دیر نہیں لگاتے رے!"

"میرا جی بہت گھبرا رہا ہے۔" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔

"مجھے پتہ ہے، پر یہ پانی آنکھوں ہی میں بند رکھ۔"

"یہ لوگ کیسی باتیں کر رہے تھے؟ کیا کہہ رہے تھے؟"

"میں نے تجھ سے کچھ الگ نہیں سُنا ہے رے!"

"یہاں سے چلے چلو، میرا دم گھٹ رہا ہے۔ تم یہاں ٹھہر کیوں گئے؟"

"کیا اُس کے گھر آکے اتنی جلدی چلا جائے گا؟"

"پَر وہ ہے کہاں۔ اُس کا ملنا میرے نصیب میں نہیں ہے۔" میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ "وہ نہیں ملیں گے، کبھی نہیں ملیں گے۔" میں نے بلکتے ہوئے انداز میں کہا۔

"کچھ سوچا سمجھا کر لاڈلے! تجھے تو یہ سُن کے خوش ہونا چاہیے کہ وہ خیریت سے ہے، عزّت سے رہ رہی تھی۔ یہاں آکے بھی اُس کا کچھ پتہ نہ چلتا تو ہم کیا کر لیتے۔" دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ مجّل نے جلدی سے میرے آنسو پونچھے اور میرا زانو تھپ تھپاتے ہوئے بولا۔ "اپنا نہیں تو کچھ اُسی کا خیال کر لے۔"

"چائے پی لیجیے۔" منیر علی چائے کی پیالیاں لیے ہوئے بیٹھک میں آگئے۔

"آپ بہت تکلیف کر رہے ہو بڑے صاحب! ایسا مت کرو۔" مجّل نے اُٹھ کے اُن کے ہاتھ سے چائے لے لی۔

"تکلیف کیسی جناب! یہ تو عین راحت ہے۔ آپ نے سُنا نہیں کہ مہمان خیر و برکت لاتے ہیں۔ باتوں باتوں میں مجھے احساس ہی نہیں رہا کہ سفر کی تھکن سوار ہوگی، آپ کو چائے کی طلب ہوگی۔ آپ مولوی صاحب کے وطن کے ہیں۔ آپ حضرات چائے شوق سے پیتے ہوں گے۔ مولوی صاحب بتاتے تھے کہ اُن کی طرف ناشتے میں چائے کا رواج عام ہو گیا ہے۔ یہاں بھی اب بہت سے گھروں میں یہ رسم چل پڑی ہے۔ مولوی صاحب باقاعدگی سے صبح و شام چائے پیتے تھے، اُنھی کی دیکھا دیکھی ہمارے گھر کے بچے بھی عادی ہو گئے۔" منیر علی کندھے پر پڑے ہوئے لمبے رومال سے اپنی آنکھوں کے گوشے صاف کرنے لگے اور عاجزی سے بولے۔ "دیکھیے صاحب! کوئی تکلف کریں گے تو شکایت ہوگی۔ گھر میں بچیاں بھی پوچھ رہی تھیں۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو دستک دے دیجیے گا۔" منیر علی ہمیں گھر کا نقشہ سمجھانے لگے۔ اُنھوں نے بتایا کہ اُن کی بیوی پانچ سال ہوئے، مر چکی ہیں۔ سب سے بڑا لڑکا بھی فوت ہو گیا ہے۔ دوسرا لڑکا علی گڑھ میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ ایک لڑکی کی شادی ہو گئی ہے، وہ جے پور میں اپنے شوہر کے ساتھ مقیم ہے۔ دو لڑکیاں اور ایک بارہ سالہ لڑکا اُنھی کے ساتھ ہیں۔ منیر علی کی ایک چکّی ٹھیکے پر چل رہی تھی۔ تھوڑی بہت زمینیں بھی تھیں، اُن سے ہر سال کچھ نہ کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔ وہ مولوی صاحب سے صرف دس روپے مکان کا کرایہ لیتے تھے۔ یہ بھی اُن کی ضد پر۔ مولوی صاحب نے کرائے کے بغیر رہنے سے انکار کر دیا تھا۔ منیر علی دیر تک اپنے بارے میں بتاتے رہے۔ اس اثنا میں اُن کا آدمی ہمارا سامان لے کے آگیا تھا۔ منیر علی مغرب کی نماز کو چلے گئے۔ اُنھوں نے ہم سے نماز کے لیے نہیں پوچھا۔ گھر کی بوڑھی ملازمہ نے آکے لالٹین جلا دی اور بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ یہ دروازہ دوسری جانب سے گھر میں کُھلتا تھا اور شاید اسی خیال سے بنایا گیا تھا کہ مہمانوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

منیر علی نماز پڑھ کے واپس آئے تو مجّل منہ ہاتھ دھو کے اور کپڑے بدل کے بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔ منیر علی نے اپنے چھوٹے لڑکے کی مدد سے دوسری چارپائی بھی بیٹھک میں ڈال دی اور بوڑھی ملازمہ نے چارپائیوں

پر سفید بستر لگا دیے۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اس درمیان میں تجمل نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی جیسے میں وہاں موجود ہی نہ ہوں۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ منیر علی واپس آئیں گے تو کسی طرح خود ہی اُن سے کورا کا ذکر چھیڑوں گا لیکن انھیں آئے ہوئے دیر ہو گئی اُن کے سامنے اُس کا نام میری زبان پر نہیں آسکا۔ مجھے ڈر لگنے لگا تھا کہ نہ جانے وہ اُس کے بارے میں کیا بتائیں۔ میں گنگ بیٹھا اپنی انگلیوں کی کھال چھیلتا رہا۔ میرا جسم خود مجھے بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ کئی بار دل میں آئی کہ تجمل کو وہیں چھوڑ کے باہر بھاگ جاؤں۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" دفعتہً منیر علی نے میرے پاس آ کے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "اب طبیعت کیسی ہے؟ کچھ دیر آرام کر لو اور کوئی بات چیت کرو۔ بات چیت کرو گے تو جی بہلے گا۔ تمھاری عمر میں تو ہماری زبان کو قرار نہیں ہوتا تھا۔ کہیں پڑھتے ہو؟"

"جی نہیں۔" میں نے زیرِ لب جواب دیا۔

"پھر کیا مشغلہ ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ تو ضرور کرتے ہو گے؟"

میں نے تجمل کی طرف دیکھا۔ "اس نے ابھی پڑھائی ختم کی ہے۔" میرے بجائے تجمل نے جواب دیا۔

"صاحب زادے ہیں ماشاءاللہ؟"

"ہاں، نہ جانے کیا کیا کچھ ہے۔" تجمل بد بداتے ہوئے بولا۔

"اچھا۔" منیر علی ہنسنے لگے۔ "اولاد تو واقعی سبھی کچھ ہوتی ہے۔ ماشاءاللہ تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے؟"

"سولہ درجے پورے پاس کیا ہے لاڈلے نے۔"

"اچھا اچھا۔" منیر علی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "اتنی کم عمری میں! پھر تو یہ عالم و فاضل ہوئے۔ بھئی ہمارے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل جائے تو نظر انداز کر دینا ظہیر میاں!" میں نے سر جھکا لیا۔

"اور ہر امتحان میں پہلے نمبر پہ آیا ہے۔" تجمل نے بتایا۔

"خوب! خدا ہر جگہ، ہر قدم پہ کامیاب کرے۔" منیر علی مجھے دعائیں دینے لگے پھر کچھ توقف کے بعد بولے۔ "مولوی صاحب قبلہ سے آپ کا کیا رشتہ نکلتا ہے؟"

تجمل کو جواب دینے میں ہچکچاہٹ ہوئی۔ "قریب کا ہی سمجھ لو ویسے رشتے ناتوں سے کیا ہوتا ہے۔ رشتہ تو سمجھنے کا ہوتا ہے اب آپ کا اُن سے کون سا رشتہ تھا؟"

"بے شک۔ سب سے بڑا رشتہ تو آدمیت کا ہے۔ پھر بھی وہ آپ کے کیا لگتے تھے؟ معاف کیجیے، مولوی صاحب سے تعلقِ خاطر کی وجہ سے جاننے کا اشتیاق ہے۔"

"بھائی کہہ لو۔"

"بھائی!" منیر علی نے تعجب سے کہا۔ "مگر... مگر..."

"مگر کیا؟" تجمل نے چونک کے پوچھا۔

"مولوی صاحب فرماتے تھے کہ اُن کا کوئی بھائی نہیں ہے۔"

"بھائی صرف سگے ہی ہوتے ہیں؟"

"نہیں نہیں۔" منیر علی ندامت سے بولے۔ "میرا مقصد یہ نہیں ہے۔ ایک دن میں مولوی صاحب سے اُن کی پچھلی زندگی کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ اول تو اپنے بارے میں کچھ بتاتے نہیں تھے مگر اُس دن نہ جانے کس عالم میں تھے، بہت سی باتیں کہہ گئے۔ کہتے تھے کہ قریبی عزیزوں میں صرف ایک بہن تھی۔"

"انھیں ایسا ہی کہنا چاہیے تھا۔"

"کیا مطلب! میں سمجھا نہیں۔"

"نہ پوچھو تو بہتر ہے بڑے صاحب!"

"کوئی مضائقہ نہیں۔" منیر علی تیزی سے بولے۔

"آپ نے غور نہیں کیا، اُن کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ اُن کے نہیر تو اُس کے تو کچھ عزیز ہو سکتے ہیں۔ وہ بھول گئے۔ دوسروں کے لیے تو انھیں بھولنے کی پابندی نہیں تھی۔"

"نہیں جناب! بالکل نہیں۔" منیر علی نے تردد سے کہا۔ "میں آپ سے متفق ہوں اور کچھ سمجھنے کی کوشش بھی کر رہا ہوں مگر آپ کو اتنی مدت بعد اچانک اُن کی یاد کیسے آگئی؟"

"ہم انھیں مدت سے کھوج رہے ہیں۔"

منیر علی پہلو بدلنے اور سر ہلانے لگے۔ "آپ کی باتوں نے عجب اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ شروع شروع میں مولوی صاحب کی موجودگی میں بھی کچھ یہ اُلجھن ہوتی تھی۔ انسان کا ذہن ہے۔ آدمی جو نہیں سوچنا چاہتا، وہ سوچتا ہے۔ مولوی صاحب جب یہاں تشریف لائے تھے تو لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ بعد میں اُن کے حسنِ اخلاق اور شرافتِ نفس نے سب کو چپ کر دیا۔ مولوی صاحب کی گوشہ نشینی اور خموشی ہی لوگوں کے لیے باعث ہوتی تھی۔ میں آپ سے نہیں پوچھوں گا کہ وہ آخر کیا بات تھی حالانکہ ایک آدمی ہونے کی حیثیت سے مجھے جستجو ہے مگر یہ معاملہ آپ کا ہے۔ جب تک آپ خود نہیں بتائیں گے، میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔" منیر علی تاسف سے بولے۔ "نرجس بھی انھی کی طرح خاموش اور الگ تھلگ رہتی تھی۔ آہ نرجس۔ کیا بتاؤں، وہ کیسی لڑکی تھی۔ خدا گواہ کہ میں نے اُسے اپنی زہرہ سے کم کبھی نہیں سمجھا۔ وہ بھی انھی کی طرح میرا لحاظ کرتی تھی۔ مجھے ابا جان کہتی تھی۔ گھر میں زہرہ اور سلمہ کے لیے کوئی نئی چیز اُسے شامل کیے بغیر نہیں آتی۔ کبھی کوئی ایسی چوک ہو جاتی تو زہرہ مجھ سے لڑتی۔"

میرے کان پھٹے جا رہے تھے۔ منیر علی اچانک کھڑے ہو گئے۔ ایک شخص دبے پاؤں بیٹھک میں داخل ہوا تھا، اُس کے کپڑے گندے اور بال بڑھے ہوئے تھے، داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ آتے ہی پھٹی پھٹی نگاہوں سے

ہمیں تکنے لگا۔ منیر علی نے تیزی سے بڑھ کے اُس کا شانہ تھام لیا اور کمزور کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔ "ارشد میاں! کہاں چلے گئے تھے؟"

"یہیں تھا۔" آنے والا بجھی ہوئی آواز میں بولا۔

"کہاں چھپے بیٹھے تھے؟ پتہ ہے تین دن ہو گئے۔ سارا شہر چھان مارا۔ خدا کے لیے مجھ بوڑھے پر تو رحم کرو۔ بتا کے جایا کرو، چاہے کتنے ہی دن کے لیے جاؤ۔ میرے اعصاب میں اب اتنا دم نہیں ہے۔ آئینے میں صورت بھی دیکھی ہے اپنی؟ سڑا کپڑے تو دیکھو۔"

ارشد نگاہیں نیچی کیے سُنتا رہا۔ میں نے اُسے پہلی بار غور سے دیکھا۔ اُس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ سرخ آنکھیں باہر نکلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ قد بھی خاصا بڑا تھا مگر وہ بیمار بیمار نظر آتا تھا۔ "میرا بھانجا ہے۔ بی اے کر چکا ہے۔" منیر علی نے تجمل سے کہا، پھر ارشد سے بولے۔ "یہ ہمارے مہمان ہیں۔ اکبر خاں صاحب اور ان کے بیٹے ظہیر میاں۔ یہ مولوی صاحب کے عزیز ہیں۔"

"مولوی صاحب کے عزیز؟" نوجوان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

"بہت مہربان لوگ ہیں، میری درخواست قبول کر لی اور یہاں قیام پر آمادہ ہو گئے۔"

"مولوی صاحب!" ارشد نے سٹ پٹاتے ہوئے پوچھا۔ "اُن کا کوئی؟..."

"نہیں بیٹے! یہ خود انھیں تلاش کرتے ہوئے آئے ہیں۔" منیر علی مایوسی سے بولے۔ "جاؤ تم اندر جا کے بہن بھائیوں کو صورت دکھا دو۔ وہ سب بہت پریشان ہیں، کپڑے بھی بدل لینا۔"

ارشد دزدیدہ نظروں سے ہمیں گھورتا رہا۔ منیر علی نے دوبارہ اُسے ٹوکا۔ وہ اندر چلا گیا۔ "بہت سعادت مند لڑکا ہے۔" اُس کے جانے کے بعد منیر علی پژمردگی سے بولے۔ "کچھ عرصے سے اس کی طبیعت میں عجیب انقلاب آیا ہے۔ نہ کھانے کا ہوش، نہ پہننے کا۔ نہ کسی سے بات کرتا ہے، نہ کسی کی سُنتا ہے۔ آپ نے حالت دیکھی؟ رات رات بھر، دن دن بھر گھر سے غائب رہتا ہے۔ لوگ ڈھونڈ تلاش کر کے لاتے ہیں۔"

"کیا پھیر ہے؟" تجمل نے تجسس سے پوچھا۔

"پھیر کچھ نہیں، بس قسمت کا پھیر ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیا ہو گیا ہے۔" منیر علی اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے اُداسی سے بولے۔ "اچھا خاصا تھا۔ میں پہلے نظر کا قائل نہیں تھا لیکن اب میرا بھی یہ خیال ہے کہ اسے نظر لگ گئی ہے۔ بہت سر مارا لیکن روز بہ روز حالت بگڑتی ہی گئی۔ باپ کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا، ماں بھی مر گئی تو میں اسے یہاں لے آیا۔"

"کب سے ایسا ہے؟" تجمل نے بیڑی جلاتے ہوئے پوچھا۔

"کئی مہینے سے۔" منیر علی بے چینی سے بولے۔ "کئی مہینے سے۔"

تجمل نے اس کے بعد کچھ نہیں پوچھا اور نہ منیر علی نے کچھ بتایا۔ نوجوان ارشد بیٹھک میں واپس نہیں آیا تھا تا آنکہ عشا کی اذان ہو گئی۔ منیر علی نماز کو چلے گئے۔ بیٹھک میں خاموشی چھا گئی اور تجمل ننگے پاؤں ٹہلنے لگا۔ پھر اچانک میرے پاس رُک کے اُس نے مجھے مونڈھے سے اُٹھایا اور میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ "لاڈلے!" اُس کی آواز بھنچی ہوئی تھی۔ وہ میرے گال زور زور سے تھپ تھپانے لگا۔ "پردہ کھینچ لے لاڈلے! پردہ کھینچ لے۔ کانچ پہ اتنا زور مت ڈال۔ اپنا نہیں تو اُس کا خیال کر لے۔"

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر بوڑھی ملازمہ اور منیر علی کے چھوٹے لڑکے نے آ کے دسترخوان لگانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں منیر علی بھی دو آدمیوں کے ساتھ واپس آ گئے۔ اُن میں سے ایک شخص شام کو ہمارے ساتھ آیا تھا۔ تجمل نے مجھے دسترخوان پہ بلایا۔ میں چپ چاپ سب کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کھانے میں قسم قسم کی چیزیں تھیں۔ بیٹھک میں روشنی مدھم تھی۔ میں ہاتھ چلاتا رہا تاکہ منیر علی کو کچھ کہنے کا موقع نہ ملے، مجھے معلوم تھا، میں جتنا انکار کروں گا کہ بھوک نہیں ہے، جی متلا رہا ہے، منیر علی کا اصرار اتنا ہی بڑھتا رہے گا۔ کیا پتہ، ان پلیٹوں میں کبھی کورا نے بھی کھانا کھایا ہو۔ اُس کا ہاتھ تو ضرور لگا ہو گا۔ وہ یہاں بیٹھک میں بھی آتی ہو گی۔

کھانے کے دوران میں وہ سب باتیں کرتے رہے۔ مولوی صاحب کی عادات و صفات کے متعلق باتیں۔ تجمل زیادہ تر سُنتا رہا۔ وہ لوگ رات گئے واپس ہوئے۔ منیر علی نے رخصت چاہی لیکن تجمل نے اُسے روک لیا۔

"اگر آپ کو نیند نہ آ رہی ہو تو کچھ دیر اور بیٹھو۔"

"بسر و چشم۔" منیر علی شگفتگی سے بولے۔ "مجھے تو آپ ہی کا خیال تھا ورنہ جی تو یہ چاہتا ہے کہ رات بھر آپ سے باتیں کرتا رہوں۔"

"بڑے صاحب! آپ بول رہے تھے کہ مولوی صاحب یہاں بہت خوش تھے اور اُن کا یہاں سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پھر ایکا ایکی یہ کیا ہو گیا؟ میرا مطلب ہے، آپ نے اُن کا سامان بھی دیکھا؟"

"دیکھا جناب! جس رات یہ حادثہ پیش آیا، تمام سامان بکھرا ہوا تھا۔ میں نے اور زہرہ نے سامان دوبارہ ترتیب سے رکھا پھر شاید میں نے آپ کو بتایا تھا، سب سامان ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔"

"کیا آپ مجھے وہ سامان ایک نظر دکھا سکتے ہو؟"

منیر علی کسمسانے لگے پھر بولے۔ "میں اُسے اُن کی امانت سمجھتا ہوں۔"

"میں صرف دیکھنے کی بات کر رہا ہوں بڑے صاحب! شاید کوئی کام کی بات کا پتہ چل سکے، شاید کوئی کاغذ پتر نکل آئے۔"

"آپ چاہیں تو دیکھ لیں۔" منیر علی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے آپ کی نگاہ کسی ایسی چیز پہ پڑ جائے جو میری نظر سے روپوش رہی ہو ویسے پولیس دو بار سامان کھنگال چکی ہے لیکن دیکھیے... آپ نے فرمایا ہے کہ آپ مولوی صاحب کے عزیز ہیں۔ اُن کے سامان میں بظاہر ایسی کوئی خاص چیز نہیں تھی، پھر بھی... معاف کیجیے۔ آدمی کو..."

"ہاں ہاں! آپ کا خیال ہے کہ کچھ کاغذ وغیرہ ہو سکتے ہیں۔"

"بدگمانی نہ سمجھیے۔" منیر علی نے کسی قدر تندی سے کہا۔

"آپ ٹھیک سمجھتے ہو بڑے صاحب!" بجھل نرم لہجے میں بولا۔ "آپ میرے لیے بہت محترم ہیں۔ مہمانوں کی دل شکنی کسی صورت میں روا نہیں ہے۔ آپ کچھ اور تصور مت کیجیے۔"

بجھل ہنسنے لگا۔ "بڑے صاحب! چھوڑو۔ میں نے یوں ہی بول دیا تھا، پولیس والوں نے اور آپ نے سب دیکھ لیا ہے تو ٹھیک ہے۔"

منیر علی زیادہ دیر نہیں ٹھیرے۔ رات بھی بہت ہو گئی تھی۔ بجھل پلنگ پر لیٹ کے کراہنے لگا۔ محلہ سرِ شب ہی سناٹے میں ڈوب گیا تھا۔ گلیوں میں جب کتے بھونکتے، سکوت درہم برہم ہو جاتا۔ بجھل رات بھر کھانستا اور بیڑیاں پیتا رہا۔ منیر علی جاتے جاتے لالٹین کی بتی کم کر گئے تھے، بیٹھک میں دھواں پھیلا ہوا تھا۔ "لاڈلے!" رات کے کسی حصے میں بجھل نے مجھے پکارا۔

"ہُوں۔" میں نے ہنکاری بھری۔ "کیا ہے؟"

"سوتا کیوں نہیں ہے!"

"تم بھی تو نہیں سو رہے ہو؟"

"سر کچھ دُکھ رہا ہے۔"

میں اُٹھ کے اُس کے سرہانے چلا گیا۔ "لاؤ دبا دوں۔"

"نا۔ نا۔" اُس نے کراہتے ہوئے میرے ہاتھ پکڑ لیے۔ میں نے زور کر کے اپنے ہاتھ اُس سے چھڑائے اور اُس کا سر دبانے لگا۔ بجھل کے ماتھے کی نسیں اُبھری ہوئی تھیں۔

"اتنی بیڑیاں کیوں پیتے ہو؟"

"کوئی بیڑی مزا ہی نہیں دے رہی لگتا ہے سالا نیم کا پتا ہے۔"

"میں تم سے ایک بات کہوں؟"

"بول۔" اُس نے آنکھیں بند کر کے کہا۔

"مگر تم مانو گے نہیں، تم سے کچھ کہنا بے کار ہے۔"

"مجھے پتہ ہے لاڈلے کہ تو کیا رٹ لگائے گا۔ یہی بولے گا کہ تمھیں اتوا چھوڑے ہوئے دن ہو گئے، جامو پریشان ہو گا، تمھارے پیچھے وہاں نہ جانے کیا ہو رہا ہے، اُدھر زرّیں تمھاری راہ تک رہی ہو گی، مجھ سے زیادہ تمھاری اُنھیں ضرورت ہے۔ یہی بولنا چاہتا ہے نا؟"

"ہاں یہی کچھ۔ اور میں کوئی بے جا بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جس طرح بھی ہوا، واپس آ جاؤں گا۔ بمبئی کی طرح نہیں کروں گا۔ اگر کہیں تمھاری ضرورت پڑی تو خط لکھ دوں گا۔ میں اپنے آپ کو سنبھال کے رکھوں گا۔ آخر جب تم نہیں تھے تو بھی میں انھیں تلاش کر رہا تھا۔ پھر کیا میں واپس نہیں آ گیا تھا۔ مجھے اتنی جلدی موت نہیں آئے گی۔ آتی تو بہت پہلے آ جاتی۔"

"لاڈلے جانی! کیا تیرے پاس بولنے کے لیے کچھ اور نہیں ہے۔ مجھے تیری یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔"

"اور مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ تم گلی گلی گھر گھر آوازیں لگاتے پھرو۔"

"کبھی کبھی دل کرتا ہے، تجھے خوب ماروں۔"

"تو مارتے کیوں نہیں، پہلے بھی تم کئی مرتبہ کہہ چکے ہو۔ تمھیں سو کا کس نے؟ تمھیں تو دیر بھی نہیں لگے گی۔ کاش میں خود یہ کر سکتا۔"

"لاڈلے!" وہ اپنا سر جھٹکنے لگا۔ "بس کر، اتنا زیادہ مت بول۔ تیری زبان بھی چاقو ہے، پر اسے چاقو کی طرح دیکھ بھال کے چلایا کر۔"

میں نے چپ سادھ لی اور آہستہ آہستہ اُس کا سر دباتا رہا۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ یہ گفتگو بے نتیجہ ہے پھر بھی میں منہ بند نہیں رکھ سکا حالانکہ میں نے طے کر لیا تھا کہ اُس سے ایسی کوئی بات نہیں کروں گا۔ رات کے آخری حصے میں بجھل کی آنکھیں بھاری ہونے لگیں۔ میں اپنے بستر پر چلا آیا۔ میں نے اپنی مالا گردن سے اُتار کے اپنے چہرے پر ڈال لی۔

منیر علی نے ہمیں علی الصباح جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ نماز سے فارغ ہو کے بیٹھک میں آئے اور سلام کے بعد رات کی بات پر معذرت چاہنے لگے۔ "مجھے ساری رات بے کلی رہی کہ کہیں آپ کی دل آزاری تو نہیں ہوئی۔" ندامت زدہ لہجے میں بولے۔ "آپ جب چاہیں، مولوی صاحب کا سامان دیکھ سکتے ہیں۔"

"بڑے صاحب! رات گئی، بات گئی۔" بجھل نے اونچی آواز میں کہا۔

"نہیں صاحب! بات ایسے نہیں جاتی۔"

بجھل نے زیادہ اشتیاق ظاہر نہیں کیا مگر منیر علی نے ناشتے کے بعد ہم سے اُٹھنے کی التجا کی اور ہمیں اپنے مکان سے ملحق ایک دوسرے مکان کے دروازے پر لے آئے۔ یہ مکان کسی مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا اور ساخت تھی جیسے کسی قلعے کا دروازہ ہو۔ میرا خون رگوں میں جمنے لگا۔ کبھی اس مکان کی دیواروں میں کورا رہتی تھی۔ یہ دروازہ اُس نے بارہا مولوی صاحب کے لیے اپنے ہاتھوں سے کھولا ہو گا۔ دروازے پر اُس کی انگلیوں کے نشانات اب بھی کہیں موجود ہوں گے۔ دروازہ کھلنے میں دیر ہو گئی۔ منیر علی نے پہلے ہی اپنے لڑکے کو اندر سے کنڈی کھولنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ دروازے کے ساتھ دونوں طرف اینٹوں سے چنی ہوئی اونچی دیوار تھی اور اوپر کئی روشن دان بنے ہوئے تھے۔ ان دیواروں سے اندر داخل ہونا آسان نہیں تھا۔ کوئی سیڑھی لگا کے، کمند پھینک کے اوپر جا سکتا تھا یا دوسرے مکان سے چھت چھت ہوتا ہوا پہنچ سکتا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی ہم ایک کوٹھری جیسی ڈیوڑھی سے گزرے۔ بہت کم تھی لیکن ڈیوڑھی سے آگے ایک کشادہ اور روشن صحن تھا۔ صحن کے تھموں پر ٹکا ہوا دالان تھا اور اندر کمرے تھے۔ فرش پکا تھا۔ کسی جگہ کوئی بھی پڑا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔ صحن میں ایک جانب بیری کا درخت پھیلا ہوا تھا۔ چنبیلی، موتیا اور گلاب کے پودوں میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ سفید گلاب کی بیل ایک کونے میں چھت تک چلی گئی تھی اور پھولوں کے گچھے شاخوں پر جھول رہے تھے۔ کیاریوں کی مٹی گیلی گیلی تھی۔ صبح وہاں ضرور پانی ڈالا گیا تھا۔ مکان زیادہ پرانا نہیں تھا۔ رنگ بھی کچھ میلا میلا ہو گیا تھا لیکن کہیں گرد اور دھول جمی ہوئی نہیں تھی۔ کمروں کے ساتھ بنے ہوئے طاق بھی صاف تھے۔ دالان میں آ کے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کورا کسی تھم یا دیوار کی اوٹ میں چھپی ہوئی ہے یا کسی روزن سے جھانک رہی ہے۔ سامنے کے کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ "یہ کیوں کھلا ہوا ہے؟" منیر علی نے متوحش لہجے میں اپنے چھوٹے لڑکے سے پوچھا اور اُس کا جواب سننے سے پہلے ہی کمرے میں داخل ہو گئے۔ ہم بھی اُن کے پیچھے پیچھے چلے آئے۔ منیر علی چند قدم چل کے ٹھٹک گئے۔ اندر چارپائی پر ارشد سکڑا ہوا پڑا تھا۔ ہماری آہٹ پر وہ چونک پڑا اور اپنا جسم چرانے کے انداز میں اُٹھ گیا۔ اُس کے گلے میں ایک چنا ہوا دوپٹا پڑا تھا۔ "ارشد میاں! تم یہاں کب سے ہو؟" منیر علی نے کسی قدر تلخی سے کہا۔

"جی۔ بہت دیر سے، بہت دیر سے۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"اور میں اُدھر تمھیں پوچھ رہا تھا۔" منیر علی ترشی سے بولے۔ "یہ گلے میں تم نے کیا ڈال رکھا ہے؟ رنگ دار لباس کا شوق تمھیں کب سے ہو گیا؟"

"جی۔" وہ گھبرا سا گیا۔ اُس نے جلدی سے دوپٹا اُتار کے پلنگ پر ڈال دیا اور نظریں نیچی کیے ایک جانب سمٹ کے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے تیبو بنا لیا تھا اور اُس کا لباس بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ آج وہ کل رات سے بہت بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اُس کا رنگ گندمیں لیکن زردی مائل تھا۔ چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ وہ کھڑے کھڑے لرز رہا تھا۔

منیر علی اُسے گھر واپس جانے کا حکم دے کے باہر آ گئے۔ اُن کے لہجے پر چند لمحوں تک کبیدگی طاری رہی۔ "یہاں مولوی صاحب رہتے تھے۔ یہ اُن کا خاص کمرہ تھا، اس مکان میں ایک چھوٹی کوٹھری اور تین کمرے ہیں۔ ایک کمرہ باہر صحن کے ساتھ ہے۔ وہ مردانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا اگرچہ اُس کے استعمال کی نوبت کم ہی آتی تھی۔ تیسرا کمرہ یہ ہے۔ یہاں نرجس بیٹی رہتی تھی۔"

وہ ہمیں مولوی صاحب کے کمرے سے ملے ہوئے ایک دوسرے کمرے کے دروازے پر لے آئے۔ میری آنکھیں پھیل گئیں۔ وہاں ایک بڑا تالا لٹکا ہوا تھا۔ منیر علی نے جیب سے چابیاں نکال کے اُسے کھولا۔ میرے پاؤں چوکھٹ پر قدم رکھتے ہی ڈگمگانے لگے۔ کمرے میں کئی ٹرنک اوپر تلے رکھے ہوئے تھے اور ہر طرف مختلف قسم کا سامان کسی دُکان کی طرح یا جہیز میں دیے جانے والے اسباب کی مانند ترتیب سے سجا ہوا تھا۔ ایک چھوٹی میز پر قلم دوات، کاپیاں اور چند کتابیں موجود تھیں۔ میز پر ایک گل دان بھی رکھا تھا، اُس کے پھول اور پتے خشک ہو گئے تھے۔ کھلی ہوئی الماری کے خانوں میں آئینہ، سُرمے دانی، تیل کی شیشیاں، صابن۔ نیچے کے خانوں میں چائے کے برتن، چینی کی پلیٹیں اور سب سے اوپر کے خانے میں کتابوں کا ڈھیر تھا۔ کمرے میں کھڑکی سے قریب نواڑ کی ایک مسہری پڑی ہوئی تھی۔ "یہ اُن کا کُل سامان ہے۔" منیر علی بجھل کو ایک ایک چیز کی تفصیل بتا رہے تھے۔ بجھل الماری کے اوپر کے خانے سے کتابیں نکال کے اُن کے صفحے اُلٹنے پلٹنے لگا۔ میرے ہاتھ پاؤں اکڑنے لگے تھے۔ منیر علی نے ایک ایک ٹرنک کھول کے دکھایا۔ کپڑوں میں زیادہ تر کورا ہی کے کپڑے تھے۔ ریشمی، رنگین، پھول دار اور سادہ کپڑے۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے اُنھیں چھوا۔ میرا سارا جسم منجمد ہونے لگا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں کورا کو چھو رہا ہوں۔ اُس کے دوپٹے، شلواریں، جمپر کُرتے، پشواز، غرارے، چھوٹے کپڑے، دو سیاہ برقعے، جُتیاں۔

"وہ ہمیشہ سادہ لباس پہنتی تھی مگر مولوی صاحب اُس کے لیے طرح طرح کے کپڑے سلواتے رہتے تھے۔ دیکھیے، بہت سے کپڑے تو ان میں ایسے ہیں جنھیں اُس نے پہنا ہی نہیں یا صرف ایک ہی بار کبھی مولوی صاحب کے اصرار پر کوئی جوڑا پہن لیا ہو۔" منیر علی نے کہا۔ "یہ اُس کے زیور ہیں، مصنوعی زیور۔ اصلی میں نے محفوظ کر لیے ہیں۔ دو ہار مولوی صاحب اپنے ساتھ لائے تھے، چوڑیاں اُنھوں نے یہیں بنوائی تھیں۔" منیر علی کی انگلیوں میں اُس کے آویزے جھلملا رہے تھے۔ "اُسے زیور پہننے کا بھی کچھ ایسا شوق نہیں تھا۔ بس کبھی کبھی بالوں میں تازہ پھول لگا لیتی تھی۔"

میں نے میز پر رکھی ہوئی کاپیاں کھول کے دیکھیں، وہ کورا ہی کی تحریر تھی۔ مولوی صاحب کی تحریر ایسی نہیں ہو سکتی، کئی کاپیاں بھری ہوئی تھیں۔ میں نے ایک ایک صفحہ لوٹ کے دیکھا۔ اُس کے لکھے ہوئے لفظ میری آنکھوں کے سامنے گردش کر رہے تھے۔ میری نظریں کسی ایک جگہ ٹھیر ہی نہیں رہی تھیں۔ تمام لفظوں کی نشست و برخاست یکساں تھی جیسے انھیں ناپ تول کے لکھا گیا ہو، چُن چُن کے لکھا گیا ہو۔ اُس کی تحریر بہت صاف اور شگفتہ تھی۔ چیکتی ہوئی، چمکتی ہوئی، دُھلی ہوئی سی تحریر۔ ایک لفظ کے بعد دوسرے لفظ کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ جہاں جہاں کشش آتا تھا، اُس کے ہاتھ کی لرزش صاف پتہ چلتی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ کشش اور لفظوں کی طرح صاف نہیں لکھ پاتی تھی۔ مجھے خیال آیا، شاید اُس نے میرے لیے کچھ لکھا ہو۔ کہیں کسی صفحے پر میرا نام بھی ہو مگر وہ تمام صفحات نصابی موضوعات پر مشتمل تھے۔ الفاظ، معانی، تاریخ، جغرافیہ، چھوٹے چھوٹے معلوماتی مضمون۔ اُس نے اردو لکھنا خوب اچھی طرح سیکھ لیا تھا۔ بولنے میں تو وہ اور بھی طاق ہو گئی ہو گی۔ لوگ کسی شخص کی دل نشیں گفتگو کی مثال پھولوں سے دیتے ہیں کہ وہ شخص جب باتیں کرتا ہے تو اُس کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ کورا پر یہ مثال بالکل صادق آتی تھی۔ اُس کے منہ سے اُس وقت بھی پھول جھڑتے تھے جب وہ اٹک اٹک کے اردو بولنے کی کوشش کرتی تھی۔ اُس کے چھوٹے چھوٹے دانت چمکنے لگتے تھے اور رخساروں میں گڑھا پڑ جاتا تھا۔ اب تو وہ اور روانی اور شستگی سے بولتی ہو گی۔ مولوی اسماعیل میرٹھی کی پانچویں کتاب بھی میز پر موجود تھی۔ اساتذہ کے مجموعے بھی اُس کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔

ایک ٹرنک میں مولوی صاحب سے متعلق سامان بھرا ہوا تھا۔ اُن کے کپڑے اور دوسری چیزیں۔ منیر علی کے بیان کے مطابق یہ سامان اُن کی بیٹی نرجس نے صندوقوں میں بند کیا تھا۔ جو سامان صندوقوں میں آنے سے رہ گیا تھا، وہ اِدھر اُدھر پڑا ہوا تھا۔ منیر علی نے اپنے دو ٹرنک بھی اس مقصد کے لیے خالی کر دیے تھے۔ مولوی صاحب کا اپنا سامان بہت مختصر تھا۔ بجھل نے مجھے بلا کے اُن کی کاپیاں اور کاغذات دکھائے۔ اُن میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ مولوی صاحب

نے کوئی یادداشت نہیں لکھی تھی۔ ڈائری نما ایک کاپی پر چیدہ چیدہ اشعار درج تھے۔ فارسی اور عربی شعروں کی کثرت تھی۔ میں نے جستہ جستہ اُنھیں پڑھا۔ کوئی پُرزہ ایسا نہیں تھا جو میں نے غور سے نہ دیکھا ہو کہ شاید کہیں کوئی نشان مل جائے یا کہیں میرا ذکر ہو لیکن مولوی صاحب کے کاغذات میں منتخب احادیث، اشعار، اقوال، علمی نوٹ، تفسیریں، بعض مسائل کی شرح، بعض منطقی موضوعات کے خلاصے اور حکایتوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ کتابوں میں انگریزی کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ دس بارہ انگریزی ناول، انگریزی اُردو ڈکشنری، انگریزی الفاظ و معانی کی کاپی، شیکسپیئر کی چند کتابیں اس بات کی غمازی کرتی تھیں کہ مولوی صاحب نے فرصت کے اوقات میں انگریزی سیکھنے کی کوشش کی ہے اور اُن کی انگریزی تحریر سے پتہ چلتا تھا کہ اُنھوں نے اچھی خاصی مہارت بھی حاصل کر لی ہے۔ ابتدائی کتابوں کے علاوہ اگلے درجوں کی کئی کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

اُس کی مسہری کی نواڑ پہ دھول کی ہلکی سی تہہ جمی ہوئی تھی۔ میں نے الماری کے خانے سے بے خیالی میں آئینہ اُٹھایا کہ شاید اُس میں کورا کا کوئی عکس محفوظ رہ گیا ہو۔ آئینے کے پیچھے مجھے ایک کنگھی دکھائی دی۔ میں نے اُسے آنکھوں سے لگا لیا۔ اُس میں کورا کی خوشبو بسی ہوئی تھی اور دندانوں میں اُس کے چند بال اٹکے ہوئے تھے۔ وہی سُرخی مائل سیاہ بال۔ کلکتے میں جب ہم دونوں ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اور ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہم کہاں جائیں گے کیا کریں گے، کورا نے اپنے بال میرے چہرے پہ بکھیر دیے تھے۔ مجھے وہ خوشبو اب تک یاد تھی۔ ہم کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک سامان دیکھتے رہے۔ میرا جی وہاں سے ایک لمحے کے لیے بھی ہٹنے کو نہیں چاہتا تھا لیکن منیر علی ایک ایک کر کے صندوق میں تالے ڈالتے گئے اور پھر ہمارے دیکھنے کو کچھ نہیں رہا۔ تجمل واپس ہونے لگا تو مجھے بھی کمرے سے نکلنا پڑا۔ منیر علی نے دروازے پہ تالا لگا دیا اور چلتے چلتے دوسرے کمرے میں جھانک کے دیکھا، وہاں ارشد موجود نہیں تھا۔ ہمارے باہر آتے ہی منیر علی کے گھر کے صحن میں کھلنے والی کھڑکی کے پٹ زور سے بند ہونے کی آواز آئی۔ منیر علی کا چھوٹا بیٹا اندر سے دروازے کی کُنڈی لگانے کے لیے مکان ہی میں رہ گیا۔ ہم تینوں باہر چلے آئے۔ تجمل کے چہرے پہ دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ بیٹھک میں آ کے بھی وہ چپ چپ رہا۔ "آپ نے کیا اندازہ لگایا جناب؟" منیر علی نے سانس قابو میں آتے ہی مضطرب لہجے میں پوچھا۔

تجمل نے جواب نہیں دیا۔ منیر علی دیر تک اُس کی صورت دیکھتے رہے اور تپائی پہ رکھی ہوئی خشک میوے کی پلیٹ سے کشمش ٹونگتے رہے۔ اُسی لمحے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اور بھی کمرے میں موجود ہے۔ میں نے بے چینی سے چاروں طرف نگاہ گھمائی تو سامنے کے روشن دان کی جالیوں سے دو بڑی بڑی آنکھیں جھانکتی ہوئی نظر آئیں۔ میں اُس کا پورا چہرہ تو نہیں دیکھ سکا لیکن اُس کا رنگ موتی جیسا تھا۔ وہ جالیوں کے پاس سے فوراً ہٹ گئی۔ منیر علی نے بھی مُڑ کے دیکھا مگر روشن دان خالی ہو چکا تھا۔ وہ منیر علی کی لڑکی زہرہ ہی ہو سکتی تھی، کورا کی ہم جلی

نہ جانے اتنے عرصے کے ساتھ میں کورا نے اُس سے کیا کیا باتیں کی ہوں گی، بہن سہیلیوں میں کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ کورا کے بارے میں جتنا وہ جانتی ہوگی اور نہیں جانتا ہوگا۔ اسے بھی تلابیلی ہوگی کہ ہم کیوں آئے، ہم کورا کے عزیز ہیں۔ وہ بھی بہت کچھ جاننے کے لیے بے تاب ہوگی۔ ہو سکتا ہے کورا نے میرے بارے میں بھی کچھ بتایا ہو۔ صبح ناشتے کے دوران میں بھی روشن دان میں کسی سائے کا گمان ہوا تھا مگر اُس وقت اتنی روشنی نہیں تھی۔ منیر علی کچھ دیر تک تجمل کے ردِ عمل کا انتظار کرتے رہے مگر تجمل نے کچھ نہیں کہا تو اُنھوں نے ہم سے معذرت چاہی کہ انھیں چھوٹے لڑکے کو مدرسے چھوڑتے اور اپنے کام نمٹانے کے لیے باہر جانا ہے۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے واپسی ہو جائے گی۔ دوران کوئی بھی ضرورت ہو تو بے تکلف دستک دے لیجیے گا۔ ملازمہ بھی موجود ہے اور اگر آپ میرے ساتھ چلنا چاہیں تو بصد شوق۔"

"نہیں بڑے صاحب! ہم یہیں رہیں گے۔" تجمل سپاٹ لہجے میں بولا۔ منیر علی شاید خود بھی ہمیں ساتھ لے جانا نہیں چاہتے تھے، بس رسم یہ اُنھوں نے کہا تھا۔ اُن کے جانے بعد تجمل اور میں بیٹھک میں پھر تنہا رہ گئے۔ منیر علی کو گئے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ وہ آنکھیں دوبارہ مجھے روشن دان میں ہوئی نظر آئیں۔ جیسے ہی میں نے نگاہ اُٹھائی، اُس کے چہرے کے سنہرے رنگ ایک جھماکا سا ہوا اور معدوم ہو گیا۔ پھر بار بار میری نگاہ خود ہی روشن دان کی طرف اُٹھنے لگی مگر وہاں کوئی نہیں آیا۔ تجمل گاؤ تکیے سے سر ٹکائے آنکھیں نیم وا کیے لیٹا تھا۔ میں اُسے چھوڑ کے باہر آ گیا۔ بیٹھک میں ہوا بند بند سی تھی۔ گلیوں میں دُور دُور تک لوگ نہیں تھے لیکن اِرد گِرد سے پھیری لگانے والوں کی صدا رہی تھیں۔ میں محلے کی مسجد سے بھی آگے نکل گیا۔ کچھ فاصلے پر سبزی منڈی اور اُس کے پاس ہی آڑھت۔ میں یوں ہی بے سر و پا گلیوں میں گھومتا، اب مولوی صاحب، ابا جان یا جہاں گیر کی طرح گھر کا کوئی آدمی ملنے کا امکان تھا۔ جبل پور زیادہ بڑا شہر نہیں تھا۔ منیر علی نے پہلے ہی انکار کر دیا تھا کہ وہ کے حلیے اور نام کے کسی آدمی سے واقف نہیں ہیں۔ میرا دماغ خالی تھا اور مجھے اپنا جسم کھوکھلا لگ رہا تھا۔ میں جلد ہی گھر کی طرف واپس مگر راستے میں ایک جگہ میرے پیر رُکنے لگے۔ سامنے سے کندھے لٹکا منہ اُٹھائے ہوئے آہستہ آہستہ ارشد آ رہا تھا۔ میں نے سوچا اُسے روک پوچھوں۔ تھوڑی دُور تک میں نے اُس کا پیچھا بھی کیا۔ اُسے خبر ہی نہیں اُس کے پیچھے کوئی آ رہا ہے۔ اُسے گھر سے باہر دیکھ کے میرے ذہن اور خیال آیا اور میرے قدموں میں تیزی آ گئی۔ ارشد آگے نکل گیا تھا۔ گھر ملا آیا۔ بیٹھک میں تجمل اسی طرح نیم دراز غنودہ پڑا ہوا تھا۔ میں دروا دستک دینے کے لیے بڑھا لیکن میرے ہاتھ کواڑوں کو بس چھو کے رہ گئے۔ میں کرسی پہ بیٹھ کے ہانپنے لگا۔ "بنڈل لائے ہو؟" میرے تجمل کی آواز گونجی۔ میں کرسی سے اُچھل پڑا۔ وہ کروٹ بدلے مجھی کو

"بھول گیا، لے آتا ہوں۔"

"جب جائے تو لے آنا، ابھی کچھ ہیں۔"

"تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی؟"

"ٹھیک ہے رے۔" اُس نے اونچی آواز میں کہا۔ "بس ذرا بدن زور کر رہا ہے۔ سالا ادھر کا موسم بدن کو نہیں لگ رہا۔"

"تو چلے چلو۔ اب یہاں کیا رکھا ہے۔"

"کچھ دیر اور ٹھیر لینے میں حرج نہیں ہے۔"

"ٹھیر کے؟" میں نے تلخی سے کہا۔ "کیا فائدہ۔ طبیعت اور خراب نہ ہو جائے۔"

"لگتا ہے لاڈلے! جو دانہ پانی ادھر کا ہے وہی روکے ہوئے ہے۔ ہوا کے اُوپر تلے ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اپنی بس ہر وقت ہی چلتی رہتی ہے۔"

"میں تمھارا مال کہہ کے حوالے آتا ہوں۔ سبزی منڈی میں ایک دکان پر میں نے حقے بھی دیکھے تھے، کہو تو وہ بھی لے آؤں؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "تیرا تو بہت دن ٹکنے کا ارادہ معلوم ہوتا ہے۔"

"میں تو تمھاری وجہ سے کہہ رہا ہوں۔"

تجمل کچھ کہہ ہی رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں اُس کی بات سُنے بغیر لپک کر وہاں پہنچا۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پہ میرے ہاتھ سے کھل گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے سسکاری بھری، اُس کے ہاتھ میں رکھی ہوئی پیتل کی ٹرے میں پلیٹیں کھڑکھڑانے لگیں۔ شرم سے اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اُس کا رنگ گندمی تھا۔ لباس سادہ تھا۔ تنگ موری کا پاجامہ اور جمپر، دوپٹا سر سے ڈھلکا ہوا، کانوں میں بالیاں اور ہاتھوں میں رنگ برنگی چوڑیاں، مہین ناک، لمبی چہرہ، ستواں نقش و نگار، سجل، قد نکلتا ہوا۔ میں اُسے ایک ہی نظر دیکھ سکا۔ ایک لمحے کے لیے جیسے اُسے سکتہ سا ہو گیا پھر اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ نتیجتاً ٹرے گر گئی اور نسوں کا چھناکا ہوا۔ وہ بدحواسی میں بل طرف بھاگی اور میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں پیچھے ہٹنا چاہتا تھا مگر ایک لمحے میں یہ سب کچھ ہو گیا۔ مجھ سے دروازہ بھی بند نہیں کیا جا سکا۔ سامنے منیر علی کے گھر کا صحن اور دالان کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے دزدیدگی سے تجمل کی طرف دیکھا، وہ گاؤ تکیے میں منہ چھپائے پٹ لیٹا ہوا تھا۔ آخر ہمت کر کے میں نے دروازہ بند کر دیا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ پھر واپس آئے گی لیکن بہت دیر ہو گئی، دروازے پر دوبارہ دستک نہیں ہوئی، نہ اُس نے ملازمہ کو بھیجا حالانکہ وہ اُسے اندر بھیج سکتی تھی۔ میں نے ارادہ کیا کہ خود دستک دے کے معذرت کر لوں، منیر علی کی واپسی میں ابھی وقت ہے۔ ملازمہ کہیں باہر گئی ہے تو وہ بھی واپس آ سکتی ہے۔ میں وہاں تک گیا بھی لیکن پھر لوٹ آیا۔ اس اثنا میں دروازہ کھٹ کھٹانے کی آواز آئی۔ میں نے جو طے کیا تھا، سب ذہن سے نکل گیا اور میں دروازے کے پاس گم سم کھڑا رہا۔ دوسری دستک پر میں نے کھنکار کے اپنی موجودگی کی تصدیق کی۔ "یہ۔۔۔۔ یہ لے لیجیے۔" اندر سے سمٹی ہوئی آواز میں اُس نے کہا۔

میں نے آہستگی سے ایک جانب کا پٹ کھول کے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ ٹرے میرے ہاتھ سے مَس ہوئی تو میں نے اُسے تھام لیا۔ "معاف کیجیے۔" میں نے تیزی سے کہا۔

اُس طرف خاموشی طاری رہی مگر چوڑیاں بجنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی دروازے کے پار کوئی موجود ہے۔ "میں۔۔۔۔ میں! آپ زہرہ ہی ہیں؟" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "آپ ہی ہیں نا؟" اُس نے جواب نہیں دیا۔ میں نے اُس کی خاموشی ہی جواب سمجھی۔ "سنیے، مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" میں نے دبی زبان میں کہا۔ "نرجس کے بارے میں، صرف اُس کے بارے میں، آپ خدا کے لیے مجھے کچھ بتا دیجیے۔ بڑے صاحب سے میں بہت سی باتیں نہیں پوچھ سکتا اور نہ وہ اتنا جانتے ہوں گے جتنا آپ۔ مجھے معلوم ہے یہ آپ کے لیے بہت مشکل ہے، آپ ایک پردے دار لڑکی ہیں اور میں آپ کے لیے اجنبی ہوں لیکن نرجس کے رشتے سے آپ مجھے اتنا معتمد سمجھیے۔ مجھ پہ بھروسا کیجیے، جتنا آپ خود پر کر سکتی ہیں۔ آپ نرجس کی سہیلی ہیں، سو میرے لیے اتنی ہی محترم ہیں جتنی نرجس کی کوئی سہیلی ہو سکتی ہے۔" میں نے سانس لینے کے لیے ایک لمحے توقف کیا۔ "بتائیے۔ اب نہیں تو پھر کسی وقت موقع نکال کے۔ آپ سوچ لیجیے مگر ہمدردی سے سوچیے گا۔ میں آپ کو مجبور تو نہیں کر سکتا، صرف منت کر سکتا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بڑے صاحب کو ہماری باتوں کا علم نہیں ہوگا۔ آپ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہیں، آپ غور کریں تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ نرجس کے لیے، اُس کے لیے جسے آپ بہت عزیز سمجھتی تھیں، مجھے صرف نرجس ہی کی بات کرنی ہے، کچھ اور نہیں، اور۔" میں نے اپنی زبان روک لی۔ اُدھر سے کچھ آہٹ نہیں ہوئی تھی جیسے وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو اور میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔ میں وہیں ٹھیرا رہا۔ وہ شاید میری بات سُنے بغیر چلی گئی تھی۔ خاصی دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے دروازہ بھیڑ دیا اور ٹرے تجمل کے آگے رکھ دی۔

کوئی پانچ دس منٹ کے اندر اندر منیر علی واپس آ گئے۔ تجمل پلنگ سے اُٹھ گیا۔ ظہر کی نماز پڑھنے اور کھانا کھانے کے بعد جب منیر علی فراغت سے بیٹھے تو شہر کے حالات بتانے لگے۔ اسی دوران تجمل نے اچانک اُن سے پوچھا۔ "بڑے صاحب! آپ نے مولوی صاحب کو ارشد میاں کے بارے میں کچھ بولا تھا؟"

"جی!" منیر علی نے حیرانی سے کہا۔ "آپ۔۔۔ آپ کی کیا مُراد ہے؟"

"میں آپ سے جو بول رہا ہوں، وہی میری مراد ہے۔"

"آپ کو کیسے معلوم؟" منیر علی نے تیز و تند لہجے میں کہا۔

"ارشد میاں کو دیکھ کے! میرا خیال ہے آپ نے اُن سے ضرور بات کی ہوگی، پھر وہ کیا بولے؟ ہو سکے تو مجھے بتاؤ۔"

"مگر۔۔۔ مگر آپ اتنے وثوق سے یہ کیسے کہہ رہے ہیں؟"

"میں اندازے کی بات بول رہا ہوں۔"

"مگر یہ بہت نجی بات تھی جو صرف میرے اور مولوی صاحب کے

درمیان ہوئی تھی۔ آپ کا اندازہ۔ نہیں نہیں۔" مولوی صاحب کے لہجے میں لرزش آگئی۔ "بہرحال! آپ کا اندازہ بہت خوب ہے۔"

"اور یہ کوئی بری بات نہیں تھی بڑے صاحب! لڑکی والے کا گھر دکان ہوتا ہے۔ جہاں بڑی کی ہوتی ہے، وہاں گراہک آتے ہی ہیں۔ جس چیز کو لوگ اچھا سمجھتے ہیں، اسی کو اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ ارشد میاں کے لیے کسی بھی لڑکی کے لیے بول سکتے ہیں، ہر جگہ لڑکیوں کی بیریاں لگی ہوئی ہیں، ہر جگہ یہ دکانیں ہیں۔ میں تو صرف اتنا پوچھ رہا ہوں کہ مولوی صاحب نے آپ کو جواب میں کیا بولا؟"

"آپ اُن کے جواب کا اندازہ بھی کیوں نہیں لگا لیتے؟"

"وہ مجھ کو معلوم ہے، پر مولوی صاحب بولتے کیا تھے؟"

"کیا بولتے!" منیر علی کی آواز ماند پڑ گئی۔ "انھوں نے ارشد میاں کو اس لائق نہیں سمجھا۔"

"انھوں نے کیا بولا بڑے صاحب!" منیر علی میری طرف دیکھ کے رکے۔

"اس کے سامنے ہی بولیں، میں اس سے بہت کم باتیں چھپاتا ہوں۔" تجمل نے کہا۔

"رات کو کسی وقت گفتگو کریں گے۔" منیر علی نے تذبذب سے کہا۔

"یہ تب بھی موجود رہے گا۔ آپ اس کی فکر نہ کرو۔" تجمل مسکراتے ہوئے بولا۔

"میری اس کی چھوٹائی بڑائی عمر کی ہے۔"

"نہیں صاحب! دیجے کی بھی ہے، میں ابتدا سے مراتب کی تربیت دی گئی ہے۔"

"یہ بات یہ خوب جانتا ہے۔"

"آپ کی مرضی۔" منیر علی نے پلکیں سکوڑتے ہوئے کہا۔ "میں نے مولوی صاحب قبلہ سے بات کی تھی حالانکہ مجھے ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا۔ شروع سے میرا اور ہمشیرہ مرحومہ کا خیال تھا کہ ارشد میاں کی نسبت زہرہ سے کر دی جائے گی۔ اس خواہش کی رسمی تکمیل یوں ضروری نہیں سمجھی گئی کہ گھر کا معاملہ تھا۔ ارشد میاں کی تعلیم کے دوران ہی میری بہن اپنے بیٹے کو دولہا اور میری بیٹی کو دلھن دیکھنے کی حسرت دل میں لیے دُنیا سے چلی گئی۔ ارشد میاں کو میں نے یہاں بلوا لیا۔ جب میں نے اُن کی رغبت مولوی صاحب کے گھر میں دیکھی تو زہرہ کے معاملے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ارشد اور زہرہ کی بات ہمشیرہ اور مجھ تک محدود تھی۔ نرجس بھی اپنی بچی تھی۔ خدا جانتا ہے کہ میں نے کبھی دو گھر نہیں سمجھے۔ زہرہ کے بجائے نرجس، مجھے یہ فیصلہ کرنے میں ذرا بھی گرانی محسوس نہیں ہوئی بلکہ خوشی ہی ہوئی چنانچہ ایک روز میں نے مولوی صاحب کا مزاج خوش گوار دیکھ کے اس کا ذکر کر دیا۔ میرا خیال تھا اُنھیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ارشد میاں کو وہ بھی اپنا بچہ سمجھتے تھے لیکن خلافِ توقع مولوی صاحب نے اُس دن پہلی بار مجھ سے عجیب رویّہ اختیار کیا۔ اُنھوں نے صاف منع کر دیا۔ ایسے معاملے میں فوراً جواب نہیں دیا جاتا۔ انکار ہو تو مناسب عذر پیش کر دیا جاتا ہے۔ میں اُن کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ اُنھوں نے آیندہ کے لیے بھی یہ کہہ کے بات کا دروازہ بند کر دیا کہ نرجس کے سلسلے میں ایسی کوئی بات نہ کی جائے تو بہتر ہے۔"

"پر اُنھوں نے ایسا کیوں کہا بڑے صاحب؟" تجمل نے درمیان میں

"واللہ اعلم۔ اُن سے کچھ پوچھنے کی پھر میری ہمت نہیں پڑی

نے اس کے بعد مولوی صاحب سے اپنے مراسم میں کوئی شکن نہیں آ

نرجس بیٹی مجھے اُسی طرح عزیز رہی اور مولوی صاحب اسی طرح میرے لیے

"آپ نے بولا نہیں کہ مولوی صاحب، تم کو کہیں تو نرجس بی بی

تھما نا ہے، پھر آخر منع کیوں کرتے ہو؟"

"میں نے آپ سے کہا نا، اصل میں انکار سننے کے بعد مجھے نہیں رہا۔ یوں بھی میں لاکھ نرجس کو اپنی بیٹی سمجھتا، اُس کے بارے میں کرنے کا اختیار اُنھی کو تھا۔"

"پر بڑے صاحب! مولوی صاحب اِدھر کئی سال سے بسے آپ کے علاوہ بھی اور لوگوں نے اُن سے ایسی بات بولی ہوگی، کیا انھو سب کو یہی جواب دیا؟"

"ہاں بھائی! سبھی کو۔" منیر علی مایوسی سے بولے۔

"ایسا کیوں بڑے صاحب؟"

"ارشد کی بات کے بہت دنوں بعد میں نے ایک دفعہ اشارۃً کہا تھا کہ آپ نے ارشد میاں کو اپنی فرزندی میں قبول نہیں کیا، مجھے نہیں ہے لیکن دوسروں کے سلسلے میں آپ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کر کے کئی اچھے گھروں نے اُن سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اُن کی خاص رفاقت کی وجہ سے چند صاحبان نے تو میرے ذریعے تک بات پہنچوائی تھی۔ مولوی صاحب نے کسی میں کوئی تخصیص نہیں کو کسی پر ترجیح نہیں دی۔ اُن میں ایسے خاندان بھی تھے، دولت جن کے گھر کی لونڈی ہے۔ کہیں سے کوئی سلسلہ جنبانی ہوتی تھی کے سامنے بہت احتیاط سے اس کا تذکرہ کرتا تھا۔ ایک موقع پر انھو قدرے ناراض ہو کے کہہ دیا کہ جب وہ مناسب سمجھیں گے، خود مجھے بتا اُس وقت تک اُنھیں شرمندہ نہ کیا جائے۔ پھر میرے زبان کھولنے ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر میرے چُپ ہو جانے سے کچھ نہیں ہوتا مولوی صاحب کے مزاج سے واقف نہیں تھے، وہ بار بار اپنے نام کرتے تھے اور انکار کو اپنی سُبکی سمجھتے تھے۔ میں اُنھیں سمجھاتا تھا کہ ایسی ہی مجبوری ہوگی جو مولوی صاحب نے معذوری ظاہر کی ہے۔ یہ خواہش بھی کہ نرجس اُن کے گھر آیا کرے، ماشاءاللہ چندے آفتاب ماہتاب۔ چاند کو شرماتی تھی، بالکل پھولوں جیسی تھی۔ کسی ملک کی شہزادی کی کوئی ملکہ۔ لڑکیاں بالیاں دُور دُور سے اُسے دیکھنے آتی تھیں، وہ نے ملنے جلنے میں بہت احتیاط رکھی تھی اس لیے لوگ آنے سے لگے تھے۔ میں ہمیشہ خوف زدہ سا رہتا تھا کہ کبھی کچھ ہو نہ جائے، دل ہوتا رہتا تھا لندہرہ اُس کی نظر اتارتی رہتی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے بھی پسند نہیں تھا کہ نرجس سب کے سامنے آیا کرے۔ اکثر ایسا ہوا

کی نظروں سے زہرہ نے اُسے چھپائے رکھا۔ گھر میں اچانک کوئی آ جاتا تو زہرہ اُسے کمرے میں بند کر دیتی تھی اور چپکے سے کھڑکی کے راستے اُسے کے گھر بھیج دیتی تھی۔ اب میں آپ کو کیا کیا بتاؤں۔" منیر علی کی آنکھوں میں بھر آئے۔

"بولو بڑے صاحب! بولتے رہو۔" تجمل نے اُن کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"بس بھائی! یہی کچھ داستان ہے۔" منیر علی گلوگیر آواز میں بولے۔

"آپ نے ارشد میاں کو دیکھا ہے، بڑا گبرو جوان، بہت ہونہار اور سعادت مند تھا۔ مولوی صاحب ایسے ناسمجھ نہیں تھے کہ اُس کا حال دیکھ کے کچھ اندازہ نہ تے ہوں مگر انھوں نے توجہ نہیں دی تو میں نے بھی اس سلسلے میں ایک لفظ کہا۔ پھر وہ چلے ہی گئے۔ اب ارشد اطلاع دیے بغیر دُور دُور نکل جاتا ہے۔ یہاں کبھی وہاں۔ آس پاس کے لوگ، محلے والے، ہر وقت میرا سینہ جلاتے ہیں۔ میں تو اُس سے مایوس ہو چکا ہوں، اب خدا ہی اُس کی کچھ سُن لے یک ہے ورنہ. . . ."

"بڑے صاحب! آپ نے خود بھی تو کچھ جانا بوجھا ہوگا کہ . . . کہ . . . ."

"میں جانتا ہوں آپ کا مدعا کیا ہے۔" منیر علی نے تجمل کو بات پوری نہیں دی، وہ سر ہلا کے بولے۔ "مجھے یہ جاننے کی سدا جستجو رہی اور میں کچھ جان ضرور اس کے تدارک کی بھی کوشش کرتا، اگر میرے بس میں واقعی کچھ ہوتا۔ ساتھ ساتھ ہمیشہ یہ احساس بھی رہا کہ میں کیا جاننا چاہتا ہوں اور میں نہ جانوں ہے۔ مولوی صاحب سراپا، سر بہ سر میرے سامنے تھے۔ وہ نرجس کی شادی کرنا ہی نہیں چاہتے تھے تو کوئی انھیں مجبور کیسے کر سکتا تھا اور وہ اپنے دکھ کسی سنا نہیں چاہتے تھے تو کوئی کیسے اُنھیں پابند کر سکتا تھا۔ میں آپ کو ایک سناؤں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے، لوگوں نے مولوی صاحب کے پیچھے نماز پڑھنے اجتناب کرنا چاہا۔ اُن کا کہنا تھا کہ جب تک مولوی صاحب کی ذات کے یہ تمام باتیں واضح نہ ہو جائیں، اُن کے پیچھے نماز پڑھنا مناسب نہیں ہے۔ نے اُن سے کہا۔ صاحبو! خدا کے خوف سے ڈرو۔ مولوی صاحب ایک عالم ہیں، میں اُن کے ساتھ رہتا ہوں، اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو سب سے پہلے میں کہتا۔ اُن کا الگ تھلگ رہنا کسی طور بھی اُن پہ حرف زنی کا جواز بنتا، بدگمانی اللہ کو پسند نہیں ہے۔ تمھارے پاس آنکھیں ہیں اور اللہ نے سننے کی خوبی عطا کی ہے۔ شُذ مولوی صاحب چار مرتبہ تمھارے سامنے ہیں، تم اُنھیں اچھی طرح دیکھتے اور سنتے ہو۔ وہ تمھارے بچوں کو درس دیتے اور گھر جا کے زمانے کی ساری آلائشوں سے دُور ہو جاتے ہیں۔ میں نے کوئی غلط بات نہیں کی تھی یا مولوی صاحب کی بے جا طرف داری کا نہیں کیا تھا، جو میں سمجھتا تھا، جیسا میں نے اُنھیں پایا تھا، وہی میں نے کہا۔ لوگ اس فقیر کی عزت کرتے ہیں۔ میرا بھرم قائم رہا لیکن انسان انسان اور پھر وہ صاحبان جو مولوی صاحب سے ایک مستقل رشتہ استوار کرنے کے آرزومند تھے، ظاہر ہے، اُن کے دلوں پر غبار چھایا رہتا ہوگا جس کا وہ

بے شک مولوی صاحب کے سامنے اظہار نہیں کرتے تھے۔ مولوی صاحب کی خوش خلقی اور کم سخنی اُنھیں اُن کے سامنے کچھ کہنے سے روکے رکھتی تھی۔ تاہم پھانس تو چبھتی رہتی ہوگی۔ اچھے بُرے سبھی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ کوئی زیادہ اثر لیتا ہے، کوئی کم۔ یہ غبار چھٹ جاتا، اگر مولوی صاحب کوئی ایک خاندان منتخب فرما لیتے۔"

"آپ سب ٹھیک بولتے ہو بڑے صاحب!" تجمل نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پر ہم کو یہ بتاؤ کہ مولوی صاحب کدھر چلے گئے؟"

"جناب!" منیر علی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ "آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

"میں بولتا ہوں بڑے صاحب! مولوی صاحب خود سے نہیں گئے، خود سے جاتے تو اس طرح سے نہ جاتے۔ کوئی اُنھیں لے گیا ہے، پر کون لے جا سکتا ہے۔ آپ جانتے ہوں گے کہ کون اُنھیں لے جا سکتا ہے۔"

"جناب! جناب!" منیر علی لرزیدہ لہجے میں بولے۔ "میں کیا. . . . کیا جان سکتا ہوں یعنی یعنی کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں جانتا ہوں؟"

"دیکھو بڑے صاحب! بات بہت سیدھی ہے۔ آپ بولتے ہو کہ مولوی صاحب نے ہر ایک کو منع کر دیا تھا اور لوگ اُن کی اس بات پر خفا ہونے لگے تھے اور آپ بولتے ہو کہ مولوی صاحب ایک دم، اچانک چلے گئے۔ ایسی صورت میں اُن کو کون لے جا سکتا ہے، وہی لے جا سکتا ہے جو سب سے زیادہ خفا ہوگا اور وہ کون تھا، یہ آپ کو پتہ ہوگا۔ معاف کرنا، ہم کو کھل کے بتاؤ۔"

"صاحب! میرے بڑھاپے کا کچھ خیال کیجیے۔" منیر علی برگشتگی سے بولے۔

"بڑے صاحب! میں جو بولتا ہوں وہ آپ خوب سمجھتے ہو، میں کسی دوسری زبان میں نہیں بول رہا ہوں، مجھ کو زیادہ بات مت کرنے دو۔"

"بھائی! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔" منیر علی کی آواز بھرا گئی۔

"میں یہ نہیں بول رہا کہ وہ آپ ہی ہو یا آپ سب جانتے ہوئے بھی اَن جان ہو، پر آپ جو کچھ جانتے ہو، اُسے جاننا نہیں چاہتے۔ مجھ کو پتہ نہیں کہ ایسا کیوں ہے۔ ہو سکتا ہے، ایسا اس لیے کہ آپ گھبراتے ہو۔ آپ کسی بات سے گھبرا سکتے ہو۔"

منیر علی نے اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔ اُن کے ہونٹ کانپنے لگے تھے۔ تجمل نے اُن کی طرف دیکھے بغیر بھاری آواز میں کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ آپ کو اپنے جاننے پر شبہ ہو اور آپ نے اپنی چُپ کے لیے اس شبہے کو سہارا بنا لیا ہو۔ آپ نے اپنے آپ کو اسی طرح تسلی دی ہوگی۔ اس کے سوا تیسری بات نہیں ہے۔ آپ کہتے ہو کہ جانے سے پہلے کوئی ایسا ویسا آدمی آپ نے مولوی صاحب کے پاس نہیں دیکھا۔ مولوی صاحب سب سے الگ تھلگ رہتے تھے اور آپ سے زیادہ اور کوئی اُن کے نزدیک نہیں تھا۔ اِدھر بات کرو تو اُدھر آ جاتی تھی۔ جن خاندان والوں کے پیام آئے، وہ سب آپ کو پتہ ہیں۔ مولوی صاحب نے اُن کا ذکر آپ سے بھی کیا ہوگا اور اپنے آپ جواب دینے کے بجائے آپ ہی سے کہلوایا ہوگا۔" منیر علی کچھ کہنے کے لیے مضطرب ہوئے مگر تجمل نے

اپنی بات جاری رکھی "آپ بولو گے کہ اگر مجھ کو پتہ ہوتا تو میں ان کی کھوج میں آدمی کیوں دوڑاتا۔ میں اُن کا مکان خالی کیوں رکھتا اور پولیس کو کیوں بلاتا۔ آپ نے اُن کی کھوج میں سب کچھ کیا' پر ایک بات نہیں کی۔ آپ کو شاید چنگاری ڈالتے ہوئے ڈر لگتا تھا' آپ کو تھر اپنے اُوپر واپس آنے کا خوف ہوگا اور جب بہت دن بیت گئے تب آپ کا شبہ پیلا پڑ گیا۔ بڑے صاحب! کانٹا دن بیتنے سے گھل نہیں جاتا' یہ تو آپ کے سینے میں اٹکا رہے گا۔ آپ سب سے چھپا سکتے ہو' پر اپنے آپ سے نہیں۔"

تجّل تھم کے بڑی جلانے لگا۔ منیر علی بُت کی طرح ساکت ہو گئے تھے اور ٹھٹھری ہوئی نظروں سے تجّل کو دیکھ رہے تھے۔ اُن کے جسم کا سارا خون جیسے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ "بڑے صاحب!" تجّل نے نیچے لہجے میں کہا۔ "آپ کے لیے ہمارے دل میں بہت عزت ہے۔ ہم آپ کے مہمان ہیں' آپ نے ہم کو مولوی صاحب کے نام پر اپنے گھر میں رکھا' ہم آپ کو مولوی صاحب ہی کا نام دیتے ہیں اور یہ بول دیں کہ ہمارا سینہ قبر کی طرح ہے۔ آپ کو ہم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ بس ہم اتنا ہی بول سکتے ہیں۔ بتاؤ بڑے صاحب!"

"آپ سے میں کیا کہوں" منیر علی کی کپکپاتی آواز گونجی۔ "آپ ہی سوال کر رہے ہیں' آپ ہی جواب دے رہے ہیں' میرے کہنے کے لیے کیا اب بھی کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔ میں کسی پر الزام نہیں رکھ سکتا کیونکہ میں کچھ نہیں جانتا۔ بخدا میں نے اپنا وہم دُور کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا کوئی حاصل نہیں نکلا۔ آپ درست کہتے ہیں کہ میں اس نتیجے سے خود مطمئن نہیں ہوا مگر میں اپنی بساط کے مطابق یہی کر سکتا تھا۔ میں ہر وقت اللہ سے دعا کرتا رہتا تھا۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ دو بے ماں کی جوان بچیوں اور دو بچوں کا باپ ہوں۔ مجھے ارشد نے اور ناتواں کر دیا ہے۔ زندگی بہت سنبھل سنبھل کے تک تک کے گزاری ہے۔ میں جانتا تھا کہ کوئی بات منہ سے نکالوں گا تو کوئی ہم نوائی نہیں کرے گا۔ سب کو اپنی عزت آبرو عزیز ہے پھر میں کس بنیاد پر سر اُٹھا کے بات کرتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا تھا اور مجھے کسی جانب سے کوئی شہادت بھی نہیں ملی تھی۔ اس لیے میرا قیاس مجھی تک محدود رہا لیکن آپ یقین کریں اور یقین کرنے کی کیا بات ہے' آپ نے خود ہی کہہ دیا ہے مجھے سکون نصیب نہیں ہوا۔ ایک اپنی بے سروسامانی کا احساس' تھوڑی بہت بنی بنائی کا خیال اور پھر یقین کی فروتنی۔ یہی باتیں تھیں جنھوں نے مجھے باندھے رکھا ورنہ شاید ایسا نہ ہوتا اور مجھے آپ کے سامنے یوں شرمندہ نہ ہونا پڑتا۔"

"نہیں بڑے صاحب! ایسا مت بولو۔ ہم کو اندازہ ہے کہ ایسی بات ضرور ہوگی۔ ہر آدمی بندھا ہوا ہے۔ وہ اپنی رسیاں اتنی ہی کاٹ سکتا ہے جتنا یہ یقین ہوتا ہے کہ جسم چاقو سے بچا رہے گا۔ جہاں رسی تنگ ہونی شروع ہو' وہیں کاٹ دو تو آدمی کھلا رہتا ہے پر مکڑی رسی بنتی رہتی ہے اور پتہ نہیں چلتا۔ پھر آدمی جالوں میں لپٹا ہوا ہی چلتا ہے۔ ہم آپ سے صفائی نہیں مانگ رہے ہیں۔ ہم جو جاننا چاہتے ہیں' وہ ہم کو بتاؤ۔"

"ہاں بھائی! ایک ذرا ٹھہریے۔ سمجھ میں نہیں آتا' کہاں سے۔" "تاہم میں آپ سے کچھ چھپاؤں گا نہیں۔ جس کانٹے کا آپ ذکر کر رہے' اس سلسلے میں' جو کچھ میرے علم میں ہے' آپ کے سامنے بیان کیے' اللہ مجھے معاف کرے۔" منیر علی نے بیٹھک میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں' نرجس بی بی کی خوشبو ... سکی۔ وہ ایک پھول ہی تھی' پھول کی خوشبو دیواروں کی پابند نہیں دُور تک گئی اور ایسی ایسی جگہوں سے بات آنے لگی جہاں کے لوگ ... سے واقف نہیں تھے اور مولوی صاحب بھی جن کے ہاں کبھی نہیں ... میں نہیں کہہ سکتا کہ نرجس کا ذکر ایک گھر سے دوسرے گھر میں' دوسرے سے تیسرے گھر میں کس طرح پہنچا۔ محلّے کی دو ایک تقریبات میں ... بہ مجبوری اُس کی شرکت پر آمادہ ہو گئے تھے' آمادہ نہ ہوتے تو لوگ کیا سمجھتے۔ اُن میں سے ایک تقریب تو اُنھی صاحب کے ہاں تھی ... مولوی صاحب شام کو کھاتا نویسی کا کام کرتے تھے۔"

"کچھ لوگ تو مولوی صاحب کے انکار پر چُپ ہو گئے۔ کچھ کہا سہہ بارہ کہا۔ بعض نے انھیں دولت سے متاثر کرنا چاہا' بعض خاندانی امارت سے' القصہ یہاں تک کوشش کی گئی کہ نرجس بی ایک محل بنوا دیا جائے گا اور حقِ مہر بھی ہوگا جو مولوی صاحب ... میں سوچتا تھا کہ مولوی صاحب کا پائے ثبات کبھی نہ کبھی ضرور ... لیکن اُن کے ارادے میں جنبش نہیں ہوئی۔ میں نہیں کہہ سکتا' آپ سمجھیں" منیر علی کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ "آخری دنوں میں رانا صاحب خاں کا اصرار بڑھ گیا تھا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے روز پیغام بھیج ... کہیں دُور جا کے میری بھی اُن سے کوئی قرابت نکلتی ہوگی لیکن ... آنا جانا بس شادی وغمی تک محدود ہے۔ وہ بہت بڑے آدمی ... میں رسوخ ہے۔ بہت بڑی حویلی میں رہتے ہیں۔ با اثر حا... لوگوں میں اُٹھتے بیٹھتے ہیں' نوکر چاکر' زمینیں' گاؤں' جاگیر' کارخانوں میں کچھ حصے' سب کچھ اُن کے پاس ہے اور بڑے آفتاب خاں کے انتقال کے بعد سارا کچھ اُنھی کے ہاتھ میں ... خون ہے' عمر ایسی بھی نہیں' دو بیویاں ہیں اور دونوں صاحب ... کی طرف سے جب نرجس کے لیے رشتہ آیا تو مجھے بھی حیرت ... معلوم تھا لیکن میں نے مولوی صاحب سے ذکر کر دیا اور بہت پیغام بر کو جواب دے دیا۔ رانا صاحب نے دوبارہ قاصد بھیجا ... کا ایک انبار' کئی طشت جوڑوں' زیوروں اور نقدی پر مشتمل ... دوبارہ جواب دے دیا۔ انھوں نے ان قیمتی تحائف کی طرف ... نے پھر معذرت چاہ لی لیکن یہ سلسلہ چلتا رہا۔ رانا صاحب قا... پیغام بر کو بھیجتے رہے اور میں انھیں واپس کرتا رہا۔ کئی بار ...

... سے ذکر بھی نہیں کیا کہ اُدھر سے اتنے شدید تقاضے ہو رہے ہیں۔ ... ہوتا تو وہ خواہ مخواہ پریشان ہوتے۔ ممکن ہے رانا صاحب نے براہ راست ... کسی ذریعے سے بھی اُن تک بات پہنچائی ہو مگر مولوی صاحب نے وہی ... دیا ہوگا جو اُن کی طرف سے میں دیتا رہا تھا۔ رانا صاحب کی تربیت ... ماحول میں ہوئی ہے' اُس کا مجھے بخوبی علم ہے۔ انھوں نے آنکھیں کھولیں ... ب خدمت گاروں کو اپنے اِردگِرد دیکھا۔ رانا صاحب شاہد باز آدمی ہیں۔ ... کے آبا کے جو مشاغل تھے' وہ انھیں ورثے میں ملے ہیں چنانچہ انھوں نے ... پیش کش بھی کی کہ وہ اپنی دونوں بیویوں کو طلاق دے دیں گے' میں نے ... کیا کہ وہ ہمیں زیادہ شرمندہ نہ کریں' اگر ایسا کوئی ارادہ ہوتا تو پس و پیش ... جاتا' پھر میں نے مولوی صاحب کی اجازت کے بغیر یہاں تک کہہ دیا ... کی منسوب ہو چکی ہے۔ رانا صاحب چند دنوں تک خاموش رہے مگر ... اِن کا اصرار بڑھ گیا اور اُس میں کچھ تلخی کی بھی آمیزش ہو گئی۔ مجھے احساس ... رانا صاحب کو یہ انکار شاق گزرتا ہوگا چنانچہ میں ہر بار نہایت عاجزی ... ساتھ قاصد سے معذرت کرتا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ کچھ مجبوریاں مانع ہیں' ... پیام لے کے آیا کہ مجبوریاں کیا ہیں' بتائی جائیں' رانا صاحب ہر مجبوری ... کرنے کی کوشش کریں گے۔ میں نے عذر کیا کہ بعض ناگفتنی باتیں ہیں ورنہ ... رانا صاحب جیسے ذی حیثیت اور رتبہ دار شخص سے رشتہ قائم کرنا پسند ... کرے گا' کسی بھی خاندان کے لیے یہ تعلق باعثِ عزت ہے۔ یہ میں ... اس لیے کہا کہ رانا صاحب اپنی ذات اور شخصیت کی ہتک نہ سمجھیں۔ میں ... قاصد سے یہاں تک کہا کہ میں اپنی بچی زہرہ کا رشتہ کرنے کو تیار ہوں' ... حسنِ صورت اور حسنِ سیرت میں یکتا ہے۔ کہنے کے لیے میرے پاس ... سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ پھر اتنا ضرور ہوا کہ رانا صاحب کے پیاموں کی ... ت میں کمی آگئی مگر محض ایک مختصر مدت کے لیے۔ اس کے بعد قاصد ... بارہ پھیرے شروع کر دیے اور وہی اصرار و انکار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مولوی ... کے جانے سے کوئی دو ماہ پہلے کی بات ہے' پیام بر نے میرا حتمی ... ن کے میرے پاس آنا بند کر دیا تھا۔ ہاں مولوی صاحب کے پاس کوئی ... آیا ہو' بس یہیں تک کی بات ہے بھائی! رانا صاحب کی پہنچ دُور ... اور اُن سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ عندیہ آ جائیں تو کچھ بھی کر سکتے ہیں' ... داروں مصاحبوں اور شورہ پشتوں کا اُن کے ہاں سے وظیفہ جاری ہے۔ ... سے بہت سے اُن کے اثر و رسوخ کا تجربہ کر چکے ہیں۔ چنانچہ لوگ ... بھی رانا صاحب سے متعلق کسی معاملے میں رائے زنی سے احتیاط ... ہیں۔ ظاہر ہے' اچھے تجربے نہیں ہوئے ہوں گے۔ بس جناب!" منیر علی ... سانس لے کے بولے "یہی حالات تھے جو میں نے آپ کے سامنے ... دیے۔ اب غیب کا حال اللہ کو معلوم۔"

تجّل گردن جھکائے گُنگ بیٹھا تھا۔ منیر علی نے بات ختم کی تو اُس ... بھاری سر اُٹھایا۔ اُس کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے پڑے ہوئے تھے۔

دیر تک سکوت چھایا رہا۔ منیر علی کبھی مجھے دیکھتے کبھی تجّل کو۔ وہ تجّل کے منہ سے کچھ سُننے کے لیے مضطرب نظر آ رہے تھے مگر تجّل خاموش رہا۔ وہ شکستہ لہجے میں بولے۔ "آپ نے توجہ دی؟"

تجّل نے آہستگی سے ہنکاری بھری۔ منیر علی زیرِ لب مولوی صاحب اور کورا کے لیے دعائیں مانگنے لگے کہ خدا انھیں اپنی امان میں رکھے۔ عصر کی اذان ہو رہی تھی' وہ اُٹھنا نہیں چاہتے تھے لیکن مسجد سے انھیں آدمی پوچھنے آگیا۔ وہ ہم سے اجازت لے کے چلے گئے۔ اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ ملازم نے آ کے لالٹین جلا دی۔ تجّل پلنگ سے نہیں اُٹھا۔ میں نے باہر جانا چاہا تو اُس نے مجھے بھی سختی سے روک دیا۔

منیر علی رات کے کھانے ہی پر بیٹھک میں آئے۔ مختلف کھانے تھے لیکن کسی سے کھایا نہیں گیا۔ منیر علی نے دوپہر کی طرح ہم سے بے تکلفی کے ساتھ کھانے کے لیے اصرار بھی نہیں کیا۔ ہم گم سُم سے نوالے منہ میں رکھتے رہے۔ کھانے کے دوران محلّے کے چند لوگ آ گئے تھے۔ تجّل نے کھانے کے بعد عذر کر دیا کہ اُس کی طبیعت سُست ہے۔ آنے والے لوگ اُسے آرام کا مشورہ دے کے جلد ہی رخصت ہو گئے۔ منیر علی نے بھی تجّل کا عذر سُن لیا تھا۔ وہ فوراً اندر جا کے ایک پلیٹ میں آملے کا مُربا لے آئے۔ "سونے سے پہلے اسے کھا لیجیے گا۔ انشاء اللہ فائدہ ہوگا۔" انھوں نے دبی زبان میں تجّل کو تاکید کی۔ تجّل نے تھوڑا مُربا مجھے دیا' باقی اُسی وقت خود کھا لیا۔ منیر علی نے اندر سے بیٹھک کی کنڈی لگا دی اور لالٹین کی لَو دھیمی کر دی۔

تجّل اُن کی موجودگی ہی میں چادر تان کے منہ ڈھانپ کے لیٹ گیا تھا۔ میں نے بھی آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی لیکن ایسا لگا جیسے میری سانس بند ہو جائے گی۔ میری رگوں میں مروڑ ہو رہی تھی۔ کوئی زور زور سے سینہ دبا رہا تھا۔ میں نے شام سے اب تک کا وقت نہ جانے کس طرح کاٹا تھا۔ ایک بار میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ شاید تجّل ہی نے منیر علی سے کہا ہے کہ مجھے یہ سب کچھ سُنایا جائے اور شاید اسی لیے تجّل نے یہاں ٹھہرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ممکن ہے اُس کے اور منیر علی کے درمیان ساز باز ہو چکی ہو اور وہ مجھے یہ باور کرانے کی فکر میں ہو کہ اب اُس کی تلاش بے سود ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میری نظروں میں اُس کی تصویر دُھندلی پڑ جائے گی' اُس کا رُتبہ کم ہو جائے گا۔

ایسی بے سروپا باتیں ہر وقت میرے ذہن میں کلبلاتی رہتی تھیں۔ مجھے ہر آدمی پر شک ہو جاتا تھا کہ وہ کورا کے بارے میں ضرور کچھ جانتا ہے اور مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے۔ میں منیر علی اور تجّل کے درمیان ہر لمحے موجود رہا تھا۔ اُس کے بال اب بھی میری جیب میں تھے۔ میں نے اُس کے کپڑوں میں اُس کی خوشبو سونگھی تھی۔ کئی بار مجھے یہ گمان بھی ہوا تھا کہ کورا گھر کے اندر ہی موجود ہے اور منیر علی نے مولوی صاحب کے جانے کی ایک فرضی داستان ہمیں سُنا دی ہے یا تجّل نے فیض آباد سے روانہ ہونے سے پہلے ہی کسی آدمی کو چپکے سے یہاں بھیج کے ایک شخص منیر علی کو ہموار کیا ہے کہ ہم دُور دراز کے سفر کے بعد جیسے ہی پہنچیں

تو اتفاقاً اُس سے ملاقات ہوا اور وہ میرے سامنے ایسا واقعہ بیان کرے۔ کچھ ہی دیر بعد میرا ذہن اپنے آپ ان خیالوں کی نفی کر دیتا تھا اور میرا دل کرتا تھا کہ میں اپنے منہ پر زور زور سے طمانچے ماروں۔

بار بار میرے سینے میں ہوک اُٹھتی تھی۔ میں یہاں بیٹھا ہوا کیا کر رہا ہوں ممکن ہے وہ جیسلمیر ہی میں ہو اور رانا نے اُسے سب کی نظروں سے چھپا رکھا ہو کسی محل میں بند کر رکھا ہو۔ وہ جیسلمیر یا قریب ہی کے کسی علاقے میں ہو سکتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میرے جسم میں آگ بھڑکنے لگتی تھی، نہ جانے اُس پر کیا گزری ہو۔ مجھے یقین تھا کہ رات کو جب خاموشی چھا جائے گی اور منیر علی سونے کے لیے چلے جائیں گے تو بجھل مجھ سے چلنے کو کہے گا، اسی لیے اُس نے بیٹھک میں آنے والوں سے طبیعت کی ناسازی کا کہہ کے انھیں جلد ہی جانے پہ مجبور کر دیا ہے۔ وہ آج کہیں سے کسی ذریعے سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ اب وہ کہاں ہے؟ اُسے رانا کے آدمی لے گئے ہیں یا کوئی اور؟ لیکن بجھل تو آرام سے بستر پہ لیٹا ہوا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ اُسے احساس ہی نہیں تھا کہ مجھے ایک ایک لمحہ گزارنا دوبھر ہو رہا ہے۔ اُسے تو اُسی وقت اُٹھ جانا چاہیے تھا جب منیر علی نے اپنی بات ختم کی تھی جب بہت رات بیت گئی اور بجھل کے جسم میں جنبش نہیں ہوئی تو میں بستر سے اُٹھ گیا۔ پہلے میں نے ایڑیوں کے بل بیٹھک میں چل کے دیکھا، پھر دروازے کے پاس جا کے کنڈی کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ابھی میرا ہاتھ کنڈی تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ بجھل کی آواز گونجی۔ "اتنی رات گئے کہاں جائے گا رے! سویرا ہونے دے۔"

وہ جاگ رہا تھا۔

"اُٹھو، چلو،" میں نے غصے سے کہا۔

"پر کدھر لاڈلے؟"

"کدھر جا سکتے ہیں، یہاں سے تو اُٹھو۔ کہیں بھی چلیں گے۔"

"نئی جگہ ہے بابرے! گلی کے کتے نہیں پہچانتے۔"

"تمھیں اب کتوں کی فکر ہونے لگی۔ تم یہیں بیٹھے رہو، مجھے جانے دو۔"

"راستہ پوچھے بنا جائے گا؟"

"ہاں، تمھارے خیال میں ابھی راستے کا پتہ کرنا بھی باقی ہے۔" میں نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ بڑے صاحب کی باتیں میں نے بھی سُنی تھیں۔ میں اب یہاں ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔"

"بیٹھ جا۔ تو تو سویرے ہی یہاں سے جانے کو کہتا تھا، ہم نکل لیے ہوتے تو کیا ہوتا؟ بیٹھ جا لاڈلے! سر گردن ہی پہ رہنے دے۔" وہ درشتی سے بولا۔ "ایک رات گزرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"ایک لمحہ گزرنے سے بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ میں جیل سے نکلنے کے بعد تمھارے پاس نہ آتا اور بمبئی میں کرشنا جی نہ ملتے تو شاید میں کب کا یہاں پہنچ گیا ہوتا، پھر یہ وقت آ سکتا تھا؟"

"پر جو بیت گیا وہ تیری اگر مگر سے واپس نہیں آ جائے گا۔"

"تمھیں ہو کیا گیا ہے؟" میں نے وحشت سے کہا۔ "تم تو باتیں بنا[illegible] ہو، تمھیں تو آرام سوجھ رہا ہے۔"

"طعنے مت دے۔ آرام کون کر رہا ہے۔"

"اور کیا کر رہے ہو۔ پتہ نہیں تم کیا کیا سوچ رہے ہو۔ تمھارا چاق[illegible] ہے؟ لگتا ہے اُسے بھی زنگ لگ گیا ہے لیکن میرے چاقو کی دھا[illegible] کھٹل نہیں ہوئی ہے۔"

"ہاں، چاقو کی بات تو تو مجھ سے کرے گا رے! صاف صاف[illegible] کیوں نہیں دیتا، گھما پھرا کے بات کیا کرتا ہے۔"

"مجھ سے اس وقت سوال جواب مت کرو۔ نہ جانے میرے [illegible] اور کیا نکل جائے، میں تم سے یہ کہنا نہیں چاہتا تھا۔"

"تیرا خوب ہے ستیاں! چت پٹ سب تیری ہے سا[illegible] کیا کر کہ آدمی سہار لے۔"

"غنیمت ہو تم تو بات پکڑ لیتے ہو۔"

"لاڈلے! میں نے تجھ سے یہ بھی تو بولا تھا کہ ہر چیز چاقو سے [illegible] جا سکتی۔ تیرے دماغ میں ہر گھڑی ہتھیار کیوں رہتا ہے؟ کبھی اس سے [illegible] کے بھی سوچ لیا کر۔ شیر ببر! بیٹھ جا، کھڑا کیوں ہے۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا اور بستر پہ اوندھا [illegible] میرے بستر ہی پر چلا آیا اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ میں [illegible] پھوٹ کے رونے لگا۔ "تو نے کوئی نئی بات نہیں سُنی ہے رے! تو تیرے کان ہر بات سُننے کے عادی ہو جانے چاہئیں۔ تجھ سے [illegible] کے بعد اُن پر کچھ بھی بیت سکتا تھا اور اگر تجھے کوئی اور خبر سننے[illegible] یہ سمجھ لے وادا کہ تو ابھی جیل ہی میں ہے۔ جیل میں بھی تو تو نے [illegible] بتائے تھے۔"

"مگر وہ جیل تھی۔"

"ابے! صرف ایک دیوار کا فرق ہے۔ یہ سمجھ کر دار اب ہم[illegible] ہیں، جیل کا قانون جیل کے باہر بھی لاگو ہے۔ اُدھر لوہے کی بیڑ[illegible] ہیں، اِدھر کانچ کی۔ بس سمجھ کا پھیر ہے رے! ذرا اُس بوڑھے آدمی ک[illegible] دھیان دے جس کے گھر میں تو ٹھہرا ہوا ہے۔ تو نے دیکھا نہیں کہ ک[illegible] زبان اٹک رہی ہے، ہاتھ پیر اٹک رہے ہیں لاڈلے! میں انھیں [illegible] کیا تو یہ سب کچھ جان لیتا؟ اوپر اوپر دیکھ کے چلے گا تو پیر ٹوٹ[illegible] ٹوٹے ہوئے پیر سے کتنی دور جائے گا پگلے! کیا ہم یہاں سے سید[illegible] چلے جاتے جہاں تیرا جانے کا ارادہ ہے۔ اس بوڑھے آدمی کو مارنا[illegible] پہلے چاقو سے اُس سمیت سارا گھر کاٹ کے جا۔ میرے چاقو کی د[illegible] ہو گئی ہے پر اب بھی ہڈی تک اُتر سکتی ہے، میں بھی تیرا ساتھ دو[illegible] اتنا بڑا سر ہے تیرا، یہ اتنی ننھی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"میری سمجھ میں سب باتیں آتی ہیں، مگر میں کیا کروں...!"

میں نے چیخ کر کہا۔ میری آواز سناٹے میں دُور دُور گئی ہوگی، اندر منیر علی نے بھی سُنی ہوگی۔ "ٹھیک ہے۔ میں کہیں نہیں جا رہا، تم جا کے سو جاؤ۔ اب میں کچھ نہیں بولوں گا، کچھ نہیں کہوں گا۔" لیکن ساری رات وہ میرے بستر ہی پر بیٹھا رہا۔ مجھے جب بھی اُس کا خیال آتا، میری سسکیاں نکل جاتیں۔ رات کے آخری حصے میں مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

صبح ناشتے کے بعد وہ مجھے ساتھ لے کے باہر نکل آیا۔ منیر علی سے اُس نے کہہ دیا تھا کہ وہ دوپہر کے کھانے پہ ہمارا انتظار نہ کریں۔ منیر علی نے پیش کش کیا اور ہمارے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی مگر بجھل کو نا آمادہ دیکھ کے وہ چپ ہو گئے۔ ہم محلے کی گلیوں سے گزرے تو منیر علی کے دو ایک شناسا مل گئے اور کچھ دُور تک ہمارے ساتھ چلتے رہے۔ وہ ہماری رہبری کے خواہش مند تھے۔ بجھل نے بڑی مشکل سے اُن سے چھٹکارا حاصل کیا۔ سبزی منڈی سے نکل کے ہم شہر کے خاص بازار میں آ گئے۔ دکانیں کھل رہی تھیں اور سڑکوں پہ لوگوں کی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ ہو رہا تھا۔ جیسلمیر کوئی بڑا شہر نہیں تھا۔ دو تین گھنٹے میں ہم نے شہر کا خاصا فاصلہ طے کر لیا اور گنجان آبادیوں سے گزرتے ہوئے ایک نسبتہً کم آباد علاقے میں آ گئے۔ بجھل پرچون کی ایک دُکان پر ٹھہر گیا۔ وہاں دھوتی باندھے ہوئے ایک دُبلا پتلا شخص پٹھلے پر پلتھا مارے بیٹھا تھا اور کپی سے ڈبے میں سرسوں کا تیل ڈال رہا تھا۔ جیسے ہی گاہک دُکان سے ہٹا، بجھل نے اُس کے پاس جا کے پوچھا کہ کیا وہ ریاست ٹونک سے آئے ہوئے ایک شخص عالم خاں کو جانتا ہے۔ دُکان دار نے لاعلمی ظاہر کی اور بولا۔ "کدھر کا پتہ بتایا ہے؟"

"پتہ ہم کو معلوم نہیں ہے، پر ادھر ہی کہیں بولا تھا۔" بجھل نے کہا۔ "وہ یہاں کسی بڑے رئیس یا نواب کے ہاں کام کرتا ہے۔ اُسے یہاں آئے ہوئے دن ہو گئے ہیں۔"

"کون سا رئیس؟" دکان دار بے دلی سے بولا۔ "ادھر کوئی ایک دو رئیس لوگ تو نہیں رہتے، جب تک پورا نام پتہ نہ ہو، ہم کیا بولیں۔"

"اُس کا نام کچھ رانا وانا سے شروع ہوتا ہے۔"

یہ سُن کے دکان والے کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی لیکن وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ "ادھر رانا، راؤ بھی بہت ہیں۔ پورا نام بولو۔"

"ہم کو بتایا تھا کہ اُس کی بہت بڑی حویلی ہے۔"

"رانا شمشیر علی خان، رانا مہتاب خان، رانا....."

بجھل نے ہاتھ اُٹھا کے اُسے روک دیا اور اُن دونوں کے پتے پوچھ لیے۔ چلتے چلتے دکان دار نے ہمیں مشورہ دیا کہ پہلے ہم رانا مہتاب خاں کی طرف جائیں کیونکہ وہاں نوکر چاکر بہت ہیں اور اُس کی حویلی بھی دُور نہیں ہے، شاید وہیں سے ہمیں ہمارے مطلوبہ آدمی کا پتہ چل جائے۔

پتہ مشکل نہیں تھا۔ ہم نے دکان دار کے بتائے ہوئے راستے پر کوس بھر کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ سامنے پتھروں سے کھنچی ہوئی ایک چار دیواری نظر آئی۔

وہ کسی قلعے کی فصیل سے مشابہ تھی۔ اندر درمیان میں واقع عمارت کی بالائی منزل کی محرابیں، بارہ دری اور شہ نشین دُور سے صاف دکھائی دیتی تھیں۔ چار دیواری کے سامنے کا اور بائیں طرف کا بڑا حصہ خالی پڑا تھا۔ دائیں طرف کچے پکے مکانوں، جھونپڑیوں اور مویشیوں کے باڑے پر مشتمل ایک چھوٹا سا محلہ تھا۔ وسط میں لکڑی کا بنا ہوا ایک قدِ آدم دروازہ تھا، اُس پر پیتل کے نوکیلے، سینگ نما مٹھا اور کڑے نصب تھے اور اُس میں سے ہاتھی بہ آسانی گزر سکتا تھا۔ وہاں سروں پہ پیلی پگڑیاں اور کمر سے سفید پٹکے باندھے، تلوار لٹکائے کئی آدمی موجود تھے۔ وہ یقیناً پہرے دار ہوں گے۔ دروازے کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے اور اُس کے دونوں جانب کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ کھلے ہوئے پٹوں سے اندر باغ اور عمارت کے ایک حصے کی صرف جھلک نظر آ سکتی تھی۔ لوگ کسی روک ٹوک کے بغیر اندر باہر آ جا رہے تھے۔ باہر کی طرح اندر بھی چہل پہل تھی۔ باہر دروازے سے ملی ہوئی سبیل کے گرد فقیروں اور معذوروں کی ایک ٹولی قطار سے بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم نے دُور دُور رہ کے چار دیواری کا چکر لگایا۔ چار دیواری زیادہ بڑے علاقے کا احاطہ نہیں کرتی تھی لیکن اُس کی دیواریں خاصی اونچی تھیں۔ کہیں کہیں درمیان میں چھوٹے بڑے دروازے تھے، اُن میں سے بیشتر بند تھے۔ بڑے دروازے کے بالمقابل پشت پہ اُس جیسا ایک اور دروازہ تھا جو شاید مہینوں سے کھلا نہیں گیا تھا۔ بجھل نہ فصیل کے قریب گیا نہ وہاں کسی آدمی سے اُس نے کوئی بات کی بلکہ تھوڑی ہی دیر بعد وہ عمارت سے دُور ہوتا گیا، ہم واپس بڑے بازار میں آ گئے۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب اُس سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔ وہ بھی تمام راستے مجھ سے نہیں بولا۔ بازار کے قریب کا تمام علاقہ گنجان تھا۔ ہم ملحقہ گلیوں اور سڑکوں سے گزرتے ہوئے بازار کے اختتام پر ایک ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ ہوٹل میں کم ہی لوگ تھے۔ اگلے حصے میں ایک بڑے سے چبوترے کڑھاؤ پہ پراٹھے پکائے جا رہے تھے اور چولھوں پہ بہت سی دیگچیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ ہوٹل کی دیواریں پیلی تھیں اور اُن پہ بیل بوٹے، شیر اور ہرنوں کی تصویریں بنائی گئی تھیں۔ لمبی لمبی بنچوں کے ساتھ اِس سرے سے اُس سرے تک اسکول کی ڈیسکوں کی طرح میزیں لگی ہوئی تھیں۔ تیز ریکارڈوں کا شور اندر گونج رہا تھا۔ بجھل ایک کونے میں جا کے بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد بیرے نے کھانے کی فہرست بتا کے ہم سے کھانے کے لیے پوچھا۔ بجھل نے ہاتھ جھٹک کے کہا۔ "کچھ بھی لے آ۔"

بیرا کھڑا رہا اور آنکھیں چڑھا کے بولا۔ "بولو کیا کھاؤ گے؟"

"دو آدمیوں کا کھانا لے آ۔" بجھل نے اونچی آواز میں کہا۔

بجھل کی آواز پہ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی متوجہ ہو گئے تھے۔ بیرا بڑبڑانے لگا اور وہیں سے چیخ کے بولا۔ "خدن! ادھر دنیا پنچھی بیٹھا ہے، پنچھی کو پنچھی کھلاؤ، دو پلیٹ اسپشل اسپیل کو آگ دکھا دے۔" تمام لوگ ہنسنے لگے۔ بجھل نے اُن کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ دوسرے کونے میں بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر شخص کو گھور رہا تھا۔ اُس شخص کی مونچھیں اُوپر اُٹھی ہوئی تھیں۔

نچلا ہونٹ کسی قدر باہر نکلا ہوا تھا، قد درمیانہ، سینہ چوڑا اور رنگ نیلا تھا۔ گالوں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں۔ کان بڑے تھے اور سر پہ چھوٹے چھوٹے بال تھے۔ وہ سب سے الگ تھلگ بیٹھا تھا، چائے کا ایک خالی گلاس اُس کے آگے رکھا تھا۔ بچھل نے اُس کی طرف دیکھا تو اُس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبالیا۔ دفعتہً بچھل نے اُسے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ پہلے وہ جھجکا لیکن بچھل کا اشارہ واضح تھا۔ اُس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ تیزی سے اُٹھا اور اپنے دونوں ہاتھ کولھے پہ رکھے، سینہ آگے کو تانے کش لگاتا ہوا ہمارے پاس آکے کھڑا ہوگیا۔ "کیا ہے جی!" اُس نے منہ بنا کے پوچھا۔

"منہ کو ٹھیک کر۔" بچھل نے ترشی سے کہا۔ "بیٹھ جا۔"

"کیا بات ہے۔" وہ نخوت سے بولا اور بینچ پہ پھیل کے بیٹھ گیا۔ اس کا ایک ہاتھ جیب میں چلا گیا تھا۔ وہ پوری طرح چوکنا تھا۔

"ہاتھ باہر نکال لے، اِدھر دھندا کیسا ہے؟" بچھل نے پوچھا۔

"دھندا؟ کیسا دھندا؟" وہ چونک کے بولا

"اپنے دھندا کیسا ہوتا ہے جڑی مار!"

"کون ہو تم؟" اُس کا چہرہ بگڑ گیا۔

"تجھ کو کیا دکھائی پڑتا ہے۔"

"تجھ کو، مجھ کو اٹھائی گیرے لگتے ہو۔"

"تُو نے ٹھیک جانا، مُردار نہیں ہے۔"

"کام بولو۔"

"اِدھر اجنبی ہیں، دُور سے آئے ہیں۔"

"تو ایسا بولو۔" وہ اپنے پیلے دانت نکال کے بولا۔ "کدھر سے آرہے ہو؟"

"دلّی سے!"

"دلّی سے۔" وہ اُچھل کے بولا۔ "اُدھر سے اِدھر! یہ تو مرگھٹ ہے۔" اُس نے گالی دے کے کہا۔ "اِدھر دھندا کدھر ہے، یہ تو ریاست ہے بابا! دھندے کا مزا تو اُدھر اجمیر یا دہلی ہے۔ اجمیر میں بہت سکھ سے تھا پر مجبوری سالی اس نامراد جگہ لے آئی، اِدھر ریت ہی ریت ہے۔"

"اپنی بھی مجبوری ہے۔"

"ٹھیک ہے پھر اِدھر ہی رہو، پچھتاؤ گے۔"

"اِدھر اور کون کون ہے؟"

اس طرف تو ہم ہی ہے، اُس طرف آٹھ دس پکھیرو خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ ہم نے تم سے بولا نہیں، اِدھر اُس طرف جیسا نقشہ نہیں ہے۔ سب سسرے آپس میں کٹتے مرتے پھرتے ہیں، ایک دوسرے کا حق مارتے ہیں۔"

"کہاں بیٹھتے ہو؟"

"بیٹھنے سے تمھارا مطلب ہے مل بیٹھنے کا؟"

"ہاں! تم نے کوئی پاڑا نہیں بنایا؟"

"پاڑا!" وہ ہنسنے لگا۔ "اِدھر تو صرف جانور کا پاڑا بن سکتا ہے۔ اِدھر مال ہی نہیں ہے لوگوں کے پلّے! بس ایک پرتھو ہے، اُس کے پانچ چھ چھوکرے ہیں۔ سالے بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ ہاتھ پیک، اُچکے۔ دیواریں پھاندنے کے سوا ڈھنگ کا کوئی کام نہیں آتا۔ پاڑا اِدھر کیسے چلے گا، جو بھی ذرا اونچا اُٹھتا ہے، راجا لوگ اپنے تھان سے باندھ لیتے ہیں اور وہ اُوپر جا کے اپنے ہی آدمی کا گلا کاٹتا ہے۔ راجا لوگوں کے یہاں جو گیا، وہ سدا کے لیے دھندے سے گیا، بیٹھ گیا۔ اُسے پھر دھندے کی ضرورت بھی کیا پڑی ہے۔ مفت میں عیش ملتا ہے۔ اپنے کو بھی اِدھر راجا داس دیو نے بولا تھا کہ تم ہمارے اصطبل میں جگالی کرو، ہم نے صاف ناں کر دی اور اُس کے سامنے تو نہیں، پھول میں کہا، پٹا ڈال کے کھانے سے کھلا بھوکا رہنا ٹھیک ہے۔"

"یہ راجا لوگ ان سے کیا کام لیتے ہیں؟"

"راجا لوگوں کی چاکری!" وہ کان پہ ہاتھ رکھ کے بولا۔ "مُرغا بنانے میں، مُرغا لڑاتے ہیں۔ راجا لوگوں میں بھی ایکا نہیں۔ ایک دوسرے سے خار کھاتے ہیں اور ان پالتوؤں کو بھونکنے کاٹنے کے لیے بھیج دیتے ہیں اور پھانڈ ہولی کھیل کے آجاتے ہیں، کبھی جوا جیت گئے، کبھی ہار گئے۔ اِدھر اُدھر دونوں طرف سے یہی لوگ مرتے ہیں۔ جہاں راجا لوگوں کو ٹیڑھ نظر آتی ہے، وہیں ان کو چابک مار کے دوڑا دیا جاتا ہے۔ سالے بھڑوے، بن چھوکری اُٹھا کے مالک کے لیے لاتے ہیں اور جس کو مالک بولتا ہے، قتل کر دیتے ہیں۔ مت پوچھو بابا! اِدھر کیسا کیسا کھیل ہوتا ہے۔ راجا جیل میں جانے والے کے گھر میں کچھ دانہ ڈال دیتا ہے اور کام کی جورو بہنیں گھر میں رکھ لیتا ہے۔ ہم کیا کیا کہانی بتائیں۔ اِدھر ایک سے ایک راجا نواب، مائی کا لال پڑا ہے۔ ہم اِدھر کے دیکھے بھالے نہ ہوتے تو اِدھر ان کے جال میں ضرور آجاتے۔ پر سر لگا کے آئے تھے۔" بیرے نے پلیٹوں میں بھنی ہوئی مرغیاں لا کے رکھ دی تھیں۔ بچھل نے اُسے بھی کھانے میں شریک کر لیا، اُس نے تکلف نہیں کیا۔ کھانے کے دوران بھی وہ باتیں اور بچھل ہوں ہاں کرتا رہا۔

"اب ہم اِدھر آگئے ہیں۔" بچھل نے سر اُٹھا کے کہا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے بابا! تم آگئے ہو، یہ تو ہم بھی دیکھ رہے ہیں کہ تم آگئے ہو۔ ہم اپنی بات نہیں بولتے۔ دو ایک آدمی کم زیادہ ہونے سے اپن کا کچھ نہیں جاتا لیکن وہ اُدھر جو اپنی ماں کے دشمن کھونٹے کھونٹے پھن پھیلائے بیٹھے ہیں! وہ رہتے اندر ہیں، پر ایک آنکھ اندر ایک باہر رکھتے ہیں اور جو باہر کھلے ہوئے ہیں، وہ بھی اُن کی ہنڈیا چاٹنے کے لیے زبان نکالے پیچھے پیچھے لگے رہتے ہیں، ہڈی مل ہی جاتی ہے۔ یہ دُم چھلے شہر کی منڈی تیزی کی پل پل کی بات اُن کے کانوں میں ٹانکتے ہیں۔ ابھی اپنے کو ہی لے لو، چھ برس بعد اِدھر لوٹے تو سب نے طوطے کا جھوٹا کھایا ہوا تھا، سب کی آنکھوں میں طوطا موت گیا تھا۔ حرامیوں نے بہت اُٹھک بیٹھک کرائی لیکن جوالا! بازار والوں سے جا کے پوچھو، جوالا ایک چھدام پیچھے نہیں کھسکا، سالے سمجھتے تھے، ہم اُدھر خالی بیٹھے ہوں گے۔" وہ منہ میں کلی کر کے اُسے پی گیا۔

ہمیں پہلی بار معلوم ہوا کہ اُس کا نام جوالا ہے۔ وہ بہت تیز تیز بول رہا تھا جیسے ہم بہت دنوں بعد اُسے دوبارہ ملے ہوں۔ بچھل نے اُسے اپنا نام دلن اور میرا بھورا بتایا۔ ہوٹل کے تقریباً تمام آدمی کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ریکارڈوں کے شور سے ہماری آواز اُن تک نہیں پہنچ رہی ہوگی لیکن وہ سب کان لگائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ بیرا پلیٹیں اُٹھانے آگیا تھا اور میں نے دیکھ لیا تھا، اُس نے ہم سے نظریں بچا کے جوالا کو آنکھ ماری ہے۔ جوالا نے اُسے جھڑک دیا۔ "آنکھ پھوٹ گئی تیری۔ گھاس چرتے چرتے آدمی کی پہچان بھول گیا۔ سمجھے ہم دب گئے، ہمارا باپ پٹے گا۔" بیرے نے ہونٹ سکوڑے ہی تھے کہ جوالا نے اُس کے ہاتھوں میں رکھی ہوئی پلیٹوں پہ ہاتھ مار دیا۔ زور کا چھناکا ہوا۔ ہوٹل کا مالک دروازے کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنی چوکی سے اُٹھ کے بھاگا ہوا ہمارے پاس آیا اور جوالا کے شانے تھپ تھپانے لگا لیکن جوالا نے شانے جھٹک کے اُسے دُور کر دیا۔ "ایک دن ہم دونوں کو فرائی کر دیں گے۔" وہ گرجتا ہوا بولا۔ "سالے آدمی نہیں دیکھتے، تمھارے شہر میں تمھاری ماں کے یار آئے ہیں۔"

ہوٹل کا مالک ٹوٹی ہوئی پلیٹیں خود اُٹھانے لگا۔ باورچی بھی اُس کی مدد کے لیے آگیا۔ اُس نے بیرے کو دھکا دے کے ایک طرف کر دیا۔ گانا ختم ہوگیا تھا اور سوئی خالی ریکارڈ پہ گھوم رہی تھی۔ ہر شخص دم بخود بیٹھا تھا۔ جب تک ہوٹل کے مالک نے اپنی جگہ واپس جا کے ریکارڈ نہیں بدلا، خاموشی نہیں ٹوٹی۔ پھر بیرے نے دبے پاؤں آکے پانی سے بھرے ہوئے گلاس ہمارے سامنے رکھ دیے۔ جوالا نے اُسے اُبلتی ہوئی آنکھوں سے گھور کے دیکھا لیکن بیرا گردن جھکائے جلد ہی واپس ہوگیا تھا۔ "ہم کیا بول رہے تھے؟" جوالا نے اپنا ماتھا ٹھونکتے ہوئے دھیمی آواز میں بچھل سے پوچھا۔

"ہمیں یاد نہیں۔" بچھل نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

جوالا کے چہرے کی لکیریں بڑھ گئیں۔ اُس نے اپنے سر کو تیزی سے جھٹکا دیا اور گلاس منہ سے لگا کے ایک ہی سانس میں ختم کر دیا۔ "ہاں! ہم کو یاد آیا۔" وہ چمک کے بولا۔ "ہم کہہ رہے تھے کہ تمھارے دماغ میں اُدھر کی بات ہے تو اُدھر کا گھوڑا اِدھر ریت میں ٹھیک سے نہیں چلتا سمجھے۔"

"کوئی اور بات کرو جوالا!"

"جو تم پوچھو۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔

"ہم نے تم سے کہا ہے کہ ہم اِدھر آگئے ہیں۔"

"اور ہم نے کیا بولا! ارے بابا! ہم نے بولا، ٹھیک ہے تم آئے ہو تو اِدھر ہی رہو۔ اِدھر زمین کی کمتائی نہیں ہے پر آگا پیچھا بتائے دیتے ہیں۔ بعد کو مت کہنا کہ ہم کو خبر نہیں ہوئی تھی۔ یاد رکھو گے کہ پہلے جوالا ملا تھا، ہم بولتے ہیں لوٹ جاؤ، اِدھر بہت خواری ہوتی ہے اور اگر تمھارے دھیان میں یہ ہے کہ تم کسی راجا نواب کے وہاں گھس بیٹھ جاؤ گے تو ایسا کر لو، پر یہ بھی دھیان میں رکھنا کہ راجا لوگ جب تک سر نیچے، پیر اُوپر کر کے نہیں دیکھ لیتے، اُس وقت تک ہاتھ نہیں رکھتے۔ اُدھر جا کے پہلے اپنی تول کرانی ہوگی۔ ایک ماشے کا فرق ہوگا تو منہ پھیر لیں گے۔ اور وہ لوگ جو اُن کے آئیں بائیں بیٹھے ہیں، سالے پہلے ہی ترازو میں پاسن کا فرق کر دیں گے۔ وہ تمھارے جاتے ہی کھڑے نہیں ہو جائیں گے کہ اُستاد آؤ، بس تمھارا انتظار کر رہے تھے، راجا کو تو بعد میں پتہ چلے گا، وہ تم کو دروازے ہی سے رستہ دکھا دیں گے۔ راجا لوگوں کو اپنا پتہ کرانے کے لیے پہلے اِدھر بازار میں بہت دنوں تک جھٹکا کرنا پڑے گا اور وہ تمھیں کھلا چھوڑ دیں گے! سالے وقت آنے پر سب مل بیٹھ کے ایک ہو جائیں گے، اُدھر پگڑی والوں کو مال چڑھا کے اشارہ کریں گے کہ شکار کدھر ہے۔"

"اسامی بولو جوالا!" بچھل نے بوجھل آواز میں کہا۔

"اسامی!" جوالا سٹ پٹاتے ہوئے بولا۔

"ہاں اسامی!" بچھل نے زور دے کے کہا۔ "آنے کے بعد لوٹنا ہم کو نہیں سکھایا گیا۔ نئی جگہ، سب جگہ، ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہم کو جگہ بولو، باقی ہم پہ چھوڑ دو۔"

"ہم تم کو دس جگہ بول سکتے ہیں۔" وہ تیزی سے بولا۔ "پر بابا! ہماری بات سمجھو، ہم اِدھر رزق کی جگہ بیٹھے ہیں اور تم پہلے ہمارے پاس آئے ہو، جوالا کے پاس جوالا کالی جعلی باتیں نہیں کرتا۔ اِدھر ایک سے ایک ٹڈی کا..."

"اسامی بولو۔" بچھل نے تندی سے کہا۔

جوالا کے جسم میں ایک لمحے کے لیے بجلی سی چمکی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گیا۔ اُس نے بیرے کو آواز دے کے چائے لانے کے لیے کہا۔ بیرا گلاس رکھ کے واپس چلا گیا تو وہ ہمیں اکتائے ہوئے لہجے میں شہر کے رؤسا کے نام اور اُن سے متعلق آدمیوں کی تفصیل بتانے لگا۔ کون پہلے کہاں تھا، کس نے کیا کیا اور کون کس چیز کا ماہر ہے، کس کی خو کیسی ہے، کس نے کتنے آدمیوں سے چاقو چھینا اور چھنوایا ہے وغیرہ۔ بچھل خاموشی سے سنتا رہا۔ انھی ناموں میں دو تین ناموں کے بعد رانا مہتاب کا نام آیا تو میں نے بے اختیار بچھل کی طرف دیکھا مگر وہ آنکھیں موندے چائے پی رہا تھا۔ جوالا بتا رہا تھا کہ رانا کے پاس بھیلیر کے علاوہ بیکانیر، احمدآباد اور اجمیر کے آدمی بھی ملازم ہیں۔

"رانا اتنے بہت سے آدمیوں کا کیا کرتا ہے رے؟" بچھل نے پوچھا۔

"کیا کرتا ہے۔" وہ بھڑک کے بولا۔ "اچار نہیں ڈالتا بابا! راجا لوگوں کی شان ہی ان لوگوں سے ہے۔ یہ نہ ہوں تو راجا لوگ آدھے بھی نہیں۔ روپیہ پیسہ بھی ہاتھ پاؤں مانگتا ہے۔ جو کام راجا لوگ اپنے ہاتھ پیر سے نہیں کر پاتے، وہ ان سے کراتے ہیں۔ یہ ان کے دوسرے ہاتھ پیر ہیں۔ ایک کو دُوسرا تو سمجھتا ہے اور اُلو کون ہے، یہ ہمارے بولنے کی بات نہیں۔ تم نے ہم سے زیادہ دُنیا دیکھی ہے۔ رانا کی بہت لمبی چوڑی زمینیں ہیں، گاؤں کے گاؤں ہیں۔ یہ لوگ اُس کی زمینوں پہ جا کے کسانوں سے اپنا بھی بھتا وصول لیتے

ہیں، رانا کا بھی۔ وہ اپنے مالک کے لیے گھر گھر نئی نئی چھوکریاں تاکتے رہتے ہیں۔ اِدھر چھوکری کا بدن پکنا شروع ہوا، اُدھر اُن کے پھیرے شروع ہو گئے۔ چھوکری ابھی دو ہاتھ اُونچی نہیں ہوتی کہ یہ اُس کی بولی بول دیتے ہیں۔ چھوکریاں تو گیاں ہوتی ہیں، چھوٹی سی گٹھری میں آجاتی ہیں۔ یہ حرام کے جنے تو ہاتھی جیسا آدمی اٹھوا لیتے ہیں اور پتہ نہیں چلتا کہ کدھر چھو ہو گیا۔"

"رانا کی کتنی بیویاں ہیں؟"

"بیویاں؟" جوالا کے منہ سے ہنسی چھوٹ پڑی۔ "کیسا بولتے ہو بابا! وہ روز ایک عورت کو سہاگن بناتا ہے، ویسے دو بیویاں ہیں۔ بچے رانا کے نام سے پالے جاتے ہیں۔ بولتے ہیں کہ رانا چھوکری کو ایک بار چھو کے دوبارہ ہاتھ نہیں لگاتا۔ کبھی کچھ اور نہیں ملتا تو اُس کے آدمی ڈھونڈ ڈھونڈ کے اُس کے لیے نچنیاں اور کنجریاں لے آتے ہیں۔ کنجریاں چاؤ سے رانا کو مہتابی پکارتی ہیں۔ رانا کو بس یہی ایک شوق ہے۔ اِدھر جیسلمیر میں اُس جیسا رنگ دار آدمی کوئی نہیں۔ حویلی میں روز رات کو ناچ گانا، دھوم دھڑکا ہوتا ہے۔ ہم تو اُدھر کبھی نہیں گئے لیکن یہی جھینگر لوگ بولتے ہیں کہ رات کو نیلے پیلے شیشے جڑے کمرے میں اِدھر شہر کے اور آس پاس کے بہت سے راجا نواب لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو یہ ولایتی شراب کا چھڑکاؤ کرتے ہیں۔ حویلی سے ہر مہینے پگڑی والوں کو پیسہ جاتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں رانا کی بہن کی سگائی ہوئی تھی۔ برات نظام حیدر آباد شہر سے آئی۔ پندرہ دن تک میلا ٹھیلا لگا رہا۔ منوں ٹنوں گولا بارود پھونک دیا گیا۔ ہر طرف سے گانے بجانے اور کوٹھے مٹکانے والیاں آئیں، ایک اِندر سبھا اندر جمتی تھی تو ایک باہر مستانوں کے لیے۔ رانا نے کئی ہاتھی اجمیر سے منگوائے تھے۔ بینڈ باجے والے تو تمہارے دلی شہر سے آئے تھے۔"

"رانا کے ہاں تم نے کون کون سے خاص خاص آدمیوں کے نام بولے تھے؟" بجھل نے تھمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہم نے بولا، اُدھر ایک آدمی نہیں ہے۔" جوالا نے برہمی سے کہا۔ "ایک سے ایک نگینہ ہے۔ اُدھر اٹھو ہے، جانو ہے، فرید خاں ہے جس کا نام رانا نے سہراب خاں رکھ دیا ہے، اچھو ہے، کالے میاں ہے، دل برہے، چینا سنگھ ہے، اجیت سنگھ ہے۔ کس کس کا نام بولیں اور ان سب سے بڑھ کے رستم خاں ہے۔ رستم کا نام پہلے بشیرا تھا، رانا نے اُس کا نام بھی بدل کے رستم رکھ دیا۔ بشیرا رانا کے پاس حویلی میں ہی رہتا ہے۔ اُس سے زیادہ کوئی اور رانا کا من چڑھا نہیں ہے۔ رانا اُدھر بھوپال میں اپنے کسی رشتے دار کے ہاں مہمان تھا، شکار کھیلتے ہوئے کسی جھگڑے میں اُس نے بشیرے کے ہاتھ کی بجلی دیکھ لی۔ پھر وہ بشیرے کو ساتھ ہی لے آیا۔ چاقو بشیرے کے ہاتھ میں آکے سالا گوندے جیسے چپک جاتا ہے۔ وہ چیتے کی طرح اپنے شکار پہ جھپٹتا ہے۔ رانا پہ ایسا جادو کیا ہے کہ بشیرے کو روز دیکھے بنا اُس کو چین نہیں ملتا۔ باقی لوگ بھی بشیرے کا بہت خیال کرتے ہیں۔ جب کوئی کام خاص ہوتا ہے تو رانا بشیرا ہی سے بولتا ہے ورنہ وہ سالا حویلی میں اینڈتا رہتا ہے اور رگ پٹھوں کو تیل پلواتا رہتا ہے۔ رانا نے بشیرے کو گھوڑے کی سواری بھی سکھا دی ہے۔ رانا کا حکم ہے کہ بشیرا جو چیز بھی مانگے اُسے تُرت دی جائے۔ بولتے ہیں کہ بشیرا روز صبح اپنے لیے بادام پستے، دودھ اور میوے کا جو کشتہ بنواتا ہے، اُس کا ایک گلاس رانا کو بھجواتا ہے، ایک خود پیتا ہے۔ رانا نے اُس کی شادی بھی اپنے ایک پرانے آدمی کی بیٹی سے کرا دی ہے اور بشیرا کی ماں کو بھی بھوپال سے بلا لیا ہے۔ جیسلمیر میں اور دُور دُور بشیرا کا چاقو گرانے والا ہماری جان پہچان میں نہیں ہے۔ ایک بار ہم نے بھی اُسے فرید خاں سے لڑتے دیکھا تھا۔ فرید خاں ڈیل ڈول میں اُس سے بیشی ہے، اُس نے بہت زور کیا لیکن بشیرے نے چاقو اُس کے ہاتھ میں رکھے ہوئے اُسے جیسے باندھ دیا تھا، ایک دم جام کر دیا تھا۔ فرید خاں اُس کے پھندے کو نہیں توڑ سکا، پھر اُس نے چاقو بشیرے کے پیروں پہ پھینک دیا اور بشیرے نے اُس کو گلے لگا لیا۔ اُسی دن رانا نے فرید خاں کا نام بدل کے سہراب رکھ دیا تھا۔ بشیرا اب بہت کم باہر نکلتا ہے۔ اُس کا کام زیادہ تر یہی ہے کہ وہ رانا کے دوسرے آدمیوں کو ہاتھ چلانا سکھلائے۔"

"بس جوالا! ہم کو جانا ہے۔" جوالا بشیرے کے بارے میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر بجھل نے اُسے روک دیا۔

"کیوں؟" جوالا حیران نظروں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا اپنے سے کوئی بات زیادہ ہو گئی؟ ہم نے تم سے کچھ غلط نہیں بولا ہے۔"

"تم نے سب ٹھیک بولا ہے۔"

"پھر کیا ہے، تم ایسے کیوں اُٹھنے لگے؟"

"ہم کو اب جانا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بابا! پر تھوڑی دیر ابھی اور بیٹھو، ابھی اور بہت سی باتیں باقی ہیں۔" جوالا تیکھے لہجے میں بولا۔

"کل ہو سکا تو اِدھر آئیں گے۔"

"کل کس نے دیکھی ہے یارا!"

"کل ہو گی تو آنے کی کوشش کریں گے۔"

بیرا قریب ہی موجود تھا۔ بجھل نے اُسے اشارہ کر کے اپنے پاس بلایا اور دس روپے کا نوٹ اُس کے ہاتھ میں تھما کے اُٹھنے لگا۔ بیرے نے نوٹ لے لیا تھا لیکن جوالا نے جھپٹ کے اُس کا گریبان پکڑ لیا۔ بیرے کو نوٹ وہیں میز پہ پھینکنا پڑا۔ بجھل نے اُسے نہیں اُٹھایا، جوالا بیرے سے اُلجھا ہوا تھا کہ وہ آگے بڑھ گیا اور ہوٹل کے چبوترے سے نیچے گلی میں اُتر آیا۔

ہم ابھی گلی میں کچھ ہی دُور آئے ہوں گے کہ جوالا نے ہمیں آ لیا اور قریب آکے بولا۔ "کیوں سیٹھا! کچھ خفا ہو گئے؟ ہم اپنی ماں کی قسم کھا کے بولتے ہیں کہ اپنا مطلب کچھ اور نہیں تھا۔" بجھل نے اُس کے کندھے پر

ہاتھ رکھ کے تھپکی دی۔ "ابھی اپنا خیال تھا کہ تم کو بیر تھو کے پاس لے چلیں گے۔ اُس کُتے کی ذات سے بھی مل کے دیکھو۔"

"ملیں گے جوالا، پھر کبھی ملیں گے۔"

جوالا ہم سے ہمارا پتہ پوچھنے لگا کہ ہم کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور بولا کہ اگر ہمیں رہنے کی کوئی تکلیف ہو تو اُس کا گھر موجود ہے جہاں اُس کی ایک بیوہ بہن اور اُس کے بچے رہتے ہیں۔ بہن کا شوہر لڑائی میں مارا گیا تھا۔ اُس کی اور بچوں کی دیکھ بھال ہی کے لیے اُسے واپس جیسلمیر آنا پڑا ہے۔ وہ ہم سے اور بہت سی باتیں پوچھ رہا تھا لیکن بجھل نے اُسے ٹال دیا اور وعدہ کیا کہ ہمیں رہنے کی یا کوئی اور ایسی ویسی مشکل پیش آئی تو ہم اُسی کے پاس آئیں گے۔ جوالا بجھل کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوا۔ "ہاتھ کے نیچے لگتے ہو، پیارا! اِدھر ہاتھ کو زنگ لگ جاتا ہے۔ اِدھر کی بات نرالی ہے اس لیے ہم نے یہ سب تم کو بولا تھا۔" راستے بھر وہ مسلسل تکرار کرتا رہا۔ بازار بھی گزر گیا لیکن وہ ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پھر بجھل نے سبزی منڈی کے نزدیک ایک جگہ ٹھہر کے تیز لہجے میں اُسے واپس جانے کے لیے کہا تب کہیں وہ ہم سے جُدا ہوا۔ ہم سیدھے منیر علی کے گھر نہیں گئے بلکہ ایک لمبا چکر کاٹ کے دوبارہ بازار میں آ گئے۔ بجھل نے اچانک ایک راہ گیر کو روک کے تارگھر کا پتہ پوچھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی مگر میں نے کچھ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔

تارگھر اور ڈاک خانہ ایک ہی عمارت میں تھا۔ بجھل نے تار کا فارم اور کھڑکی کے اندر بیٹھے ہوئے ایک بابو سے قلم مانگ کے مجھے تھما دیا اور کہنے لگا، "پیرو کو تار دو کہ وہ پہلی گاڑی سے بیکانیر پہنچے۔"

"کیوں؟" میں نے بوکھلا کے کہا۔ یہ لفظ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا تھا۔ میں نے فوراً اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور بجھل سے کوئی دوسرا سوال نہیں کیا۔

"لکھ! ۔ پتہ تو تجھے یاد ہو گا۔"

میں نے سر ہلایا اور تار کے فارم پہ پیرو کا پتہ لکھنے لگا۔

"کیا لکھا ہے؟"

"جو تم نے کہا ہے۔"

"پڑھ کے سُنا دے۔"

"لکھا ہے فوراً بیکانیر پہنچو مگر وہاں کہاں؟" میں نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

"اتنا ٹھیک ہے لے! یہ تار کب تک پہنچ جائے گا؟"

"ممکن ہے رات تک۔ دیر بھی ہو سکتی ہے۔"

"بابو سے کہو کہ زیادہ پیسے لے کے اسے جلدی بھیج دے۔"

میں نے فارم پہ ارجنٹ لکھ دیا۔ بابو کو فارم دے کے اور پیسے ادا کر کے ہم باہر چلے آئے۔ بجھل نے گھر جانے کے بجائے بازار سے کئی چیزیں خریدیں۔ شیرینی، دو ریشمی گلابی دوپٹے، چوڑیاں، چاندی کے کڑے، شیروانی کا کپڑا اور ایک شال۔ دھوپ اُوپر چڑھنے لگی تھی۔ ہم سامان سے لدے پھندے گھر کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں منیر علی مل گئے۔ وہ ہمی کو ڈھونڈنے کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ بجھل نے گھر آ کے سارا سامان اُن کے حوالے کر دیا۔ منیر علی نے بہت انکار کیا مگر بجھل نے ملازمہ کے ہاتھوں سامان اندر بھجوا دیا۔ منیر علی غالباً یہ جاننے کے لیے بے تاب نظر آتے تھے کہ ہم کہاں کہاں گئے تھے۔ نہانے کے بعد جیسے ہی بجھل بیٹھک میں واپس آیا اور چارپائی پر پاؤں پسار کے بیٹھا، منیر علی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کہاں کہاں کی سیر کی جناب نے؟"

"یوں ہی گلی گلی گھوم رہے تھے بڑے صاحب!" بجھل نے نرمی سے جواب دیا۔

"کیسے شہر آپ کو کیسا معلوم ہوا؟" منیر علی نے تجسس سے پوچھا۔

"صرف ناموں کی بات ہوتی ہے۔"

"ہاں! آپ سچ کہتے ہیں۔" منیر علی ہنس کے بولے۔ "یعنی آپ کے خیال میں بستیاں بھی آدمیوں کی طرح ہوتی ہیں مگر صاحب! آدمی آدمی میں تو بہت فرق ہوتا ہے۔"

"ہاں بڑے صاحب! بستی بستی میں اتنا فرق نہیں ہوتا۔"

منیر علی نے گھر پہنچتے ہی ہم سے کھانے کو پوچھا تھا۔ ہم نے منع کر دیا تھا لیکن چائے کے ساتھ کھانے ہی کے برابر سامان آ گیا۔ دہی بڑے، امرود، کیلے، سنگترے، ناشپاتی کی چاٹ، نمک پارے وغیرہ۔ منیر علی سمجھے تھے کہ شاید ہم تکلف کر رہے ہیں، دوپہر کا کھانا کھا کے نہیں آئے ہیں۔ میری حد تک تو اُن کا یہ قیاس درست تھا کیونکہ میں نے ہوٹل میں چند ہی لقمے لیے تھے۔

چائے پینے کے کچھ ہی دیر بعد بجھل نے اُن سے کہہ دیا کہ ہم آج رات کسی وقت یہاں سے چلے جائیں گے۔ "کیوں بھلا؟" منیر علی نے حیرانی سے پوچھا جیسے بجھل نے کوئی انوکھی بات کہہ دی ہو۔ "آپ نے اچانک جانے کا ارادہ کیوں کر لیا؟"

"کیا کریں بڑے صاحب! جانا تو کسی وقت ہے ہی، دن بھی کئی ہو گئے ہیں۔"

"کہاں! تیسرا ہی دن تو ہے بلکہ تیسرا دن تو اب شروع ہوا ہے۔ نہیں جناب! ابھی آپ اور ٹھہریں گے۔" انھوں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"نہیں بڑے صاحب! موقع ملا تو پھر کبھی آئیں گے۔"

"ابھی تو آپ کا آنا ہی معلوم نہیں ہوا۔" وہ ناراضی سے بولے۔ "آدمی آتا اپنے بس سے ہے، جاتا پرائے بس سے ہے۔ میں آپ کو اتنے جلدی نہیں جانے دوں گا۔ اتنے دور دراز کے سفر کے بعد آپ آئیں اور فوراً چل دیں، یہ کیسے ممکن ہے۔ مجھے تو آپ کی خاطر تواضع کا موقع ہی نہیں ملا۔ ابھی تو میں کہوں گا کہ ہم نے ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھا بھی نہیں۔ میرے اوسان تو ارشد میاں نے بے حال کر رکھے ہیں۔ آپ کو کسی قسم کی تکلیف ہوئی ہو تو مجھے معذور سمجھ کے معاف کر دیجیے۔ آپ کو کیا بتاؤں، آج دوپہر ارشد میاں کو پھر وہی دورہ پڑا تھا، جسم پتھر ہو گیا تھا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں اکڑے ہوئے تھے جیسے

بند تھی۔ یہ دورہ کئی بار پہلے بھی پڑ چکا ہے جسم پہ کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور دیکھتے دیکھتے وہ دنیا و مافیہا سے بے سدھ ہو جاتا ہے۔ خود بھی روتا ہے دوسروں کو بھی رلاتا ہے۔ اتفاق سے میں گھر نہیں تھا۔ جیسے ہی خبر ملی بھاگا بھاگا آیا۔ بچے پریشان ہو گئے تھے۔ آپ کے آنے سے کچھ دیر پہلے اُسے ہوش آیا ہے۔ ساری رات چھت پہ پڑا اوس میں بھیگتا رہا تھا۔ جیسے جیسے دن گزر رہے ہیں اُس کی حالت سنبھلنے کے بجائے اور گرتی جا رہی ہے۔ نہ جانے اُس کا کیا ہو گا۔ یقین جانیے آپ کے آنے سے کچھ تسلی ہو گئی تھی کہ اب میں تنہا نہیں رہا۔ حالانکہ یہ احساس اپنی جگہ تھا کہ آپ مہمان ہیں اور آپ کو واپس بھی جانا ہے۔ میری درخواست مان لیجیے کچھ اور ٹھہر جائیے۔" منیر علی شدت سے اصرار کرنے لگے۔ نتیجتہً بتّھل مزید ایک رات ٹھہرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

منیر علی رات تک سرگرم رہے۔ کبھی اندر جاتے، کبھی بیٹھک میں آ کے ہمارے پاس بیٹھ جاتے۔ وہ رات کے کھانے پہ محلّے کے چند لوگوں کو بھی بلانا چاہتے تھے۔ بتّھل کے سامنے انھوں نے اس کا ذکر کیا تو اُس نے نہ تائید کی نہ تردید لہٰذا منیر علی نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ بتا رہے تھے کہ محلّے کے کئی آدمی ہمیں اپنے گھر مدعو کرنا چاہتے تھے مگر جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ہم واپس جا رہے ہیں تو وہ بہت مایوس ہوئے۔ منیر علی محلّے کے ایک اعلا تعلیم یافتہ بزرگ شاہد صاحب کا ذکر بھی کر رہے تھے۔ شاہد صاحب ناگ پور کے کسی کالج میں پرنسپل تھے اور ان دنوں اپنے وطن آئے ہوئے تھے۔ "میں نے اُن سے تمھارا ذکر کیا تھا۔" منیر علی نے مجھ سے مخاطب ہو کے کہا۔ "میں نے کہا تھا کہ میں اُسے لے کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ آپ مل کے بہت خوش ہوں گے۔ بہت سعید بچہ ہے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ سولہ درجے پاس کیے ہوئے ہے۔" شاہد صاحب نے بہت اشتیاق ظاہر کیا، وہ جب بھی کہیں یہ سنتے ہیں کہ مسلمان بچے نئی روشنی کی تعلیم سے آراستہ ہو رہے ہیں، بہت مسرور ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمیں نئے زمانے کی تعلیم میں پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔ عجیب عجیب طرح قائل کرتے ہیں۔ آدمی سن کے ششدر رہ جاتا ہے کہ افسوس، وہ کتنی غفلت میں تھا۔ میں نے انھی کے ایما پر بڑے لڑکے کو علی گڑھ بھیجا ہے۔ چھوٹا ابھی اسکول میں پڑھ رہا ہے اور ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کر رہا ہے۔ بچیوں کو ایک اُستانی پڑھانے آتی ہے۔ مولوی صاحب بھی انھی کے ہم نوا تھے۔ پچھلی مرتبہ جب شاہد صاحب ناگ پور سے آئے تھے تو مولوی صاحب سے اُن کی ملاقات ہوئی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں دونوں ایک دوسرے کے ایسے شیدائی ہوئے کہ جب تک شاہد صاحب یہاں رہے روز مولوی صاحب سے ملنے آتے رہے۔ دینی معاملات میں مولوی صاحب طاق تھے تو شاہد صاحب نئی تعلیم کے رموز و نکات کے ماہر۔ دونوں میں خوب دلچسپ تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ ممکن ہوا تو کل صبح اوّل وقت اُن کے ہاں چلیں گے۔ دین دار آدمی ہیں۔ پانچوں وقت پابندی سے مسجد آتے ہیں۔ محلّے میں سبھی اُن کی عزت کرتے ہیں، آتے ہیں تو جمگھٹا لگ جاتا ہے۔ ماشاء اللہ گھر میں سب کچھ ہے لیکن اپنا آبائی محلہ نہیں چھوڑتے۔ کہتے ہیں کہ مجھے یہاں آ کے تم لوگوں کے ساتھ رہنے ایک فرحت محسوس ہوتی ہے۔" میں نے سر جھکا لیا۔ میں اُن سے کیا کہتا کہ میرا دل کسی سے ملنے کو نہیں چاہتا۔ ارشد کے تو ہاتھ پاؤں اکڑ بھی جاتے ہیں، وہ تو بے خبر بھی ہو جاتا ہے مجھ سے تو یہ بھی نہیں ہوتا۔

رات کے کھانے پہ منیر علی نے گزشتہ دونوں دنوں سے زیادہ اہتمام کیا۔ وہ پہلی بار ہمیں اندر گھر میں لے گئے اور دالان میں رکھے ہوئے ایک تخت پہ بٹھا دیا۔ تخت پہ سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ درمیان میں دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ منیر علی کا گھر خاصا بڑا تھا۔ وسیع صحن، لمبا چوڑا دالان، فرش دُھلا ہوا اور دیواروں کا رنگ اُجلا۔ دالان میں دوسری جانب ایک اونچی جگہ دری بچھی تھی، گاؤ تکیے تھے اور کئی لالٹینیں جل رہی تھیں۔ پورا مکان روشن تھا۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ صحن میں رات کی رانی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ دالان سے اندر کی طرف کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔ کورا یہاں دن میں نہ جانے کتنی بار آتی ہو گی۔ صحن میں مولوی صاحب کے گھر میں کھلنے والی کھڑکی بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ بدن کو خم دے کے، سر جھکا کے ہی کھڑکی سے گزرتی ہو گی۔ کبھی اُس طرف وہ اِس طرف زہرہ بیٹھی رہتی ہو گی۔ میرے گھر میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ امی پڑوس والی بھابی سے بات کرتی تھیں تو پیڑھی پہ کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتی تھیں اور گھنٹوں بیٹھی رہتی تھیں۔ کھڑکی اُس وقت بند ہوتی تھی جب ابا جان آتے تھے یا گھر میں مہمان ہوتے تھے۔ میری نظریں ہر سمت گھوم رہی تھیں۔ سامنے باورچی خانہ تھا۔ دفعتہً میری نگاہ ایک جگہ ٹھہر گئی۔ باورچی خانے کے کواڑوں کی اوٹ سے زہرہ جھانک رہی تھی۔ میں اُسے ایک ہی نظر دیکھ سکا۔ اُس کے کانوں میں آویزے جھول رہے تھے۔ غرارہ، جمپر اور سبز دوپٹا۔ اُس کا رنگ آگ کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا منہ کھل گیا۔ اُس نے جھٹ کواڑ بند کر دیا اور شاید اتنی بدحواسی سے پلٹی کہ چھوٹی بہن سے ٹکرا گئی۔ دونوں کی چیخیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ منیر علی دوڑے دوڑے باورچی خانے گئے اور فوراً واپس آ گئے۔ دونوں بہنوں نے یہ بہانہ کر دیا تھا کہ شامی کباب تلے جا رہے ہیں، گھی میں پانی کا چھینٹا پڑ گیا تھا۔

اس کے بعد زہرہ دروازے پر نمودار نہیں ہوئی۔ گو میری نظریں بار بار اس طرف اُٹھتی رہیں۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو مگر سب بے کار تھا۔ یہ محض میری خوش گمانی تھی۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ میری التجا بے سود ہے۔ زہرہ مجھ اجنبی سے کیسے بات کرے گی۔ میں تو اُسے کورا کی سہیلی سمجھ رہا ہوں مگر وہ مجھے اُس کا کچھ کیوں سمجھے۔ اب ہمیں یہاں سے جانا ہی تھا۔ میرے ذہن میں پھر وہی ترکیب آئی کہ میں اُسے ایک خط کیوں نہ لکھوں۔ میں اُس سے صرف کورا کے بارے میں معلوم کروں گا۔ کسی کے متعلق کسی سے کچھ پوچھنا کوئی غلط بات نہیں ہے۔ اس میں زہرہ کا کوئی ضرر نہیں ہے۔ میں اپنے خط میں پہلے ہی اُس سے یہ وعدہ کر لوں گا کہ تمھارا جوابی خط تمھیں واپس مل جائے گا۔ وہ جواب میں مجھے صرف

اتنا بتا دے یا لکھ دے کہ کورا کسی کے بارے میں اُس سے کچھ کہتی تھی یا نہیں۔ اُس نے زہرہ سے کچھ تو ضرور کہا ہو گا۔ کاش زہرہ جواب میں صرف چند سطریں لکھ دے۔ میں نے سوچا کہ ایک سوال نامے کی صورت میں اُسے خط کیوں نہ لکھوں۔ میں اُس سے صرف اتنی درخواست کروں گا کہ وہ ان سوالات پر ہاں یا نہیں کے نشانات لگا دے مگر علیحدہ بیٹھ کے خط لکھنے اور پھر اُسے زہرہ کے حوالے کرنے یا کسی ذریعے سے اُس تک پہنچانے کی صورت میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں خط لکھ بھی لیتا تو اُسے دیتا کس طرح؟ رات کا وقت تھا۔ منیر علی عشا کی نماز سے فارغ ہو کے آ گئے تھے اور اب اُن کے کہیں جانے کا امکان نہیں تھا اور اُن کی موجودگی میں دستک دے کے کسی کو بیٹھک میں نہیں بلایا جا سکتا تھا۔ بالفرض اگر بلا بھی لیا جاتا تو میں خط اُس کے حوالے نہیں کر سکتا تھا تا ایں کہ دستک کے جواب میں خود زہرہ ہی دروازے پر نہ آئے۔ منیر علی کے سامنے اُن کے چھوٹے لڑکے مجو سے بھی التجا نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنی بہن کو میرا خط پہنچا دے۔ بیٹھک سے ملحق غسل خانے وغیرہ کے لیے جو ایک مختصر سی جگہ تھی، وہاں ایک نچلی دیوار گھر کے صحن میں حائل تھی۔ کبھی وہ جگہ صحن ہی کا حصہ ہو گی۔ منیر علی نے بیٹھک میں ٹھہرنے والے مہمانوں کی سہولت کے لیے صحن کے کونے میں دو طرف دیوار کھینچ کے اُسے علیحدہ کر دیا تھا۔ دیوار میں ایک دروازہ بھی تھا۔ بس یہی ہو سکتا تھا کہ زہرہ اس طرف کھڑی ہو اور اُسے پتہ ہو کہ میں رقعہ پھینک رہا ہوں اور وہ اُسے اُٹھا لے یا پھر رات کو کسی وقت جب سب سو گئے ہوں، میں اِس طرف سے دیوار پھاند کے گھر میں داخل ہو جاؤں اور خط کسی ایسی جگہ رکھ آؤں جہاں صبح سب سے پہلے زہرہ کی نظر پڑے۔ باورچی خانے میں یا کسی اور جگہ۔ یا اگر گھر میں کہیں زہرہ ہی دکھائی دے جائے، اُس کے سونے کا کمرہ کھلا ہو، یا وہ دالان ہی میں سو رہی ہو تو خط اُس کے سرہانے رکھ آؤں یا اُس کے دوپٹے میں باندھ آؤں۔ صبح اُٹھنے کے بعد اُس کی نظر دوپٹے کی گانٹھ پر ضرور جائے گی مگر اس طرح دوپٹے میں رقعہ بندھا دیکھ کے وہ میرے بارے میں کیا سمجھے گی اور زہرہ تک خط پہنچ بھی گیا تو کیا ضروری ہے کہ وہ جواب بھی دے دے۔ وہ اپنی سہیلی کی بات کسی کو کیوں بتلائے گی، وہ سوچے گی نہیں کہ میں کون ہوتا ہوں اور اگر کورا نے اُسے میرے متعلق کچھ بتایا ہے تو وہ میرے بارے میں تصدیق کرنے سے پہلے جواب کیوں دے گی۔ بتّھل نے یہاں میرا نام دوسرا بتایا تھا، بابر نہیں۔ ایک دوسری صورت بھی تھی کہ میں رات کو گھر میں کود کے زہرہ کو چھت پر لے جاؤں۔ منیر علی بیدار ہو گئے تو میں انھیں ایک لمحے میں بے سُدھ کر دوں گا۔ میں اپنے آپ کو چھپا کے جاؤں گا۔ زہرہ کو بھی کچھ دیر کے لیے جب تک میں اُسے چھت پر لے جاؤں، بے حس و حرکت رکھا جا سکتا ہے۔ میں چاقو دکھا کے بھی اُس سے پوچھ سکتا ہوں۔ وہ دہشت زدہ ضرور ہو جائے گی لیکن بعد میں جب اُسے یہ اطمینان ہو جائے گا کہ میرا مقصد کورا کے بارے میں جاننے کے سوا کچھ نہیں ہے تو وہ کسی قدر سنبھل جائے گی۔ ممکن ہے زہرہ اعصاب کی مضبوط ثابت ہو۔ میں ہاتھ جوڑ کے اُس کے سامنے کھڑا ہو جاؤں گا۔ ارشد اور دوسرے گھر والوں کا اتنا مسئلہ نہیں ہے۔ میں آسانی سے مکان میں جا سکتا ہوں۔

کھانا دسترخوان پر سجا دیا گیا تھا۔ منیر علی نے ارشد کو بھی ساتھ بٹھا لیا۔ وہ اندر کسی کمرے میں گھسا ہوا تھا۔ ہمیں سلام کر کے وہ چپ چاپ بیٹھ گیا۔ ایک طرف میں، بتّھل اور منیر علی کا چھوٹا لڑکا مجو تھا، سامنے ارشد اور منیر علی۔ ارشد نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ صاف لگتا تھا کہ منیر علی اُسے جبراً یہاں لائے ہیں۔ وہ نظریں جھکائے ہوئے اپنے پیروں کی کھال چھیل رہا تھا۔ اُسے دیکھ کے مجھے خفقان ہونے لگا۔ ارشد نے زبان نہیں کھولی۔ منیر علی نے کئی بار اُسے ٹوکا بھی کہ وہ ہماری طرف دھیان رکھے کہ کہیں ہم تکلف تو نہیں کر رہے ہیں۔ انھوں نے اُسے باورچی خانے سے گرم بریانی لانے کو بھی کہا۔ ارشد نے اُن کے حکم کی تعمیل کی۔ وہ چھوٹے چھوٹے لقمے منہ میں ڈالتا رہا۔ منیر علی زیادہ تر اُس کی تعریف کرتے رہے کہ اسے تعلیم کا بہت شوق ہے۔ وہ اُس کے ماں باپ کے واقعات بھی سناتے رہے۔ ارشد ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتا رہا، آخر کھانا ختم ہوتے ہی وہ ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا اور دوبارہ نہیں آیا۔

منیر علی مراد آباد میں ہمارا پتہ پوچھ رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ مولوی صاحب سے قرابت کے باعث ہم مراد آباد ہی میں رہتے ہوں گے۔ اس ذکر پر بتّھل کو انھیں مدعو کرنا چاہیے تھا لیکن بتّھل نے نہ تو واضح طور پہ مراد آباد میں اپنا پتہ بتایا، نہ اُن سے وہاں آنے کو کہا۔ اُس نے کہہ دیا کہ ابھی اُس کا وہاں جانے کا ارادہ نہیں ہے اور مراد آباد جانے سے پہلے جلد ہی وہ دوبارہ جیسلمیر آئے گا۔ منیر علی کو کوئی شک نہیں ہوا کیونکہ بتّھل نے صاف لہجے میں بات کی تھی۔

ہم بارہ ساڑھے بارہ بجے کے قریب واپس ہوئے۔ بتّھل آتے ہی پلنگ پر دراز ہو گیا۔ جیسے جیسے رات بڑھتی گئی گلیوں میں ہُو کا عالم طاری ہوتا گیا۔ میں نے خود کو چادر میں لپیٹا، منہ میز پوش سے ڈھانپا اور آہستہ سے دروازہ کھول کے بیٹھک سے ملحق غسل خانے کے حصّے میں آ گیا۔ دیوار پہ ہاتھ رکھ کے میں نے اُس کی مضبوطی کا بھی اندازہ کر لیا اور اندر جھانک کے دیکھا۔ مکان میں دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ دالان میں چارپائی پر کوئی سو رہا تھا۔ وہ یقیناً منیر علی ہوں گے۔ وہاں اور کوئی چارپائی نہیں تھی۔ زہرہ اندر کسی کمرے میں ہو سکتی تھی۔ اگر میں کودتا تو دھمک ہوتی اور جتنی دیر میں منیر علی جاگتے، اتنی دیر میں لپک کے میں اُن کے پاس پہنچ سکتا تھا اور انھیں بہت دیر کے لیے ہوش و حواس سے معطل کر سکتا تھا۔ اُن کے لیے گردن پر ایک معمولی ضرب کافی ہوتی۔ میں دیوار پر چڑھ گیا مگر اوپر چڑھ کے میرے پیروں میں جان نہیں رہی۔ پیر جیسے کسی نے جکڑ لیے۔ کئی لمحوں تک میں گٹھری بنا ہوا وہیں بیٹھا رہا پھر اسی طرف کود پڑا۔ بتّھل سویا ہوا تھا۔ میں اپنے بستر پہ آ کے ہانپنے لگا۔ میں نے رات بھر میں کئی بار ارادہ کیا مگر صبح قریب آ گئی۔ یہاں تک کہ اذان

گھر سے منیر علی کے جاگنے کی آواز آئی اور کچھ ہی دیر بعد مسجد میں اذان ہونے لگی۔

صبح کے نو بجے ہوں گے سواری باہر کھڑی تھی۔ ہم نے بہت روکنا چاہا مگر منیر علی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے اور جب تک گاڑی روانہ نہیں ہوئی، وہ اسٹیشن پر موجود رہے۔ انھوں نے کھانے پینے کا بہت سا سامان ہمارے ساتھ کر دیا تھا۔ میرے اور تجمل کے لیے ایک ایک جوڑے کا کپڑا علیحدہ تھا۔ چلتے وقت انھوں نے ہم دونوں کو کئی بار گلے لگایا۔ میرے سر پہ ہاتھ پھیرا، مجھے دعائیں دیں اور ڈبڈبائی ہوئی آواز میں کہا کہ وہ ہمارا انتظار کرتے رہیں گے۔

گاڑی لیٹ تھی حالانکہ سفر طویل نہیں تھا۔ ہم مغرب سے کچھ پہلے بیکانیر کے اسٹیشن پر اُترے اور منہ ہاتھ دھو کے اندر شہر میں چلے گئے۔ ہم نے اپنا مختصر اسباب اسٹیشن کے باہر ایک ہوٹل میں رکھ دیا تھا۔ ہم زیادہ دور نہیں گئے۔ شہر کا ایک ہی حصہ دیکھا ہوگا کہ واپس آگئے۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد رات گزارنے کے لیے اسٹیشن کے قریب ہی ایک سرائے میں جگہ مل گئی۔ تجمل نے گاڑی سے اُترتے ہی بمبئی سے آنے والی گاڑیوں کے بارے میں معلومات حاصل کر لی تھیں۔ رات کو کوئی گاڑی نہیں آتی تھی۔ پیرو کے آنے کا امکان صبح ہی تھا بشرطیکہ اُسے تار جلد مل گیا ہو۔ سرائے میں برابر برابر چارپائیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہمارے علاوہ وہاں اور بھی مسافر تھے۔ یہاں تجمل کو حقہ پینے کو مل گیا۔ رات کا کھانا ہم نے ہوٹل میں کھا لیا تھا۔ منیر علی کے دیے ہوئے کھانے میں سے بہت کچھ بچ گیا تھا۔ انھوں نے توشہ دان بھی دے دیا تھا۔ جیسلمیر کے مقابلے میں یہاں کی رات اتنی خنک نہیں تھی۔ سرائے کے بستر کے ساتھ رکھی ہوئی رلائی ہمارے پیروں میں پڑی رہی۔ رلائی کے بجائے ہم نے اپنی چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔

رات کو سرائے میں بکھرے ہوئے لوگوں کی نیندیں اچانک اُڑ گئیں۔ کسی نے سوتے میں تجمل کی جیب سے روپے چرانا چاہا تھا۔ اُس کی آنکھ لگ گئی۔ میں بھی اُس کے بازو کی چارپائی پہ آنکھیں موندے پڑا تھا۔ تمام لوگ سوئے ہوئے تھے اور ساری سرائے اندھیرے اور خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اُس آدمی کی چارپائی ہم سے تین چار پائیاں دور تھی۔ اُس نے دُور سے دیکھ لیا تھا کہ تجمل نے اپنی واسکٹ اُتار کے سرہانے رکھ دی ہے اور اُس کی صدری چادر سے باہر جھانک رہی ہے۔ وہ شاید زمین پر رینگتا ہوا آیا تھا۔ مجھے بھی خبر نہیں ہوئی مگر جیسے ہی اُس نے تجمل کی چارپائی پر آکے اُس کی واسکٹ پر ہاتھ ڈالا، مجھے آہٹ کا احساس ہو گیا۔ میں نے تجمل کی چارپائی پھلانگ کے اُس کی گردن دبوچ لی۔ وہ اس طرح چیخنے پکارنے لگا جیسے اُسے کسی سانپ نے کاٹ کھایا ہو۔ سرائے میں شور مچ گیا۔ وہ اُلٹا مجھ پر الزام رکھنے لگا کہ میں تجمل کی واسکٹ سے روپے چرانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ یہ دیکھ کے اپنی چارپائی سے بھاگا ہوا آیا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ میں اور تجمل ساتھ ساتھ سرائے میں آئے ہیں۔ میری حجت ہی پر تجمل کی آنکھ کھل گئی تھی۔ شور سُن کے سرائے کا مالک بھی آگیا اور مسافر اپنی چارپائیاں چھوڑ کے ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ تجمل نے چور سے کچھ نہیں کہا مگر سرائے کا مالک اور دوسرے لوگ اُسے مارنے لگے۔ آخر تجمل نے اُٹھ کے اُسے چھڑایا۔ سب لوگ اُسے اُسی وقت سرائے سے نکال دینا چاہتے تھے۔ تجمل نے صبح تک کے لیے اجازت دلوا دی لیکن صبح اُس کی چارپائی خالی پڑی تھی۔

ناشتے کے بعد ہم اسٹیشن آگئے اور ایک بینچ پر بیٹھے رہے۔ گاڑیاں آتی جاتی رہیں۔ معلوم ہوا تھا کہ بمبئی سے آنے والی گاڑی بارہ بجے سے پہلے نہیں آئے گی۔ بارہ بھی بج گئے مگر گاڑی نہیں آئی۔ پھر کوئی ڈیڑھ بجے اسٹیشن پر ہماری منتظر گاڑی کی آمد کی گھنٹیاں بجیں۔ تجمل پلیٹ فارم کے وسط میں ایک جگہ آکے ٹھہر گیا۔ گاڑی تیزی سے اسٹیشن میں داخل ہوئی اور میں نے شروع کے ڈبوں میں زورا کو ایک دروازے پر کھڑا ہوا دیکھ لیا۔ وہ وہی تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ زورا کے پیچھے ماچھی کھڑا تھا۔ پیرو مجھے نظر نہیں آیا۔ ہم لپکتے ہوئے اُن کے ڈبے تک پہنچے۔ گاڑی ابھی ٹھیری بھی نہیں تھی کہ ماچھی اور زورا نے ڈبے سے کود کے مجھے اُوپر اٹھا لیا۔ اُس طرف پیرو تجمل سے چمٹا ہوا تھا۔ پھر زورا اور ماچھی مجھے چھوڑ کے تجمل سے لپٹ گئے اور پیرو نے میرے سر پہ زور سے اپنا سر مار کے مجھے جکڑ لیا۔ وہ تینوں ایک لمحے میرے پاس ٹھیرتے، دوسرے لمحے تجمل کے پاس۔ "دادا! دادا! اپن کے سامنے یہ تم ہو نا؟" پیرو جھراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "بولو اُستاد! بولو۔ اِن کی آنکھ کو تسلی دو۔"

"ہاں پیرو!" تجمل نے پیرو کے بازو جھنجوڑ دیے۔

"اوئے۔" پیرو کی بلند آواز سے اطراف کے مسافر بھی چونک گئے لیکن پیرو سب سے بے خبر تجمل کو دبوچے ہوئے تھا۔ "تیلے گرام آیا تو اپن سمجھا سالا کسی نے مسخری مارا ہے پر اپن بولا، دیکھا جائیں گا۔ جو ہوئیں گا، دیکھا جائیں گا۔ کیوں ماچھی!" وہ پلٹ کے بولا۔ "اپن کیا بولتا تھا؟"

"دادا بولتا تھا کہ تار پہ اُستاد تجمل کا نام لکھا ہے۔ بس اتنا بہت ہے۔" ماچھی نے تیزی سے کہا۔ "دادا تم کو بہت یاد کرتا تھا اُستاد! روز تمھارا بولتا تھا۔"

"تم ٹھیک ہو پیرو؟" تجمل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں تجمل بھائی! ایک دم ٹھیک۔" پیرو تجمل کے ہاتھ اپنے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔ "تم اپنا بولو، تم کیدر ہے؟ کتنے دن تم کو اور بمبئی سے جائے ہوئے ہو گئے۔ تم نے اپنا پیرو کو بھلا دیا۔ چھ مہینے سے اُوپر ہو گیا۔ اپن اُدر کلکتے میں کوئی بیس خط ڈالا ہو گا۔ ہر ٹیم ایک ہی جواب ملتا تھا کہ اُستاد نئیں ہے۔ اُستاد نئیں ہے۔ اُستاد ابھی نئیں آیا ہے۔ اُس کا لاڈلا بھی نئیں ہے۔ تم کیدر چھپ گیا تھا تجمل بھائی؟"

"بتاؤں گا پیرو دادا، سب بتاؤں گا۔" تجمل نے رُکی رُکی آواز میں کہا۔ "تم بولو، بمبئی میں سب خیریت ہے۔ پھر کوئی آیا تو نہیں تھا؟"

"آیا تھا۔" پیرو سر جھٹک کے بولا۔ "پر اب سب فِٹ فاٹ ہے۔ تمھارے جانے کے بعد سالا اپن کو پھر لے گیا تھا۔ دس دن اندر رکھا۔ پھر چھوڑ دیا۔"

"وہ دوبارہ بھی تم کو لے گئے تھے؟" تجمل نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں اُستاد! لے گیا تھا سالا، پر وہ ایک لمبی بات ہے۔ تم اپنا بولو۔ تم ایدر کیدر ہو؟ ایدر چھچھوندر جگہ پر؟"

"ہم کل ہی اِدھر آئے تھے۔"

"پر پہ ایدر تم کیا کرتا ہے تجمل بھائی؟" پیرو پٹ پٹاتی آنکھوں سے بولا۔

"ایسے ہی بولنے کے لیے تم کو بُلایا ہے۔"

"بولو تجمل بھائی! جلدی بولو۔" پیرو نے بے چینی سے کہا۔

"آؤ، اب اُدھر سے چلتے ہیں۔" تجمل پیرو کا بازو تھام کے قدم بڑھاتا ہوا بولا۔ اسٹیشن پر مسافروں کی نقل و حرکت میں ٹھیراؤ آگیا تھا۔ زورا اور ماچھی نے دونوں جانب سے میرے گلے میں بانہیں ڈال رکھی تھیں۔ ماچھی مجھے گدگدا رہا تھا اور زورا میرا ہاتھ آنکھوں سے لگائے ہوئے تھا۔ وہ بار بار اُسے چومتا تھا۔ پلیٹ فارم کے لوگ متجسس نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ زورا بتا رہا تھا کہ اڈے کے تمام آدمی روز میرا انتظار کرتے ہیں کہ شاید میں واپس آجاؤں۔ وہ روز ایک دوسرے سے شرط لگاتے ہیں۔ ماسٹر ماشی تو میرا نام آتے ہی رونے لگتا ہے۔ منڈے نے اپنا نام بھی بمبئی میں میرے مشہور نام راجا پہ رکھ لیا ہے۔ اب وہ خود کو راجا جونیئر کہتا ہے اور ہر وقت میری طرح چاقو اچھالتا اور لڑتا رہتا ہے۔ سب کہتے ہیں کہ راجا اُستاد سپنا دکھا کے چلا گیا۔ سپنے میں آنے والے بے مروت ہوتے ہیں۔ زورا بمبئی میں میرے پیچھے ہونے والے واقعات ایک ہی سانس میں سُنا دینے کے لیے بے چین تھا۔ وہ میرے پوچھے بنا ایک ایک آدمی کا حال بتا رہا تھا۔ کہتا تھا کہ چھنگا اُستاد کے پاٹے کے تمام آدمی مجھے دیکھنے اور مجھ سے ملنے کے لیے کلکتے جانا چاہتے تھے مگر میرا کوئی پتہ ہی نہیں تھا۔

اسٹیشن سے باہر پیرو نے مجھے اُن سے چھین لیا۔ "راجا!" وہ میری کمر میں ہاتھ ڈال کے کھینچتے ہوئے بولا۔ "خیر تو ہے؟"

"ہاں پیرو دادا! سب خیر ہے۔" میں نے نظریں جھکا کے کہا۔ اُس نے میری ٹھوڑی اُوپر اُٹھائی۔ "تم ایک دم نہیں بدلا۔" میرے ہونٹ کپکپانے لگے۔ "بتی اور دھیمی کر لی لاڈلا راجا!" وہ میرے چہرے پہ نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اچانک ماچھی چیخنے لگا۔ تجمل نے اُس کا پنجہ پکڑ رکھا تھا۔ "اُستاد! بس کر، معاف کر دے۔" ماچھی کا جسم پھڑک رہا تھا۔

"پیرو!" تجمل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس مستانے کو کیا کھلایا ہے؟"

"سالا چربی چاشنی کھا لیا ہے۔"

"چاقو کھولو، میں اس کے ہاتھ کا ورم اُتارتا ہوں۔"

"جلنے دو تجمل بھائی! سالا خود کسی سے اُتروالے گا۔ اپن راستے میں بولا تھا ماچھی! سالا ہاتھ سنبھال لیا ہے۔ اُستاد تجمل دیکھیں گا تو کیا بولیں گا؟"

تجمل نے تڑپتے ہوئے ماچھی کا ہاتھ جھٹک کے چھوڑ دیا۔ "اس کی منجھائی کرو پیرو دادا! — اور یہ زورا! زورا بھی مجھے کچھ چڑھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔"

زورا میری آڑ میں ہو گیا۔ "سالا سب مستی کرتا ہے تجمل دادا! اپن نے اسی لیے خط ڈالا تھا کہ ابھی ان کو آ کے سنبھالو۔"

زورا اور ماچھی دونوں کی صحت پہلے سے بہت اچھی تھی۔ ماچھی کے چہرے سے تو خون پھوٹا پڑتا تھا۔ سینہ کچھ اور چوڑا ہو گیا تھا۔ گال بھر گئے تھے۔ مونچھیں اور بڑی ہو گئی تھیں۔ پیرو کے اڈے میں ماچھی ہی کا ہاتھ سب سے تیز تھا۔ پہلی بار جب تجمل پیرو کے اڈے گیا تھا اور اُس نے کچھ دنوں کے لیے اُس سے اڈا مانگا تھا تو پیرو نے ماچھی ہی کو آگے کیا تھا کہ وہ ہم لوگوں کی تصدیق کرے۔ تجمل کے بجائے جامو ماچھی سے لڑا تھا مگر وہ جامو تھا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید ماچھی اتنے جلدی بے قابو نہ ہوتا۔ اُس کے ہاتھ میں بہت چمک تھی۔ چاقو کی نوک سے اُس کی نگاہ بندھی رہتی تھی۔ زورا کا ہاتھ بھی میں نے اور تجمل نے رواں کرنے کی بہت کوشش کی تھی۔ پہلے سے خاصا فرق بھی آگیا تھا۔ اسی لیے تجمل نے اُسے جامو کے ساتھ تیواڑی کے اڈے جانے والے آدمیوں میں شامل کیا تھا۔ ممکن ہے اُس نے مشق جاری رکھی ہو۔ پیرو کے ساتھ اُس کی موجودگی ہی اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ اُس کے ہاتھ پہ اعتبار کرنے لگا ہے۔

ابھی ہم اسٹیشن سے باہر آئے ہی تھے کہ کسی ہوٹل کا ایجنٹ ہمارے پیچھے لگ گیا اور اصرار کر کے ہمیں شہر کے صاف ستھرے علاقے کے ایک بڑے ہوٹل میں لے آیا۔ رجسٹر پہ نام لکھاتے ہوئے تجمل نے اپنا نام پھر بدل دیا تھا۔ اُس نے ہم سب کے نام بھی مختلف لکھوائے۔ وہ ایک بڑا ہال جیسا کمرہ تھا۔ روشن اور ہوادار۔ فرنیچر بھی خاصا تھا۔ ایک گوشے میں کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ زورا، ماچھی اور پیرو کے چہروں پہ سفر کی دھول جمی ہوئی تھی۔ بال بھی گرد و غبار میں اَٹے ہوئے تھے لیکن وہ کمرے میں قدم رکھتے ہی نہائے دھوئے بغیر کرسیوں پر پھیل گئے اور پیرو شور مچانے لگا کہ اُسے سخت بھوک لگی ہے۔ تجمل نے ہوٹل میں کھانے کی جتنی قسمیں تھیں، سب کی سب منگوا لیں۔ اتنی چیزیں آگئیں کہ کرسیوں کے درمیان میں رکھی ہوئی چھوٹی میز پر پلیٹیں رکھنے کی جگہ نہیں رہی تھی۔ بھنے ہوئے مرغ، بریانی اور گوشت۔ وہ کھانے پر اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے برسوں کے بھوکے ہوں۔ پیرو کہہ رہا تھا کہ جب اُسے تار ملا تو گاڑی کا وقت نہیں تھا۔ راستے میں انھوں نے صرف چائے اور بسکٹ پہ گزارا کیا۔ گاڑی جگہ جگہ لیٹ ہونے پر پیرو کا ٹی ٹی سے جھگڑا بھی ہو گیا۔

وہ بتا رہے تھے کہ ہمارے بمبئی سے آنے کے بعد پولیس انھیں مہینے ڈیڑھ مہینے تک تنگ کرتی رہی۔ پیرو کے علاوہ اور آدمی بھی انھوں نے دوبارہ پکڑ لیے تھے۔ ہر جگہ سے پولیس کا عملہ تبدیل کر دیا گیا تھا۔ انھوں نے از سرِ نو تفتیش شروع کرنی چاہی تھی۔ حوالات میں پیرو کے سوا تقریباً ہر آدمی کو بھوکا پیاسا رکھا گیا اور انھیں شدید اذیتیں پہنچائی گئیں لیکن کسی نے زبان نہیں کھولی۔ تیواڑی کے اڈوں

پر ہیرو نے یکے بعد دیگرے اپنے آدمی بھیجے تھے۔ اس کی وجہ ایک تو یہی تھی کہ پولیس مسلسل نظر رکھے ہوئے تھی۔ دوسرے تیواڑی کے بچے کھچے چند آدمی گڑبڑ کرنے کی کوشش کر رہے تھے، بعد میں اُن میں سے کئی بمبئی سے بھاگ گئے، کئی نے ہیرو کے پاس آ کے چاقو پھینک دیے۔ ہیرو کے آدمیوں نے اُن میں سے ایک ایک کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ تیواڑی کے خاص اڈے پر ہیرو نے اپنے ایک پرانے دوست پیرو کو بھیجا تھا جس نے شادی کرنے کے بعد چاقو نہ اٹھانے کی قسم کھائی تھی اور بمبئی کی ایک بستی میں خاموشی کے دن گزار رہا تھا۔ ہیرو نے چند دنوں کے لیے اُس سے مدد کی درخواست کی تو وہ واپس آ گیا لیکن اُس نے چاقو کو پھر بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اُس کا کام تیواڑی کے وسیع علاقے پہ کام کے آدمی متعین کرنا تھا۔ کبھی اس میں مزاحمت کا اندیشہ ہوا تو اُس نے خود جانے کے بجائے اپنے آدمیوں کو بھیج دیا۔ وہ صرف ایک مہینے تک وہاں رہا، پھر واپس اپنے گھر چلا گیا اور دوبارہ کارخانے میں فورمین کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ اُس نے ہیرو کی دی ہوئی ایک بڑی رقم بھی لینے سے انکار کر دیا تھا۔ تین مہینے پہلے تیواڑی کے تمام اڈے ہیرو کے پاس آ گئے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اڈوں سے متعلق علاقوں کے تمام لوگ بہت خوش ہیں جیسا کہ ہمارے سامنے اُن کے درمیان طے ہوا تھا، سارا انتظام اُسی طرح چل رہا ہے۔ پہلے جو اڈے تیواڑی اور ہیرو میں سے کسی کے پاس نہیں تھے، وہ جوں کے توں تھے۔ نہ انھوں نے درمیان میں آنے کی کوشش کی نہ ہیرو اور اُس کے آدمیوں نے اُن سے حجت کی۔ میرے دل میں آیا، پوچھوں کہ مستانہ کے اڈے کا کیا ہوا لیکن میں خاموش رہا۔ ہیرو کہہ رہا تھا کہ اُس نے اپنا اڈا ماچھی کے سپرد کر دیا ہے اور خود اِدھر اُدھر علاقوں میں گھومتا رہتا ہے مگر اُس کی اصل بیٹھک اب بھی اپنے پرانے علاقے میں ہے۔ شام تک وہ بمبئی کی باتیں کرتے رہے۔ اُن میں سے کسی کو بھی اپنے گرد و پیش کی خبر نہیں تھی۔ ایک خاموش ہوتا تھا تو دوسرا بولنے لگتا تھا۔ دوسرا کچھ بولتا تھا تو تیسرا اُسے ٹوک دیتا تھا۔ جھل توجہ سے اُن کی باتیں سنتا اور درمیان میں دخل دیتا رہا۔ کمرے میں اندھیرا ہونے لگا تھا۔ جھل نے اُٹھ کے بتی جلائی تو وقت گزرنے کا احساس ہوا اور ہیرو نے زورا کو ڈانٹ کے چپ کر دیا۔ "سالا زبان کو بریک مار۔ ابھی تم نے پوچھا بھی ہے کہ جھل بھائی نے اپن کو کیوں یاد کیا ہے۔ سچ دادا! راستے بھر دل دھکڑ پھکڑ کرتا رہا کہ جھل بھائی نے اتنے دن بعد اچانک اپن کو کیوں پکارا ہے۔ تار میں جیسلمیر لکھا تھا اور بلایا تم نے اِدھر بیکانیر میں تھا۔ اپن اسی بارے سوچتا رہا۔ اِدھر آ کے اور تم کو دیکھ کے اپن کا جی اجلا ہوا۔ ایسی کیا بات ہے جھل بھائی، راستے میں یہ جانگلو لوگ بولتے تھے کہ ضرور جھل دادا پہ کوئی مصیبت آ پڑی ہے۔ اپن بولتا تھا کہ جھل بھائی سالا اتھلے مافق جنگلی نہیں ہے۔ تم سالا ہاتھ چلاتے ہو، پورا جسم نچاتے ہو، وہ اور ہاتھ کم چلاتا اور بھیجے کی پھرکی زیادہ گھماتا ہے۔ بولو دادا! ایسا کیا ہے؟"

"ہیرو!" جھل نے سکون سے کہا۔ "مجھے تمہاری ضرورت پڑ گئی ہے۔"

"ایسا ہے۔" ہیرو اُچھل کے بولا۔ "بولو دادا!"

"تم کو جیسلمیر جانا ہے۔"

"تم جہنم میں بولو۔"

"میں نے تم کو جان کے بلایا ہے، تم اِدھر خود بھی نہیں تھے، پھر تم . . ."

"کام بولو جھل بھائی!" اُس نے تیزی سے کہا۔ "پر اپن حیران ہے سالا ایسا کیا کام ہے جو تم نہیں کر سکتا۔"

"ایسا ہی ہے ہیرو دادا!"

"اپن کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"میں تم کو نہیں بلاتا، پر میرا اُس طرف جانا ٹھیک نہیں تھا، جدھر تم کو جانا ہے۔ اگر میں جیسلمیر پہنچتے ہی اُدھر چلا جاتا، تب دوسری بات تھی پر . . ."

"صاف بات بولو جھل بھائی!"

جھل نے ہیرو کو وہاں کچھ نہیں بتایا۔ وہ اُسے لے کے کمرے سے باہر چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی زورا اور ماچھی مجھ سے پوچھنے لگے کہ جھل کو کیا پریشانی ہے۔ میں اُن سے کیا کہتا۔ میں نے کہا تم خود اُس سے پوچھ لینا۔ وہ اضطراب سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے اور پھر مجھے لے کے باہر آ گئے۔ ہوٹل پُر رونق علاقے میں واقع تھا۔ بازار میں دکانیں جگمگا رہی تھیں۔ زورا اور ماچھی چپ چاپ سے ہو گئے تھے۔ میں نے اُن کی خاموشی توڑنے کے لیے مارٹی کے بارے میں پوچھا اور مجھے حیرت ہوئی کہ زورا جولین کے متعلق سب کچھ جانتا ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ مارٹی روز صبح پہلے وہاں جاتا ہے پھر اڈے پر آتا ہے یا علاقے میں گھومتا ہے۔ ہیرو بھی اُن کی خیر خبر لینے کے لیے آدمی بھیجتا رہتا ہے۔ دو ایک بار وہ خود بھی گیا تھا۔ باڑے کے بہت سے آدمیوں کو معلوم ہے کہ میرا اُس گھر سے کیا تعلق رہا ہے۔ لوگ نئی نئی باتیں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ راجا کی ماں بمبئی میں ہے، وہ اُس سے ملنے ضرور آئے گا۔ میری ماں سے اُن کی مُراد جمیا تھی۔ میں نے تردید نہیں کی۔ وہ گھر جا کے میرے بارے میں پوچھتے ہوں گے تو جمیا مجھے اپنا بیٹا ہی کہتی ہو گی۔ زورا کہتا تھا کہ مارٹی بہت بدل گیا ہے، وہ باتیں بھی کم بناتا ہے، ہر وقت کچھ سوچتا رہتا ہے، باڑے میں آ کے روز پابندی سے دو تین گھنٹے ورزش کرتا ہے اور بَلَم لاٹھی، چاقو، پٹے وغیرہ کی مشق کرتا رہتا ہے۔ مارٹی کے ہاتھ میں بہت پھرتی آ گئی ہے۔ ماچھی پان کھانے اور سگریٹ لینے کے لیے ایک دکان پہ ٹھہرا تو زورا نے مجھے اُس سے کچھ دور لے جا کے سرگوشی کی کہ اگر میں اپنے تک محدود رکھنے کا وعدہ کروں تو وہ مجھ سے ایک بات کہنا چاہتا ہے۔ میں نے جلدی سے وعدہ کر لیا۔ اُس نے بتایا کہ کانتے ایک مہینے پہلے بمبئی آیا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر کسی اڈے پر نہیں گیا۔ جولین کے گھر میں ٹھہرا رہا۔ اُس نے مارٹی کے ذریعے صرف زورا کو بلایا تھا اور مارٹی اور زورا دونوں کو قسم دلائی تھی کہ وہ اُس کی آمد کا ذکر کسی سے نہیں کریں گے۔ کلکتے میں بھی وہ کسی سے کہہ کے نہیں آیا تھا۔ زورا کہتا تھا کہ کانتے کی آمد سے جولین بہت خوش نظر آتی تھی، وہ صرف تین دن وہاں ٹھہرا۔ اُس کی زبانی زورا کو معلوم ہوا تھا کہ میں جھل کے ساتھ سفر پہ گیا ہوں اور ہماری واپسی کا وقت طے نہیں ہے۔ زورا نے کانتے سے کیے ہوئے عہد کا پورا پاس کیا۔ کسی کو نہیں بتایا، نہ مارٹی نے کسی سے کچھ کہا۔ زورا نہ جانے کیا کیا بتا رہا تھا۔ میرا ذہن جھل اور ہیرو میں اُلجھا ہوا تھا۔ وہ راستے میں ہمیں کہیں دکھائی نہیں دیے تھے۔ میں نے ہوٹل واپس چلنے کو کہا۔ وہ دونوں بھی یہی چاہتے تھے مگر ہوٹل میں جھل اور ہیرو موجود نہیں تھے۔ رات گئے خاصی دیر بعد وہ واپس آئے۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے ہیرو کا چہرہ دیکھا، وہ تمتما رہا تھا۔ آنکھوں میں تیز چمک تھی۔ اُس نے جھپٹ کے مجھے گلے سے لگا لیا اور دیر تک چمٹائے رہا۔ میں نے خود کو بہت روکا لیکن پھر میری سانسیں اکھڑنے لگیں اور آنکھیں پگھلنے لگیں۔ ہیرو نے مجھے اور زور سے جکڑ لیا اور میرے ساتھ خود بھی رونے لگا۔

وہ تینوں صبح کی گاڑی سے جیسلمیر روانہ ہو گئے۔ ہم انھیں اسٹیشن چھوڑنے بھی نہیں گئے۔ جھل جس وجہ سے وہاں جانا نہیں چاہتا تھا، وہی وجہ میرے ساتھ تھی۔ یہ جاننے کے باوجود میں نے اُن سے بہت منت کی کہ وہ مجھے بھی ساتھ لے چلیں لیکن نہ جھل تیار ہوا، نہ اُن میں سے کوئی۔ جھل نے مجھے کچھ بولنے کی اجازت نہیں دی، ہیرو نے بھی مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو اُس نے درشت لہجے میں مجھے خاموش رہنے کی تاکید کی اور بولا کہ مجھے ہیرو کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ چلے گئے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ جھل جیسلمیر سے قریب ہی کسی گاؤں یا قصبے میں ٹھہرے گا لیکن وہ اسی ہوٹل میں پڑا رہا۔ ہیرو نے چلتے ہوئے امید ظاہر کی تھی کہ وہ ایک ہفتے کے بعد یا تو خود آ جائیں گے یا ہیرو، ماچھی اور زورا میں سے کسی کو ایک وقت کے لیے یہاں بھیج دے گا۔ گویا ایک ہفتے سے زیادہ بھی لگ سکتا تھا۔ ایک مہینہ، ایک سال، یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کبھی واپس نہ آئیں۔ پتہ نہیں، وہاں جا کے وہ کیا کریں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے رانا کی حویلی دیکھی تھی اور اپنے کانوں سے منیر علی اور جوالا کی باتیں سنی تھیں۔ حویلی میں داخل ہونا اور رانا تک پہنچنا اُن کے لیے آسان نہیں تھا۔ سات مہینے گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں نہ جانے کیا ہو گیا ہو۔ ہم نے جس قدر احتیاط کی تھی، اگر انھوں نے نہ کی، اُن سے ذرا سی بھی چوک ہو گئی۔ رانا یا اُس کے آدمیوں کو ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو وہ زندگی بھر اُس کا پتہ نہیں چلا سکیں گے۔ ہیرو کو بتاتے ہوئے جھل کے ذہن سے کوئی بات رہ گئی ہو، انھوں نے عجلت کر دی یا تیزی دکھا دی تو جیسلمیر سے اُن کا واپس آنا مشکل ہو جائے گا۔

ضروری نہیں کہ وہ جیسلمیر میں نہ ہو، رانا نے اُسے کہیں دور رکھا ہو، وہ اب اُس کی حویلی ہی میں نہ ہو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ حویلی کے تمام آدمیوں کو یہ بات معلوم ہو مگر چند خاص آدمیوں کو ضرور معلوم ہو گی۔ جوالا نے رانا کے جن جن خاص آدمیوں کے نام لیے تھے، اُن میں سے چند کو یقیناً اُس کے بارے میں علم ہو گا کہ وہ اب کہاں ہے۔ وہ حویلی میں کس عذر سے داخل ہوں گے اور جا کے کیا کہیں گے۔ رانا کے کسی خاص آدمی کو اعتماد میں لیں گے مگر پھر وہ رانا تک کس طرح پہنچیں گے اور رانا تک پہنچ بھی گئے تو اُس سے کس طرح معلوم کریں گے اور حویلی کا خاص آدمی آسانی سے اُن کے اعتماد میں کیوں آ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اُسے صرف اس قدر معلوم ہو کہ وہ اُس رات اُسے وہاں سے لے جانے میں شریک تھا، بعد کے حال سے وہ ناواقف ہے۔

اور ابھی اس بات کی تصدیق کہاں ہوئی تھی کہ اُسے رانا ہی کے آدمی لے گئے ہیں، کوئی اور بھی ہو سکتا ہے، رانا کی طرح جیسلمیر کا کوئی اور رئیس یا کوئی اور۔ اگر وہ رانا ہی تھا تو اُس کے آدمی مولوی صاحب کو کیوں اپنے ساتھ لے گئے۔ ضرور مولوی صاحب نے مزاحمت کی ہو گی اور اُن میں سے کسی کو دیکھ لیا ہو گا اور وہ اس خدشے کے پیشِ نظر مولوی صاحب کو بھی لے گئے کہ اگر انھیں چھوڑ دیا گیا تو وہ اُن کے جاتے ہی یا ہوش میں آتے ہی شور مچا دیں گے اور رانا کے لیے اور مشکل پیدا کر دیں گے۔ یا رانا نے انھیں مولوی صاحب کو ساتھ لانے کی ہدایت کی ہو۔ رانا کا خیال، جیسا کہ اُس نے مولوی صاحب کو بار بار پیغام بھجوا کے ظاہر کیا تھا، یہی ہو اور وہ مولوی صاحب کی موجودگی میں ضروری سمجھتا ہو کہ وہ سامنے ہوں گے تو انھیں ہموار کرنا اتنا دشوار نہیں ہو گا۔ مولوی صاحب کو ختم کرنے کی صورت میں صبح محلے بھر میں دہشت پھیل جاتی اور منیر علی شاید احتیاط کا دامن چھوڑ دیتے، وہ برسرِ عام پولیس اور شہر کے لوگوں کی توجہ رانا کی طرف مبذول کر دیتے۔ ظاہر ہے، مولوی صاحب آمادہ نہیں ہوئے۔ ہو جاتے تو قرب و جوار میں کسی کو نظر آتے۔ وہ اُس کے ساتھ پھر کہاں گم ہو گئے۔ رانا نے اتنی مدت تک انھیں کوٹھری میں بند نہیں رکھا ہو گا۔ وہ نہیں مانے ہوں گے تو رانا کے آدمیوں نے انھیں راستے سے ہٹا دیا ہو گا اور وہ اکیلی رہ گئی ہو گی مگر وہ اتنی نازک ہے، اتنی باتیں اُس کی آنکھوں نے کیسے برداشت کی ہوں گی۔

جھل کو ہیرو کو بلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اُس سے کہا تھا کہ وہ واپس چلا جائے، مجھے تنہا چھوڑ دے، میں خود اُسے ڈھونڈ لوں گا، مجھے کہیں واپس نہیں جانا ہے جو مجھے وقت کی تنگی کا احساس ہو۔ میں اکیلا ہوتا تو رانا کی حویلی میں ضرور داخل ہو جاتا۔ میں رانا کے ہاں ملازم ہو جاتا۔ میں سیدھا اُس کے پاس جا کے کہتا کہ وہ رستم یا سہراب میں سے کسی کی جگہ مجھے دے دے۔ وہ میرے اس مطالبے پر ہنستا، مذاق اُڑاتا اور رستم و سہراب کو بلا کے مجھے اُن کے سامنے کر دیتا۔ مجھے یقین تھا کہ اُن میں سے کوئی بھی چند منٹوں سے زیادہ کا نہ ہوتا۔ پھر مجھے رانا کے ہاں ملازمت کرنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آتی۔ وہاں رہ کے اُن لوگوں سے قریب رہ کے کسی نہ کسی دن مجھے پتہ چل ہی جاتا کہ وہ کہاں ہے۔ ہم منیر علی کے ہاں تین دن ٹھہرے تھے۔ اگر کوئی شخص مجھے وہاں دیکھ کے کسی کو یہ بتا دیتا کہ ہم مولوی صاحب کے رشتے دار کی حیثیت سے منیر علی کے مہمان رہے تھے تو پھر شاید ایک لمحے بھی میرا وہاں رہنا ممکن نہ ہوتا۔

اور کیا عجب، پیرو جب واپس آئے تو اُس کے ساتھ وہ بھی موجود ہو۔ وہ یوں خالی ہاتھ تو نہیں آئے گا۔ بچّل نے کچھ سوچ سمجھ کے ہی پیرو کو بمبئی سے بلایا ہے۔ وہ تیواڑی کے بعد بمبئی کا سب سے بڑا استاد تھا۔ اُس کی عمر بھی زیادہ ہے، نگاہ کا بہت تیز ہے۔ ماچھی بھی دیکھ بھال کے قدم اُٹھائے گا۔ اگر اُس میں یہ خوبی نہیں ہوتی تو وہ پیرو کے اس قدر قریب نہ ہوتا، نہ پیرو اپنا اڈّا اُس کے حوالے کرتا۔ زورا کو بھی ہر لمحے یہ خیال ہو گا کہ بعد میں میرے سامنے منہ دکھانے کی شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ وہ ضرورت سمجھیں گے تو بمبئی سے اور آدمی بلا سکتے ہیں۔ اُن کے پاس آدمیوں کی کمی نہیں، سارے جیسلمیر میں اتنے آدمی نہیں ہوں گے، جتنے پیرو کے ایک پاڑے میں ہوں گے۔ اگر وہ واقعی اُس کے ساتھ آگئی! ابھی اُنھیں گئے ہوئے دیر نہیں ہوئی تھی مگر مجھ سے ایک پل نہیں کاٹا جا رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ سے، ہر چیز سے ڈر لگ رہا تھا، سینہ بار بار کوئی نوچے لیتا تھا۔ رگوں میں جیسے برف سی جم گئی تھی۔ میں کبھی باہر جاتا، کبھی ہوٹل میں واپس آجاتا۔ اس طرح شام ہو گئی۔ وہ جیسلمیر پہنچ گئے ہوں گے اور ہماری طرح حویلی کے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے ہوں گے۔ رات کو بھی میں کھڑکی میں کھڑا یہی اندازے لگاتا رہا۔ ایک دن گزر گیا پھر دوسرا دن بھی گزر گیا۔ مجھے ہر لمحے یہ احساس ہوتا تھا کہ ہوٹل کی سیڑھیوں پر کوئی چڑھ رہا ہے حالانکہ اُنھوں نے ایک ہفتے بعد آنے کو کہا تھا مگر وقت کی اتنی پابندی تو تھی نہیں، وہ پہلے بھی آسکتے تھے۔ دروازے پر کوئی آہٹ ہوتی تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا۔ اے خدا، کاش وہ مل جائے، میں کرشنا جی کی دی ہوئی ساری دولت اُسی وقت لٹا دوں گا۔

ابھی ایک ہفتہ نہیں گزرا تھا، پانچواں دن تھا اور سہ پہر کا وقت۔ یکایک دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔ یہ ہوٹل کے کسی ملازم کی دستک نہیں تھی، میں بستر سے اُچھل پڑا۔ فرش پر قدم رکھتے ہی مجھے چکر سا آنے لگا مگر بچّل کے پہنچنے سے پہلے ہی میں نے ڈگمگاتے قدموں سے بھاگ کے دروازہ کھول دیا۔ سامنے پیرو کھڑا تھا۔ پیرو، ماچھی اور زورا۔ اُن کے پیچھے کوئی اور نہیں تھا اور اُن کے چہروں ہی پر سب کچھ لکھا ہوا تھا۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔

"بچّل بھائی!" پیرو کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ اُودر نئیں ہے۔"

بچّل اُسے تھامنے سے تھام کے اندر لے آیا۔ "اُودر اُس رات ہی رستم خاں نے اُس کو اور مولوی کو فرار کرا دیا تھا۔ اپن کچھ ساتھ لے کے نئیں آسکا دادا! پر ......"

اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے ایک ریشمی رومال بچّل کے آگے ڈال دیا۔ اُس میں دو آنکھیں لپٹی ہوئی تھیں۔ خون میں چُھپری تھڑی ہوئی دو بڑی بڑی آنکھیں۔۔!

اُن کے کپڑے میلے ہو گئے تھے اور چہروں پر دھول جمی ہوئی تھی اور وہ مختصر سامان اُن کے ساتھ نہیں تھا جو وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ بچّل نے دونوں آنکھیں جلدی سے رومال سے ڈھک دیں اور پیرو کو کھینچ کے پلنگ پر بٹھا لیا۔ "وہ کہاں ہے؟" اُس نے چیخ کر پوچھا۔

"وہ اُودر نئیں ہے بچّل بھائی!" پیرو نے آہستگی سے جواب دیا۔

"پر یہ.... تم کیا لے آئے؟"

"اپن کو خالی ہاتھ آتے اچھا نہیں لگا۔" پیرو گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

"پر تم.... تم اتنی جلدی کیسے آگئے؟" بچّل کا لہجہ اکھڑا ہوا تھا۔

"وہاں جاستی ٹھیرنے کی ضرورت نئیں پڑی بچّل بھائی!"

"زبان کھولو پیرو دادا!" بچّل اُس کا بازو جھنجوڑنے لگا۔

"کیا زبان کھولے۔" پیرو نے خود کچھ کہنے کے بجائے تھکے ہوئے لہجے میں ماچھی سے کہا۔ "بول دے ماچھی! بچّل بھائی کو سب بول دے۔"

بچّل نے اپنی سُرخ آنکھیں ماچھی کی طرف مرکوز کر دیں۔ ماچھی دروازے کے پاس سر جھکائے کھڑا تھا۔ "ابھی اپن کیا بولے۔" وہ بُدبُداتے ہوئے بولا۔

"بول دے سب بول دے۔" پیرو نے دہشت زدہ لہجے میں اُسے حکم دیا۔

"اپن اُودر گیا تھا۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد ماچھی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "پہلی رات تو دیوار کے ادر چکر کھاتا منگج مارتا رہا کہ اندر سامنے کے رستے سے جائے یا کسی اور جگہ سے۔ اُودر پہرے دار لوگ بہت تھا۔ پھر پیرو دادا بولا کہ اِس طرح ادر اُودر ٹکر مارنے سے اچھا ہے کہ اپن کو سیدھا رستم خاں کے پاس چل کے دیکھنا چاہیے۔ اندر جانے پر کوئی روک ٹوک نئیں تھا۔ پر سالا پوچھتا، آفرودز ایسا کیسے اندر گھس سکتا تھا۔ ساری رات اپن دیوار کے نزدیک باغ میں پڑا رہا۔ دادا نے پھر زورا کو باہر ٹھیرنے کو بولا اور دوسرا دن سویرے سویرے اُودر گیٹ پہ جا کے کھڑا ہو گیا۔ نوا رد آدمی دیکھ کے پہرے دار نے پوچھا۔ اپن نے رستم کا نام بولا۔ اُو دراُس کو سب جانتا ہے۔ رستم اپنے کوارٹر پر ہی تھا۔ اپن نے کُنڈی ماری تو باہر آیا اور اپن دونوں کو دیکھ کے آنکھیں پھاڑنے لگا۔"

"بوم مت مار۔" کام کی بات بول۔" پیرو نے دہاڑ کے درمیان میں دخل دیا۔ ماچھی کی زبان پھر رُکنے لگی تھی۔

"چھلنی نہ کر، بولتا رہ۔" بچّل نے بے چینی سے کہا۔

ماچھی چند قدم آگے بڑھ کے بچّل کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اپن رستم سے بولا کہ دُور سے آیا ہے اور تم سے کچھ خاص بات کرنا مانگتا ہے۔" اُس کی آواز رفتہ رفتہ ٹھیرتی گئی۔ وہ بتا رہا تھا کہ یہ سُن کے رستم خاں نے اُن سے پوچھا کہ وہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ انھوں نے دوبارہ وہی جواب دیا کہ وہ اُس سے ملنے کے لیے دُور دراز سے آئے ہیں۔ رستم خاں اُن کی بات سے مطمئن نہیں ہوا۔ دروازے پر جما ہوا سوچتا رہا۔ پھر وہ اُنھیں اندر گھر میں لے گیا۔ اُس نے اُن کے کہنے پر کسی قدر جھجک کے بعد دروازہ بند کر لیا۔ ماچھی اور پیرو جان بوجھ کے اُس کے پاس گئے تھے تاکہ گھر میں کسی اور کی موجودگی ممکن نہ ہو۔ رستم خاں کے گھر میں اُس کی بیوی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ لنگوٹ کسے ہوئے ورزش کرنے کی حالت میں تھا۔

دروازہ بند ہوتے ہی پیرو نے چاقو نکال کے لپنے اور اُس کے

درمیان فرش پر ڈال دیا۔ رستم خاں چونکا اور خشمگیں نظروں سے اُنھیں گھورنے لگا۔ پھر اُس نے بھی طاق سے اپنا چاقو اُٹھا کے پیرو کے چاقو پر پھینک دیا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید اتا پتہ پوچھے بغیر اُنھیں گھر میں نہ لے جاتا مگر وہ رستم خاں تھا، رانا مہتاب خاں کا سب سے قابلِ اعتماد آدمی۔ یہ اعتماد اُس نے اپنی بے باکی اور جرأت ہی سے حاصل کیا تھا۔ ماچھی کے کہنے کے مطابق اُس نے گفتگو میں پہل نہیں کی بلکہ اُن سے رسماً پوچھا کہ پہلے وہ ناشتہ کر لیں۔ پیرو کے انکار پہ اُس نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا۔ تاہم وہ پوری طرح چوکنا بیٹھا تھا۔ پیرو نے اُس سے مولوی صاحب اور کورا کے بارے میں سوال کیا۔ وہ اپنی جگہ اُچھل کے کھڑا ہو گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے سنبھل کے صاف منع کر دیا کہ وہ کسی ایسی لڑکی یا آدمی کو نہیں جانتا، وہ غلط جگہ آگئے ہیں۔ پیرو نے فوراً دونوں چاقو زمین سے اُٹھا لیے اور رستم کا چاقو اُس کی طرف اُچھال کے دوبارہ یہی سوال کیا۔ رستم خاں انکار کرتا رہا۔ پہلے ماچھی اور پیرو کا ارادہ تھا کہ کورا اور مولوی صاحب کی بات کرنے سے پہلے رستم کو بھروسے میں لیں اور اُسے اپنے ٹھکانے پر مدعو کرنے کے بہانے کسی تنہا جگہ لے جائیں گے مگر اُنھیں کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کمرہ بند تھا اور پھر اُن دونوں کے لیے اس اجنبی شہر میں اس سے مناسب جگہ کی تلاش آسان نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ رستم سے مولوی صاحب اور کورا کا ذکر کر چکے تھے۔ اب رستم خاں کا اُن کے ساتھ باہر جانا ممکن نہیں تھا۔ انھیں جو بات کرنی تھی، وہیں کرنی تھی۔

پیرو نے حتمی لہجے میں اُس سے کہا کہ وہ کورا کا پتہ پوچھے بغیر یہاں سے نہیں جائے گا۔ رستم خاں درشتی پر اُتر آیا۔ اُس نے اُن دونوں کو حکم دیا کہ وہ اُس کے گھر سے فوراً نکل جائیں ورنہ نتیجہ بُرا ہو گا۔ اُس نے اپنے چاقو کو بوسہ دے کے کہا کہ وہ دونوں حویلی سے زندہ واپس نہیں جائیں گے لیکن رستم خاں کی ہذیانی حالت دیکھ کے پیرو کو یقین آگیا تھا کہ مولوی صاحب اور کورا کے بارے میں وہ بہت کچھ جانتا ہے۔ وہ وہاں سے نہیں اُٹھے۔ پیرو نے رستم خاں کو للکار کے اُس پر وار کر دیا۔ ماچھی کہہ رہا تھا کہ وہ خود رستم خاں سے نمٹنا چاہتا تھا، اُس کا خیال تھا کہ پیرو نے بہت دنوں سے چاقو نہیں اُٹھایا ہے، ہاتھ کھلنے میں شاید دیر لگے۔ کوئی بھی اُلٹی سیدھی بات ہو سکتی تھی مگر پیرو نے اُسے ایک طرف خاموش بیٹھے رہنے کی ہدایت کر دی تھی۔ رستم خاں نے کئی پینترے بدلے مگر اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کے سامنے بمبئی کا سب سے بڑا اُستاد پیرو ہے۔ دو تین ہی بار لوٹ پلٹ کے پیرو نے اُس سے چاقو گروا لیا۔ جیسے ہی رستم خاں بے بس ہوا، پیرو نے اپنا چاقو بند کر لیا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ رستم خاں جھپٹ کے اُس کے گلے لگ گیا اور اُس کی اُنگلیاں چومنے لگا اور کچھ کہے سُنے بِنا دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔ وہ دونوں وہیں بیٹھے رہے۔ رستم چند ہی منٹ بعد واپس آگیا۔ اُس کے ہاتھوں میں پیتل کی ایک لُٹیا اور کٹورے تھے۔ لُٹیا سے

مغزیات پڑا ہوا دودھ لوٹ کے اُس نے ایک کٹورا پیرو کے آگے کر دیا۔ پیرو نے اُس میں سے چند گھونٹ پیے ہوں گے۔ باقی دودھ رستم نے ایک ہی سانس میں حلق سے اُتار لیا اور پیرو کا ہاتھ سینے سے لگا کے پوچھنے لگا کہ وہ کون ہیں اور اُس کا پتہ اُنھیں کس نے دیا ہے۔ پیرو نے پھر اپنی بات دُہرائی کہ جب تک رستم اُس کے سوال کا جواب نہیں دے گا، وہ اپنے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔

رستم نے پھر ضد نہیں کی اور اقرار کیا کہ اُس رات وہ مولوی صاحب اور کورا کو لے کے آیا تھا۔ وہ چھ آدمی تھے۔ اِس کا منصوبہ انھوں نے کئی دن پہلے بنا لیا تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ محلّے کے لوگ تراویح پڑھ کے جلد ہی سو جاتے تھے۔ آدھی رات کے وقت وہ مولوی صاحب کے گھر میں اُترے۔ مولوی صاحب نے بساط بھر مزاحمت کی۔ کورا اُن لوگوں کو دیکھ کے بے ہوش ہو گئی تھی۔ رانا نے اُنھیں حکم دیا تھا کہ مولوی صاحب کو نہ تو ختم کریں، نہ چھوڑ کے آئیں۔ وہ رانا کی ہدایت کے مطابق شہر سے دُور اُس کی جاگیر پر واقع ایک حویلی میں اُنھیں لے آئے۔ یہاں رانا کبھی کبھار سیر و تفریح اور شکار کے لیے ٹھیرتا تھا۔ خاص خاص موقعوں کے لیے رانا کی نگاہ اسی حویلی پر جاتی تھی۔ حویلی کے آس پاس باغات اور کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ یہ سب کے سب رانا کی ملکیّت تھے۔ حویلی میں آکے رستم نے پہلی بار کورا کو غور سے دیکھا۔ کورا کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور وہ ایک کونے میں سکڑی ہوئی بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ مولوی صاحب بُری طرح رو رہے تھے۔ وہ رستم کے پیروں پر گر گئے اور گڑگڑانے لگے کہ یہ لڑکی کسی کی امانت ہے۔ مولوی صاحب نے رستم کو خدا رسول کا، اُس کی ماں بہن کا واسطہ دیا۔ ماچھی کہہ رہا تھا، رستم خاں نے اُنھیں بتایا کہ کورا کو دیکھ کے اُس کا جی گھبرانے لگا۔ کورا پھولوں کی طرح نازک تھی۔ وہ اُسے دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ جب وہ مولوی صاحب اور کورا کے کمرے کی کُنڈی لگا کے باہر کی طرف آیا تو اُسے اپنے قدم بوجھل محسوس ہوئے۔ اُس کا ارادہ متزلزل ہو چکا تھا۔ اُس نے اشارتاً اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے شاگرد سہراب سے کیا تو اُس نے توقع کے خلاف اُس کی حمایت کی۔ وہاں کئی آدمی تھے۔ ایک قاصد رانا کے پاس اطلاع دینے کے لیے روانہ کر دیا گیا تھا اور اب رانا کسی بھی وقت وہاں پہنچ سکتا تھا مگر اُس کی آمد صبح کے بعد ہی متوقع تھی۔

چلتے وقت رانا پہلی بار عمارت میں دُور تک رستم کو رخصت کرنے آیا تھا۔ اس اہتمام سے اُسے یہ جتانا مقصود تھا کہ وہ ایک اہم کام کے لیے جا رہا ہے۔ رانا نے رستم اور اُس کے ساتھیوں سے وعدہ کیا تھا کہ واپسی پر وہ اُن کا منہ موتیوں سے بھر دے گا۔ رستم کو اس حقیقت کا پوری طرح احساس تھا کہ رانا اُسے بہت نازک اور پیچیدہ وقت ہی طلب کرتا ہے۔ اُس نے رستم کو بطورِ خاص یہ ہدایت کی تھی کہ مولوی صاحب اور کورا کو اُس کے خاص کمرے میں رکھا جائے اور رستم کے سوا کوئی کورا کے بدن کو ہاتھ

لگائے، دوسروں سے جس حد تک ہو سکے، اُس کی پردہ پوشی کی جائے چنانچہ تم ہی اُسے اپنے کندھے پر ڈال کے مکان سے باہر لایا تھا، اُس نے اس کا بدن چادر سے ڈھک دیا تھا۔ اِس طرح کہ اُس کا چہرہ دوسروں سے چھپا رہے۔ حویلی کے اُس کمرے میں بھی جہاں مولوی صاحب اور کورا بند تھے، سہراب کے سوا اُس نے کسی کو آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

وہ دونوں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ حویلی کے صحن میں بیٹھے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہے۔ وقت گزرا جا رہا تھا۔ اندھیرا چھٹنے میں ابھی دیر تھی مگر اُنھیں جلد ہی کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ رستم سوچتا رہا پھر وہ اچانک اپنے ساتھیوں کے درمیان سے اُٹھ گیا۔ اُس نے اُنھیں یہ تأثر دیا کہ وہ حفظِ ماتقدم کے طور پر ایک بار پھر بند کمرے کا جائزہ لینا چاہتا ہے۔ رُستم نے اندر جا کے جتنے بھی روپے اُس کے پاس تھے اور اپنے گلے میں پڑی ہوئی سونے کی زنجیر وغیرہ سب کچھ مولوی صاحب کے حوالے کر دیا اور اُن سے کہا کہ جس وقت وہ اشارہ کرے اُسی لمحے وہ فرار ہو جائیں اور واپس اپنے گھر جانے کی کوشش نہ کریں بلکہ دوبارہ کبھی جیسلمیر شہر کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔ اُس نے اُنھیں یہ مشورہ بھی دیا کہ اگر آج رات وہ اشارہ دینے میں کامیاب نہ ہو سکے تو مولوی صاحب رانا سے خوش اطواری سے پیش آئیں اور بہ جبر و اکراہ اس سے کورا کی شادی پر رضامند ہو جائیں۔ رانا نے رُستم سے دوبارہ وضاحت کی تھی کہ اُس کا ارادہ کورا کو مستقل طور پر اپنے حرم میں لینے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ رستم متعجب تھا کہ رانا کو اس تاکید کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ اُسے شاید خدشہ ہو گیا تھا کہ کورا کو دیکھ کے رُستم کی نظر نہ بہک جائے یا وہ اُس کی آہ و بُکا سے متأثر ہو کے کوئی اور قدم نہ اُٹھا لے یا ممکن ہے رانا کے ذہن میں کوئی اور بات ہو۔ رُستم کو یہ بھی معلوم تھا کہ مولوی صاحب نے کورا کو رانا کے عقد میں دینے سے انکار کر دیا ہے، اگر مولوی صاحب اب بھی تیار نہ ہوئے تو کورا کا نصیب رانا کے ہاں آنے والی دوسری لڑکیوں سے مختلف نہیں ہو گا اور مولوی صاحب اب بھی آمادہ نظر نہیں آتے تھے۔

رُستم کی واپسی کے کوئی آدھے گھنٹے بعد اصطبل میں دفعتاً گھوڑے ہنہنانے لگے۔ وہ سب دوڑتے ہوئے باہر پہنچے۔ کئی گھوڑے زخمی تھے اور ہنہنا رہے تھے۔ اس موقع پر رُستم کے ذہن میں یہی ایک تدبیر آئی۔ اُس کی ایما پر سہراب گھوڑوں پر چاقو چلاتا ہوا ایک پل میں اندھیرے میں اوجھل ہو گیا تھا۔ باہر افراتفری مچ گئی۔ اسی ہڑبونگ میں سہراب نے اندر جا کے کنڈی کھول دی۔ جیسے ہی رُستم کو سہراب دوبارہ اصطبل میں دکھائی دیا، وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شور مچاتا ہوا اندر صحن میں واپس آیا۔ مولوی صاحب کے کمرے کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ ... کے آگے پیچھے کھیت اور باغات تھے، اُن پر گہرا اندھیرا مسلط تھا۔ رُستم نے مولوی صاحب اور کورا کو جس سمت بھاگنے کو کہا تھا وہ اور سہراب اُسی سمت گئے تھے۔ باقی لوگوں کو اُس نے دوسری سمتوں میں دوڑا دیا تھا۔ مولوی صاحب اور کورا رُستم کو پھر کبھی نظر نہیں آئے۔

رانا کے پاس جس وقت دوسرا قاصد پہنچا، وہ حویلی سے چل پڑا تھا۔ حالانکہ ابھی صبح پوری طور پر بیدار نہیں ہوئی تھی۔ قاصد نے اُسے راستے ہی میں جا لیا اور مولوی صاحب اور کورا کے غائب ہو جانے کی خبر سُنائی۔ رانا کو سکتہ سا ہو گیا۔ اُسے گمان ہوا کہ قاصد جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ آناً فاناً جاگیر پہ پہنچا تو حویلی کے پہرے داروں اور ملازموں کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ اُنھوں نے اُسے بتایا کہ مختلف آدمی مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئے ہیں۔ رانا کی دلبرداشتگی کم ہونے میں کئی دن لگ گئے۔ اس دوران ہر طرح اُس کی دل جوئی کی کوشش کی گئی۔ وہ اُن تمام آدمیوں کو ملازمت سے برخاست کر سکتا تھا مگر ایسا کر کے اور پریشانیاں مول لینے کا اندیشہ تھا۔ اُس نے کسی پر شبہے کا اظہار بھی نہیں کیا۔ شبہ کرتا بھی تو مولوی صاحب اور کورا واپس نہیں آ سکتے تھے۔ اُس نے قُرب و جوار کے تمام علاقوں میں اپنے دو دو آدمی بھیج کر دیکھے۔ کئی روز تک اُس کے آدمی مولوی صاحب کے محلّے میں گھومتے اور سُن گُن لیتے رہے۔ مولوی صاحب کے قریب کے لوگوں کی بھی نگرانی کی گئی۔ جن جن جگہوں پر رانا کا اثر و رسوخ تھا، وہاں وہاں مولوی صاحب کا حلیہ نقش کر دیا گیا اور بعض جگہ پولیس میں بھی۔ پولیس میں اس لیے کہ یہ مولوی صاحب کی تلاش کا ایک تو مؤثر ترین ذریعہ تھا، دوسرے اس طرح رانا پر کسی جانب سے کیے جانے والے شبہے کی بھی تلافی اور پیش بندی ہو سکتی تھی۔ رانا کی دلچسپی کی وجہ سے پولیس کے زیادہ فعال ہونے کا بھی امکان تھا جو محلّے والوں کے ہنگامے پر پہلے ہی سرگرم ہو چکی تھی۔ وہ پولیس کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ اِدھر یہ اطمینان حاصل تھا کہ مولوی صاحب کسی جگہ بھی پولیس سے رابطہ قائم کرنے اور رانا کو ملوث کرنے کی جسارت نہیں کریں گے۔ دو ایک مہینے تک رانا کی محفلیں سُونی رہیں۔ اُس نے ناسازیٔ طبع کا بہانہ کر کے خود کو گوشہ نشین سا کر لیا تھا۔

رانا مہتاب خاں اور اُس کی نوجوان بہن نے کسی تقریب میں کورا کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہاں سے واپس آتے ہی اُس نے رُستم کو طلب کر کے کورا کی فرمائش کر دی۔ رُستم نے ہامی بھری تھی کہ وہ اپنے آقا کی خواہش کی تعمیل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا لیکن جب رُستم نے مولوی صاحب کے گرد و پیش کے ماحول اور تمام حالات کا جائزہ لیا تو اُسے بہت سی اُلجھنوں کا اندازہ ہوا۔ مولوی صاحب متوسط درجے کے مسلمانوں کے علاقے میں رہتے تھے۔ رانا سے قریب و دُور کا تعلق رکھنے والے اور حویلی میں آنے والے کئی خاندان وہاں آباد تھے۔ رانا کے بہت سے ملازموں سے بھی اُن کا رابطہ تھا۔ اُن لوگوں میں رانا کا بھرم قائم رہنا چاہیے تھا۔ وہ ہزار احتیاط کرتا لیکن اگر کہیں ذرا سی بھی بات کُھل جاتی تو رانا کی بہت رُسوائی ہوتی۔ رُستم خاں کو علم تھا کہ رانا کے بارے میں شہر کے بہت سے مسلم گھرانے اچھی رائے نہیں رکھتے مگر کسی نے آج تک کُھلے عام اُس پر حرف زنی نہیں کی تھی۔ وہ رانا کے واقعات سُن کے ملال کرتے اور اُس سے کھنچے کھنچے سے رہتے تھے۔ بہ صورتِ دیگر اُن کا رویّہ نفرت میں بدل جاتا۔ پھر محلّے کے لوگ اپنی لڑکیوں کو سایوں سے چھپا کے رکھتے تھے۔ رُستم کو اس مجمے جمائے ماحول کے کسی گھر میں ہاتھ ڈالنا اچھا معلوم نہیں ہوا اور اُس نے رانا کو مشورہ دیا کہ اگر اُسے لڑکی اتنی ہی مطلوب ہے تو بہتر ہے وہ باقاعدہ پیام بھیجے۔ رانا جیسے صاحبِ حیثیت شخص کو کون رشتہ دینا پسند نہیں کرے گا۔ رانا ہر صورت میں کورا کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ رانا نے رُستم کی رائے سے اتفاق کیا اور براہِ راست سلسلہ جنبانی کی۔ رُستم کا گمان تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شاید رانا کے دل میں کورا کا خیال خود ٹھنڈا پڑنے لگے لیکن اُدھر سے جیسے جیسے انکار ہوتا گیا، رانا کی چنگاریاں تیز ہوتی گئیں۔

بچّل یا پیرو نے ماچھی کو بیچ میں کہیں نہیں ٹوکا۔ ماچھی اپنی زبان میں بڑبڑاتا رہا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ رُستم کی زبانی یہ سب جان کے اُنھوں نے اُس کی تصدیق کی ضرورت نہیں سمجھی۔ رُستم نے اپنے بیان کی شہادت کے لیے اُنھیں سہراب کے پاس لے جانا یا اُسے وہیں بُلانا چاہا مگر پیرو نے اُسے منع کر دیا۔ مولوی صاحب، رُستم کو اپنی منزل کا پتہ بتا کے نہیں گئے تھے۔ نہ ہی رُستم نے اُن سے کچھ پوچھا تھا کیونکہ مولوی صاحب اُسے اپنا صحیح پتہ کبھی نہ بتاتے۔ ماچھی اور پیرو اُسی وقت جیسلمیر سے واپس ہو سکتے تھے۔ اب مزید کہیں جانے اور کرید کرنے سے کوئی اور نتیجہ نکلنے کی اُمید نہیں تھی لیکن رستم نے چند روز ٹھیرنے کے لیے اُن پہ زور دیا تو اُنھوں نے اُس کی بات نہیں ٹالی کیونکہ وہ خود ایسا چاہتے تھے۔ اتنی دُور آ کے اُنھیں یوں واپس جانا مناسب نہیں لگا۔ اُنھوں نے اپنے بارے میں رُستم کا تجسس یہ بتا کے دُور کیا کہ وہ مدراس سے آئے ہیں اور اُنھیں مولوی صاحب کے ایک عزیز نے اُن کی کھوج کے لیے بھیجا ہے۔ رُستم کو اس بات پر حیرت تھی کہ وہ اتنے تیقّن کے ساتھ سیدھے اُس کے پاس کیسے آ گئے اور اُنھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ رُستم مولوی صاحب کے سلسلے میں کچھ جانتا ہے۔ سہراب کے سوا کسی کو یہ بات معلوم نہیں تھی۔ اُس رات اُن کے ساتھیوں نے بھی کسی موقع پر اُن سے اشارۃً اور کنایۃً اپنے شک کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پیرو کو بتانا پڑا کہ مولوی صاحب اپنے آبائی گھر سے رُوٹھ کے اپنی لڑکی کے ساتھ جیسلمیر آ گئے تھے۔ بہت دنوں سے اُن کے رشتے دار اُن کی تلاش میں تھے۔ پھر کسی نے بتایا کہ وہ اس طرف جیسلمیر میں ہیں۔ جب یہاں آدمی بھیجا گیا تو لوگوں سے پتہ چلا کہ مولوی صاحب اور کورا ایک عرصہ ہوا، ایک رات اِن حالات میں گھر سے غائب ہو گئے تھے اور اپنے ہمراہ سامان بھی نہیں لے گئے تھے۔ اُن کے متعلق اُن کے شناساؤں سے تمام حالات معلوم ہونے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اُنھیں کون لے جا سکتا ہے۔ پیرو نے رُستم کو بتایا کہ حویلی میں داخل ہونے سے پہلے اُس نے تمام معلومات حاصل کر لی تھیں اور سُنا تھا کہ رانا کی حویلی میں رُستم نامی ایک آدمی کا بڑا شہرہ ہے اس لیے کہیں اور بھٹکنے کے بجائے وہ اُس کے پاس چلے آئے۔ اُن کا اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا۔ رُستم اُس کی تاویل سے بڑی حد تک مطمئن ہو گیا اور اُس نے اُن دونوں کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔

وہ اپنا سامان لینے کی غرض سے باہر آئے تو زورا بے تابی سے اُن کا منتظر تھا اور دیر ہو جانے کے سبب خود اندر جانے کے ارادے باندھ رہا تھا۔ اُنھوں نے زورا کو شہر کے ایک سرائے نما ہوٹل میں ٹھیرایا اور حویلی میں رُستم کے گھر واپس پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ رُستم گھر میں اکیلا نہیں تھا، اُس نے پُرانے واقف کار کی حیثیت سے اُن کا تعارف اپنے چند خاص آدمیوں سے کرایا۔ وہ سہراب سے ملے۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے رُستم نے اچانک اپنے ساتھیوں کو باری باری ماچھی اور پیرو سے زور آزمائی کی دعوت دے دی۔ پیرو اور ماچھی اس کے لیے تیار نہیں تھے لیکن ابھی اُنھیں یہیں رہنا تھا۔ اُنھوں نے یہ صراحت کر دی تھی کہ اُن کا تعلق کسی اڈّے سے نہیں ہے بلکہ اُن کا مشغلہ اجناس کی تجارت ہے اور وہ زیادہ تر دیہات میں رہتے ہیں اور یہ جو کچھ ہاتھ پیروں میں تھوڑی بہت پھُرتی ہے، وہ اسی فراغت کی وجہ سے ہے۔ رُستم کی خواہش پر اُنھیں اُس کے ساتھیوں کے سامنے آنا پڑا۔ ہر چند کہ اُنھوں نے بہت پہلو تہی کی اور ہاتھ چلانے میں بھی احتیاط برتی لیکن کوئی بھی اُن کے آگے چند لمحوں سے زیادہ نہیں ٹھیر سکا۔ اُن کی چُستی اور تیزی دیکھ کے رُستم کے ساتھی اُن کے گرد جم کے بیٹھ گئے۔ اس موقع پر ماچھی اور پیرو نے رُستم سے دانستہ پنجہ آزمائی نہیں کی تھی۔ شام کو رُستم اُنھیں حویلی کی سیر کرانے لے گیا۔ اُنھوں نے پورا نقشہ ذہن میں محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ وہ ایک ایک جگہ حیرت اور اشتیاق سے دیکھتے جیسے یہ سارا منظر پہلی بار دیکھ رہے ہوں اور جیسے عمارت کا سارا نقشہ رُستم نے بنایا ہو اور وہ سب اُسی کی ملکیت ہو۔ رُستم اُن کا شوق دیکھ کے اُنھیں حویلی کے ہر گوشے میں لے گیا۔ وہ کہیں بھی آ جا سکتا تھا۔ جہاں کوئی ملازم یا حویلی کا باسی اُن کی راہ میں پڑتا، رُستم کو سلام کرنا ضروری سمجھتا۔ حویلی تین حصّوں میں منقسم تھی۔ ایک زنان خانہ، ایک مردان خانہ جس کے ساتھ مہمانوں کے ٹھیرنے کی بھی ایک بڑی عمارت تھی۔ تیسرا حصّہ ملازموں کے کوارٹر جیسے مکانات پر مشتمل تھا۔ پچھواڑے ایک باغ تھا اور ایک چمن، جہاں بارہ دری اور حوض بنا ہوا تھا۔ رُستم کے کہنے کے مطابق شام کو اور صبح عموماً رانا مہتاب خاں چمن میں کچھ وقت گزارتا تھا۔ دوپہر کو جب زنان خانے سے عورتیں اس طرف آتی تھیں تو کسی مرد کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ وہ شام ہی کا وقت تھا لیکن اتفاق سے رانا مہتاب خاں چمن میں موجود نہیں تھا۔ ماچھی اور پیرو اُسی کو دیکھنے کے لیے مضطرب تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ حویلی میں گھومتے ہوئے کسی جگہ اُس سے ملاقات ضرور ہو جائے گی۔ زنان خانے اور مردان خانے کے اُس حصّے کے سوا جہاں رانا مہتاب خاں کی موجودگی کا امکان تھا، رُستم نے اُنھیں حویلی کا کونا کونا تفصیل سے دکھایا۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد رُستم اُنھیں اپنے گھر سے کچھ دُور احاطہ کھنچی ہوئی ایک کُھلی جگہ لے گیا۔ یہاں وہ شام کو بھی آیا تھا۔ درمیان

میں ایک اونچا چبوترا تھا جو اکھاڑے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں رانا کے آدمی ورزش کرتے اور داؤ پیچ سیکھتے تھے۔ اب وہاں فرش پر دری بچھی تھی اور اطراف میں گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ سامنے سازندے بیٹھے تھے۔ اُن کے بیچ میں ایک ناچنے گانے والی لڑکی تھی۔ رُستم نے اُن سے کچھ کہے بغیر یہ اہتمام کیا تھا۔ محفل چند ہی لوگوں تک محدود تھی اس لیے کہ پیرو اور ماچھی نے پہلے ہی رُستم سے کہہ دیا تھا کہ اُنھیں بھیڑ بھڑکا پسند نہیں ہے۔ وہ جلد از جلد یہ محفل ختم کرنے کی جستجو میں تھے لیکن رُستم غزلوں کی فرمائش پہ فرمائش کر رہا تھا۔ بہت رات گئے یہ سلسلہ بند ہوا۔ اُنھیں ایک اور رات ضائع جانے کا افسوس تھا۔ گھر آنے کے بعد مدہوش رُستم دیر تک اُنھیں اپنے واقعات، حویلی کے تذکرے اور رانا کی باتیں سُناتا رہا اور وہ اُس سے کُرید کُرید کے پوچھتے رہے۔ اُن کی دلچسپی کا محور صرف رانا کا تذکرہ تھا اور جیسا کہ جوالا نے ہمیں بتایا تھا، رُستم نے بھی رانا کے متعلق اُنھیں وہی باتیں بتائیں۔ دوسرے دن صبح گیارہ بجے کے قریب وہ رانا کو دیکھ سکے۔ رُستم اُنھیں سہراب کے ہاں دوپہر کے کھانے کی دعوت پہ لے جا رہا تھا کہ رانا سے اُن کا آمنا سامنا ہوگیا۔ رانا کو دیکھ کے رُستم ٹھہر گیا اور اُس نے اُن دونوں کو اُس کی خدمت میں اپنے مہمان کے طور پر پیش کیا۔ رانا کو شاید اُن کی آمد کے بارے میں کچھ معلوم ہوگیا تھا۔ اُس نے خندہ پیشانی سے اُن کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ اگر رُستم کے گھر میں تنگی ہو تو اُنھیں مہمان خانے میں ٹھہرا دیا جائے۔ ماچھی تبار رہا تھا کہ رانا کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کے اُس کی آنکھوں میں خون اُترنے لگا۔ وہ سُرخ و سپید رنگ کا ایک دراز قد شخص تھا، اُس کا جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ عمر زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ باریک مونچھیں، سیاہ بال پیچھے کی طرف لوٹے ہوئے، سفید کُرتے اور پاجامے میں وہ ایک نواب لگ رہا تھا۔ رانا اُن کے لیے کوئی نیا آدمی نہیں تھا۔ اب تک وہ اُس کے بارے میں بہت سی باتیں سُن چکے تھے اور اُن باتوں سے اُنھوں نے اُس کے متعلق جو تصور قائم کیا تھا، وہ ہو بہو اُس کے مطابق تھا۔ رانا کے چہرے پر سب سے نمایاں اُس کی آنکھیں تھیں۔ بڑی بڑی سُرخ آنکھیں۔ اُن میں خون کے سُرخ ڈورے پڑے ہوئے تھے۔

شام کو وہ زورا سے ملنے کے لیے تنہا شہر جانا چاہتے تھے مگر رُستم اُن کے ساتھ ہوگیا۔ وہ بازاروں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے اُس سرائے کی طرف جا نکلے جہاں زورا ٹھہرا ہوا تھا۔ زورا نے اُنھیں دُور سے دیکھ لیا لیکن ماچھی کا اشارہ پا کے دُور دُور ہی رہا۔ اُن کا مقصد بھی زورا کو اپنے چہرے دکھانے تھے لیکن جب وہ سرائے سے قریب پان کی ایک دکان پہ پہنچے تو زورا اُن کے قریب آگیا۔ وہ رُستم کے سامنے ایک دوسرے کے لیے اجنبی بنے رہے۔ پھر پیرو نے رُستم کو اپنی طرف متوجہ کرلیا اور ماچھی کو زورا سے چند باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ اُس نے زورا سے کہا کہ کل دوپہر تک اگر وہ اُس کے پاس نہ آسکیں تو وہ بمبئی تار دے کے اور لوگوں کو بُلالے اور اگر وہ اُن لوگوں کے بمبئی سے آنے کے بعد بھی اُس کے پاس نہ پہنچ سکیں تو وہ سب جس طرح مناسب سمجھیں، حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کریں اور فرض کرلیں کہ ماچھی اور پیرو کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ اُدھر بیکانیر میں اُستاد مجھل اور لاڈلے کو فوراً مطلع کر دیا جائے۔ اُن کے ذہن میں بہت سی باتیں تھیں لیکن جو اُنھوں نے سوچ رکھا تھا، وہ آسان نہیں تھا۔ وہ تعداد میں صرف دو تھے اور رانا کی حویلی ایک چھوٹے سے قلعے کی حیثیت رکھتی تھی، گو وہ اُس قلعے کے اندر بیٹھے تھے۔ دوسری رات رُستم خاں پھر مجرے کا اہتمام کر رہا تھا۔ اُنھوں نے اصرار کرکے مجرا دوسرے دن کے لیے ملتوی کرا دیا۔ رُستم خاں نے اس محفل کے لیے خاص طور پر سبزی کے پاپلے بنوائے تھے۔ پیرو اور ماچھی نے اسی قدر پی کہ ہوش میں رہ سکیں البتہ رُستم خاں نے خوب پی، کھانا بھی بے تحاشا کھایا اور جلد ہی اپنے آپ سے دُور ہونے لگا پھر بھی رات کے ڈیڑھ دو بجے سے پہلے ماچھی کو رُستم کے گھر سے باہر نکلنے کا موقع نہیں مل سکا۔ حویلی میں ہر سُو خاموشی تھی۔ پیرو رُستم کے پاس ہی ٹھہرا رہا اور ماچھی رات کے اندھیرے میں کوارٹر سے باہر نکلا۔

اُنھوں نے رُستم کی زبانی رانا کی ایک چھوٹی بہن کے متعلق سُنا تھا۔ اُنھوں نے طے کرلیا تھا کہ راستے میں جتنے آدمی آئیں گے، اُن کے ساتھ وہ کوئی رعایت نہیں کریں گے اور کسی نہ کسی طرح اندر زنان خانے میں داخل ہونا ایسا مشکل مرحلہ نہیں تھا۔ وہاں دو ایک ہی چوکی دار ہو سکتے تھے۔ رانا بہرحال ایک جاگیردار تھا، کوئی درباری عہدے دار یا راجا نہیں۔ حویلی کے چاروں طرف پھیلی ہوئی دیوار اور اِدھر اُدھر دروازوں ہی پر بہت پہرے دار تھے تو اندر رکھوالی کی اتنی ضرورت کہاں تھی مگر جب اُنھوں نے آپس میں بعد کے مراحل پہ غور کیا تو رانا کی بہن کو لانے کا خیال مسترد کر دیا۔ اُسے بے شک اندر سے لایا جا سکتا تھا لیکن حویلی کی دیوار کے پار لے جانا تبھی ممکن تھا جب اُن کے پاس زیادہ آدمی ہوتے۔ اپنے دوسرے آدمیوں کی آمد کا انتظار کرنے میں دن بہت لگ جاتے۔ انھیں واپس مجھل کے پاس پہنچنا تھا۔

ماچھی نے خود کو ایک چادر میں لپیٹ لیا تھا، اندھیرے میں خود کو چھپاتا ہوا وہ حویلی کے پچھواڑے چمن میں آگیا اور بارہ دری کی محرابوں اور جالیوں کا سہارا لے کے زنان خانے کی چھت پہ پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس جگہ کی اُس نے پہلے ہی نشان دہی کرلی تھی۔ چمن زنان خانے اور مردان خانے کے سامنے درمیانی حصے میں تھا اور حوض کے پاس بارہ دری شاید اس خیال سے بنائی گئی تھی کہ حویلی کے دونوں حصوں کے مکینوں کو وہاں آنے جانے میں دشواری نہ ہو۔ ماچھی چھت چھت اور منڈیر منڈیر گزرتا ہوا مردان خانے تک آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔ چھت پر اُسے اِدھر سے اُدھر جانے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ اُسے کسی زینے کی تلاش تھی اور اُس کا خیال تھا کہ اس طرز کی عمارتوں کے زینے عموماً کھلے ہوتے ہیں، وہ کسی جگہ سے دوبارہ نیچے پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا مگر اس طرف جو زینہ نظر آیا

[د]روازہ بند تھا۔ ماچھی نے اُسے کھولنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام [...] نیچے اُترنے کے لیے کوئی اور مناسب جگہ ڈھونڈنے لگا۔ چھت سے [...]پائپ کی شکل میں کئی پرنالے باہر اُٹھے ہوئے تھے۔ اگر اُس کے پاس [...]تی تو وہ اُسے اُن سے باندھ کے نیچے اُتر سکتا تھا۔ پرنالا دونوں [...]ں سے پکڑ کے اور جسم نیچے گرا کے زمین پہ کودنے سے ہاتھ پیر ٹوٹ[نے] کا اندیشہ تھا۔ چھت بہت اُونچی تھی۔ اسی لحاظ سے پرنالے بھی اُونچے [...] چھت پر یہاں سے وہاں دبے قدموں کھسکتا، رینگتا رہا اور آخر اُس [...]یں یہی بات آئی کہ وہ جس راستے سے اُوپر آیا ہے، اُسی سے واپس ہو اور نیچے ہی کہیں سے مردان خانے میں جانے کا راستہ تلاش کرنے [کی کو]شش کرے۔ مجبوراً وہ بارہ دری کے ذریعے واپس چمن میں آگیا اور رکتا [...] درختوں کی آڑ لیتا مردان خانے کی طرف بڑھنے لگا۔ اُسے ایک لمبا چکر [...]ے عمارت کے سامنے آنا تھا لیکن یک بارگی اُس کے ذہن میں آیا کہ [...]وہ عمارت کے پچھلے ہی حصے میں کسی طرف راستے کا سراغ لگائے۔ [...]ں جگہ کمروں میں ہلکی روشنی تھی۔ مردان خانے کی عمارت میں پیچھے کی [...] اُسے ایک تنگ گلی سی نظر آئی۔ ماچھی اُسے گلی کہہ رہا تھا مگر وہ راہ داری [تھی۔ م]اچھی بے آواز چاپوں سے اُس کے قریب گیا۔ راہ داری دُور تک [جا]تی تھی اور اندر سے دائیں بائیں دوسری راہ داریوں سے مل جاتی تھی۔ چند [قدم چل]کے اُسے اندازہ ہوا کہ آگے کچھ فاصلے پر راہ داری کا دروازہ بند ہے، [کو]ئی آواز جھنکار نہیں ہے۔ ماچھی نے لوہے کے جالی دار دروازے [سے] جھانک کے دیکھا۔ مدھم روشنی میں چارپائی پر اُسے ایک شخص سویا ہوا [...] چارپائی کے سرہانے فرش پر دھیمی جلتی ہوئی لالٹین رکھی ہوئی [تھی۔ پا]س ہی ایک لاٹھی بھی دیوار سے ٹکی ہوئی تھی۔ ماچھی دیر تک سوچتا [رہا کہ کی]ا کرے۔ اگر وہ اُس شخص کو پکارتا ہے تو ضروری نہیں کہ سویا ہوا شخص [دروازہ] کھول کے باہر نکل آئے اور آہٹ کی تصدیق کرے اور اسی اثنا [میں ماچ]ھی اُس پہ کود پڑے۔ وہ اندر ہی رہ کے آوازیں لگا سکتا تھا کہ [...]ہے۔ اُسے خواہ مخواہ تنگ میں ڈال کے مزید کوئی اُلجھن پیدا نہیں [کرنی چا]ہیے تھی۔ ماچھی نے اُسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور آگے [بڑھنے] کا فیصلہ کرلیا۔ عمارت کی دیوار سے چپکتا ہوا وہ کونے تک پہنچ گیا۔ [...]یں جانب مُڑ کے عمارت کے ساتھ ساتھ ہی چلنا تھا۔ اُس نے [س]ر نکال کے دیکھا۔ اُدھر کوئی نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ چلنے کے بجائے [اُس] نے پنجوں کے بل بھاگنا شروع کر دیا اور چند ثانیوں میں دوسرے کونے [تک پہنچ گیا م]گر جب اُس نے وہاں سے جھانک کے دیکھا تو عمارت کے سامنے [...]ے میں خاصی روشنی تھی۔ اُسے چبوترے جیسے طویل و عریض صحن کے [...]پر دو تین آدمی بھی بیٹھے ہوئے نظر آئے، دو موٹریں بھی کھڑی تھیں۔ [...]ں سمجھ گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ رانا کی محفل ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ [ر]ات کا بڑا حصہ گزر چکا تھا۔ اُس نے رُستم سے سُنا تھا کہ کبھی

کبھی تو رات رات بھر ناچ گانا ہوتا رہتا ہے۔ باہر آدمیوں کی موجودی سے ظاہر تھا کہ اندر بھی بہت سے لوگ ہوں گے۔ پتہ نہیں کب یہ محفل ختم ہو۔ ممکن ہے صبح ہو جائے۔ وہ یہیں کھڑا رہ کے کب تک انتظار کر سکتا ہے، اس درمیان میں کسی پہرے دار یا کسی اور شخص کی نظر پڑگئی تو وہ اُس سے کیسے نمٹے گا۔ اس قسم کے کئی اندیشوں نے ماچھی کو اُلجھن میں مبتلا کر دیا۔ صحن سے دُور، درمیان کے درختوں کی آڑ میں اُسے بڑے دروازے پہ چہل پہل کے آثار نظر آرہے تھے۔ دروازہ بند معلوم ہوتا تھا۔ ماچھی نے واپس جانے کا ارادہ کیا مگر واپس مڑتے ہوئے اُس کے پیر اٹکنے لگے۔ وہ پیرو کو کیا جواب دے گا اور کل کا سورج نہ معلوم کس انداز سے نمودار ہو، یہ سوچ کر وہ رُک گیا اور اُس نے انتظار کرنے کا عزم کرلیا لیکن کسی ایسی جگہ چھپنا بہتر تھا جہاں سے وہ آنے جانے والوں کو دیکھ سکے اور عمارت کا وہ حصہ بھی قریب رہے جس طرف اُسے جانا تھا۔ ماچھی کو ان حالات میں ایک ہی راستہ دکھائی دیا کہ وہ عمارت اور چار دیواری کے بیچ کی کشادہ جگہ عبور کرکے چار دیواری کے ساتھ لگی ہوئی کیاریوں کی باڑھ میں خود کو چھپالے۔ اُس نے یہی کیا اور ایک ایسے مقام پر آکے بیٹھ گیا جہاں اُس کی نظروں کے سامنے سب کچھ عیاں تھا۔ آہٹ کے بغیر کوئی اُسے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اُس نے چادر سے اپنا جسم ڈھانپ لیا تھا۔ اس طرح وہ زمین پر اُٹھا ہوا مٹی کا ایک تودا معلوم ہوتا تھا۔ وہ وہیں موجود رہا۔ کچھ دیر بعد ہی شور اُٹھا۔ صحن میں ایک ساتھ کئی افراد آتے ہوئے دکھائی دیے۔ اُن میں رانا نہیں تھا۔ شیروانی پہنے ہوئے ایک دبلے پتلے شخص نے اُن چند لوگوں کو موٹر تک رخصت کیا۔ سب کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ پھر شیروانی والا شخص لوٹ آیا۔ اُس کے جاتے ہی سازندوں کی ایک ٹولی اندر سے آکے صدر دروازے کی طرف چلی گئی۔ ماچھی نے اپنی نگاہیں جمائے رکھیں۔ لوگ آئے اور چلے گئے۔ سازندوں کے ساتھ گانے والی نہیں تھی۔ اُسے شاید اندر روک لیا گیا تھا۔

تھوڑی دیر میں لمبے چوڑے پختہ صحن میں خاموشی غالب آگئی۔ وہ شخص بھی اُٹھ کے کہیں چلا گیا تھا جو آخری سرے پر پہرے داری کر رہا تھا۔ باہر کی روشنیاں مدھم پڑگئیں۔

ماچھی نے وہیں بیٹھے بیٹھے وہ جگہ آنکھوں میں محفوظ کرلی تھی جدھر سے لوگ باہر آئے تھے۔ صحن میں ہر آہٹ معدوم ہوگئی تو ماچھی اپنی جگہ سے اُٹھا۔ صحن میں اب بھی اتنی روشنی ضرور تھی کہ دُور سے کوئی بھی اُس کی نقل و حرکت دیکھ سکتا تھا۔ ماچھی صحن میں آکے لوٹتا پوٹتا عمارت سے قریب ہو جاتا مگر یہ ایک طویل اور تھکا دینے والا عمل تھا۔ صحن ہر طرف سے کھلا ہوا تھا۔ بڑے دروازے پر پہرے دار اب بھی جاگ رہے تھے، گو وہ بہت دُور تھے۔ خاصی دیر سوچنے کے بعد اُس نے خطرہ مول لینے کی ٹھان لی۔ اُس نے طے کیا کہ وہ کھلے طور پر صحن میں چلتا ہوا عمارت میں داخل ہوگا۔ دُور سے کسی نے اُسے دیکھا تو پہرے دار کا گمان کرے گا۔ عمارت

کے کونے تک وہ دیوار سے چپکتا ہوا آیا اور صحن میں قدم رکھتے ہی اُس نے اپنا جسم سیدھا کر لیا۔ اُس نے چادر اس طرح لپیٹ لی تھی کہ اُس کا جسم کم سے کم چھپ سکے۔ اُس کی چال بھی معتدل تھی۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا ہوا وہ سارا صحن عبور کر گیا اور اَن گنت کھمبوں پر ٹکے ہوئے والان میں آ گیا۔ یہاں اُسے معلوم نہیں تھا کہ کس طرف جانا ہے۔ اُس نے ایک اندازہ لگایا اور ایک کھلے ہوئے محراب نما دروازے میں اوجھل ہو گیا۔ اُس کا خیال درست تھا۔ دروازے کے دونوں اطراف دائیں بائیں راستے جاتے تھے۔ راستوں پر قالین بچھا ہوا تھا۔ اِردگرد کمرے بنے ہوئے تھے۔ ماچھی کو کسی روشن کمرے کی تلاش تھی مگر وہاں کئی کمروں کے اُوپر روشن دانوں سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ماچھی نے پہلے پڑنے والا دروازہ آہستہ سے ہلا کے دیکھا، وہ بند تھا۔ ماچھی نے چہرے پر چادر لپیٹ لی اور ہلکی سی دستک دی۔ دستک کا کوئی جواب نہیں ملا تو اُس نے دروازہ دھڑدھڑایا۔ اندر سے ایک گھبرائی ہوئی آواز اُبھری کہ کون ہے؟ ماچھی نے دستک جاری رکھی۔ اُسے محسوس ہوا کہ کوئی دروازے کی طرف آ رہا ہے۔ "کون ہے؟" کسی نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"رانا جی — رانا جی۔ ۔ ۔ ۔ وہ"۔ ماچھی نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔ اُسے احساس تھا کہ زیادہ نہیں بولنا چاہیے۔ اُس کا لہجہ بہت نمایاں تھا۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ ماچھی تیار کھڑا تھا۔ اُس نے ایک لمحے میں باہر سر نکالنے والے شخص کا سر دبوچ لیا اور اُس کا منہ بند کر دیا۔ دوسرے لمحے ماچھی کا چاقو اُس کی گردن پہ تھا۔ وہ وہی شخص تھا جو رانا کے مہمانوں کو رخصت کرنے موٹروں تک آیا تھا۔ اُس نے شیروانی اُتار دی تھی اور صرف کُرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ وہ گھگھیانے لگا۔ "رانا کے پاس چلو" ماچھی نے اُسے حکم دیا اور کہا کہ اگر اُس نے آواز نکالنے کی کوشش کی تو چاقو اُس کے سینے کے پار ہو گا۔ وہ نڈھال ہونے لگا۔ ماچھی نے اُس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ رانا کا کمرہ اُس شخص کے کمرے کے برابر ہی تھا۔ ماچھی نے پھر اُسے حکم دیا کہ وہ دروازے پر دستک دے اور اپنا نام بتائے۔ وہ شخص جھجکا لیکن چاقو کی نوک اُس کی گردن میں چبھی تو فوراً آمادہ ہو گیا۔ اندر سے رانا کی لڑکھڑاتی ہوئی گرج دار آواز گونجی۔ ماچھی کے دبوچے ہوئے شخص نے اپنا نام مکی میاں بتایا۔ رانا نے ناراضی سے پوچھا "کیا ہے؟" مکی میاں نے ماچھی کے ایما پر آواز لگائی "کوئی آیا ہے، دروازہ کھولیے۔"

"نہیں کھولتے" رانا نے اکھڑی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

مکی میاں نے پھر التجا کی "کھولیے سرکار! کام ہے ضروری کام ہے"۔

رانا کے ڈگمگاتے ہوئے قدموں کی گونج ماچھی کے کانوں میں پڑی تو اُس نے مکی میاں کے کندھے پر گردن کے قریب ضرب لگائی۔ مکی میاں وہیں بیٹھ گیا۔ ماچھی پوری طرح مستعد تھا۔ دروازہ کھلا تو رانا تمنچا لیے اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کا سراپا کسی شاخ کی طرح لہرایا۔ ماچھی نے ایک ہاتھ سے

اُس پہ جھپٹا مارا، دوسرے ہاتھ سے اُس کے منہ پہ وار کیا۔ تمنچا ز[...] رانا اتنا مدہوش نہیں تھا جتنا آواز سے معلوم ہوتا تھا۔ ماچھی کی[...] کے وہ فوراً اُٹھ گیا لیکن جب اُس نے اپنا تمنچا ماچھی کے ہاتھ[...] اُس کے بڑھتے ہوئے قدم ٹھٹھر گئے۔ "کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟" را[...] آواز ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ ماچھی اُسے جواب دی[...] جست لگا کے اُس لڑکی کے پاس جا پہنچا تھا جس نے اُس کے ا[...] چیخ بلند کی تھی کیونکہ وہ پلنگ پر برہنہ پڑی تھی۔ رانا جیسے ہی زمین[...] اپنا بدن چھپاتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ ماچھی نے اُسے زیادہ چیخنے کا[...] نہیں دی۔ ماچھی کا ایک ہی ہاتھ اُس کی خاموشی کے لیے[...] دوسری جانب ماچھی نیم برہنہ رانا کو نشانے پر لیے ہوئے تھا۔[...] بڑی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ ماچھی نے تمنچا جیب میں رکھ لیا ا[...] اُس کے پیٹ میں اپنا گھٹنا گھسیڑ دیا۔ رانا دوہرا ہو گیا۔ ماچھی[...] کے لیے اُٹھنے اور سنبھلنے کی گنجائش نہیں رکھی تھی۔ اُس نے دروازہ[...]

جب وہ وہاں سے لوٹا تو اُس کے ہاتھ خون میں لت[...]

رُستم گہری نیند سو رہا تھا اور پیرو ماچھی کے اشارے کا منتظر تھا۔[...] پیرو کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ دونوں شمال کی سمت چار دیواری[...] ٹٹولتے ہوئے چلتے رہے۔ دو پہر ہی اُنھوں نے کسی جگہ اینٹیں[...] تھیں۔ دوسری طرف سے بے نیاز ہو کے وہ اُوپر چڑھ گئے اور[...] چار دیواری کی منڈیر سے چپکے ہوئے خود کو گھسیٹتے رہے۔ اُن کے[...] ہو گئے۔ وہ دوسری جانب ایسی جگہ کودنا چاہتے تھے جہاں[...] اُوپر ہو یا کوئی درخت قریب ہو جس کی شاخ کا سہارا لے سکے[...] پھر ایک جگہ اُنھیں کوڑے کا ڈھیر نظر آیا۔ اُنھوں نے خود کو د[...] کے کپڑے اس قابل نہیں تھے کہ وہ شہر جا سکیں۔ وہ اند[...] بھاگتے رہے۔ پیرو کے کپڑے ماچھی کے کپڑوں سے بہتر تھے[...] ماچھی کو دُور ٹھہرا کے خود سرائے پہنچا۔ زورا جاگ رہا تھا۔ پیرو[...] کے وہ کسی مسافر کی پوٹلی اُٹھا لایا۔ اُن تینوں نے ریلوے لائن[...] جیسلمیر کی مخالف سمت سفر شروع کیا۔ وہ چلتے رہے تا آنکہ[...] آیا۔ پھر اُنھیں ایک چھکڑا مل گیا۔ جیسلمیر سے تیس میل دُور لا[...] پر آ کے اُنھوں نے سانس لی اور گاڑی کا انتظار کرنے لگ[...]

ماچھی چُپ ہو گیا تھا۔ بجھل نے سر نہیں اُٹھایا۔[...]

اُس نے کچھ سُنا ہی نہ ہو اور ماچھی اپنے آپ سے باتیں کر[...] ایک دوسرے کو ستائشی نظروں سے دیکھنے لگے۔ پیرو نے[...] کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ بجھل چونک پڑا۔ "بجھل بھائی! کیدر جا[...]

"کدھر بھی نہیں"۔ بجھل نے سرد لہجے میں کہا۔

"کیا سوچنے لگا ہے؟"

"کچھ نہیں پیرو!" بجھل نے آہستگی سے کہا۔ "تم بمبئی وا[...]

[...]کیا۔ ۔ ۔ کیا بول رہا ہے؟ اور تم؟"

[...]ہم کو یہیں چھوڑ دو۔"

[...]تم ایدر کیا کریں گا بجھل بھائی؟"

[...]پیرو! تم واپس چلے جاؤ۔"

[...]وہ تو اپن چلا جائیں گا پر۔ ۔ ۔ پر تم کیا سوچ رہا ہے! اپن سے کوئی [...]ہے؟"

[...]پر بجھل بھائی! ایسے چپ کیوں ہو گیا؟"

[...]تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی، غلطی ہم سے ہوئی جو تم کو اتنی دُور سے [...]یا۔"

بجھل اپنے گال تھپڑانے لگا۔

پیرو نے اُس کے ہاتھ پکڑ لیے اور بھنچی ہوئی آواز میں بولا: "بجھل بھائی! [...]ات ہے تو اپن کو بولو، اپن سزا سُننے کے لیے تیار ہے۔"

[...]نہیں نہیں پیرو! نہیں، تم جاؤ۔ اُدھر بمبئی جا کے اپنا اڈّہ چلاؤ۔ [...]ے جانے ہوئے راستوں پر ٹھیک چلتا ہے۔" بجھل نے مدبرانی انداز میں [...]پولیس یہاں تک بھی آ سکتی ہے۔"

پیرو نے اپنا جوتا اُتار کے اُس کے سامنے کر دیا۔ "سالا جوتا مار دو پر ایسا [...]اپن گھوڑا کیدر بے تُوڑ ہے بجھل بھائی! ہم اپنا گیتا کا قسم کھا کے [...]اپن نے جان بوجھ کے کوئی غلطی نہیں کیا۔ اور ایسا ہوا تو اپن ناک [...]تمھارے پیروں پہ رکھ دے گا۔"

[...]ناک قسم مت کھاؤ۔" بجھل نے درشتی سے کہا۔ "وہ اُدھر نہیں تھا، [...]اتنا ہی بولا کہ اُدھر سے صرف اتنا جان کے آؤ۔ اس کے لیے تم [...]بولا تھا۔ ہم خود بھی اُدھر جا سکتے تھے پیرو! پر ہم نے تم سے کہا تھا [...]جانا ٹھیک نہیں ہے۔ ماچھی کو اتنی دیر لگی۔ لاڈلے کو اتنی دیر [...]تی۔ وہ بھری محفل میں جا کے اِنھیں نکال کے لے آتا۔ ہم نے [...]ہن رکھی تھیں، کلائی میں موچ نہیں آ گئی تھی۔ سالی آنکھ میں [...]تی پیرو! میں نے تم کو سب بول دیا تھا۔"

[...]بن بار بار چیختا تھا کہ سالا چلو اس ماچھی آر کا پٹھا نے بولا ایسا کیسے [...]ک کے پاس جائیں گا۔ اپن کا منگج بھی کام نہیں کرتا تھا بجھل بھائی! [...]مانی کرو جب یقین ہو گیا تب اپن نے ایسا کیا۔"

[...]اسنے ٹھیک کیا پیرو! ٹھیک کیا۔" بجھل نے گھٹے ہوئے لہجے [...]پولیس تمھارا پیچھا کرتی ہوئی یہاں تک آ سکتی ہے۔ تم پہلی گاڑی [...]چلے جاؤ۔"

[...]اپن کو پولیس کی فکر نہیں ہے۔ تم اب کیدر جاؤ گے؟"

[...]میں تو ہم بھی جائیں گے۔"

[...]کیدر؟" پیرو برہمی سے بولا۔ "اپن کو کیوں نہیں بولتا؟"

[...]بس پتہ نہیں ہے کہ ہم کدھر جائیں گے۔"

"ہم بھی تمھارے ساتھ چلیں گا۔" پیرو نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "تھوڑے دن کے لیے اُودر بمبئی چلو۔ نہیں جائیں گا تو اپن بھی تمھارے پاس یہیں رہے گا۔ ایک ساتھ جیل چلیں گا تو مزہ آئیں گا، سمجھا۔"

"پیرو! ضد مت کرو"۔ بجھل تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"بجھل بھائی! اپن کچھ کچھ جان رہا ہے۔ پر اُودر رُستم سالا نے ایسا ایسا بات بولا کہ اپن سے یوں ہاتھ نچاتے ہوئے آنا ٹھیک نہیں معلوم ہوا۔ غلطی آدمی سے ہوتا ہے بجھل بھائی! اپن تو تمھارا پیرو ہے۔"

"اسی لیے تو تم کو بلایا تھا پیرو!"

"اپن جانتا ہے، تم کلکتے سے بھی بہت لوگوں کو بلا سکتا تھا۔ تمھارے پاس آدمی کی کمتائی نہیں ہے۔ پر اپن کو بولو کہ ابھی کیا کرے؟"

"کچھ نہیں پیرو! اب تمھارا کام ختم ہو چکا ہے۔" بجھل نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ اپنی آواز پر مشکل سے قابو پا رہا تھا۔ "کیا ٹائم ہو رہا ہے؟"

"ابھی تین بجے ہیں"۔ زورا پہلی بار کسمساتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے۔ گاڑی پانچ بجے کے قریب جاتی ہے۔ تم آج کی گاڑی پکڑ لو۔"

پیرو بجھل کی چھاتی پر سر ٹھنے لگا۔ "ایسا کیسے جائیں گا؟"

"تم جاؤ گے پیرو! مجھے فرصت ملی تو جلد ہی تمھارے پاس آ جاؤں گا۔ بس اس کے بعد کچھ مت بولنا۔"

"بجھل بھائی!" پیرو اُس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ بجھل نے کہنے کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھی تھی۔ زورا اور ماچھی نے اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں کہا۔ اُسی لمحے بجھل نے بیرے کو بلا کے حجّام کے لیے کہا۔ حجّام آیا تو پیرو اور ماچھی خاموشی سے اپنے بال ترشواتے رہے۔ بجھل نے اپنے اور پیرو کے کپڑوں کا ایک ایک جوڑا بھی انھیں بدلوا دیا تھا۔ اسٹیشن پر بھی اُن کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ بمبئی کی طرف جانے والی گاڑی ٹھیک وقت پر روانہ ہونے والی تھی۔ ڈبے میں چڑھتے ہوئے بجھل نے پیرو کو کھینچ کے گلے سے لگا لیا، اُس کے گال تھپتھپائے لیکن پیرو کچھ نہیں بولا، سر جھکائے کھڑا رہا۔ اُس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ بجھل نے بازار میں رُک کے خریدی ہوئی چیزوں کا تھیلا پیرو کے سپرد کر دیا کہ وہ یہ گیتا کو دے دے۔ پیرو نے اُس سے اپنا منہ چھپا لیا۔

گاڑی گئے ہوئے دیر ہو گئی لیکن بجھل وہیں پلیٹ فارم پر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیرے لگاتا رہا۔ ہم ہوٹل کا حساب چکا کے آئے تھے اور ہمارے ساتھ ہمارا مختصر سامان بھی تھا اس لیے ہوٹل واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے اُس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں خاموشی سے اُس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ تھک کے ایک بنچ پر لیٹ گیا۔ اُس کے سر کے نیچے میلے کپڑوں کا تھیلا رکھ کے میں بھی کونے میں اُس کے پیروں کی طرف بیٹھ گیا۔ وہاں اب کوئی سواری اور گاڑی نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی گاڑی جلد آنے کا امکان نظر آتا تھا۔ اسٹیشن پر بتدریج سکوت طاری ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی

مال گاڑیوں کے ڈبّوں کی کھڑکھڑاہٹ یا انجن کی تیز سیٹیوں کا شور گونج اُٹھتا۔ گشت کرنے والے سپاہی کئی بار ہماری طرف سے گزرے۔ بجّھل نے انھیں روک کے دو روپے دے دیے تھے چنانچہ انھوں نے ہم سے کوئی باز پرس نہیں کی بلکہ ویٹنگ روم میں ہمیں آرام کرنے کا مشورہ دیا مگر بجّھل وہیں پڑا رہا۔ ہوا بہت سرد تھی اور اوس اِس طرح گر رہی تھی جیسے ہلکی پھوار پڑ رہی ہو۔ ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ سامنے کے پلیٹ فارم پر ایک مال گاڑی آ کے ٹھیری۔ بجّھل ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا اور مجھے وہیں رہنے کی تاکید کر کے وہ لائنوں لائنوں چلتا ہوا میری نگاہوں سے دُور ہو گیا۔ بہت دیر بعد وہ مجھے دوبارہ نظر آیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے میری جانب واپس آ رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے سامان سمیٹا اور مجھے اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی مال گاڑی کے اُس سرے تک پہنچ گئے جہاں گارڈ کا ڈبا تھا۔ سفید وردی میں ملبوس ادھیڑ عمر کا گارڈ ڈبے کے باہر ہی کھڑا تھا۔ میرے سلام کا جواب دینے سے پہلے اُس نے سر تا پا مجھے گھور کے دیکھا پھر مسکراتے ہوئے ہمیں اندر فرش پہ چادر بچھا کے بیٹھنے کی ہدایت کی۔ تھوڑی دیر میں کندھے پر بندوقیں لٹکائے دو سپاہی بھی ڈبے میں آ گئے اور بجّھل سے باتیں کرنے لگے۔ گارڈ کی سیٹی بجی اور سگنل پہ گاڑی رینگنے لگی۔ آہستہ آہستہ اُس کی رفتار تیز ہو گئی۔

اُن کے درمیان ہونے والی گفتگو کے دوران میں نے سُن لیا تھا کہ بجّھل کا ارادہ کہاں جانے کا ہے۔ مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ وہ کہیں بھی جائے۔ اب مجھے نہ کوئی جلدی تھی، نہ کوئی فکر۔ شمال جنوب، مشرق، مغرب، میرے لیے ہر سمت ایک سی تھی۔ سمتوں سے تو انھیں واسطہ ہوتا ہے، جن سے لوگ روٹھے ہوئے نہیں رہتے۔ اب تو کوئی آہٹ بھی نہیں تھی کہ آدمی سمت کا اندازہ کرے۔ گاڑی کے پہیے شور مچاتے ہوئے لائنوں پر دوڑ رہے تھے۔ بار بار اسٹیشن آ جاتے تھے اور گاڑی کہیں بھی ویرانے، اندھیرے میں رُک جاتی تھی۔ سبھی لوگ نیچے اُترے۔ میں اپنا جسم سمٹائے بیٹھا رہا۔ میری بابت بجّھل نے اُن سے وہی عذر کر دیا تھا جو عام طور پہ وہ لوگوں سے کرتا رہتا تھا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ یوں بھی میرا سارا جسم سُن سا ہو گیا تھا۔ مجھے پہلے ہی اس میں شبہ تھا کہ وہ لوگ کامیاب واپس آئیں گے، بس ایک اُمید تھی کہ شاید وہ کوئی خبر ہی لے کے آ جائیں، شاید زمین کی گردش بدل جائے مگر اُسے یوں ملنا ہوتا تو یہ سب کچھ کیوں ہوتا، وہ مجھ سے دُور ہی کیوں ہوتی۔ نہ میرے بس میں کچھ تھا نہ اُس کے بس میں کچھ۔ پتہ نہیں کس کے بس میں تھا۔ سبھی کہتے تھے کہ وہ میرے لیے بہت دُعائیں مانگتے ہیں۔ چمپا، جولین، زرّیں۔ دعائیں اس طرح باریاب ہوا کریں تو پھر بات ہی کیا تھی۔ آدمی سچّے دل سے دُعا کیا کرتا اور اُس کی اُمید بر آتی۔ چمپا کہتی تھی کہ خدا اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے مگر یہ خوب آزمائش تھی۔ کئی بار میرے دل میں آیا کہ اُن سے کہوں، تم میرے لیے بددعائیں کیا کرو۔ فیض آباد سے چلتے وقت وہ چھوٹی نیساں بی نے بہت یقین سے کہا تھا کہ اُس کی دُعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے۔ وہ بھی میرے لیے دُعا کر رہی ہو گی۔ میں نے اُس کے خیال سے اُس وقت کچھ نہیں کہا تھا کہ تمھیں مایوسی ہو گی، مجھ سے اللہ میاں بہت ناراض ہیں۔ میں نے ا تنگ کیا، انھیں زندہ درگور کر دیا۔ میں نے اپنا گھر جلا دیا۔ میں بہن نمّی کے سامنے پہنچ گیا کہ اُسے زندہ نہ رکھوں۔ میں نے ابّا جان کے کھونے دے کے دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا مال گاڑی کے فرش پہ بیٹھا اونگھ رہا تھا، اُدھر مولوی صاحب چھپائے پھر رہے تھے۔ اُن سے بھی اُن کا گھر چھِن گیا تھا۔ چودرن سے اُدھر دنیا میں ڈھونڈتے رہے ہوں گے۔ کہاں تک اُسے پردے گے اور لوگوں کو کیا بتاتے پھریں گے۔ اُسے پھر کسی رانا نے دیکھا صاحب کو کوئی ہتھیار چلانا بھی نہیں آتا تھا۔ محض زبان سے کب نبھائی ہو گی۔ کہیں تھک کے گر پڑے ہوں گے۔ چلتے وقت جب کہہ رہی تھی کہ بابر بھائی! دیکھنا، میری دُعا ضرور قبول ہو گی تو میرے آیا تھا، اُس سے کہوں ساتھ میں یہ بھی کہہ دے کہ اگر میں کامیاب خدا کم از کم مجھے موت دے دے۔ دو میں سے کوئی ایک دُعا تو لیکن نیساں کی آنکھیں دیکھ کے میں اُس سے یہ کہہ نہ سکا۔ آدمی کا نہیں ہے۔ یہ آنکھیں طرح طرح کی آنکھیں اُسے ڈراتی رہتی ہیں کی کبھی جولین کی، کبھی چمپا کی، کبھی بجّھل کی، کبھی نیساں کی، کبھی جہا مجھے یقین ہوتا کہ میرے نہ ہونے سے ان آنکھوں کو قرار آ جا آنکھیں بھی بچھڑ جائیں گی جو ہر لمحے میرے پیچھے سائے کی طرح میرے سینے میں چبھتی رہتی ہیں تو میں ان سب سے اتنی دُور ج سے کوئی واپس نہیں آتا۔ میرے نہ ہونے سے تلافی نہیں ہوتی اور کورا اسی طرح دربدر بھٹکتے رہتے۔ اُن کے لیے میں اب بھی ک تھا۔ میرا مرنا جینا سب کے لیے یکساں تھا، البتہ جسم سامنے پڑا رہے لوتھڑا ہی ہو پھر بھی ایک اُمید رہتی ہے کہ شاید کبھی ہوش میری حالت اُن کے لیے ایسی ہی تھی اور خود میرے لیے بھی ایک آس ہو گی کہ میں پلٹ کے کبھی تو اُس کی خبر لوں گا، اسی آ میرے حلق میں بھی اٹکی ہوئی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی کے ختم ہو جاتا ہے، زندگی ہے تو احساس بھی ہے۔ اس احساس سے تھا کہ میں اپنی سزا کاٹ رہا ہوں ورنہ وہاں امّی کے سامنے کس منہ پھیر لیتیں کہتیں چوروں کی طرح چلا آیا، زندگی کے قید خانے بھاگ کے چلا آیا، اپنی سزا پوری کر کے نہیں آیا۔ وہ وہاں بھی نہیں کرتیں۔ نہ امّی، نہ فہمیدہ۔ بجّھل نے ایک بار کہا تھا کہ خود خود غرضی ہے۔ امّی بھی مجھے اپنے پاس دیکھ کے یہی کہتیں، مط تو پھر انھیں چھوڑ آیا، جہاں گیر کو خواب دکھا کے چلا آیا۔

ماچھی کے بقول مولوی صاحب نے رستم کو بتایا تھا کہ ہے۔ امانت سے اُن کی کیا مراد تھی، نہ جانے وہ کیا کہنا چاہتے۔ جملہ میرے ذہن میں پیوست ہو کے رہ گیا تھا۔ امانت سے اُن کا مطلب اور کیا ہو گا۔ انھیں اُمید ہو گی کہ میں کسی دن ضرور واپس آؤں گا اور کورا کو لے جاؤں گا مگر انھیں یہ کیسے یقین ہو گا کہ ایک دن میں واپس آ ہی جاؤں گا۔ یری فکر ہوتی تو کبھی نہ کبھی وہ میری خبر لیتے۔ ضرور پوچھتے کہ مجھ پر کیا گزری، میں ندہ ہوں یا مر گیا۔ کلکتے میں وہ جس مسجد میں ٹھیرتے تھے، وہاں کے مولانا نے تایا تھا کہ اُس رات کے بعد وہ واپس نہیں آئے۔ اِس کا ثبوت اُن کا وہ سامان تھا جو ایک الماری میں محفوظ کر دیا گیا تھا۔ انھوں نے گھبرا کے فوراً کلکتہ چھوڑ دیا ہو گا۔ انھیں خدشہ ہو گا کہ کسی طرح میری زبان سے کلکتے میں اُن کی موجودگی کے وران کورا کا ذکر آ گیا تو پولیس انھیں آسانی سے تلاش کر لے گی۔ وہ بھی صیبت میں گرفتار ہو جائیں گے اور کورا بھی۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے یکھا تھا کہ میں نے کانسٹیبل کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا ہے اور کانسٹیبلوں نے مجھے اپنے نرغے میں لے لیا تھا۔ میرے بچنے کی انھیں کوئی اُمید نہیں ہو گی۔ سو انھوں نے کورا کو اور اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ انھیں ن نے بتا دیا تھا کہ کورا کون ہے، کہاں سے آئی ہے اور اُس کے ساتھ کیا اقعات پیش آئے ہیں چنانچہ انھوں نے اُسے لوگوں کی نظروں سے ہر ممکن د پردے میں رکھنا چاہا۔ وہ اپنے شہر مُراد آباد بھی واپس نہیں گئے ورنہ اُن کے شتے دار پوچھتے کہ یہ کون لڑکی اُن کے ساتھ ہے۔ کورا کا چہرہ ہی ایسا تھا کہ ہ آدمی سے اُس کا گھر چھڑوا دے۔ مولوی صاحب بھی اُس کی آہ و بکا سے، ن کے آنسوؤں سے متاثر ہو گئے ہوں گے۔ وہ ویسے بھی تنہا آدمی تھے۔ نھوں نے کورا ہی کو اپنا سب کچھ سمجھ لیا ہو گا۔ سوچا ہو گا کہ وہ ایک گھر بنا کے رہیں گے اور کورا کو عمدہ تعلیم دیں گے، اُسے خوش رکھیں گے۔ بعد یں انھیں احساس ہوا ہو گا کہ یہ کتنا مشکل ہے لیکن پھر وہ کورا کو تنہا چھوڑ کے ہیں جا نہیں سکتے تھے۔ اتنے دن ساتھ رہتے رہتے انھیں اُس سے خاصا س ہو گیا ہو گا۔ وہ ایک وضع دار، خوش خُلق آدمی تھے۔ خود انھیں کوئی بہت ا دکھ تھا۔ ہم دونوں کلکتے میں ہر طرف سے ٹھوکریں کھا کے اُن کے پاس نچے تھے تو انھوں نے خندہ پیشانی سے ہمیں معاف کر دیا تھا۔ انھوں نے را اور کورا کے لیے کپڑے بنائے، گھر کا سامان خریدا، وہ اس بات سے بہت ش تھے کہ مُراد آباد جا کے اپنے گھر میں ہم دونوں کے ساتھ رہیں گے۔ وہ ب نظر میں سمجھ گئے تھے کہ میں اپنے گھر واپس نہیں جاؤں گا کیونکہ میرے والے کورا کو اپنے ساتھ رکھنا پسند نہیں کرتے ہیں ورنہ میں گھر سے آتا ہی ں۔ کاش اُس دن وہ ہمیں دریا کی سیر کو نہ لے جاتے، اسی وقت کلکتے روانہ ہو جاتے تو نہ وہ خانہ برباد ہوتے، نہ مجھے جیل جانا پڑتا۔

مولوی صاحب نے منیر علی سے ارشد کے لیے انکار کر دیا تھا اور بھی ت سے گھروں کو منع کر دیا تھا۔ ارشد تو اُن کا دیکھا بھالا تھا۔ پڑھا لکھا، شکل و صورت کا لڑکا۔ انھوں نے اپنے ہی خواہ منیر علی کی بات ٹھکرا دی۔ ایسے صاحبِ حیثیت شخص کا پیام منظور نہیں کیا۔ جیسلمیر آنے سے پہلے بھی جہاں وہ رہتے ہوں گے، وہاں کے لوگوں نے بھی اُن پہ زور ڈالا ہو گا، کورا کی صورت دیکھ کے بہت سے خاندانوں کی تمنا ہو گی کہ وہ اُن کے گھر میں آ جائے۔ مولوی صاحب نے کسی تخصیص کے بغیر سب کو کیوں مایوس کر دیا۔ انھیں کس کا انتظار تھا۔ کون آنے والا تھا جس کے لیے وہ کورا کو روکے بیٹھے تھے۔ اُن کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا تھا جو جوان لڑکیوں کو دیر تک گھر میں بٹھا کے رکھنا پسند نہیں کرتے۔ انھیں بہت زیادہ اپنی لڑکی سے محبت ہوتی ہے تو بھی ایک نہ ایک دن اُس کی جُدائی کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ نمّی بہت چھوٹی تھی، تبھی سے امّی نے اُس کے لیے جہیز تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اکثر انھیں یہ دُعا مانگتے دیکھا تھا کہ اللہ کرے! اُن کی لڑکیوں کے نصیب اچھے ہوں۔ مولوی صاحب نے پھر کیا سوچ کے ہر شخص کو منع کر دیا تھا۔ اگر انھیں میرا انتظار تھا تو اس کی کوئی مدت بھی اُن کے ذہن میں متعین ہو گی۔ سات سال کی جیل کے دوران کسی ذریعے سے مجھے اطلاع پہنچا سکتے تھے کہ وہ محفوظ ہیں اور کورا اُن کے پاس ہے تاکہ میں جیل سے رہا ہو کے سیدھا اُن کے پاس آؤں۔ میں سات سال تک روز اُن کے خط کا انتظار کرتا رہا۔ سبھی قیدیوں کے خط آتے تھے، میرے پاس کبھی کوئی خط نہیں آیا۔ میں نے اپنے ذہن میں اس کی بہت سی تاویلیں ڈھونڈ رکھی تھیں کہ مولوی صاحب رابطے کی کوشش کرتے تو اُن کا یہ اقدام جیل کے حکام سے روپوش نہ رہتا۔ انھیں شاید معلوم ہو گیا ہے کہ میں نے مقدمے میں کسی کے متعلق کچھ نہیں بتایا، اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں کوئی بھی بات چھُپی رہی ہے تو چھُپی ہی رہنی چاہیے۔ خط لکھنے یا جیل میں مجھے دیکھنے آنے میں پولیس کو کوئی اشارہ نہ مل جائے اور از سرِ نو تفتیش شروع نہ ہو جائے، اسی اندیشے کی وجہ سے انھوں نے احتیاط برتی ہو گی یا مولوی صاحب کو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ کورا اُن کے پاس نہیں رہی یا وہ بھی نہیں رہے۔

لیکن وہ جیسلمیر میں تھے۔ اُدھر جیل سے نکلنے کے بعد میں نے خواہ مخواہ چاند میاں اور نسرین کا پیچھا کیا۔ موجماد کے اڈّے پہ میں نے بے کار واویلا کیا۔ مولوی صاحب تو کورا کو اپنے پروں میں چھپائے بیٹھے تھے اور انھیں کسی کا انتظار تھا۔ وہ کہتے تھے کہ کورا کسی کی امانت ہے۔ وہ مجھے دوسطری گمنام خط لکھ سکتے تھے، کسی ایسے اسٹیشن سے خط ڈال سکتے تھے جہاں سے وہ گزر رہے ہوں، کسی اور سے لکھوا سکتے تھے۔ کورا کو اُردو لکھنی آ گئی تھی۔ اُسی سے چند لفظ لکھوا دیتے۔ ایسا لگتا ہے کہ کلکتے سے جانے کے بعد انھیں میرے بارے میں کوئی خبر ہی نہیں تھی اور نہ انھوں نے کچھ جاننے کی جستجو کی تھی۔ جیسے انھوں نے یقین کر لیا تھا کہ اب پھانسی میرا نصیب ہے یا مجھے تا زندگی جیل میں رہنا پڑے گا، پھر انھوں نے یہ بھی سوچا ہو گا کہ جیل میں اتنی مدت تک رہنے کے بعد میں بالکل بدل جاؤں گا اس لیے مجھ سے کوئی رابطہ رکھنا بے سود ہے۔ میری واپسی کے بعد کورا مجھے دیکھ کے ڈر جائے گی۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ جیل میں ہر لمحے، ہر آن میں اُسی کے ساتھ رہا ہوں اور میں نے وہاں وقت نہیں گنوایا ہے۔ میں نے وہاں رہتے ہوئے سولھواں درجہ پاس کیا ہے اور

وہ بھی فرسٹ۔ جیل میں رہ کے میں یہی کر سکتا تھا۔ اخباروں میں یہ خبر چھپی تھی مگر مولوی صاحب کو کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔ اُن کی نظر سے یہ خبر بھی نہیں گزری، گزرتی تو وہ مجھے مبارک باد کے دو لفظ ہی لکھ دیتے اور میرے بارے میں اتنا کچھ اُن کے علم میں ہوتا تو یہ بھی معلوم ہوتا کہ میری سزا کتنی مدت کی ہے اور جب میں نے اپنی سزا پوری کر لی ہے تو دوبارہ تفتیش کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ دو سال، تین سال، پانچ سال۔ اس دوران میں جیل کے بہت سے حکام بدل گئے تھے اور لوگ بھول گئے تھے کہ میں کس معاملے میں جیل آیا ہوں۔ بات پُرانی ہو گئی تھی۔ ایک عرصہ گزرنے کے بعد مولوی صاحب کا یہ اندیشہ دُور ہو جانا چاہیے تھا۔

مولوی صاحب جیسے شخص کے لیے جیل کا تصور ہی بہت بھیانک ہو گا۔ اُنھوں نے یہی سمجھا ہو گا کہ اب میری طرف توجہ دینا خود کورا کو اُلجھن میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ میں جیل سے رہا بھی ہو گیا تو کورا کے لائق نہیں رہوں گا۔ میرا تو سایہ بھی کورا پہ نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ یہ فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتے تھے اس لیے کہ اب وہی کورا کے سب کچھ تھے۔ اُس کے لیے اُنھوں نے اپنے ماضی سے یکسر ناتا توڑ لیا تھا۔ نہ جانے اُنھوں نے کورا کو کیا بتایا ہو گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ اُنھوں نے اُسے میرے واپس آنے کی تسلّی دی ہو گی۔ کہا ہو گا کہ میں کھو گیا ہوں اور وہ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ اگر وہ کورا کو یہ نہ بتاتے تو وہ اپنا گلا گھونٹ لیتی۔ چوڑیاں پیس کے کھا لیتی۔ اُنھوں نے اسی طرح کچھ کہا ہو گا اور یہی اس سے کہنا بھی چاہیے تھا مگر ساتھ میں اُنھیں یہ بھی احساس ہو گا کہ وہ کورا کو کب تک یہ دلاسا دے سکتے ہیں۔ کورا نے اُنھیں ہزاروں بار ٹوکا ہو گا کہ وہ میرے اَبّا جان یا اَمّی کو خط لکھیں۔ مولوی صاحب نے ہمیشہ یہی جواب دیا ہو گا کہ وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا ہے۔ ممکن ہے سال دو سال بعد کورا کے بتائے ہوئے پتے پر مولوی صاحب نے گھر کوئی خط لکھا ہو اور وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو کیونکہ اَمّی کے انتقال کے کچھ دنوں بعد اَبّا جان نے گھر چھوڑ دیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ابتدا ہی میں کہیں مولوی صاحب کا تعاقب جانگ قبیلے کے لوگوں نے کیا ہو جو کورا کی تلاش میں سرگرداں تھے اور مولوی صاحب محتاط ہو گئے ہوں کہ اگر کہیں کسی ذریعے سے اُن لوگوں کو پتہ چل گیا تو وہ پھر اُن کے سامنے آ جائیں گے۔ اُن کی گوشہ نشینی کا سب سے بڑا سبب یہی ہو گا۔ اُنھیں ایسے چند لوگ ضرور راستے میں ٹکرائے ہوں گے اور اُن کی شدّت کا بھی اُنھیں اندازہ ہوا ہو گا کہ وہ ہر حال میں کورا کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اتنی طویل مدت کے دوران اُنھیں کوئی ایسا شخص نظر آ گیا ہو جسے وہ کورا کے لیے سب سے موزوں سمجھتے ہوں۔ اسی لیے اُنھوں نے باقی تمام لوگوں کو منع کر دیا ہو۔ جب اُنھوں نے امانت کا لفظ کہا تھا تو اُن کے ذہن میں کوئی اور شخص بھی ہو سکتا ہے۔ جیسلمیر آنے سے پہلے وہ متعدد جگہوں پر رہے ہوں گے اور اَن گنت خاندانوں سے اُن کا واسطہ پڑا ہو گا۔ ہو سکتا ہے اُن کی نظرِ انتخاب کسی شخص پر گئی ہو اور وہ اُسی کے انتظار میں ہوں یا پھر یہ ہو کہ

کورا کو جُدا کرنے کا تصور ہی اُن کے لیے سوہانِ روح ہو۔ ایک طرف اُنھو
نے کورا سے کہا ہو گا کہ وہ میری کھوج میں ہیں، اِس صورت میں دوسری طرف
اُسے مستقل طور پر کسی اور سے وابستہ کرنے کا ذکر وہ اُس کے سامنے کیسے کر
ہیں۔ کورا نے اُنھیں یقیناً کوئی ایسا تاثر دیا ہو گا کہ وہ صرف میرے لیے ز
ہے جیسے میں اُس کے لیے زندہ تھا۔ اُس نے ایسا کچھ ضرور کہا ہو گا او
مولوی صاحب کو یہ بھی یقین ہو گا کہ وہ کورا کی رائے نہیں بدل سکتے، چا
صدیاں بیت جائیں اور جب اُنھیں یقین ہو گیا تھا تو سات سال درمیا
تھے۔ اِس عرصے میں کورا اُنھی کے ساتھ تھی۔ لازماً اُنھیں میری زندگی اور
کی سُن گُن ضرور ملنی چاہیے تھی میرے دماغ میں بہت سی مکڑیوں نے جا
بُن لیا تھا۔

مال گاڑی بھاگ رہی تھی۔ وہ سبھی باتیں کرتے کرتے اونگھنے لگے
صرف گارڈ جاگ رہا تھا۔ کہیں گاڑی رُکتی تو سپاہی چونک کے آنکھیں مسلنے
اور گاڑی ٹھہر جاتی تو گارڈ کے ساتھ نیچے اُتر جاتے۔ گاڑی چلنے لگتی تو
اندھیرے لپکنے لگتے۔ رات کو کسی وقت اُس نے ہمیں جودھپور پہنچا دیا
سے ہم مختلف لاریوں میں سفر کرتے ہوئے گیارہ بجے کے قریب اپنی من
پر پہنچ گئے۔ ایک ہفتے بعد جیسلمیر شہر کا اُونچا قلعہ پھر ہمارے سامنے تھا۔

علاقے کی گلیوں میں زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ اسٹیشن سے یہاں تک کا فاصلہ
تیز رفتاری سے طے کیا تھا۔ شاید سارے مرد گھروں سے باہر نکل چکے تھے۔ راستے میں
جاننے والا کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ ہماری دستک پر دروازہ منیر علی ہی نے
اور ہمیں اپنے سامنے دیکھ کے ٹھٹک کے رہ گئے۔ اُن کے پپوٹے سو
ہوئے تھے اور لباس پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے
رات بھر نہیں سوئے ہیں اور جیسے ایک ہفتے کے دوران وہ کچھ اور بوڑ
ہو گئے ہوں۔ "آپ ....!" بہ مشکل تمام اُن کے حلق سے کانپتی ہوئی آواز

"ہاں بڑے صاحب!" بجھل نے نرمی سے کہا۔

"آپ .... آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟" اُنھوں نے سٹ پٹا
لہجے میں پوچھا۔

"زیادہ دُور سے نہیں۔"

"مگر آپ تو، آپ تو ....."

"ہاں!" بجھل بڑھ کے اُن کے گلے سے لگ گیا۔ "جلد ہی واپس
ہو گیا۔ اِدھر جیسلمیر سے گزر رہے تھے۔ سوچا، اپنا وعدہ بھی پورا کر لیں۔ آ
سلام کرتے چلیں، آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ لگتا ہے کچھ ....." وہ
کہتے کہتے رُک گیا۔

"آپ اتنے دنوں کہاں کہاں رہے؟" منیر علی نے مضطرب انداز
"یہیں، حیدرآباد تک۔ زیادہ دُور نہیں جا سکے۔"

"حیدرآباد ....!" منیر علی کی آواز لرز رہی تھی۔ اُنھوں نے ہم سے

آنے کے لیے نہیں کہا۔ وہ ایسی نظروں سے ہمیں گھور رہے تھے جیسے ہماری شکلیں بدل گئی ہوں یا ہم اُن کے لیے بالکل اجنبی ہوں۔

"بیٹھک کھولیے بڑے صاحب!" بجھل نے اُنھیں ٹوکا۔

"جی .... جی۔" وہ حواس باختہ انداز سے سر ہلانے لگے۔ "ایسا ہے ....." اُن کی زبان تھرّا کے رہ گئی۔ "آپ، آپ لوگ اندر ہی سے آ جائیے۔"

وہ اندر کی طرف تیزی سے جاتے ہوئے بولے۔ بجھل نے مجھے سپاٹ نظروں سے دیکھا۔ میں نے پلکیں جھکا لیں۔ منیر علی اندر پہنچ کے فوراً دروازے پر آ گئے اور ہمیں گھر کے راستے سے بیٹھک میں لے گئے۔ اُنھوں نے بیٹھک کا گلی میں کھلنے والا دروازہ بھی نہیں کھولا۔ اندر سب چیزیں اُسی طرح رکھی ہوئی تھیں جس طرح ہم چھوڑ گئے تھے البتہ وہ چارپائی نہیں تھی جو میرے لیے منیر علی نے اندر گھر سے یہاں ڈلوا دی تھی۔

"بات یہ ہے۔" منیر علی نے سنبھل سنبھل کے کہنے کی کوشش کی۔ "کچھ مہمانوں کی آمد متوقع ہے۔" اُن کے لہجے سے عیاں تھا کہ وہ ہم سے جھوٹ بول رہے ہیں اور اُن کا مقصد یہ کہنا ہے کہ اب وہ اپنے گھر میں ہمیں ٹھہرانے سے معذور ہیں۔

"ہمارا ارادہ اتنی جلدی اس طرف واپس آنے کا نہیں تھا۔" بجھل نے اُن کی بات سُنی اَن سُنی کر دی۔ "بچّوں کے لیے بھی کچھ نہ لا سکے۔ گھر میں سب ٹھیک ٹھاک ہے؟"

"جی ہاں! اللہ کا فضل ہے۔" منیر علی نے شکستہ لہجے میں جواب دیا۔

"آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟"

"نہیں نہیں۔ کچھ نہیں۔" منیر علی ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔

"کچھ تو بات ہے۔ ارشد میاں کا کیا حال ہے؟"

"وہی لیکن لیکن ....."

"لیکن کیا بڑے صاحب! کھل کے بولو۔"

"کچھ نہیں جناب!" منیر علی کے لہجے میں اضطراب تھا۔ وہ ہمیں دزدیدہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

"کچھ ضرور ہے۔ ہم آپ کا بھلا چاہنے والوں میں ہیں بڑے صاحب!"

"بے شک، بے شک لیکن کچھ صورت بدل گئی ہے۔" اُن کی آواز اٹک رہی تھی۔ "میں آپ سے منّت کروں گا کہ اس مرتبہ کہیں اور ٹھہر جائیے۔ شاید میں پہلے کی طرح آپ کی خدمت نہ کر سکوں۔"

"کیا صورت بدل گئی ہے؟" بجھل نے حیرانی سے پوچھا۔

"مجھ سے کچھ نہ پوچھیے۔ بہتر ہے، مجھ سے کچھ نہ پوچھیے۔"

"پھر کس سے پوچھیں؟ ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے بڑے صاحب؟"

"نہیں جناب! خطاکار میں ہوں۔"

"آپ نے بھلا کیا خطا کی ہے؟ آپ کیا بول رہے ہو؟"

"آپ کو کچھ پتہ نہیں!" منیر علی نے ہذیانی انداز میں کہا۔

"کس کا پتہ؟"

"آپ کچھ نہیں جانتے؟ حلفیہ آپ کچھ نہیں جانتے؟"

"کس بارے میں؟"

"وہی رانا کے بارے میں؟" منیر علی نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"رانا! کیا اُس نے پھر کوئی بات چھیڑی ہے؟"

"نہیں صاحب! کیا آپ کو واقعی کچھ نہیں معلوم؟"

"آپ کچھ بولو گے تو پتہ ہو گا۔" بجھل نے ملائمت سے کہا۔

"رانا کو اندھا کر دیا گیا ہے۔ اُسے دو دن پہلے کسی نے اندھا کر دیا۔" منیر علی لرزیدگی سے بولے۔ "سارے شہر میں چرچا ہے۔ بڑے بڑے ڈاکٹر بلائے گئے ہیں، وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آیا ہے۔"

"رانا کے اندھے ہونے سے آپ کا کیا تعلق؟" بجھل نے بے چینی سے پوچھا۔

"خدا بہتر جانتا ہے کہ میرا کیا تعلق ہے۔ معلوم نہیں اُسے کیا منظور ہے۔" منیر علی ہانپتے ہوئے بولے۔ "کل رات دو آدمی دیوار پھاند کے اندر گھر میں گھس آئے۔ میری آنکھ لگ گئی تھی۔ اُنھوں نے مجھے پلنگ سے اُٹھا لیا۔ اُن میں سے ایک کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ کہنے لگے، شور مچانے کی کوشش مت کرنا۔ کسی تنہا جگہ چلو۔ میرے ہوش و حواس گُم ہو گئے تھے۔ میں نے بیٹھک کی طرف اشارہ کیا۔ وہ گھسیٹتے ہوئے مجھے یہاں تک لے آئے اور پوچھنے لگے کہ کچھ دن پہلے تمھارے ہاں جو دو مہمان ٹھہرے ہوئے تھے، وہ کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور اُن کا پتہ کیا ہے۔ مجھے آپ لوگوں نے صرف اپنے نام ہی بتائے تھے۔ میں نے وہی بتا دیے اور کہا، پتہ مجھے نہیں معلوم۔ پوچھنے لگے، کیا مولوی صاحب سے اُن کا کوئی رشتہ نکلتا تھا۔ میں نے جواب دیا، ہاں اُنھوں نے خود کو اُن کا رشتے دار بتایا تھا۔ پھر پوچھا، تم نے رانا مہتاب کے بارے میں اُن سے کچھ کہا تھا کہ رانا نے مولوی صاحب کی لڑکی کو مانگا تھا۔ مجھے بہ صد اکراہ اقرار کرنا پڑا لیکن وہ اور مشکوک ہو گئے کہ میں جان بوجھ کے آپ کا پتہ چھپا رہا ہوں۔ وہ کرید کرید کے گھر میں آپ کے قیام کی مدت اور دیگر باتیں پوچھنے لگے۔ میں نے اُن سے کہا کہ سات روز ہوئے، وہ دونوں مہمان یہاں سے چلے گئے۔ اُنھوں نے میری داڑھی پکڑ لی، مجھے طمانچے مارے اور گردن دبا کے بولے، تم اُن لوگوں کا پتہ بتا دو، اسی میں تمھاری بھلائی ہے۔ میں نے اُن کے آگے ہاتھ جوڑے اور کہا کہ اس کے سوا مجھے کچھ نہیں معلوم۔ دو صاحبان یہاں ٹھہرے ضرور تھے۔ مولوی صاحب سے تعلق کی بنا پر میں نے اُنھیں اپنے ہاں مہمان رکھا تھا۔ مولوی صاحب اور لڑکی کی باتیں چھڑیں تو رانا مہتاب کے پیام کا ذکر بھی آ گیا۔ وہ صرف تین دن ٹھہرے۔ اُنھوں نے بتایا تھا کہ وہ مُراد آباد سے آ رہے ہیں، مولوی صاحب کا تعلق بھی شاید وہیں سے تھا لیکن وہ بتا کے گئے ہیں کہ مُراد آباد کی طرف نہیں جا رہے ہیں اور واپسی میں پہلے یہاں جیسلمیر آئیں گے۔ میں نے جو سچ تھا اُسے کہنے میں ہچکچاہٹ نہیں کی مگر وہ بہ ضد رہے، مجھ سے سختی کے

ساتھ پیش آتے رہے دھمکیاں دیتے رہے کہ میں اپنے حق میں بُرا کر رہا ہوں میں نے کہا میرے علم میں جو کچھ تھا میں نے کہہ دیا۔ اب میرے پاس انھیں بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ وہ مجھے بُرے لوگ نہیں معلوم ہوتے تھے بھلے آدمیوں کی طرح بیان رہے۔ آخر اُن لوگوں سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ وہ رعونت سے بولے، ہمیں اُن کی تلاش ہے ہم اُنھیں دیکھنا چاہتے ہیں اُن کے قصور کا تمھیں اُس وقت پتہ چلے گا جب ہم اُن کی پیڑھیوں تک کو اندھا کر دیں گے۔ میں اُنھیں اپنی لاعلمی کا یقین دلاتا رہا میری عاجزی سے وہ کسی قدر نرم ہوئے، ایک دوسرے سے اشاروں اشاروں میں کچھ کہا اور چلے گئے لیکن چلتے چلتے کہہ گئے ہیں کہ اُن کے آنے کی اطلاع پولیس یا محلے والوں کے کانوں میں نہیں پڑنی چاہیے ورنہ اپنی ذلت کا میں خود ذمّے دار ہوں گا اور وہ یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ اگر اُنھیں بعد میں پتہ چلا کہ میں نے اُن سے کچھ پردہ پوشی کی ہے یا جھوٹ بولا ہے تو وہ دوبارہ آئیں گے اور دوبارہ اس طرح واپس نہیں جائیں گے اور اگر اس دوران میں نے کہیں روپوش ہونے کی کوشش کی تو میں جہاں کہیں بھی ہوں گا دُنیا کے آخری کونے تک وہ مجھے ڈھونڈ لیں گے۔" منیر علی کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہنے لگے۔

"جی کو نرم رکھو بڑے صاحب!" بجّھل اُٹھ کے اُن کے پہلو میں بیٹھ گیا اور کھوئے ہوئے لہجے میں بولا: "آپ نے یہ سب بتا کے ٹھیک کیا۔ ہم وقت پر آ گئے۔ اُن کو کوئی دھوکا ہو گیا ہے۔"

"دھوکا!" منیر علی کی آواز بھرا گئی: "یہ کیسا دھوکا ہے۔"

"ہو جاتا ہے وہ ہمارا پتہ مانگتے تھے۔ اب ہم خود اِدھر آ گئے ہیں آپ ایسا کرو کہ ہم کو اُن کے سامنے کرو۔ اُن کا شبہ دُور ہو جائے گا۔"

"بات اتنی آسان نہیں ہے جتنی آسانی سے آپ کہہ رہے ہیں۔" منیر علی ناتوانی سے بولے: "اُنھیں آپ کے پتے کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔ کسی غلط فہمی کی وجہ سے؟ مگر کیا اس طرح اُن کی غلط فہمی دُور ہو جائے گی؟ کیا اُنھوں نے آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے جو سامنا ہوتے ہی آپ کو پہچان لیں گے کہ آپ وہ نہیں ہیں جو اُنھیں مطلوب ہیں، آپ کیسے ثابت کریں گے؟"

"ثابت ہو جائے گا، اس لیے کہ ہم وہ نہیں ہیں۔"

"یہ تو آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں، جب تک آپ ثابت کریں گے وہ کچھ بھی کر بیٹھیں گے۔ اُنھوں نے اپنے چہرے مجھ سے چھپا رکھے تھے لیکن ان کی آنکھوں، آواز اور اطوار و انداز سے میں اُن کی اُفتادِ طبع کا اندازہ اچھی طرح کر سکتا تھا، وہ شوریدہ سر لوگ ہیں اور میں ایک خانہ دار آدمی ہیں حیل و حجت اور بات بڑھنے کی کسی اُلجھن میں پڑنا نہیں چاہتا میری جگہ کوئی بھی ہوگا تو یہ نہیں چاہے گا، میں آپ کو مشورہ دوں گا بلکہ درخواست کروں گا کہ آپ فوراً یہاں سے چلے جائیے میری سمجھ میں یہی آتا ہے۔"

"ہم آپ کو اس حالت میں چھوڑ کے کیسے چلے جائیں۔"

"چلے جائیے میرے ناتھ خدا ہے وہ سب دیکھ رہا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بڑے صاحب! سمجھو خدا نے ہی ہم کو بھیجا آپ گھبراؤ نہیں وہ لوگ اِدھر آئیں گے تو ایک دفعہ اُن کا شک نکل جا سب بات ٹھیک ہو جائے گی۔"

"لیکن یہاں میری عزت کا کیا ہوگا نہیں نہیں۔" منیر علی نے کا ہاتھ رکھ لیے۔ "یہاں سے چلے جائیے اور ایسا ہی ہے تو مجھے اپنا پتہ جائیے میں اُنھیں بتا دوں گا۔ وہ آپ کو ڈھونڈ لیں گے اور اپنی تسلی کر

"آپ اپنے گھر میں نہیں رہنے دو گے تو ہم نہیں رہیں گے لیک بولتے ہیں ابھی ہمارا اِدھر رہنا ٹھیک ہے پہلے آپ ہمارے بار اپنا شک دُور کرو، پھر ٹھنڈے دل سے سوچ کے بولو کہ ہمارا آپ کے جانا ٹھیک ہے یا آپ کے ساتھ اِدھر رہنا؟"

"میں آپ پر کوئی شک نہیں کر رہا ہوں نہ کرنا چاہتا ہوں بلکہ بات میں نے کہہ دی ہے۔ آپ خود سوچیے وہ میرے پاس کیوں آ آپ گئے اور آپ سے رانا کے متعلق بات ہوئی، اُدھر یہ واقعہ پیش اُن کی نظر سیدھی میرے گھر کی طرف کیوں آئی؟"

مجھے توقع تھی کہ منیر علی جلد یا بدیر یہ سوال کریں گے۔ اُنھوں کئی دسیوں مہمان کسی گھر میں آتے جاتے ہیں میں اُن کے جانے کوئی اُنھیں اس طرح پوچھتا ہوا نہیں آ جاتا۔ مجھے بجّھل کا جواب جا جستجو تھی منیر علی مجھ سے یہ سوال کرتے تو میرے پاس اس کا کوئی نہیں تھا۔ بجّھل کا چہرہ دُھندلانے لگا مگر وہ دھیمی آواز میں بولا: "آپ نہیں بول رہے بڑے صاحب! پر میں جانتا ہوں آپ کا مطلب میں آپ کی بات کا جواب ابھی نہیں دے سکتا۔ آپ کے پاس پول آئی تھی، دو ہی آدمی آئے تھے اور جس طرح آئے تھے، وہ آپ کو ابھی اُن کو شبہ ہے شبہ نہیں ہوتا تو وہ چوری چھپے نہ آتے۔ ہو سکتا اُنھی آدمیوں میں سے ہوں جو مولوی صاحب اور لڑکی کو لے گئے بہت سی ایسی جگہوں پر بھی گئے ہوں گے جہاں جہاں رانا نے لڑکیاں اُٹھوائی ہوں گی اِدھر بھی آ گئے اور یہاں محلے میں آ کے اُن کہ کچھ دن پہلے دو اجنبی لوگ مولوی صاحب کو پوچھتے ہوئے آئے آپ کے گھر ٹھہرے تھے۔"

"مگر آپ.... آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہی نے کیا تھا؟" منیر علی کپکپاتی ہوئی آواز میں بولے۔

"یہ تو آپ بھی خوب سمجھتے ہو پھر وہ آپ کے پاس نہیں آ آپ کہتے ہو کہ اُنھوں نے آ کے آپ سے رانا کا نام لیا تھا۔"

"پھر آپ خود ہی اپنی تمام بات کی تردید کر رہے ہیں۔"

"لیکن میں یہ بھی بول رہا ہوں کہ وہ کسی ایک جگہ نہیں گئے اُنھوں نے اور بھی بہت سے گھر کھوجے ہوں گے، یہاں بھی آ

کا آنا اپنے شک پہ پانی ڈالنے کے لیے ہے، اُسے آپ اپنے سمجھنے کے لیے اتفاق بھی کہہ سکتے ہو۔"

"میرا دماغ پھٹ جائے گا، چند دن پہلے رانا کے سلسلے میں مجھ بدزبان کا آپ کے سامنے زبان کھولنا، رانا کا اپنی آنکھیں کھو دینا، اُن کا یہاں آنا اور آپ کو پوچھنا، یہ سب کتنے عجیب اتفاقات ہیں۔"

"بہت عجیب ہیں بڑے صاحب! زیادہ سرمت کھپاؤ۔" بجّھل افسردگی سے بولا: "اسی لیے میں بولتا ہوں کہ ہم کو اِدھر ہی رہنے دو، وہ پھر آئیں تو ہماری طرف اُنگلی اُٹھا دینا۔ بس اور کیا کہوں۔"

بجّھل نے منیر علی کو سمجھانے کی ہر طرح کوشش کی کسی حد تک کامیاب بھی ہو گیا۔ منیر علی چپ ہو گئے مگر اُن کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ میں جانتا تھا، اُن کی خاموشی چند ثانیوں کی ہے۔ اس جہاں دیدہ کے دماغ میں کسی بھی لمحے یہ بات آ سکتی ہے کہ وہ ہم نہیں ہوں گے تو ہمارے ساتھی ہوں گے۔ بات تو ایک ہی تھی کوئی سلسلہ ضرور ملتا ہوگا۔ ابھی اُنھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ جس رات رانا کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا، اُس کی حویلی میں رُستم خاں کے ہاں دو آدمی ٹھیرے ہوئے تھے جو اُس رات کے بعد حویلی میں نظر نہیں آئے۔ وہ اپنا تھوڑا بہت سامان بھی چھوڑ گئے۔ اگر منیر علی کے پاس آنے والے آدمی اُنھیں یہ بھی بتا دیتے کہ رُستم کے وہ دونوں مہمان حویلی سے غائب ہیں تو پھر منیر علی کو یہ یقین دلانا ہمارے لیے مشکل ہو جاتا کہ وہ کوئی اور لوگ تھے، ہم نہیں تھے لیکن جلد ہی کسی نہ کسی وقت یہ بات منیر علی کو معلوم ہونی تھی۔ ابھی صرف دو دن گزرے تھے، شہر چھوٹا تھا اور واقعہ رانا جیسے آدمی کا تھا۔ اب بھی طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی ہوں گی۔ حویلی میں بہت سے لوگوں کو پیرو اور ماچھی کی آمد کا پتہ تھا۔ پولیس کو بھی اُنھی دو آدمیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہوگا مگر حویلی کے رہنے والوں کو یہ علم نہیں تھا کہ رُستم خاں کے وہ دو مفرور مہمان مولوی صاحب اور کورا سے کوئی وابستگی رکھتے تھے اور اسی بنیاد پر اُنھوں نے رانا کو آنکھوں سے محروم کر دیا۔ رُستم نے یہ بات عام نہیں کی ہوگی کہ اُس کے ہاں ٹھیرنے والے کیا بات جاننے کے لیے آئے تھے۔ وہ یہ بات بتا دیتا تو مولوی صاحب اور کورا کی گمشدگی کے احوال سے سارا شہر باخبر ہو جاتا اور رانا کی رُسوائی کو سند مل جاتی۔ ساتھ ہی رُستم اور اُس کے ساتھیوں کا پردہ چاک ہو جاتا۔ ویسے بھی اُسے یہ کسی کو نہیں بتانا تھا کہ اُسی نے اُس رات مولوی صاحب اور کورا کو جلنے دیا تھا۔ اِس راز سے صرف اُس کا شاگرد سہراب واقف تھا۔ رُستم خاں کو اشارۃً بھی یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ اُس کے پاس ٹھیرنے والے لوگوں نے مولوی صاحب اور کورا کا کوئی ذکر اُس سے کیا تھا۔ وہ حویلی کے عام لوگوں کی طرح حیرت کا اظہار کر رہا ہوگا لیکن یہ حقیقت خود اُس کے سینے پر بوجھ بنی ہوگی کہ اُن دو آدمیوں کے سوا یہ کام کسی کا نہیں۔ پھر رُستم پر چاروں طرف سے زور پڑ رہا ہوگا کہ جن مہمانوں کو اُس نے اپنے پرانے ساتھی کہہ کے حویلی کے لوگوں سے ملوایا تھا، وہ کون تھے اور اچانک

کیوں چلے گئے، اُن سے اُس کی کب سے آشنائی تھی۔ رُستم اپنی لاجوابی پر سب سے زیادہ شک کا ہدف بنا ہوگا حالانکہ حویلی میں اُس کی ذات شک اور شبہے سے بالاتر تھی۔ رانا سے اُس کے خاص مراسم ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ اُس نے پولیس اور حویلی کے عام لوگوں سے اپنے مہمانوں کے متعلق اُلٹ سلٹ باتیں کہی ہوں گی کہا ہوگا اُسے یقین نہیں آتا کہ ایسا اُنھوں نے کیا ہے اور اگر واقعی اُنھوں نے کیا ہے تو اُسے بہت بڑا دھوکا ہو گیا۔ وہ اسے فریب دے گئے۔ اُس رات اُنھوں نے اُسے غافل کر دیا تھا ممکن ہے اُس نے پولیس کو ماچھی اور پیرو کا کوئی فرضی پتہ بھی دے دیا ہو کسی دُور دراز مقام کا پتہ تاکہ پولیس اُنھیں ڈھونڈتی رہے۔

بمبئی شہر دُور نہیں تھا لیکن رُستم خاں کی نگاہ ماچھی اور پیرو تک زندگی بھر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ایک ہی تدبیر اُن تک پہنچنے کی رُستم کے ذہن میں آئی ہوگی کہ منیر علی کو کُرید اجائے۔ وہ محلے میں مولوی صاحب کے سب سے گہرے رفیق تھے اور اُنھی کے ذریعے رانا نے مولوی صاحب کو کورا کا پیام بھجوایا تھا۔ رُستم خاں کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ حویلی میں آنے سے پہلے پیرو اور ماچھی کا منیر علی اور دوسرے محلے والوں سے لازماً کوئی ربط ضبط رہا ہوگا اور منیر علی نے اُن سے رانا کے سلسلے میں اپنے شبہے کا اظہار کیا ہوگا۔ منیر علی ہی اُسے سامنے کے آدمی نظر آئے ہوں گے، اُنھی سے کچھ معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ لوگ کہاں سے آئے تھے، اُنھیں کسی نے کرائے پر حاصل کیا تھا یا وہ مولوی صاحب کے بچھڑے ہوئے عزیز تھے۔ رُستم کو احساس ہوگا کہ وہ اکیلا یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ پیرو اور ماچھی کے ہاتھ میں کیسی پھرتی ہے۔ بجّھل کے بقول چاقو اُن کی اُنگلیوں کے اشارے پہ ناچتا تھا۔ اُن کی اُنگلیوں میں مقناطیس لگا ہوا تھا، جو چاقو چھپکا کے رکھتا تھا اور دوسرے کا چاقو کھینچ لیتا تھا۔ اپنا اکیلا پن دُور کرنے کے لیے رُستم کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا ہوگا کہ وہ اپنے شاگرد سہراب کو ہر بات بتا دے۔ ہو سکتا ہے رُستم کو پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا ہو یا حویلی ہی میں اُس کی کڑی نگرانی کی جا رہی ہو۔ اِس موقع پر اُس کا حویلی سے باہر نکلنا ویسے بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ سہراب اور اُس کا کوئی قابلِ اعتبار ساتھی ہوگا جو منیر علی کے گھر میں چوروں کی طرح داخل ہوئے تھے۔ یہ رُستم اور سہراب جیسے رانا کے تمام ملازمین کے لیے اپنے مالک سے وفاداری اور جاں نثاری دکھانے کا وقت تھا ورنہ وہ وہاں کس لیے تھے۔ اُس کی آنکھیں نکل جانے کا اُنھیں اتنا ہی صدمہ ہوگا جتنا کسی کے خیراندیشوں کو ہو سکتا ہے۔ رانا کی بہت سی باتیں، بہت سے حکم اُنھیں ناپسند ہوں گے مگر کوئی بھی یہ نہیں چاہتا ہوگا کہ رانا کو ایسی سزا ملے۔ اُن کے دل میں آگ لگی ہی ہوگی۔ بیشتر اس وجہ سے کہ یہ سب کچھ اُن کے ہوتے ہوئے ہو گیا۔ وہ اُن دونوں آدمیوں کو ڈھونڈنے کے لیے بے چین ہوں گے۔ اُن کا چین اُسی وقت بحال ہو سکتا ہے جب وہ کہیں سے رانا کے پیروں میں پیرو

اور ماچھی کے سر یا اُن کی آنکھیں لا کے ڈال دیں۔ سہراب اور رستم نے اپنے ساتھیوں کو اشتعال دلانے کی ہر کوشش آزمائی ہو گی۔ اُنھیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ کورا اور مولوی صاحب کو ہم نے فرار کرایا تھا۔ واقعے کا یہ حصہ غیر متعلق تھا چنانچہ انھوں نے اسے خود تک محدود رکھا ہو گا۔ اگر وہ سہراب ہی تھا تو اُس نے منیر علی کو سوچنے کے لیے کچھ مہلت دی تھی۔ منیر علی نے مسلسل اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ سہراب متذبذب ہو کے چلا گیا لیکن رستم کو منیر علی کی لاعلمی کا یقین نہیں آیا ہو گا۔ وہ اپنے ساتھیوں پہ دوبارہ اُن کے گھر جانے کے لیے زور دے رہا ہو گا کہ بس وہی ایک ذریعہ ہے جہاں سے اُنھیں کچھ مل سکتا ہے، پانی وہیں مرتا ہے۔

بیکانیر واپس آ کے ماچھی یہ سب بتا رہا تھا تو میرا ذہن اتنی باتوں کی طرف نہیں گیا تھا۔ بظاہر میرے کان ماچھی کی آواز پہ لگے ہوئے تھے مگر میں تو کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ بجھل نے جب اچانک ہیرو سے بمبئی واپس جانے کو کہا تو مجھے اُس کی بات عجیب لگی تھی۔ بجھل نے ہیرو کو جیسلمیر بھیجتے ہوئے یہ ضرور بتایا ہو گا کہ وہ خود وہاں کیوں نہیں جا رہا ہے اور کون سی ایسی رکاوٹ اُسے درپیش ہے۔ ہیرو نے خیال نہیں کیا۔ اُسے اُسی دن حویلی سے واپس آ جانا چاہیے تھا جب اُس نے مولوی صاحب کے متعلق رستم کی باتوں پہ اعتبار کر لیا تھا۔ بہر حال گزرا ہوا اب لوٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ راستے میں پہلی بار جب میں نے بجھل کی زبان سے یہ سُنا تھا کہ اُس کا ارادہ جیسلمیر جانے کا ہے تو میں سمجھا تھا' وہ محض اپنی تسلی کے لیے صورتِ حال کا اندازہ لگانے جا رہا ہے۔ اُس وقت پیش آنے والے حالات کا صرف دھندلا دھندلا ایک خواب مجھے نظر آیا تھا، ایک بُرا سا خواب ہمیں کسی طور کل ہی رات یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ منیر علی کی آنکھیں لال ہو گئی تھیں۔ بجھل اُن سے جو سب سے بڑی بات کہہ سکتا تھا' وہ یہی تھی کہ وہ اُن کے گھر پہ موجود رہے گا تا کہ وہ رستم کی طرف سے دوبارہ آنے والے آدمیوں کا سامنا ہم سے کرا دیں مگر خود کو آنے والے آدمیوں کے سامنے کر دینے کی پیشکش اور رانا کے واقعے سے اپنی بے تعلقی اور بے خبری کے اصرار کے باوجود واقعات کی ترتیب اور تسلسل کی بات منیر علی کے دماغ میں جونک کی طرح چمٹ گئی تھی۔ رہ رہ کے اُنھیں شاید یہی خدشہ ڈس رہا تھا کہ اگر ہمارا کوئی تعلق نکلا تو ہماری یہاں موجودگی اُن کے لیے اور ضرر رساں ہو سکتی ہے۔ کسی اور کا معاملہ ہوتا تو بات دیگر تھی مگر یہ معاملہ رانا کا تھا اور وہاں بھانت بھانت کے ملازم موجود تھے۔ انھوں نے رانا اور اُس کے آدمیوں کے بارے میں بے شمار باتیں سُنی تھیں اور بجھل نے اِس کا کوئی معقول جواز پیش نہیں کیا تھا کہ رانا کے ہاں چلنے والی گولی کا دھماکا اُن کے گھر میں کیوں ہوا۔ انھوں نے دبے دبے لفظوں میں پھر ہمیں اپنے گھر سے چلے جانے کا مشورہ دیا لیکن بجھل کو معلوم تھا کہ وہ لوگ دوبارہ آئیں گے، پولیس نہیں آئے گی کیونکہ وہ پولیس کی توجہ ہرگز منیر علی کے گھر کی جانب مبذول نہیں کریں گے۔ وہ خود آئیں گے اور منیر علی یہ نہیں جان رہے ہیں کہ وہ پہلے کی طرح اِس نالہ و شیون سے اُنھیں متاثر نہیں کر سکیں گے۔ "ہماری بات آپ کے دل نہیں لگتی تب بھی ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ اِدھر آپ کے ساتھ گے۔ ہاں آپ چاہو تو کہیں اور جا سکتے ہو۔" بجھل نے اُونچی آواز میں

"کیا مطلب؟" منیر علی بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولے۔

"مطلب یہ کہ آپ کچھ دنوں کے لیے کسی اور شہر چلے آپ کوئی ایسا اندیشہ محسوس کرتے ہو۔ ہم کو یہیں رہنے دو۔ جب اِدھر ہو جائے گا' ہم آپ کو واپس بُلا لیں گے۔"

"مگر میں کہاں جاؤں گا؟ جہاں بھی جاؤں گا' وہ میرے پیچھے گے' لوگ میرے تمام ٹھکانوں سے واقف ہیں۔ اِس سے تو وہ اور ہو جائیں گے اور پھر میں.... اپنا گھر بار چھوڑ کے کہاں جا سکتا ہوں' ساتھ بچے بچیاں ہیں۔ ایک دیوانہ سا لڑکا بھی ہے۔"

"آپ ان سب کو لے کے ہمارے گھر چلے جاؤ' وہاں آپ طرح محفوظ رہو گے۔ وہاں تک کوئی آپ کا پیچھا کرتا ہوا بھی نہیں اور آپ کو اُدھر کوئی تکلیف بھی نہیں ہو گی۔ بڑے صاحب! آپ یہی بہتر ہے کہ آپ نکل جاؤ۔ عزت کے لیے لوگ سب کچھ کر لیتے مولوی صاحب کو دیکھو' اُنھوں نے کیا نہیں کیا۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں' آپ کو گھر بار کی فکر ہے۔ آپ سب کا آپ نے ہم سے سودا کر لیا۔ پن چکی' زمینیں' گھر' سامان' آپ کی نظر میں ان کا جو بنتا ہو' ہم کو بول دو' ہم آپ کو ادا کر دیں ہی نہیں کہ ادا کر کے آپ کا ہم سے واسطہ نہیں ہو گا۔ ہمارے پاس زمین ہے جس کی دیکھ بھال کے لیے اُدھر کوئی نہیں ہے۔ ہمارے بچے بچیاں ہیں' آپ کو اُدھر جا کے کوئی دُکھ نہیں ہو گا۔ ہو گا تو ہم قریب ہی ہوں گے۔ آپ ہماری گردن پکڑ لینا' پر یہاں سے چلے

"آپ.... آپ یہ کیسا مذاق کر رہے ہیں؟"

"نہیں بڑے صاحب! میں آپ سے مذاق نہیں کر سکتا بھی مسخری کا نہیں ہے۔ میں صحیح بات بول رہا ہوں' آپ نے بٹھایا ہے۔ ہم کو کچھ کرنے دو۔"

"گویا آپ کا خیال ہے کہ میں یہ جگہ' یہ محلہ' رشتے دار سب کو چھوڑ دوں' یہاں سے وہاں چلا جاؤں جہاں مجھے کوئی نہیں آپ کہنا چاہتے ہیں کہ جو اندیشہ مجھے لاحق ہے' اُس کا اب کو بھی احساس ہو رہا ہے"

"ہاں بڑے صاحب!" بجھل نے سر جھکا کے کہا۔ "کچھ ایسا

"اور خود آپ یہاں ٹھہرے رہنے پر کیوں بہ ضد ہیں؟"

"پھر ہم بھی اِدھر نہیں رہیں گے۔"

"اور جو سودا آپ مجھ سے کر رہے ہیں' اُس کا کیا ہو گا؟"

"وہ ہم اِدھر ہی چھوڑ دیں گے۔"

"یہیں چھوڑ جائیں گے؟" منیر علی پھٹی ہوئی آنکھوں سے بجھل کو گھورنے لگے۔ "فرض کیجیے' میں آپ کی ہدایت پہ عمل کر لیتا ہوں تو کیا آپ میرے ہمراہ ہی چلیں گے؟"

"ہم بھی آپ کے ساتھ چل سکتے ہیں' پر آگے پیچھے۔ آپ اِدھر سے جائے گے' اُدھر ہم آپ کے پیچھے چل پڑیں گے۔ ہم دونوں کا ساتھ نکلنا ضروری نہیں ہے۔ آپ کسی سامان کے بغیر جاؤ اور ہو سکے تو رات کی ہی گاڑی سے ہی۔"

"بس کیجیے۔ خدا کے لیے چُپ ہو جائیے۔"

"بڑے صاحب! ہم پہ اعتبار کرو۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے جناب!" منیر علی تُرشی سے بولے۔

"کیوں نہیں ہو سکتا۔ آدمی جس زمین میں رہتا ہے' جڑ پکڑ لیتا ہے۔"

"مجھے یہاں رہتے ہوئے عمر گزر گئی۔ اب اِس آخری وقت میں' میں کہاں جاؤں گا۔ آپ کی منشا میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے' کچھ دیر پہلے آپ اور کہتے تھے' اب کچھ اور کہنے لگے ہیں۔ میری آنکھوں سے اندھیرا ہٹائیے پہ رحم کیجیے۔"

"میں نے کچھ دیر پہلے ایک اور بات بھی بولی تھی بڑے صاحب سر پہ اتنا ہی بوجھ رکھو جتنا وہ سہار لے' باقی بوجھ دوسروں کو دے دو۔ آپ یہاں رہو گے تو یہ بوجھ کم نہیں ہو گا اس لیے اچھا ہے کہ آپ جگہ بدل دو۔ پھر جیسا آپ چاہتے ہو' ویسا نہ ہوا اور بات بگڑ گئی تو پچھتاوے کا وقت نکل جائے گا' پر ابھی وقت آپ کی مٹھی میں ہے۔"

"وقت نکل جائے گا' یعنی آپ....؟" منیر علی سرتا پا لرزنے لگے۔

"بڑے صاحب! آپ کو دیکھ کے اور آپ کی باتیں سُن کے مجھے بھی اب یہ دِکھ رہا ہے کہ آپ کا یہاں سے ٹل جانا بہتر ہے۔ آپ کا سوچنا غلط نہیں' وہ بہت بُرے لوگ ہیں۔ فرض کرو' اُن کا شک آپ پہ ہی جم جائے؟"

"مجھ پہ! مجھ کمزور اور بوڑھے آدمی پہ!"

"اندھے کو کچھ دکھائی نہیں دیتا' اُنھوں نے کئی رات کہاں دیکھا کہ آپ جھوٹ نہیں بول رہے ہو۔ کیا آپ سمجھتے ہو کہ اُن کو یقین آ گیا؟"

"نہیں آیا' بالکل نہیں آیا۔"

"پھر میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔"

"مگر میں اِس طرح کہاں جا سکتا ہوں' میں نہیں جا سکتا۔"

"آپ سوچ لو' فیصلہ آپ کو ہی کرنا ہے' میں آپ کو زبردستی کہیں نہیں بھیج سکتا' ایسا ہوتا تو ضرور کر لیتا۔"

"آپ نے اُلجھن اور سوا کر دی ہے۔"

"یہاں مولوی صاحب سے سب سے زیادہ آپ کا رشتہ تھا' اُن کی بات بیچ میں آ گئی ہے تو سب سے پہلے آپ کا خیال جائے گا۔"

"مگر میں نے.... میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔" وہ کانپنے لگے۔

"پر جب تک آپ لوگوں کو سمجھاؤ گے' بل پڑ چکا ہو گا۔"

منیر علی پہ جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

اُنھیں گُنگ بیٹھے بیٹھے دیر ہو گئی تو بجھل نے اُن کا بازو تھپتھپایا۔ "چھوڑو بڑے صاحب! آپ گھر میں جاؤ' کچھ دیر آرام کرو۔ کہیں اور جاتے ہوئے آپ کا دل نہیں ٹھکتا تو پھر اِدھر ہی رہو' پر جی کڑا رکھو۔ زندگی کپڑوں کی طرح ہوتی ہے' پہنو گے تو داغ دھبے بھی پڑیں گے۔ یہ زمین ہے' آسمان نہیں ہے' جدھر مٹی نہیں ہوتی۔ ہم بھی یہیں بیٹھے ہیں۔ جو ہو گا' دیکھیں گے۔ بیٹھک کی کنڈی کھول دو۔ کچھ ہوا آئے گی۔ ہم لوگ بہت تھکے ہوئے ہیں' ذرا کمر ٹکا لیں۔"

"دروازہ بند ہی رہنے دیجیے۔" وہ سراسیمگی سے بولے۔

"اُسے کھلا رہنے دو بڑے صاحب! اُن کو پتہ ہو جائے گا کہ ہم آ گئے ہیں۔"

بجھل خود اُٹھ کے دروازے تک گیا۔ منیر علی اُچھل پڑے۔ وہ بجھل کو روکنا چاہتے تھے مگر اُن کے ہونٹ پھڑک کے رہ گئے۔ بجھل نے پلٹ کے اُن کی طرف دیکھا اور دروازہ کھولے بغیر واپس آ کے پلنگ پہ لیٹ گیا۔

دروازہ دن بھر بند رہا۔ اندر اتنا اندھیرا نہیں تھا۔ بیٹھک سے ملحق چھت پہ جانے والے زینے کے روشن دان سے روشنی خوب آ رہی تھی۔ اُدھر غسل خانے کے حصے کی طرف کھلنے والا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ ہمیں تاریکی کا احساس نہیں ہوا۔ گلی میں چلنے والے لوگوں کی آوازیں کبھی کبھی صاف سنائی دیتی تھیں۔ اندر گھر میں کوئی آواز' چہکار نہیں تھی۔ منیر علی صبح شربت کی ٹرے رکھ کے گئے تو پھر اُنھوں نے سہ پہر کو بیٹھک میں قدم رکھا۔ انھوں نے کھانا لا کے ہمارے سامنے رکھ دیا لیکن خود شامل نہیں ہوئے۔ بجھل نے اُن سے طبیعت کی ناسازی کا عذر سُن کے تکرار بھی نہیں کی۔ جب تک ہم کھاتے رہے' وہ خاموش بیٹھے رہے اور پلیٹیں اُٹھا کے چل دیے۔ وہ اپنے چھوٹے لڑکے کو مدرسے چھوڑنے اور بازار میں پن چکی کا حساب کتاب کرنے بھی نہیں گئے تھے البتہ نماز پڑھنے کے لیے وہ مسجد ضرور جاتے رہے۔ اُنھیں خیال ہو گا کہ جماعت میں خلافِ معمول اُن کی غیر حاضری کے سبب نمازی کہیں اُنھیں پوچھنے کے لیے گھر تک نہ آ جائیں اور کسی کو ہماری موجودگی کا پتہ نہ چل جائے۔ گھر کے خاص دروازے پر کئی مرتبہ کنڈی کھٹ کھٹانے کی آواز آئی مگر بیٹھک میں کوئی نہیں آیا، بوڑھی ملازمہ اور منیر علی کا چھوٹا لڑکا بھی نہیں۔ بیٹھک بند تھی۔ لیٹے لیٹے میری کمر دُکھنے لگی تھی۔ میں نے طاقوں میں رکھی ہوئی منیر علی کی کتابیں بھی اُلٹ پلٹ کے دیکھیں مگر اُن میں میرا جی نہیں لگا۔ اُن میں زیادہ تر مذہبی یا طب سے متعلق کتابیں تھیں۔

سہ پہر کو پہلی بار روشن دان کی جالیوں پر زہرہ کا چہرہ نظر آیا۔ میں اُسی سمت کروٹ لیے ماتھے پر ہاتھ رکھے لیٹا تھا۔ آنکھیں بھی انگلیوں میں چھپ گئی تھیں کہ یکایک روشن دان پر مجھے اُس کی آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ہاتھ نہیں ہٹایا۔ مجھے اُس کے آنے کی توقع تھی۔ کئی دفعہ روشن دان کی جانب بے اختیار میری نگاہیں اٹھی تھیں نہ جانے کیوں مجھے دوبارہ اُسے دیکھنے کی جستجو تھی میرے جانے کے بعد ممکن ہے اُسے افسوس ہوا ہو کہ میری بات کا اُس نے جواب کیوں نہیں دیا۔ ہو سکتا ہے اُسے یہ احساس بھی ہو گیا ہو کہ میرے سامنے زبان کھولنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میری التجا بہت معمولی تھی۔ میں تو ایک مسافر تھا، ہمیشہ کے لیے اس کے گھر میں رہنے کے لیے نہیں آیا تھا اور میں نے اُسے یقین دلانے کی پوری کوشش کی تھی کہ مجھے صرف کورا کے بارے میں پوچھنا ہے کیونکہ وہ اُس کی ہم جولی رہی ہے۔ میری آنکھوں پر انگلیوں کا پردہ دیکھ کے وہ ایک بار تو سہم کے پیچھے ہو گئی۔ میں نے اپنا جسم باندھے رکھا اور انگلیوں کی درزوں سے روشن دان کی طرف نظریں جمائے رہا۔ چند ہی لمحوں بعد اُس کا چہرہ پھر جالیوں پر اُبھرا۔ اُدھر روشنی خاصی تھی۔ اس لیے میں اُس کے خدوخال واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور چہرہ دھوپ کی تمازت سے آگ کی طرح جل رہا تھا مگر اُس کا رنگ ہی ایسا تھا۔ وہ پلکیں جھپکاتی، زاویے بدل بدل کے اندر بیٹھک میں جھانکتی رہی۔ نہ جانے وہ یہاں کیا دیکھنا چاہتی تھی۔ اندر بیٹھک میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ دونوں پلنگوں پر ہم اوندھے سیدھے پڑے ہوئے تھے۔ اُس کا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا ہوا تھا اور ہوا سے بالوں کی لٹیں اُڑ رہی تھیں۔ دوپٹا سر سے ڈھلکا ہوا تھا اور گلے پر آ کے ٹھہر گیا تھا۔ پھر اُس کی نگاہیں مجھ پر آ کے ٹک گئیں۔ مجھے جھرجھری سی آنے لگی اور ایسا لگا جیسے کورا نے اُس سے کہا ہو کہ مجھے خوب غور سے دیکھ کے آئے۔ ہم جولیاں ایک دوسرے سے ایسی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ وہ تھوڑی ہی دیر وہاں ٹھہر سکی۔ منیر علی ظہر کی نماز پڑھ کے گھر واپس آ گئے تھے اور دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ دوسری بار عصر کی نماز کے وقت مجھے پھر اُس کا دوپٹا روشن دان کی جالیوں پر سرسراتا ہوا نظر آیا۔ مجھ سے غلطی ہو گئی کہ میں نے نظریں اُٹھا کے اُس جانب دیکھ لیا۔ اُس کا منہ کھل گیا اور وہ چشم زدن میں اوجھل ہو گئی لیکن ابھی منیر علی نماز سے لوٹے نہیں تھے کہ کسی نے دروازہ کھٹ کھٹا کے چائے لینے کو کہا۔ وہ اُسی کی آواز تھی۔ میں بھاگ کے دروازے پر پہنچا اور میں نے پٹ کھولنے میں احتیاط رکھی مگر وہ سامنے ہی کھڑی تھی۔ اُس کا وہی عالم ہوا اب کے وہ بھاگی تو نہیں نہ اُس کے ہاتھ سے ٹرے گری مگر اُس کا سارا بدن کسی شاخ کی طرح تھرتھرا کے رہ گیا۔ اُس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے میں وہ آڑ میں ہو گئی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے ٹرے اُس کے کپکپاتے ہاتھوں سے تھام لی۔ بجّل جاگ رہا تھا۔ اِس کے باوجود میں وہیں کھڑا رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ شاید شرمندگی کا اظہار کرتی۔ میں نے بہت ارادہ کیا کہ اُس کوئی بات کروں لیکن لفظ میرے حلق میں اٹک گئے تھے۔ میں زیادہ وہاں کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں بولی۔ میں نے کواڑ بھیڑ دیے۔ کوئی اُمید رکھنا بیکار تھا۔ میں نے عہد کیا کہ اب روشن دان کی نگاہ نہیں اُٹھاؤں گا یا وہ کوئی چیز لے کے آئے گی تو دروازے پر جاؤں گا۔ سب لاحاصل ہے۔ زہرہ اگر کچھ بتا بھی دیتی تو میں کیا کر لیتا کا پتہ تو اُسے بھی نہیں معلوم تھا۔ ماچی نے رستم کی زبانی سنی ہوئی آخری سی باتیں اُس کے متعلق بتائیں تو مجھے کیا حاصل ہوا۔ رات کے کھانے منیر علی ہمارے ساتھ رسمی طور پر شریک ہوئے۔ اُن کی زبان کو چپ لگ گئی تھی۔ ہم دونوں بھی سر نیچے کیے لقمے نگلتے رہے۔ دن بھر ہم ایک پل بھی باہر نہیں نکلے تھے۔ بجّل کے پاس بیڑی کا بنڈل بھی ختم ہو گیا تھا۔ کھانے سے نمٹ کے منیر علی فوراً اندر چلے گئے۔ بجّل کچھ دیر تک بیٹھک میں چہل قدمی کرتا رہا۔ پھر میری چارپائی پر آ کے بیٹھ گیا۔ اُس نے میری گردن اپنے بازو میں جکڑ لی۔ "کدھر کی سیر کر رہا ہے؟" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بوجھل آواز میں بولا "کچھ بول رے۔"

"کیا بولوں۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"جی کیسا ہے؟"

"سب ٹھیک ہے۔"

"تو نے کچھ پوچھا نہیں؟" اُس نے سرگوشی کی۔

"کا ہے کے بارے میں؟"

"کسی کے بارے میں بھی۔"

"تمھی کچھ بتا دو۔"

"میں کیا بولوں۔ تُو تو سب دیکھ رہا ہے۔"

"پھر میں کیا پوچھوں۔"

"بولتا رہا کر۔" وہ لمبی سانس کھینچ کے بولا۔

"فضول زبان چلانے سے کیا فائدہ۔"

"ساری زندگی گھاٹا ہے لاڈلے! ہر وقت فائدے کی مت سوچ۔ منہ کو کبھی کبھی یوں بھی کھول لیا کر۔ جیسا کہ ہوا اور دھوپ لگتی رہتی ہے جی ہلکا رہتا ہے۔"

"تم اس وقت اسے ہوا ہی لگا رہے ہو، دھوپ تو ہے نہیں۔"

"ٹھیک بول رہا ہے، ابھی بھاری نہیں ہوئی، دھار رکھی ہے۔"

"کیا بھاری نہیں ہوئی؟"

"تیری زبان! میں سمجھا تھا، ایک کروٹ لیٹے لیٹے بھاری ہو گئی پر دھار نہیں اتری ہے۔ اپنے آپ سے بولتا رہا ہے۔"

"اپنے آپ سے کیا بولوں گا، میرے پاس سوال ہی سوال ہیں۔ دینے کے لیے بھی تو کچھ ہونا چاہیے۔"

"تو اکیلا ہی ایسا نہیں ہے۔ ہر آدمی سدا سوال جواب کی یہ لاٹری ڈالتا ہے۔ نتیجہ بیتّن نکلتا ہے۔ پر کبھی کبھی ٹھیک بھی جواب آ جاتا ہے۔ سمجھ لے کی چاندی ہو گئی۔ یہ جوا کھیلتے رہنا چاہیے۔ آدمی ٹھیک طرح اپنے کو جواب دیتا ہے۔ پانسا پھینکے جا، پر جواریوں کی طرح نہیں، بھیجا جائے گا۔" میں چپ رہا۔ اُس کی گرفت سے میری گردن میں درد رہا تھا۔ میں نے گردن چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ میرا دل چاہا میری گردن توڑ ہی دے۔ لیکن اُس نے دو تین جھٹکے دے کے خود اپنا ڈھیلا کر دیا اور رُک رُک کے بولا "لاڈلے! رات کو آنکھ جگی رکھنا۔"

"کیوں؟" میں نے تندی سے پوچھا حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ اس قصد ہے۔ اُس کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے کہا "ضروری نہیں وہ آج ہی آ جائیں۔"

"ہاں! وہ سر ہلا کے بولا "تو بھی یہی سوچ رہا ہے پر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ نہ آئیں۔ انھیں آ جانا چاہیے۔"

"اور اگر وہ کل، پرسوں، اترسوں ایک ہفتے تک نہ آئیں؟"

"ایسا مشکل دیکھتا ہے پر یہ اُس کے بعد سوچیں گے۔"

"اس کے بعد کیا سوچو گے؟"

"پھر چل پڑیں گے۔"

"کہاں؟"

"تجھ کو پتہ نہیں رے۔"

"اب کدھر جاؤ گے؟"

"تیرا ارادہ کدھر کو ہے؟"

"گھر چلیں گے۔" میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"گھر! کون سے گھر؟"

"زرّیں کے ہاں!"

اُس کی آنکھیں میرے چہرے پر منڈلانے لگیں۔ "تجھے اُس کا کیسے آ گیا؟"

"بس یوں ہی۔ دن بہت ہو گئے، وہ لوگ انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"چھوٹا یاد آ رہا ہے۔ رجّو!"

"اُس کا نام جہاں گیر ہے۔"

"ہاں ہاں، اُسی کو بولتا ہوں، وہ اُدھر سکھ سے ہو گا۔"

"اُسی طرف چلو۔"

"پہیلی بوجھ رہا ہے۔"

"تم نہیں سمجھ رہے۔" میں نے وحشت سے کہا۔

"کیا ہے رے! یہ اچانک کمان کیوں چڑھا لی؟"

"سب بے کار ہے۔"

"جانتا ہوں تو اُدھر چلنے کو کیوں بول رہا ہے۔"

"کیوں بول رہا ہوں۔"

"رسّی کاٹنے کی سوچ رہا ہے پر لاڈلے! یہ تیری بھول ہے۔"

"میرے دماغ میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"سمجھ لے، تُو نے اب کے ایسا کیا تو میں تجھ سے کبھی نہیں بولوں گا۔"

"میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں۔"

"میں سُن رہا ہوں، پر تُو وہاں رہے گا نہیں۔"

"میرے پیر میں زنجیر ڈال دینا۔"

"وہ تو کب سے پڑی ہوئی ہے۔"

"تم میری بات نہیں سُن رہے ہو۔"

"تو بھی میری بات نہیں سُن رہا ہے۔"

"میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں۔"

"اس ٹائم تو ضرور سچ کہہ رہا ہے پر...." وہ میری کمر پر زور سے ٹھونگا مارتے ہوئے بولا "کمر تو ابھی تیری ٹُن بول رہی ہے۔ رہنے دے، پھر بات ہو گی اور ہاں! ایک بات کان میں ٹانک لے۔ اپنی مٹی میں چکنی مٹی زیادہ پڑی ہوئی ہے۔ صرف اپنے آپ کی بابت سوچا کر۔ یہ بار بار آنکھ مچولی کیوں کرتا ہے۔" وہ مجھے بستر پہ دھکا دے کے اپنے پلنگ پر چلا گیا۔ کمرے میں سکوت چھا گیا۔ گلی میں ہر آواز اندھیرے میں ڈوب گئی تھی۔ کچھ توقف کے بعد وہ نسبتہً اونچی آواز سے بولا "لاڈلے! کان کھلے رکھنا۔"

"تم سو جاؤ۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

بیٹھک میں کوئی گھڑی نہیں تھی مگر اندازاً اس وقت گیارہ بجے ہوں گے۔ پلنگ پہ لیٹنے سے پہلے بجّل نے پھونک مار کے لالٹین بجھا دی تھی۔ میں نے اُٹھ کے صراحی ٹٹولی اور ایک کٹورا پانی لے کے پھر اپنے بستر پہ آ گیا۔ ہوا بالکل بند تھی۔ بستر جسم سے چپکا جا رہا تھا۔ میں نے اُسے لپیٹ کے پیروں کی طرف کر دیا اور کھری چارپائی پر پاؤں پھیلا کے لیٹ گیا۔ ادوائن کسی ہوئی نہیں تھی میرے بوجھ سے چارپائی میں گڑھا سا پڑ گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے چارپائی اندر زمین میں دھنسی جا رہی ہے۔ اس حبس میں نہ جانے کیسے بجّل کی آنکھ لگ گئی تھی۔ اُس کی سانسوں کے تواتر سے پتہ چلتا تھا کہ وہ گہری نیند سو رہا ہے۔ میں دیر تک درمیان میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھا رہا۔ پھر دبے قدموں چلتا ہوا غسل خانے کی طرف آ نکلا۔ یہ جگہ کھلی ہوئی تھی اور آسمان صاف نظر آتا تھا۔ اُوپر ستاروں کا جال بچھا ہوا تھا لیکن چاند کا دُور دُور پتہ نہیں تھا۔ دیوار کے کونے میں اُگی ہوئی چنبیلی کی بیل کا پتا پتا ساکت تھا۔ آدھی بیل دوسری طرف منیر علی کے صحن میں اُتر گئی تھی۔ اُسے دیکھ کے مجھے خیال آیا کہ دیوار پر چڑھ کے منیر علی کے گھر میں ایک نظر کیوں نہ جھانک لوں۔

دیوار پر چڑھنے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اس کا تجربہ میں پہلے ہی کر چکا تھا۔ میں نے سر اٹھایا ہی تھا کہ فوراً نیچے کر لیا۔ منیر علی جاگ رہے تھے اور دالان کے تخت پر قبلہ رخ بیٹھے ہوئے تھے۔ میری سانس پھولنے

گی، اگر وہ مجھے یوں جھانکتے ہوئے دیکھ لیتے! میں دیوار سے ہٹ گیا۔ منیر علی ترچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ چند لمحوں بعد میرے اوسان بحال ہوئے تو اندر دیکھنے کی کُھد بُد پھر ہوئی۔ میں نے آہستگی سے دوبارہ سر اُٹھایا۔ دالان میں منیر علی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ جن کمروں کے دروازے مجھے نظر آئے، وہ سب کے سب بند تھے۔ بائیں طرف مولوی صاحب کے گھر کی کھڑکی نظر آ رہی تھی۔ منیر علی جا نماز پر تسبیح کا ورد کر رہے تھے۔ میں انھیں دیکھتا رہا مگر پھر میری آنکھیں دُھندلانے لگیں، میں بیٹھک میں واپس چلا آیا۔

رات خاصی گزر چکی تھی۔ مجھے اب کسی کے آنے کی توقع نہیں رہی تھی۔ رات کے آخری حصے میں کسی لمحے نیند مجھ پر غالب آ گئی مگر بہت زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ یہ خواب نہیں تھا، میں نے ایک گھٹی ہوئی چیخ سنی تھی۔ بچّل نے بھی سنی تھی۔ وہ اُچھل کے پلنگ سے اُتر گیا۔ "لاڈلے!" اُس نے سرگوشی میں مجھے پکارا۔ "اندر کھڑ کھڑ ہے۔"

میں نے بھاگ کے گھر میں کھلنے والے دروازے سے کان لگا دیے اور جھنجوڑ کے اُسے کھولنا چاہا مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ منیر علی نے اُسے بند کر دیا تھا۔ "اِدھر سے آؤ۔" میں نے بچّل کا ہاتھ پکڑ کے اُسے کھینچ لیا۔ "غسل خانے کی طرف، اُدھر دیوار سے بھی ایک راستہ ہے۔"

ہمیں گھر کے صحن میں کودنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ میرا چاقو ہاتھوں میں دبا ہوا تھا مگر بچّل نے دیوار پر چڑھتے ہی مجھے چاقو جیب میں رکھنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ اندر کا سارا منظر بدلا ہوا تھا۔ صحن میں روشنی کم تھی مگر سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ دو آدمیوں نے منیر علی کو بے بس کر رکھا تھا، دو کے قبضے میں زہرہ تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ جیسے ہی ہمارے اندر کودنے کی آواز ہوئی۔ دونوں آدمی منیر علی کو دھکا دے کے ہماری طرف بڑھے۔ باقی دو زہرہ کو کھینچتے ہوئے دروازے کی طرف لے جانے لگے۔ بچّل نے مجھے اُسی طرف جانے کو کہا۔ زہرہ بے سُدھ تھی۔ سَر پہ دوپٹا بھی نہیں تھا۔ پھر میں نے بچّل کو دیکھا اور جھپٹ کے اُن دونوں کے کرتوں کے گلے پیچھے سے پکڑ لیے۔ انھوں نے پروا نہیں کی بلکہ اور تیز بھاگنے لگے۔ ڈیوڑھی کے قریب ایک آدمی نے زہرہ کو اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ دوسرے نے دفعتاً مڑ کے میرے سینے پر چاقو مارنے کے انداز میں جھپکی دی۔ میں اور آگے بڑھ گیا۔ وہ مجھے چاقو مارنا نہیں چاہتا تھا اس لیے کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے دوسرے آدمی کی فکر تھی، جو زہرہ کو لے کے آگے بڑھ گیا تھا۔ بچّل نے ٹھیک ہی کہا تھا، چاقو میرے ہاتھ میں نہ ہونے کی وجہ سے میرے مقابل شخص نے مجھے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ وہ اپنے بچاؤ کے بجائے مجھ پر حملہ کرنے میں پہل کر سکتا تھا اور یہی صورت میرے لیے بہتر تھی۔ ماچھی کی زبانی مجھے رُستم کے ساتھیوں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا پھر بھی اُس کے ہاتھ میں چاقو تھا اور رسوخنی زیادہ نہیں تھی۔ پھر مجھے فوراً اُسے راستے سے ہٹا کے جلد از جلد دوسرے آدمی تک پہنچنا تھا۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ گلی میں اُن کے کچھ اور آدمی نگرانی کے لیے موجود ہوں۔ دُور کر[ا]
بھی کھڑی ہو گی۔ یقیناً اندر گھر میں پہلے ایک آدمی کودا ہو گا اور اُس
دوسرے ساتھیوں کے لیے اندر سے ڈیوڑھی کا دروازہ کھول د[یا]
دروازہ کھلا ہونا چاہیے تھا، چاہے اس میں تالا پڑا ہو۔ تالا اُکھا[ڑ]
بھی توڑ دیا ہو گا یا منیر علی سے چابی حاصل کر لی ہو گی ورنہ باہر ن[کلنے میں]
اُنھیں دشواری ہوتی خصوصاً اس صورت میں کہ واپسی میں اُن
گھر کا ایک فرد بھی موجود ہو۔ ڈیوڑھی میں اور آدمی بھی چھپے ہو سک[تے تھے]۔

میرے سامنے والا شخص اپنی جھپکی کے جواب میں میرے
کی وجہ سے جیسے ہی پیچھے ہوا تو غیر اختیاری طور پر اُس کا چاقو
اُس کے جسم سے کچھ پیچھے چلا گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ دوبارہ حملہ
بھی یہی کرے گا۔ میں نے تیزی سے کسی قدر بائیں طرف جھک [کے اُس کا]
چاقو والا ہاتھ اپنے پنجے میں کس لیا۔ اُس کی ساری توجہ اُس
مرکوز ہو گئی۔ اسی دوران میں نے مجبوراً سامنے سے ایسی نازک ج[گہ پر ضرب لگائی کہ]
وہ درد سے اُٹھ نہیں سکتا تھا۔ عام حالات میں میں کبھی ایسا ن[ہ کرتا مگر]
ایک ایک لمحہ بھاری تھا۔ بچّل نے چاقو کو منع کر دیا تھا۔ یہ منیر علی [کا گھر تھا]
یہاں خون کا چھینٹا نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ وہ لوگ بھی شور کرنا [نہیں چاہتے]
تھے۔ منیر علی کے لیے بھی یہ مناسب نہیں تھا۔ اُدھر مشرق کی سم[ت مولوی]
صاحب کا گھر تھا، مغرب میں ایک دوسرا مکان تھا۔ وہاں لوگ
بھی جاگ سکتے تھے۔ مکان کے پچھلے اور اگلے حصے میں تنگ گ[لی تھی]۔
اُس نے درد سے بے چین ہو کے سسکی بھری اور زمین پر لو[ٹنے لگا۔ درد]
اتنا شدید تھا کہ اُس کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے
موقع نہیں دیا، گردن پر میرے ہاتھ کی ضرب نے اُسے درد
دلا دی۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اپنے ساتھی کی سسکاریاں [سُن کے دوسرا]
آدمی اپنا سر آگے کیے کسی دیوانے کی طرح ڈیوڑھی سے برآمد [ہوا۔ اُس کے]
کندھے پر زہرہ نہیں تھی۔ اُس نے ایک نظر اپنے ساتھی کو د[یکھا۔ میں نے]
ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ اُس نے اُچھل کے مجھے اپنے [بازوؤں]
میں لینا چاہا۔ میں اُلٹے قدموں دالان کی جانب ہو گیا اور اچا[نک وہ]
کے ڈیوڑھی کی طرف بھاگا۔ راستے میں ڈیوڑھی کے ایک کو[نے میں پڑی]
ہوئی زہرہ کی چوٹی سے میرے پیر اُلجھ گئے۔ اُس کے بدن کو
میں وہاں رُکا نہیں، اُسے وہیں چھوڑ کے میں نے کُنڈی لگا
میں وہ میرے سر پہ پہنچ گیا تھا۔ نکلنے کی کوئی صورت نہیں
کے ہاتھ میں چاقو بھی ہو سکتا تھا۔ اپنے بچاؤ میں میرے
کے لیے جگہ تنگ تھی۔ ڈیوڑھی میں گہرا اندھیرا تھا۔ نہ وہ۔
نہ میں اُسے۔ نیچے ہو کے میں اُس کی ٹانگیں بھی نہیں اُکھ[اڑ سکتا تھا]
کے ہاتھ کھلے رہتے اور اگر چاقو اُس کے پاس تھا تو اُسے
ہوتی۔ وہ دروازے کے قریب آ کے ٹھہر گیا تھا۔ میں نے

[ف]اصلے کا تعین کیا۔ چاقو مارنے میں اُس کا ہچکچانا بھی لازم تھا کیونکہ
[میر]ا میرے لیے دیوار بنا ہوا تھا، اُس کے لیے بھی مشکل پیدا کر دیا۔
[...]ں کا بڑھایا ہوا ایک ہاتھ خالی چلا جاتا تو شاید اُسے دوسری بار ہاتھ
[چ]لانے کا وقت نہ ملتا۔ باہر صحن میں اپنے ساتھی کا حشر وہ دیکھ چکا
اور اُس کے وہ دونوں ساتھی بھی اندر سے نہیں آئے تھے جو منیر علی کو
[...]ے ہوئے تھے اور بچّل کو سامنے دیکھ کے اُس سے بھڑ گئے تھے۔ میرے
[ذہن] میں ایک اور بات آئی کہ اپنا منہ ایک طرف کر کے آواز نکال کے
[...]یہ بتا دوں کہ میں کس جانب کھڑا ہوں اور جھٹ دوسری طرف
[...]بائیں منہ کے بجائے میں ہاتھ بڑھا کے بھی آہٹ پیدا کر سکتا تھا۔
[میں] نے یہی کیا اور اُس نے بھی وہی کیا جس کی مجھے اُمید تھی۔ میں عقب
[سے] اُس کی گردن ٹیڑھی کر کے جھٹکا دینا چاہتا تھا لیکن مجھے اس کی مہلت
[نہیں م]لی۔ بہرحال میں نے اُس کے مڑنے سے پہلے بازوؤں میں بازو ڈال
[کے] اُسے ہاتھ چلانے سے معذور کر دیا لیکن وہ پشت سے میرے جسم پر
[...]ں اور ٹخنے مار سکتا تھا اور کمر ترچھی کر کے مجھے دوسری سمت لوٹ
[سکتا] تھا۔ آگے اس کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ دروازے میں اَڑا ہوا تھا۔
میں نے اُس کے امکانی واروں کا خیال رکھا تھا۔ میں نے اپنا جسم اُس
[سے] دُور نہیں کیا۔ ٹانگیں اُس کی ٹانگوں سے چپکا لیں۔ اُس نے اپنا بازو چھڑانے
[کے لی]ے سارا زور میرے بازوؤں پر ڈال دیا اور جلد ہی اُسے احساس ہو گیا کہ
[وہ] کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میرے پاس اب ایک ہی صورت تھی کہ سینے
[کی] تمام طاقت لگا کے اُس کا جسم لکڑی کے دروازے سے ٹکرا دوں۔ دروازے
[ک]ی اور لکڑی کی اُبھری ہوئی بلّیاں اُس کے جسم میں پیوست ہوں گی تو
[اُس کے] لیے حواس بحال رکھنا آسان نہیں رہے گا مگر یہ تبھی ممکن تھا جب میں اپنے
[دونوں] شانے اور اتنی تیزی سے ہٹاؤں کہ اُسے میرے ارادے کا گمان نہ ہو
[ور]نہ اُس کے ساتھ خود میرے بازو زخمی ہو جاتے۔ وہ میری گرفت سے
[نکلنے کی] تمام تر کوشش کر رہا تھا اور اتنی دیر میں اُسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے
[ہاتھ می]ں چاقو نہیں ہے۔ اس بات نے اُس کا حوصلہ اور بڑھایا مگر میں نے
[اُسے بازوؤں] سے پیچھے نہیں آنے دیا۔ پہلے احتیاطاً اُس کے ہاتھ میں دبا
[چاق]و گرا لینا ضروری تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ چاقو اُس کے کون
[سے ہا]تھ میں ہے۔ وہ کسرتی جسم کا آدمی تھا۔ اُس کا قد زیادہ نہیں تھا لیکن جسم
[خ]اصی پھرتی تھی۔

پھر میں نے سب کچھ ملتوی کر دیا اور اُسے بازوؤں میں جکڑے
[...]ے کھسکتا ہوا دروازے سے کچھ دُور ڈیوڑھی کے اندر لے آیا۔ یہاں میں
[نے اپ]نا دایاں بازو کسی قدر ڈھیلا کیا۔ اُس کا ردِ عمل میری توقع کے مطابق
[تھ]ا، اُس نے اپنا ہاتھ آزاد کرا لیا۔ چاقو اُس کے دوسرے ہاتھ میں تھا یہ
[میں] نے فوراً اپنے کھلے ہوئے ہاتھ میں لے لیا۔ میرا قیاس درست تھا کہ چاقو
[اُس] کے دائیں ہاتھ میں ہو گا تو وہ اُسے فوراً بائیں ہاتھ میں لے لے گا

اور اگر بائیں ہاتھ ہی میں ہوا تو اُسے اس زحمت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ دونوں صورتوں میں وہ میرے کولھے یا پسلی کا نشانہ لے گا۔ مجھے یقین تھا کہ اُسے ایسا ہی کرنا چاہیے۔ مجھے وہ بات یاد تھی جو کبھی جیل میں بچّل نے کاٹنے سے کہی تھی۔ اُس نے کہا تھا، ایسا داؤ پھینکو کہ مقابل کا نشانہ یقینی ہو جائے۔ اُس کے پاس کوئی اور چارہ نہ رہ جائے۔ اس طرح بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ میں نے اُس کا دوسرا بازو دانستہ نہیں چھوڑا۔ نتیجتاً وہ مجھ پہ حملہ آور ہونے کے لیے ترچھا ہوا۔ اِدھر میں نے اُس کا دایاں بازو کھینچ کے اُسے رُخ بدلنے میں مدد دی مگر وہ اتنا ہی مڑ سکا جتنی مجھے ضرورت تھی۔ دوسرے لمحے اُس کا چاقو والا ہاتھ اُسی کے جسم کے نیچے دب گیا۔ میں نے جھٹکا دے کے اُسے پھر دروازے سے دُور کیا اور صرف ایک پل میں دوبارہ اُسے دروازے سے ٹکرا دیا۔ چاقو کی نوک ضرور اُس کے ہاتھ میں یا جسم کے کسی اور حصے میں چبھی ہو گی۔ اُس کی چیخیں ڈیوڑھی میں گونجنے لگیں۔ باہر اُس کے ساتھی موجود ہوں گے تو انھوں نے بھی یہ چیخیں سنی ہوں گی۔ میں اپنا عمل دُہرانا چاہتا تھا مگر ڈیوڑھی میں یکایک روشنی ہو گئی۔ وہ بچّل تھا۔ اُس نے آتے ہی اُس کے چہرے پر پنجہ مارا اور مجھے اُس سے جُدا کر کے اُس کا منہ بند کر دیا۔ "تو اُدھر جا۔" اُس نے سرگوشی میں مجھے زہرہ کی طرف جانے کی ہدایت کی۔

اُس کا بدن بہت ہلکا تھا۔ میں نے اُسے اُٹھایا تو وہ میرے کندھے پر جھول گئی۔ منیر علی ڈیوڑھی کی چوکھٹ کا سہارا لیے نیم جاں کھڑے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں لالٹین لرز رہی تھی۔ میں نے زہرہ کو پلنگ پر لٹا کے اُس کا بدن سیدھا کیا اور اُسے چادر سے ڈھک دیا۔ منیر علی لالٹین لیے لڑکھڑاتے قدموں سے پلنگ کی طرف جلد از جلد پہنچنے کی کوشش میں دالان کی دہلیز سے ٹھوکر کھا کے گرتے گرتے بچے۔ لالٹین بھڑکنے لگی۔ میں نے بڑھ کے اُنھیں سہارا دیا۔ منیر علی دونوں ہاتھوں سے زہرہ کا چہرہ ٹٹولنے لگے۔ زہرہ کے لال چہرے پر سفیدی چھائی ہوئی تھی، بتیسی بند تھی۔ منیر علی کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں، ہاتھوں پر لرزہ طاری تھا۔ انھیں زہرہ کے پاس چھوڑ کے میں اُن دونوں آدمیوں کو دیکھنے کے لیے صحن میں لوٹ آیا جن سے بچّل اُلجھا ہوا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پہ اوندھے پڑے تھے۔ اُن میں سے ایک اُٹھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اور جلدی اُٹھنے والا نہیں تھا۔ مجھے پانی کی تلاش تھی۔ گھڑونچی اُلٹنے کی وجہ سے سارے گھڑے ٹوٹ گئے تھے اور فرش پر پانی ہی پانی پھیلا ہوا تھا لیکن سامنے باورچی خانے کے پاس رکھی ہوئی ایک ٹنکی مجھے نظر آ گئی۔ کٹورے میں پانی لے کے میں نے زہرہ کے منہ پر چھینٹے مارے۔ منیر علی اُسے بے تحاشا جھنجوڑنے لگے۔

اُسی لمحے بچّل ڈیوڑھی والے آدمی کی گُدّی پکڑے اُسے دھکیلتا ہوا ڈیوڑھی سے باہر نکلا۔ اُس کے بائیں کان اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ ناک سے بھی خون کی تلی جاری تھی۔ چاقو اُس کی ران میں کہیں لگا تھا، بائیں جانب کی ٹانگ لہولہان ہو گئی تھی۔ بچّل نے دھکا دے کے اُسے اُس کے

اُس ساتھی پر لوٹ دیا جو زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اُس نے دوبارہ اُسے گُدّی پکڑ کے اُٹھا لیا اور بھنبھناتی ہوئی آواز میں بولا "دیکھ لے۔ ان حرام کے جنوں میں ابھی شاید کچھ جان باقی ہو۔ بڑے صاحب کی وجہ سے ہم نے ان کو چھوڑ دیا ہے۔ انھیں اُٹھا کے لے جا۔" بجّھل نے اُس کی گدّی سے ہاتھ اُٹھا لیا اور وہ ڈور ہٹ کے کھڑا ہو گیا "جلدی کر" بجّھل نے ہنکارتے ہوئے کہا۔

وہ اُبلی ہوئی آنکھوں سے بجّھل کو دیکھنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس نے بجّھل کی بات نہیں سُنی ہے یا اُسے اپنے کانوں پر دھوکے کا شبہ ہے۔ اُس سے کوئی جواب نہیں دیا جا سکا۔

"ابھی تیرے کتنے اور آدمی ہیں اُدھر؟"

"تین ا" وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

"سب کو اِدھر بُلا لے، جلدی" بجّھل نے اُس کے گال پر طمانچہ مارتے ہوئے کہا۔ بجّھل کا ہاتھ اُس کے چہرے پر پھیلے ہوئے خون سے گیلا ہو گیا تھا۔ "دروازہ کھلا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ تم سب کو سدا کے لیے اِدھر چھوڑ کے بھاگ جائیں اور محلّے کے لوگ باگ تمھاری ہڈی ماس الگ کر دیں، تم سب اِدھر سے دفع ہو جاؤ ورنہ اِدھر تم چاروں کے لیے تمھاری ماں کے یاروں کو بُلایا جا سکتا ہے۔ ہم مُنڈا نہیں چاہتے، ہم کو پتہ ہے تم کدھر سے آئے ہو۔ پر اُدھر تم سب حرام کی کھاتے ہو، اُتنا سیدھا کالا پیلا تم کو دکھائی نہیں دیتا۔ ہم کو تم سے بہت سی باتیں بولنا تھیں پر وقت سالا کم ہے اور اِدھر بڑے صاحب بھی بیٹھے ہیں۔ تم چاروں ماروں نے آنے میں دیر کر دی۔ ہم کو بھی ایک رات کی دیر ہو گئی۔ کل ہی ہم تم اندھوں کو اپنا مکھڑا دکھا دیتے۔ جلدی فیصلہ کر۔ ابھی اِدھر اپنے پاس تم سب کو زندہ دابنے کے لیے جگہ بہت ہے۔"

اُس آدمی کی عمر ۳۰ سال کے قریب تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی، رنگ صاف ستھرا میرے خیال میں وہ سہراب ہی ہو سکتا تھا۔ اُسے کھڑے ہونے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ خون مسلسل اُس کے کپڑے رنگ رہا تھا۔ بجّھل کی بات سن کے وہ چند لمحوں تک تذبذب سے اُسے دیکھتا رہا۔ بجّھل طمانچہ مارنے کے لیے دوبارہ اُس کی طرف بڑھا۔ وہ تیزی سے پلٹ کے ڈیوڑھی کی جانب بھاگا لیکن ابھی وہ ڈیوڑھی میں داخل نہیں ہوا تھا کہ بجّھل کی آواز نے اُس کے قدم جامد کر دیے۔ "کدھر جاتا ہے۔ پہلے ان کو ڈیوڑھی کے اندر ڈال دے اور سمجھ لے، آخری آدمی جب تک اِدھر سے نہیں ہٹے گا تم سب کی گردن کو رسّی کھینچتی رہے گی، اُن شکروں کو بھی بول دینا کہ اب اور زیادہ کنوئیں میں پتھر نہ پھینکو، ہم نے ابھی ہتھیار نہیں تولا ہے۔ سالا سودا سستا ہو گیا۔ بڑے صاحب کو دعا دو، لڑکی کو تم کتّوں نے جن ہاتھوں سے چھُوا تھا اِدھر ہمارے ہوتے ہوئے اُن کو ثابت لیے جا رہے ہو۔ اپنے ہاتھ میں زندگی بھر کھجلی ہوتی رہے گی۔"

وہ اپنے ایک ہی ساتھی کو اُٹھا کے ڈیوڑھی میں لے جا سکا۔ دوسری بار وہ صحن میں آیا تو بُری طرح ہانپ رہا تھا اور کسی بھی لمحے چکرا کے

گرنے والا تھا۔ بجّھل نے اس دوران اُس کے باقی دو ساتھیوں ... دیا تھا۔ ہم دونوں نے انھیں خود اُٹھا کے ڈیوڑھی میں پھینکنے کا ارا... زہرہ اچانک چیخنے لگی۔ بجّھل نے بھاگ کے لالٹین کی لَو دھیمی کر... اُس آدمی کو دالان میں کھینچ لیا جو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی ... رہا تھا اور ایک اور ساتھی کو اُٹھانے میں مصروف تھا۔ بجّھل نے ... دبی رکھنے اور جلدی کرنے کی پوری احتیاط کی تھی۔ ہم نے کوئی لڑ... نہیں کیا تھا۔ بجّھل کو دونوں آدمیوں سے نمٹ کے میرے پاس ... تک پہنچنے میں کچھ ہی منٹ لگے ہوں گے پھر بھی دیر ہو گئی۔ صحن... دوڑ، گھڑونچی گرنے، گھڑے ٹوٹنے، باورچی خانے کے پاس رکھے جھوٹے برتن کھڑکنے کی آوازوں اور زہرہ کی چیخوں سے برابر کے ... لوگ جاگ گئے۔ ابتدا میں انھوں نے یہ ہلکی بھاری آوازیں نظر ... ہوں گی یا اُن تک پہنچی ہی نہیں ہوں گی مگر زہرہ کی چیخیں خاص... تھیں۔ اب اُن کا بیدار ہو جانا لازم تھا۔ وہ کھڑکی کی دھڑ دھڑا ر... اندر ہونے والے شور کے بارے میں مضطرب لہجے میں سوالات ... تھے۔ برابر کے مکان میں آمد و رفت کے لیے ایسی ہی ایک کھڑکی ... میں موجود تھی جیسی مولوی صاحب کے مکان میں آنے جانے کے لیے ... چھت پر بھی آ سکتے تھے اور دیوار پر بھی چڑھ سکتے تھے، بجّھل نے ... دری کھینچ کے صحن میں پڑے ہوئے ایک آدمی پر ڈال دی اور ... زہرہ کے پاس سے اُٹھا کے آگے کر دیا کہ پڑوسیوں کو مطمئن کریں ... آدمی کو میں کندھے پر لاد کے ڈیوڑھی میں بھاگ آیا اور یہیں ... اندر والان کی طرف تھا۔ زہرہ کی چیخیں بتدریج ہلکی ہو گئی تھیں۔ ... اُسے کمرے میں منتقل کر دیا تھا۔ منیر علی کی جھرجھراتی آواز مجھے ڈیوڑھی ... سُنائی دی "کوئی بات نہیں ہے آپ لوگ آرام کریں" وہ پڑوسیوں ... رہے تھے "زہرہ کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے۔ اس نے گھ... کسی آدمی کو دیکھ لیا تھا۔ ممکن ہے کوئی چور ہو۔ کھٹکا میں نے بھی سُنا ... اب سب ٹھیک ہے" منیر علی اپنے لہجے کی لرزش محسوس نہ کر... نے رسماً اندر آنے کو کہا مگر منیر علی تکرار کرتے رہے کہ وہ اپنی نیند خرا...

"زہرہ کی طبیعت زیادہ بگڑی تو آواز دے لوں گا۔"

کھڑکی پر خاموشی چھا گئی، زہرہ کی چیخیں بھی بند ہو گئی ... تک اندر کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہا، پھر کچھ ... میں نے سر نکال کے باہر دیکھا۔ بجّھل دری ہٹا رہا تھا۔ میں نے دا... چھپے ہوئے اُس آدمی کو بھی کندھے پر ڈال لیا جسے بجّھل نے پ... آواز سن کے احتیاطاً اندر کھینچ لیا تھا۔ اُس میں اب اپنا بوجھ بھی ... کی طاقت معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ہم نے یہ انتظار کرنے کے بجائے ... نگرانی کے لیے کھڑے ہوئے اُن کے ساتھی ڈیوڑھی میں آ کے انھیں ... لے جائیں، خود ہی اُن چاروں کو گھر سے باہر چھوڑ آنے کا فیصلہ کیا...

اُن کا ایک آدمی دروازے کے قریب منڈلا رہا تھا، جیسے ہی دروازہ کھلا، وہ اندھیرے میں لپکتا ہوا دروازے کی طرف آیا، بجّھل نے اُسے اپنی شکل دکھانے اور صورتِ حال سمجھنے کا موقع نہیں دیا۔ جھپٹ کے اُس کا گریبان پکڑ لیا۔ اُس نے جلد از جلد گلی سے اپنے ساتھیوں کو اُٹھانے کا حکم دیا اور ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر لیا۔

جب تک میں نے چھت پر جا کے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیا، مجھے اطمینان نہیں ہوا۔ باہر رہ جانے والے تینوں آدمی گلی کے نکڑ پر مجھے اپنے ساتھیوں کی طرف بھاگتے ہوئے دکھائی دیے۔ زینے سے اُتر کے مجھے خود کو دیکھنے کا ہوش آیا۔ میرے سارے کپڑوں پر خون کے دھبے پڑے تھے۔ ہاتھ بھی خون میں چپڑے ہوئے تھے۔ دالان میں سنّاٹا تھا لیکن سامنے کے ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے وہاں جھانک کے دیکھا۔ منیر علی زہرہ پر جھکے ہوئے تھے۔ کمرے میں کوئی اور نہیں تھا۔ میں اندر نہیں گیا۔ میری آہٹ سن کے منیر علی نے مجھے دروازے پر کھڑا ہوا دیکھا تو ہاتھ کھینچ کے اندر لے گئے "ہوش ہی نہیں آ رہی ہے" وہ ہذیانی انداز میں بولے۔

زہرہ کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔ ہاتھ سرد پڑے تھے۔ میں نے اُس کے سرہانے بیٹھ کے اُس کی چوٹی کھول دی۔ پھر میں نے اُسے اُٹھا کے دیوار کے سہارے دونوں جانب تکیے رکھ کے بٹھا دیا اور اُس کی ہتھیلیاں سہلانے لگا۔ ہتھیلیاں روئی کے گالوں کی طرح سفید ہو گئی تھیں۔ زہرہ کی انگلیاں میرے ہاتھوں میں تھیں۔ لمبی لمبی تیلی تیلی انگلیاں، ان انگلیوں نے ہزاروں بار کورا کو چھُوا ہو گا۔ اُس کی چوٹی گوندھی ہو گی، اُس کا سر دبایا ہو گا۔ ایک پل کے لیے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہی کورا ہے اور اُس کے بدن میں کورا کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ وہ ایک حسین لڑکی تھی۔ کورا کی سہیلی اتنی ہی خوب صورت اور چھوئی موئی ہونی چاہیے تھی۔ میرے ہاتھ رُک گئے اور میرا جی چاہا کہ میں ان انگلیوں کو خوب پیار کروں اور زہرہ کو گلے سے لگا لوں اور اُس کی گود میں سر رکھ کے خوب روؤں۔ اُسے دیکھتے دیکھتے میری آنکھوں میں گھُٹن سی ہونے لگی تھی۔ منیر علی کی آواز پر میں چونک پڑا "تم نے دیکھا؟" وہ بے چینی سے بولے "اس کے ہونٹوں پر جنبش ہوئی ہے۔ یہ ہوش میں آ رہی ہے۔ یا اللہ! تو اسے اپنی امان میں رکھنا۔"

زہرہ کی پلکیں تھرتھرا رہی تھیں "آپ اِدھر آ جائیے" میں نے مسہری سے اُٹھتے ہوئے کہا "اُن کی طبیعت اب جلد ٹھیک ہو جائے گی"۔ میرا وہاں سے ہٹ جانا ہی بہتر تھا۔ ہوش میں آ کے زہرہ میرا چہرہ دیکھتی تو شاید پھر بے ہوش ہو جاتی۔

"تم کہاں چلے؟" منیر علی نے اضطراب سے پوچھا۔

"بجّھل بھائی کہاں ہیں؟"

"کون! کون بجّھل بھائی؟" وہ حیرانی سے بولے۔

میرے منہ سے اُن کے سامنے بجّھل کا نام نکل گیا تھا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ بجّھل نے انھیں اپنا نام اکبر خاں بتایا تھا "گھر میں سب انھیں بجّھل ہی پکارتے ہیں" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "بجّھل اُن کا گھریلو نام ہے۔ وہ کس طرف ہیں؟" میں نے اُن کی توجہ ہٹانے کے لیے جلدی سے پوچھا۔

"وہ۔ وہ ارشد میاں کے کمرے میں ہیں" منیر علی تذبذب سے بولے۔

میں نے پھر مُڑ کے اُن کا چہرہ نہیں دیکھا۔ بجّھل کونے کے ایک کمرے میں موجود تھا اور ارشد کے سر پر پٹّی باندھ رہا تھا۔ ارشد کا تمام چہرہ سوجا ہوا تھا۔ ہاتھ میں ایک پٹّی بندھی ہوئی تھی۔ اُسے بھی اپنی خبر نہیں تھی۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کے مجھے منیر علی کے دوسرے بچّوں کا دھیان آیا۔ وہ ابھی تک مجھے کہیں نظر نہیں آئے تھے۔

"اور دوسرے کہاں ہیں؟" میں نے اٹک اٹک کے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہیں رے!" بجّھل تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تم نے اُنھیں دیکھا بھی؟"

"ہاں، ہاں دیکھ لیا، دیکھ لیا جانی! اُن دونوں جھینگروں سے نمٹ کے میں اُنھی کی طرف گیا تھا، ڈیوڑھی میں تیرے پاس آنے میں اسی وجہ سے دیر ہو گئی تھی۔"

"لیکن وہ تھے کہاں؟"

"وہ بڑی کے ساتھ تھے اور کہاں ہوتے رے!" بجّھل نے تندی سے کہا۔

مجھے بھی یہی اندیشہ تھا کہ منیر علی کی چھوٹی لڑکی اور لڑکا دونوں اپنی بڑی بہن ہی کے کمرے میں ہوں گے۔ رستم خاں کے ساتھیوں نے زہرہ کو لے جاتے وقت اُنھیں نظر انداز نہیں کیا ہو گا۔ بجّھل نے مجھے بتایا کہ چھوٹی لڑکی نے اپنے حواس نہیں کھوئے۔ زہرہ کی چیخ سن کے دونوں بچّوں کی آنکھ کھُل گئی تھی۔ رستم کے آدمیوں کو خوف تھا کہ دونوں بچّے شور مچائیں گے اس لیے انھوں نے بچّوں کو بھی بے بس کر دینا ضروری سمجھا جب کہ اُن کی دہشت ہی اُنھیں چُپ رکھنے کے لیے کافی تھی۔ باہر منیر علی کو جکڑنے والے دونوں آدمی بجّھل کے لیے چند لمحوں کے تھے۔ اُس نے اِس سے زیادہ وقت نہیں لیا۔ منیر علی کے اشارے پر اُس نے پھر سیدھے زہرہ کے کمرے کا رُخ کیا۔ لڑکی اپنے چھوٹے بھائی کو اشاروں میں حوصلے کی تلقین کے ساتھ ساتھ اُس کے ہاتھ کھولنے کی بھی تگ و دو کر رہی تھی کہ بجّھل وہاں پہنچ گیا۔ اُس نے اُن دونوں کے ہاتھ کھولے، منہ کھولا اور اُنھیں وہیں خاموش پڑے رہنے کی تاکید کر کے چلا آیا۔ اس نے اُنھیں باہر آنے کے لیے منع کر دیا تھا۔ چھوٹی نے اُس کی ہدایت پر پوری طرح عمل کیا اور اپنے بھائی کو تسلّی دیتی رہی۔

"لاج رہ گئی لاڈلے!" بجّھل کی آواز ڈولنے لگی "کسی کو بھی کچھ ہو جاتا تو سالی آنکھ میں سدا کے لیے جالا پڑ جاتا۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ساری غلطی میری ہی تھی۔ میں اگر تھوڑی دیر اور جاگتا رہتا تو یہ سب کچھ اِس طرح نہ ہوتا۔ وہ شاید ہواؤں پر چل کے

آئے تھے، مجھے خبر ہی نہیں ہوئی۔

"تو یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے؟" بجھل راشد کے گالوں پر تھپکیاں دیتے ہوئے بولا۔ "ذرا باورچی خانے میں جا کے دیکھ، دودھ ہو تو گرم کر کے لے آ اور یہ اپنے کپڑے بھی بدل لے۔ وقت کیا ہوا ہوگا؟"

"صبح ہونے والی ہوگی۔"

"نہیں رے۔"

"ہاں لیکن ابھی اندھیرا گہرا ہے۔"

"وقت نکل جائے گا۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ بھی اینٹھا پڑا ہے۔ اُدھر اس کا کیا حال ہے؟" اس کی مراد زہرہ سے تھی۔

"وہ ہوش میں آ رہی ہے۔"

"ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کے باہر گلی میں پانی لوٹ دے سا اُدھر لونڈیں پڑی ہوں گی۔"

"بونڈیں تو گھر میں کئی جگہ ہوں گی۔"

"میں باہر کی بولتا ہوں۔" وہ تنک کے بولا۔ "دیر نہ کر، اُٹھ جا۔"

میں نے تینوں کام تیزی سے کیے۔ باورچی خانے میں دودھ موجود تھا۔ لالٹین سے مٹی کا تیل لوٹ کے میں نے کوئلوں میں آگ لگا دی اور دودھ گرم کر کے راشد کے کمرے میں لے گیا۔ بجھل مجھے زہرہ کے کمرے میں ملا۔ مجھے اندر جاتے ہوئے جھجک ہوئی۔ زہرہ پلنگ پہ آنکھیں کھولے گم سم بیٹھی تھی۔ سر پہ دوپٹا بھی نہیں تھا۔ اس کے دونوں بہن بھائی، دائیں بائیں اس کے پہلو سے چمٹے ہوئے تھے۔ "آؤ، آؤ" مجھ پہ نظر پڑتے ہی پہلے کی طرح منیر علی مجھے اندر لے گئے۔ "اب کیسا پردہ ظہیر میاں!" زہرہ نے صرف ایک نظر مجھے دیکھا اور اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔ اس کے گالوں کی سرخی کچھ لوٹ آئی تھی۔

"یہ ظہیر میاں ہیں، اب ان سے پردہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تجھے تو کچھ معلوم نہیں۔ میں تجھے کیا بتاؤں انھوں نے...."

"جانے دو بڑے صاحب! بٹیا کو اس کے کمرے میں پہنچا دو اور ذرا میرے پاس بیٹھک میں آؤ۔" پھر بجھل زہرہ سے مخاطب ہو کے بولا۔ "گھبرانے کی اب کوئی بات نہیں۔ آرام سے سو جاؤ۔"

زہرہ نے اپنا بدن اور سمیٹ لیا۔

منیر علی فوراً بیٹھک میں آ گئے۔ "بڑے صاحب!" بجھل نے کسی تمہید کے بغیر بھاری آواز میں ان سے کہا۔ "وقت بہت کم ہے۔"

"میں نہیں سمجھا۔" منیر علی گھبرا کے بولے۔

"سمجھنے کی کوشش کرو بڑے صاحب!"

"شاید میں ابھی تک اپنے اوسان میں نہیں ہوں۔" وہ عاجزی سے بولے۔

"جو بیت گیا ہے اُسے بھول جاؤ۔"

"اُسے کیسے بھلایا جا سکتا ہے۔"

"اُسے بھول جانا ہی ٹھیک ہے، جو کل ہونے والا ہے اس کی فکر کرو۔ مجھے بتاؤ آپ نے کل کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"کیا فیصلہ کروں۔" منیر علی کی آواز بھرانے لگی۔ "آپ ہی کچھ بتائیے، میری عقل تو کچھ کام نہیں کر رہی ہے۔ نہ جانے کون سے اعمالِ بد کی سزا خدا مجھے دے رہا ہے۔"

"آپ پر ہمارا سایہ پڑ گیا بڑے صاحب! بعض لوگوں کا سایہ ہی اتنا منحوس ہوتا ہے۔ نہ ہم لوگ اِدھر آتے، نہ یہ سب...."

"ایسا نہ کہیے۔" منیر علی تیزی سے بولے۔ "آج آپ نہ ہوتے تو نہ جانے میرے لیے صبح بھی ہوتی یا نہیں اور ہوتی تو کس طرح ہوتی۔ میں اپنا چہرہ خود کو بھی نہیں دکھا سکتا تھا۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں، اللہ کے واسطے مجھے معاف کر دیجیے۔ میں نے آپ کے متعلق بہت بدگمانی کی، شاید یہ اسی کی سزا ہے۔ مجھے اپنے رویے پر بہت ندامت ہے۔" منیر علی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے۔

"بڑے صاحب! میں نے آپ کو اِس وقت اس لیے ادھر نہیں بلایا ہے کہ آپ ہم سے ایسی باتیں کرو، ہم کو یہ باتیں سننے کی عادت نہیں ہے۔ مجھے آپ سے یہ بولنا تھا کہ آپ چلنے کی تیاری کرو، جتنی جلدی ہو سکے اس جگہ سے نکل جاؤ۔ میں اِسی وقت اُٹھنے کو کہتا، پر زہرہ بٹیا اور راشد میاں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجبوری ہے، جیسے ہی اُن کا جی ٹھیک ہو جائے، آپ کو ادھر سے چل دینا ہے۔"

منیر علی کنگ نظروں سے بجھل کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"ہاں بڑے صاحب! میں نے آپ کو پہلے بھی ایسا ہی بولا تھا۔ آپ نے خیال نہیں کیا۔ پر آپ اِدھر نہیں رہو گے۔"

"مگر میں...." منیر علی سٹ پٹاتے ہوئے بولے۔ "یہ کس طرح ممکن ہے؟"

"ہم بھی یہ نہیں چاہتے کہ آپ ایسا کرو، پر کچھ اور نظر نہیں آتا بڑے صاحب!" بجھل نے مایوسی سے کہا۔

"یعنی آپ کے خیال میں وہ، وہ مجھ گنہ گار کو معاف نہیں کریں گے، خدا میری کبھی نہیں سنے گا۔ انھوں نے آپ کو دیکھ لیا ہے، اب تو وہی ہو گیا جو آپ چاہتے تھے، اب بھی وہ...."

"انھوں نے ہم کو دیکھ لیا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں، جب وہ آئے تھے تو آپ نے ہماری طرف اشارہ کیوں نہیں کر دیا کہ وہ جن لوگوں کا پتہ مانگتے تھے، وہ خود آ گئے ہیں اور بیٹھک میں موجود ہیں۔"

"مجھے انھوں نے اس کی مہلت ہی کہاں دی۔ میں بیشتر وقت جاگتا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے پلنگ پہ کمر ٹکائی تھی کہ غنودگی طاری ہو گئی۔ نہ جانے کس وقت وہ گھر میں کود پڑے۔ میں نے نظر اُٹھا کے دیکھا تو زہرہ اُن کے قبضے میں میرے سامنے کھڑی تھی۔ اتنے میں آپ صاحبان آ گئے۔ انھوں نے مجھے زبان کھولنے یا بیٹھک کی جانب اشارہ کرنے کا موقع ہی کہاں دیا۔"

"میں جانتا ہوں، آپ ہمیں ضرور بلاتے۔" بجھل نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"لیکن میں نے سوچا تھا.... آپ سے سچ کہہ دوں، میں نے اپنے طور پر سوچا تھا کہ میں کل کی طرح، جہاں تک ہو سکا، اُن سے آپ کے بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کروں گا۔ شاید وہ مان جائیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ مجھے پھر سرزنش کریں گے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ اُن کے سامنے ہوں اور بحالتِ مجبوری میں نے طے کیا تھا کہ اُن سے کہہ دوں گا، آپ لوگ گھر پہ موجود ہیں، وہ دیکھ لیں۔"

"اور اسی لیے آپ نے اندر سے بیٹھک کی کنڈی لگا دی تھی۔"

"ہاں!" منیر علی نے سر جھکا لیا۔

"پر انھوں نے خود آپ کو اس کا موقع نہیں دیا۔"

"جی ہاں!" منیر علی ہچکچاتے ہوئے بولے۔

"کیوں نہیں دیا بڑے صاحب! آپ نے سوچا؟" منیر علی کی پلکیں پھڑکنے لگیں۔ "اس لیے نہیں دیا کہ وہ زہرہ بٹیا کو لے جانے کا ارادہ کر کے آئے تھے۔ انھیں اُسے لے جانا ہی تھا۔ انھیں یقین تھا کہ آپ کو اُن لوگوں کا پتہ معلوم ہے پر آپ آسانی سے انھیں بتاؤ گے نہیں۔ آپ کچھ دوسرے لوگوں کو بھی اُن کے سامنے کر سکتے تھے اور آپ ان کو غلط پتہ بھی بول سکتے تھے۔ وہ بٹیا کو اس لیے لے جانا چاہتے تھے کہ آپ سے ٹھیک پتہ معلوم کریں۔ آپ کو پھر بتانا پڑتا اور جب تک وہ اپنے خیال میں اُس پتے پر پہنچ کے یقین نہیں کر لیتے، زہرہ کو نہ چھوڑتے یا کبھی بھی نہ چھوڑتے۔"

"میرے خدا!" منیر علی نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"ہاں بڑے صاحب!" بجھل نے بوجھل لہجے میں کہا۔ "اس لیے انھوں نے سب سے پہلے زہرہ بٹیا پر قبضہ کیا۔ پر وہ آپ سے کیا بات کرتے اور آپ اُن کو کیا جواب دیتے اور کیا وہ آپ کی بات سن کے زہرہ کو چھوڑ دیتے۔ یہ آپ خوب جانتے ہو۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ...." منیر علی اپنا منہ کھسوٹنے لگے۔

"بڑے صاحب! حوصلہ رکھو، آپ تو خدا والے ہو، پڑھے لکھے ہو۔ انھوں نے ہم کو دیکھ لیا ہے۔ پر اتنا کافی نہیں ہے۔ ہمارے دیکھنے سے اُن کی آنکھوں کو نیند نہیں آ جائے گی۔ ہم بھی پہلے آپ سے یہی بولتے تھے، ہم کو خیال نہیں تھا کہ اس سے زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ آپ کا اس جگہ سے دُور ہو جانا ہی اچھا ہے۔ ہم یہاں نہیں رہ سکتے، نہیں تو ہمیشہ کے لیے آپ کے ساتھ رہتے۔ ادھر بے شک آپ اپنے محلے داروں اور رشتے والوں کو بلا کے پہرا بٹھا سکتے ہو، کتّوں نے آپ کا گھر دیکھ لیا۔ وہ سونگھتے سونگھتے ادھر پہنچ جائیں گے۔ آپ کب تک پہرا بٹھاؤ گے اور کب تک لوگ چوکسی کرتے رہیں گے۔ آپ خود یہ نہیں کرو گے۔ مجھ کو پتہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو نکو بنانا برداشت نہیں کرو گے۔ آپ بہت اکیلے ہو، ہر عزت والا آدمی اکیلا ہوتا ہے۔ آپ کے سامنے جو آدمی ہیں، وہ آپ جیسے نہیں ہیں۔ اُن کا دل گوشت کا بنا ہوا نہیں ہے اور سمجھو بس اُن کے سینگ نہیں ہیں۔ وہ گنتی میں بھی زیادہ ہیں اور اُن کی آنکھ میں تنکا پڑ گیا ہے۔ میں بہت سوچ سمجھ کے آپ سے بول رہا ہوں۔ سویرا ہونے کو ہے اور سویرا ہونے سے پہلے آپ کو فیصلہ کرنا ہے۔ ہم لوگ آپ کے لیے اجنبی ہیں، پر ہم کو اتنا اجنبی مت سمجھو۔ تھوڑے کہے کو بہت جانو۔ آپ دونوں کام ایک ساتھ نہیں کر سکتے اور میں آپ کو اس کی رائے بھی نہیں دوں گا۔"

بجھل اپنی کہی ہوئی باتیں دہرا رہا تھا۔ ظاہر ہے، ہم منیر علی کے لیے اجنبی نہیں تھے تو اور کون تھے۔ اجنبیوں کے کہنے پر کون اس طرح اپنا گھر بار چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ منیر علی کے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا اور بجھل اُن سے ساری بات نہیں کہہ سکتا تھا کہ اپنے آدمیوں کے واپس آنے کے بعد رستم کے یقین کو اور سند مل جائے گی۔ رستم خاں کو ہر وقت یہ احساس چاٹنے لگتا ہوگا کہ اُس نے کورا کو واپس کر کے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔ اُس کا کسی قدر ازالہ زہرہ ہی سے ہو سکتا تھا۔ پیرو اور ماچھی سات آٹھ مہینے بعد کورا کو پوچھتے ہوئے اُس کے پاس آ سکتے تھے تو زہرہ کی خبر سن کے بھی اُن کی واپسی کی اُمید کی جا سکتی تھی۔ رستم خاں چپ بیٹھنے والا آدمی نہیں تھا۔ زہرہ ہی کچھ اُس کی اٹک شوئی کر سکتی تھی اور اُسی کے ذریعے وہ اپنی دانست میں منیر علی کی زبان کھلوا سکتا تھا۔ اس موقع پر وہ اپنے تمام دشمنوں کو بھی یہ کہہ کے اکٹھا کر سکتا تھا کہ جیسلمیر میں باہر کے لوگ آئے ہوئے ہیں اور وہ سب اکٹھا ہو بھی جائیں گے۔ میں نے سوچا، بجھل سے کہوں وہ بھی فیض آباد سے جمرد، کپتن خاں کو کلکتے سے کانتے، جامو لالہ، شولی، گھونٹی وغیرہ کو اور بمبئی سے پیرو، ماچھی، زورا، چھیدا، ماٹی اور دوسرے آدمیوں کو بلا لے۔ ایسا ہی ہے تو پھر ایک مرتبہ بات نبٹ ہو جائے۔ پھر منیر علی یہیں رہیں گے مگر میں نے اُس کا ذکر بجھل سے نہیں کیا۔ یہ طوالت غیر ضروری تھی۔ اتنے لوگوں کو درمیان میں ڈالنے سے بات پھیلتے پھیلتے کہاں تک جا پہنچتی۔ پھر مولوی صاحب اور کورا کا ذکر بھی آتا، نہ جانے کیا کیا ہوتا، پولیس، کچہری، تھانہ، عدالت، منیر علی جس بات سے گریزاں تھے، وہی ہوتی۔ میں چپ ہی رہا۔ بجھل نے دبے دبے لہجے میں منیر علی سے ہر بات کہہ دی تھی لیکن وہ یہ کیسے بتا سکتا تھا کہ وہ اُسی کے آدمی تھے جو رستم خاں کے پاس گئے تھے، جنھوں نے رستم خاں سے مولوی صاحب اور کورا کی بات چھیڑی تھی اور جورانا کی آنکھیں نکال لائے تھے۔ بجھل منیر علی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا اور کہنا بھی چاہتا تھا۔ منیر علی ویران نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے اور اُس کی باتیں سنتے رہے۔ بجھل خاموش ہوا تو اُنھوں نے پھر اُس سے اپنے گھر بار، کاروبار کا عذر کیا۔

"سب جل گیا بڑے صاحب! سمجھو سب جل گیا، کسی نے آگ لگا دی۔" بجھل کے لہجے میں تلخی آ گئی تھی۔ "آپ نے اپنے بچوں اور غیرت کی عوضی میں یہ سب دے دیا، پھر ہم آپ سے بول رہے ہیں کہ اب آپ اس کے مالک نہیں رہے ہو۔ یہ سارا ہم نے آپ سے آپ کی بولی ہوئی قیمت پر خرید لیا ہے۔ قیمت کا چرچا ہمارے آپ کے بیچ اچھا نہیں لگتا۔ پر جو آپ بولیں گے ہم پلک بھی جھپکائیں تو ہمارے منہ پہ تھوک دینا۔ آپ سوچو، میں آپ سے

یہ کہہ کیسے رہا ہوں کہ آپ نئی جگہ اپنے آپ کو بے بس اور لاچار نہ سمجھو اور میں یہ سب یہاں دیمک اور زنگ لگنے کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں' بڑے صاحب! آپ سے کوئی لالچ مجھ کو نہیں ہے' میری آپ سے دشمنی نہیں ہے۔ آپ بڑے ہو' میں چھوٹا۔ چھوٹے کی بات سن لو' منع مت کرو' اگر آپ کا اُدھر جی نہ لگے تو کسی اور جگہ چلے جانا یا پھر کچھ مدت بعد اِدھر ہی لوٹ آنا' سمجھو ہم سے کوئی گناہ ہو گیا۔ پر ہمیں معافی کا ایک موقع دو۔"

منیر علی کے چہرے پر پسینے کے بے شمار قطرے چمک رہے تھے۔ "کیا مجھے کچھ وقت نہیں مل سکتا؟" انھوں نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"نہیں بڑے صاحب! کوئی وقت مت لو' میں جانتا ہوں' یہ فیصلہ آپ کو بعد کو بھی کرنا ہے۔ پر بعد کو وقت پنجے میں نہیں رہا تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

منیر علی نے ایک جھرجھری لی۔ سر اُٹھا کے چاروں طرف دیکھا اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے بولے۔ "اللہ کی مرضی۔"

تجمّل نے بڑھ کے اُن کے پیر پکڑ لیے۔

ہم کچھ ہی دیر وہاں ٹھیرے۔ فجر کی اذان نہیں ہوئی تھی مگر کسی بھی لمحے ہونے والی تھی۔ ہم گھر سے باہر نکلے۔ گلیوں میں خاصا اندھیرا تھا۔ راستے میں دُور تک کوئی شخص دکھائی نہیں دیا۔ لاری کے اڈّے تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا سمٹنے لگا تھا۔ معلوم ہوا کہ لاری صبح چھ بجے سے پہلے روانہ نہیں ہوگی۔ اِدھر اُدھر مضافات سے آئے ہوئے چند مسافر بھی لاری کے انتظار میں اڈّے پر سو رہے تھے۔ ہم نے بھی انتظار کیا۔ لاری آئی تو ہم لوگ اور سب مسافر اُس میں بیٹھ گئے۔ پھر بھی کچھ نشستیں خالی رہ گئیں۔ سب نشستیں بھر جاتیں تبھی لاری چلتی اور ابھی چھ بجنے میں بھی کچھ وقت تھا۔ تجمّل نے خالی نشستوں کے پیسے ادا کر کے ڈرائیور کو کسی نہ کسی طرح وقت سے پہلے چلنے پر راضی کر لیا اور ہم جلد ہی جیسلمیر کی حدود سے دُور نکل گئے۔ مسافروں کی تعداد کم تھی۔ ہم سیٹوں پر پاؤں پھیلا کے لیٹ سکتے تھے مگر ایک تو لاری ہچکولے بہت کھا رہی تھی' دوسرے لیٹنے کو جی بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ سفر زیادہ طویل نہیں تھا اور لاری کی رفتار تیز تھی۔ اونچے نیچے راستوں سے گزرتی' دھول اڑاتی جب پوکاران اسٹیشن پر پہنچی تو دھوپ خوب چڑھ آئی تھی۔ پوکاران سے کوئی ایک گھنٹے بعد جودھ پور جانے والی ریل گاڑی مل گئی۔ اُس نے ہمیں مغرب کے بعد جودھ پور جنکشن پہنچا دیا۔

تجمّل نے مجھ سے کھانے کے لیے پوچھا لیکن مجھے بھوک ہی نہیں تھی۔ صبح پوکاران کے اسٹیشن پر ہم نے صرف چائے کی ایک ایک پیالی پی تھی۔ میں نے تجمّل سے اصرار کیا کہ اگر اُسے بھوک لگی ہو تو وہ کھانا کھا لے لیکن تجمّل میری بات سُنی اَن سُنی کرتا ہوا ویٹنگ روم میں چلا آیا تھا۔ یہاں پہلے سے دو مسافر بیٹھے تھے۔ ہمارے داخل ہوتے ہی اُنھوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور سر سے پیر تک ہمیں گھورنے لگے۔ ہمارا لباس اوّل درجے کے ویٹنگ روم میں بیٹھنے کا نہیں تھا' اسی لیے اُنھیں تجسس ہوا ہوگا۔ ہمارے ساتھ پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا تھا۔ ہم نے اپنا سامان ایک طرف رکھ دیا اور دونوں مسافروں کی نگاہیں نظر انداز کر کے صوفے پر لیٹ گئے۔ کمر کو سہارا ملا تو سارے جسم میں دُکھن ہونے لگی۔ تجمّل کی بھی شاید یہی حالت تھی۔ وہ مسلسل بیڑیاں پی رہا تھا۔ ایک ختم نہیں ہوتی تھی کہ دوسری سلگا لیتا تھا۔ کل دوپہر اُس کے پاس بیڑی کا بنڈل ختم ہو گیا تھا۔ لاری میں جیسے ہی اُس کی نظر کسی بستی میں پہلی کھلی ہوئی دُکان پر پڑی' اُس نے لاری رُکوا کے بیڑیاں خرید لی تھیں' اُس وقت سے اب تک وہ اَن گنت بیڑیاں پی چکا تھا۔

تھوڑی دیر میں وہ دونوں مسافر چلے گئے۔ ہم ویٹنگ روم میں اکیلے رہ گئے۔ ویٹنگ روم صاف ستھرا تھا۔ مچھر دُور کرنے کے لیے میں نے پنکھا کھول دیا' گو پنکھے کا موسم نہیں تھا۔ نیند پھر بھی نہیں آئی۔ نیند آ جاتی تو کچھ وقت ہی گزر جاتا۔ مجھے ابّا جان کی بات یاد آ رہی تھی' جب میں کسی رات جلدی سو جاتا تھا تو وہ کہتے تھے' زیادہ سونے سے زندگی کم ہو جاتی ہے اور زندگی کے معنی ہی بیداری کے ہیں۔ سو جو جتنا زیادہ سویا' اُس نے اپنی زندگی میں خود ہی کمی کر لی۔ اِس لحاظ سے میری زندگی کے دن بڑھ رہے تھے۔ ابّا جان آج سامنے ہوتے تو میں اُن سے ضرور کہتا' اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آدمی کی زندگی زیادہ ہی ہو۔ یوں بھی ایک دن ہمیشہ کے لیے سو جانا ہے۔ کاش آدمی کسی طور پر مجبور ہوتا کہ زیادہ سے زیادہ وقت سویا کرے۔ جتنی دیر آنکھ بند رہے اور جتنے کم لوگوں کا سامنا ہو اچھا ہے مگر لوگ سوتے میں بھی تو پریشان کرتے ہیں اور ایک طرح آنکھ کُھلی ہی رہتی ہے۔

دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی ٹِک ٹِک کر رہی تھی۔ جیسے جیسے سوئیاں آگے بڑھتی گئیں' میرے خون کی گردش تیز ہوتی گئی۔ رات کو صفائی کرنے والا مہتر کمرے میں داخل ہوا تو ہم دونوں باہر چلے آئے۔ سامنے پلیٹ فارم کی گھڑی میں پونے دس بجے تھے۔ درختوں اور دیواروں پر سنّاٹا چھا گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر بھی زیادہ چہل پہل نہیں تھی۔ سامان ویٹنگ روم میں چھوڑ کے ہم اسٹیشن سے باہر ایک چھوٹے سے چائے خانے میں آ گئے۔ تجمّل نے ایک ساتھ کئی پیالیاں پیں۔ چائے والے نے ہمارے کہے بغیر پانوں کی ایک طشتری ہماری میز پر بھجوا دی تھی۔ میں نے بہت دنوں بعد پان کھایا۔ گلوری میں لونگ جڑی ہوئی تھی۔ مجھے چمپا یاد آنے لگی۔ وہ بھی اِس قسم کی گلوریاں بناتی تھی۔ کرشنا جی نے اُس کے لیے بازار سے ایک پان دان منگوا دیا تھا۔ کبھی کبھی وہ مجھے بھی پان دے دیتی۔ کہتی تھی' پیارے میاں! پان تمھارے منہ پر خوب رچتا ہے' خدا نظرِ بد سے بچائے۔ میں سمجھتا تھا کہ چمپا مجھے خوش کرنے کے لیے ایسا کہہ رہی ہے اور جب مجھے یہ احساس ہوتا تھا تو مجھے اُس پر اور غصّہ آنے لگتا تھا۔ چمپا نے جوبین سے نہ جانے کتنے خط لکھوائے ہوں گے۔ میں نے ارادہ کیا کہ جیسے ہی فرصت ملی' اُسے ضرور خط لکھوں گا مگر میں اُسے پکاروں گا کس لقب سے؟ اور کیا لکھوں گا؟ بہتر یہی ہے کہ

کچھ لکھا ہی نہ جائے۔ زورا نے بتایا تھا کہ مارٹی روز جوبین کی خیر خبر لینے گھر جاتا ہے۔ زورا کے ذریعے مارٹی کو معلوم ہو جائے گا کہ میں زندہ ہوں اور چمپا کو بھی خبر مل جائے گی۔ پلیٹ فارم پر واپس آ کے میں نے گھڑی دیکھی تو صرف بیس منٹ اُوپر ہوئے تھے۔ مجھے شک ہوا کہ شاید گھڑی غلط ہے۔ ابھی ۱۰ بجکر ۵ منٹ ہی ہوئے تھے۔ گیارہ بجے کے قریب ہم نے اپنا سامان ویٹنگ روم سے اُٹھوا لیا۔ اسٹیشن پر جیسے صبح ہو رہی تھی' رفتہ رفتہ مسافروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ ہم ویٹنگ روم اور گیٹ کے درمیان ایک بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میری نگاہیں بار بار دوسرے پلیٹ فارم کو ملانے والے پل اور گیٹ پر جم جاتی تھیں۔

پلیٹ فارم پر گاڑی آ گئی تو میں نے تجمّل کی طرف دیکھا' وہ منہ پر ہاتھ رکھے سکون سے بیٹھا تھا۔ "گاڑی اب چلنے ہی والی ہے۔" میں نے مضطرب لہجے میں اُسے ٹوکا۔

"ابھی دیر ہے رے!" وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"اور اگر گاڑی چلی گئی؟"

"تو جانے دے۔" اُس نے سر جھٹک کے کہا۔

جو قلی ہمارا سامان اُٹھا کے ویٹنگ روم سے لایا تھا' وہ کئی بار آ کے تجمّل کو ٹوک گیا تھا۔ پھر وہ ہمارے قریب ہی آ کے بیٹھ گیا اور تجمّل کی صورت دیکھنے لگا۔ "صاحب! کیا اسی گاڑی سے جانا ہے؟" اُس نے تلخی سے پوچھا۔

"بیٹھا رہ۔" تجمّل نے اُسے جھڑک دیا۔

میں نے اپنے ہونٹ سی لیے تھے' ابھی سگنل نہیں ہوا تھا اور نہ گارڈ نے سیٹی دی تھی مگر پلیٹ فارم پر مسافروں کی نقل و حرکت میں سرگرمی نہیں رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ گاڑی روانہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ میں تجمّل کو دوبارہ ٹوکنا چاہتا تھا مگر میری بات منہ میں رہ گئی۔ میں بینچ پر بیٹھے بیٹھے اُچھل پڑا۔ مجھے اپنی بینائی پر اعتبار نہیں آیا۔ میں نے زور سے تجمّل کا شانہ جھنجوڑا۔ گیٹ پر سب سے پہلے مجھے منیر علی کا چھوٹا لڑکا حجو نظر آیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سب اندر آ گئے۔ سیاہ برقع اوڑھے ہوئے زہرہ ہی ہوگی' اُس کی چھوٹی بہن سلمہ بدن سے چادر لپیٹے ہوئے تھی۔ ارشد کے ماتھے پر پٹی بندھی تھی اور وہ لنگڑا لنگڑا کے چل رہا تھا۔ منیر علی قلی کے ساتھ تھے۔ انھوں نے شیروانی پہن رکھی تھی۔ ہم دونوں نے لپک کے انھیں گیٹ کے قریب ہی جا لیا۔ تجمّل نے اُن کے ہاتھ سینے سے لگا لیے۔ "بہت دیر ہو گئی بڑے صاحب؟" اُس نے منمناتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں بھائی! دیر ہو گئی۔" منیر علی شکستہ لہجے میں بولے۔

"سب ٹھیک ٹھاک رہا نا؟"

منیر علی نے ناتوانی سے سر ہلایا۔ تجمّل نے پھر اُن سے کچھ نہیں پوچھا اور اُن کا ہاتھ تھامے ہوئے تیزی سے ایک جانب چل دیا۔ ہم سے آگے جانے والے قلی سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے کے سامنے ٹھیر گئے تھے۔

گاڑی نے رفتار پکڑ لی تھی۔

میرے سامنے کی نشست پر منیر علی بیٹھے ہوئے تھے۔ میری آنکھیں ابھی تک بے یقینی سے اُنھیں دیکھ رہی تھیں لیکن وہ کوئی اور نہیں منیر علی ہی تھے۔ میرے ذہن میں اُن کے آنے کا امکان بہت خفیف تھا حالانکہ میں نے تجمّل کی تقریباً تمام ہدایتیں اپنے کانوں سے سُنی تھیں جو چلنے سے پہلے اُس نے اُنھیں کی تھیں اور پھر منیر علی نے اپنا بیشتر سامان بھی ہمارے ساتھ کر دیا تھا۔ ہم منہ اندھیرے ہی گھر سے نکل جانا چاہتے تھے۔ دُور تک یہ صندوق ہم اپنے سروں پر اُٹھا کے لائے تھے۔ وہاں تک جہاں سے لاری کے اڈّے پر پہنچنے کے لیے ہمیں سواری ملی' راستے میں کتنی ہی بار مجھے وہ بوجھ اُٹھانا فضول معلوم ہوا۔ ہمیں ٹالنے کے لیے منیر علی کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ صبح ہوتے ہی وہ اپنی رائے نہ بدل دیں۔ چُپ چاپ کہیں اور نکل جائیں۔ وہ کوئی بھی غلط یا صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے اس وقت تک ارشد ہی چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو یا اُن کے ساتھ جانے سے انکار کر دے یا کوئی اور رکاوٹ پیش آ جائے۔ کوئی بھی بات ہو سکتی تھی۔ رائے بدلنے کے لیے اُن کے پاس خاصا وقت تھا۔ ہمارے بارے میں نئے نئے شبہات اُن کے دماغ میں پروان چڑھ سکتے تھے۔ انھوں نے رات کو ہمیں اُن چاروں آدمیوں سے نمٹتے دیکھا تھا۔

انھیں زیادہ سے زیادہ شام کو ۹' ۱۰ بجے تک جودھ پور اسٹیشن پہنچ جانا چاہیے تھا۔ تجمّل نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ وہ کوئی موٹر کرائے پر حاصل کر لیں یا لاری سے آ جائیں لیکن زیادہ دیر نہ کریں۔ اوّل وقت ہی اِس شہر سے دُور ہو جائیں۔ محلّے والے پوچھیں تو کہہ دیں کہ وہ اجمیر جا رہے ہیں۔ روانگی میں تاخیر ہوئی تو اُن کا گھر سے نکلنا مشکل ہو سکتا ہے۔ تجمّل کا اندازہ تھا کہ ارشد کی بے ہوشی زیادہ طول نہیں کھینچے گی اور اُدھر رستم خاں کے آدمی اپنے ساتھیوں کے ناکام واپس آ جانے پر منیر علی کے گھر کے اطراف فوراً پہرا نہیں لگا دیں گے۔ وہ خوب غور و خوض کر کے ہی کوئی قدم اُٹھائیں گے لیکن احتیاطاً ہماری ٹوہ لینے کے لیے اِدھر کا رُخ ضرور کریں گے۔ اس دوران وہ آسانی کے ساتھ شہر سے نکل سکتے ہیں۔ تجمّل نے چلتے چلتے اُنھیں تاکید کر دی تھی کہ اپنے ساتھ زیادہ سامان لانے کی کوشش نہ کریں ورنہ محلّے والوں کو اُن کے بیان پر شبہ ہو سکتا ہے کہ وہ اجمیر جا رہے ہیں۔ تجمّل کو یہ بھی خدشہ ہوگا کہ دیر ہو جانے سے منیر علی پھر تذبذب میں نہ پڑ جائیں۔ اُس نے اُنھیں یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ وہ پڑوسیوں کو اپنی روانگی سے بالکل آخری وقت تک نہ مطلع کریں اور جہاں تک بھی ہو جو سواری ملے جس کرائے پر ملے' بیٹھ جائیں۔ اس طرح محلّے میں اگر کوئی مخبر ہوگا تو وہ کسی کو اُن کے گھر چھوڑنے کی اطلاع نہیں پہنچا سکے گا۔ تجمّل نے مختصراً ایک ایک بات اُنھیں سمجھا دی تھی اور کہا تھا کہ بس وہ جودھ پور تک ہمّت اور حوصلے سے کام لیتے رہیں۔ جودھ پور اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں وہ اُن کا منتظر رہے گا۔ منیر علی نے اُس کی کسی بات کی تردید نہیں کی تھی۔ جو کچھ وہ کہتا رہا' چپ چاپ سنتے اور سر ہلاتے رہے۔

منیر علی کے پاس زیادہ سامان نہیں تھا۔ صرف دو صندوق تھے۔ ایک بڑا سا تھیلا اور بغل میں دبا ہوا ایک چرمی ہینڈ بیگ تھا۔ وہ بجھل کو بتا رہے تھے کہ ہمارے آنے کے بعد انھیں گھر سے نکلنے میں زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے لگے ہوں گے۔ انھیں ایک موٹر بھی مل گئی تھی لیکن کچھ ہی دُور پہنچ کے وہ خراب ہو گئی۔ پھر وہ ایک لاری میں بیٹھ گئے اور جب لوکلان اسٹیشن پہنچے تو گاڑی کا وقت نہیں تھا۔ وہاں سے انھیں ایک اور لاری مل گئی۔ چلنے سے پہلے انھیں اپنی بوڑھی ملازمہ کا انتظام بھی کرنا تھا، وہ ایک زمانے سے اُن کے ہمراہ تھی۔ انھوں نے ہی اُس کے بیٹوں بیٹیوں کی شادیاں کی تھیں۔ ملازمہ رات کو مولوی صاحب کے مکان میں سوتی تھی۔ منیر علی مولوی صاحب کا مکان خالی نہیں رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ آباد رہے گا تو اُس کی وحشت سوا نہیں ہوگی۔ ملازمہ کو انھوں نے عین وقت پر بتایا اور اُس سے کہہ دیا کہ اگر واپسی میں انھیں دن لگ جائیں تو وہ اپنے بیٹے یا بیٹی کو بلا کے گھر میں رکھ لے۔ انھوں نے ایک رقعہ بھی اُس کے نام لکھ دیا تھا، رقعے کی رُو سے وہ اُن کی مرضی سے گھر اپنی تحویل میں لینے کی مجاز تھی۔ اُن کے واپس نہ آنے کی صورت میں محلّے والے اُسے پریشان نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرا رقعہ انھوں نے شاہد صاحب کو لکھا تھا۔ شاہد صاحب وہی شخص تھے جن کی بابت پچھلی مرتبہ انھوں نے ہم سے بہت سی باتیں کی تھیں اور مجھے اُن سے ملوانے کے خواہش مند تھے۔ وہ بقول اُن کے اُن پر ایمان کی حد تک بھروسا کرتے تھے۔ ملازمہ سے انھوں نے دوسرے دن یہ رقعہ شاہد صاحب کو پہنچانے کے لیے کہا تھا۔ رقعے میں انھوں نے شاہد صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ اُن کی زمینوں اور پن چکی کی دیکھ بھال کرتے رہیں، واپسی میں انھیں شاید عرصہ لگ جائے۔ انھوں نے انھیں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اگر یہ مدّت واقعی طویل ہو گئی تو وہ ایک رسمی مختار نامہ لکھ کے بھیج دیں گے۔ اپنی منزل اور جیسلمیر سے اچانک چلے جانے کے بارے میں انھوں نے شاہد صاحب کو ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا۔

ایک اور رقعہ انھوں نے اپنے مرحوم بڑے بھائی کی اکلوتی شادی شدہ لڑکی کو بھی ڈاک سے بھیج دیا تھا۔ اُسے انھوں نے اپنی بیٹیوں کی طرح پالا تھا اور بیٹی ہی کہتے تھے۔ مجھے یہی وسوسہ تھا کہ وہ وہاں جانے کا فیصلہ نہ کر لیں مگر ایک تو وہ داماد کے گھر ٹھہرنا پسند نہیں کرتے تھے، دوسرے ان کا ایسے کسی عزیز کے ہاں جانا مناسب ہی نہیں تھا جس کے ٹھکانے سے محلّے والے اور ان کے دوسرے عزیز و اقارب واقف ہوں۔ بات تو پھر وہی رہتی ہے لوہیں اُن کی موجودگی کسی سے ڈھکی چھپی نہ رہتی۔ منیر علی نے صبح معمول کے مطابق محلّے کی مسجد میں فجر کی نماز ادا کی تھی اور نمازیوں سے اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا تھا کہ کچھ دیر بعد وہ اُن سے رخصت ہو رہے ہیں۔

ڈبے میں روشنی کبھی بالکل مدھم پڑ جاتی، کبھی اتنی تیز ہو جاتی کہ آنکھیں چکا چوند ہونے لگتیں۔ گاڑی اندھیرے میں اپنا سفر تیز رفتاری سے طے کر رہی تھی۔ ڈبے میں اچھی خاصی گنجائش تھی۔ بجھل نے ارشد کو اُوپر کی برتھ پر لٹا دیا تھا۔ زہرہ ایک کونے میں سمٹی دبکی ہوئی تھی۔ سلمہ بھی اُس کے پہلو سے چپکی ہوئی تھی اور گھبرا کے بار بار ڈبے میں چاروں طرف نظریں گھمانے لگتی تھی۔ بج... کا سر بجھل نے اپنے زانو پر رکھ لیا تھا۔ دن بھر نہ میں نے کچھ کھایا تھا، نہ بجھل نے اور شاید اُن لوگوں نے بھی کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ بجھل نے جودھ پور اسٹیشن پر قلی سے کھانے کا کچھ سامان منگوا لیا تھا۔ زہرہ نے ابھی تک نقاب ڈھیلی نہیں کی تھی۔ منیر علی کی خواہش تھی کہ زہرہ اور سلمہ زنانے ڈبے میں بیٹھ جائیں مگر بجھل نے اُن کی تائید نہیں کی۔ اُن دونوں کو کھانا علیحدہ دے دیا گیا تھا۔ انھوں نے آڑ میں بیٹھ کے کھا لیا۔ صبح ہوش میں آنے کے بعد سے اب تک زہرہ مسلسل سفر کرتی رہی تھی۔ "کب تک گھٹی بیٹھی رہے گی بٹیا! منہ کھول لے۔" بجھل نے اچانک اُس کے پاس جا کے اُس کی کمر تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔ "سفر میں اتنا پردہ نہیں کرتے۔" وہ اور سمٹ گئی۔ جب تک منیر علی نے بجھل کی ہم نوائی نہیں کی، اُس نے نقاب سے ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ بجھل نے منیر علی کو بھی ایک برتھ پر لٹا دیا۔ دونوں بیٹھے رہے اور وہ دونوں بھی، زہرہ اور سلمہ۔ مجھے احساس ہوا کہ شاید زہرہ میری وجہ سے آرام نہیں کر رہی ہے۔ مجھے کسی دوسرے ڈبے میں چلا جانا چاہیے تاکہ وہ پاؤں پھیلا کے بیٹھ سکے۔ ڈبے میں چار مسافر اور تھے مگر اُن کا اُسے اتنا خیال نہیں ہوگا جتنا میرا تھا۔ بجھل بھی اونگھنے لگا۔ سلمہ بھی کھڑکی سے ٹیک لگا کے غافل ہو گئی تھی۔ میں نے کھڑکی کی طرف منہ کر لیا اور ایسا ظاہر کیا جیسے مجھ پر بھی نیند کا غلبہ ہے۔ خاصی دیر بعد میں نے منہ پھیر کے دیکھا۔ وہ خود بھی اُسی نشست سے بیٹھی تھی۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ہوا سے اُس کی نقاب اُٹھی اُڑی جاتی تھی۔ مجھے دیکھ کے اُس نے گھبرا کے نقاب ہاتھ سے روک لی لیکن پھر اُسے خود ہی کچھ خیال آ گیا۔ اُس نے ہاتھ ہٹا لیا اور اُڑتی ہوئی نقاب سے اُس کا چہرہ جلنے سا لگا، اُس بلب کی طرح جو ایک لمحے روشن ہوتا ہے، دوسرے لمحے بُجھ جاتا ہے یا اُن بدلیوں کی طرح جو کبھی چاند پہ چھا جاتی ہیں کبھی چاند اُن پہ۔ میں نے خود ہی نظریں چرا لیں۔ زہرہ کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور چہرے پہ خوابیدگی طاری تھی۔ شہابی رنگت پہ ایک دھندسی غالب تھی۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہی تھی۔ وہ کہاں جا رہی ہے، ہم لوگ کون ہیں، مولوی صاحب کے عزیز رات کو کون لوگ آئے تھے، وہ اُسے کیوں لے جانا چاہتے تھے۔ اُس کے باپ نے اچانک گھر سے جانے کا ارادہ کیوں کر لیا۔ رات کو ہم وہاں نہ ہوتے یا ہماری آنکھ کھلنے میں اور دیر لگ جاتی تو زہرہ نہ جانے اس وقت کہاں ہوتی، کسی اندھیری کوٹھری میں! اور کن لوگوں کے درمیان! اُسے کیا معلوم تھا کہ اُس کی سہیلی کورا کو بھی وہی لوگ لے گئے تھے۔ وہ بھی اسی طرح پکار رہی ہوگی مگر اُس کی چیخ سن کے آنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ زہرہ تو اپنے کمرے سے صحن تک آتے آتے بے سدھ ہو گئی تھی۔ کورا بستیوں بستیوں انھی حادثات کی ز... پر رہی تھی۔ اُس کا باپ مر گیا تھا اور اپنے ہی لوگ اُس کے دشمن ہو گئے تھے۔ ایک رات اُس نے اپنے بوڑھے اتالیق آجتین کو اپنی آنکھوں سے قتل ہوتے دیکھا تھا اور وہ بدھ گیا سے رات کے اندھیرے میں تن تنہا سات آٹھ ... تک بھاگتی ہوئی ہمارے گھر پہنچی تھی۔ کلکتے میں اُس نے مجھے سپاہیوں کے ...

میں چھپا مارتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُس کا تو سبھی کچھ لُٹ گیا تھا۔ کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ ماں نہ باپ۔ ایک میرا سہارا تھا، وہ بھی چھن گیا۔ مولوی صاحب نہ ہوتے تو نہ جانے اُس کا کیا ہوتا۔ مولوی صاحب کے ہمراہ بھی معلوم نہیں کتنی راتیں اور کتنے دن اُس پہ ایسے گزرے ہوں گے۔ ایک ہی آسرا ہوگا جس نے اُسے زندہ رکھا۔ اُسی آسرے نے مجھے زندہ رکھا تھا، اُسی آسرے پہ اُس نے اپنی اُن آنکھوں پہ جو پھول مرجھانے سے سہم جاتی تھیں، سب کچھ گوارا کر لیا تھا۔ ممکن ہے اپنے بارے میں اُس نے زہرہ کو کچھ بتایا ہو۔ زہرہ نے ہزار بار اُس سے پوچھا ہوگا تو ایک آدھ بار اُس کی زبان بھی بہک گئی ہو گی۔ جیسے میں نے بجھل کو سب کچھ بتا دیا تھا، اُس نے بھی شاید زہرہ سے کچھ کہا ہو۔

گاڑی کسی اسٹیشن پر ٹھہری تو منیر علی کسمسانے لگے اور مجھے جاگتا ہوا دیکھ کے اُٹھ بیٹھے۔ پھر انھوں نے چونک کے زہرہ کی طرف دیکھا۔ زہرہ نے فوراً اپنا رُخ بدل لیا تھا۔ منیر علی غنودہ آواز میں مجھے بھی آرام کا مشورہ دینے لگے۔ "زہرہ بی بی سے کہیے کہ لیٹ جائیں، دن بھر کی تھکی ہوئی ہیں۔" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ زہرہ کی جھل ملاتی نگاہیں ایک ثانیے کے لیے مجھ پہ مرکوز ہوئیں پھر اُس نے گردن جھکا لی اور انگلیاں مروڑنے لگی۔ منیر علی پوری طرح بیدار ہو گئے تھے۔ انھوں نے گٹھڑی بنی ہوئی سلمہ کے پیر سیدھے کیے، اُس کے سر کے نیچے تکیہ رکھا اور اُوپر کی برتھ سے چادر لٹکا دی۔ جہاں ارشد سو رہا تھا۔ وہ دونوں پردے کے پیچھے اوجھل ہو گئیں۔

ڈبے میں ہمارے سوا صرف دو مسافر اور رہ گئے تھے۔ انھیں بھی جودھ پور اسٹیشن اُتر جانا تھا۔ رات کے پچھلے پہر جب سب لوگ سوئے ہوئے تھے، اُوپر کی برتھ سے منیر علی کا لٹکایا ہوا پردہ ہوا کے زور سے یا ارشد کے ہلنے جلنے سے دفعتہً نیچے گر گیا۔ نیم دراز زہرہ ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھی اور اُس نے جلدی سے اپنے پیر سکوڑ لیے جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ اُس کے سر پہ برقع نہیں تھا۔ سُرخی مائل بال شانے پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں سامنے ہی بیٹھا تھا۔ اُس کی نظر سیدھی مجھی پر آئی اور چند لمحوں کے لیے اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ اُس کی بالکل وہی کیفیت تھی جو پہلی بار بیٹھک کا دروازہ کھلنے سے ہوئی تھی یا جو کسی چور کی چوری پکڑے جانے پر ہوتی ہے۔ اُس کی بے بسی دیکھ کے میرے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے اپنا چہرہ دوپٹے کے پلو سے چھپا لیا۔ میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا۔ ڈبے میں کسی کی بھی آنکھ کھل سکتی تھی۔ زہرہ کھڑی ہو کے دوبارہ خود پردہ نہیں ڈال سکتی تھی۔ یک بارگی اُس نے پلو ہٹا کے پٹ پٹاتی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا، وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ میں نے دبے پاؤں فرش پر جھک کیا اور اُس کی جانب نظر کیے بغیر چادر ارشد کے بستر کے نیچے اچھی طرح دبا دی اور اُلٹے پاؤں اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ دوبارہ پھر چادر نہیں گری مگر زہرہ رات بھر ایک پل کے لیے نہیں سوئی تھی۔ صبح اُس کی بھاری بھاری آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ جاگتی رہی ہے۔

بازاروں اور گلیوں میں خوب روشنی تھی۔ رات کے نو بجے کے قریب زرّیں کی حویلی کے سامنے ہمارا تانگا ٹھہرا۔ بڈھا چوکی دار لاٹھی سنبھالتا ہوا ہماری طرف آیا اور بجھل پر نظر پڑتے ہی اُچھلنے چیخنے لگا۔ "اُستاد! قسم سے اُستاد ہو، اُستاد بجھل۔"

بجھل نے تانگے سے کود کے جھٹ اُسے گلے لگا لیا۔ "کیسا ہے شیرا؟"

"تمھاری دعا لگ رہی ہے اُستاد۔" وہ تیزی سے بولا۔ "اب کے بہت دن لگا دیے؟"

"کدھر!" بجھل نے ہنس کر کہا۔ "اب کے تو پہلے آ گیا ہوں رے!"

"بٹیا بہت ناراض ہے۔" وہ خفا ہو کے بولا۔

"کیسی ہے رے وہ؟" بجھل نے بے تابی سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ پر یاد بہت کر رہی تھی۔"

"سالے تو کیا وہ مجھے بھول جاتی۔ تیرا بھی منہ زاب کچی ہو گیا ہے۔ اب تجھے چلا جانا چاہیے۔ چل جا کے اُسے خبر کر اور سامان اُتروا کے اندر رکھ دے۔"

شیرا نے میری طرف دیکھا ہی نہیں تھا، نہ اُس نے سامان اُتروایا۔ بھاگتا ہوا حویلی میں چلا گیا۔ بجھل نے ہم سب کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور منیر علی کے شانے پہ ہاتھ رکھ کے اندر جانے لگا۔ میں نے ارشد کو تھام رکھا تھا۔ اُسے تیز بخار تھا۔ سامان تانگے میں رکھا رہا۔ ہم حویلی کی چار دیواری میں داخل ہو گئے۔ ابھی ہم آدھے راستے میں بھی نہیں پہنچے ہوں گے کہ سامنے دروازے پر زرّیں کا سراپا سرسراتا ہوا نظر آیا۔ وہ چبوترے کی سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی دوڑنے لگی۔ بجھل نے رُک کے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے اور زرّیں کو بازوؤں میں بھر کے زمین سے اُٹھا لیا۔ وہ اُس کی آغوش میں آتے ہی سسکنے اور تڑپنے لگی۔ بجھل اُسے اپنے بازوؤں میں چھپائے ہوئے چپ کھڑا رہا۔ لمحوں بعد اُس کی ٹمٹماتی ہوئی سی آواز اُبھری۔ "سنبھل ری۔" اُس نے زرّیں کی کنپٹیوں پر ہاتھ رکھ کے اُس کا بھیگا ہوا چہرہ اُٹھایا اور اُس کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے بولا۔ "میں آ گیا ہوں۔ اِدھر دیکھ، میں تیرے لیے کون کون لایا ہوں۔"

زرّیں کو جیسے ہوش آ گیا ہو۔ وہ حیرت بھری نظروں سے ہم سب کو تکنے لگی۔ میں ارشد کے ساتھ سب سے پیچھے کھڑا تھا۔ جیسے ہی اُس کی نگاہ مجھ پر ٹھہری، اُس کے لب پھڑکنے لگے۔ "لالہ بھی ہے۔" بجھل بلند آواز سے بولا۔ "اُس کی بعد میں خبر لینا۔ پہلے اِن سب کو عزت سے گھر لے جا۔ تو بہت بولتی تھی نا، اکیلی ہوں، اکیلی ہوں، بابا تم آ جاؤ۔ اب ایک نہیں، تیرے دو دو بابا ہیں۔ اب تجھ کو شکایت نہیں ہو گی ری۔" بجھل اُسے کھینچتا ہوا منیر علی کے پاس لے گیا۔ "اِس کے سر پہ ہاتھ رکھ دو بڑے صاحب! یہ بھی تمھاری بیٹی ہے۔ انھیں سلام کر بٹیا!" وہ زرّیں کو ٹہوکا مارتے ہوئے بولا۔ منیر علی کسی قدر جھجکے۔ زرّیں نے جھک کے انھیں آداب کیا ہی تھا کہ بجھل کی جانب بے چینی سے دیکھتے ہوئے انھوں نے اُسے اپنے پہلو سے لگا لیا۔ "جیتی رہو۔ خدا ہمیشہ خوش رکھے۔" وہ لرزیدہ لہجے میں بولے۔

اُسی لمحے اندر سے جہاں گیر اور نیساں دروازے پر نمودار ہوئے اور ...

تلانچیں بھرتے ہوئے بجھل کے پاس آ کے اُس سے لپٹ گئے۔ بجھل نے اُن دونوں کو ایک ساتھ اپنے سینے سے چمٹا لیا تھا۔ "کیوں شہزادے!" وہ جہاں گیر کو دبوچتے ہوئے بولا۔ "جان نہیں بنائی؟ اور یہ پھول کی چھڑی بھی اکڑی کی اکڑی ہے۔"

وہ دونوں شکایتیں کرنے لگے۔ ایک ہی سانس میں بہت سی باتیں۔ پھر وہ بجھل کا جواب سننے کے بجائے اُس کے بازوؤں سے نکل کے میری طرف جھپٹ پڑے۔ مجھے ارشد کا ہاتھ چھوڑنا پڑا۔ اُن دونوں نے میرے بازو جکڑ لیے تھے۔ نیساں کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور جہاں گیر نے اپنا سر میرے کندھے سے ٹکا دیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ایک ہنگامہ سا ہو گیا تھا۔ کسی کو بھی یہ خیال نہیں رہا تھا کہ اندر جانا ہے اور ہم راستے میں کھڑے ہیں۔ دیر نہیں گزری تھی کہ خانم بھی لپکتی جھپکتی آ گئی اور حویلی کے سارے ملازم بھی۔ کوئی اِدھر جاتا، کوئی اُدھر۔ کبھی بجھل کے پاس، کبھی میرے پاس، کبھی زہرہ کو دیکھتا جس نے اپنی نقاب ہٹا لی تھی۔ خانم ہی کو سب سے پہلے احساس ہوا۔ وہ اور زریں، زہرہ کو دلھنوں کی طرح اندر لے جانے لگیں۔ نیساں نے سلمہ کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ میں نے اور جہاں گیر نے ارشد کا۔ منیر علی بجھل کے ساتھ تھے۔ جس کمرے میں ہم سب پہنچے، وہاں تیز روشنی کر دی گئی۔ بجھل نے چوکی پر پیر پسارتے ہی خانم سے کہا کہ اُسے تیز بھوک لگی ہے، فوراً کھانے کا انتظام کیا جائے۔ خانم مسکرانے لگی اور بتانے لگی کہ گھر میں زریں روز اس خیال سے کھانا زیادہ پکواتی ہے کہ شاید بابا کسی وقت آ جائیں۔ روز ڈھیر سارا کھانا بچ جاتا ہے۔

ارشد کو میرے کمرے میں ایک صاف ستھرے بستر پر لٹا دیا گیا۔ بجھل نے اُس کا زخم دوبارہ کھول کے دیکھا۔ اُسے گہری چوٹ لگی تھی۔ زخم کے چاروں طرف ورم آ گیا تھا اور وہ بُری طرح کراہ رہا تھا۔ بجھل نے زخم صاف کر کے پھر باندھ دیا اور ارشد کو دلاسا دے کے باہر چلا گیا۔ زریں گلاس میں دودھ گرم کر کے لے آئی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ سے ارشد کو پلایا۔ دوپہر تک مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اُسے کیسے چوٹ آ گئی ہے۔ شام کو ریل میں بجھل نے پہلی بار مجھے اُس کے بارے میں بتایا تھا۔ رستم کے آدمیوں نے منیر علی کو گرفت میں لینے کے بعد بطورِ احتیاط گھر کے تمام کمروں کی تلاشی لینی ضروری سمجھی۔ کونے کے کمرے میں ارشد موجود تھا، دروازہ کھلا ہوا تھا اور ارشد جاگ رہا تھا۔ انھوں نے منیر علی کی طرح اُسے بے قابو کر دینا چاہا لیکن ارشد کو کمرے میں اندھیرے کی وجہ سے بچنے کا موقع مل گیا۔ اُس نے مزاحمت کی مگر وہ تین آدمی تھے۔ ایک نے اُس کا منہ بند کر کے چاقو کا دستہ اُس کی پیشانی پر مار دیا۔ دوسرے نے اُس کے پیٹ میں گھونسے مارے۔ ارشد نے پھر بھی اُن سے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش جاری رکھی۔ اُس نے اُس شخص کی انگلیاں دانتوں میں چبا لیں جس نے اُس کا منہ بند کر دیا تھا۔ وہ اُن کے ہاتھوں سے ایک بار نکل بھی گیا لیکن انھوں نے پے در پے وار کیے۔ ارشد نے میز سے ٹھوکر کھائی۔ پیشانی کا زخم دوبارہ دیوار کے ساتھ ٹکرانے سے اور گہرا ہو گیا۔ اُس کے پاؤں میں بھی زخم پڑ گیا تھا۔ ارشد سے پھر نہیں سنبھلا گیا۔ وہ وہیں فرش پر ڈھے گیا۔

بجھل نے چوکی دار سے اُستاد جامو کے چھوٹے بھائی جمرو کو کہلوا دیا تھا کہ وہ اپنے ساتھ کسی ڈاکٹر کو لے کے فوراً حویلی پہنچے۔ سب کے کپڑوں اور بالوں پہ دھول جمی ہوئی تھی۔ زریں نے سبھی کو دھلے ہوئے تولیے نکال کے دیے۔ نیساں اور خانم باورچی خانے میں کھانے کا انتظام کرنے چلی گئی تھیں جس پر سارے گھر میں بھاگا بھاگ پھر رہا تھا۔ نہا دھو کے اور کپڑے بدل کر سب بڑے کمرے میں آ گئے۔ نیساں اور زریں نے چوکی پہ کھانا سجا دیا تھا۔ خانم نے سچ کہا تھا، گھر میں کھانے کا خاصا سامان تھا۔ پھر بھی نیساں نے بٹیریں اور مرغیاں بھون لی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کسی چھوٹی موٹی دعوت کا اہتمام ہو۔ وہ پانچوں، زریں، خانم، نیساں، زہرہ اور سلمہ ایک طرف بیٹھ گئیں۔ اُن کے سامنے ہم چاروں بیٹھے، بجھل، منیر علی، جہاں گیر اور میں۔ کھانے میں میٹھے چاول بھی تھے۔

جہاں گیر چپکے سے مجھ سے کہنے لگا کہ جب نیساں نے اُسے بتایا، بابر بھائی اور بابا چند مہمانوں کے ساتھ آئے ہیں تو اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا کہ کہیں ابا جان، فرخ، فرمالی، فارسہ اور اکبر تو نہیں آ گئے۔ کہنے لگا، مجھ سے تو چلا بھی نہیں گیا۔ میں اُسے کیا جواب دیتا کہ مٹے! اُن کا ملنا ہماری قسمت میں نہیں ہے۔ پوچھنے لگا، اُن کا کچھ پتہ چلا؟ مجھے اُس کے سوالوں سے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ پتہ چلتا تو وہ میرے ساتھ ہی کیوں نہ ہوتے اور میں سب سے پہلے یہ خبر اُسے کیوں نہ سناتا۔ مجھے چپ دیکھ کے اُس نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ خود ہی سمجھ گیا اور موضوع بدل کے اپنی پڑھائی کے بارے میں بتانے لگا کہ وہ الٰہ آباد بورڈ سے میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے اور اُسے اُمید ہے، فرسٹ کلاس میں پاس ہو گا۔ اُس کی صحت بھی نسبتاً بہتر تھی اور وہ پہلے سے کسی قدر بڑا معلوم ہوتا تھا۔ اُدھر نیساں بار بار اُچک اُچک کے مجھے دیکھنے لگتی تھی۔ اُس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ میرے پاس آ کے بیٹھ جائے۔ مجھے یقین تھا، وہ ضرور مجھ سے کسی وقت پوچھ بیٹھے گی کہ میرے لیے کیا لائے۔ اُس کی زبان رکتی ہی نہیں تھی۔ مجھے کچھ ایسا لگا کہ آنکھوں آنکھوں میں وہ یہی بات کہہ رہی ہے۔ میں نے خود چلتے وقت اُس سے پوچھا تھا، نیساں! بتا تیرے لیے کیا لاؤں۔ اُس نے وہی جواب دیا تھا جو اُسے دینا چاہیے تھا۔ کہا تھا، "بس آپ آ جائیں۔" سوچنا تو میرا کام تھا کہ کیا لے جانا ہے۔ اتنی دیر سے آنے کے بعد کوئی یوں خالی ہاتھ تو گھر نہیں لوٹتا۔ نیساں نے میرے پیچھے میرے لیے بہت دعائیں کی ہوں گی۔ میں اُس کے لیے ایک جوڑی ہاتھوں کی چوڑیاں بھی نہ لا سکا۔ میں نے طے کیا کہ بجھل سے پیسے لے کے صبح صبح بازار نکل جاؤں گا اور بہت ساری چیزیں لاؤں گا، اتنی کہ نیساں گنتے گنتے، اُٹھاتے اُٹھاتے، دیکھتے دیکھتے تھک جائے گی۔

کھانے کے دوران ہی چوکی دار نے اطلاع دی کہ جمرو ڈاکٹر لے کے آ گیا ہے۔ ہم کھانا تقریباً کھا ہی چکے تھے۔ میں نے آج پیٹ بھر کے کھانا کھایا تھا۔ بجھل نے انھیں مردانے میں بٹھانے کو کہا اور ہاتھ دھو کر فوراً باہر چلا گیا۔ مردانے میں جمرو اکیلا نہیں تھا۔ فیض آباد میں اُس کے اڈے کے کئی آدمی اُس کے

ساتھ موجود تھے۔ میں وہاں پہنچا تو شور مچا ہوا تھا۔ سب بجھل کو گھیرے ہوئے تھے۔ میری آہٹ پر وہ سب میری طرف پلٹ پڑے۔ جمرو اپنا سر میرے سر سے مارنے اور قہقہے لگانے لگا۔ اُس نے جھک کر پہلو میں بے تحاشا گدگدیاں کیں۔ میں جتنا بھاگتا، اُتنا ہی اُس کے قہقہے بلند ہوتے مگر پھر کمرے میں اچانک خاموشی چھا گئی۔ جمرو نے مجھے چھوڑ دیا۔ بجھل اپنا ہاتھ اُٹھائے ہوئے چیخ رہا تھا۔ منیر علی وہاں آ گئے تھے۔ "بڑے صاحب!" بجھل اُن کی جانب تیزی سے مڑ کے بولا۔ "یہ سب۔۔۔۔ سب اپنے جانی ہیں۔ یہ مائی کا لال جمرو ہے، جمرو بدمعاش اور یہ سب اِس کے لنگوٹیے ہیں۔ سب ایک نمبر ہیں۔ آواز اور آنکھ خوب پہچانتے ہیں۔ یہ آدمی کے بچے ہیں۔ ان کو اپنا غلام سمجھو۔"

جمرو کے ساتھ سبھی نے جھکتے ہوئے انھیں سلام کیا اور نیچی نظریں کیے وہیں کھڑے رہے جہاں جہاں تھے۔

"کیا ڈاکٹر صاحب آ گئے؟" منیر علی نے سراسیمگی سے پوچھا۔

بجھل چونک پڑا اور جمرو کے بال پکڑ کے کھینچنے لگا۔ "ابے سب بھلا دیا تو کیسے لایا ہمارے؟ کدھر ہے وہ؟ کسی عطائی قصائی کو تو نہیں پکڑ لایا؟"

جمرو نے ڈاکٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ڈاکٹر کونے کی ایک کرسی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ "نگینہ ڈھونڈ کے لایا ہوں اُستاد! بہت بڑا ڈاکٹر ہے۔ اس کی قینچی ایسے ہی چلتی ہے جیسا تمھارا۔۔۔" بجھل نے جمرو کو بات مکمل نہیں کرنے دی، اُس کے پیٹ میں زور سے مکا مارا۔ جمرو بلبلا گیا۔ "تمھارے سر کی قسم!" وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "مریض کی کلائی پکڑنے کی دیر لگتی ہے، سمجھو مرض ایک دم دفع۔"

بجھل نے بڑھ کے ڈاکٹر کا بیگ اُٹھا لیا۔ میں نے اُس سے بیگ لینا چاہا مگر جمرو نے پہل کر دی۔ ڈاکٹر ایک معمر اور بردبار شخص تھا۔ باقی سب باہر رک گئے۔ جمرو ہمارے ساتھ اندر آ گیا۔ ارشد کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ بخار میں پھنک رہا تھا۔ ڈاکٹر دیر تک غور سے اُس کا معائنہ کرتا رہا۔ زخم کی مرہم پٹی کے بعد اُس نے دو انجکشن بھی ارشد کے بازو اور کولھے میں گھونپ دیے۔ ڈاکٹر کو چپ دیکھ کے منیر علی کانپتے ہوئے اُس سے پوچھنے لگے کہ کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے۔

"عادت سے مجبور ہے بڑے صاحب!" جمرو نے درمیان میں دخل دیا۔ "یوں ہی منہ بنائے رہتا ہے۔ آدمی سالا اِس کا پھولا ہوا گال دیکھ کے خود بیمار پڑ جاتا ہے۔ ہم کو بھی بس چوٹیں کھا کے پتہ چلا، جب یہ ایسا منہ بنائے تو سمجھو سب ٹھیک ہے۔"

ڈاکٹر کو ہنسی آ گئی۔ اُس نے منیر علی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی اور نسخہ لکھ کے جمرو کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ڈاکٹر نے دودھ کے سوا ارشد کے لیے ہر غذا کی ممانعت کر دی تھی اور سخت احتیاط کی تاکید کی تھی۔

جمرو اور اُس کے ساتھی رات کے دو بجے تک مردانے میں بیٹھے بجھل کے پیچھے ہونے والے ایک ایک واقعے کی تفصیل اُسے سناتے رہے۔ جمرو کی زبانی معلوم ہوا کہ کانتے دو دن کے لیے کلکتے سے آیا تھا۔ یقیناً وہ ممبئی جاتے یا واپس آتے ہوئے زریں کو دیکھنے کے لیے فیض آباد کے راستے سے گزرا ہو گا۔ جمرو بھی کانتے کے فیض آباد آنے کا وہی مہینہ بتا رہا تھا جو زورا نے مجھے اُس کے ممبئی پہنچنے کا بتایا تھا۔ کانتے نے کتنی ہی بار بجھل سے کہا تھا کہ اُسے فیض آباد بھیج دیا جائے مگر بجھل نے ہر دفعہ اُس کی خواہش سختی سے مسترد کر دی تھی۔ کانتے کا ممبئی میں جولین کے گھر رہنا بھی پسند نہیں کیا تھا۔ اِس میں کیا مصلحت تھی، شاید وہ اُسے وہیں کلکتے کے اڈے پر رکھنا چاہتا تھا۔ جمرو کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دوران گھوشی کا دماغ پھر اُلٹ گیا تھا۔ اُس نے پیسہ پہنچانے سے انکار کر دیا تھا اور ایک بار پھر زور دکھانے کی کوشش کی تھی۔ اُستاد جامو نے گھوشی کی لاش موجمدار کے علاقے میں بیچ سڑک پر پھنکوا دی تھی۔ پولیس نے جامو کو اور تمام اڈوں کے آدمیوں کو بہت ٹٹولا لیکن کسی نے ایک لفظ کہہ کے نہیں دیا۔ گھوشی کے مرنے کے بعد موجمدار کے علاقے میں پھر کوئی نہیں اُٹھا۔ اب تمام اڈوں سے وقت پر پیسے آ جاتے ہیں اور کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہے۔ شبولی اور لالہ دونوں جیل میں بند ہیں۔ دونوں ہاوڑا اسٹیشن پر کسی سیٹھ کی بغل سے روپوں کا بھاری تھیلا لے کے بھاگ رہے تھے۔ اچانک ریلوے لائن پر دوسری ٹرین آ گئی۔ ٹرین کی رفتار تیز تھی، پار نہیں جا سکتے تھے۔ سیٹھ کے شور مچانے پر مسافروں نے انھیں بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ کسی نے اسٹیشن پر پڑی ہوئی لوہے کی کوئی چیز کھینچ کے ماری۔ شبولی وہیں گر گیا۔ نتیجے میں لالہ کو بھی رکنا پڑا۔ دونوں دھر لیے گئے۔

"اچکے!" بجھل کا چہرہ لال ہو گیا۔ "تو سچ بول رہا ہے جمرو؟"

"ہاں اُستاد! یہی سنا ہے۔" جمرو نے آہستگی سے کہا۔

"ہا، تھو! اپنے اڈے کے آدمی اچکا پن کرنے لگے۔"

"اُستاد! اسامی موٹی تھی۔ وہ دونوں بہت دور سے پیچھا کر رہے تھے۔ سالا سیٹھ تھیلا بغل سے چپکائے ہوئے تھا۔" جمرو نے دبی زبان سے کہا۔

"سونا بھرا تھا نا اُس میں!" بجھل چیخ کر بولا۔ "پر یہ اُٹھائی گیرا پن اُن کو کس نے سکھا دیا! چھین کے بھاگ گئے مداری!"

"ہاں اُستاد! کوئی اور شکل نہیں تھی۔"

"تو بھی یہی بک رہا ہے؟" بجھل نے اُلٹے ہاتھ سے جمرو کے منہ پر طمانچہ مارا۔

جمرو اُس کے پیروں پر جھک گیا۔ بجھل تیزی سے حقہ گڑگڑانے لگا۔ حقہ زریں نے کھانے سے پہلے ہی اُس کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ اِس کے بعد اُن میں سے کوئی نہیں بولا، نہ بجھل نے کچھ پوچھا۔ رات بھی بہت ہو گئی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ اُٹھ کے جانے لگے۔ مجھے صبح بازار جانے کے لیے بجھل سے پیسے مانگنے تھے لیکن میں بھی چلا آیا۔ بجھل نہ جانے کب تک وہاں اکیلا بیٹھا رہا۔

مردانے سے باہر حویلی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جیسلمیر کے مقابلے میں یہاں موسم زیادہ خنک تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سرسرا رہے تھے۔ مجھے بھی کچھ ہلکا پن محسوس ہو رہا تھا۔ کئی راتوں سے سونا نہیں ہوا تھا۔ باہر آ کے خیال آیا کہ میں رات کہاں گزاروں گا، اُس کمرے میں ارشد موجود تھا جو زریں نے ایک طرح

میرے لیے مخصوص کر دیا تھا لیکن حویلی میں اور بہت سے کمرے تھے۔ برآمدے سے ملحق چھوٹا کمرہ عبور کر کے چند ہی قدم چل کے میرے پیر جامد ہو گئے۔ سامنے وسیع کھلے حصے کے اس طرف والان میں روشنی ہو رہی تھی اور کوئی تھم کے سہارے ننگے فرش پر بیٹھا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں سب سے پہلے زرّیں کا نام آیا اور وہ وہی تھی۔ اس نے پیازی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ دوپٹا، کرتا، پاجامہ سبھی ایک رنگ کا تھا۔ "زرّیں!" میں نے اُسے درمیان ہی میں جا لیا اور حیرانی سے پوچھا۔ "تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟"

"ہاں!" اُس کے من میں ہلکی سی لرزش ہوئی۔ "تم کہاں آرام کرو گے؟"

"کہیں بھی کہیں بھی لیٹ جاؤں گا۔ اتنا بڑا گھر ہے۔" میں نے ہچکچا کے کہا۔

"میں نے لائبریری کے برابر والا کمرہ صاف کر دیا ہے۔"

"کیا تم یہی بتانے کے لیے یہاں بیٹھی ہوئی تھیں؟"

"نہیں۔" وہ مدھم آواز میں بولی۔ "مگر یہ بھی ایک خیال تھا۔"

"اور اگر میں ساری رات وہیں بیٹھا رہتا؟"

اُس نے جواب نہیں دیا۔ فرش پر نگاہیں جمائے چپ کھڑی رہی تب مجھے اُسے غور سے دیکھنے کے لیے چند لمحے مل گئے۔ پیازی رنگ کے لباس میں اُس کا اپنا رنگ اور نکھر آیا تھا۔ زرّیں اس عرصے میں کچھ اور دُبلی ہو گئی تھی اور اُس کا قد پہلے سے زیادہ بڑا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ میرے شانے تک آ رہی تھی۔ اسے شاید احساس ہو گیا کہ میں اُسی کی جانب دیکھ رہا ہوں۔ "کمرہ یاد ہے؟" کچھ توقف کے بعد وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"نہیں، میں تو بالکل نیا ہوں۔"

"میں نے سوچا کہ تم . . . . "

"تم مجھے اندر کسی سے کہلوا دیتیں۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"سب سو گئے تھے۔"

میں نے اُس سے بحث نہیں کی لیکن میرا جی اُس سے اور باتیں کرنے کو چاہتا تھا۔ میری سمجھ میں لفظ نہیں آ رہے تھے۔ آخر میں نے اُس سے کمرے میں چل کے سو جانے کو کہا۔ دو سے اوپر ہو چکے تھے۔ "کیا تمھیں نیند آ رہی ہے؟" چلتے چلتے میں نے پلٹ کے اُس سے پوچھا۔

وہ ابھی تک اپنی جگہ کھڑی تھی۔ "کوئی کام ہے؟"

"چائے مل سکتی ہے؟" میں نے یوں ہی کہہ دیا۔

"اِس وقت! چائے سے تو نیند اور دُور ہو جائے گی۔"

"سر کچھ بھاری بھاری ہے۔"

"سفر کی تھکن ہے، بال بھی خشک پڑے ہیں۔ تیل بھی تو نہیں ڈالتے۔"

"سفر کی تھکن ہے؟"

"سفر میں ان باتوں کی کہاں فرصت ملتی ہے۔"

"سر دبا دوں؟" اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"نہیں، درد نہیں ہے۔ بس تم اگر ہو سکے تو چائے پلا دو۔"

"ابھی لاتی ہوں۔"

"تم اس وقت اتنی دُور باورچی خانے میں جاؤ گی؟"

"باورچی خانہ گھر ہی میں ہے۔" وہ سرگوشی میں بولی۔

"رہنے دو۔"

"کیوں؟" اُس نے پلکیں اُٹھا کے مجھے بےتابی سے دیکھا۔

"بس نہیں۔ رات بہت ہو گئی ہے۔"

"تو کیا ہوا۔" میری بات سُنے بغیر وہ ایک طرف بھاگ گئی۔

لائبریری کے برابر ایک بڑے کمرے میں میرے کپڑے بستر پر رکھے ہوئے تھے۔ پاجامے میں کمربند بھی تھا۔ مسہری کے قریب میز پر پانی سے بھرا ہوا جگ اور گلاس موجود تھا اور چند کتابیں اور رسالے۔ منہ پر چھپکا مار کے میں کرتا پہن ہی رہا تھا کہ اُس کی چاپیں سُنائی دیں۔ شاید وہ دانستہ زمین پر زور زور سے قدم رکھ رہی تھی۔ میرا جسم ایک لمحے کے لیے سُن سا ہو گیا۔ زرّیں کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ "اتفاق سے دودھ چند ہی قطرے تھا۔ مرزا تنے کے لیے چائے بنی اور وہ ارشد صاحب کے لیے . . ." اُس نے اپنی ہانپتی ہوئی آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ بالائی کہاں سے آ گئی؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"دیگچی میں لگی ہوئی تھی۔ کالی چائے سے خشکی اور بڑھ جاتی۔" میں نے دو تین ہی گھونٹوں میں چائے ختم کر لی۔ "ٹھنڈی ہو گئی کیا؟" وہ پریشانی سے بولی۔

"ریل چھوٹنے کے ڈر سے جلدی جلدی چائے پینے کی عادت ہو گئی ہے۔"

اُس کے چھوٹے چھوٹے دانت چمکنے لگے۔ "آپ کہاں کہاں گئے؟"

"دُور دُور تک۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

وہ خاموش رہی پھر چند ثانیوں بعد بولی۔ "اب میں جاتی ہوں۔"

"نیند آنے لگی کیا؟"

"نہیں۔"

"تو بیٹھ جاؤ، کھڑی کیوں ہو؟"

وہ مسہری کے کونے میں پائنتی سے لگ کے بیٹھ گئی۔

"تم کیسی ہو؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"بالکل . . . . بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ چونک کے بولی۔

"اب تمھارا جی لگ رہا ہے!"

"ہاں۔" اُس نے اضطراب سے کہا۔

"جہاں گیر اور نیساں نے تمھیں زیادہ تنگ تو نہیں کیا؟"

"وہ دونوں بہت اچھے ہیں۔"

"میری وجہ سے تو نہیں کہہ رہی ہو؟"

"اُن کے آنے سے گھر ہی بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نیساں مجھے کسی کام کو ہاتھ ہی نہیں لگانے دیتی۔ ہر وقت کودتی اُچھلتی رہتی ہے۔ ذرا خاموش ہو تو گھر میں کمی سی محسوس ہوتی ہے اور جہاں گیر۔ میں نے ایک بار سختی سے

کہا کہ تم پڑھائی میں دلچسپی کم لو گے تو میری تم سے کٹی۔ بس ہر وقت پڑھتا رہتا ہے اور روزرات کو مجھے آ کے بتاتا ہے کہ آج میں کتنا آگے بڑھ گیا۔ آج میں نے کیا سیکھا۔ میرے بغیر وہ کھانا بھی نہیں کھاتا۔"

"اور خانم . . !"

"خانم باجی!" وہ مرتعش لہجے میں بولی۔ "اُن کا بس چلے تو وہ مجھے اپنی آنکھوں سے ایک پل بھی اوجھل نہ ہونے دیں۔ حویلی کا یہ جو نقشہ بدلا ہوا ہے سب اُنھی کا کیا ہوا ہے۔ کھڑکیوں کے پردے دروازوں کے پردے دیواروں کا رنگ سارا باغ بھی اُنھوں نے بدل کے رکھ دیا ہے۔ اب ہر طرف پھول ہی پھول کھلے ہیں۔ وہ روز کئی گھنٹے باغ پر صرف کرتی ہیں۔ بہت سلیقہ مند ہیں، بہت شائستہ۔ مجھے ہر وقت یہ احساس رہتا ہے کہ میری کوئی بات اُنھیں بُری نہ لگ جائے کیونکہ وہ بہت نازک ہیں۔ کبھی کبھی ستار بجاتی ہیں تو کھو جاتی ہیں۔ پھر اُنھیں کچھ خبر نہیں رہتی۔ میں نے اُن سے بہت کہا کہ خانم باجی! آپ مجھے بھی ستار سکھا دیں۔ میری ہر بات مانتی ہیں لیکن ایک یہی بات نہیں مانتیں۔ کچھ کھاتی پیتی بھی نہیں ہیں۔ بس دال، چاول، سبزی یا کبھی ہلکے قسم کا شوربہ۔ کہتی ہیں کہ کم اور ہلکا کھانے سے دو فائدے ہیں۔ ایک تو مزاج لطیف رہتا ہے، دوسرے خدانخواستہ کبھی بُرا وقت آ جائے تو اتنی پریشانی نہیں ہوتی۔ عجب عجب منطقی باتیں کرتی ہیں مگر کم ہی بولتی ہیں۔"

زرّیں نے پہلی بار مجھ سے اتنی باتیں کی تھیں۔ میں اُسے درمیان میں ٹوکنا نہیں چاہتا تھا تاکہ کہیں وہ رُک نہ جائے۔ وہ باتیں کرتے ہوئے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ رخسار دہک رہے تھے اور لہجے میں ایک ہلکی سی لرزش تھی جیسے وہ ایک ساتھ سب کہہ دینا چاہتی ہو۔ میں اُس کا چہرہ تک رہا تھا لیکن اُس کی نگاہیں میری طرف نہیں تھیں۔ بولتے بولتے یکایک وہ رُک گئی۔ اُس کے کانوں کی لَویں سُرخ ہو گئی تھیں۔ "کیا ہوا؟ تم رُک گئیں؟"

"کچھ نہیں۔" وہ جھینپ کر بولی۔ "وقت بہت ہو گیا ہے۔"

"ہونے دو۔ صبح ہونے میں اب دیر ہی کتنی ہے۔"

"دو راتوں سے جاگ رہے ہو۔ کچھ دیر کے لیے سو جاؤ۔"

"تمھیں یہ کس نے بتایا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"زہرہ کہہ رہی تھیں۔"

"اور کیا کیا کہہ رہی تھی؟"

"اور کچھ نہیں۔" وہ زیرِ لب تبسم سے بولی۔

"مگر میرے جاگنے سونے کا ذکر کیسے نکل آیا؟"

"بس باتوں باتوں میں۔"

"اتنی دیر میں اتنی باتیں ہو گئیں؟"

"ہاں! بہت سی باتیں۔"

"مثلاً کیا کیا۔ اور کیا بتایا اُن لوگوں نے؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔"

"عام باتیں سہی۔ مجھے نہیں بتاؤ گی؟"

"وہ اپنے بارے میں، خاندان کے بارے میں اور بہن بھائیوں کے بارے میں بتاتی رہیں۔"

میں نے ہنکاری بھری۔

"زہرہ بہت خوب صورت ہیں۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"ہاں۔" میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجھے بہت اچھی لگیں۔"

"خدا کرے تمھارا یہ تاثر قائم رہے۔"

"کیوں؟" وہ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"اتنی دیر میں کسی کے بارے میں کوئی رائے کیسے قائم کی جا سکتی ہے۔"

"مجھے یقین ہے وہ ہر اعتبار سے اچھی ہوں گی۔ ویسے بھی وہ بہت اچھی لگتی ہیں۔ دل چاہتا ہے بس دیکھتے رہو۔ کاش اُن کا بھی یہاں دل لگ جائے اور وہ کبھی نہ جائیں۔"

"زرّیں! مجھے تم سے اُن لوگوں کے بارے کچھ کہنا تھا۔" میں نے مذبذب کہا۔

اُس کی غزالیں آنکھیں چمکنے لگیں۔

"گو اس کی ضرورت تو نہیں۔" میں نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔ "پھر بھی کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ خانم اور جہاں گیر کے بعد اب یہاں یہ لوگ آ گئے ہیں۔ بات ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ ہمیں یہاں لانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ اُن کا ایک بڑا سا گھر تھا۔ اتنا بڑا تو نہیں جتنا یہ ہے لیکن بہت سے گھروں سے اچھا تھا۔ ہمارے پاس اِس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ یہ لوگ اپنا گھر چھوڑ کے یہاں آئے ہیں اور صرف ہماری وجہ سے۔"

"یہ سب کیوں کہہ رہے ہو؟"

"اب زیادہ لوگ ہو گئے ہیں تو ایک . . . "

"حویلی بہت بڑی ہے۔ خوب رونق رہے گی۔" وہ تیزی سے بولی۔

"کاش ایسا ہی ہو۔"

"ایسا ہی ہو گا۔" وہ مسکرانے لگی۔

"ممکن ہے کبھی وہ اپنے گھر واپس چلے جائیں۔"

"ہم اُنھیں جانے ہی نہیں دیں گے۔"

میں کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔ گھڑی نے تین بجا دیے تھے۔ مجھے زرّیں کو واپس بھیج دینا چاہیے تھا۔ صبح اُسے جلد اُٹھنا تھا مگر وہ جانے کے لیے کسمسانے لگی تو میں نے اُسے پھر روک لیا۔ لمحے بیت گئے۔ وہ یوں ہی بیٹھی رہی۔ کہنے کو تو میں نے اُس سے کہہ دیا تھا لیکن اب پچھتاوا سا ہو رہا تھا کہ زرّیں سے یہ سب کہہ کے میں نے اُسے دُکھ پہنچایا ہے۔ اُس کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ منیر علی اور زہرہ وغیرہ ہمارے ساتھ آئے ہیں۔ ظاہر ہے کوئی ایسی ہی بات ہو گی جو ہم اُنھیں یہاں لائے ورنہ ہم کہیں اور بھی لے جا سکتے تھے۔ زرّیں نے مجھ سے کُرید نہیں کی کہ اُن لوگوں کے ساتھ کیا حالات پیش آئے تھے۔ وہ خود بھی

حالات سے گزر چکی تھی اور اچھی بُری نگاہ کی پہچان اُسے خوب ہوگئی تھی، وہ جانتی تھی کہ زندگی میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں دُہرایا نہیں جاتا، دُہرانے سے تکلیف ہوتی ہے یہ دُنیا ہی ایسی ہے۔ یہاں وقت کا موسم یکساں نہیں رہتا اور کہہ کے بھی نہیں آتا، نہ اُس کا کوئی وقت مقرر ہے اور نہ ہر فرد پہ ایک جیسی گزرتی ہے۔ آدمی اُس دُنیا میں اکیلا نہیں رہتا، دوسرے بھی اُس کے ساتھ رہتے ہیں۔ سامنے کسی کی نگاہ بدل گئی یا اپنی ہی نگاہ چوک گئی۔ خود ذرا سی لغزش ہوگئی تو ساری تدبیریں خاک میں مل جاتی ہیں۔ زرّیں کو وقت کے اُتار چڑھاؤ کا اچھی طرح تجربہ ہو چکا تھا سو اُس نے کچھ اور جاننے کی کوشش نہیں کی۔ وہ میرے سامنے بیٹھی رہی بالکل تصویر کی طرح نگاہیں جھکائے ہوئے، روشنی میں اُس کا سُرخ و سفید رنگ دہک رہا تھا۔ آج سے ڈیڑھ دو سال پہلے کی زرّیں اور اب کی زرّیں میں بہت فرق تھا۔ جب ریل میں یہ مجھے اُس کمینی نسترن کے ساتھ نظر آئی تھی تو اُس کا چہرہ جل سا رہا تھا، آنکھوں میں وحشت چھائی ہوئی تھی اور بدن سہما سہما گھبرایا گھبرایا لگتا تھا مگر یہ کسی پَری کی طرح اُس وقت بھی ایسی ہی تھی۔ بجھل نے اُسے دیکھتے ہی کہا تھا "لاڈلے! یہ شہزادی کہاں سے لے آیا۔"

اب زرّیں بہت بدلی ہوئی تھی۔ اب وہ ایک پُرسکون جھیل کے مانند تھی جس میں کنکر پھینکو تو ایک ارتعاش سا ہوتا ہے۔ پھر پانی سطح پر برف کی طرح جم جاتا ہے۔ اُس کے اِس سکون سے مجھے ہول آنے لگتا تھا۔ سفر میں ہزاروں بار مجھے اُس کا خیال آیا تھا۔ جیسے جیسے فیض آباد قریب آتا جا رہا تھا، مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ نہ جانے کتنی باتیں میں نے اُس سے کہنے کے لیے سوچ رکھی تھیں، اب وہ سامنے بیٹھی تھی تو سب باتیں گڈمڈ ہوگئی تھیں۔ یوں ہی بیٹھے بیٹھے ایک گھنٹہ گزر گیا۔ پتہ ہی نہیں چلا۔ گھڑی نے چار بجائے تو وہ جیسے خواب دیکھتے دیکھتے بیدار ہوگئی۔ یکایک اُٹھ کھڑی ہوئی "جا رہی ہو؟" میری آواز ڈوبنے لگی۔

"اب چلنا چاہیے۔"

"ہاں جاؤ۔"

"طبیعت کیسی ہے اب؟"

"نیند نہیں آرہی ہے۔"

"بستر پہ آجائے گی۔ کیا میں ٹھہر جاؤں؟"

"نہیں" میں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا "میں تمھیں پہنچا آتا ہوں۔"

"اب مجھے ڈر نہیں لگتا، حویلی میں اکیلی رہتی تھی۔"

"مگر تم تو چھپکلی سے ڈر جاتی ہو۔"

"چھپکلی کی بات اور ہے۔" وہ ہنسنے لگی۔

ہم دونوں آہستہ آہستہ زنان خانے کی طرف آگئے۔ ہوا میں خنکی اور بڑھ گئی تھی صحن اور دالانوں میں بہت دھیمی روشنی تھی۔ میں اُس کے کمرے کے سامنے آکے رُک گیا۔ چند لمحوں تک وہ وہیں ٹھیری رہی پھر تیزی سے اندر چلی گئی۔

میری آنکھ کھلی تو کمرے میں دن کا اُجالا پھیلا ہوا تھا اور جہاں گیر میرے سرہانے بیٹھا مُسکرا رہا تھا۔ میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا میری نظر سیدھی گھڑی پر گئی۔ ایک بجنے والا تھا میں ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا "کیا وقت ہوا ہے؟"

"گھڑی دیکھیے" وہ شوخی سے بولا۔

"گھڑی میں تو ایک بج رہا ہے" میں نے سٹ پٹا کے کہا۔

"شاید کچھ پیچھے ہوگئی ہے۔"

"کیا مطلب۔"

"مطلب یہ کہ وقت کی دوڑ میں گھڑی کی سوئیاں شاید کچھ پیچھے رہ گئی ہیں۔" وہ تیکھے لہجے میں بولا "اب اُٹھ جائیے۔ آپی نے کہا ہے کھانا تیار ہو رہا ہے۔ کھا کے پھر سو جائیے گا۔"

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں اُٹھایا؟"

"صبح سے نیساں اور میں کئی بار یہاں آچکے ہیں لیکن ابا نے منع کر دیا تھا کہ آپ سو رہے ہوں تو اُٹھایا نہ جائے۔ زرّیں باجی بھی دو مرتبہ دیکھ کے جا چکی ہیں۔ اب جلدی سے منہ ہاتھ دھو لیے۔ جب تک آپ تیار ہوں گے، کھانا دسترخوان پہ آتارا جا چکا ہوگا۔"

"اور سب لوگ کہاں ہیں؟"

"یہیں گھر میں ہیں۔" اُس نے سادگی سے کہا۔

مجھے اپنے آپ سے ندامت ہونے لگی ایسا لگا جیسے جہاں گیر نے میری کوئی غلطی پکڑ لی ہے۔ اُس کا چہرہ کِھلا ہوا تھا۔ اُس نے میرا ہاتھ کھینچ کے مجھے بستر سے اُٹھا لیا اور میرے پیروں کے آگے چپّل رکھ دیے "غسل خانے میں کپڑے موجود ہیں۔ میں یہیں بیٹھا ہوں آپ تیار ہو کے آئیے۔" اُس کے لہجے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

میں نے کسی معمول کی طرح اُس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس سے پہلے کہ میں بڑے کمرے کے دروازے میں قدم رکھتا، اندر سے ایک دم نیساں اُچھلتی ہوئی میرے پاس آگئی اور میرے پہلو سے بے تابانہ چمٹ گئی۔ میں نے اُسے اور زور سے چمٹا لیا۔

"بابر بھائی!" اُس کی آواز رُندھنے لگی۔

"ارے تم تو رو رہی ہو نیساں، ہائیں۔" میں نے بے قراری سے کہا۔

نیساں کے نتھنے لرزنے لگے۔

"نیساں ہر وقت آپ کو پوچھتی تھی۔" جہاں گیر نے کانا پھوسی کے انداز میں کہا۔

"میں آگیا ہوں نیساں اور تم رو رہی ہو۔"

"بابر بھائی!" اُس سے کچھ اور نہیں کہا جا سکا۔

"نیساں! میں نے بھی تمھیں بہت یاد کیا تھا۔" وہ اور ہچکیاں بھرنے لگی۔ اُس نے اپنا چہرہ میرے بازو میں چھپا لیا۔ میں نے اُس کے ریشمیں بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "کیا یہاں۔ یہاں تمھارا... تمھیں کوئی...؟" اُس نے فوراً میرا بازو چھوڑ دیا اور روتے ہوئے سر ہلانے لگی۔

"پھر کیا بات ہے؟"

وہ کچھ نہیں بولی۔ اندر سے خانم کی آواز آئی۔ وہ نیساں کو پکار رہی تھی۔ میں اُسے ساتھ لے کے کمرے میں داخل ہوگیا لیکن اندر جاتے ہی میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ خانم اور زرّیں کے درمیان زہرہ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ تینوں ایک ساتھ کھڑی ہوگئیں۔ ایک ہی رات میں زہرہ بالکل مختلف نظر آرہی تھی۔ اُس نے زرّیں جیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ کپڑوں کی تراش خراش بھی زرّیں کی وضع کی تھی، سفید کُرتا، تنگ موری کا سفید پاجامہ اور سفید دوپٹا۔ کانوں کے آویزے بھی سفید تھے۔ ضرور زرّیں نے اُسے اپنا کوئی جوڑا دیا ہوگا۔ تینوں کو دیکھ کے ایسا لگتا تھا جیسے ایک زمانے سے ساتھ رہ رہی ہوں یا تلے اوپر کی بہنیں ہوں میرے آنے پر تینوں نے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو رازدارانہ انداز میں دیکھا۔ میں نے خانم کو آداب کیا ہی تھا کہ زہرہ نے جھک کے مجھے سلام کیا۔ زرّیں اُس کے پہلو میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ مجھ سے جواب نہ بن پڑا۔ "صرف تمھارا انتظار تھا۔" خانم میرے قریب آکے شگفتگی سے بولی "خوب نیند لی۔"

"آنکھ ہی نہیں کھلی آپی!" میں نے خفت سے کہا۔

"بس اب دسترخوان پر بیٹھ جاؤ۔" خانم حکمیہ لہجے میں بولی "آج سارا کھانا سلمہ اور نیساں نے پکایا ہے۔ خدا خیر کرے۔ دونوں بلّیاں صبح سے باورچی خانے میں گھسی ہوئی تھیں۔ خوشبو تو اچھی آرہی ہے؟"

"آپ دیکھیے گا آپی!" نیساں چہک کے بولی "بابر بھائی! اپنی انگلیوں کا خیال رکھیے گا۔"

"کیوں؟" مجھے ہنسی آگئی۔

"بس یوں ہی لقمہ منہ میں لیتے وقت احتیاط رکھیے گا۔"

"نمک مرچ کا یقین جو نہیں ہے۔" خانم چپکے سے بولی۔

نیساں نے سُن لیا تھا۔ وہ خانم کو کوئی جواب دینا چاہتی تھی کہ بجھل اور منیر علی ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ میں انھی کا منتظر تھا میری نظریں منیر علی کا چہرہ ٹٹولنے لگیں۔ فوری طور پر کچھ اندازہ نہیں ہو سکا منیر علی چپ چپ سے تھے۔ اسی دوران جمو اور سلمہ بھی نہ جانے کہاں سے گھومتے ہوئے دسترخوان پر آکے بیٹھ گئے تھے۔ اچھا خاصا ہجوم ہوگیا تھا۔ بالکل گھر جیسا منظر تھا۔ گھر میں ابا جان، امّی فہمیدہ، فرخ، فرمال، فارحہ، اکبر، جہاں گیر اور میں سب اسی طرح اکٹھے بیٹھ کے کھاتے تھے۔ مجھے جولین یاد آنے لگی، وہ بھی یہاں ہوتی تو کیا حرج تھا۔ جہاں اتنے لوگ تھے وہاں دو تین افراد کے اضافے سے کیا فرق پڑ جاتا۔ نیساں اور سلمہ نے واقعی بہت لذیذ کھانا پکایا تھا۔ منیر علی کو جب معلوم ہوا تو اُن سے چپ نہیں رہا گیا۔ کھانے کے بعد انھوں نے سلمہ اور نیساں کو اپنے پاس بلا کے اُن کی پیشانیاں چوم لیں یقیناً وہ پُرسکون تھے۔ اُن کے ماتھے پر کوئی شکن نہیں تھی بلکہ اُن کی آنکھوں میں ایک قسم کی چمک تھی۔ جہاں گیر نے سلفچی میں اُن کے ہاتھ دھلائے۔ انھوں نے اُسے گلے سے لگا لیا اور بہت سی دعائیں دیں۔

میں نے نیساں اور جہاں گیر سے کہا کہ دھوپ کم ہوتے ہی بازار چلیں گے۔ تیار رہنا۔ سہ پہر ہوتے ہی وہ میرے کمرے میں آگئے۔ چوکی دار نے تانگا منگوا دیا تھا۔ میں نے سلمہ اور جمو کو بھی ساتھ لے لیا۔ تانگا فیض آباد کے مختلف بازاروں میں گھومتا رہا۔ میں نے بجھل سے بہت سے روپے لے لیے تھے۔ رات کو ہم چراغ جلنے کے بعد گھر واپس پہنچے۔ میری جیب میں چند ہی روپے بچے تھے۔ جو کچھ وہ کہتے رہے میں انھیں دلاتا رہا۔ اُن سب کے جوتے، کپڑے، چوڑیاں، انگریزی بسکٹ، چاکلیٹ، کھیل کا سامان، ٹینس کا نیٹ وغیرہ۔ خانم کے لیے ساڑی، زرّیں اور زہرہ کے لیے سوٹ کا کپڑا بھی میں نے الگ بندھوا لیا تھا۔ دل سے ایک بوجھ اُتر گیا تھا۔ گھر میں جا کے وہ سب کو اپنی چیزیں دکھا رہے تھے۔ اُن کی باتیں سُن کے اور انھیں دیکھ کے میرے جسم میں سنسناہٹ ہونے لگی تھی۔

جمرو نے ڈاکٹر کے متعلق بالکل سچ کہا تھا۔ ارشد کی طبیعت چند ہی خوراکوں سے غیر معمولی طور پر سنبھل گئی تھی۔ زخم کا ورم بھی ختم ہوگیا۔ تیسرے دن صبح وہ باغ میں آنے کے قابل ہوگیا۔ اُسی دن بجھل نے جمرو سے کہہ کے ایک موٹر منگالی تھی۔ ساتھ ہی اُس نے زرّیں کی وسیع جائداد اور زمینوں کی نگرانی اور حساب کتاب کرنے والے منشی کو بھی بلا لیا تھا۔ وہ جمرو اور منشی کے ہمراہ منیر علی کو زمینیں دکھانے لے گیا۔ مغرب کے وقت وہ لوگ تھکے ماندے گھر واپس ہوئے۔ بجھل نے میرے سامنے منشی سے کہہ دیا تھا کہ اب تمام جائداد اور زمینوں کی دیکھ بھال منیر علی کیا کریں گے۔ منیر علی نے اُس وقت تو کچھ نہیں کہا لیکن جیسے ہی منشی گیا، انھوں نے عاجزی سے انکار کر دیا کہ وہ نہ تو یہ وسیع جاگیر سنبھالنے کی اہلیت اپنے اندر پاتے ہیں نہ مناسب سمجھتے ہیں اور نہ اُن کے ذہن میں جیسلمیر کی اپنی زمین کے کسی معاوضے کا تصور ہے، انھیں یقین ہے کہ اُن کی عدم موجودگی میں شاہد صاحب اپنا فرض نبھائیں گے۔ وہ یہاں سے یا کسی اور شہر سے مختار نامہ لکھ کے انھیں بھیج سکتے ہیں تاکہ شاہد صاحب کو معاملات نمٹانے میں دشواری نہ ہو۔

"بڑے صاحب!" بجھل نے نرمی سے کہا "اُس کو بھول جاؤ، نہ شاہد صاحب کو خط لکھو۔ اگر وہ سب باقی رہتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اُسے جانے دو۔ ہم معاوضے کی بات نہیں کرتے، نہ بدل میں زمین کا کوئی ٹکڑا آپ کو دے رہے ہیں۔ آپ بھی معاوضے کا خیال دل سے نکال دو۔ ہم اِدھر آپ کو اپنے بڑے کے موافق لائے ہیں۔ آپ زرّیں کو اپنی بیٹی سمجھ کے اس جائداد کی نگرانی کرو۔ آپ اپنے گھر میں ہو۔ ہم کو معلوم تھا کہ آپ یہی جواب دو گے۔ جب تک آپ میری بات نہیں مانو گے ہم سمجھیں گے آپ کے دل میں ہماری طرف سے کوئی بال ہے۔"

"نہیں نہیں۔" منیر علی جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولے "یہ خیال مت کیجیے میرے دل میں ذرا بھی بدگمانی ہوتی تو میں یہاں نہ آتا۔ اگر یہ آپ کا حکم ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں مگر میری بھی ایک درخواست ہے۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا، میں کروں گا مگر ایک بیٹی کی ملکیت سمجھ کے۔"

"جیسا آپ بولتے ہو ٹھیک ہے پر کارندہ مت سمجھنا بڑے صاحب اور نہ یہ سمجھنا کسی کو جواب دینا ہے۔ ابھی آپ کچھ نقدی زیور لائے ہو، زمین پہ بیج ڈال دو، اور چاہو تو بن چکی بھی چلا دو، آپ جیسا سمجھو کرو۔ ابھی نہیں، میں آپ

کو کچھ دن بعد ساری بات بول دوں گا کہ آپ کا اُدھر سے نکلنا کیوں ضروری تھا۔ میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔"

منیر علی چونک کے اُسے گھورنے لگے: "وہ کیا بات ہے۔ آپ ابھی کیوں نہیں بتا دیتے؟" وہ وحشت سے بولے۔

"ابھی مت پوچھو بڑے صاحب! ویسے وہ آپ کی بات نہیں ہے۔ اپنی ہی کچھ صفائی کرنا ہے۔ آپ کام کرو۔ کام کرنے کی ادھر آپ کو ضرورت نہیں ہے۔ آپ یہاں آرام سے بیٹھ کے کھا سکتے ہو۔ پر آدمی کام چھوڑ کے بیٹھ جاتا ہے تو سمجھو اُس کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ کام کے بغیر آدمی بیمار جیسا ہے۔ ہاتھ پیر چلاتے رہو تو ہاتھ پیر بھی ساتھ دیتے ہیں ورنہ سالے پڑے پڑے سڑ جاتے ہیں۔ ابھی مجھ کو کلکتے کے ایک سیٹھ کی بات یاد آتی ہے۔ اپنی اُس سے تھوڑی بہت یاری تھی۔ زندگی بھر بھاگتا رہا، جوان رہا، سونا چاندی عزت خوب بنائی۔ لڑکے لوگ بڑے ہوئے تو باپ سے بولے کہ اب تم چھٹی کرو، گھر بیٹھ کے نوکروں پہ حکم چلاؤ، ہم موجود ہیں تو تم کو کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سیٹھ مستی میں آگیا۔ گھر آکے بیٹھ گیا۔ دھندا تو لڑکوں نے سنبھال لیا پر اُدھر سیٹھ آدھا ہو گیا۔ پہلے سر بھاری بھاری رہنے لگا پھر سالا پورا جسم۔ ایک کے بعد ایک شکایت۔ بیماری بھی گِدھ کی طرح ہوتی ہے۔ آدمی چلتا پھرتا ہے تو پرے رہتی ہے۔ دو ڈھائی سال میں سیٹھ کا کام تمام ہو گیا۔ میں اُدھر گیا تو لڑکے لوگ باپ کی میت پر رو رہے تھے۔ اب میں اُن سے کیا بولتا کہ خود ہی مارنے ہو، خود ہی روتے ہو۔ یوں جانا سب کو ہے۔ کام کر کے بھی آدمی سالا رکھا تھوڑی رہ جاتا ہے، پر ہاتھ پیر چلتے رہیں تو وقت کچھ بڑھ جاتا ہے اور پھر کچھ موت کا مزہ بھی آتا ہے۔"

"آپ درست کہہ رہے ہیں۔" منیر علی کسی قدر جوش سے بولے۔

"پتہ نہیں بڑے صاحب! کیا درست ہے کیا نادرست۔ پر جو دیکھا ہے، وہ آپ کو بول رہا ہوں۔ ویسے آپ نے مجھ سے زیادہ دیکھا ہے۔"

"صرف دیکھنے سے کیا ہوتا ہے، سمجھنا بھی کوئی چیز ہے۔"

"جب سمجھنے کا وقت آیا تو سرا اپنے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا، پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔" بجھل نے بوجھل آواز میں کہا۔

چند ہی دنوں میں ارشد بالکل تن درست ہو گیا تھا۔ پٹی بندھی ہوئی تھی لیکن زخم تیزی سے سوکھ رہے تھے۔ اُدھر منیر علی نے اپنے بڑے بیٹے تنویر علی کو خط کے ذریعے فیض آباد منتقل ہونے کی اطلاع دے دی تھی اور لکھ دیا تھا کہ فی الحال اُن کا ارادہ مستقل یہیں رہنے کا ہے۔ تنویر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ منیر علی نے اُسے تاکید کر دی تھی کہ وہ کسی رشتے دار یا دوست کے خط کے جواب میں اپنے باپ کے موجودہ پتے سے لاعلمی ظاہر کرے۔ اُنھوں نے فیض آباد آنے کی وجہ سے اُسے بے خبر رکھا تھا اور لکھا تھا کہ یونی ورسٹی دو چار دن کے لیے بند ہو تو وہ فیض آباد آجائے، علی گڑھ سے فیض آباد قریب ہے۔

بجھل کے ایما پر منیر علی نے تمام جائداد کے کاغذات اور نقشوں وغیرہ کی جانچ پڑتال شروع کر دی تھی اور اُنھیں پہلی بار یہ علم ہوا تھا کہ زرّیں کی یہ ساری جاگیر میرے نام سے ہے۔ اُن کے لیے یہ بات بہت عجیب تھی۔ بجھل سے اُنھوں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا تو وہ ہنسنے لگا اور بولا: "میں آپ کو بولنا ہی بھول گیا تھا۔ یہ بھی بِٹیا کا مذاق ہے بڑے صاحب! پر یہ اُس کے نام سے ہو یا اِس کے نام سے۔ یہ اور وہ دو نہیں۔ جو چلتا ہے چلنے دو۔ اِن دونوں نے دُنیا کو ہم سے کچھ زیادہ ہی جانا ہے۔ سارے بکھیڑوں سے دُور ہیں۔"

ہماری عدم موجودگی میں بھی جمرو کا معمول تھا کہ وہ روز صبح آکے زرّیں کی خیریت دریافت کرتا تھا۔ اب وہ صبح و شام اپنا بیشتر وقت یہیں گزارتا تھا۔ اُس کے ساتھ فیض آباد کے اڈّے کے بہت سے آدمی بھی ہوتے۔ جس جس کو اطلاع مل رہی تھی، بجھل سے ملنے آ رہا تھا۔ لکھنؤ سے کپتن خاں بھی خبر سُن کے آ گیا تھا۔ رات کو بھی اُنھی لوگوں کی بھیڑ ہوتی۔ اندر سے حقّہ تازہ ہو ہو کے آتا رہتا۔ وقفے وقفے سے گلوریاں اور ہر گھنٹے دو گھنٹے بعد چائے آجاتی۔ ایک ہفتے تک بجھل گھر سے باہر نہیں نکلا۔ جب یہ لوگ نہ ہوتے تو منیر علی اور بجھل نہ جانے کیا باتیں کرتے رہتے۔ پھر اُن کے درمیان اڈّے کے لوگ آجاتے تو منیر علی کچھ ہی دیر بعد اُٹھ کے اندر چلے جاتے۔ آنے والا ہر آدمی اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ ضرور لاتا۔ گھر میں مٹھائیوں اور پھلوں کا انبار لگ گیا تھا۔ آموں کا موسم تھا۔ ٹوکرے کے ٹوکرے یوں ہی پڑے رہتے۔ بجھل اُنھیں ہزار بار منع کرتا لیکن وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کے قسم قسم کے آموں کے ٹوکرے لاتے رہے۔ بجھل کو میری طرح پھلوں میں آم اور امرود بہت مرغوب تھے۔ امرودوں کی تو اُسے ایسی پہچان تھی کہ جس امرود پہ انگلی رکھ دیتا، اُس میں واقعی جیسے شہد بھرا ہوتا۔

منیر علی کے خط لکھنے کے چوتھے دن شام کے وقت اچانک اُن کا بڑا لڑکا تنویر علی حویلی میں آگیا۔ وہ بہت پریشان تھا مگر چند ہی گھنٹوں میں اپنے بہن بھائیوں سے مل کے اُس کی اضطراری حالت اعتدال پہ آگئی۔ تنویر علی میں اپنے باپ کی تمام خصوصیات موجود تھیں۔ وجاہت میں وہ اپنے بہن بھائیوں سے کم نہیں تھا۔ اُس کی آنکھیں بڑی اور روشن تھیں۔ ماتھا چوڑا لیکن جسم ارشد کے مانند اکہرا تھا۔ شیروانی پہنے ہوئے وہ بہت جامہ زیب لگتا۔ قد اوسط تھا لیکن شیروانی میں کچھ نکلتا ہوا محسوس ہوتا۔ خانم اور زرّیں نے اُس سے پردہ نہیں کیا۔ زہرہ اُن سے کتنی ہی مرتبہ اُس کا ذکر کر چکی ہوگی۔ منیر علی مجھ سے اُس کا تعارف کراتے ہوئے یہ بتانا نہیں بھولے تھے کہ میں نے ایم اے کیا ہے۔ وہ مجھ سے بہت گرم جوشی سے ملا۔ ارشد کے چہرے پر بھی اُس کے آنے سے کچھ اور بحالی آگئی تھی۔ تنویر تیسرے ہی دن واپس چلا گیا۔ جاتے وقت وہ کہہ گیا تھا کہ موسمِ سرما کی تعطیلات گزارنے یہیں آجائے گا۔

دس بارہ روز تک گھر میں اڈّے کے لوگوں کی آمد و رفت، ارشد کی علالت، نیساں، جہاں گیر، سلمیٰ اور رجّو کے ساتھ باتوں میں اور پھر تنویر کے آجانے سے دن گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا مگر تنویر کے جانے کے بعد جیسے ہر چیز اپنی جگہ ٹھہر تی گئی۔ ارشد نے باہر نکلنا شروع کر دیا تھا اور سنبھلا سنبھلا رہنے لگا تھا۔ یقیناً جگہ بدلنے سے اُس پر خاصا اثر پڑا تھا۔ نیساں، جہاں گیر، سلمیٰ اور رجّو چاروں کے لیے مولوی صاحب اور ماسٹر صاحب پڑھانے آنے لگے تھے۔ وہ پڑھائی میں مصروف ہو جاتے تو میں گھر سے نکل جاتا۔ کبھی جمرو کے اڈّے کی طرف چلا جاتا، کبھی بازاروں میں گھومتا رہتا۔ ایک دن صبح میں حویلی سے باہر نکلا ہی تھا کہ ارشد بھی میرے پیچھے پیچھے آگیا۔ اُس نے میرے ساتھ چلنے کی خواہش کی۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ پھر عموماً ہم دونوں ساتھ ہی جانے لگے۔ وہ بہت کم بات کرتا، نہ کبھی اپنی کسی رائے کا اظہار کرتا، نہ اُسے گھر واپس پہنچنے کی جلدی ہوتی، جہاں جہاں میں جاتا، وہ میرے ساتھ چلتا رہتا۔ کئی مرتبہ میرے دل میں آیا کہ اُس سے کوڑا کا ذکر چھیڑوں لیکن پھر اچھا نہیں لگا۔ اُس نے خود کوئی ذکر نہیں کیا تو میرے لیے بھی مناسب نہیں تھا۔ راستے میں جگہ جگہ ہمیں اڈّے کے لوگ ٹکرا جاتے تھے۔ وہ ہم دونوں کو قریب کے کسی ہوٹل میں لے جاتے یا تانگے میں سیر کراتے۔ ارشد اُن کی باتیں بہت تجسّس سے سُنتا تھا۔ اُس سے کچھ چھپانا بے کار تھا۔ اُسے یہیں رہنا تھا تو جلد یا بدیر سب کچھ معلوم ہو ہی جانا تھا، سو ایک دو بار میں اُسے جمرو کے اڈّے بھی لے گیا۔ اڈّے کا ایک حصہ ورزش، چاقو، بنّوٹ، لاٹھی بازی وغیرہ کے لیے مخصوص تھا۔ میں اس طرف گیا تو لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور مجھ سے بھی چاقو بازی کے لیے اصرار کیا۔ میں نے ارشد کی وجہ سے اُنھیں ٹال دیا مگر ایک دن جب ہم وہاں پہنچے تو جمرو کے ایک ساتھی متّن نے مجھ پر اچانک چاقو سے حملہ کر دیا۔ ارشد چیخ اُٹھا۔ اُس نے مجھے بچانے کے لیے جھپٹ کے میرے پاس آنا چاہا۔ لوگوں نے اُسے پکڑ لیا۔ اُسی اثنا میں متّن کا پنجہ میرے ہاتھ میں تھا اور متّن تڑپ رہا تھا۔ اڈّے کے تمام آدمی قہقہے لگانے لگے۔ میں نے متّن کو چھوڑ دیا مگر پلٹ کے اُس نے دوبارہ مجھ پر وار کر دیا۔ فاصلہ زیادہ تھا، مجھے متّن کا بڑھتا ہوا چاقو والا ہاتھ درمیان ہی میں اُوپر اُٹھانے کا موقع مل گیا تھا۔ اِس داؤ میں ضروری ہے کہ اپنا اُوپر اُٹھا ہوا ہاتھ سلاخ کی طرح اکڑا لینا چاہیے۔ غیر اختیاری طور پر مقابل اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے کوشش کرے گا جب کہ اُسے اس کوشش کے بجائے دوسرے کُھلے ہوئے ہاتھ سے کام لینا چاہیے یا جسم کو جھٹکا دے کے پوری طاقت سے پیچھے ہو جانا چاہیے مگر یہ اُسی صورت میں ممکن ہے جب داؤ کا جواب توقع کے مطابق ہو، خلاف نہ ہو۔ میں نے توقع کے خلاف متّن کا ہاتھ درمیان میں پکڑ کے اُوپر اُٹھا دیا تھا۔ نتیجتاً اُسے گڑبڑانا لازم تھا۔ اُس نے اپنا چاقو والا ہاتھ آزاد کرانے کی کوشش کی۔ میں نے اس وقفے میں اُس کے منہ اور ناک پر ہاتھ رکھ کے اُس کی سانس بند کر دی۔ متّن دو ایک گھونسے اور لاتیں مجھے مار سکتا تھا۔ اُس نے میرے جبڑے پر گھونسا مارا، پھر وہ ایک دو لاتیں ہی مار سکا۔ اُس کی سانس گُھٹ گئی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ اُس کے منہ سے نہیں ہٹایا، چنانچہ اُس نے چاقو چھوڑ دیا اور میں نے فوراً اُس کا منہ... بعد میں ارشد کو معلوم ہوا تو وہ بہت حیران ہوا کہ متّن نے محض تفریح کے لیے مجھ پر وار کیا تھا، اس یقین کے ساتھ کہ میں اُس سے بچ جاؤں گا۔ متّن میرے پیر پکڑ کے مجھ سے اپنی غلطیاں پوچھنے لگا۔

روز روز بازاروں میں پھرنے اور سڑکوں کا چکر لگاتے لگاتے میرا جی اُکتانے لگا۔ میں نے گھر سے نکلنا ہی کم کر دیا۔ ارشد دن چڑھتے وقت مجھ سے چلنے کے لیے کہتا تو میں اُس سے معذرت کر لیتا اور لائبریری میں آکے بیٹھ جاتا۔ خانم نے لائبریری بھی از سرِ نو ترتیب دی تھی۔ پہلے بھی کئی مرتبہ میں یہاں آکے بیٹھا تھا لیکن میں نے کبھی غور سے ان کتابوں کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پہلے وہ الماریوں میں اس سلیقے سے سجی ہوئی نہیں تھیں۔ زرّیں کے خالو نے حویلی پہ قبضے کے بعد بہت سی کتابیں بکسوں میں بند کرا دی تھیں۔ خانم ہی نے آدمی کو بُلا کے اُن کی جزبندی کرائی تھی۔ ترتیب کا کام شہر کی پبلک لائبریری کے لائبریرین نے انجام دیا تھا۔ وقت گزارنے کے لیے میں نے چند کتابیں باہر نکال لیں۔ رفتہ رفتہ مجھے اندازہ ہوا کہ زرّیں کے باپ کوئی عالم شخص تھے۔ اُن کے پاس مختلف موضوعات کی کتب کا ایک بڑا ذخیرہ تھا۔ انگریزی کتابیں بھی خاصی بڑی تعداد میں تھیں۔ جیل کے بعد مجھے کبھی توجہ سے پڑھنے کا وقت نہیں ملا تھا۔ ملا تھا تو جی نہیں لگتا تھا۔ بمبئی میں کرشنا جی کی کتابوں کے صفحے اُلٹ پلٹ کے میں الماری میں واپس رکھ دیتا تھا۔ مدراس میں کرشنا جی کی بڑی لائبریری اُن کے سامان کے ساتھ فروخت کر دی گئی تھی۔ میرے لیے یہ مشغلہ نیا تھا۔ شروع شروع میں مجھے اکتاہٹ ہوئی مگر یہاں بہت سکون تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو اِن کا عادی بنانے کی پوری کوشش کی۔ پھر کتابیں میری آنکھوں کی جیسے عادی ہو گئیں۔ مجھے بہت سی نئی نئی، عجیب عجیب سی باتیں معلوم ہوئیں۔

منیر علی آنے والے دنوں میں بے حد مصروف رہے۔ ہر دوسرے تیسرے روز وہ زمینوں پہ چلے جاتے، کبھی شام کو لوٹ آتے، کبھی رات وہیں بسر کرتے اور دوسرے دن شام کو واپس آتے۔ ارشد بجھل کے پاس زیادہ بیٹھنے لگا تھا۔ بجھل کا بھی یہ تھا کہ جب تنہا ہوتا، ارشد کو پکارتا ہوا اندر آجاتا یا اُسے مردانے میں اپنے پاس بُلا لیتا۔ جب بجھل جمرو کے اڈّے پہ جاتا تو اکثر ارشد کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا۔ جہاں گیر اور ارشد کی عمروں میں بہت فرق تھا مگر جہاں گیر اُس سے ٹینس کھیلنے کے لیے اصرار کرتا تو وہ منع نہ کرتا۔ میں نے اس دوران میں بہت سی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ دن کا بیشتر وقت میں لائبریری میں گزارتا۔ وہاں بہت کم لوگ آتے تھے۔ کوئی آتا تو دروازے سے دیکھ کے چلا جاتا کہ میں وہاں موجود ہوں یا نہیں یا دوپہر اور رات کے کھانے پہ نیساں اور جہاں گیر میں سے کوئی بُلانے آجاتا۔

ایک روز میں لائبریری میں آکے بیٹھا ہی تھا کہ زرّیں زہرہ کے ساتھ وہاں آگئی اور آتے ہی کہنے لگی: "ایک بات کہنی ہے۔"

میں نے کتاب بند کر دی اور تعجب سے پوچھا: "کیا بات ہے؟"

وہ دونوں میرے سامنے کی کرسیوں پہ بیٹھ گئیں۔ زرّیں جھجکتے ہوئے بولی۔

"زہرہ کا ارادہ ہے کہ یہ فارم بھر دیں اور اسی سال امتحان دے دیں۔"

میں کیا کہتا۔ میں نے کہا "بہت اچھا ہے۔"

"لیکن... لیکن کورس بڑا ہے۔" زریں سنجیدگی سے بولی "کیا یہ ممکن ہوگا کہ ایک سال میں یہ ساری تیاری مکمل کرلیں؟"

میں نے مسکرا کے جواب دیا "یہ تو اس پہ منحصر ہے کہ کورس کیا ہے اور آپ یہ کتنی جلدی گرفت میں لیتی ہیں۔" میں استعداد کہنا چاہتا تھا لیکن میرے منہ سے نہیں نکلا۔

زریں میری بات سمجھ گئی اور زہرہ کی جانب چمکتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی "زہرہ ماشاءاللہ بہت پڑھی لکھی ہیں لیکن کورس میں حساب وغیرہ بھی تو شامل ہے۔ میرا خیال ہے پہلے ان کا ایک امتحان لے لیا جائے؟"

"بہت اچھا خیال ہے۔"

"سنا ہے فارم جانے کا وقت قریب ہے۔"

"مجھے معلوم نہیں۔" میں نے تذبذب سے کہا۔

"جہانگیر کے ماسٹر صاحب بتا رہے تھے۔"

"انھی سے صحیح معلوم ہوگا اور وہی ان کا امتحان بھی لیں گے۔"

"مگر کچھ مدد آپ بھی کرنی ہوگی۔" زریں فیصلہ کن لہجے میں بولی "کبھی وقت نکال کے زہرہ کو پڑھا دیا کریں۔"

"میں!... زریں! میں تو... میں نے کبھی کسی کو نہیں پڑھایا۔ میں تو جیسے سب بھول گیا ہوں۔" میں نے بے چینی سے کہا "اتنی مدد تو تم بھی کرسکتی ہو۔"

"میں تو کروں گی ہی گھر میں سبھی کریں گے، ارشد بھائی سے بھی میں نے وعدہ لے لیا ہے۔ تنویر صاحب آئیں گے تو ان سے بھی کہا جائے گا۔ زہرہ کو پڑھنے لکھنے سے بہت دلچسپی ہے۔"

"جو کچھ مجھ سے ہوسکے گا، میں بھی کروں گا۔"

"بس یہی کہنا تھا۔ زہرہ! تم خود کیوں نہیں کہتیں؟"

زہرہ کا چہرہ سرخ ہوگیا "میں کیا کہوں۔" وہ شرماتے ہوئے بولی۔

"تم بھی تو کہہ سکتی ہو کیا تمھاری بات بابر نہیں سنیں گے؟"

"جی!—" زہرہ نے اپنا چہرہ سینے میں چھپا لیا۔

لیکن زہرہ نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنے ناخن سے ہاتھوں پر بنے ہوئے مہندی کے ستارے کھرچتی رہی۔ زریں اٹھی تو وہ بھی ہڑبڑا کے کھڑی ہوگئی۔ میں نے سوچا بھی کہ کچھ دیر کے لیے انھیں روک لوں لیکن وہ دروازے سے باہر نکل گئیں۔ میں ارادہ ہی کرتا رہ گیا۔

دوسرے دن رات کو میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ دروازہ کھلا ہی ہوا تھا۔ زریں ہوتی تو میں اس کی آہٹ فوراً پہچان لیتا۔ وہ روز رات کو دودھ کا گلاس میز پر رکھ جاتی تھی لیکن اس رات بہت دیر ہوگئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ میری آنکھوں پر ایک لمحے کے لیے دھند سی چھا گئی۔ وہ غرارہ پہنے ہوئے تھی، سر پہ آسمانی دوپٹا تھا۔ وہ زہرہ ہی تھی۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے وہ اندر کمرے میں آگئی اور گلاس میز پر رکھ کے واپس جانے لگی "زریں کہاں ہیں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" زہرہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"کیا ہوگیا؟ کھانے کے وقت تو وہ بالکل ٹھیک تھیں؟"

"کھانے کے بعد ہی شاید طبیعت کچھ بگڑ گئی۔" زہرہ کی آواز میں لرزش تھی۔

"کچھ زیادہ خراب تو نہیں؟"

"نہیں، کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں۔ کہہ رہی تھیں، سر میں درد ہے اور دل گھبرا رہا ہے۔" زہرہ ٹھہر ٹھہر کے بولی۔

"کوئی دوا وغیرہ دی؟"

"میں نے سر کی مالش کردی ہے اور گلاب کا عرق پلا دیا ہے۔ اب پہلے سے بہتر ہیں۔ یہ دودھ رکھا ہے۔" وہ واپس مڑتے ہوئے بولی۔

"زہرہ۔!" وہ دروازے پر پہنچ گئی تھی میری آواز سن کے رک گئی۔ مجھے خود پر حیرت ہوئی کہ میں نے اسے کیوں آواز دی ہے۔ اس نے مڑ کے ایک نظر مجھے دیکھا اور سر جھکائے ہوئے دروازے ہی پہ کھڑی رہی۔ "کچھ دیر کے لیے ٹھہر جائیے۔" میں نے عاجزی سے کہا "آپ کو جلدی تو نہیں ہے؟"

اسے سر ہلانے میں دیر لگی۔

"مجھے آپ سے ایک بات پوچھنا ہے۔ اندر آکے بیٹھ جائیے۔"

اس کے سارے بدن میں ایک لہر سی اٹھی مگر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کرسی پر سمٹ کے کسی بت کی طرح بیٹھ گئی۔

"آپ کو یاد ہوگا۔" میں نے اپنا حلق تر کرتے ہوئے کہا "وہاں گھر میں، میں نے آپ سے کچھ کہا تھا۔ کیا آپ کو یاد ہے؟"

وہ تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ جسم کا سارا خون چہرے پر جم گیا تھا، سینہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے یک بارگی سر اٹھا کے پھر جھکا لیا۔

"یاد ہے نا؟" میں نے لرزیدہ آواز میں پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"سنا ہے آپ کا مولوی صاحب کے گھر ہر وقت کا آنا جانا تھا۔ وہ بظاہر تو دو گھر تھے لیکن تھے ایک ہی۔ مولوی صاحب آپ کو اپنی بیٹی ہی سمجھتے تھے اور آپ نرجس کی سہیلی تھیں۔"

اس کی پلکیں تھرتھرانے لگیں "جی!" اس نے زیر لب کہا۔

"بڑے صاحب سے ان کے بارے میں کچھ معلوم ہوا ہے مگر آپ ممکن ہے ان سے زیادہ جانتی ہوں۔ میں آپ سے منت کرتا ہوں آپ مجھے کچھ بتا دیجیے۔"

"میں کیا بتاؤں؟" وہ سراسیمگی سے بولی۔

"جو کچھ بھی آپ جانتی ہوں۔ مثلاً آپ کے لیے یہ بات حیرت انگیز ہو

مولوی صاحب ایک طرح تمام دنیا سے قطع تعلق کرکے گوشہ نشین کیوں ئے تھے، وہ پہلے کہاں تھے اور وہاں کیوں آگئے تھے؟"

"وہ مجھ سے بہت کم بات کرتے تھے۔"

"لیکن نرجس تو آپ سے ہر وقت باتیں کرتی ہوگی۔ اس نے آپ سے کچھ کہا ہوگا۔ آپ اس کی رازدار سہیلی تھیں۔ ممکن ہے اس نے آپ کو نسم دلادی ہو یا آپ اپنے اور اس کے درمیان ہونے والی باتیں دہرانا ب سمجھتی ہوں یا آپ کو کوئی اور جھجک ہو۔ یہ قسم توڑ دیجیے۔ آپ کو اسی کی میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ یہ سب میرے سینے میں دفن ہوجائے گا۔ کسی جھجک کے بغیر سب کچھ بتا دیں۔ مجھ پر بھروسا کریں۔ یقیناً آپ کو یہ نہیں لگتا ہوگا مگر یہ اس لیے ضروری ہے کہ شاید نرجس کی بھلائی کا کوئی پہلو ئے اور آپ کی کسی بات سے اس کی تلاش میں مدد مل سکے۔ کوئی ایسی جو آپ ابا جان کو بھی نہ بتا سکی ہوں؟"

"میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔"

"یہ آپ کا احسان ہوگا۔"

"آپ یہ مت کہیے۔" وہ اداسی سے بولی۔

"میں آپ کو ہر طرح سے یقین دلانا چاہتا ہوں۔"

"آپ مجھے آپ آپ کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"اوہ بس یوں ہی۔" میں نے خفت سے کہا "یہ میری غلطی ہے۔"

"مجھے بہت ندامت ہوتی ہے۔"

"میں اب نہیں کہوں گا۔"

زہرہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور ہونٹوں پر کپکپی سی طاری ی میری سانس رکنے لگی "بڑے ابا (مولوی صاحب) سے میری کوئی بات یں ہوتی تھی۔ بس سلام دعا۔ مجھے دیکھ کے کبھی وہ میری خیریت پوچھ لیتے اور بھی کسی کھانے کی فرمائش کردیتے۔ میرے ہاتھ کے شامی کباب انھیں بہت پسند تھے۔" زہرہ کی آواز بھرانے لگی۔

"اور نرجس!—" میں نے جلدی سے کہا۔

"نرجس تقریباً ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتی تھی۔ ہم دونوں کا دل ایک دوسرے کے بغیر نہیں لگتا تھا۔ کبھی مجھے ذرا سی دیر ہوجاتی تو وہ کھڑکی سے پوچھنے لگتی مگر اس نے... اس نے مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا۔"

"کچھ نہیں بتایا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں! وہ اپنے بارے میں کچھ نہیں بولتی تھی۔"

"تو پھر تمھاری اس سے اور کیا باتیں ہوتی تھیں؟" میں نے تند لہجے میں کہا۔

"سبھی طرح کی باتیں۔ تمام دنیا کے قصے کہانیاں۔"

"تین سال سے وہ جیسلمیر میں تھی۔ تین سال میں تم نے کبھی اس سے نہیں پوچھا کہ وہ کون ہے کہاں سے آئی ہے۔ اس کے بارے میں یہ سب جاننے کا تمھیں تجسس نہیں ہوا؟"

"شروع شروع میں میں نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ وہ اس ذکر پہ اور اداس ہوجاتی تھی بلکہ رونے لگتی تھی۔ مجھ سے اس نے کہا تھا کہ سب چھوٹ گئے۔ اب شاید کوئی نہیں۔ جو لوگ بچھڑ گئے، ان کے ذکر سے کیا حاصل۔ پھر ہمیشہ مجھے ڈر رہتا تھا کہ میں اس سے کچھ پوچھوں گی تو وہ رونے لگے گی پھر بھی کبھی کبھی میرے منہ سے نکل ہی جاتا تھا۔ ایک دن اس نے مجھ سے ہاتھ جوڑ کے کہا 'زہرہ! مجھ سے کچھ مت پوچھا کرو۔ سمجھو، مجھے کچھ یاد نہیں ہے' پھر میں نے اپنی زبان بند کرلی۔"

"لیکن محلے والے، گھر میں آنے والے دوسرے لوگ تو اس سے یہ سوال کرتے ہوں گے۔ انھیں وہ کیا جواب دیتی تھی؟"

"آنے والے طرح طرح کے سوال کرتے تھے۔ تمھاری ماں کہاں ہیں، کوئی بہن بھائی ہے یا نہیں۔ تم کہاں کی ہو۔ اس کا ایک ہی جواب ہوتا کہ میرا کوئی نہیں ہے، ماں بچپن میں مرگئی۔ بہن بھائیوں میں کوئی نہیں ہے۔ بڑے ابا نے بتایا تھا کہ ان کا تعلق کبھی مراد آباد شہر سے تھا۔ وہ بھی یہی کہتی تھی لیکن ساتھ میں یہ بھی کہ مراد آباد اسے یاد نہیں ہے اور وہ مختلف شہروں میں رہی ہے۔ مختلف شہروں کے نام ان کے سامنے لے دیتی۔ لوگ اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے اور ایک بات کے بعد دوسری بات پوچھنے لگتے۔ وہ کبھی ٹال جاتی، کبھی بات بنا دیتی۔ کوئی بہت کرید کرتا تو تنگ آکے کہتی 'مجھے کچھ نہیں معلوم' بابا سے پوچھ لو۔ مجھے احساس تھا کہ یہ ذکر اس کے لیے تکلیف دہ ہے۔ اس لیے میں بھی اپنی طرف سے ادھر ادھر کی باتیں کرکے لوگوں کو خاموش کردینے کی کوشش کرتی تھی۔ میں نے محلے میں سبھی سے کہہ رکھا تھا کہ وہ اس کی ماں بہن بھائی عزیزوں اور گھر وغیرہ کے متعلق اس سے کچھ نہ پوچھا کریں۔ اسے کوئی بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ اس ذکر سے اسے وہ پرانی باتیں یاد آنے لگتی ہیں جن کا بھول جانا ہی اس کے لیے اچھا ہے لیکن لوگوں کی زبان نہیں رکتی تھی۔ وہ اس کے سامنے کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ ہی دیا کرتے تھے۔" زہرہ سسکنے لگی۔

میں نے چند لمحے انتظار کیا۔ وہ چپ ہوگئی تھی اور دوپٹے کے پلو سے آنکھوں کے گوشے صاف کررہی تھی مگر آنسو اس کی آنکھوں میں امڈے ہی چلے آتے تھے۔ "مجھے کچھ اور بتاؤ۔" میں نے اضطراب سے کہا۔

"اور کیا بتاؤں۔" وہ شکستہ آواز میں بولی۔

"تم نے اتنے دن اس کے ساتھ رہتے رہتے اپنے طور پر بھی تو کچھ اندازہ کیا ہوگا۔ کیا اس نے تم سے کبھی بھولے سے بھی اپنے کسی عزیز رشتے دار کسی کا بھی ذکر نہیں کیا؟"

"کبھی نہیں کیا۔" وہ سسکتے ہوئے بولی "وہ ہمیشہ کھوئی کھوئی رہتی تھی، ہر وقت گم سم، کچھ نہ کچھ سوچتی ہوئی یا دیواریں گھورتی ہوئی، سب سے الگ تھلگ، خاموش۔ ذرا سے کھٹکے پر چونک جاتی اور قریب شعور میں پیار رہتا، اسے خبر نہیں ہوتی۔ میرے سوا اسے کسی سے ملنا پسند نہیں تھا لیکن جو بھی آتا تھا، وہ اس سے خوش اخلاقی سے ملتی تھی۔ جب ہمارے گھر میں بیٹھی ہوتی اور کوئی آجاتا تو فوراً اٹھ

کے اپنے گھر نہیں چلی جاتی تھی، کچھ دیر ضرور ٹھیرتی تھی۔ لوگ دُور دُور سے اُس کی خوب صورتی کا ذکر سن کے اُسے دیکھنے آتے تھے۔ میں نے اکثر اُسے تنہائی میں چپکے چپکے روتے دیکھا تھا۔ اُسے نہ لباس کا شوق تھا، نہ زیور کا۔ نہ کہیں آنے جانے کا۔ بس کچھ تھا تو پھولوں کا۔ آپ نے گھر میں جو پودے دیکھے ہوں گے، وہ سب اُسی کے لگائے ہوئے تھے۔ گھر کا کام مختصر تھا۔ دو آدمیوں کا کھانا پکانا ہی کیا، وہ یہ کام نہایت تیزی سے کرلیتی تھی۔ ابتدا میں اُسے اتنا اچھا پکانا نہیں آتا تھا مگر اُس نے مجھ سے سیکھ لیا تھا اور جلد ہی اتنا اچھا پکانے لگی تھی کہ مجھے خود حیرت ہوتی تھی۔ میں اِدھر سے کھانا لے کے چلی جاتی یا وہ اُدھر سے آجاتی۔ ہم دونوں ساتھ مل کے ہی کھاتے تھے۔ یہی حال اُس کے پڑھنے کا تھا۔ کتاب فوراً ختم کرلیتی تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے روز بڑے ابا اُسے پڑھاتے تھے۔ وہ اُس کے لیے نئی نئی کتابیں خرید کے لاتے تھے۔ وہ بولتی کم اور سُنتی زیادہ تھی۔ بڑے ابا سے بھی اُس کی رسمی سی بات تھی جب کہ وہ اُس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اُس کے لیے قسم قسم کے کپڑے لاتے مگر وہ اُنھیں بس ایک دوبار پہنتی، پھر صندوق میں رکھ دیتی، وہ تمام لڑکیوں سے الگ تھی۔ میں نے اُس کی حالت دیکھ کے ہی اندازہ لگایا تھا کہ گزری ہوئی بہت سی باتیں اُس کے ذہن پر نقش ہیں۔ تین سال کے عرصے میں بھی وہ اُنھیں نہیں بھولی۔ کوئی ایسی بات ضرور تھی جسے وہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے دھوکا ہوتا تھا، آپ مجھے معاف کردیں۔" وہ ہچکچاہٹ سے بولی۔ "جیسے بڑے ابا اُس کے اصل باپ نہیں ہیں اور وہ اُسے اُس کے تمام عزیزوں سے چُرا کے لے آئے ہیں لیکن اُس نے بڑے ابا کے متعلق کبھی کوئی بات نہیں کی۔ میں نے چھُپ کر اُن کے درمیان ہونے والی باتیں سُننے کی کوشش بھی کی مگر مجھے کچھ پتہ نہیں چلا۔ میں نے کتنی ہی بار اُس سے پوچھا تھا۔ نرجس! تم اتنی اُداس کیوں رہتی ہو۔ مجھے شبہ ہوتا ہے جیسے تم مجھ سے ناراض ہو۔ کہتی کہ میں تجھ سے کیسے ناراض ہوسکتی ہوں۔ میں اُسے سمجھاتی تھی کہ جو بچھڑ گئے یا جو چھُوٹ گیا کیا وہ واپس آسکتا ہے؟ میں نے طرح طرح اُس کا دھیان بٹانا، اُسے خوش رکھنا چاہا۔ میری بات سُن کے کبھی کبھی وہ مسکرانے لگتی۔ کہتی، زہرہ! میں شروع سے بدنصیب ہوں۔ میں چاہتی تھی کہ اُس کی زبان کھُل جائے۔ شاید اِس سے اُس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوجائے۔ ایک بار میں جان بوجھ کے اُس سے رُوٹھ گئی۔ وہ مجھے منانے آئی تو میں اور رُوٹھ گئی۔ میں نے کہا، تم مجھے غیر سمجھتی ہو، اپنی بہن نہیں سمجھتیں، مجھ سے کچھ چھپاتی ہو، تمھیں یہ بھی خیال نہیں آتا کہ تمھیں یوں دیکھ کے میرا دل بھی تو اُداس ہوجاتا ہوگا۔ تم مجھ سے کچھ کہو گی تو کیا میں اُسے اپنے پاس محفوظ نہیں رکھوں گی؟ وہ رونے لگی اور بولی، تجھے کیا بتاؤں، کوئی ایسی بات ہی نہیں ہے اور جو تو سُنے گی تو ڈر جائے گی۔ میں تجھے کھونا نہیں چاہتی۔ مجھے یہاں رہنے دے۔ وہ مجھے منانے کے لیے میری منتیں کرنے لگی اور جب میں نہیں مانی تو اپنے گھر چلی گئی۔ مجھ سے ایک لمحے بھی نہیں ٹھیرا گیا۔ وہ میرے گلے لگ کے پھوٹ پھوٹ کے روتی رہی۔ مجھے اپنے آپ پر بہت غصّہ آیا کہ میں نے اُس کا دل کیوں دکھایا، مجھے معلوم تھا کہ ذراسی بات پر اُس کے چہرے کا رنگ بدل ذراسی بات پر اُس کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔"

زہرہ کورا کا ذکر کررہی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو[...] اور رگوں میں چنگاریاں سی چٹخ رہی تھیں۔ "شاید تمھارے علم میں [...] بڑے صاحب نے مولوی صاحب سے ارشد میاں کی بات کی تھی [...] بارے میں تمھاری اُس سے کوئی بات نہیں ہوئی؟"

"ہاں ہوئی تھی۔" وہ چونک کے بولی۔ "میں نے اُس سے پو[چھا] تمھارا کیا ارادہ ہے۔ کہنے لگی، میں کبھی شادی نہیں کروں گی۔"

"تم نے اِس کا سبب نہیں پوچھا؟"

"پوچھا تھا، اُس نے کوئی خاص جواب نہیں دیا۔ کہتی تھی، کیا [...] بغیر لڑکیاں نہیں رہ سکتیں۔"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا کہ اگر بڑے ابا آمادہ ہوجائیں تو تم کیا کرو گی۔ بولی [...] نہیں ہوں گے۔ میں نے کہا، فرض کرو اگر وہ راضی ہوگئے تو انکار [...] کہنے لگی، مجھ سے پوچھے بغیر وہ ایسا نہیں کریں گے اور اگر انھوں [...] اُنھیں منع کردوں گی۔ میں نے کہا، تم اُن کے سامنے زبان کھولو گی؟ [...] ہاں اگر ضرورت پڑی تو مجھے یہی کرنا ہوگا۔ پھر میں نے کہا، نرجس [...] پڑھے لکھے ہیں۔ ہزاروں میں ایک ہیں اور اُن کی خواہش بھی یہی [...] سے ...... تم سے ...... میں نے ارشد بھائی کے متعلق اُس سے بہت [...] کہا کہ اس طرح تم میرے قریب ہی رہو گی، میرے گھر، میری بھابی [...] نے جواب دیا، ارشد بھائی بہت اچھے آدمی ہیں مگر مجھے شادی نہیں کر[نی] کے بولی اور پھر تو بھی تو یہاں نہیں رہے گی، کہیں چلی جائے گی تو کیا [...] خود چلی گئی۔" زہرہ کی آواز پھٹنے لگی۔

میں نے اپنے آپ کو بہت روک کے رکھا تھا۔ زہرہ رو رہی تھ[ی] اُس کے سامنے رو بھی نہیں سکتا تھا۔ اچھا ہوا اُس نے نظریں اُٹھ[ا کے میری] طرف نہیں دیکھا، میرا سینہ کٹ رہا تھا۔ پھر مجھ میں اُس سے کچھ او[ر پوچھنے کی] ہمت نہیں پڑی اور زہرہ کو شاید کچھ اور معلوم بھی نہیں تھا۔ در[اصل مجھے] کئی بار شبہ ہوا تھا کہ زہرہ مجھے کچھ بتانے سے گریز کررہی ہے لیکن و[ہ چھپانے] کی کوشش کرتی تو صاف پتہ چل جاتا۔ وہ تو بُری طرح سسکیاں [لے رہی تھی۔] میں اپنے بستر سے اُٹھ کے اُس کی کرسی تک پہنچ گیا۔ میرے جی [میں آیا] کہ اُسے اُٹھا کے اپنے سینے میں بھینچ لوں اور کہوں کہ تم اتنا کیوں ر[و رہی ہو، میری] طرف دیکھو، میرے ہاتھ اُٹھتے اُٹھتے رہ گئے، میری زبان سے بھی [دلاسا] دینے کے لیے ایک لفظ نہیں پھوٹا اور میں اُسے کیا دلاسا دیتا، بستر [پر لوٹ] گیا اور اُس کی صورت دیکھتا رہا، وہ بھی وہیں بیٹھی رہی۔ نہ جانے ک[ب] خانم اُسے ڈھونڈتی ہوئی اِدھر آنکلی۔ اُسے دیکھ کے زہرہ گھبرا سی گئی [...] نہیں تھا۔ خانم سیدھی اندر چلی آئی۔ "اے تم یہاں ہو؟" وہ ہانپتے ہوئے [...]

زہرہ کے جواب دینے سے پہلے میں نے آہستگی سے کہا۔ "آپی! میں نے [...]رک لیا تھا۔ مجھے کچھ معلوم کرنا تھا۔"

"میں پریشان ہوگئی تھی۔ زرّیں کے کمرے میں دیکھا تو یہ وہاں بھی [...]نہیں۔ اتفاق سے سلمہ کی آنکھ کھُل گئی۔ میں بیچ کا دروازہ اسی لیے کھُلا [...]ہوں کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں سامنے موجود رہوں۔ سلمہ بھاگی بھاگی [میر]ے ہی پاس آئی کہ باجی کمرے میں نہیں ہیں۔ میں نے کہا، تم ٹھیرو، [د]یکھ کے آتی ہوں۔ زرّیں کے پاس ہی ہوں گی۔ ٹھیک ہے، اب مجھے [...]ہوگیا۔"

"بیٹھیے آپی!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"میں بھی چلتی ہوں۔" زہرہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"تم چاہو تو بیٹھو۔" خانم کے چہرے پر شگفتگی بکھر گئی۔ "سلمہ کو میرا انتظار ہوگا۔"

"بس باتیں نکل آئیں آپی اور خیال ہی نہیں رہا۔"

"باتوں کا تو یہی ہوتا ہے۔" خانم مسکرا کے بولی۔ اُس نے زہرہ کو اپنے بازو [میں س]میٹ لیا۔ "زہرہ بہت پیاری ہے۔ پیاری پیاری باتیں کرتی ہے۔"

زہرہ یکایک خانم کے سینے پر سر رکھ کے بلکنے لگی۔

"اے! یہ کیا؟" خانم نے بے قرار نظروں سے میری جانب دیکھا۔ "کیا [...] نے کچھ کہہ دیا ہے بابر میاں؟"

"نہیں آپی! میں نے کچھ نہیں کہا، اِن کے گھر کی بات ہورہی تھی۔"

"اوہ زہرہ! تم تو بہت صبر کی لڑکی ہو۔ یہ بچّوں کی طرح آنکھیں کیوں [بھ]ر لیں؟" خانم اُس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے شفقت کے لہجے میں بولی۔ "آؤ، [میر]ے ساتھ چلو۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوکے اجازت لینے لگی۔ "بابر! میں اسے [...]لیے جارہی ہوں۔"

میں نے کچھ نہیں کہا، میری آواز حلق میں اٹک گئی تھی۔

خانم جاتے جاتے دروازہ بھیڑ گئی تھی۔ روشنی گُل کرکے میں نے مسہری پر [...]کوشش کی لیکن ایک پَل کے لیے نیند نہیں آئی۔ کمرے میں ہرسُو اندھیرا [پھ]یلا ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری آنکھوں میں روشنی نہیں رہی ہے اور [...]کی دیواریں مجھ پر گرنے والی ہیں۔ میں نے کمرہ دوبارہ روشن کرنے کے لیے [...]نے کا ارادہ کیا مگر میرا سارا جسم لوتھڑا سا بن گیا تھا۔ ساری رات زہرہ کی باتیں [میر]ے کانوں میں گونجتی رہیں۔

زہرہ نے کوئی نئی بات نہیں بتائی تھی۔ وہی کچھ بتایا تھا جو میں نے [...]یا تھا، جو میں پہلے سے جانتا تھا۔ منیر علی کے ملنے سے بھی پہلے، جلیسر [...]نے سے بھی پہلے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کہیں بھی چلی جائے، سات سمندر پار سہی، [...] صدیاں بیت جائیں مگر وہ کورا ہی رہے گی اور میں اُس کے ساتھ رہوں [...]ہر تل اور زہرہ نے صرف میرے یقین کی تصدیق کی تھی۔ اُس کے بارے [...] مجھے اتنا یقین نہ ہوتا تو آٹھ پہر بھی نہ گزرتے، آٹھ سال تو بہت ہوتے

ہیں۔ وہ سب میرے لیے نیا نہیں تھا مگر اُس نے میرے جسم کی ساری طاقت کھینچ لی تھی۔ زہرہ کی ایک ایک بات میرے سینے میں چبھ رہی تھی۔ وہ شاید مجھ پر ماتم کرنے آئی تھی۔ وہ کورا کے لیے رو رہی تھی مگر اُس کا رونا در اصل میرے لیے تھا کہ میں کس اطمینان سے یہاں بیٹھا ہوں۔ وہ مجھے طعنہ دینے آئی تھی اور اصل میں وہ کورا ہی تھی جو اپنی سہیلی زہرہ کی شکل، اُس کی زبان میں اپنا حال بیان کرنے آئی تھی۔

ساری رات مجھ پر سکتہ سا طاری رہا۔ صبح نیساں ناشتے کے لیے بلانے آئی تو مجھ سے چلا نہیں گیا۔ میں صحن تک جا کے لوٹ آیا۔ نیساں میرا ناشتہ کمرے ہی میں لے آئی۔ نیساں کے اصرار پر میں نے چند لقمے زہر مار کرلیے اور اُس کے جاتے ہی حویلی سے نکل گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ جا کے سب کو بتائے گی اور پھر سب مجھے پوچھنے آئیں گے۔ مجھے اپنے آپ سے گھن آرہی تھی۔ ڈیڑھ مہینہ یہاں آئے ہوئے ہوگیا تھا۔ میں حجرے کے اڈّے پر تماش بینی کرتا اور لائبریری میں بیٹھا قصّے کہانیاں پڑھتا رہا تھا۔ جیسے مجھے کوئی اور کام نہیں تھا۔ سب کچھ نمٹ چکا تھا بلکہ مجھے راستوں کے پھیلاؤ اور اپنے سمٹاؤ کا شدت سے احساس ہوگیا تھا۔ میری آنکھیں ایک فاصلے ہی تک دیکھ سکتی تھیں اور راستے حدِ نظر کے پار تک جاتے تھے۔ میرے پاؤں ایک وقت میں ایک ہی گلی میں دوڑ سکتے تھے۔ کیا یہ وہی احساس تھا کہ اب مجھے باہر نکلتے ہوئے خوف آتا تھا۔ میں اِس گلی سے جاؤں گا تو وہ کہیں اُس گلی سے نہ نکل جائے۔ میں سامنے کی طرف دیکھتا رہ جاؤں اور وہ پُشت ہی سے راستہ نہ بدل دے۔ اسی میں وقت گزر جائے گا اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ پھر ایک وقت ایسا آئے گا کہ راستے سجھائی دینا مشکل ہوجائے گا مگر ایسا نہیں تھا۔ اگر وہ کسی لمحے نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی تو میں اپنے آپ سے اوجھل ہوگیا ہوں گا۔

میرا خیال تھا کہ یہاں آنے کے کچھ دنوں بعد بچّھل خود مجھ سے کہے گا۔ اُس کا چند دنوں تک یہاں ٹھیرے رہنا ضروری تھا اسی لیے میں نے اُس پہ زور نہیں دیا لیکن بچّھل یہاں آکے مردانے میں بیٹھا حقّہ گڑگڑا رہا تھا اور اُسے کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ گھر سے تو میں خود بھی کسی وقت نکل جاتا۔ فوراً نہیں تو پندرہ دن بعد، ایک مہینے بعد سہی مجھے اتنے دن نہیں لگتے۔ اتنے دن صرف بچّھل کے انتظار میں لگے کیونکہ وہ راستے مجھ سے زیادہ پہچانتا تھا۔ وہ نہ ہوتا تو میں شاید کورا کے گھر تک نہ پہنچ پاتا۔ میں تو اُسی وقت چلنے کو کہہ رہا تھا جب منیر علی نے یہ کہہ کے بات ختم کردی تھی کہ مولوی صاحب سات مہینے پہلے اچانک ایک رات غائب ہوگئے۔ بچّھل نے وہیں ٹھیرنے پر اصرار کیا یہاں تک کہ منیر علی کی زبان پر رانا مہتاب کا نام آگیا۔ بچّھل کو اپنے ساتھ لے جانے کی وجہ سے مجھے بھی خاموش رہنا پڑا۔ اتنے عرصے کی دَوڑ دھوپ کے بعد اب راستوں پر پہلے سے نشان لگانا ٹھیک معلوم ہوتا تھا اور یہ کام بچّھل مجھ سے بہتر جانتا تھا اور اُس کی آنکھوں میں میری طرح بار بار اندھیرا نہیں چھا جاتا تھا۔ یہ جھجک تھی تو وقت کو یوں

گنوا دینے کے اندیشے کے سبب سے تھی۔ یہ انجام کا خوف نہیں تھا بلکہ وقت کو صحیح طور پر صرف کرنے کا خیال تھا۔ اس کے بعد چاہے کچھ ہو، وقت گزر جائے اور کچھ نہ ملے۔ نہ ملے لیکن پھر وقت اکارت کر دینے کا پچھتاوا تو نہیں رہے گا۔ میرا وقت اُسی کا وقت اور میرا انجام اُسی کا انجام تھا۔ اپنے لیے نہیں تو مجھے اُس کے لیے پھونک پھونک کے قدم اُٹھانا چاہیے تھا۔

مجھے کم از کم اتنا تو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ کسی چھت کے نیچے بلاؤں سے دُور رہی ہے اور یہاں تک بھی کہ مولوی صاحب اُسے رانا مہتاب کے پنجے سے بچالے جانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ وہ اُس کے ساتھ ہی تھے اور انھیں پھر اُسے دُنیا کی نظروں سے چھپانے کے لیے کوئی چھت کوئی دیوار میسر آ گئی ہوگی مگر اُسے میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اُس کے اِرد گرد تو اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا۔ مولوی صاحب نے اُس سے ایک ہی بات کہی ہوگی کہ میں جیل سے فرار ہو گیا ہوں اور کبھی نہ کبھی ضرور مل جاؤں گا۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں، میں بھی اُسے ڈھونڈ رہا ہوں گا۔ وہ اُسے یہ اُمید دلائے بغیر زندہ نہیں رکھ سکتے تھے لیکن مولوی صاحب کب تک اُسے یہ دلاسا دیتے رہیں گے اور میری تلاش اس لیے نہیں کریں گے کہ اب میرا سایہ بھی اُس پہ نہیں پڑنا چاہیے۔ پھر مولوی صاحب اُس پہ ظلم کر رہے تھے ورنہ مجھے تلاش کرنا اُن کے لیے کوئی ایسا مشکل نہیں تھا۔ جیل میں انھیں آسانی سے معلوم ہو جاتا کہ میں کہاں مل سکتا ہوں۔ اڈّے کے آدمی ہمیشہ وہاں موجود رہتے تھے مگر اُنھوں نے ایسا نہیں کیا۔

سڑکوں پہ جگہ جگہ جمرو کے ساتھی مل جاتے تھے۔ حویلی کے عقب سے کھیتوں کھیتوں گزرتا ہوا میں شہر سے دُور نکل آیا اور سارا دن ایک باغ میں پڑا رہا۔ باغ کا چوکی دار ایک مہربان آدمی تھا۔ اُس نے مجھے بُرا بھلا نہیں کہا بلکہ اپنی کھاٹ میرے لیے چھوڑ دی۔ وہاں بہت سکون تھا لیکن میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ شام ہو گئی اور ہر طرف سناٹا چھا گیا تو حویلی میں واپس جانے کے بجائے میں نے وہیں سے اسٹیشن جانے کا ارادہ کیا لیکن پھر یہ سوچ کے میں حویلی ہی کی جانب مُڑ گیا کہ اگر اُس نے اور دیر کی تو میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ اُس نے جیل و حجّت کی تو پھر میں خود کہیں کسی طرف نکل جاؤں گا۔ میں نے جیسلمیر میں اُس سے وعدہ کیا تھا کہ اُسے مطلع کیے بغیر کہیں نہیں جاؤں گا۔ اُس سے کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ شاید وہ اسی انتظار میں ہو اور اُس نے سمجھا ہو کہ میں خود کہیں جانا نہیں چاہتا، لائبریری میں بھری ہوئی کتابوں میں میرا جی لگ گیا ہے، نیساں کے ہاتھ کے کھانے میرے منہ کو لگ گئے ہیں، مجھے نہیں چھیڑنا چاہیے۔

حویلی تک پہنچتے پہنچتے رات گہری ہو گئی تھی۔ چوکی دار نے دروازے ہی پر مجھے بتا دیا تھا کہ ہنجل کئی بار مجھے پوچھ چکا ہے۔ میں مردانے میں پہنچا تو جمرو کے اڈّے کے بہت سے آدمی وہاں موجود تھے۔ کبّن خاں اور جمرو ہنجل کے ساتھ چوکی پہ دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تھے۔ اڈّے کا ایک آدمی مُرلیا چائے کی پیالیاں تقسیم کر رہا تھا۔ مرلیا مُرلی بجانے میں ماہر تھا اس کا نام مرلیا پڑ گیا تھا۔ مردانے میں شور گونجا ہوا تھا۔ وہ سب اِ[illegible] تھے کہ انھیں میرے اندر داخل ہونے کی خبر نہیں ہوئی۔ میں چپکے سے کونے میں دیوار سے لگ کے بیٹھ گیا۔ کبّن خاں اور جمرو میں کسی ع[illegible] بابت جھگڑا ہو رہا تھا۔ مجھے یہ سُن کے حیرت ہوئی کہ موتین ماہ پہلا سے روشن نامی ایک طوائف کو بھگا کے لے آیا ہے اور اس نے [illegible] میں اُسے ایک علیحدہ گھر لے کے دیا ہے جہاں وہ ہر دوسرے تیسرے جاتا اور گھر کا سارا خرچہ اپنی جیب سے اُٹھاتا ہے۔ کبّن خاں ہنجل [illegible] کر رہا تھا کہ اُس لڑکی کو لکھنؤ واپس کر دیا جائے کیونکہ اُس کا تعلق [illegible] کے علاقے سے نہیں ہے اور علاقے کے تمام لوگوں کو پتہ چل گیا روشن کو کون لے گیا ہے، وہ ابھی تک انھیں روکے ہوئے ہے لیکن [illegible] واپس نہیں گئی تو وہ اُس کے علاقے سے لڑکیاں اُٹھانے کی کوشش [illegible] اور خون خرابہ ہو جائے گا۔ ہنجل اُن دونوں کی باتیں سر ہلائے بغیر تو سُن رہا تھا۔ حقّے کی نے اُس کے منہ میں دبی ہوئی تھی۔ درمیان میں [illegible] زور سے بول اُٹھتے تھے جن میں سے کچھ جمرو کی ہم نوائی کر رہے [illegible] کبّن خاں کی۔ کچھ خاموش بیٹھے ہنجل کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ وہ [illegible] ہو جاتے تو ہنجل انھیں جھڑک دیتا۔ چائے تقسیم کرتے ہوئے مرلیا [illegible] آیا تو ایک دم چِلّا اُٹھا: "استاد! لاڈلے بابو تو اُدھر بیٹھے ہیں۔"

مردانے میں ایک لحظے کے لیے سکوت ہو گیا۔ سب کی نگاہ[illegible] مرکوز ہو گئی تھیں۔ "لاڈلے!" ہنجل چونک سا گیا، اُونچی آواز میں [illegible] "آیا رے؟ اُدھر کیوں بیٹھا ہے؟" دوسرے ہی لمحے کبّن خاں لپکتا پاس آ گیا اور مجھے اُٹھا کے چوکی پر لے گیا۔ "کدھر اُڑ گیا تھا؟" ہنجل نے تنک کے پوچھا۔

"یہیں تھا۔" میں نے تلخی سے جواب دیا۔

اُس نے جھٹکے سے میری ٹھوڑی پکڑ کے ایک نظر مجھے [illegible] اور کبّن خاں کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔ کبّن خاں کے پہلے جیسا زور نہیں رہا تھا۔ وہ دبے لہجے میں اپنی بات دُہرا رہا [illegible] چاہے تو وہ اُس کے لیے ایک سے ایک حسین لڑکی فراہم کر سکتا [illegible] کو وہ لڑکی واپس کر دینی چاہیے پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اُس [illegible] سودا کر کے اُسے دوبارہ جمرو کے حوالے کر دے۔ جمرو نے جواب میں [illegible] ہی تھی کہ ہنجل نے ہاتھ اُٹھا کے انھیں خاموش کر دیا۔ "کل دیکھیں[illegible]" نے ترشی سے کہا۔ اُن لوگوں نے گفتگو کا موضوع تو بدل دیا مگر اُٹھے نہیں۔ وہ ہنجل کو اڈّے لے جانے آئے تھے۔ کبّن خاں [illegible] خاص ہنجل کو سنوانے کے لیے ایک طوائف بُلوائی تھی اور آج رات [illegible] ناچ گانے کی محفل جمنے والی تھی۔ وہ ہنجل کو دفعتے دفعتے سے لوک [illegible] کر وقت زیادہ ہو گیا ہے۔ ہنجل کا شاید پہلے سے جانے کا ارادہ ہو[illegible]

[illegible] آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ اُن کے ساتھ گیا یا نہیں۔ [illegible] وہاں سے اُٹھ کے چلا آیا۔ ہنجل نے مجھے روکا بھی نہیں تھا۔

دالان اور صحن میں روشنی ہو رہی تھی۔ زنان خانے کے تمام کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ کونے کے پہلے کمرے میں جہاں گیر میز پہ جھکا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا۔ اُس کے برابر ہی دوسری میز پہ ارشد بیٹھا تھا۔ میں خانم کے کمرے کے سامنے سے گزرا تو نیساں کے تیز تیز بولنے کی آواز آئی۔ غالباً وہ بھی وہاں موجود تھے۔ میں نے سوچا، زرّیں کی خیریت معلوم کر لوں مگر میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں آ کے لیٹ گیا۔ اس موقع پر ہنجل سے کچھ کہنا ٹھیک نہیں تھا اور ویسے بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اتنے دنوں میں ہنجل کے چہرے پر بحالی آ گئی تھی۔ یہاں بہت سے لوگ موجود تھے۔ حویلی کے علاوہ جمرو کے اڈّے کے آدمی بھی۔ کبّن خاں بھی کبھی کبھی لکھنؤ سے آ جاتا تھا۔ زرّیں ہر وقت اُس کا خیال رکھتی تھی۔ نیساں اُس کا سر دبانے کا بہانہ کر کے اُس کے پاس آ جاتی تھی۔ وہ جہاں گیر سے پنجہ لڑاتا تھا اور جب جہاں گیر اُس کا پنجہ موڑ دیتا تھا تو وہ خوب قہقہے لگاتا تھا۔ ارشد جب دیکھو اُسی کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ میرے ساتھ کیا تھا۔ ایک بستی سے دوسری بستی، ایک شہر سے دوسرے شہر، بھوکے پیاسے رہنا، رات کو تھک کے کسی سرائے یا ہوٹل میں پڑ جانا۔ دوسرے دن پھر لوگوں سے فقیروں کی طرح سوال کرنا۔ اجنبی جگہوں پر لوگ ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے۔ کوئی کچھ سمجھتا تھا کوئی کچھ۔ ہنجل کو یہ سب بھگتنے کی کیا ضرورت تھی۔ میری وجہ سے! لیکن جب وہ میرا خیال رکھتا تھا تو مجھے بھی اُس کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔

میں نے بستر سے اُٹھ کے دروازہ بند کر دیا اور کمرے کی تلاشی لی۔ مجھے وہاں اپنے مطلب کا کوئی تھیلا نہیں ملا۔ میں نے ایک چادر میں اپنے چند جوڑی کپڑے لپیٹ لیے۔ چیک بک اور بینک کے سارے کاغذات لیے کے لفافے میں بند کر کے میں نے الماری میں ڈال دیے تھے۔ انھیں نکال کے میں نے صدری کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔ نقد رقم میں میرے پاس چند ہی روپے تھے جو اُس روز بازار سے خریداری کے بعد بچ گئے تھے۔ یہ رقم بہت کم تھی مگر گھر کے کسی شخص سے مانگنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اسی پر قناعت کی۔ کرشنا جی کے روپے خرچ کرنے کے سوا کوئی صورت نہیں تھی۔ وہ انھوں نے بہرحال میرے ہی لیے چھوڑے تھے تاہم میں نے انھیں اپنے ذہن میں قرض سمجھا۔ کرشنا جی ہوتے اور میں اُن سے مانگتا تو وہ میری جیب میں بہت سے روپے ٹھونس دیتے۔ جو روپے میرے پاس تھے اُن سے میں پانچ سو میل دُور جا سکتا تھا۔ وہاں کسی بینک میں چیک داخل کرنے کے بعد تین چار دن انتظار کرنا پڑتا۔ پھر روپوں کی کمی نہ ہوتی۔ ہنجل کے ساتھ سفر کرنے سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ سفر میں پیسے وافر ہونا کس قدر ضروری ہے۔ اس سے میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ جگہوں پہ جا سکتا تھا۔

چادر کی گٹھری مسہری کے نیچے ڈال کے میں نے دروازہ کھول دیا۔ کوئی بھی مجھے دیکھنے آ سکتا تھا۔ زرّیں کے آنے کا امکان سب سے زیادہ تھا لیکن وہ نہیں آئی۔ شاید اُس کی طبیعت ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ خاصی دیر بعد خانم کی آواز سُنائی دی۔ اُس نے مجھ سے کھانے کے لیے پوچھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ وہ آ کے میرے سرہانے بیٹھ گئی اور جب تک اُس نے میری کلائی اور پیشانی چھو کے اطمینان نہیں کر لیا، وہاں سے نہیں اُٹھی۔ اُس نے دُودھ کا گلاس میز پہ رکھ دیا تھا اور چلتے چلتے مجھے ہدایت کر گئی تھی کہ میں اسے پی کر ہی سوؤں۔ صبح تک میں جاگتا رہا اور اس درمیان میں میں نے گٹھری کھول کے کپڑے دوبارہ بکس میں رکھ دیے۔ گٹھری ساتھ لے جانے سے چوکی دار کو شبہ ہو جاتا۔

جس وقت میں اسٹیشن پہ پہنچا، اُجالا نہیں ہوا تھا۔ کھڑکی پر پوچھنے سے معلوم ہوا کہ پہلی گاڑی سات بجے کے قریب لکھنؤ کی طرف جائے گی۔ سات بجنے میں ابھی بہت دیر تھی۔ فیض آباد سے لکھنؤ کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ مجھے اپنی سمت کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ پہلی گاڑی لکھنؤ جا رہی تھی اس لیے میں نے وہیں کا ٹکٹ خرید لیا۔ فیض آباد سے میں جتنی دُور ہو جاتا، اتنا ہی اچھا تھا۔ ہنجل کے ساتھ جنوبی اور وسطی ہند کے بہت سے علاقے میں نے دیکھ لیے تھے لیکن مراد آباد سے دُور دراز کے علاقوں میں ابھی بہت سی جگہیں باقی رہ گئی تھیں۔ رات کو میں نے سوچا تھا کہ امرتسر سے اُوپر پہاڑوں کی طرف نکل جاؤں گا مگر اسٹیشن پر آتے ہی مجھے اختلاج ہونے لگا تھا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ ہنجل کا چہرہ بار بار نظروں میں گھوم جاتا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے جہاں گیر، نیساں، خانم، زرّیں، زہرہ وغیرہ حویلی کے سارے لوگ کہیں چھپے ہوئے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ گاڑی آئی اور چلی گئی۔ میں بنچ پر بیٹھا مسافروں کو اُترتے چڑھتے دیکھتا رہا۔

جب میں نے حویلی میں قدم رکھا تو دھوپ خوب نکل آئی تھی۔ ہنجل مردانے میں ارشد کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ "لاڈلے!" میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اُس نے بھاری آواز میں کہا۔ "کہیں چلنے کا ارادہ نہیں ہے؟"

"کہاں؟" میں نے تعجّب سے پوچھا۔

"کیا اِدھر ہی بیٹھا رہے گا رے؟"

"بیٹھے تو تم ہو۔" میری آواز جھرجھرانے لگی۔

"بٹیا سے میں نے بول دیا ہے۔"

"کیا بول دیا ہے؟"

"چلنے کا۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کے بولا۔

"مگر کہاں؟ کہاں جاؤ گے؟" میں نے بوکھلا کے پوچھا۔

"پہلے کلکتے دو چار روز کے لیے چلیں گے۔"

"پھر!"

"پھر کہیں اور نکل جائیں گے رے۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔

مجھے یقین نہیں آیا، بتھل نے مجھے یقین دلانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ ارشد کے ساتھ زنان خانے میں چلا گیا۔ جمرو کے اڈے کے لوگ جب آنا شروع ہوئے تو اُن کی زبانی پتہ چلا کہ بتھل آج ہی رات کلکتے جا رہا ہے۔ صرف ایک دن درمیان میں تھا۔ میں پھر اندر نہیں گیا۔ دن بھر مردانے ہی میں رہا لیکن جاتے وقت وہ سب لوگ سامنے تھے۔ سب کی آنکھیں لبریز تھیں۔ میں بتھل سے پہلے حویلی سے باہر آ گیا۔ جہاں گیر، ارشد اور منیر علی اسٹیشن تک ہمیں چھوڑنے آئے۔ جمرو کے اڈے کے تمام آدمی وہاں موجود تھے۔ کبن خاں اور متن ڈبے سے نہیں اُترے۔ گاڑی چلی تو مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ وہ دونوں بھی ہمارے ساتھ کلکتے جا رہے ہیں۔

دوسرے دن دوپہر کو گاڑی ہاوڑا اسٹیشن پر ٹھہری تو ایک ہجوم نے ہمارا ڈبا گھیر لیا۔ جامو، کانتے، نصیب میاں، شولی، لالہ وغیرہ لیکن اُن کے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ تھے۔ اُنھیں دیکھ کے میری آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ وہاں پیرو، ماچھی، زورا، چھیدا اور ماسٹر مارٹی بھی تھے۔ مارٹی لوگوں کے اُوپر سے کودتا ہوا آ کے میرے گلے سے لپٹ گیا۔ ٹڈے نے زور سے میری ٹانگیں جکڑ لیں۔

"مارٹی!" میں نے اُسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا "تم یہاں کیسے آ گئے؟"

"اپن کو ادھر استاد کا میسج ملا، اُودر ٹکٹ کٹایا، پر پھر بھی سالا دیری ہو گیا۔"

"استاد کا میسج!" میری آواز سنسنانے لگی۔

"تم کو نئیں معلوم راجا!" وہ حیرانی سے بولا "اُودر بتھل دادا نے پیرو دادا کو میسج بھیجا تھا کہ ایک دم کلکتہ پہنچو۔"

"بتھل بھائی نے بھیجا تھا؟"

"ہاں، اُسی نے، اُس نے لکھا تھا کہ سب اگلا پچھلا گناہ معاف کرا کے آنا۔ ادھر تین چار مہینہ لگ سکتا ہے۔ اپن کو اُودر پاڑوں کے ایڈجسٹ منٹ میں دیری ہوا۔ دھندا بہت پھیل گیا ہے کنگ...."

میں نے چبھتی نظروں سے بتھل کو دیکھا، وہ پیرو کا سینہ ٹھونکتے ہوئے کہہ رہا تھا "واوا! دم تازی کر کے آئے ہو؟ ابھی اُوپر دُور پہاڑوں پر چلنا ہے۔"

"نرکھ میں چلو بتھل بھائی!" پیرو دہاڑتے ہوئے بولا۔

بتھل کی بات پر میرے کان کھڑے ہوئے۔ پیرو دادا سے وہ کیا کہہ رہا ہے؟ دُور پہاڑوں پر چلنے سے اُس کی کیا مراد ہے؟ لیکن اتنے میں کانتے نے مارٹی سے مجھے چھین لیا اور اتنی زور سے بھینچا کہ میری سانس رُکنے لگی "لاڈلے! کدھر کھو گیا تھا جانی!" وہ میری گردن اور دونوں گال چومتے ہوئے کہنے لگا "کانتے کو بھول گیا!"

"نہیں کانتے!" میں نے اُسے دبوچتے ہوئے کہا۔

"رفو ڈاکیے سے پوچھتا تھا، اپنے جانی کا کوئی خط پتر آیا؟"

"فرصت ہی نہیں ملی کانتے!"

"فرصت کی مت بول، بول دھیان ہی نہیں آیا۔"

"نہیں کانتے!" میری آواز بھرّا گئی۔

"اب کیسا ہے تو؟"

"میں ٹھیک ہوں۔"

"کیا ٹھیک ہے، پہلے سے جان آدھی کر کے آیا ہے۔"

جامو نے مجھے جواب دینے کا موقع نہیں دیا، اُس نے کا[نتے] کو گردن سے پکڑ کے مجھ سے جُدا کر دیا اور میرے گلے سے لگ گیا۔ [ٹڈا] میری ٹانگوں سے چپکا ہوا تھا۔ اسٹیشن پر کلکتے کے اڈوں کے بہت لوگ موجود تھے۔ ڈبے کے سامنے اُن کی ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی اور [اُنھوں] نے پلیٹ فارم پر مسافروں کا راستہ روک رکھا تھا۔ جامو ابھی مجھ سے [مل] ہی رہا تھا کہ زورا اور چھیدا نے مجھے اپنے بازوؤں میں چھپا [لیا۔ کئی] برس نہیں گزرے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُنھوں نے مجھے [کئی] برسوں بعد دیکھا ہو۔ ماچھی، شولی، سارٹے، لالہ، نصیب میاں، کاکا، وہ کبھی بتھل کے پاس جاتے، کبھی میرے پاس آتے۔ متن اور کبن خاں [کو] اُنھوں نے گھیر لیا تھا۔ اُن کی چیخیں اور نعرے سُن کے بہت سے مسافر اطراف اکٹھے ہو گئے تھے۔ جب پیرو میری طرف بڑھا تو سب نے اُس کے لیے جگہ چھوڑ دی "لاڈلا! لاڈلا!" اُس نے دہاڑتے ہوئے مجھے [کمر] سے پکڑ کے اُوپر اُٹھا لیا اور ناچنے لگا "استاد! استاد! بتھل بھائی!" وہ [بتھل] کو مخاطب کر کے بولا "لاڈلا اپن کا ہے۔"

"تمھارا ہے پیرو دادا! تمھارا ہے۔" بتھل نے ہنستے ہوئے جواب [دیا۔]

"ابھی اپن ادھر سے اس کو پارسل کر کے لے جائیں گا۔"

وہ سب قہقہے لگانے لگے۔ جیسے ہی پیرو نے مجھے اُوپر اُچھا[ل کر] اپنے بازو چھوڑے، میں جھپٹ کے نصیب میاں کے پاس پہنچا۔ وہ نزدیک آنے کی دیر سے کوشش کر رہا تھا۔ نصیب میاں سفید شیروا[نی میں] ملبوس تھے، سر پہ دوپلی ٹوپی تھی، رنگ کھلا ہوا تھا لیکن عمر میں پہلے [سے] زیادہ کے معلوم ہوتے تھے "نصیب میاں!" میں نے اُسے سینے سے [لگا لیا۔]

"بالم! اتنی دیر لگا دی۔" وہ اُداسی سے بولا۔

"ہاں! کچھ دیر ہی ہو گئی۔"

"دل کو کسی ٹھکانے پہ لگا دو نوشہ!"

"نصیب میاں!" میں نے اُس کی گردن میں منہ چھپا لیا۔

"بدنصیب سچ کہتا ہے۔" وہ مجھے گدگداتے ہوئے بولا "[ج]تم نے تل نہیں لگایا ایں؟"

"کیسا تل نصیب میاں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"بھول گئے! سجنا! کہا تھا کالا تل لگا کے پردے سے نکلا [کرو۔ ہو]نہیں خاک لیکن بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ نظر کا وار چاقو کے وار [سے] زیادہ تیز ہوتا ہے۔" مجھے شرم سی آ گئی۔ "ہائے سبحان اللہ۔ رخساروں پر [و]ہی چمک ہے۔" اُس نے اُچک کے میری ٹھوڑی چوم لی۔

بتھل کو قریب دیکھتے ہی نصیب میاں اُس کے گلے سے لگ [گئے] "ایسا اندھیر کہیں ہوتا ہے۔" وہ روہانسی آواز میں بولا "ہمارے [لی]ے بس دیواریں چھوڑ گئے تھے۔"

بتھل نے اپنا ہار اُس کی گردن میں ڈال دیا اور اُسے زور سے [جک]ڑ لیا۔

گاڑی آئے ہوئے نہ جانے کتنی دیر ہو گئی تھی۔ پلیٹ فارم [مس]افروں سے خالی ہو گیا تھا۔ بتھل نصیب میاں کو لے کے آگے بڑھ گیا [س]ب اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ گیٹ پر ٹی ٹی ہاتھ بڑھا کے رہ [گ]ئے۔ باہر بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں جن میں زیادہ تر ٹیکسیاں تھیں اُنھوں نے شاید مسافروں کو بٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اسٹیشن سے اڈا دُور تھا۔ سڑکوں پر آگے پیچھے گاڑیوں کی ایک قطار لگ گئی تھی۔ ایک ایک گاڑی میں چھ سات آدمی ٹھنسے ہوئے تھے۔ ٹڈا میری گود میں آ کے دبک گیا تھا۔ [ایک] طرف مارٹی، دوسری طرف کانتے میرے شانوں سے چپکے ہوئے تھے۔ [اڈ]ے کی گلی کے نکڑ پر بہت سی گاڑیاں رُک گئیں۔ صرف چند ہی اڈے کی [عم]ارت کے سامنے آ کے ٹھہریں، اُن میں بتھل، پیرو اور جامو تھے۔

گلی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہی دکانیں، وہی مکانات [او]ر چہرے۔ دکانوں میں رونق پہلے سے کچھ زیادہ نظر آتی تھی۔ اڈے کی [عم]ارت کا روغن بھی "تازہ تازہ" تھا۔ بتھل کو گاڑی سے اُترتے دیکھ کے [گ]لی کے کئی آدمی اُس کی طرف دوڑ پڑے اور دیکھتے دیکھتے گلی میں شور [م]چ گیا۔ بتھل ہر ایک کا نام لے کے اُس کی خیریت پوچھتا رہا۔ اُن میں عورتیں [ب]ھی تھیں، بچے بھی۔ گلی کے ایک بوڑھے پستہ قد آدمی نے آ کے پیچھے سے بتھل کا کُرتا پکڑ لیا اور کہنے لگا "بلو کا دم تمھارے کارن اٹکا ہوا ہے۔"

"کیوں بلو دادا!" بتھل نے پلٹ کے نرمی سے پوچھا۔

"تمھارا انتظار تھا، تمھاری پریا نے ہاتھ پاؤں بہت پھیلا لیے [ہ]یں۔ بیل کی طرح بڑھتی جا رہی ہے۔" بوڑھا پھولی ہوئی سانسوں سے [بو]لا "اُسے کس کے پاس چھوڑ جاتا۔"

"ہمارا بوجھ اُٹھانے سے بھاگتے ہو؟"

"نا نا، ایسا مت بولو۔" بوڑھا بلو منہ پر ہاتھ رکھ کے ایسے خوف زدہ لہجے میں بولا جیسے بتھل نے اُسے کوئی گالی دے دی ہو "اب تو اپنے ہاتھ ہی سے آگ دکھا دو استاد!"

"پریا کیسی ہے؟"

"دیکھو گے تو پہچان نہیں پاؤ گے۔"

"پر مجھ کو گئے ہوئے اتنے دن کدھر ہوئے ہیں بلو!"

"پر میں تو ایک ایک دن گن رہا تھا۔"

بتھل نے اُس کا ناتواں جسم دونوں ہاتھوں پر اُٹھا لیا "اب تجھے چلا ہی جانا چاہیے بلو! بدن تو تُو نے پہلے ہی راکھ کر لیا ہے۔"

"میں کیا بولتا ہوں۔" بوڑھا بلو سسکنے لگا "اُس نے سارا خون چوس لیا ہے۔ مجھے اب اُسے دیکھ کے ڈر لگتا ہے۔"

"پر اُسے ڈولی میں بٹھا کے جانا۔"

"اب زیادہ ٹیم نہیں ہے، پر تم جلدی کرو گے تو...."

جامو نے بتھل کے اشارے پر بلو کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اُسی لمحے محلّے کی ایک موٹی، بھدی اور کالی عورت بھیڑ کاٹتی، ہانپتی ہوئی سب سے آگے آ گئی اور بتھل کے گلے میں گیندے کے پھولوں کا ہار ڈالنے کی کوشش کرنے لگی "استاد! سالی ایک اور کا بینڈ بجانے کی جگاڑ میں لگی ہوئی ہے۔ ڈھبرا کا پیچ کس رکھا ہے۔" کانتے نے اُس کے کولھے میں چٹکی بھری، وہ مٹکنے لگی۔

"گھر امت، تیرا نمبر بھی آئے گا پٹھولے!" عورت دیدے نچاتے ہوئے بولی۔ اڈے کے لوگ بے تحاشا ہنسنے لگے۔ دروازے پر اور لوگ بھی جمع ہو گئے تھے اور گھر گھر کے اڈے کی طرف آ رہے تھے۔ جامو پیرو کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے اُسے اندر لے آیا۔ بتھل وہیں رہ گیا۔ میں بھی مارٹی اور ٹڈے کو لے کے اندر آ گیا۔ صحن کے بعد پہلے بڑے کمرے میں فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ بتھل کا حقہ تیار تھا۔ خمیرے کی خوشبو کمرے میں مہکی ہوئی تھی۔ میں تھوڑی ہی دیر وہاں بیٹھا پھر مارٹی اور ٹڈے کو دوسرے کمرے میں لے آیا۔

"مارٹی!" میں نے تیزی سے پوچھا "استاد نے تم لوگوں کو کیسا تار دیا تھا؟"

"اپن کو سالا اتنا ہی پتہ ہے کہ استاد کا ٹیلی گرام پیرو دادا کے نام آیا تھا، پیرو دادا اپن کو بلوایا اور بولا، چلیں گا، لاڈلے راجا کے پاس چلیں گا؟ اپن بولا، سر کے بل چلیں گا۔ دادا بولا، تار میں لکھا ہے واپسی میں بریک لگ سکتا ہے، سالا بوم مارنے سے پہلے سوچ سمجھ لو۔ اپن بولا، سوچنا ہی کیا ہے دادا! راجا کے لیے سالا گردن میں بریک لگ جائے۔ اُودر پاڑوں کا کام اُلٹا پلٹی کرنے میں دیری ہو گیا۔ پھر سالا یہ ٹڈا بھی دادا کے پیروں پڑ گیا۔ دادا اس کو لے جانا نئیں مانگتا تھا۔ پر یہ اُس کا پیر نئیں چھوڑا اور پھر انکال کے اپنے کو مارنے لگا۔ قسم سے دادا ایک دم ترٹی میں آ گیا اور پھر اس کو بھی اُٹھا لیا۔ ابھی اپن کو ادھر آئے ہوئے ایک دن ہوتا پڑا ہے۔"

مارٹی کو کچھ اور معلوم نہیں تھا۔ ظاہر ہے بتھل ہر بات ٹیلی گرام میں نہیں لکھ سکتا تھا اور اگر اُس نے پیرو کو کچھ لکھا بھی ہو گا تو پیرو کو اپنے پاڑے کے کسی آدمی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں خاموش ہو گیا۔ مارٹی کا چہرہ تمتما رہا تھا جیسے اُسے اب بھی شک ہو کہ وہ دوزانو ایک

دوسرے کے سامنے بیٹھے ہیں۔" راجا ڈارلنگ! ابھی کوئی ایسا داؤ چلاؤ کہ اپن کبھی بھی تمھارے پاس سے نہیں جاسکے۔ فادر جانتا ہے کہ اُودر تمھارے جانے کے بعد ایک مومنٹ کے لیے بھی اپن کا دل نہیں لگا۔"

میں صرف سر ہلا کے رہ گیا۔ ٹمّا بھی اُس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے میرے شانے دبا رہا تھا۔ "تم نے کوئن کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا راجا؟" مجھے چُپ دیکھ کے مارٹی اضطراب سے بولا۔ وہ جولین کو شروع ہی سے کوئن کہتا تھا۔

"ٹھیک ہی ہوگی مارٹی!" میں نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں کوئن ویسے آل رائٹ ہے راجا! ایک دم پرفیکٹ۔" مارٹی بوجھل لہجے میں بولا۔ "پر سائیلنٹ رہتی ہے۔ روز ہم اُس کو سویرے اُودر دیکھنے جاتا ہے۔ کوئن اپنا بہت ریگارڈ کرتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے روز چائے پلاتی ہے اور، اور وہ . . . ."

"اور چمپا کا کیا حال ہے؟" میں نے اُس کی بات کاٹ کے پوچھا۔

"وہ اپن کی مدر کے مافق ہے۔ اُودر اپنی دو مدر ہے۔ ایک کوئن کی مدر، دوسری چمپا۔ میں اور ٹمّا ریگولرلی اُودر جاتا ہے تو وہ گھر میں اندر بُلا کے بٹھاتا ہے اور روز تمھارے لیے پوچھتا ہے۔ پر کوئن نے کبھی اپن سے ایک ورڈ نہیں بولا۔ ہم سمجھتا ہے راجا! اُس کی آنکھ اپن سے پوچھتا ہے اور اپن روز جھوٹ بول دیتا ہے کہ راجا کا خبر آیا ہے، وہ سفر میں ہے اور بالکل فِٹ فاٹ ہے۔ کوئن جانتا ہے کہ اپن جھوٹ بول رہا ہے۔ پر اپن اور کیا بولے۔"

"وہ اسکول پڑھانے جاتی ہے؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"ڈیلی۔ پر اسکول سے آ کے گھر میں بند ہو جاتی ہے، کیں اور نہیں جاتی۔ اپن نے کتنا ٹائم مدر سے بولا، کوئن کو باہر نکالو، گھر میں بیٹھے بیٹھے سالا زنگ لگ جائیں گا۔ اُودر کرسمس کا ٹائم کوئن چرچ بھی نہیں گیا۔ کرسمس نائٹ پُرا اپن اکھی رات اُس کے گھر پہ رہا۔ کوئن نے کپڑے بھی نہیں پہنا۔ اپن اُس دن پہلی بار کوئن سے ڈرتے ڈرتے بولا، کوئن! مارٹی کو بولو، وہاٹ از دی میٹر؟ مارٹی تمھارا اسلیو ہے۔ اِسمائل کر کے ایدر سے اُودر چلا گیا۔ کیسا اسمائل تھا وہ راجا! اپن سے نہ پوچھو۔ ایسا لگا کہ مارٹی کو چاقو مار کے چلا گیا ہے، مارٹی کے منہ پر تھوک کے چلا گیا ہے۔ ٹمّا بھی اپن کے ساتھ تھا۔ بول ٹمّا ماسٹر! ایسا تھا کہ نہیں؟" ٹمّا درمیان میں لقمے دیتا رہا۔

میں نے اپنے کان بند نہیں کیے۔ جو وہ کہتے رہے، سنتا رہا۔ تجمّل نے نہ جانے اُسے ممبئی میں کیوں روک دیا تھا۔ جب خانم نیساں اور منیر علی کا سارا گھر حویلی میں سما سکتا تھا تو جولین وہاں کیوں نہیں آسکتی تھی۔ حویلی میں اُن سب کو اکٹھے بیٹھا دیکھ کے کتنی ہی بار مجھے اُس کا خیال آیا تھا۔ زرّیں سے اُس کی خوب بنتی۔ زرّیں جس طرح نیساں، خانم اور زہرہ کے آنے سے خوش تھی، جولین سے مل کے بھی بہت خوش ہوتی۔ مجھے معلوم تھا کہ مارٹی اُس کے بارے میں اسی طرح کی باتیں کرے گا۔ دو مہینے پہلے جب ز[...] بیکانیر میں ملا تھا تو اُس نے اتنا کچھ نہیں بتایا تھا مگر میں جانتا تھا [...] کیسی ہوگی۔ اُس نے کرشنا جی کی وہ رقم بھی لوٹا دی تھی جو میں نے ممبئی [...] چلتے وقت اُسے دی تھی۔ مجھے سب اندازہ تھا لیکن مارٹی کی زبا[ن سے اُس] کا ذکر سُن کے میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں نے مارٹی کو کوئی جواب [...] میرے ذہن میں اس کا ایک ہی جواب آیا تھا کہ آج یا کل کسی وقت [...] ضرور خط لکھوں گا۔ اب مارٹی وہاں سے چلا آیا ہے۔ وہ سودا [...] لینے خود بازار جاتی ہوگی۔ مارٹی کے روزانہ جانے سے کم از کم اُ[سے] تنہائی محسوس نہیں ہوتی ہوگی۔ جولین کا چہرہ میری آنکھوں میں گھوم ر[ہا تھا]۔ مارٹی اور ٹمّا دیر تک اُسی کی باتیں کرتے رہے۔

کانتے مجھے پکارتا ہوا اُدھر آ گیا اور ہم تینوں کو چاندنی [...] کمرے میں لے آیا۔ وہاں سبھی بیٹھے ہوئے تھے۔ تجمّل، پیرو، ماچھ[و] اور جامو سامنے دیوار سے کمر ٹکائے ہوئے اُن کے آگے تھے۔ مٹھائی کا ایک بڑا ٹوکرا رکھا تھا اور چائے کی پیالیاں تھیں۔ شولی او[ر] ٹوکری سے دونے اُٹھا اُٹھا کے لوگوں میں تقسیم کر رہے تھے۔ پیرو کے سامنے الگ مٹھائی کا ایک ٹوکرا موجود تھا۔ کمرے میں تمام [...] بھری ہوئی تھیں اور ہر شخص اپنی اپنی بولی بول رہا تھا۔ میں نے [...] بیٹھنا چاہا لیکن پیرو نے آواز دے کے مجھے اپنے پاس بُلا لیا [...] گردن میں ہاتھ ڈال کے تجمّل کو ممبئی کا حال سُناتا رہا۔ میرا خیال تھ[ا] کے کھانے سے پہلے اُن میں سے کوئی نہیں ہلے گا لیکن مٹھائی [...] اور چائے پینے کے بعد تجمّل دفعتہً اُٹھ کھڑا ہوا اور پیرو کو لے [...] فلیٹ میں چلا گیا جہاں کبھی زرّیں ٹھیری تھی۔ اُس کا زینہ اڈّے [...] سے بھی اُوپر جاتا تھا۔ جامو بھی اُن کے ساتھ تھا۔ اُنھوں نے مجھ[...] کو نہیں کہا حالانکہ میں اُن کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ وہ ضرور کوئی خا[ص بات] کرنے فلیٹ میں گئے تھے۔ فیض آباد میں بیٹھے بیٹھے تجمّل کا اچانک [...] کا ارادہ کرنا اور پیرو کو ممبئی کے پارٹوں کے آدمیوں کے ساتھ کلک[تے ...] بے سبب نہیں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے بتانے میں کیا م[...] فیض آباد سے کلکتے کے طویل سفر کے دوران تجمّل مجھے کہیں بھ[ی ...] تھا۔ میں نے خاصی دیر اُن کے پیچھے آنے کا انتظار کیا۔ وہ نہیں [...] میں نے مارٹی اور ٹمّا کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

گلی کے نکڑ ہی پر ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ ہم تینوں اُس [میں بیٹھ] گئے۔ ٹیکسی والے نے منزل کا پتہ پوچھا تو میں نے اُس سے کہہ د[یا کہ] جہاں چاہے لے جائے۔ میری جیب میں چند روپے پڑے تھے [...] کلکتے کے بازاروں اور سڑکوں پہ گھومتی رہی۔ ٹمّا اور مارٹی اِنتہ[...] عمارتیں اور دکانیں دیکھ رہے تھے۔ جدھر دیکھو آدمی ہی آدمی [...] تھے۔ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ کلکتہ دیکھ لیں، پھر شاید فرصت کا[...]

[...]لیے بانہ ملے۔ یکایک میرا جی گھبرانے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے عمارتیں اور دکانیں گردش سی کرنے لگی ہوں۔ میں نے ٹمّے کو ایک طرف ہٹا کے باہر گھور کے دیکھا۔ ٹیکسی والا مختلف راستوں سے گزرتا ہوا اُس [...]علاقے میں آ گیا تھا جہاں مولوی صاحب کا مدرسہ تھا۔ سب کچھ وہی تھا۔ [...]گلی میں کچھ اندر جا کے مسجد اور مدرسہ تھا۔ میں نے ڈرائیور کا کندھا پکڑ کے [...]سے روک دیا مگر دیر ہوگئی اور میں نیچے نہیں اُترا تو مارٹی مجھے جھنجوڑتے [ہو]ئے پوچھنے لگا۔ "کیا بات ہے راجا استاد؟"

"کچھ نہیں مارٹی!" میں نے ہڑبڑا کے جواب دیا۔ "کچھ نہیں۔"

"تم نے ایدر ٹیکسی کو کیوں ہالٹ کر دیا؟"

"بس ایسے ہی۔"

"راجا! تمھاری آنکھ بھرا ہوا ہے۔" وہ بے تابی سے بولا۔

"کچھ نہیں مارٹی!" میں نے منہ پھیر لیا۔ "آگے چلو۔"

ٹیکسی والے نے گاڑی اسٹارٹ ہی کی تھی کہ میں نے اُسے پھر [رو]ک دیا۔ "تم ٹھیرو مارٹی! میں ابھی آتا ہوں۔" میں جلدی سے اتر گیا۔

"کیدر؟ کیدر راجا؟"

"میں ابھی آیا۔"

"اپن بھی چلیں گا۔" مارٹی بھی باہر آنے لگا۔

"نہیں، تم یہیں بیٹھو۔" میں نے اُس سے التجا کی۔

"راجا! کوئی لفڑے کا بات تو نہیں؟" اُس نے سڑک پر چاقو نکال لیا۔

"میرے پاس بھی چاقو ہے مارٹی!" میں نے تلخی سے کہا۔ مارٹی نے نظریں جھکا لیں۔ میں اُسے چند لمحوں میں واپس آنے کی تاکید کر کے بھاگتا ہوا گلی میں پہنچا اور مدرسے کا دروازہ پھلانگ کے سیدھا دفتر میں [د]اخل ہو گیا۔ سید کی ٹوپی اور کھدر کے کرتے پاجامے میں ملبوس وہاں [صر]ف ایک ادھیڑ آدمی بیٹھا تھا۔ مجھے یوں اندر آتا دیکھ کے اُس کے [م]اتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ "جناب!" میں نے اپنی سانسیں قابو میں کرتے [ہ]وئے پوچھا۔ "مولوی محمد شفیق کا کچھ پتہ چلا؟"

"مولوی محمد شفیق!" وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔ دوسرے [ہ]ی لمحے مجھے احساس ہو گیا کہ میں بے کار یہاں آ گیا ہوں۔ میں اُس کا [ج]واب سنے بغیر واپس آنے لگا۔ اُس نے سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں [مجھے رو]کا۔ "کیا تم مرادآباد والے مولوی محمد شفیق کو پوچھ رہے ہو؟"

"ہاں ہاں! اُنھی کو۔" میں نے تیزی سے جواب دیا۔

"تم اُن کے کون ہوتے ہو؟"

"میری بات کا جواب دیجیے، کیا اُن کی کوئی خیر خبر معلوم ہوئی؟"

"بیٹھو میاں!" وہ تحمل سے بولا۔ "تم شاید ایک بار پہلے بھی آئے ہو؟"

"ہوں۔" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا آپ کچھ جانتے ہیں؟"

"اللہ بہتر جانتا ہے۔"

"وہ کسی کو بھی دکھائی نہیں دیے؟"

اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"اور اُن کا سامان؟"

"جُوں کا تُوں رکھا ہے۔ گل گلا گیا ہوگا۔ میں نے مدرسے کے متولی احسان الٰہی صاحب سے کہا تھا کہ کسی غریب کو دے دیجیے، کسی کے کام ہی آ جائے گا لیکن وہ بھلے آدمی نہیں مانے۔ تم بتاؤ کہ تم اُن کے کون ہوتے ہو؟"

"میں اُن کا ایک عزیز ہوں۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"بھلا کیا رشتہ ہوتا ہے آپ کا اُن سے؟"

"کوئی بھی نہیں اور تمام رشتے۔" میں نے شکستہ لہجے میں جواب دیا۔ وہ حیران نظروں سے میری صورت دیکھنے لگا۔

"تم نے انھیں کہاں کہاں تلاش کیا؟"

"بہت سی جگہوں پر۔"

"برس گزر گئے میاں! آخر تمھیں اُن کی آتنی . . . صبر کرو۔" وہ کسمساتے ہوئے بولا۔ "اللہ کسی نہ کسی دن اُنھیں ضرور ملا دے گا۔" میں اُٹھنے لگا تو اُس نے مجھ سے چائے پینے کے لیے اصرار کیا۔ "اگر اُن کا کوئی پتہ چلے تو تمھیں کہاں اطلاع دی جائے؟"

مجھے اُس کی بات عجیب سی معلوم ہوئی۔ "میرا پتہ۔" میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں پھر کبھی آ جاؤں گا مگر . . . مگر آپ مجھے . . . ."

میں نے اُسے اپنا نام صرف بابر بتایا اور پتہ فیض آباد کا لکھوا دیا۔

"خدا کرے، کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے۔"

"کہیں . . . کہیں آپ مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہے ہیں؟" میں نے اچانک لرزیدہ آواز میں پوچھا۔

"لاحول ولا قوت۔ میاں کیسی بات کرتے ہو۔"

"مجھے معاف کر دیجیے، یوں ہی خیال آ گیا تھا۔" میں نے ندامت سے کہا اور فوراً وہاں سے اُٹھ کے باہر آ گیا۔ وہ مجھے آوازیں دیتا رہا۔ مجھے وہاں جانا اور اُس کا وقت برباد کرنا ہی نہیں چاہیے تھا لیکن مجھے کسی کے وقت کی کون سی فکر تھی۔ سبھی کا وقت ضائع ہو رہا تھا۔ تجمّل کا اور نہ جانے کتنے لوگوں کا۔ جس طرح میرے پاس وقت ہی وقت تھا، میں سمجھتا تھا، سبھی میری طرح خالی بیٹھے ہیں۔ میرے سوا دنیا میں اُنھیں اور کوئی کام نہیں ہے۔ مولوی صاحب اور اُسے جدا ہوئے نو برس سے زیادہ ہو چکے تھے۔ ہر دن ایک دن کا فاصلہ اور بڑھ جاتا تھا۔ اب تو میرا چہرہ بھی مولوی صاحب کو یاد نہیں رہا ہوگا۔ مجھے سامنے دیکھیں تو شاید پہچان بھی نہ پائیں۔ ممکن ہے وہ بھی بہت بدل گئے ہوں اور وہ مجھے بھلانا ہی چاہتے ہوں گے، میرا چہرہ اپنی نظروں سے فراموش ہی کرنا چاہتے ہوں گے۔ کورا کے لیے بھی اُن کی یہی کوشش ہوگی مگر

یہی اُن کی سب سے بڑی بھول تھی بے شک آنے والا ہر دن اُن کی آنکھوں میں مرتسم میرے نقش پر کچھ اور گرد ڈال دیتا ہوگا لیکن آنے والے ہر دن کورا کی آنکھوں میں یہ نقش اور اُجاگر ہو جاتے ہوں گے۔ مولوی صاحب اُسے یہ باور کرانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے کہ میں زندہ نہیں ہوں، مر چکا ہوں یا جیل میں ہوں میں نے اُس رات دو آدمیوں کو چھرے مار دیے تھے۔ میں اُسے بھول گیا ہوں گا۔ یہ ناپختگی کی ایک واردات تھی کہ میں اُسے گھر سے لے کے چلا آیا۔ اچھا ہوا کہ وہ اُن کی پناہ میں آگئی۔ میرے ساتھ رہتی تو نہ جانے کیا کیا واقعات پیش آتے اور اب اگر میں اُسے مل بھی جاؤں تو ایک بدلا ہوا آدمی ہوں گا اور کورا جیسی لڑکی کے لیے میں کسی طرح موزوں نہیں ہوں گا۔ وہ اُس سے یہی کچھ کہتے ہوں گے۔ نہیں کہتے ہوں گے تو ایسا تاثر دیتے ہوں گے۔ وہ اشاروں کنایوں میں کہتے ہوں گے کہ جب میں اپنے گھر کا نہیں رہا، اُس گھر کا جہاں پلا بڑھا تھا تو کسی اور کا کیا ہو سکتا ہوں۔ وہ ایسی باتیں اُسی کی خاطر کرتے ہوں گے۔ کورا کے ساتھ رہتے رہتے انھیں اُس سے یہ ہمدردی ہو ہی جانی چاہیے۔ اُن کی ہمدردی کا اس سے بڑا ثبوت کیا تھا کہ اُنھوں نے اُس کے لیے ساری دُنیا سے رشتہ توڑ لیا تھا۔

اُنھیں حق تھا کہ وہ کورا سے کچھ بھی کہیں۔ اُس رات وہ نہ ہوتے تو کورا نہ جانے کہاں ہوتی حالانکہ اُس رات دریا کے کنارے چلنے پر اصرار بھی اُنھوں نے ہی کیا تھا۔ اگر ہم وہاں نہ جاتے تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ ہم اُن کے ساتھ مراد آباد چلے جاتے یا گھر ہی واپس ہو جاتے۔ ابّا جان مجھے دیکھ کے گھر سے باہر نہیں نکال دیتے۔ ہم دونوں اُن کے پیروں پر سر رکھ کے معافی مانگ لیتے۔ پھر نہ اتنی مرتیں نہ فہمیدہ کا پردہ اُٹھتا، نہ گھر بکتا۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ اگر مولوی صاحب کہیں مل گئے تو میں اُن سے نہیں بولوں گا۔ اُنھوں نے مجھے اتنا نیچ اور ذلیل کیوں سمجھا تھا۔ جیل میں رہ کے سبھی بدل نہیں جاتے۔ لوگ جیل مجبوری میں جاتے ہیں۔ کس کا جی چاہتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھ جائے۔ مولوی صاحب کو مجھ پر ترس نہیں آیا کہ میں نے کورا کو بچانے کے لیے اور خود اُنھیں بچانے کے لیے ان لوگوں کو چاقو مارے تھے۔ میں اور کیا کرتا۔ کیا کورا کو یوں ہی جانے دیتا۔ بس اُنھوں نے سمجھ لیا تھا کہ میں نہیں بچوں گا اور اگر بچ بھی گیا تو مجھے برسوں کی قید ہوگی۔ اتنے سال گزرنے کے بعد جب میں باہر نکلوں گا تو پچھلی تمام باتیں بھول چکا ہوں گا۔ اُنھیں کیا معلوم تھا کہ میں نے اُسی کی خاطر وہاں اپنی تعلیم جاری رکھی تھی۔ میں نے اُسی کے لیے چاقو چلانا سیکھا تھا۔ کبھی تو خبر لیتے کہ مجھ پر کیا گزری، میں واقعی ویسا ہوں یا میری صورت بدل گئی ہے۔ وہ مجھے آزمائش کا ایک موقع تو دیتے۔ کورا اُن کی نہیں تھی، وہ میری امانت تھی۔ امانت لوٹاتے وقت یہ خیال نہیں رکھا جاتا کہ مطلوب پاگل ہو گیا ہے یا مجرم ہے یا امانت لوٹانے کا اہل ہی نہیں رہا۔ مگر مولوی صاحب نے اُسے میری امانت ہی نہیں سمجھا ہوگا۔ وہ تھے کہ میں کورا کو کس طرح گھر سے لایا ہوں۔ میں نے اُنھیں ساری بات بتا دی تھی۔ مولوی صاحب کورا سے کچھ بھی کہتے ہوں لیکن اُنھیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ صرف میرے لیے زندہ ہے، میرے لیے زندہ رہے گی۔ وہ اُسے کچھ بھی تاثر دیتے ہوں، کہیں بھی لے جائیں، اُس کے پاس اپنا بھی ایک دل تھا اور وہ دل ضرور کہتا ہوگا کہ میں نے اُس کے پاس پہنچنے کے لیے کون سا جتن نہیں کیا ہے۔

جیسے زہرہ نے مجھے اُس کی حالت بتائی تھی۔ مولوی صاحب اُسے میرے مرنے کا یقین دلانے کی غلطی نہیں کی ہوگی۔ وہ اُسے آسرے پر قائم رکھ سکتے تھے۔ اُن کا خیال ہوگا کہ وقت کی سرد ہوا کے سامنے کورا کب تک ٹھہری رہے گی، ایک دن تھک جائے گی، کی آس کبھی نہیں ٹوٹے گی۔ مولوی صاحب خود تھک جائیں گے، دن اُنھیں مجھے تلاش کرنا ہی ہوگا اور مجھے تلاش کرنا اُن کے لیے ایسا مشکل نہیں ہوگا، جیل میں کسی سے بھی اُنھیں معلوم ہو جائے گا کہ میں کہاں مل سکتا ہوں۔

مارٹی، ٹلا اور میں جب اڈّے واپس آئے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ دکانوں کی روشنیاں جلی ہوئی تھیں۔ اڈّے کے باہر لوگوں کی بھیڑ تھی۔ اندر بھی بہت گہما گہمی تھی۔ نصیب میاں، زورا، چھیدا، کالا، منّن، کبن خاں اور دوسرے سبھی مصروف نظر آتے تھے۔ سارٹے نے مجھے بتایا کہ استاد تجھل کے آنے کی خوشی میں بکرے کاٹے گئے، میٹھے کی دیگیں بھی چڑھائی گئی ہیں۔ رات کو گلی کے آخری سرے پر میدان میں مجرا بھی ہوگا۔ وہیں کھانا کھلایا جائے گا۔ اڈّے کی کلی تمام مکینوں اور دوسرے اڈّوں کے آدمیوں کو دعوت دی گئی ہے۔ سے نقیروں نے ڈیرا جما دیا تھا۔ سارٹے اُنھیں میدان میں پہنچنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ اڈّے کے تقریباً سبھی لوگ وہاں موجود تھے، تجھل، جامو اور پیرو کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے کالا پکڑ کے پوچھا: "تجھل بھائی کہاں ہیں؟"

"کچھ تو ہی لیل لاڈلے!" وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ "آج بڑے چکر میں دکھائی دیتا ہے۔ شام تک اُوپر کے فلیٹوں میں تنبو مسکوٹ ہوتی رہی۔ اُستاد نے گاڑی بھیج کے اپنے منڈے وکیل کو بھی بلایا تھا۔"

"منڈے وکیل کو بھی!" میں نے حیرت سے کہا۔

"منڈے وکیل کے جانے کے بعد وہ تینوں بھی اُتر کے باہر چلے گئے۔ اب دیکھو سیّاں کب لوٹتے ہیں۔"

"کچھ کہہ کے نہیں گئے؟"

کانتے نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں نے کوئی مضحکہ خیز بات کہہ دی ہو۔ مجھے اتنے دن تجھل کے ساتھ رہتے ہو گئے تھے۔ وہ اُسی بات کا جواب دیتا تھا جو بتانا چاہتا ہو۔ کانتے کے اندازے کے مطابق اُسے جلد آ جانا چاہیے تھا لیکن وہ رات تک نہیں آیا۔

میدان میں سارے لوگ اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ایک بار موجمدار اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بھرے مجمع میں تجھل کو دھمکی دینے آیا تھا کہ اگر اُس نے میرے ساتھ آئی ہوئی لڑکی دوسرے دن شام تک نسترن کو واپس نہ کی تو اُس سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔ دوسرے دن موجمدار ہی نہیں رہا اور وہ علاقہ تجھل کے علاقوں میں شامل ہو گیا جہاں نسترن رہتی تھی۔ اُس روز رات کو ناچ گانا بھی ہوا تھا، کھانا بھی اسی طرح پکایا گیا تھا۔ تجھل نے سارے محلّے کو دعوت دی تھی۔ آج لوگ اُس دن سے زیادہ تھے۔ نصیب میاں بولائے بولائے پھر رہے تھے۔ اِدھر میدان میں زنخے اُچھل کود کر رہے تھے۔ اڈّے کا سب سے موٹا، سب سے بھاری آدمی ٹالو اُن کے ساتھ مٹکنے لگا، کان پڑی آواز سنائی دینی مشکل ہو گئی۔ تجھل ہی نے اُس کا نام ٹالو رکھا تھا، لوگ اُسے ٹلوا بھی کہتے تھے۔ ٹلوا یا ٹالو کی عادت کام ٹالنے کی تھی۔ ایک دو آوازیں تو وہ ایک کان سے سُن کے دوسرے کان سے اُڑا دیتا تھا۔ وہ اتنا بھاری تھا کہ اپنا جسم اُٹھاتے ہوئے اُسے زور لگانا پڑتا تھا۔ اُس کے سامنے بھنا ہوا سالم بکرا رکھا ہو تو سارا کا سارا کھا جاتا اور ڈکار نہیں لیتا۔ اُس کی آنکھیں چھوٹی، سر چھوٹا، سارا چہرہ چھوٹا تھا، جیسے غلطی سے اُس کے پھیلے ہوئے جسم پر لگا دیا گیا ہو۔ بڑے سے بڑا وزن اُٹھانے میں اُس کی سانس نہیں پھولتی تھی۔ پل میں ہڈی توڑ دیتا اور جسم پر کتنے ہی بید، قمچیاں، ہنٹر کتنی ہی ضربیں پڑ جائیں، کھڑا سہتا رہتا۔ کسی زمانے میں بلّم، چاقو زنی اور لٹھ بازی میں اُسے ملکہ حاصل تھا مگر اب بتدریج موٹا ہوتا جا رہا تھا۔ جیل میں وہ مختلف اوقات میں میرے ساتھ کوئی ڈیڑھ سال تک رہا تھا۔ ایک بار وہاں کسی لڑائی جھگڑے کی سزا میں اُسے قمچیاں ماری گئیں۔ وہ آنکھیں کھولے زمین پر بے حرکت کھڑا رہا، اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا تو جیلر نے اُس کے لیے ایک سخت سزا تجویز کی۔ بھوکا رکھنے کی سزا، ٹلوا بھوک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دو وقت ہی میں ہاتھ پاؤں زمین پر مارنے لگا مگر منڈے وکیل نے اُس کی طرف سے اعلیٰ حکام کو درخواست بھجوا دی۔ آئندہ اُسے بھوکا رکھنے کی سزا نہیں دی گئی۔ اب اُس کا زیادہ تر وقت اڈّے کی دیکھ بھال، مغزیات کی تیاری اور تجھل کے جسم کی مالش کرنے میں گزرتا تھا۔

زنخے اُس کے جسم میں ٹھوکے مارنے لگے۔ ٹالو کے جسم میں اگر کوئی ایک تنکا بھی چبھو دیتا تو وہ پندرہ بیس منٹ مسلسل ہنستا رہتا۔ تجھل کی چیخ پکار بھی ہنسی کا یہ دورہ ختم نہ کر پاتی۔ زنخوں نے اُس کے سر پہ دوپٹا ڈال دیا۔ موٹے ٹالو نے بُرا نہیں مانا۔ وہ دوپٹا اوڑھ کے تھرکتا، مٹکتا میرے پاس آیا۔ اُس کی حالت دیکھ کے مجھے بھی ہنسی آگئی۔ کانتے نے میرے سر پہ دس کا نوٹ رکھ دیا جو اُس کے بجائے ایک زنخے نے اُچک لیا اور میری بلائیں لینے لگا۔ موٹے ٹلوا کو اڈّے کے آدمیوں نے پھر اپنے گھیرے میں لے لیا اور اس سے دُور دُور کھڑے رہے۔ تجھل کی سخت ممانعت تھی کہ کوئی اُس کے جسم میں گدگدی نہ کرے۔ ٹلوا بے تحاشا ہنس رہا تھا اور اُس کا سارا جسم پارہ بنا ہوا تھا۔ سارے میدان میں قہقہے گونج رہے تھے، اڈّے کے آدمیوں کو ڈر تھا کہ اس دوران تجھل نہ آ جائے۔ کہیں پندرہ بیس منٹ بعد ٹلوا کی ہنسی رُکی اور جیسے اُسے ہوش آیا۔

وہ تینوں نہیں آئے لیکن چائنا ٹاؤن کے اڈّے سے ایک آدمی نے آ کے خبر دی کہ تجھل کے آنے میں اور دیر ہو جائے گی لہٰذا کھانا شروع کر دیا جائے اور ناچ گانا بھی۔ اڈّے کے بہت سے آدمیوں نے کھانا نہیں کھایا، البتہ فقیروں اور گلی کے لوگوں اور دُور دراز کے اڈّوں کے آدمیوں کے لیے دیگیں کھول دی گئیں۔ کانتے نے مجرا جمانے کی کوشش کی مگر تجھل کے نہ آنے کی خبر سُن کے میدان میں ایک اُکھڑا پن پیدا ہو گیا تھا۔ سارٹے نے مجھے بتایا تھا کہ کئی گانے والیاں بُلائی گئی ہیں، وہ اڈّے کی عمارت میں ٹھیری ہوئی تھیں۔ اُن میں سب سے پہلے گانے والی جمنا اپنے سازندوں سمیت میدان میں آ چکی تھی۔ میں وہاں رُکنا نہیں چاہتا تھا لیکن تجھل کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ جمنا کی آواز بُری نہیں تھی۔ عمر تیس سے کم نہیں ہوگی۔ مارٹی کے اشارے پر وہ میرے پاس آ کے ٹھیر گئی۔ پھر مارٹی، زورا اور چھیدا نے اُس پر روپے برسانے شروع کر دیے۔ کانتے اور کبن خاں نے اُنھیں روکا۔ ابھی اُس نے پہلی غزل بھی ختم نہیں کی تھی کہ تجھل کے آنے کی گونج اُٹھی۔ اُس کے ساتھ پیرو اور جامو بھی تھے۔ وہ تینوں تھکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ناچ گانا رُک گیا تھا۔ تجھل کے قریب آنے پر جمنا نے اُسے جھک کے سلام کیا۔ "جمنا بائی! تجھے لُوٹ رہی ہو" تجھل نے بھاری آواز میں کہا۔

"آپ کی نظر کا اثر ہے اُستاد!" اُس کا بدن لہرا گیا۔

"زبان کو بھی نرت سکھا دی ہے۔"

"سننے والے کو شاید پہچاننے لگی ہے۔" وہ شگفتگی سے بولی۔ "اب آپ نہ کبھی بلاتے ہیں، نہ آتے ہیں۔ جب پوچھو ایک ہی جواب ملتا ہے کہ اُستاد شہر میں نہیں ہیں۔"

"میں شہر میں نہیں تھا جمنا!"

"لیکن سُنا ہے، درمیان میں آئے تھے، ہماری طرف نہیں آئے؟"

"تیسرے چوتھے ہی روز تو پھر جانا ہو گیا تھا۔"

"کوئی اور شہر پسند آگیا ہے؟"

"اپنے لیے سبھی شہر ایک جیسے ہیں پر کلکتے کی بات اور ہے۔"

"اور کلکتے سے دُور بھی رہتے ہیں۔" جمنا شکایتی لہجے میں بولی۔

"مالنی آپ کو بہت یاد کرتی تھی۔ پچھوایا بھی تھا لیکن....."

"مالنی کہاں ہے؟" جھل نے اضطراب سے پوچھا۔

"آپ کو نہیں معلوم۔" وہ اداسی سے بولی۔ "جہاں جانا تھا، چلی گئی۔"

"چلی گئی! کب؟ کیسے جمنا؟"

"روگ لگا لیا تھا۔"

"کیسا روگ؟"

"یہی آنے جانے والوں میں سے کسی ایک کا۔"

"کون تھا وہ؟"

"اسی شہر کا تھا۔"

جھل چند لمحوں تک خاموش کھڑا رہا، پھر درشتی سے بولا۔

"نام بتاؤ؟"

"اب نام بتا کے کیا ہوگا استاد! مالنی واپس نہیں آجائے گی۔ آپ ہوتے تو شاید اُس پگلی کو سمجھا پاتے۔ آپ کا بہت ذکر کرتی تھی چھوڑیے یہ بتائیے کہ اب جا تو نہیں رہے؟"

"جارہے ہیں جمنا! جلدی ہی جانا ہے۔"

"پھر جارہے ہیں؟"

"ہاں جمنا، تم سے یہی بولنا تھا۔ آج رات بھی تم سے باتیں نہیں ہو پائیں گی۔ لگتا ہے تم پیچھے نرت اور بھاؤ کو چھانتی رہی ہو۔ رستی ڈھیلی نہیں کی بمبئی سے کچھ مہمان آئے تھے۔ یہ پیرو دادا ہے۔" جھل نے پیرو کی گردن میں ہاتھ ڈال کے اُسے قریب کرتے ہوئے کہا۔

جمنا نے پیرو کو آداب کیا۔ "کبھی اُدھر بمبئی آؤ نا۔" پیرو مسکرا کے بولا۔

"کیسے آئیں۔ اس شہر نے پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی ہیں لیکن آپ بلائیں گے تو ضرور آئیں گے۔ بمبئی دیکھنے کی حسرت ہے۔"

"آؤ، شوق سے آؤ، اپن تم کو آکھا بمبئی دکھائیں گا۔"

"ضرور آئیں گے۔"

"اُدھر بھی سب جھل بھائی کا ہے۔ اپن تو اس کا غلام ہے۔"

"تم چاہو تو گانا شروع رکھو پر ہم کو جانا ہے۔" جھل بولا۔

"آپ کے بغیر لطف نہیں آئے گا۔"

"ادھر بہت سے دیکھنے اور سننے والے ہیں۔"

"آج سالی سویرے سویرے کینسٹ ہوگئی تھی۔ ٹلرا کا منہ دیکھ لیا تھا۔" کانتے بیچ میں بولا۔ "استاد جانے دو پھر کسی دن جمنا بائی کو بلالیں گے۔" سبھی نے کانتے کی تائید کی۔ جھل نے اصرار بھی کیا کہ اُس کے اور چند لوگوں کے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا مگر سبھی کا جی اُکھڑ گیا تھا۔ کانتے نے شولی کو ہدایت کی کہ وہ اڈے جا کے دوسری گانے والیوں کو واپس بھیج دے جو جمنا کے ناچ کے بعد یہاں آنے والی جمنا بائی بھی شولی کے ساتھ چلی گئی۔ جن لوگوں نے جھل کی وجہ نہیں کھایا تھا، اُن کے سامنے تھالیاں اور پلیٹیں رکھ دی گئیں کے دوران سب چُپ چُپ سے رہے۔ میری طرح سب کو یہ جاننے ہوگی کہ جھل کہاں گیا تھا، ویسے کیوں آیا اور پھر اُسے کہاں جانا میں اُسی کی طرف دیکھ رہا تھا مگر وہ سر جھکائے لقمے ٹونگتا رہا۔ پیرو بھی زبردستی ہاتھ چلا رہے تھے۔ دھیان کہیں اور تھا۔ میرا تو میں وہاں سے اُٹھ جاتا اور پھر کبھی اُن کے سامنے نہ آتا۔ ایک وہ مجھے رودھو کے، بُرا بھلا کہہ کے چُپ ہوجاتے۔

تھوڑی دیر میں میدان خالی ہوگیا۔ جھل سب کے ساتھ آگیا۔ آتے ہی اُس نے کانتے کے ذریعے فرداً فرداً تقریباً بیس آ کو اڈے پر رُکنے اور اوپری منزل کے ایک کمرے میں بیٹھ جا اُن میں پیرو، ماچھی، زورا، چھیدا، مارٹی، ٹلما، کپتن خاں اور مٹن جامو کانتے، سارٹے، شولی، لالہ، کدّا، وزیر، موسج، گجرو، ہلاکو پلٹو شامل تھے۔ جھل نے جن جن لوگوں کے نام کانتے کو بتائے اُن کے سوا کوئی اوپر نہیں آیا۔ میرا نام اُن میں نہیں تھا لیکن جھل میرا ہوئے مجھے اوپر لے آیا۔ جب سب بیٹھ گئے اور کمرے میں گہ طاری ہوگئی تو جھل نے حقے کی نے منہ سے ہٹائی اور گونجتی ہوئی میں بولا۔ "تم سے بولنے کی ضرورت نہیں تھی، مجھ کو پتہ ہے تمھا کیا ہوگا پر تم میں سے ہر ایک کو میری طرف سے منع کرنے کی ا ہے۔ جس کے آگے پیچھے کوئی نہیں، مجھ کو اُس آدمی کی ضرورت پیچھے کوئی دیکھنے والا نہیں ہے یا تمھارا پیر کہیں اٹکا ہوا ہے یا اور فکر ہے تو میرا دھیان مت کرو، ابھی انکار بول دو۔ مجھ کو جا اور لاڈلے کو دُور جانا ہے اور واپسی مشکل ہو سکتی ہے۔"

لمحوں تک سکوت چھایا رہا، سب متذبذب نظروں سے دیکھ رہے تھے پھر سارٹے نے کھڑے ہو کے تیز لہجے میں کہا: "استاد! کدھر چلنا ہے؟"

"جہنم میں چلنا ہے۔" جھل گرج کے بولا۔ "تم کو اس سے واسطہ نہیں کہ کدھر چلنا ہے، میری بات کا جواب دو۔"

"جواب کیا دینا ہے استاد!" وزیر نے دبے لہجے میں کہا

"جدھر تم بولو گے، چلیں گے۔" گجرو کی جوشیلی آواز ابھری

"نہیں اچھی طرح سوچ سمجھ لو، میں تم کو جیل جانے، کسی کا کرنے یا ڈاکا ڈالنے کو نہیں بول رہا ہوں۔ کام دلیا نہیں ہے تمھارا ہاتھ چلتا ہے۔ اپنے کو تمھارے ہاتھ کی صفائی سے زیاد کی صفائی چاہیے۔ سب کچھ ادھر ہی چھوڑ کے چلنا ہوگا اور وا ایک چھدام بھی نہیں مل سکتا ہے۔ سمجھو استاد تم سے تمھاری جا ہے۔"

"اپنی جان تمھارے پاس ہی ہے استاد!" کانتے سر جھٹک کے بولا۔

"چُپ رہ۔" جھل نے اُسے جھڑک دیا۔

"کانتے ٹھیک بولتا ہے استاد!" ایک ساتھ کئی آوازیں گونجیں۔

"کانتے جو بولتا ہے ٹھیک ہے پر تم کانتے کے بولے پر مت ..اگر تم انکار کردو گے اور استاد بُرا مانے تو تم سب مل کے استاد سے ..ز چھین لینا اور اس حرام کے تخم کو جوتیوں کا ہار ڈال دینا اس کے ..پر تھوک دینا۔ ایسا میں اس لیے بولتا ہوں کہ تم اپنی مرضی کو اچھی طرح ..ن پٹ لو۔ یہ کوئی تمھارا امتحان نہیں ہے، میں نے بول دیا ہے کہ ..جانا ہے اور کام بھی بدلا ہوا ہے۔"

"حکم دو استاد!" سارٹے نے چاقو نکال کے اپنا گریبان چاک ..یا اور نوک سینے میں دھانس لی۔ پیرو، جامو، کانتے اور میرے سوا ..بھی نے اُس کی پیروی کی۔ پھر سب نے اپنے چاقو جھل کے آگے ..ال دیے۔

"انھیں اُٹھا لو۔" جھل نے ترشی سے کہا۔ "گرمی مت دکھاؤ۔ میں ..م کو سوچنے کے لیے ایک پورا دن دیتا ہوں۔" اُس نے پھر تکرار کی کہ ..اگر کسی کو کوئی مجبوری ہے تو وہ کسی خوف، جھجک اور مروت کے بغیر ..ے بتا دے۔ اُس کا یہ اصرار میری فہم سے بالاتر تھا۔ وہ ان سے کون سا ..م لینا اور کہاں بھیجنا چاہتا تھا۔ ایسا کام جہاں سے واپسی مشکل ہو ..سکتی ہے۔ کئی باتیں میرے ذہن میں آئیں لیکن کسی کا کوئی مضبوط جواز ..نظر نہیں آتا تھا۔ کیا جھل اُنھیں ہندوستان کے مختلف حصوں میں ..علیحدہ علیحدہ بھیجنا چاہتا تھا کہ ایک سے دو، دو سے چار بھلے ہوتے ..ہیں۔ زیادہ آدمی زیادہ مقامات پر جا سکتے ہیں۔ پہاڑوں پر چلنے سے ..اُن کی مراد یہ ہوگی کہ مولوی صاحب کو دُور دراز کے مقامات پر تلاش ..کیا جائے۔ کشمیر، سرحد، بلوچستان اور دوسرے پہاڑی علاقوں میں جہاں ..ابھی تک نہیں پہنچے تھے اور فیض آباد سے میں نے بھی وہیں جانے ..کا ارادہ کیا تھا مگر جھل کی وجہ سے واپس آگیا تھا۔ کاش میں چلا ہی جاتا۔ ..مولوی صاحب جیسلمیر سے نکلنے کے بعد پھر کسی دُور افتادہ مقام پر ..چلے گئے ہوں گے۔ مراد آباد اور اپنے ملاقاتیوں سے دُور کے علاقوں میں۔ ..میں نے اُن کی، کورا اور آپا جان کی شکل و صورت، عادات و اطوار کے ..بارے میں سب کچھ جھل کو بتا دیا تھا۔ وہ اُن کے متعلق تقریباً ہر بات ..جانتا تھا بس اُن لوگوں کی صورت نہیں دیکھی تھی اُس نے۔ جب وہ کہیں ..کسی سے انھیں پوچھتا تھا تو مجھے زبان کھولنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ..میں چُپ کھڑا رہتا تھا۔ منیر علی نے بھی میری عدم موجودی میں مولوی ..صاحب کی بہت سی باتیں اُسے بتائی ہوں گی۔ ممکن ہے زہرہ اور ارشد ..نے بھی اُس نے کچھ معلوم کیا ہو۔ ایک ہی بات کچھ سمجھ میں آتی تھی کہ کلکتے میں مختلف آدمیوں کو اکٹھا کرنے سے جھل کا مقصد مولوی صاحب اور کورا یا آپا جان کا حلیہ بتا کے اُنھیں جگہ جگہ بھیجنا ہو مگر وہ سب کامیاب یا ناکام واپس کلکتے آسکتے تھے۔ اُن کی واپسی میں کیا الجھنیں پیش آسکتی تھیں اور جھل کو یہ لہجہ اور یہ انداز اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ اُن سے یوں بھی یہ بات کہہ سکتا تھا۔ ضرور جھل کو کچھ معلوم تھا جو میں نہیں جانتا تھا۔

جو لوگ اوپری منزل کے کمرے میں موجود تھے۔ اُن میں مارٹی، گجرو، ٹنڈے اور میرے سوا سب کی عمریں تیس سے اوپر تھیں یا لگ بھگ۔ وزیر پرسوں آسنسول سے آیا تھا لیکن پہلے وہ کلکتے ہی میں رہتا تھا۔ جھل نے کئی سال پہلے اُسے آسنسول کے موتی استاد کے پاس بھیج دیا تھا۔ اب جھل نے اُسے بھی تار دے کے کلکتے بلایا تھا۔ سب کا پنجہ مضبوط تھا، نظر تیز تھی۔ وقت آنے پر اُن کا جسم بجلی کی طرح چمک اُٹھتا تھا۔ کئی کئی سال جیل میں رہ چکے تھے اور وہاں اُنھوں نے وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ صبح و شام محنت کرتے یا ایک دوسرے سے پنجہ آزمائی کرتے رہتے تھے۔ جھل نے اُنھیں اپنا فیصلہ سنانے کے لیے ایک دن کی مہلت دی تھی لیکن یہ محض اُس کی حجت تھی۔ اُسے معلوم ہوگا کہ وہ کل کیا جواب دیں گے۔ اُس نے اُنھیں بتایا کہ روانگی میں دو یا تین دن لگ سکتے ہیں اور تاکید کی کہ وہ نیچے اُتر کے کسی سے اس کا چرچا نہ کریں۔ نہ اب، نہ اُس کے جانے کے بعد۔ اُنھیں اپنے طور پر خود فیصلہ کرنا ہے۔ جو یہاں بیٹھے ہیں، وہ بس آپس میں مشورہ کر سکتے ہیں۔ باہر کے کسی آدمی سے نہیں اور وہ ایک ساتھ آ کے اُسے بتانے کے بجائے الگ الگ اُس کے پاس آئیں گے۔ کوئی آدمی روبرو عذر پیش کرنے میں جھجک محسوس کرتا ہے تو وہ اِنھی آدمیوں میں سے کسی کے ذریعے جھل کو بتا سکتا ہے۔ اُس نے آنے والے دو تین دنوں میں اُنھیں اڈے پر اپنے آس پاس رہنے کی ہدایت کی۔

اپنی بات مکمل ہونے کے بعد اُس نے سب کو وہاں سے چلے جانے کی اجازت دے دی اور خود بھی پیرو کے ساتھ اُٹھ کے نیچے آگیا۔ مجھے تنہائی کا کوئی موقع نہیں مل رہا تھا کہ اُس سے بات کروں اور پوچھوں کہ یہ سب کیا ہے۔ نیچے کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد وہ پیرو اور جامو کو لے کے فلیٹ میں سونے کے لیے چلا گیا۔ ماچھی، زورا، چھیدا، مارٹی، ٹلما، کپتن خاں اور میں دوسرے فلیٹ کے دونوں کمروں میں آ کے بستروں پر لیٹ گئے لیکن کسی کو نیند نہیں آرہی تھی۔ اُنھوں نے تاش کھیل کے وقت گزارنا چاہا۔ اس میں اُن کا جی نہیں لگا تو وہ سب میری چارپائی کے اردگرد بیٹھ گئے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ کانتے اور مارٹی کی چارپائیاں میرے آس پاس تھیں۔ ٹلما ادوائن پر میرے پیروں کو تکیہ بنائے سکڑا پڑا تھا۔ اُن سب کی نگاہیں بار بار مجھی پر مرکوز ہوجاتی تھیں جیسے میں انھیں کچھ بتا سکوں گا کہ اُستاد جھل انھیں کہاں بھیجنے کا ارادہ

رکھتا ہے۔ کانتے نے اُن کی غلط فہمی دُور کی۔ وہ اپنی چارپائی پر لیٹ گئے۔ تڈّا بھی اپنے بستر پر چلا گیا۔ رات کو کسی وقت کانتے اُٹھ کے چپکے سے میری چارپائی پر آ گیا اور سرگوشی میں بولا "جاگ رہا ہے لاڈلے؟"

میری آنکھیں کھُلی ہوئی تھیں۔ کانتے میرے پہلو میں لیٹا کھُسر پھُسر کرنے لگا کہ وہ اس دوران جولین کے ہاں وہ دو تین دن کے لیے جا چکا ہے مجھے صرف ایک ہی بار کا پتہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا میرے لیے یہ انکشاف ہو گا۔ میں نے اُسے نہیں بتایا کہ زورا اور مارٹی کی زبانی مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے۔ وہ جولین کی باتیں کرتے کرتے پوچھنے لگا کہ "زرّیں بہن کا کیا حال ہے؟ مجھے کبھی پوچھتی ہے؟"

"تمھارا بہت ذکر کرتی تھی۔" میں نے بدبداتے ہوئے کہا۔

"سچ!" وہ چمک کے بولا۔

"ہاں، بہت زیادہ۔"

"وہ ضرور کرتی ہو گی۔"

"پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"

"بمبئی سے لَوٹ کے میں وہاں بھی گیا تھا۔"

"مجھے زرّیں نے بتا دیا تھا۔"

"زرّیں بہن نے بتا دیا؟"

"مگر بٹھل بھائی سے نہیں کہا۔"

"نہیں کہا ہو گا، میں نے منع کر دیا تھا۔" وہ میرے پہلو میں کسمساتے ہوئے بولا "لاڈلے! دل کرتا ہے کہ میں اُس کے پاس ہی رہوں اور جولی کو بھی وہیں بلا لوں۔ وہ بہت اکیلی ہے۔"

"میں بٹھل بھائی سے بات کروں گا کہ جولی کو بھی اُدھر بلا لیں۔"

"ایسا ہو جائے تو پھر کیا بات ہے؟" کانتے جوش میں بولا۔

"ایسا ہی ہو جائے گا۔"

"اور پھر میں یہ سب کام چھوڑ دوں گا۔ میں وہیں رہوں گا اور زری بہن کی زمینوں پر ہل چلاؤں گا۔ چاقو کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔"

"پر چاقو تمھیں نہیں چھوڑے گا کانتے!"

"چھوڑے گا کیسے نہیں، میں اپنی انگلیاں کاٹ لوں گا۔"

"تمھیں وہ دونوں اتنی اچھی لگتی ہیں؟"

"وہ کانتے کی جان ہیں لاڈلے! میرا دُنیا میں اُستاد کے سوا کوئی نہیں ہے، پر اب دو میری بہنیں بھی ہیں۔ جب بھی میں فیض آباد یا بمبئی گیا، تجھے کیا بولوں، اُنھوں نے اپنے بھائی کانتے کے لیے کیا کیا۔ کوئی ایک بات ہو تو بولوں۔ ایک دن بمبئی میں میری طبیعت ذرا نَیس ہو گئی تو جولین پریشان ہو گئی۔ گھر میں ڈاکٹر کو بلا لائی، رات بھر بخار میں میرے سرھانے بیٹھی رہی اور میرا ماتھا چھو چھو کے دیکھتی رہی۔ اُدھر جب کبھی میں فیض آباد جاتا ہوں، زری بہن مجھے آنے نہیں دیتی۔ کوئی

نہ کوئی اڑنگا لگا دیتی ہے۔ اِدھر میں کلکتے میں زیادہ تر اِدھر سالا باہر نکلو تو جیل کا دروازہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ تو جانتا [ہے] نے کبھی جیل سے منہ نہیں موڑا۔ جیل جا کے کچھ دن آرام کے [لیے] اُدھر بھی اِدھر جیسا اڈّا ہے۔ پر میں جیل سے بچتا رہا، اُنھی لاڈلے! اب مجھے خیال آیا، وہ دونوں جیل میں اپنے بھائی کو خط [لکھیں گی]... کانتے کچھ بزدل ہو گیا ہے لاڈلے! سُن رہا ہے؟" وہ مجھے [ٹہوکا] مار کے پوچھتا "سُن رہا ہے؟" میں ہُوں ہاں کرتا رہا۔ رات [گئے] پہر اُسے رات گزرنے کا احساس ہوا۔ وہ مجھے سو جانے کی [تاکید کر کے] دبے قدموں اپنے پلنگ پر چلا گیا۔ وہ ایک پل کے لیے نہیں [سویا، اُس] کی لمبی لمبی سانسیں رات بھر میرے کانوں میں سرسراتی رہیں۔

صبح نصیب میاں نے جب ہم سب کو ناشتے کے [لیے بلایا] تو وہ تینوں موجود نہیں تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ منہ اندھیرے اڈّ[ے پر] گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ انھیں لَوٹنے میں وقت لگ [جائے گا۔ نصیب] میاں سے یہ پوچھنا لاحاصل تھا کہ وہ لوگ کس طرف کا کہہ کے [گئے ہیں۔] دس گیارہ بجے تک ہم سب اُن کا انتظار کرتے رہے۔ پھر ماچھی [نے] کلکتہ دیکھنے کی فرمائش کی تو کانتے نے ٹیکسیاں منگوا لیں۔ [مجھے] بھی زبردستی اپنے ساتھ بٹھا لیا اور مختلف اڈّوں میں گھومتے [رہے۔ باہر سے] آنے والوں کے لیے یہ سب دلچسپی اور اشتیاق کا سامان تھا۔ لوگ اُن سے جوش و خروش سے بغل گیر ہوتے۔ ہر جگہ اُن کے [آگے] مٹھائی، بسکٹ، پھل اور مشروبات کا ڈھیر لگ جاتا۔ موجد[ہ] اڈّے پر ہم زیادہ دیر ٹھیرے۔ وہیں ہمیں پتہ چلا کہ صبح کے [وقت] بیرو اور جامو کو لوگوں نے اِدھر سے گزرتے دیکھا تھا۔ وہ [ٹیکسی میں] سوار تھے اور اُن کے ساتھ سوٹ میں ملبوس ایک اجنبی شخص [تھا۔] ابھی بہت سے علاقے باقی تھے۔ اگر ہم اسی حساب سے ہر [جگہ] لوگوں سے ملتے اور چائے وغیرہ پیتے رہتے تو کئی دن لگ [جاتے۔] کھاتے کھاتے تھک گئے تھے اور میں جلد از جلد اڈّے پر وا[پس جانا] چاہتا تھا۔ میں نے ماچھی سے کہہ کے ٹیکسیوں کا رُخ اڈّے [کی طرف] مُڑوا دیا۔

سہ پہر کو ہم واپس پہنچے تو ہمیں دروازے ہی پر معلوم [ہوا کہ] بٹھل اندر موجود ہے اور نچلی منزل کے بڑے کمرے میں [ہے۔ دروازہ] کھُلا ہوا تھا لیکن ٹلّو دروازے پر پہرا دے رہا تھا۔ ہم نے اند[ر] قدم بڑھائے تو ٹلّو نے آنکھ مار کے ہمیں باہر ہی ٹھیرنے [کا] اشارہ کر دیا اور چند لمحے بعد دروازے سے ہٹ کے ہمیں بتا[یا کہ] ایک صاحب بیٹھا ہے، اُستاد بارہ بجے واپس آ گیا تھا، اُس [کے بعد] کئی آدمی اُس سے ملنے کے لیے آ چکے ہیں۔ سیٹھ گوپی رام [بھی آیا] گیا ہے۔ گوپی رام کلکتے کا مشہور دولت مند تھا۔ اُس کے کئی

[دوسرے] شہروں میں چلتے تھے۔ شام تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ شام ہی کو [سیٹھ] گوپی رام کا ایک آدمی ہاتھوں میں دو بھاری تھیلے لٹکائے اڈّے [کی عم]ارت میں داخل ہوا۔ نصیب میاں نے اُسے دیکھتے ہی نعرہ لگایا "ہٹو، [ا]رے ہٹو، لکشمی جی آ رہی ہیں۔" نصیب میاں کا اندازہ درست تھا۔ [ج]ب گوپی رام کے آدمی کی اطلاع سُن کے باہر آیا تو اُس نے ایک تھیلا [نصی]ب میاں کی تحویل میں دے دیا۔ اِس تھیلے میں ضرور روپے ہوں گے۔ [اڈّے] کی آمدنی کا تمام حساب نصیب میاں ہی کے پاس رہتا تھا۔ [تھیلا] نصیب میاں سے سنبھالا نہیں جاتا تھا مگر وہ اُسے سینے میں دبوچے [اندر کی ط]رف نکل گیا۔

رات کو بٹھل نے دوبارہ اوپری منزل کے اُسی کمرے میں اُن [لوگ]وں کو طلب کیا جنھیں کل رات اُس نے ایک دن کی مہلت دی تھی۔ [اس س]ے پہلے جامو، بیرو اور کانتے کے سوا وہ سب باری باری اُس [سے م]ل چکے تھے اور اپنا فیصلہ سُنا چکے تھے۔ "تم نے میری بات پر دھیان [نہیں] دیا۔" بٹھل نے تھکی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "مجھ کو صرف بارہ [آدمی] چاہئیں۔ میں نے اسی لیے گنتی میں زیادہ کو بلایا تھا کہ ہر ایک [کے] پاس گنجائش رہے۔ وہ نہیں جائے گا تو اُستاد کو اُس کا بدل مل جائے گا، [اس] کو منع کرنے میں آسانی رہے گی۔ ٹھیک ہے، تم سب جانا چاہتے [ہو تو] جا سکتے ہو۔ پر میں سب کو نہیں لے جا سکتا۔ چار ہم اِدھر بیٹھے ہیں۔ [بی]رو دادا، جامو، لاڈلا اور میں..... آٹھ کی اور ضرورت ہے۔ تو بھی ہو [س]کتے ہیں۔"

"ہم بھی تمھارے پاس بیٹھے ہیں اُستاد!" کبن خاں تند و تیز لہجے [می]ں بولا۔

"کبّن! تیرا کام اِدھر ہے۔"

"اپنے کو ساتھ لے کے ہی چلو۔" کبن کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

"اور اپنے کو بھی اُستاد!" کانتے جھنکارتی ہوئی آواز میں بولا۔

"تو بھی اِدھر رہے گا، کبن کے ساتھ۔ تم دونوں جامو کی جگہ اڈّے کی [دیک]ھ بھال کرو گے اور جس جس کو میں بولوں گا۔"

"اور اپن کو اُودر سے خواری کرنے کو مانگتا تھا!" ماچھی اشتعال [میں] بولا۔ "اپن کا نام بھی جانے والوں میں نتھی کرو۔"

ماچھی کے ساتھ اور لوگ بھی کھڑے ہو گئے اور واویلا کرنے لگے۔ [مار]ٹی زورا، چھیدا، ہلاکو، گجرو، وذیر، سبھی کا مطالبہ تھا کہ انھیں نہ چھوڑا [جائے۔] صرف سارٹے اور تڈّا چُپ رہے۔ بیرو اور جامو نے ہاتھ اُٹھا [کے] انھیں بیٹھنے اور چُپ رہنے کی تلقین کی۔ وہ بیٹھ تو گئے مگر چُپ [نہ]یں ہوئے۔

"پھر تم نے اُن کو یہاں کیوں بُلایا تھا جن کو لے جانا نہیں تھا؟" [کا]نتے کا اشارہ اپنی اور کبن خاں کی طرف تھا۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر بٹھل کا اُٹھا ہوا سر اور گھورتی ہوئی آنکھیں دیکھ کے اُس کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔

"ٹر ٹر مت کرو۔" بٹھل نے چلّا کے کہا۔ "تم کیا بولنا چاہتے ہو؟ تم کو پتہ ہے، اُدھر کیا مُنٹا ہے! ہم اُدھر نوٹنکی دیکھنے جا رہے ہیں! اُدھر مال پڑا ہے؟ تمھاری اماں کا ناچ ہو رہا ہے؟ سالے نخرا کر رہے ہو۔ مجھ سے شو بازی کرتے ہو مادریو! میں نے کیا بولا ہے، تم نے سُنا نہیں، میں نے کیا بولا ہے۔" بیرو نے اُس کے شانے پر آہستگی سے ہاتھ رکھا تو بٹھل نے اپنے ہونٹ بند کر لیے مگر وہ جیسے سُوج گئے تھے۔ پھر کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آئی۔

چند لمحے سنّاٹا رہا۔ پھر بٹھل ہی بولا۔ "مجھ کو کسی سے بیر ہے کیا! جو نہیں جا سکے گا، اُس کے کالک نہیں لگ جائے گی، اُس کا کام اِدھر ہے۔ اِدھر کس کو یہ اٹم بار دیکھنا ہے۔ چار آنکھیں، چار کان کھُلے رکھنا ہے۔ تم بولو گے تو میں لاٹری ڈال لوں گا، پر کبن خاں، کانتے اور تڈّا لاٹری میں شامل نہیں ہوں گے۔ سمجھ میں آئی! تم لوگوں سے ماں کا دودھ ابھی ابھی چھوٹا ہے کیا!"

"ابھی تمھارے سامنے یہ سب بچّہ ہی لوگ ہے اُستاد!" بیرو مسکرا کے بولا۔

"تو کہنا کیوں نہیں مانتے۔ ٹھمکا لگاتے ہیں۔"

"جیسا..... جیسا تم بولو گے، وہی ہو گا۔" کبن اُس کے پیر پکڑتے ہوئے بولا۔ "ہم کو معاف کر دو۔ جامو! اُستاد سے بول، غصہ تھوک دیں۔"

"کبن! اسوئیاں مت چبھو، بس کر۔" بٹھل نے بیزاری سے کہا۔

کبن خاں نے اُس کے پیروں سے ہاتھ ہٹا لیے۔ بیرو کے کہنے پر کانتے نے آواز دے کے نیچے سے چائے منگوائی۔ چائے آنے تک سب سَر جھکائے بیٹھے رہے اور بٹھل حقہ گڑگڑاتا رہا۔ تڈّا کھسکتے کھسکتے سب سے پیچھے چلا گیا تھا۔ اُسی لمحے سارٹے نے مجھے کُہنی ماری۔ میں نے نگاہیں اُٹھا کے دیکھا تو بیرو دادا مجھے بٹھل سے بات کرنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اُس سے کیا بات کروں۔ خود بیرو بھی اگر بٹھل سے کچھ کہتا تو وہ اُس کی بات ضرور سُنتا، وہ بیرو کا بہت لحاظ کرتا تھا مگر شاید بیرو اس موقع پر بولنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

"کیا مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے؟" میں نے دبے لہجے میں اچانک بٹھل کو مخاطب کیا۔

"نہیں!۔ اجازت مانگتا ہے تو نہیں ہے۔" بٹھل سپاٹ آواز میں بولا۔ میں نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ بٹھل نے ایک ہی گھونٹ میں پوری پیالی حلق میں انڈیل لی اور کانتے کو نیچے کے کمرے سے تھیلا لانے کا حکم دیا۔ کانتے فوراً تھیلا اُٹھا لایا۔ یہ وہی چرمی تھیلا تھا، ہینڈ بیگ کی طرح جو آج شام سیٹھ گوپی رام کا آدمی

اڈے پر دے گیا تھا۔ ٹجّل نے اُسے اپنے ہاتھوں سے کھولا۔ اس میں تمنچے رکھے ہوئے تھے۔ ٹجّل انھیں ایک ایک کر کے نکالتا رہا۔ ہم سب حیرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔

”تم کو ان پہ ذرا ہاتھ صاف کرنا ہے۔“ اُس نے سرد لہجے میں کہا۔

”اس سے تو ہاتھ بہک جائے گا اُستاد!“ کانتے منمناتے ہوئے بولا۔

”ہاں! پر کیا کرے ٹائم بدل گیا ہے۔“

”کسی تھرڈ کلاس زمانے نے اس کو بنایا ہے۔“ کپتن خاں نے تمنچا ہاتھوں پر اُچھالتے ہوئے کہا۔ ”اُستاد! میں نے اِسے چلایا ہے لیکن تمھاری قسم مزہ نہیں آیا۔“

”مزہ علی رضا لے گئے۔“ وزیر بیچ میں بولا۔ ”آسنسول میں موتی اُستاد نے بھی ایک رکھا ہوا ہے۔ آج تک ضرورت نہیں پڑی۔“

”بٹائیں ٹھُس۔“ ماچھی منہ بگاڑنے لگا۔ ”اُدھر ممبئی میں اپن کو چلانے کا تین چار چانس ملا تھا۔ ہر بار اپن کو ہاتھ میں لے کے ایسا لگا جیسے اپن سالا ٹمٹا ہو گیا ہے، لنگڑا لولا ہو گیا ہے۔ یہ اُن کے لیے ہے اُستاد جن کے ہاتھ پیر ٹھیک نہیں۔“

”پر جن کی نظر ٹھیک ہے۔“ ٹجّل نے اونچی آواز میں کہا۔ ”اس کا کھیل اُسی وقت جمتا ہے جب سامنے والے کے ہاتھ میں بھی یہ دھرا ہو، ویسے بھی کام کی چیز ہے۔ سب کے پاس یہ ہو جائے گا تو تم کیا کرو گے۔ جب تک چاقو کھولو گے، کام تمام ہو جائے گا۔“

”سب مرد، عورتیں کیسے ہو جائیں گے اُستاد!“ کپتن خان تنک کے بولا۔ ”ہاتھوں میں مہندی لگا کے یہ اور اچھا لگے گا۔ یہ سب سالا چھتری والوں کا حرامی پن ہے۔ سالے شکل سے عورت لگتے ہیں۔“ ٹجّل کو ہنسی آنے لگی۔ ”تمھی بتاؤ اُستاد! کوئی مرد سالا اتنا گورا چٹا لال انگارا ہوتا ہے جتنے یہ بندر ہوتے ہیں۔“

”لکھنؤ میں ایک گورے لونڈے پر کپتن خاں کا دل آ گیا تھا اُستاد! اسی لیے جلی جلی باتیں بول رہا ہے۔ لونڈے نے اس کو تگنی کا ناچ نچا دیا تھا۔“

”چُپ لے۔“ ٹجّل نے جامو کی کمر پہ دھپ مارتے ہوئے کہا اور میری طرف دیکھا۔ ”لاڈلے! کبھی تُو نے بھی تمنچا چلایا؟“

”ممبئی میں کرشنا جی کے ہاں اُٹھا کے دیکھا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”تیری نظر بڑی تیز ہے۔ چاقو کی لوک کی طرح اس میں بھی نال سے آنکھ بندھی رہتی ہے۔ چاقو کا نشانہ چُوک جائے تو فرصت مل جاتی ہے۔ اس کا نشانہ چُوکے تو پانی پینے کا وقت بھی نہیں ملتا۔ ذرا دکھا تو سہی ان بڑبولوں کو ہاتھ۔“

کمرے کے تمام دروازے بند تھے۔ کھڑکیاں بھی بند کر دی گئیں۔ دوسرا بلب بھی جلا دیا گیا۔ ٹجّل، کپتن خاں، کانتے، پیرو، ماچھی، وزیر تمنچا چلانا خوب جانتے تھے۔ ٹجّل نے اس کا میکنزم سب کو سمجھایا۔ مجھے پہلے ہی کرشنا جی سے اور مدراس میں ایس پی تنسکلا کی زبانی تھوڑی بہت ہو گئی تھی۔ جیل میں بھی میں نے اس کے متعلق بہت سی باتیں سُنی تھیں۔ میکنزم ہی کیا تھا۔ چھ گولیاں بھر کے چرخی گھمانی اور لبلبا جیسا کھٹکا پڑتا تھا۔ ٹجّل نے اپنی جگہ سے ہٹ کے چائے کی خالی پیالی ایک طاق میں رکھ دی اور مجھے تمنچا دے کے دُور جانے کا اشارہ کیا۔ کمرہ خاصا تھا۔ نشانہ لینا کچھ ایسا مشکل نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے چاقو اُچھالنے انداز سے تمنچا ایک طرف رکھا اور ہر طرح جانچ کے دیکھ لیا۔ میری ساری توجہ پیالی پر مرکوز تھی۔ سانس سینے میں روک کے میں نے ہاتھ منجمد کر لیا اور جھجکتے جھجکتے کھٹکا دبا دیا۔ میں نے اپنی آنکھیں فوراً لی تھیں۔ اسی آن تیز چھناکا ہوا۔ میری سانس چلنے لگی۔ پیالی کرچی ہو گئی تھی۔ سب مجھ سے لپٹ گئے۔ ٹجّل نے پھر آدھا انچ کے قریب کا پلاستر اپنے چاقو کی نوک سے اُدھیڑ دیا اور مجھ سے بولا۔ ”لاڈلے! گہرا کر دے۔“

پیالی بڑی تھی اس لیے نشانہ بنانا آسان تھا۔ دوسری بار محتاط ہونا پڑا۔ وہ ایک چھوٹا دائرہ تھا، انگور کے مانند۔ چاقو ہوتا تو ہاتھ چُوکنے کا امکان نہیں تھا۔ کمرے میں روشنی بھی اتنی زیادہ نہیں لیکن نشان زدہ جگہ بہرحال مجھے نظر آ رہی تھی۔ میں نے تمنچا سیدھا طاق کے عین مقابل کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے کچھ جلدی ہو گئی۔ مجھے ابھی تعین کرنا چاہیے تھا۔ کھٹکا دباتے ہی طاق میں دھول سی اُڑ گئی۔ گولی طاق ہی میں لگی تھی مگر اصل نشانے سے نیچے تقریباً ایک پورے فاصلے پر۔ اس سے پہلے کہ ٹجّل مجھے کوئی ہدایت دیتا، میں نے تیسری چلانے کے لیے چرخی گھمائی۔ سب کنارے ہو گئے۔ پہلی گولی سے غلطی کا کسی قدر اندازہ ہو گیا تھا۔ تمنچا پھر اُسی جگہ رکھ کے میں نے نال رُخ پہلے سے کچھ اونچا کیا۔ دھماکا ہوا تو ٹجّل طاق کی طرف دوڑا کے پیچھے پیرو اور جامو بھی تھے۔ پیرو نے تیزی سے لوٹ کے لگا لیا۔ پھر میں نے سارا تمنچا اُسی نشانے پہ خالی کر دیا اور گولی کی اُس کی سیدھ اور نال اور نگاہ کا توازن کچھ کچھ میری سمجھ میں آیا اور کا پتہ چلا کہ اصل تو چاقو کی طرح ہاتھ اور نظر کا اعتماد ہے۔ ہاتھ ہو یا نظر متذبذب ہو تو نشانہ ٹھیک لگ ہی نہیں سکتا۔ اتفاق سے لگ تو لگ جائے۔ ٹجّل نے کبھی مجھ سے کہا تھا کہ ہاتھ سے دیکھنے اور سُننے ڈال سچا نشانہ تبھی بنتا ہے، اُس نے کہا تھا کہ ہاتھ کو سمجھایا جائے نظر آنے لگتا ہے اور وہ سُننے بھی لگتا ہے، اُس کا مطلب ہاتھ اور توازن سے تھا۔ ہاتھ تبھی اُٹھے جب نگاہ اجازت دے اور کان فاصلے تعین کر سکیں۔ ہاتھ سے سُننے اور دیکھنے کی قوت پیدا کرنے کے لیے ہاتھ کی جھجک نچوڑنی پڑتی ہے۔ میں نے دو غلطیاں کیں، دوسری اور

مرتبہ۔ پانچویں بار تجربے کی غلطی تھی۔ نشانہ خطا ہو جانے کا امکان پچاس فی صد تھا مگر چھ گولیاں خرچ کرنے کے بعد میرا ہاتھ بڑی حد تک تمنچے پر رواں ہو گیا یا ٹجّل کے بقول ہتھیار پکڑ میں آ گیا۔

میں دوبارہ گولیاں بھرنا چاہتا تھا لیکن ٹجّل نے مجھے ہٹا دیا۔ میرے بعد جامو، سارنگے، مارٹی، زورا، ہلاکو، منڈا، گجرو، بلٹو، جینی وغیرہ نے نشانے باندھنے شروع کیے۔ اُن میں سے کئی بندوق چلا چکے تھے۔ چائے کی بہت سی پیالیاں ٹوٹ گئیں۔ کسی کا نشانہ چُوکا، کسی نے پہلے ہی تلے میں پیالی توڑ دی۔ مگر ان سب کے لیے یہ کام کچھ ایسا دشوار ثابت نہیں ہوا۔ ایک دو غلطیوں کے بعد سبھی ٹھیک ٹھیک جگہ گولیاں مارنے لگے۔ ہر ایک نے ایک ایک تمنچا خالی کیا۔ البتہ دوسرے نشانے پر اُن کا ہاتھ خاصا بہکا۔ منڈے نے چھ گولیوں میں چار گولیاں ٹھیک چلا کے سب کو متحیر کر دیا۔ معلوم ہوتا تھا، منڈا پہلے سے تمنچا چلانا جانتا ہے، جان بوجھ کر چُپ بیٹھا تھا۔ مارٹی نے تردید کی کہ منڈے نے آج پہلی ہی بار اسے ہاتھ لگایا ہے۔ ماچھی منڈے کو کندھے پر اُٹھا کے سارے کمرے میں گھومنے لگا۔

کوئی دو گھنٹے تک بند کمرے میں گولیاں گونجتی رہیں۔ ٹجّل، پیرو، ماچھی، کانتے اور وزیر، اُن لوگوں کو تمنچا چلانا بتاتے رہے جنھوں نے اُسے پہلے استعمال نہیں کیا تھا۔ خود پیرو اور ماچھی نے بھی نشانے لیے۔ اُن کے ہاتھ نے کوئی غلطی نہیں کی۔ کسی نے رات کا کھانا نہیں کھایا۔ کانتے نے تمام تمنچے واپس لے کے دوبارہ انھیں تھیلے میں رکھ دیا اور ٹجّل کے اُٹھ جانے پر کھانے کے لیے ہم سب نیچے آ کے چاندنی والے کمرے میں بیٹھ گئے۔ وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ بارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔

جیسا کہ میرا اندازہ تھا، ٹجّل کھانا کھاتے ہی پیرو اور جامو کے ساتھ اُوپر فلیٹ میں چلا گیا۔ دوسری صبح وہ پھر اڈے پر موجود نہیں تھا لیکن جلد واپس آ گیا اور ہم سب کو کلکتے سے کوئی بیس پچیس میل دور ایک بڑے باغ میں لے گیا۔ تمنچوں کا تھیلا اُس کے ساتھ تھا۔ باغ کے چوکی دار سے تین بندوقیں بھی ہمیں وہیں مل گئیں اور اسی کے ذریعے معلوم ہوا کہ باغ کلکتے کے ایک رئیس گرو دیال کی ملکیت ہے۔ وہیں ہمارے لیے دوپہر کے کھانے کا انتظام تھا۔ ٹجّل زیادہ دیر نہیں ٹھیرا۔ جامو کو چھوڑ کے وہ پیرو کے ساتھ اُسی وقت لوٹ گیا تھا۔ ہم سب نے جامو سے کچھ جاننے کی کُرید کی تو اُس نے صاف سر ہلا دیا۔ جامو کی یہی عادت تھی۔ وہ درمیان کی بات کبھی نہیں کرتا تھا یا تو صاف منع کر دیتا یا صاف اقرار کر لیتا تھا۔ ایک بار منع کر دے تو لاکھ واسطے دیے جائیں، وہ زبان کھول کے نہیں دیتا تھا۔

سہ پہر تک کانتے، ماچھی اور وزیر ہم سب کو نشانے کی مشق کراتے رہے۔ میں نے اُس دن پہلی مرتبہ بندوق چلا کے دیکھی اور وہ مجھے تمنچے سے زیادہ سہل لگی۔ ٹجّل واپس نہیں ہوا البتہ شام کو پانچ بجے موٹریں ہمیں اڈے پر لے جانے کے لیے آ گئی تھیں۔ ٹجّل اور پیرو ہمیں وہاں بھی دکھائی نہیں دیے۔ اندھیرا ہونے کے بعد نصیب میاں اور ٹلو کی آوازوں سے اڈے پر اُن کی آمد کی دھمک سُنائی دی۔ سب بڑے کمرے کے فرش پر ستا رہے تھے لیکن وہ ہمارے درمیان اتنی دیر ہی رہے جتنی دیر میں کھانا کھایا جا سکتا تھا۔ پھر اُوپر فلیٹ میں جا کے بند ہو گئے۔ چلتے چلتے ٹجّل نے کانتے کو بُلا کے کہہ دیا تھا کہ وہ ہمیں کہیں جا کے گھما لائے۔ پیارے کا مشورہ دریا کے کنارے چلنے کا تھا کہ چاندنی رات میں کشتی کی سیر کریں گے مگر ماچھی نے ناچ دیکھنے کی ضد کی تو سب اُس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ میں نے تھکن کا عذر کر کے اڈے ہی پہ ٹھیرے رہنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ماچھی، زورا، چھیدا اور مارٹی نے میرے بغیر کہیں جانے سے انکار کر دیا۔ کانتے نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ لاڈلا نہیں رُک جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ پیرو اور جامو ہوتے تو وہ شاید اُن کی بات مان لیتے لیکن وہ اَڑ گئے۔ پھر مجھے بھی اُن کے ساتھ چلنا پڑا۔ اڈے سے باہر سڑک پر کانتے میرے قریب آ کے سرگوشی میں بولا۔ ”لاڈلے! جی کو باندھ کے“

میں نے اُس سے کچھ نہیں کہا کہ وہاں جانے میں مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ وہاں میری ایک بہن ناچتی رہی ہے، میرا ایک بھائی پلتا رہا ہے۔ اور دُور پرے پتہ نہیں کیا بیتی۔ میں تو اسی ڈر سے وہاں نہیں جانا چاہتا تھا کہ فمی کی طرح کوئی اور نہ مل جائے۔ مجھے یہ خوف بھی تھا اور میری نظریں ہر وقت، ہر طرف اُن کے لیے بھٹکتی بھی رہتی تھیں۔ وہ کہیں بھی ملیں، کسی حال میں، کسی طور اُن کی صورت نظر آ جائے۔ یہی بہت ہے۔ میری قسمت میں اُن سے انھی جگہوں پر ملنا رہ گیا تھا تو یہی سہی۔ اِس سے میرا اُن کا رشتہ تو نہیں ٹوٹ جاتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم، میں نے وہاں جانے سے کیوں احتراز کیا تھا۔ فمی کی مثال میرے سامنے تھی۔ مجھے تو ہر ایسی جگہ جانا چاہیے تھا جہاں بے آسرا لوگوں کو کوئی ٹھکانا ملتا ہو۔ اناتھ آشرم، یتیم خانے، فٹ پاتھ، بالا خانے۔ کون اپنی مرضی سے وہاں جاتا ہے۔ کوئی چارہ نہیں رہتا، تبھی لوگ جاتے ہیں اور جو لوگ وہاں ہوتے ہیں، کون جانے کہاں کہاں سے آتے ہیں۔ انھیں زندہ رہنے کے لیے ایک چھت تو مل جاتی ہے اور لیں ایک آس تو بندھی رہتی ہے کہ شاید کبھی دن پھر جائیں، اُن کے بچھڑے ہوئے مل جائیں۔ یہاں آ کے اُن کے رنگ، ناک نقشہ، اُن کے دل نہیں بدل جاتے۔ خانم اور چمپا بھی اِنھی جگہوں سے آئی تھیں۔ انھیں چھت تو مل گئی تھی لیکن گھر نہیں ملا تھا جس کے دروازے پر مکین کی حکومت ہو، راہ گیروں کی نہیں۔ لوگ نگاہیں جھکا کے اندر آیا کریں، سر اُٹھا کے نہیں۔ فمی بھی یہی چاہتی ہوگی کہ کاش وہ کچھ دیر صبر کرتی۔ میں اُسے کہاں نہیں جاتا۔ وہ دیکھتی تو سہی، میں اُسے سینے سے لگا کے زرّیں کی حویلی میں لاتا۔ مگر نہ مجھے ہوش رہا، نہ اُسے۔

موسم خنک تھا، جب ہم چلے تھے تو آسمان صاف تھا۔ اب گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ابھی رات کا ابتدائی

پہر ڈھلے لوگوں کا آنا شروع ہوا تھا۔ تمام گلیاں روشنیوں سے جگ مگا رہی تھیں۔ چائے خانوں، پان، پھول، خوشبو اور دوسری دکانوں میں بڑے بڑے بلب یا گیس کے ہنڈے جل رہے تھے اور بالا خانوں کی کھڑکیوں، چھجوں، چبوتروں پر رنگ رنگ کے کپڑے پہنے، کاجل، سرخی، زیور، پھولوں سے آراستہ لڑکیاں اور عورتیں یا تو بیٹھی تھیں یا کھڑی تھیں کہیں کہیں ریشمی پردوں کی آڑ میں، کہیں چلمن سے جھانکتی ہوئی۔ میں نے بتھل کے ساتھ ہندوستان کا ایک بڑا حصہ دیکھا تھا اور ہم ہر بستی میں ان علاقوں سے ضرور گزرتے تھے۔ یہ علاقے ہر جگہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ دن بھر خاک اُڑتی رہتی ہے، سرِ شام چراغ جل اُٹھتے ہیں۔ دن جیسے یہاں نکلتا ہی نہیں ہے، جیسے جیسے اندھیرا بڑھتا جاتا، گلیاں جاگنے لگتیں اور دروازے کھل جاتے۔ ہر جگہ یہی ریت تھی۔

ہم سب نہا دھو کے اور کپڑے بدل کے آئے تھے۔ صرف مارٹی اور ماچھی پتلون پہنے ہوئے تھے، باقی سب کرتوں، پاجاموں اور واسکٹوں میں ملبوس تھے۔ میں نے وہ کرتا پہلی بار پہنا تھا جو زرّیں نے اپنے ہاتھ سے تُرپا تھا، سفید ململ اور بند گلے کا۔ مونڈھوں پر بیل کڑھی ہوئی تھی۔ زرّیں نے میرے سامان میں بہت سے کپڑے رکھ دیے تھے۔ شیروانی بھی تھی، سلیم شاہی جوتیاں بھی۔ گلیوں میں مختلف اڈّوں کے کئی آدمی ہمیں مل گئے انھوں نے اس وقت تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا جب تک مٹھائی کی دکان پر ہمیں چم چم نہ کھلا دی اور دودھ کی دکان پر لمبے لمبے گلاس نہ پلوا دیے۔ گلیوں میں اور بھی بہت سے لوگ کانتے، سارتے، ہلاکو، چینی وغیرہ کو جانتے تھے۔ بالاخانوں سے متعلق آدمیوں کی نظر جیسے ہی کانتے پر پڑتی، وہ لپکتے ہوئے اس کی طرف آتے اور پوچھتے "کدھر چلنا ہے؟" وہ عورتوں کے نام بھی گنانے لگتے۔ کوئی کہتا، "کانتے استاد! آج کل خورشید بیگم کا ستارہ چمک رہا ہے۔" کوئی کہتا، "ناہید جب سے رام پور سے لوٹی ہے، گلے سے رس ٹپکتا ہے۔" کسی کا کہنا تھا کہ بنگال کا جادو دیکھنا ہو تو ہم اس کے ساتھ چلیں۔ انھوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہمارے ساتھ مہمان ہیں۔ مجھے بھی وہ مہمان ہی سمجھے ہوں گے اسی لیے ان کا اصرار بڑھ گیا تھا۔ کانتے ان سب کو ٹالتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ گلی کے نکڑ پر بتھل کو گلوریاں کھلانے والا دبلا پتلا پنواڑی چھٹن صاحب دُبلیا اوڑھے بیٹھا تھا۔ کانتے کو دور سے دیکھ کے اس نے آنکھ پر ہاتھ کا سایہ کر لیا اور دیدے مٹکانے لگا "استاد! آج بھی نہیں آئے۔" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

"آ گئے ہیں، پر کام تھا۔" کانتے نے مختصر جواب دیا۔

"جاکے کہنا، اتنا ترسانا اچھا نہیں ہے۔" وہ آہیں بھر کے بولا "میری طرف سے سرکار کو گلوریاں پیش کر دینا اور کہنا کہ شمع پردہ کر لے تو پروانے جلنا بند نہیں کر دیتے۔ کہنا کہ ہم بھی بہت دیوانے ہیں۔ ہم بھی تمھارے سر کی قسم، ایک دن۔۔۔"

کانتے نے جھٹ اُس کا منہ بند کر دیا "نا نا، چھٹن صاحب! ابھی سے ایسی باتیں! ابھی تو تمھارے سپنوں کے دن ہیں۔ تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ اُدھر اُس چھمک چھلّو شرفن کا کیا ہو گا؟"

"ہائے کانتے جی! کس کا نام لے دیا۔" وہ لہرا کے بولا "تھی جیتا رکھے ہوئے ہو۔ تمھارے اندر وہی استاد بادشاہ کی خوبو ہے۔" اس نے کانتے کا گال چوم لیا۔ گلوریاں کھلانے سے پہلے اس نے ہمارے کپڑوں پر خوشبو لگائی۔ جب میری باری آئی تو وہ پلکیں پٹ پٹانے لگا۔ دن بہت ہو گئے تھے۔ وہ مجھے نہیں پہچانا تھا۔ جیسے ہی اُسے میرا چہرہ یاد آیا، وہ اُچھل گیا اور دکان سے اُتر کے اس نے مجھے تین فرشی سلام کیے "آہا، لاڈلے نواب! میں بھی تو کہوں، یہ بازار کا رنگ آج بدلا بدلا سا کیوں ہے۔ اب کھلا کہ سب شہزادے کے دم قدم کی رونق ہے۔ سرکار! کہاں چلے گئے تھے؟"

"چھٹن صاحب! آپ خیریت سے ہیں؟" میں نے اُس سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

"اپنی کیا پوچھتے ہیں۔ انتظار میں کٹ ہی جاتی ہے۔"

"کس کا انتظار ہے آپ کو؟"

"لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے۔ یہ تم بھی خوب ہے صیّاد اپنے صید سے پوچھتا ہے کہ اُسے کیا غم ہے۔"

چھٹن صاحب کا لب و لہجہ وہی تھا۔ اس کی باتیں ختم نہیں ہوتی تھیں۔ کانتے نے مجھے کھینچ کے ان سے دور کیا۔ چھٹن صاحب نے ہم سب کے گلوں میں ہار ڈالے۔ کانوں میں عطر کی پھریریاں اٹکائیں اور اپنے ہاتھ سے سب کو گلوریاں کھلائیں۔ بتھل اور نصیب میاں کے لیے کیلے کے پتّوں میں گلوریاں الگ باندھ کے دیں۔

اتنے لوگوں کا کسی ایک بالاخانے پر اکٹھا جانا مناسب نہیں تھا۔ کانتے نے ہمیں دو ٹولیوں میں تقسیم کر دیا۔ سارتے، کپتن خاں، وزیر، ہلاکو اور چینی وغیرہ کو لے کر الگ ہو گیا۔ کانتے بمبئی سے آنے والوں کے ساتھ رہا۔ بہت سے دروازے بند تھے اور اندر سے ناچنے گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگ جھریوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم کئی گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک نسبتاً خاموش گلی میں داخل ہوئے۔ یہاں بڑے اور اونچے مکانات تھے۔ ایک جگہ اچانک میرے منہ پر گلاب کا پھول آ کے لگا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ محض اتفاق ہے لیکن نشانہ ایسا صاف تھا کہ میری نظریں اِدھر اُدھر منڈلانے لگیں۔ بائیں طرف والے مکان کی پہلی منزل پر کھڑکی میں ایک سرو قد، خوب صورت لڑکی بنی سنوری کھڑی تھی۔ وہ بھی میری طرح گھبرا گئی مگر اُس نے سنبھل کے جلدی سے مجھے آداب کیا۔ میرے ہاتھ بھی غیر ارادی طور پر اُسے جواب دینے کے لیے اُٹھ گئے۔ دوسرے ہی لمحے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے اُسے

پہچان لیا تھا، وہ شہ پارہ تھی۔ کوئی ڈیڑھ سال پہلے جب میں بتھل اور اُس کے دوست آسنسول کے اُستاد موتی، موجملار کے اڈّے کے گھوشی اور کانتے کے ساتھ یہاں آیا تھا تو میں نے شہ پارہ کو دیکھا تھا مگر یہ وہ مکان نہیں تھا۔ گلی بھی دوسری تھی۔ "راجا اُستاد!" مارٹی نے زور سے میرا بازو پکڑ لیا۔ "اپن نے کیا دیکھا؟"

"بے پر کا پری دیکھا۔" کانتے نے مارٹی کی مبہوت آنکھوں کے سامنے انگلیاں نچاتے ہوئے کہا "آسمان سے نہیں اُترا تھا۔"

ہم سب وہیں ٹھیر گئے۔ کھڑکی پر چند ثانیوں کے لیے مارٹی کے کہنے کے مطابق مختلف رنگوں کا ایک شعلہ سا بھڑکا تھا۔ شہ پارہ کو میری صورت یاد تھی۔ یقیناً اس نے جان کے پھول پھینکا ہو گا۔ میں آگے بڑھنا چاہتا تھا مگر مارٹی نے مجھے روک لیا "راجا اُستاد!" وہ لجاجت سے بولا "اُسی کے پاس چلو۔"

"وہ اب اِدھر گانا نہیں گاتی۔" کانتے نے سرسری انداز میں کہا۔

"تو پھر اِدھر کیوں ہے؟"

"اِدھر ہی ہے۔ اب وہ صرف ایک خاص آدمی کے لیے گاتی ہے۔"

"اپن کے راجا سے زیادہ خاص آدمی اور کون ہوئیں گا۔ تم نے دیکھا نئیں۔ پرنسیز نے راجا کے اوپر پھول پھینکا تھا۔"

"پھینکا تھا۔ پر اُس کے لیے گانا بند ہے۔ آگے چل ماسٹر! آگے تیری آنکھ کے لیے اور سُرمہ ہے۔"

"نہیں کانتے! ایک دو مومینٹ اور ٹھیرو۔ پرہیپس پرنسیز مے رِٹرن۔"

"ابے کیا گِٹ پِٹ کرتا ہے تخنیجو!" کانتے جھلّا کے بولا۔

"آئی ایم ساری کانتے استاد، سالا زبان سِلپ ہو جاتا ہے۔"

کانتے اُسے دھکاتے ہوئے چند قدم بڑھ گیا تھا۔ یک بارگی ہمارے بائیں طرف کے مکان کا دروازہ تیزی سے کھلا اور شہ پارہ نمودار ہوئی۔ وہ گلی میں آتے ہوئے جھجکی۔ کانتے خود ہی جھپٹ کے اُس کے پاس پہنچ گیا۔ پیچھے پیچھے ہم بھی گئے۔

"شپارے! کیا بات ہے؟" کانتے نے کسی قدر حیرانی سے پوچھا۔

"لاڈلے میاں کب آئے؟" شہ پارہ نے مترنم آواز میں پوچھا۔

"پرسوں!" کانتے نے میری جانب دیکھتے ہوئے ہچکچا کے جواب دیا۔

"اندر آئیے۔" وہ مضطرب لہجے میں بولی۔

"اجازت ہے؟" کانتے نے سرخم کر کے پوچھا۔

"آپ کا مزاج کیسا ہے؟" کانتے کو جواب دینے کے بجائے وہ جھلملاتی آنکھوں کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"میں۔۔۔ میں اچھا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"اِدھر سے گزر رہے تھے؟"

"مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ تم اب یہاں رہتی ہو۔"

"کانتے جی کو تو معلوم تھا، آپ نے پوچھا ہوتا تو بتا دیتے۔"

"میں بتا دیتا لیکن مجھے اور باتوں کا بھی پتہ تھا۔" کانتے بولا۔

"آپ کو کون روک سکتا ہے۔"

"روک تو کوئی نہیں سکتا پر تمھارا خیال آ جاتا تھا شپارے! اور تم سے زیادہ کریمن بیگم کا۔ وہ بہت دُہائیاں دیتی ہے۔"

"آپ نے بتایا نہیں کہ میں نے کتنی بار پوچھا ہے؟"

"بتا کے کیا کرتا، تم نے تو پہرے بٹھا لیے ہیں۔"

"شرمندہ کرتے ہیں۔ اب ایسا بھی کیا، کیا ہم اپنی مرضی سے ایک گھڑی کسی سے مل بھی نہیں سکتے۔"

"کریمن بیگم سے پوچھا ہوتا۔ اُس دن انھوں نے ہمیں لوٹا دیا تھا۔ ہم لوٹ گئے۔ غصہ تو بہت آیا پر کریمن بیگم کا کچھ دھیان آ گیا۔"

"ارے! اندر چلیے۔ میں بھی کتنی باؤلی ہوں، اتنی دیر سے آپ لوگوں کو دروازے پر کھڑا کیے ہوئے ہوں۔ اندر آئیے۔ آئیے نا۔"

کانتے نے اندر قدم نہیں رکھا۔ اسی دوران شہ پارہ کے پیچھے کریمن آ کے کھڑی ہو گئی۔ اُس نے کانتے کو اشاروں سے سلام کیا اور ہم سب کو مضطرب انداز میں دیکھنے لگی۔ شہ پارہ کو اُس کی موجودی کا احساس نہیں ہوا تھا "پھر کبھی آئیں گے۔" کانتے نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یعنی دروازے پر آ کے لوٹ جائیں گے؟" وہ مایوسی سے بولی۔

"جی تو نہیں چاہتا پر پھر۔۔۔ پھر سہی۔"

"کیوں؟ آئیے نا۔"

"کانتے جی کوئی غیر تھوڑی ہیں شپارے! پھر آ جائیں گے۔" پیچھے سے کریمن بیگم کی نرم آواز اُبھری۔ شہ پارہ ایک لمحے کے لیے بدحواس سی ہو گئی۔ کریمن کہہ رہی تھی "تمھیں یاد نہیں کیا وقت ہو رہا ہے؟"

"مجھے یاد ہے مگر، مگر آپا جانی! یہ ہمارے مہمان ہیں۔"

"بے شک، سر آنکھوں پر۔" کریمن نے شائستہ لہجے میں کہا "زہے نصیب! ہمارے دروازے پر ان کا آنا عزت کا باعث ہے مگر تم۔۔۔"

"میں نے شپارے کو بول دیا ہے کریمن بیگم!" کانتے زہرخند سے بولا "ہم کو پتہ ہے یہ کون سا وقت ہے۔ تم کو زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں"

"کانتے بابو! بخدا غلط مت سمجھنا۔"

"انھیں میں نے ہی بُلایا ہے آپا جانی! کانتے جی کے ساتھ مہمان ہیں۔ تم بھول گئیں۔ یہ لاڈلے میاں ہیں۔"

کریمن نے مجھے ٹٹولتی نگاہوں سے دیکھا "ہاں کچھ چہرہ تو یاد آ رہا ہے"

"لاڈلے میاں بہت دنوں بعد یہاں آئے ہیں۔ آئیے، آپ لوگ اندر آئیے۔ آپا جانی! ذرا فردوس کو بُلا کے کہیے کہ مہمان آئے ہیں۔" کریمن کی پیشانی پر لکیریں پڑ گئیں "میں گاؤں گی نہیں" شہ پارہ نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا "آپ لوگ آتے کیوں نہیں؟"

"نہیں شپارے!" کانتے تلخی سے بولا۔ "پھر کسی وقت۔"
"اس وقت کیا بات ہے؟"
"آجاؤ کانتے جی! نہیں آئے تو شپارے اُداس ہو جائے گی۔ کچھ دیر کے لیے شپارے کی خاطر ٹھہر جاؤ۔" مجھے حیرت ہوئی مگر یہ کرمن بیگم ہی کی آواز تھی۔ شہ پارہ کے رخسار دمکنے لگے۔

کانتے اندر جانے کے لیے آمادہ نہیں تھا لیکن شپارے اپنا ہاتھ اُس کی جانب بڑھا چکی تھی۔ کانتے نے اُس کا ہاتھ تھاما نہیں مگر اندر داخل ہو گیا۔ ہم سب ایک مرصّع کمرے کے فرش پر آ کے بیٹھ گئے۔ وہاں بیش قیمت قالین بچھا ہوا تھا۔ چھت خاصی اُونچی تھی اور درمیان میں ایک بڑا جھاڑ لٹک رہا تھا۔ جتنے قمقمے تھے، سبھی پر قندیلیں روشن تھیں۔ یہ مکان شہ پارہ کے پہلے مکان سے بہت بڑا تھا اور باہر سے دیکھ کے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اندر سے اتنا صاف ستھرا اور سجا ہوا ہو گا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم کسی نواب کے دیوان خانے میں آ گئے ہوں۔ کمرے کے چاروں طرف کٹی ہوئی جالیوں کی ایک دیوار تھی جس پر چھت تک قریب قریب محرابیں بنی ہوئی تھیں اور ان سب پر ریشمی پردے ڈوریوں سے بندھے تھے۔ محرابوں کے بعد ایک کمرے کے اطراف گلی جیسا راستہ، راستے کے اُس طرف بیل بوٹے کڑھی ہوئی دیوار اور نیلے، پیلے، سُرخ اور سبز شیشوں کی کھڑکیاں۔ اندر مکان سے آنے کے لیے ایک بڑا دروازہ تھا۔ سارا کمرہ روشن تھا۔ ہمارے بیٹھنے کے بعد شہ پارہ پہلے تو اِدھر اُدھر بھاگی بھاگی پھرتی رہی۔ کبھی اندر جاتی، کبھی باہر۔ پھر وہ ہمارے مقابل آ کے بیٹھ گئی۔ وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اُس کے کانوں میں آویزے جھول رہے تھے۔ ناک میں ایک بڑی سی نتھ سُرخ دھاگے سے کان تک بندھی ہوئی تھی۔ ماتھے پر جھومر، گلے میں گلوبند، کلائیوں میں سنہری چوڑیاں، سر پہ گلابی دوپٹا، چوڑی دار پاجامہ اور گھیردار جمپر۔ باقی سارے کپڑے کیسری رنگ کے تھے۔ ڈیڑھ سال کی مدت میں وہ پہلے سے کچھ اور حسین نظر آتی تھی مگر اُس کے چہرے پر وہی معصومیت تھی جو میں نے پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ کرمن بیگم اندر چلی گئی تھی۔ شہ پارہ کے نازک ہونٹ بے چین سے تھے۔ "جب بھی پوچھا، یہی معلوم ہوا کہ آپ ابھی نہیں آئے۔" وہ اُمڈی ہوئی آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔
"میں بہت دُور دُور گیا تھا۔" میں نے آہستگی سے کہا۔
"کہاں کہاں؟" وہ اشتیاق سے بولی۔
"شہروں شہروں۔"
"کون کون سے شہر؟"
"ایک جگہ ہو تو بتاؤں۔ مجھے اب اُن کے نام بھی یاد نہیں رہے ہوں گے۔"
"حیدرآباد بھی جانا ہوا؟"
"ہاں!" میں نے چونک کے کہا لیکن اِس کی وجہ فوراً میری سمجھ میں آ گئی کہ کرمن شہ پارہ کو حیدرآباد ہی سے لائی تھی۔ "وہاں تو کئی دن رہے۔" میں نے جواب دیا۔
"اور وہاں... وہاں بھی جانا ہوا؟" وہ تجسس سے بولی۔
"کہاں؟" میں نے متردد آواز میں پوچھا۔
"وہیں، محبوب کی مہندی؟" وہ لفظ چبا کے بولی۔
"وہاں بھی گئے تھے مگر کیوں؟ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"
"یوں ہی۔" وہ خوابیدہ لہجے میں بولی۔ "حیدرآباد بہت یاد آتا ہے۔"
"بہت خوب صورت شہر ہے۔ چار مینار، مکہ مسجد، قطب شاہی مزارات، گول کنڈے کا قلعہ، فلک نما، نہ جانے کیا کیا۔ دکانیں، عمارتیں، بازار سبھی بہت اچھے ہیں۔"
"وہاں آپ کس کس سے ملے؟"
مجھے شبہ ہوا کہ کہیں وہ خانم اور جہاں گیر کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتی۔ ممکن ہے اسی لیے مجھ سے کُرید کے پوچھ رہی ہو مگر وہ کیسے جان سکتی تھی۔ "ہم تو یوں ہی سرسری گئے تھے، بس گئے اور آ گئے۔" میں نے کسمسا کے کہا۔
"میں نے سوچا، شاید کہیں میرا ذکر ہوا ہو۔"
"اتنا موقع نہیں ملا۔ تم وہاں کس کس کو جانتی تھیں؟"
"بہتوں کو۔ وہاں دن بہت گزارے ہیں۔ بہت لوگ جانتے تھے۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔
میرے دل میں آیا، خانم کا نام لے کے دیکھوں لیکن اگر اُسے کچھ بھی معلوم تھا، حیدرآباد سے کسی آتے جاتے کی زبانی تو شاید وہ سمجھ جاتی۔ حیدرآباد میں شاہ جی کا واقعہ بازار کے سارے لوگوں کو معلوم تھا۔ بعد میں انھیں یہ بھی پتہ چل گیا ہو گا کہ خانم کن لوگوں کے ساتھ گئی ہے۔ خانم سے وہاں سبھی واقف تھے۔ حیدرآباد اور کلکتے کے درمیان لوگ سفر کرتے رہتے ہوں گے۔ ضرور کرمن کے ہاں آنے والے لوگوں نے خانم کا ذکر کیا ہو گا اور انھوں نے ہمارے حلیے بھی بتائے ہوں گے کہ ایسے ایسے دو آدمی خانم کے ہاں آ کے ٹھہرے تھے۔ ہمارے نکلنے کے بعد وہاں نہ جانے کیسی کیسی باتیں مشہور ہو گئی ہوں گی۔ ممکن ہے شہ پارہ جہاں گیر کے بارے میں بھی جانتی ہو۔ "ہم وہاں ایک کام سے گئے تھے۔ ایک شخص کی تلاش تھی۔"
"مل گیا وہ؟" شہ پارہ سرگوشی میں بولی۔
"ہاں مل تو گیا۔"
"شپارے! اور بھی لوگ بیٹھے ہیں۔" کانتے نے مسکرا کے اُسے ٹوکا۔
"ارے۔" وہ شرما گئی۔ "میں نے پہلے کسی کو دیکھا نہیں تھا اس لیے۔"
"ہم کو تو دیکھا تھا۔"
"آپ تو نہیں رہتے ہیں۔" اُس نے نگاہیں چُراتے ہوئے کہا۔

"تو اپنی بات ختم ہو گئی؟"
"آپ کی بات اپنی جگہ ہے۔"
"کس جگہ ہے؟"
"اچھی ہی جگہ ہے۔" وہ دُہری ہو کے بولی۔
"چلو، آج رات اپنے کو ٹھیک نیند آ جاوے گی۔"
"آپ نے بتایا ہی نہیں کہ آپ کے ساتھ اور کون صاحب ہیں؟" وہ تیزی سے بولی اور کانتے کی طرف رُخ کر کے بیٹھ گئی۔
"صاحب کیا، یہ مسٹر ماچھی ہے، بمبئی سے آیا ہے، نمبر ون ہے۔"
اُس نے ماچھی کو سلام کیا۔ ماچھی پریشانی سے پہلو بدلنے لگا۔ کانتے نے باری باری سبھی کا نام لیا اور شہ پارہ نے اُن سب کو زیرِ لب تبسم سے سلام کیا۔
"ابھی اپن ایک بات بولنا چاہتا ہے۔" ماچھی کی زبان اٹکنے لگی۔
"کہیے۔" وہ گنگناتی آواز میں بولی۔
"اپن کیا بولے۔ سالا تمھارے سامنے کون بول سکتا ہے۔ اپن ساری دُنیا گھوما پھرا پر اپن نے تم جیسا رانی نئیں دیکھا۔"
"رُک کے ماچھی!" کانتے نے ہانک لگائی۔
"رُک کے ہی بولتا ہوں کانتے دادا!" ماچھی کی آواز دھڑک رہی تھی۔
شہ پارہ نظریں نیچی کیے اُن کی باتیں سُنتی رہی۔ بالا خانے کی ایک لڑکی فردوس نے ہمارے درمیان کھانے پینے کا بہت سا سامان لا کے رکھ دیا۔ شہ پارہ کے اصرار پر ہمیں کچھ نہ کچھ کھانا پڑ گیا۔ فنجانوں میں بے دودھ کی چائے تھی۔ شہ پارہ اپنے ہاتھوں سے پھل تراشتی رہی۔ اُس کی بڑی بڑی پلکیں آنکھوں پر پردہ کیے ہوئے تھیں۔ جب وہ یہ پردہ ہٹاتی تبھی اُس کی گہری، بھیگی ہوئی سیاہ آنکھیں نظر آتیں۔ ماچھی ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ رہا تھا۔ زورا اور چھیدا ابھی گُم سُم سے تھے۔ اس اثنا میں کرمن کئی مرتبہ اندر آئی، کچھ دیر بیٹھی اور چلی گئی۔ گلوری منہ میں رکھتے ہی کانتے ایک دم اُٹھ گیا۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔
"یہ کیا ہوا؟ آپ کہاں چلے؟" شہ پارہ حیرانی سے بولی۔ "اچانک آپ نے۔"
"بس تمھارا کہا پورا ہو گیا۔" کانتے نے سادگی سے کہا۔
"مگر ابھی تو...." وہ سراسیمگی سے بولی۔
"ان لوگوں کو کچھ سُنوا دیں۔ لاڈلے! تم ادھر ہی بیٹھو۔ ہم واپسی میں تم کو ادھر سے لے لیں گے۔"
"میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔"
"آپ بھی چلے جائیں گے؟"
"نہیں، یہ اِدھر ہی رہے گا۔" میرے بجائے کانتے نے جواب دیا۔
"ہم آتے ہیں لاڈلے!" کانتے نے مجھے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔

اِدھر شہ پارہ میرے پاس کھڑی ہوئی بجھی بجھی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ "آپ تو بیٹھیے۔" وہ ملتجی لہجے میں بولی۔ "کانتے جی آ جائیں گے۔"
"وہ تو آ جائیں گے مگر میں...." میں نے تذبذب سے کہا۔
"کچھ دیر اور سہی۔"
کہیں اور جانے کے بجائے خود میرا دل بھی وہیں بیٹھنے کو کرتا تھا لیکن کرمن کی بات میرے ذہن میں محفوظ تھی۔ اُس نے دروازے پر شہ پارہ کو دبے لفظوں میں جتایا تھا کہ یہ ہمیں اندر بلانے کا وقت نہیں ہے۔ میں اُسے یہی یاد دلانا چاہتا تھا۔ دُور کھڑی ہوئی کرمن کا چہرہ صاف غمازی کرتا تھا کہ اُسے میرا بیٹھنا ناگوار لگ رہا ہے۔ وہ اُلجھی ہوئی سی تھی۔ کانتے نے جاتے جاتے لوٹ کے میری جیب میں کوئی چیز رکھی۔ میں نے ٹٹول کے دیکھا، روپے تھے۔ وہ سب چلے گئے۔ میں انھیں دیکھتا رہ گیا۔ اُسی لمحے کرمن نے شہ پارہ کو بُلا کے کچھ کہا۔ میں نے سوچا جیب میں جتنے روپے ہیں، سب کرمن کو دے دوں۔ شہ پارہ واپس آئی تو اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ "کیا کہہ رہی تھیں؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔
"کچھ نہیں۔" وہ ڈوبتی ہوئی آواز میں بولی۔ "کوئی خاص بات نہیں ہے۔"
"میں جانتا ہوں، کیا کہہ رہی ہوں گی۔ میرا خیال ہے مجھے اُٹھ جانا چاہیے۔"
"نہیں۔" وہ بے تابی سے بولی۔ "وہ تو خواہ مخواہ کی فکر کرتی ہیں۔"
"کیسی فکر؟"
"ایسے ہی، آپ کو کیا بتاؤں۔" اُس کی آواز گھُٹ گئی۔
"انھیں میرے رُکنے پر اعتراض ہے۔ یہی بات ہے نا؟"
"ہاں۔" وہ اپنے پوروں کے ناخنوں سے کھرچنے لگی۔ "اُن کا سوچنا بھی ٹھیک ہی ہے۔ آپ کو کچھ اندازہ ہو گیا ہو گا۔" اُس کے حلق میں جیسے کوئی چیز اٹک گئی۔ "یہاں ایک رئیس ہیں، سیٹھ کرم چند۔ انھوں نے پابندی لگا دی ہے کہ یہاں اُن کے سوا کوئی نہیں آئے گا۔"
"مگر کیا یہ بات تمھاری مرضی کے خلاف ہوئی ہے؟"
اُس نے آنکھیں میچ لیں اور کچھ توقف کے بعد بولی۔ "میری مرضی کہاں ہے۔"
"اس کا حق تو تمھیں تھا کہ ایسی پابندی لگواؤ یا نہیں۔ تم کرمن بیگم کو منع کر سکتی تھیں۔"
"آپ بالکل نہیں بدلے۔ بالکل وہی ہیں۔"
"وہی کیا؟" میں نے سٹ پٹا کے پوچھا۔
"پہلے جیسے۔"
"پہلے کیسا تھا؟"
"جیسے اب ہیں۔" اُس کے ہونٹ کھِل کھِلانے لگے۔ "آپ سمجھتے کیوں نہیں؟"

”میں سمجھ گیا، پھر مجھے واقعی یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔“

”مگر میں گا تو نہیں رہی ہوں۔“

”یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو۔“

”آپ کا دل یہاں بیٹھنے کو نہیں چاہ رہا؟“

میں نے تیزی سے اثبات میں سر ہلایا۔

”مجھے یقین تھا کہ آپ ایک دن ضرور واپس آئیں گے۔ اب آپ اتنے دنوں بعد آئے ہیں تو میں آپ سے دو باتیں بھی نہ کر سکوں۔“

”یہ تو تم بہتر سمجھ سکتی ہو۔“

”آپ کے خیال میں کیا یہ نامناسب بات ہے؟“

”میں کیا کہوں، میں سمجھتا ہوں تمھیں اتنا اختیار تو ہونا ہی چاہیے۔“

”آپا جانی کہتی ہیں، وہ پابندی لگانے کا اختیار رکھتے ہیں، انھوں نے کرایہ دیا ہے۔“ وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

”کتنا کرایہ؟“ میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

”پتہ نہیں، بہت ہی ہو گا۔“

”تمھیں نہیں معلوم؟“

”میں معلوم کر کے کیا کرتی۔“

”تو پھر وہ تمھیں یہاں کیوں رکھے ہوئے ہیں؟“

”یہ تو اُن کی اور آپا جانی کی مرضی پر ہے۔ وہ چاہیں تو لے بھی جائیں۔ اُن کے پاس بہت دولت ہے۔ پر آپا جانی نے شاید انھیں منع کر دیا ہے کہ ابھی وہ مجھے سموچا کسی کی تحویل میں دینا پسند نہیں کرتیں۔ انھوں نے سو عُذر کر دیے کہ ابھی میری عمر کم ہے، مجھے ابھی اور سیکھنا ہے، ابھی اُن کا ایسا کوئی خیال نہیں، وہ کچھ عرصے اور مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتی ہیں۔ البتہ جہاں تک گانے کی بات ہے، وہ مجھے کسی ایک شخص کے لیے وقف کر سکتی ہیں۔ انھوں نے یہی کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی دن آمادہ ہو جائیں اور سیٹھ جی مجھے یہاں سے لے جائیں یا پھر یہیں رکھیں اور میں بس انھی کے لیے محدود ہو جاؤں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سیٹھ جی ابھی آپا جانی کی منہ مانگی مُراد قبول کرنے میں ہچکچا رہے ہوں۔ آپا جانی نے کچھ زیادہ ہی طلب کر لیا ہو گا۔ یہ گھر بھی سیٹھ جی نے لے کے دیا ہے۔“

”تمھارا اپنا کیا خیال ہے؟“

”میرا خیال کیا۔“

”سیٹھ جی کیسے ہیں؟“

”آدمی ہیں۔“ وہ سرد آہ بھر کے بولی اور دیر تک چُپ بیٹھی رہی۔ کمرے میں میرے اور اُس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اُس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ جھن جھناتی، کھن کھناتی ہوئی۔ جی چاہتا تھا، وہ بولتی رہے۔ کسی بات پر وہ شرماتی تو ٹھوڑی کے قریب گڑھا سا پڑ جاتا۔ باتیں کرتے کرتے اُس کے ہونٹ جیسے جیسے لرزتے تھے چہرے کا رنگ اور لال ہو جاتا تھا۔ اُس کا لہجہ بہت صاف، نرم، کسی موج کی طرح تھا لیکن پھر مجھ سے کچھ پوچھا نہیں گیا۔ میرا سر گھومنے سا لگا تھا۔

”آپ سنائیے۔ آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“

”کیا بتاؤں؟“

”ایک بات پوچھوں؟“ وہ منتشر آواز میں بولی۔ ”کبھی میرا چہرہ یاد رہا آپ کو؟“

”ہاں! کئی بار خیال آیا۔“

”سچ!“ اُس کی پُتلیاں چمکنے لگیں۔ ”میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ معلوم کیا۔“

”کیا کیا۔ تم نے کیا معلوم کیا؟“ میں نے وحشت سے کہا۔

”یہی کہ آپ کے ساتھ کیا کیا گزری۔“

”تم کیا جانتی ہو؟“

”زیادہ نہیں، بس اتنا کہ آپ نے بہت دُکھ اُٹھائے ہیں۔“

”مجھے کھُل کے بتاؤ۔“

”آپ اپنی ہی باتیں جاننے کے لیے اتنے بے تاب کیوں ہیں؟“

”شاید تم نے کچھ غلط سُنا ہو۔“

”مگر میں نے آپ کو دیکھا بھی تو ہے۔“

”کتنی بار!“

”بعض اوقات تو ایک ہی بار کافی ہوتا ہے۔“ وہ لرزیدہ لہجے میں بولی۔

”ایک بار میں تُم نے کیا سمجھا ہو گا؟“

”بہت کچھ سمجھ لیا۔ میں نے آپ کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ جو لوگ میں نے اب تک دیکھے ہیں، آپ کی آنکھیں اُن سب سے الگ ہیں۔ جن لوگوں کے ساتھ آپ آئے تھے، اُن میں بھی الگ الگ نظر آ رہے تھے۔ میرا دل چاہا تھا کہ آپ کو روک لوں مگر ہمت نہیں پڑی، پھر میں آپ کا انتظار کرتی رہی کہ شاید آپ پھر آئیں۔ میں نے بہت سی باتیں سوچ رکھی تھیں کہ آپ آئیں گے تو کہوں گی لیکن اب کچھ یاد ہی نہیں آ رہا ہے۔ نہ جانے کیا کیا سوچا تھا۔ میں اس چار دیواری میں بند ہوں اور میرے پیروں میں گھنگروؤں کی زنجیر پڑی ہے۔ میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتی اور میرے کرنے نہ کرنے سے ہو گا بھی کیا؟ ہو سکے تو اپنے کچھ دُکھ مجھے دے دیجیے۔ مجھے احساس ہے کہ یہ ایک مہمل سی بات ہے، کون کسی کے دُکھ سمیٹ سکتا ہے مگر مجھے معلوم نہیں کہ آپ کے سامنے اور کیا کہنا چاہیے۔“

”شبارے!“ میری آواز بیٹھ گئی۔ ”تم نے کیا کیا سُنا ہے؟“

اُس نے سُنا کم تھا، اخذ زیادہ کر لیا تھا اور جتنا اخذ کیا تھا، اُسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اصل کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے۔ وہ صرف اتنا ہی جانتی تھی کہ مجھے ایک طویل مدت جیل میں گزارنی پڑی ہے اور وہاں میں نے تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ اُسے کسی نے بتایا تھا کہ شاید اس دوران میرے گھر والے مجھ سے کھو گئے ہیں، میں اُنھی کی تلاش میں شہروں شہروں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ اُسے خانم اور جہاں گیر کی بابت کچھ علم نہیں تھا لیکن وہ خانم سے واقف ضرور ہو گی۔ نسترن، چاند میاں، موجمدار کا واقعہ، زریں کا نام، فیض آباد میں اُس کی حویلی، یہ سب کچھ اُسے معلوم تھا، بمبئی کے چند واقعات بھی اُس کے علم میں تھے۔ اُس نے فہمیدہ کا ذکر نہیں کیا۔ کوئی بعید نہیں کہ فیض آباد سے یہ بات کلکتے تک پہنچ گئی ہو۔ اڈوں کے آدمیوں ہی نے اُسے یہ ساری باتیں بتائی ہوں گی۔ یہاں طرح طرح کے لوگ آتے رہتے ہوں گے۔ شہہ پارہ نے اُن سے خود ہی پوچھا ہو گا اور انھوں نے اُس کی خاطر اناپ شناپ زبان کھولنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا ہو گا۔ بہرحال اُسے کورا اور مولوی صاحب کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔

”کیا یہ سب کچھ غلط ہے؟“ اُس نے رنجیدگی سے پوچھا۔

”نہیں، بہت کچھ درست ہے۔ تو کیا تمھیں مجھ پر ترس آتا ہے؟“

”نہیں۔“ وہ پریشان لہجے میں بولی۔ ”یہ ترس نہیں ہے، آپ ایسا کیوں کہتے ہیں، جب مجھے کچھ پتہ نہیں تھا تو بھی میں نے کچھ یہی جانا تھا۔ اتفاق سے بعد میں اس کی تائید بھی ہو گئی۔ اسے ترس کہہ کے مجھے نادم مت کیجیے۔ ترس تو معذوروں، بے بسوں پر کیا جاتا ہے۔ ہاں، مجھ پر آپ ضرور ترس کھا سکتے ہیں۔ میں نہ آپ کی طرح آزاد ہوں، نہ مختار۔ آپ مرد ہیں اور خدا نے آپ کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ آپ کے بازو مضبوط ہیں اور ابھی آپ کے سامنے ایک عمر پڑی ہے۔ خدا آپ کو بہت زیادہ عمر دے، بہت زیادہ اور آپ کی ساری مُرادیں بر آئیں۔“

”شبارے!“ میں نے خجالت سے کہا۔ ”تم نے اگر میری بات محسوس کی ہے تو مجھے معاف کر دو۔ میری زبان قابو میں نہیں رہتی۔ کہنا کچھ چاہتا ہوں، نکل کچھ جاتا ہے۔ جنھوں نے دُکھ سہا ہے، دُکھ وہی سمجھ سکتے ہیں۔ تم بھی مجھے بہت دُکھی لگتی ہو۔ یقین کرو، پہلے بھی، جب میں یہاں آیا تھا تو میں نے یہی محسوس کیا تھا لیکن میں تم سے کچھ کہہ نہیں سکا۔ تم نے کہہ دیا ہے۔ میرے لیے تمھاری طرح اور لوگ بھی دعا کرتے ہیں، پر کچھ ہوتا ہی نہیں۔“

”مایوس کیوں ہوتے ہیں۔“

”تم بھی تو مایوس نظر آتی ہو۔“

”مایوسی کے ساتھ ساتھ ایک اُمید بھی ہے، خدا کبھی تو سُنے گا۔“

”سب یہی کہتے ہیں۔“

”کوئی غلط تو نہیں کہتے، کیا دیکھتے دیکھتے لوگوں کی قسمتیں نہیں بدل جاتیں؟ اتنا اندھیر نہیں ہے۔“

”تم یہاں اس قید خانے میں بیٹھ کے یہ کہہ رہی ہو تو واقعی اندھیر نہیں ہے۔ تمھارے دُکھ بھی میں جانتا ہوں شبارے! یقیناً وہی ہوں گے جو یہاں بہت سوں کے ہوتے ہیں۔ بہت کم لوگ خوش رہتے ہوں گے یہاں اور تم جیسی لڑکی تو بالکل نہیں۔“ میں نے اُس سے یہ نہیں کہا کہ وہ نمی کی طرح معصوم ہے یا زریں، جولین اور نیساں کی بہن لگتی ہے۔

”قسمت کا تماشا ہے۔“

”تم سب یہ پسند نہیں کرتیں نا؟“ اُس نے گردن جھکا لی۔

”مجھے یقین ہے، کریمن بیگم تمھاری اصل ماں بھی نہیں ہو گی۔“

”اب تو وہی سب کچھ ہیں۔“

”تمھیں کہاں سے لایا گیا تھا؟“

”مجھے کچھ یاد نہیں، صرف دُھندلا دُھندلا سا ایک نقش ہے۔“ میرے پوچھنے پر اُس نے بہ مشکل تمام بتایا کہ وہ بہت چھوٹی تھی کہ کسی نے اُسے حیدر آباد کے بازار میں پہنچا دیا۔ اُسے صرف اتنا یاد ہے کہ اُس دن گھر میں بہت سے لوگ آئے تھے اور اُس کے باپ کی مسہری کے گرد بیٹھے رو رہے تھے۔ لوگوں کی دیکھا دیکھی وہ بھی رونے لگی۔ اُسے حیرت تھی کہ اُس کے باپ کو اچانک کیا ہو گیا ہے، وہ بولتے کیوں نہیں، اُٹھتے کیوں نہیں۔ اُس کا ایک بڑا سا گھر تھا، بہن بھائی تھے۔ اُن کی شکلیں اب تک اُس کے ذہن میں محفوظ تھیں۔ جب اُس کے ابا کو لوگ کندھوں پر اُٹھا کے لے جانے لگے تو وہ بھی باہر آ گئی۔ گلی میں بہت بڑا ہجوم تھا۔ لوگ اُسے سینے سے لگا کے پیار کرنے لگے اور اُنھی میں سے کسی شخص نے اُسے گود میں لے لیا۔ پھر جب اُسے ہوش آیا تو وہ ایک دوسری جگہ تھی۔ حیدر آباد کے بازار محبوب کی مہندی میں۔ وہ وہیں پلی بڑھی۔ بعد میں کریمن بیگم کلکتے سے حیدر آباد آئی تو شہہ پارہ اُس کے سپرد کر دی گئی کیونکہ جس عورت کے ہاں اُس نے پرورش پائی تھی، وہ کریمن بیگم کی قریبی عزیز تھی۔ ”سب ایک خواب کے مانند ہے۔“ اُس کی آواز ڈگمگانے لگی۔ ”وقت کے ساتھ یہ دُھند بھی چھٹ جائے گی۔“

”کبھی نہیں چھٹے گی۔ اور گہری ہو جائے گی۔ آدمی یہی سمجھتا ہے کہ وہ بھول جائے گا لیکن بہت سی باتیں بھولنے کی نہیں ہوتیں۔ وقت کا اُن پر اثر نہیں ہوتا۔“

”ہو بھی جاتا ہے۔ کئی مثالیں تو میرے سامنے ہیں۔ وقت نے اُن کے زخم بھر دیے۔ انھیں اب کسی سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔“

”پتہ نہیں، یہ اچھا ہوتا ہے یا بُرا۔“

”اچھا ہی ہوتا ہے۔ یوں زندہ رہنا بھی ایک طرح وقت سے سمجھوتا کرنا ہے۔ وقت کے سامنے سرِ خم کر دینا ہے۔ صرف اِس بہانے کہ شاید رُت بدل جائے اور رُت کبھی بدل جاتی ہے، کبھی نہیں بدلتی۔ کسی کے لیے بدل جاتی ہے، کسی کے لیے نہیں اور آدمی عمر بھر اُس کے انتظار کے فریب میں رہتا ہے۔“

"کاش! میں تم سے کچھ کہہ سکتا لیکن فضول باتیں کرنے سے کیا حاصل۔ میری زبان کہتے کہتے رُک جاتی ہے۔"

"آپ کا اتنا کہنا ہی میرے لیے بہت ہے۔" اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ "مجھے احساس ہے کہ آپ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ دُکھی آدمی جھوٹ نہیں بولتا ورنہ اُس کے دُکھ جھوٹ ہوتے ہیں۔ دل پر بوجھ مت رکھیے گا۔ میری باتیں سُن کے آپ کا جی اور گراں ہو گیا ہو گا۔"

"یہ ذکر تو میں نے خود چھیڑا تھا نشپارے! اپنے آنسو روک لو، ابھی تو مجھے صبر و ضبط کے لیے کہہ رہی تھیں۔ اب بتاؤ ضبط کرنا کیسا مشکل ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھ کے گم سُم بیٹھی رہی۔

"ہم لوگ جا رہے ہیں نشپارے! دیکھو واپسی کب ہوتی ہے لیکن جب بھی ہوگی، میں اِدھر ضرور آؤں گا۔"

"پھر جا رہے ہیں؟" وہ شکستہ لہجے میں بولی۔

"ہاں اور مجھے خود نہیں معلوم کہ کس طرف جا رہے ہیں۔ ممکن ہے جلدی آجائیں یا ممکن ہے بہت دیر ہو جائے یا کبھی واپس نہ آسکیں۔"

"نہیں نہیں۔" وہ بے قراری سے بولی۔ "ایسی بدفالیں منہ سے کیوں نکالتے ہیں۔ خدا نے چاہا تو آپ کامیاب لوٹیں گے۔"

"کیا کہا جا سکتا ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

"اور تم مجھے یاد آتی رہو گی۔" میں نے ڈولتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے ہر دم تمھارا احساس رہے گا۔ میں آگیا تو ٹھیک ہے لیکن نہ آسکا تو تم، تم..." سب کچھ میرے دماغ میں گڈ مڈ ہو گیا کہ میں اُس سے کیا کہنا چاہتا تھا۔

"آپ آئیں گے، انشاءاللہ جلد واپس آئیں گے۔ میرا کوئی احساس نہ کیجیے گا۔ میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں۔ حوصلے سے جائیے اور مایوسی دل میں مت لائیے۔" وہ مجھے تسلّیاں دینے لگی۔

دیر ہو گئی تھی۔ اُن میں سے کوئی واپس نہیں آیا تھا۔ کرمن بیگم ایک بار آ کے چلی گئی تھی۔ شہ پارہ میرے پاس ہی بیٹھی رہی۔ ایک لمحے کے لیے بھی اُٹھ کے کہیں نہیں گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ باہر جا کے کانتے وغیرہ کو خود تلاش کرنا چاہیے۔ معاً سامنے کے دروازے سے کرمن بیگم حواس باختہ انداز میں اندر داخل ہوئی۔ "وہ آگئے ہیں۔" کمرے میں اُس کی تلملاتی آواز گونجی۔

"کون آیا جانی؟" شہ پارہ نے آنکھیں پٹ پٹا کے پوچھا۔

"کرم جی!۔ وہ اُوپر چڑھ رہے ہیں۔ موٹر نیچے کھڑی ہے۔"

"تو آنے دیجیے۔" شہ پارہ تحمل سے بولی۔

"میں چلتا ہوں۔" میں نے درمیان میں کہا۔

"آپ بیٹھیے۔ کہاں کانتے جی کو ڈھونڈتے پھریں گے۔"

"کیا یہ مناسب ہوگا؟" کرمن کتراتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "شاید اُنھیں یہ پسند نہ ہو۔"

"میں نے نہ گھنگرو باندھے ہیں، نہ گا رہی ہوں، نہ یہاں ساز والے موجود ہیں۔"

"تم درست کہتی ہو مگر وہ محسوس کرلیں گے۔ مجھے جو اندیشہ تھا، وہی ہوا نا۔ وہ آگئے نا۔ اُن کے مزاج سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ وہ تمھارے معاملے میں کتنے حسّاس ہیں، ہمیں اُن کا خیال رکھنا چاہیے۔ ہم پر اُن کے احسانات کچھ کم نہیں ہیں۔"

"مگر آپا جانی!" شہ پارہ نے احتجاج کیا۔ "کیا یہاں ہمارا کوئی مہمان نہیں آسکتا؟ ہم تھوڑی دیر کے لیے اپنے کسی مہمان کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے؟"

"میں نے تمھیں بتا دیا ہے، تم تو سمجھ دار ہو۔" کرمن ناراضی سے بولی۔

"کیا یہ نامناسب نہیں ہے کہ اُن کے آتے ہی ہم اپنے مہمان کو اُٹھا دیں۔"

"تم جانو۔ وہ آرہے ہیں۔"

دروازے پر کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی پھر چشم زدن میں سانولی رنگت، درمیانہ قد اور ادھیڑ عمر کا ایک شخص برآمد ہوا۔ اُس کی آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ کھچڑی بالوں کی مونچھیں سب سے زیادہ نمایاں تھیں۔ اُس نے بند گلے کا ایک سلکن کوٹ پہن رکھا تھا۔ دھوتی سفید تھی۔ چہرے مہرے سے وہ اچھا خاصا صاف ستھرا شخص تھا۔ ہونٹ موٹے موٹے، ناک اُبھری ہوئی۔ کوٹ کے باہر گلے میں سونے کی زنجیر پڑی ہوئی تھی۔ انگلیوں میں کئی رنگوں کے پتھروں کی موٹی موٹی انگوٹھیاں تھیں۔ پہلے اُس نے شہ پارہ کو دیکھا، پھر مجھے، پھر کرمن بیگم کو۔ اُس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اُس کے تیور اچھے نہیں ہیں۔ شہ پارہ نے کھڑے ہو کے اُسے تسلیم کی۔ اُس نے سر کو ایک خفیف سی جنبش دی۔ میں نہیں اُٹھا تھا۔ "تشریف لائیے کرم جی!" شہ پارہ نے شائستگی سے کہا۔

وہ آگے نہیں بڑھا۔ دروازے سے کچھ فاصلے ہی پر کھڑا رہا۔

"یہ لاڈلے میاں ہیں۔" کرمن نے جلدی سے کہا۔ "یہ استاد جھّل کے خاص آدمی ہیں۔"

سیٹھ کرم چند نے جواب نہیں دیا۔ شہ پارہ اُس کے پاس جا کے ٹھیرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "کیوں! آپ بیٹھتے کیوں نہیں؟"

"کرمن بیگم۔" اُس کی بپھری ہوئی آواز اُبھری۔ "ہم اِس کو کیا سمجھے؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"تم مطلب خوب سمجھو ہو۔ کیا ہم اِدھر دوبارہ نہیں آئے؟"

"کون کم بخت کہتا ہے۔ یہ گھر آپ کا ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔"

"تمھارا خیال ہے، ہم کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ اِدھر ہمارے پیچھے کون آتا جاتا ہے۔ کیا اِدھر ہم نے اپنا کوئی آدمی نہیں چھوڑا ہوگا جو ہم کو پل پل

کی خبر دے۔"

"سیٹھ صاحب! اگر آپ کا اشارہ لاڈلے میاں کی طرف ہے تو یہ ہمارے مہمان ہیں۔" کرمن عاجزی سے بولی۔ "آپ سکون سے کچھ دیر بیٹھیے ذرا سانس لیجیے۔ یہ بھی عزت دار آدمی ہیں۔"

"ہم کو اس سے کوئی ناتا نہیں ہے۔ یہ کون ہے، کدھر سے آیا ہے؟ ہماری بات تم سے ہے۔ تم سے ہمارا کیا طے ہوا تھا، اِدھر کوئی نہیں آئے گا، کوئی بھی نہیں آئے گا تو نشپارے کے پاس نہیں۔ ہم کو پتہ چلا ہے کہ ابھی اِدھر سے بہت سے لوگ اُٹھ کے گئے ہیں۔ وہ اِدھر کیا کرنے آئے تھے؟ نشپارے کے سوا اِدھر اور کون چیز دیکھنے کی ہے؟"

"خدا گواہ ہے سیٹھ صاحب! نشپارے نے جو اُن کے سامنے گھنگرو باندھے ہوں۔ وہ اِس علاقے کے لوگ ہیں۔ اُن کا بھی کچھ لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔"

"ایک سے بنا کے رکھو۔ ہم تم کو پہلے ہی بول دیا تھا کرمن بیگم! یہ سب ہم کو ایک دانہ بھر بھی اچھا نہیں لگتا۔ نشپارے کو ہم باہر کے کسی آدمی کے سامنے کرنا نہیں چاہتے اور ہم اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت چکانے کو تیار ہیں۔"

"آپ بیٹھیے تو سہی۔ پھر جو جی میں آئے کہہ لیجیے گا۔"

"تم کو معلوم ہے، ہم کو اِدھر کسی کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں ہے۔"

"لاڈلے میاں بس جانے ہی والے تھے۔"

"مگر یہ اِدھر کیوں ہے؟" اُس کی آواز بتدریج تیز ہوتی جا رہی تھی۔ کرمن بیگم کی خوشامدوں کے باوجود اُس کا پارہ نہیں ٹھیرا۔ شہ پارہ نے بھی اُسے نرم لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی۔ اُس نے اُس کی بات پر بھی توجہ نہیں دی۔ میں چلا آتا لیکن مجھے اُس کی بدزبانی بہت بُری لگی۔ شہ پارہ کبھی میری طرف دیکھتی، کبھی اُس کی طرف۔ "یہاں اور کسی کا ہونا کرم چند کا اپمان ہے، بے عزتی ہے۔ اپنے مہمان سے بولو کہ چلا جائے۔"

مجھے سخت غصہ آیا۔ جی میں آیا، بڑھ کے اُس کا گریبان پکڑ لوں۔ وہ شہ پارہ کی توہین کر رہا تھا۔ کرمن بیگم نے شکایت کی۔ "آپ ایسا نہ کہیے، یہ چلے جائیں گے۔ یہ خود رُکنے پر آمادہ نہیں تھے۔ سچ تو یہ ہے، ہم نے ہی انھیں روکا۔ ڈیڑھ دو سال بعد آج نظر آئے ہیں۔ دروازہ اسی لیے کھلا رکھا تھا کہ آپ کو بدگمانی نہ ہو۔ لاڈلے میاں!" کرمن اِس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ میری سُرخ آنکھیں دیکھ کے چُپ ہو گئی۔

"اپنے سیٹھ سے کہو کرمن بیگم کہ زبان سنبھال کے بات کرے۔ اسے بولنا نہیں آتا تو زبان بند رکھے۔" میں نے درشتی سے کہا۔

"لاڈلے میاں! خدا کے لیے خاموش رہیے۔ میری خاطر، شہ پارہ کی خاطر۔" کرمن گڑگڑا کے بولی۔ "سیٹھ کرم چند جی نے ہمارے ساتھ بہت سلوک کیا ہے۔ جو یہ کہہ رہے ہیں، سب سچ ہے۔ شہ پارہ باہر کے لوگوں میں صرف اِنھی کے سامنے آتی ہے، ماشاءاللہ آپ سمجھ دار ہیں، سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اس سے پہلے کہ بات طُول کھینچے، میں منت کرتی ہوں کہ اپنے آپ کو قابو میں رکھیے۔"

"بات کو تو یہ سیٹھ کرم چند طول دے رہا ہے۔"

"کرمن بیگم!" کرم چند گرجتی آواز میں بولا۔ "چھوکرے سے بولو کہ یہ ہمارا گھر ہے اور ہم کو اپنے گھر میں ایسی بات برداشت نہیں۔ چلے جاؤ چھوکرے!" وہ پہلی بار براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔

"میں یہیں رہوں گا۔"

"تم اِدھر نہیں رہ سکتا۔"

شہ پارہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "خدا کے لیے..."

"اس سے دُور رہو نشپارے جان!" کرم چند نے چیخ کے کہا۔

شہ پارہ نے اس طرح میرا ہاتھ چھوڑ دیا جیسے اُسے ڈنک لگ گیا ہو۔

"سیٹھ کرم چند!" میں نے نسبتاً پُرسکون آواز میں کہا۔ "حکم مت چلاؤ۔"

"ہم نے اِدھر روکڑا دیا ہے۔" وہ انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے برہمی سے بولا۔ "حکم کا روکڑا، روکڑا ہو تو کھولو۔"

"ضرورت پڑی تو وہ بھی کھول دیں گے۔"

"اس کی ضرورت ایسے ہی وقت پڑتی ہے۔ اِدھر خالی بیلی نہیں چلتا۔"

"تم نے کتنا روکڑا دیا ہے؟" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"اِدھر دو لاکھ کرمن بیگم کی مانگ ہے۔"

"ہم چار لاکھ دیں گے۔"

"چار لاکھ! ہم چھ لاکھ دے گا۔"

"میں اِسے دُگنا کر دوں گا۔"

"پہلے اِدھر لے آ۔" وہ حقارت سے بولا۔ "اور اس سے پہلے اِدھر سے چلا جا۔ جب پیسہ لے کے آئے پھر بات کرنا۔ دُگنا روپیہ دے گا! دیکھا ہے! آنکھیں پھٹ جائے گا۔"

"آنکھیں تیری پھٹیں گی سیٹھ کرم چند! ہم کو ایک پیسہ دکھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں اسے یوں ہی تیرے سامنے سے لے جاؤں گا۔ پوچھ لے نشپارے سے۔"

"مفت کا مال نہیں چھوکرے! بازار میں کھڑا ہے۔"

"پوچھ لے نشپارے سے کہ وہ تیرے روپے کے ساتھ جانا چاہتی ہے یا میرے ساتھ۔ میری جیب میں اس وقت اتنے پیسے نہیں ہیں۔"

"ہا، ہا، نواب کا تھوکا... دن میں سپن دیکھتا ہے، پوچھ لے۔ پوچھ لے اور اپنے مغز سے یہ مستی بھی نکال دے۔"

"یہ کیسی باتیں ہو رہی ہیں۔ خدا کے واسطے یہ گفتگو بند کیجیے۔" کرمن ہذیانی انداز میں بولی۔ "سیٹھ جی! آپ ہی کچھ بڑے پن کا ثبوت دیجیے۔ یہ باتیں آپ کے شایانِ شان نہیں۔"

"اپنی تان پر جو کالک لگانا تھی، وہ تم نے لگا ہی دی ہے کرمین بیگم! اب اور کیا چاہو ہو۔ چھوکرے سے بولو کہ چلا جائے ورنہ ہم اس کو دھکے دے کے باہر نکال دے گا۔"

"سیٹھ! تمھاری عمر کا دھیان ہوتا ہے تم صرف زبان سے کہتے ہو، میں ابھی تمھیں نیچے پھینک دوں گا۔"

"اوہ اوہ۔" کرمین دونوں ہاتھ کان پر رکھ کے واویلا کرنے لگی۔

سیٹھ نے پھر کچھ نہیں سنا۔ سیدھا دروازے کی طرف پلٹ گیا۔ میں سمجھا، وہ چلا گیا ہے۔ زینے پہ جا کے اس نے تالی بجائی۔ اسی لمحے زینے میں بھاری بھاری قدموں کی آہٹ گونجی۔ کرمین بیگم دہائیاں دینے لگی۔ آنے والے دو آدمی تھے، دو مشٹنڈے۔ پہلوانوں کے مانند۔ لباس سے فوجی معلوم ہوتے تھے۔ دونوں کی کمر سے چمڑے کی ایک ایک بیلٹ بندھی تھی اور بیلٹوں کے خانوں میں کارتوس بھرے ہوئے تھے۔ کندھوں سے ہولسٹر لٹک رہے تھے۔ چھرے بھی بیٹی میں اڑسے ہوئے تھے۔ دونوں کے سینے چوڑے، جسم جھکے ہوئے اور قد نکلتے ہوئے تھے۔ مونچھیں تلوار کی طرح کھنچی ہوئی تھیں۔ سر پہ چھوٹی پگڑی کسی ہوئی تھی۔ ان کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا، ایک کی چالیس ہوگی تو دوسرے کی تیس۔ رنگت خاکی تھی، جیسے بھوری مٹی۔ وہ اس طرح اندر آئے جیسے انھیں کسی چور کی تلاش ہو، دیدے پھاڑے ہوئے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ آتے ہی انھوں نے چاروں طرف گھور کے دیکھا پھر ان کی نظریں مجھ پر آ کے ٹک گئیں۔ "اس کو اٹھا کے نیچے پھینک دو۔" کرم چند نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"یہ استاد تھل کے آدمی ہیں۔" کرمین سیٹھ کے سامنے آ گئی۔

"ان لوگوں نے بڑے بڑے استادوں کا نشہ ہرن کر دیا ہے کرمین بیگم!"

"میں کہتی ہوں آپ انھیں روک لیجیے۔"

"ہم ان کو روک لیتے ہیں۔ چھوکرے سے بولو، آخری موقع ہے۔ ادھر سے دفع ہو جا۔ پھر کبھی اس گھر کی طرف سر اٹھا کے نہ دیکھنا۔"

"لاڈلے میاں! میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" اس نے اپنا دامن میرے آگے پھیلا دیا۔ "سیٹھ جی اس وقت ہوش میں نہیں ہیں، کچھ سمجھ نہیں رہے ہیں لیکن تم ہوش مت کھونا۔"

دونوں آدمی مجھ سے ایک فاصلے پر آ کے ٹھہر گئے تھے۔ "سیٹھ کرم چند!" میں نے تلخی سے کہا۔ "بازو بھی دوسرے کا استعمال کرتے ہو۔"

"یہ بھی اپنا بازو ہے چھوکرے! روکڑے کا بازو اور روکڑا بازو ہلائے بغیر نہیں آتا۔ بولو، جلدی فیصلہ کرو۔ ہم ان کو اشارہ کرے؟"

"بس کرو، بس کرو۔" کرمین چلانے لگی۔

"چپ ہو جاؤ!" کرم چند نے اسے ڈانٹ دیا۔

"یہاں سے چلے جاؤ سیٹھ!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"ہم جائے؟" وہ نخوت سے بولا۔ "پھینک دو اسے نیچے۔" اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ وہ مجھ پر ایک دم نہیں لپکے، پہلے مجھے نظروں میں تول رہے ہیں۔ میں نے اپنے کندھے گرائے رکھے لیکن میری آنکھیں انھی پر مرکوز تھیں۔ کرمین اور شہہ پارہ میرے آگے ڈھال بن کے کھڑی ہو گئیں۔ میں نے انھیں دھکیل دے کے خود سے دور کیا۔ کرم چند کے آدمیوں نے خنجر نہیں نکالے۔ دونوں مجھے بازوؤں سے پکڑ کے دھکیلتے اور گھسیٹتے ہوئے زینے تک لے جانے کی جستجو میں ہوں گے۔ شروع شروع میں وہ یہی کر سکتے تھے۔ سیٹھ کمرے کے درمیان ایک ستون سے سہارا لے کے کھڑا ہو گیا۔ وہ آہستگی سے میرے قریب آئے جیسے مجھ سے دوبدو کچھ کہنا چاہتے ہوں کہ بہتر ہے میں انھیں ہاتھ نہ اٹھانے دوں۔ میں اپنی جگہ سے نہیں ہٹا، انھیں آنے دیا۔ شہہ پارہ سسک رہی تھی۔ ان دونوں نے ہاتھ بڑھائے مگر اس سے پیشتر کہ وہ میرے بازو پکڑ کے مجھے آگے دھکیلتے، میں نے خود پھرتی سے جھپٹ کے ان کے دراز ہاتھ پہنچے سے پکڑ لیے اور زور سے جھٹکا دیا۔ دونوں ایک ساتھ فرش پر گرے اور قلابازی کھا گئے۔

ان کے لیے یہ بہت غیر متوقع ہوگا۔ میں نے ایک ثانیے کے وقفے میں کچھ پیچھے ہو کے اپنا رخ بدل لیا تھا۔ وہ اٹھ تو جلدی گئے لیکن پھر انھوں نے مجھ پر حملہ کرنے میں جلدی نہیں کی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور استہزائی انداز میں مسکراتے ہوئے کھڑے ہو گئے پھر رفتہ رفتہ انھوں نے دوبارہ آگے بڑھ کے مجھ سے فاصلہ کم کیا۔ میں دوسری بار ان کے ارادے کا تعین نہیں کر سکا تھا۔ کئی باتیں ممکن تھیں۔ یا تو وہ عام لوگوں کی طرح طیش میں آ کے مجھ سے چمٹ جاتے یا خنجر نکال لیتے یا کچھ اور کرتے لیکن وہ دو گز کی دوری پر آ کے ٹھہر گئے اور اچانک طوفان کی تیزی سے دونوں ادھر ادھر سے بیلوں کی طرح اپنے سر آگے کیے میرے سینے پر حملہ آور ہوئے۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایسا کریں گے۔ میں دونوں کے بیک وقت زور کی تاب نہیں لا سکا۔ گو میں نے بچنے کی ایک کوشش کی تھی تاہم انھوں نے بہت عجلت کی۔ مجھے سنبھلنے کا ذرا سا وقت بھی نہیں دیا اور میرے ساتھ ہی گرے۔ وہ میرے جسم پر دباؤ ڈالے ہوئے تھے کچھ اس طرح کہ بے فائدہ ٹانگیں چلانے کے سوا میرے لیے باقی جسم کو حرکت دینا مشکل ہو گیا تھا۔ اب ایک ہی صورت مناسب تھی کہ میں مزاحمت کے بجائے اپنا جسم ڈھیلا کر لوں۔ اس طرح قدرتی طور پر ان کے ہاتھ سست پڑ جاتے کیونکہ ابھی ابتدا تھی۔ پہلا واقعہ انھوں نے اتفاق محمول کیا ہوگا۔ اپنے ڈیل ڈول پر انھیں پورا اعتبار ہوگا اور سیٹھ کرم چند کو یہ جتانے کی بھی خواہش ہوگی کہ انھیں زیادہ ہاتھ پیر چلانے اور زور کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ وہ صرف ایک حملے میں مخالف کو زیر کر لیتے ہیں۔ چنانچہ مجھے یقین تھا، جلد ہی ان میں سے کوئی اپنے دوسرے ساتھی کو یہ کہہ کے ہٹا دے گا کہ وہ اکیلا کافی ہے لیکن یہ سب فضول باتیں تھیں۔ کیا میرے پاس ان کی رعایت ملنے کے سوا اپنے بچاؤ کا کوئی اور طریقہ نہیں رہ گیا تھا؟ ایسا نہیں تھا، ایک کی نسبت دو آدمیوں سے نمٹنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ان دونوں میں اپنے عمل کی یکسانی ممکن نہیں ہوتی۔ سوچ میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ وہ پہلے سے کتنی ہی منصوبہ بندی کریں مگر مخالف کے غیر متوقع جوابی داؤ پر غور کرنے اور آپس میں تبادلۂ خیال کرنے کا وقت نہیں ہوتا اور پھر ایک کو دوسرے کا ہر دم خیال رہتا ہے۔

میں ان کے نیچے دبا رہا۔ مجھے اپنے اور ان کے جسموں کے درمیان حرکت کے لیے ایک گنجائش درکار تھی۔ گنجائش انھیں دینی ہی تھی۔ وہ نہ دیتے تو میں نیچے سے زور کر کے انھیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیتا۔ ظاہر ہے، میری کشمکش سے ان کا حرکت کرنا لازم ہو جاتا اور یہیں مجھے کوئی موقع مل جاتا۔ میرا کوئی ہاتھ کھلا ہوتا تو اتنی دیر بھی نہ لگتی۔ میں ترچھے ہاتھ سے ان کے کولھوں اور کمر پر ضرب لگا سکتا تھا۔ میں نے کسی کشمکش کا اظہار نہیں کیا۔ انھوں نے میری کنپٹیوں پر ضربیں لگائیں۔ وہ میری کراہیں اور چیخیں سننے کی آرزو میں ہوں گے مگر میں جیسے بے دم پڑا رہا۔ مجھے بے مزاحمت دیکھ کے انھیں کچھ تردد ہوا۔ اپنی دانست میں انھوں نے ذرا سا اوپر اٹھ کے میرا جائزہ لینا چاہا۔ میں نے پھر بھی کوئی جدوجہد نہیں کی۔ نتیجتاً ان کی گرفت میں اور ڈھیل پیدا ہوئی اور انھوں نے گویا اپنے طور پر طے کر لیا کہ اب مجھے اٹھا کے زینے میں پھینک دیا جائے۔ جیسے ہی ان کا دباؤ کم ہوا اور وہ میرے جسم سے کسی قدر اوپر ہٹے، میں نے اسی لمحے سینے کے بل پوری طاقت کے ساتھ نیچے سے زور کیا۔ وہ منتشر سے ہو گئے۔ ایک میری ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ میں نے دوسرے کا خیال ترک کر کے پہلے اسی کے منہ پر گھٹنا مارا پھر بے دریغ ٹانگیں چلاتے ہوئے کم از کم اسے چند لمحوں کے لیے دور کر دیا۔ دوسرا جس کی عمر زیادہ تھی، غصے میں آ گیا تھا۔ اگر وہ مجھ سے لپٹا رہتا تو اتنی دیر میں دوسرا آ جاتا مگر اس نے پہلی بار کی طرح مجھے مارنا شروع کر دیا۔ میری ٹانگیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ میرے کولھوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے مارنے کے سبب میرا ایک ہاتھ بھی آزاد ہو گیا تھا۔ دوسرے کو اس نے دبا رکھا تھا۔ میرے لیے اب زیادہ دشواری نہیں تھی۔ میں نے کوئی پل ضائع کیے بغیر کھلے ہاتھ سے اس کے منہ پر پنجہ مارا۔ وہ ہڑبڑا کے پیچھے ہٹا، اس طرح میرا دوسرا ہاتھ بھی کھل گیا۔ پھر میں نے ادھر ادھر کروٹ بدلنے کے انداز میں اپنے جسم کو تین چار جھکولے دیے۔ اس عمل سے یہی مراد تھی کہ وہ اور متذبذب ہو جائے حالانکہ میں اس کی گردن پر ایک ترچھی ضرب لگا سکتا تھا لیکن مجھے خیال تھا کہ انھیں اپنے پیروں سے نیچے جانا چاہیے۔ انھیں کندھوں پر اٹھا کے موٹر تک لے جانے میں اور الجھن ہوتی۔ جس طرف میں کروٹ بدلنے کا ارادہ ظاہر کرتا تھا، اسی طرف وہ بھی دباؤ ڈالتا تھا۔ وہ میری تیزی کا ساتھ نہیں دے سکا۔ چوتھی مرتبہ میں صاف اس کے نرغے سے نکل گیا اور فرش پر لوٹتا ہوا ایک لحظے میں اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔

میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب پیش قدمی مجھے کرنی پڑے گی۔ اتنی دیر میں میں ان کے کس بل کا بڑی حد تک تخمینہ لگا چکا تھا۔ وہ زور میں کم نہیں تھے مگر انھیں اپنا زور مختلف طریقوں سے آزمانا نہیں آتا تھا۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، پہلا آدمی میرے اٹھنے کے دوران مجھے دوبارہ جکڑ لینے کے لیے پر تول رہا تھا۔ میں اٹھ گیا تو اس نے احتیاط مناسب سمجھی۔ دونوں کی پگڑیاں اتر چکی تھیں اور لمبے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں سے خون ابل رہا تھا۔ ان کا یہ اشتعال میرے لیے بہت سودمند تھا۔ دونوں ہاتھ پھیلائے ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر کھڑے ایک قسم کی بھبکیاں دے رہے تھے۔ میری پیش قدمی سے قبل انھوں نے بہرحال ایک داؤ آزمایا۔ دونوں ایک ساتھ آگے سے بڑھے تھے لیکن ایک مجھ سے چمٹ گیا، دوسرا اس کا ساتھ دینے کے بجائے میرے پیچھے چلا گیا۔ میں ادھر سامنے کے آدمی کو ہاتھوں پر لیے ہوئے تھا کہ پیچھے والے نے جست لگا کے میرے بازوؤں میں بازو ڈال کے انھیں پابند کر دیا اور سامنے والا اطمینان سے میرے منہ پر گھونسے اور طمانچے مارنے لگا۔

"ہنہ۔" کرم چند کے ہنسنے کی آواز آئی۔ "یکسر، استاد کا خاص آدمی۔"

کرمین ابھی تک اس سے التجائیں کر رہی تھی۔ شہہ پارہ کو اشارہ کر کے میں نے خاموش رہنے کی تاکید کر دی تھی۔ وہ خوف زدہ آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

مجھے احساس تھا کہ یہ کرمین بیگم کا بالاخانہ ہے، معاملہ زیادہ کھنچ گیا تو شہہ پارہ کی بھی رسوائی ہوگی۔ دوسرے کوئی ایسی ویسی بات ہو جانے سے تھل کی ناراضی کا بھی اندیشہ تھا، ہمارے سفر میں بھی رکاوٹ پیش آ سکتی تھی۔ پھر اگر کانتے، ماچھی، مارٹی وغیرہ اس اثنا میں واپس آ جاتے تو یہ ماجرا دیکھ کے اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ پاتے لیکن ان اندیشوں کی خاطر میں اپنے ہاتھ پیر نہیں باندھ سکتا تھا۔ جو کچھ مجھے کرنا تھا، جلدی کرنا تھا۔ پیچھے والا آدمی میرے بازو مقفل کیے ہوئے تھا، اس کے باوجود میں سامنے والے کی طرف جھپٹا اور زینے کی طرف چند قدم بڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے یہ عمل پھر دہرانا تھا۔ پیچھے والا آسانی سے میرے بازو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ادھر آگے والا اپنے مکوں کا نشانہ بنائے ہوئے تھا اور اس نے میرے دانتوں سے خون نکال دیا تھا۔ میں پیچھے والے کو ساتھ لیے ایک بار پھر سامنے کی طرف لپکا اور چند قدم اور آگے بڑھ گیا۔

میرا رخ واضح طور پر زینے کی سمت تھا۔ وہ یہ سمجھے کہ اب میں بھاگنے کی فکر میں ہوں۔ اس سے زیادہ خوش گوار بات ان کے لیے کوئی نہیں تھی چنانچہ انھوں نے مجھے بڑھنے دیا۔ سامنے والا البتہ الٹے

قدموں سے مجھ پر ہاتھ چلاتا ہوا آگے آگے رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ زینے پر وہ ہٹ جائے گا، وہیں میں اچانک بیٹھ کے اور پیچھے والے کو سر کے زینے میں لوٹ دوں گا۔ اسے ڈوب کا داؤ کہتے ہیں۔ اتنی دیر تک مجھے اپنے سامنے کے آدمی کی ضربیں اور برداشت کرتے رہنا چاہیے تھا لیکن زینے کے پاس عین موقع پر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ایک مرحلہ ایسا آگیا تھا کہ میں اچھل کے پیچھے والے کی ٹانگوں کے درمیان ایڑی مار سکتا تھا۔ میں نے آہستہ سے ٹانگ اُٹھائی اور جتنی طاقت سے اپنے پیچھے کے آدمی پر مار سکتا تھا، ماری۔ وہ ٹھیر نہیں سکتا تھا، بلبلاتا ہوا میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ اپنے ساتھی کی ہولناک چیخ سن کے دوسرے کے ہاتھ سٹ پٹا گئے اور وہ بدحواسی میں مجھ سے چمٹ گیا۔ میں نے اُس کا جسم زینے کے دروازے سے ٹکرا دیا۔ گُدّی سے اُس کے سر پہ گہری چوٹ لگی ہوگی۔

میں زینے سے کچھ اندر کمرے میں آگیا کیونکہ مجھے پیچھے والے کو بھی دیکھنا تھا۔ اُس کے پاس تمنچا بھی تھا اور خنجر بھی۔ میرے اندازے سے ضرب میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی پھر بھی ایک بار اسے غور سے دیکھ لینا بہتر تھا۔ وہ فرش پہ دُہرا پڑا کراہ رہا تھا۔ اُس کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔ اُس کے جلد حرکت میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا بلکہ بے سُدھ ہونے کا امکان زیادہ تھا۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کے احتیاطاً چاقو باہر نکال لیا۔ سامنے والے کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور بعید نہیں تھا کہ وہ آخری حربے کے طور پر تمنچا یا چاقو نکال لے۔ میرے پیچھے ہونے اور اُس کے ساتھی کو دیکھنے کے دوران اُس نے سنبھلنے میں چند لمحے لیے ہوں گے۔ میں نے مُڑ کے اُس کی طرف دیکھا تو وہ تمنچا باہر نکال چکا تھا۔

”نہیں!“ کمرے میں شہہ پارہ کی سسکتی ہوئی چیخ گونجی۔ وہ کرم چند کا بازو پکڑے فریاد کر رہی تھی۔ میں نے چاقو کھول لیا تھا۔ اُس نے جلدی سے چرخی گھمائی اور تمنچا مجھ پر تان لیا۔ اُسے وہ دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ آج سے ڈیڑھ دو سال پہلے کرمن بیگم کے بالاخانے پر ایسی ہی صورت پیدا ہوگئی تھی۔ اُس وقت سیٹھ لکشمی داس نے ہم پر تمنچا تان لیا تھا۔ موتی نے اُس کے اُسی ہاتھ پر اتنی چابک دستی سے چاقو مارا تھا کہ سیٹھ دیکھتا رہ گیا تھا۔ تمنچے کے سامنے میرے لیے بھی موتی کی ترکیب پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اُس نے بھی دیکھ لیا تھا کہ میرے ہاتھ میں چاقو ہے۔ مجھے ایک ہی خدشہ تھا کہ چاقو کہیں اور نہ لگ جائے سو بہت احتیاط سے اسے اچھالنا تھا۔ میری نظریں اُس کے چہرے اور انگلیوں سے بندھی تھیں۔ اُدھر کھٹکا دبانے کے لیے اُس کے ماتھے پر شکن اور انگلیوں میں جنبش ہوئی، اِدھر میں نے بجلی جیسی سُرعت سے بائیں طرف ہو کے چاقو پھینکا۔ کمرے میں گولی کا تیز دھماکا ہوا۔ ساتھ ہی تمنچا اُس کے ہاتھ سے گر گیا اور خون کی تلی چھوٹ پڑی۔ چاقو پھسلتا ہوا گزر گیا تھا اور اُس کے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں کٹ کے ہاتھ میں جھول رہی تھیں۔ میں نے بھاگ کے اُس کا تمنچا اُٹھا کے جیب میں ڈال لیا اور اُس کی پیٹی سے خنجر بھی نکال لیا۔ دوسرے کو ٹھوکر مار کے میں نے اُس کے دونوں ہتھیار بھی قبضے میں کر لیے۔ اُن دونوں کو اُن کی حالت پر چھوڑ کے میں دُور چلا آیا۔ شہہ پارہ اور کرمن بیگم دیوانہ وار میرے پاس آکے میرے ہاتھ اور شانے ٹٹولنے لگیں۔ میرے منہ سے ابھی تک خون جاری تھا۔ شہہ پارہ اپنے دوپٹے کے پلّو سے اُسے صاف کرنے لگی۔ کرمن اندر سے ٹھنڈا پانی اور ملازمہ بڑا سا اُگال دان لے آئی۔ غرارے کرنے سے خون کچھ رُک گیا لیکن ہونٹ کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ کُرتے پر خون کی بوندیں گر گئی تھیں۔ شہہ پارہ نے ایک چمچا شکر میرے منہ میں ڈال دی اور میرے گال اور گردن سے پسینہ خشک کرتی رہی۔ کرمن پنکھا جھلنے لگی۔ میں نے اُسے روک دیا۔

کرم چند ساکت و جامد کھڑا تھا۔ زینے پر اُس کے آدمیوں کے آنے اور مجھ پر حملہ آور ہونے کے بعد صرف چند منٹ صَرف ہوئے ہوں گے مگر وہ چند منٹ بہت طویل تھے۔ اُسے اپنے کراہتے اور سسکتے ہوئے آدمیوں کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ وہ ٹھٹھری ہوئی نگاہوں سے مجھے تکتا رہا۔ میں نے سوچا، جا کے اُسے ایک طمانچا ماروں مگر میں نہیں گیا۔ میں نے وہیں سے دھیمی آواز میں اُسے مخاطب کیا۔

”کرم چند! اِن کو اُٹھا لو۔“

میری آواز سن کے اُس نے ایک جھرجھری لی اور خاموش رہا۔ اپنے دونوں آدمیوں کو سنبھالنا اُس کے لیے مشکل تھا اور اُس کی شان کے خلاف بھی ہوگا۔ میرے اشارے پر کرمن نے گھر کے تمام ملازم اور سازندے بلا لیے۔ دونوں آدمی اِس قابل نہیں تھے کہ نیچے جا سکیں۔ پہلے والا تو تقریباً بے ہوش ہوگیا تھا۔ وہ اُسے پانی پلانے، جھنجوڑنے اور مالش کرنے لگے۔ دوسرے کی انگلیوں پر کپڑا باندھ دیا گیا۔ اس بات کا قطعی امکان تھا کہ سیٹھ کرم چند نیچے جاتے ہی پولیس کا رُخ کرے۔ پھر میرے لیے پولیس کو سمجھانا اتنا آسان نہ ہوتا۔ کرم چند پہلے ہی انھیں بھر دیتا اور میرے پچھلے ریکارڈ کے باعث سارا الزام مجھی پر آتا۔ کرمن اور شہہ پارہ پولیس میں اُس کے خلاف گواہیاں دیتیں تب بھی دیر تو لگ ہی جاتی۔ مناسب یہی تھا کہ کرم چند پولیس تک جانے کی ہمت ہی نہ کرے۔ ایک اور احمقانہ بات میرے ذہن میں آئی کہ میں یہاں سے فرار ہو جاؤں اور اڈّے پر جا کے چھپ جاؤں۔ پولیس اڈّے پر پہنچ گئی تو مجھل اُس سے نمٹ لے گا پھر میں اُسی وقت باہر نکلوں گا جب سفر کے لیے روانہ ہونا ہوگا۔ کرم چند نے اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھا تھا مگر میں نے اُس کے سامنے مجھل کا حوالہ بھی دیا تھا۔

اُسے کرمن کی ایک ایک بات یاد آ رہی ہوگی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مزید کسی ہنگامے سے بچنے کے لیے پولیس کو درمیان میں نہ لائے لیکن اُس نے پہلے ہی کرمن اور شہہ پارہ کی فریادوں پر کان نہیں دھرے تھے، اب کیا ضمانت تھی کہ وہ باز رہے گا۔ ساری بات وقت کی تھی۔ وقت کم تھا۔ ہمیں جلد ہی کلکتے سے روانہ ہونا تھا۔ ایک اور تدبیر بھی تھی کہ کرم چند کو اتنا تھکا کے اور شکست خوردہ کر کے بھیجا جائے کہ اُس کے پولیس تک جانے کی نوبت ہی نہ آئے۔ میں نے ایک سازندے سے کہا کہ کانتے جہاں کہیں بیٹھا ہو اُسے بلا لاؤ مگر پھر میں نے اُسے خود ہی منع کر دیا۔ وہ کرم چند کا پروردہ بھی ہو سکتا تھا۔ اِسی گھر کے کسی آدمی نے ہمارے یہاں آنے کی خبر اُسے پہنچائی تھی۔ ”کرم چند! اب اپنے لیے تم نے کیا سوچا ہے؟“ میں نے اپنی آواز تیز نہیں ہونے دی۔ ”تمھیں یہاں کھڑکی سے نیچے پھینک دیا جائے یا شیالے اور کرمن بیگم کی شہادت پر پولیس کے حوالے کر دیا جائے یا ہم تمھیں تمھاری ہی موٹر میں اڈّے پر لے جائیں جہاں تم تینوں کی ہڈیاں بھی نہ مِل سکیں؟“

”ٹھیک ہے۔“ وہ گہری سانس لے کے بولا۔ ”ہم جاتا ہے۔“

”اور کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔ تم یا تمھارا کوئی آدمی اگر پھر اِس زینے پر چڑھتا دیکھا گیا تو وہ واپس زینے سے نہیں جائے گا۔“

”ہم سمجھتا ہے۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”نہیں، اگر سمجھنے میں کوئی کسر رہ گئی ہو تو تم اور میں دونوں یہاں موجود ہیں۔ تم کو اپنے اور باڈی گارڈوں کو بلانے کی اجازت ہے۔“

”اب ان حرام زادوں کو دیکھ کے کیا کرے گا۔“ وہ مایوسی سے بولا۔ ”جو تم بولتے ہو وہ سب ٹھیک ہے، تم خوشامد نہ سمجھو تو ہم ایک بات بولے۔“

”بولو۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

”ہم تمھارے گلے میں اپنی زنجیر ڈالنا چاہتا ہے۔“

”جاؤ، جاؤ۔“ میں نے اُسے دھتکار دیا۔

”ہم ٹھیک دل سے بولتا ہے۔“

”زیادہ باتیں مت کرو، دفع ہو جاؤ۔“

شہہ پارہ نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے تحمل کی التجا کی۔ جس آدمی کی انگلیاں کٹ گئی تھیں، وہ دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا تھا۔ اُس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ اُسے شدید تکلیف ہے۔ سازندے اُسے پنکھا جھل رہے تھے۔ دوسرا بے دم سا پڑا تھا۔ سازندے اُسے نیچے لے جانے کے لیے اُٹھانے لگے۔ میں نے اُنھیں ٹھیرنے کو کہا اور خود بڑھ کے دروازے پر اُس آدمی کے پاس پہنچا جس کا خون پٹی باندھنے کے باوجود نہیں رُکا تھا۔ پٹی کا کپڑا سارا لال ہوگیا تھا۔ میں نے سازندوں کو اُس کی پٹی کھولنے کی ہدایت کی۔ شہہ پارہ اور کرمن بیگم میرے قریب آ کے بیٹھ گئیں۔ اندر سے کپڑا منگوا کے میں نے اُس کی دوبارہ پٹی کی۔ جھولتی ہوئی انگلیاں سیدھی کر کے انھیں علیحدہ پٹی سے باندھا اور خون رُکنے کے لیے کلائی پر ایک اور پٹی کس دی۔ پھر میں نے اُس کا سارا ہاتھ لپیٹ دیا۔ میں نے دانستہ دیر لگائی تھی۔ کرم چند کا کوئی بھروسا نہیں تھا کہ نیچے جا کے اُس کے دماغ میں کیا آ جائے۔ وہ چال بازی بھی کر سکتا تھا۔ پٹی سے نمٹ کے میں دوسرے آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔ کرم چند کو ٹھیرانے کے لیے میری تدبیر کارگر ہوئی۔ اسی دوران زینے سے اُن لوگوں کی آوازیں آنے لگیں۔ نیچے اُنھوں نے موٹر دیکھ لی ہوگی اس لیے اُن کی رفتار تیز تھی۔ سب سے پہلے کانتے اندر داخل ہوا اور بھونچکا سا ہو کے کمرے کی افراتفری دیکھنے لگا۔ ”لاڈلے!“ وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”ہاں کچھ گرما گرمی ہوگئی۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”تُو نے اپنا منہ کیسے بگاڑ لیا؟“

”بس ہوگیا کانتے!“

”ہرے!“ کانتے پھنکار کے بولا۔ ”کرمن بیگم! اپنے کو بولو، یہ سب سالا کیا ہے؟“ اُس نے کرمن کا گلا دبوچ لیا۔

ساتھ ہی ماچھی دہاڑا۔ ”اپن کے لاڈلے پر کس حرام کے جنے نے ہاتھ اُٹھایا؟“ اُس نے گالی دے کے پوچھا اور سیٹھ کرم چند کو گریبان سے اُٹھا کے فرش پہ پٹخ دیا۔

”چھوڑ دے۔“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”بات ختم ہو چکی ہے۔“

”اپن کیا دیکھ رہا ہے لاڈلے!“ مارٹی نے بھی چاقو نکال لیا تھا۔ ”یہ دو آدمی ساتھ لے کے آیا تھا۔“

”اور تجھ کو اتنی دیر لگی لاڈلے؟“ کانتے غصّے سے بولا۔

”دیر ہی لگ گئی۔“ میں اُسے کیا بتاتا کہ میرے ہاتھ رُک رہے تھے۔

”کیا یہ سور کے بچے تیرے کچھ لگتے تھے؟“

”کانتے!“ میں نے بیزاری سے کہا۔ ”جانے دے۔“

”کیسے جانے دے۔“ وہ سیٹھ کے منہ پر اُلٹے ہاتھ سے طمانچا مارتے ہوئے بولا۔ ”کرمن! تُو نے اِس چوہے کی اولاد کو بولا نہیں کہ لاڈلا کون ہے؟“

”بتایا تھا، خدا کی قسم بتایا تھا۔“ کرمن گڑگڑانے لگی۔

”پھر بھی یہ سالا نہیں مانا، ہائیں کون ہے یہ اُلّو کا پٹھا؟“

”یہ سیٹھ کرم چند ہیں۔“ کرمن سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

”یہ ہے وہ سالا!“ کانتے نے فرش پر تھوک کے کہا۔ ”کلکتے میں نیا نیا آیا لگتا ہے۔ شوقینی کرنے نکلا تھا، اِدھر چڑیا بھی اپنے کو بولے بغیر نہیں اُڑتا۔ لاڈلے نے ضرور تیرا اور تیری ماں کے یاروں کا دھیان کیا۔“

میں نے جا کے کانتے کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اُستاد کے سامنے کیا یہ سُوجا ہوا منہ لے کے جائے گا؟" کانتے ہی سے بولا۔ "وہ کیا بولے گا۔"

"کچھ نہیں بتّھل بھائی سُنیں گے تو کچھ نہیں کہیں گے۔"

"پر لاڈلے! پہلے اِدھر مجھ کو جواب دے، تجھ کو دیر کیوں لگی؟"

"بہت سی باتوں کا خیال تھا ورنہ کیا دیر لگتی۔" میں نے جھلّا کے کہا۔

"وہی تو میں پوچھ رہا ہوں رے!"

"بتا دوں گا۔ تیری سمجھ میں اِس وقت کچھ نہیں آئے گا۔"

"ایمان سے اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔" وہ سر جھٹکنے لگا۔

"میں چاہتا تھا کہ انھیں اُٹھا کے نہ لے جانا پڑے۔ تجھے یاد نہیں ہمیں آگے جلدی جانا ہے۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"لاتوں کے بھوت تیری باتوں سے مان جاتے۔ خیر، جو تُو بولتا ہے، پڑھا لکھا ہے، سمجھ کی بات ہے۔ میری گُدّی ذرا ساتھ نہیں دیتی۔" کانتے اُونچی آواز میں بولا۔

"ان کو نیچے پہنچانے کا انتظام کرو۔"

"زینے پر لوٹ دیتا ہوں۔ اپنے آپ چلے جائیں گے۔"

"لوٹنے کو تو میں بھی لوٹ سکتا تھا۔"

"یہی تو میں بول رہا ہوں۔"

"اور یہی بات تیری عقل میں نہیں آ رہی ہے۔ تجھ کو کچھ آگے پیچھے کا ہوش نہیں۔ تو چپ رہ۔"

کرم چند اور اُس کے آدمیوں کو نیچے چھوڑ کے وہ اُوپر آئے تو میرے گرد اکٹھے ہو گئے۔ کمرے میں کچھ دیر تک سکوت طاری رہا۔ میں نے زبان نہیں کھولی۔ ماچھی کرمن سے سوالات کرنے لگا۔ جب تک کرمن نے انھیں ایک ایک بات نہیں بتا دی، اُن کی تسلی نہیں ہوئی۔ سازندے بھیگے ہوئے کپڑوں سے قالین سے خون کے دھبّے مٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک ملازم چائے لے آیا۔ شہہ پارہ نے چائے دودھ اور چینی ملا کے ہم سب کو پیش کی۔ رات بہت ہو گئی تھی۔ کانتے اُٹھا، اُس کے اُٹھ جانے پر سبھی اُٹھ گئے لیکن میں بیٹھا رہا۔

"کیوں لاڈلے!" کانتے ترشی سے بولا۔ "تو نہیں چلے گا؟"

"مجھے کرمن بیگم سے ایک بات کہنی ہے۔"

"کیا بات ہے لاڈلے میاں! بندی سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا۔" کرمن مضطرب آواز میں بولی اور میری شکل دیکھنے لگی۔

"کرمن بیگم! شپارے اب نہ کبھی گائے گی، نہ ناچے گی۔"

کرمن کے ہونٹ لرز کے رہ گئے۔

"تم نے سیٹھ کرم چند سے دو لاکھ کو کہا تھا، وہ میں تم کو دے دوں گا۔" میں نے اُس کے جواب دینے سے پہلے تیزی سے کہا۔ "شپارے اب میری ہے۔ اس کا تم سے کوئی واسطہ نہیں، ابھی میں سفر پر جا رہا ہوں۔ تم کو پچیس ہزار روپے کل کانتے کے ذریعے مل جائیں گے۔ باقی رقم میرے آنے پر ملے گی جب میں شپارے کو یہاں سے لے جاؤں گا لیکن اس عرصے میں بالاخانہ بالکل بند رہے گا۔ کانتے تمھارے اور شہہ پارہ کے خرچ کے لیے پانچ سو روپے ماہانہ دیتا رہے گا۔ منظور ہے؟"

شہہ پارہ کی بے تاب نظریں میرے چہرے پر مچل رہی تھیں، کرمن نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ کمرے میں سُوئی بھی گرتی تو آواز آ جاتی۔ وہ سب مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ "شپارے تمھارے پاس میری امانت کے طور پر رہے گی اور میں تمھیں صاف بتا دوں کہ مجھے یہاں سے اسے کسی اور بالاخانے پر نہیں لے جانا ہے۔ اگر تم اس سے کچھ بھی ہمدردی رکھتی ہو تو میری بات مان لو گی اور یوں بھی کہ یہ شپارے کی مرضی کے مطابق ہے۔ بولو، تمھارا کیا جواب ہے؟"

"تم حواس میں تو ہو لاڈلے میاں!" کرمن کانپتے لہجے میں بولی۔

"میں بالکل حواس میں ہوں۔" میں نے اپنی آواز پر ضبط پاتے ہوئے کہا۔ "تمھیں آج نہیں تو کل شہہ پارہ کو کسی نہ کسی کے حوالے کرنا ہی دینا ہے تو میرے حوالے کرنے میں کیا حرج ہے؟ یہ تمھارے ساتھ اتنے دن رہی ہے، کچھ تو اِس کی منشا کا خیال کرو۔ اگر تم نہیں مانو گی تو میں اسے یہاں سے اُٹھا کے نہیں لے جاؤں گا لیکن میں تم سے کہتا ہوں، ایک دن یہ ضرور گھٹ گھٹ کے مر جائے گی۔ رقم کچھ کم ہو تو مجھے بتا دو۔ سیٹھ نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ تم نے دو لاکھ مانگے ہیں، وہ دو لاکھ پر آمادہ نہیں تھا ورنہ پہلے ہی دے دیتا۔"

"پھر کسی وقت بات ہو گی لاڈلے میاں! تم جا کے آرام کرو۔"

"بات اِسی وقت ہو گی۔ کیا تم مجھ پر یقین نہیں کرتیں؟ کیا تمھیں شک ہے کہ میرے پاس رقم نہیں ہے؟"

"میں تم پر شک نہیں کر رہی ہوں۔ بہتر یہ ہو گا کہ تم اُستاد بتّھل سے پوچھ لو۔"

"اُن کی بات بعد کی ہے۔ پہلے تم بتاؤ، کیا تمھیں کوئی انکار ہے؟"

"میری عقل حیران ہے کہ میں کیا جواب دوں۔ ٹھیک ہے، میں نے سُن لیا ہے۔ اگر تمھیں میری مرضی کا اتنا پاس ہے تو مجھے کچھ سوچنے اور سمجھنے کا موقع دو۔"

"اس میں سوچنے سمجھنے کی کیا بات ہے۔ تم نے ہزار بار اس پر غور کیا ہو گا۔ بیچ میں تم ہے، شپارے تمھاری بیٹی نہیں ہے۔ تم نے بھی اسے خریدا ہے اور یہی سوچ کے خریدا ہے کہ کل تمھیں اس کے منہ مانگے پیسے مل جائیں گے۔ ایسا ہے کہ نہیں؟ پھر تمھیں کاہے کا پس و پیش ہے۔"

"یہ درست ہے کہ شہہ پارہ میرے پیٹ سے پیدا نہیں ہوئی لیکن یہ میری بیٹی کی طرح ہے۔ پوچھ لو شپارے سے کہ کیا میں نے کبھی اس سے اُونچے لہجے میں بات کی ہے۔"

"لیکن کوئی ماں اپنی بیٹی کو یوں لوگوں کے سامنے نہیں کر دیتی۔ تم اسے بیٹی تو کہتی ہو مگر ماں کی طرح اس کا خیال نہیں کر رہی ہو۔ مجھے نہیں معلوم تم خود کیسے یہاں آئی تھیں۔ تم بھی ایسے ہی لائی گئی ہو گی جیسے شپارے کو لایا گیا تھا۔ پھر تم کیوں شپارے کا دُکھ محسوس نہیں کرتیں؟ اور اگر تم شروع سے یہاں ہو تو بھی تم سے کم شپارے کی ایک ہم صنف ہونے کے ناتے تمھیں میری پیشکش پر توجہ دینی چاہیے کیونکہ میں شپارے کے لیے تم سے بہتر ارادہ رکھتا ہوں۔ میں اس کے لیے غلط نہیں سوچ رہا ہوں۔ میں سیٹھ کرم چند نہیں ہوں۔"

"میاں!" وہ تند لہجے میں بولی۔ "کیسی باتیں کرتے ہو۔ ماشاء اللہ ابھی چڑھتی جوانی ہے، خون گرم ہے۔ زندگی کی اُونچ نیچ سے واسطہ نہیں پڑا ہے۔ یہاں ساری عمر لوگوں کو دیکھتے ہوئے بیت گئی ہے۔ کتنے لوگ آئے اور چلے گئے۔ آدمی کا بوجھ سنبھالنا سب سے مشکل کام ہے خصوصاً کوڑے کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے آدمی کا۔ اُجلے کپڑوں پر دھبّے پڑ جاتے ہیں۔ آدمی کو تو سنبھال لو گے، نگاہیں نہیں سنبھالی جائیں گی۔ کیوں تنکے چھوتے ہو۔ کس بدنصیب کا جی یہاں رہنے کو چاہتا ہے پر جو لکھا ہے، اُسے کوئی کیسے مٹا سکتا ہے۔ زمین پر رہنے والے کو زمین ہی کی طرف دیکھنا چاہیے، تم دو ہی ملاقاتوں میں شپارے کے عزیز ہو گئے اور جو اُس کے ساتھ مدت سے رہے، اُسے اس کا بُرا بھلا سوچنے کے لیے تھوڑا وقت دینے کو بھی تیار نہیں ہو۔ رہی کرم چند کی بات تو کیا تمھارا خیال ہے، میں شپارے کو ہمیشہ کے لیے اُس ہرجائی کے حوالے کر دیتی؟ مجھے معلوم ہے کب تک اُس کی آنکھ سمٹی رہتی۔ شپارے کو پھر ایک دن یہاں آنا تھا اور پھر میں ...... میں شپارے کو جُدا کر کے یہاں کیا خاک پھانکتی۔ میری پونجی شپارے کے سوا اور کیا ہے۔"

"سبھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں، سوچنے کا وقت مانگنا ٹالم ٹول ہے۔ حیدرآباد کا بازار بند نہیں ہوا ہے۔ تمھارے پاس پیسے ہوں گے تو تم دس لڑکیاں اور لے آؤ گی۔ پہلے یہاں ایک پری بیگم بھی تھی، اب نظر نہیں آ رہی ہے۔ وہ کہاں گئی؟ رقم زیادہ درکار ہو تو بتا دو۔ میں سودے بازی نہیں کروں گا اور تم۔ تمھیں یہاں بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم اب اللہ اللہ کیوں نہیں کرتیں۔ اگر تم یقین رکھتی ہو کہ اللہ میاں یہ باتیں ناپسند کرتا ہے تو اُسی کا احساس کر لو اور چاہو تو شپارے کے ساتھ ہی رہو۔ تم اتنا روپیہ لے کے کہاں جاؤ گی؟ کیوں اتنی ہوس کرتی ہو؟"

"زیادہ آڑی مت کر کرمن!" کانتے اُسے چُپ دیکھ کے ناراضی سے بولا۔ "لاڈلا اتنی باتیں بول رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے میاں! تم جیسا کہتے ہو وہی ٹھیک ہے۔" خاصی دیر بعد کرمن نے جھجکتے ہوئے زبان کھولی۔ "سفر سے واپس آ جاؤ۔ میرا وعدہ ہے، شپارے تمھاری رہے گی۔"

شہہ پارہ اُس کے بازو سے چمٹ کے بلکنے لگی۔ کرمن نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ خود اُس کی آنکھوں میں بھی آنسو چھلک آئے۔ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔ "قسمت کو یہی منظور ہے تو کون اسے بدل سکتا ہے، پیاری جان۔"

"کیا تم خوش نہیں ہو شپارے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

اُس نے ڈبڈبائی نظروں سے مجھے دیکھا اور کرمن کو چھوڑ کے میرے پیروں سے لپٹ گئی۔ اُس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اُسے اُٹھانے کے لیے اُس کے شانے تھامتے وقت میرے ہاتھ بھی کپکپانے لگے۔ جب میں نے اُسے کھڑا کیا تو اُس کا سر میرے کندھے پر ڈھلک گیا۔ "رو کیوں رہی ہو؟" میں نے اُسے بچکارتے ہوئے کہا اور اپنے دامن سے اُس کی آنکھیں خشک کرنا چاہا لیکن مجھ سے بھی آنسو نہیں روکے جا سکے۔ جتنا میں روکنے کی کوشش کرتا تھا، آنسو اتنے ہی اُمڈ اُمڈ کے چلے آتے تھے۔

کانتے میری کمر پر تھپکیاں دیتا رہا، پھر شاید اُسی نے کچھ کہا تو کرمن بیگم نے آ کے شہہ پارہ کو تھام لیا اور اُسے مجھ سے جُدا کر کے دور لے گئی۔ میرا دل اُسے ایک لمحے کے لیے وہاں چھوڑنے کو تیار نہیں تھا لیکن میں اُسے ساتھ بھی نہیں لے جا سکتا تھا۔ سبھی خاموش تھے اور سبھی کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ کانتے کا سارا چہرہ بھیگ گیا۔ ضرور اُسے فیض آباد میں چمپا بیگم کے بالاخانے کی بات یاد آ گئی ہو گی۔

ہمیں رخصت کرنے کے لیے شہہ پارہ ڈیوڑھی تک ساتھ ہی آئی اور مجھ سے زیرِ لب پوچھنے لگی کہ اب میں کب آؤں گا؟

"اگر کل کہیں نہ جا سکے تو کسی وقت آنے کی کوشش کروں گا۔ چلے گئے تو پھر دیکھو کب ملاقات ہوتی ہے۔ میں کانتے کو سب سمجھا دوں گا۔ وہ یہ سارا انتظام کرے گا۔ تم کسی چیز کی فکر مت کرنا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو کانتے کو بُلا کے کہہ دینا۔ میں جلد واپس آنے کی پوری کوشش کروں گا اور اگر نہ آ سکا! ....." شہہ پارہ نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

کرمن بیگم بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ باہر نکلنے سے پہلے میں نے اُسے تاکید کرنا ضروری سمجھا۔ "میں اگر نہ آ سکا تو کانتے اسی شہر میں موجود ہے۔ رقم اسی کے پاس ہو گی۔ یہ تمھیں ادا کر کے شپارے کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔ تم چاہو گی تو کانتے تمھارے اور شپارے کے لیے کسی اچھی جگہ مکان کا بندوبست بھی کر دے گا لیکن اچھی طرح سن لو، تم نے درمیان میں کوئی چال چلی یا شپارے کو کسی اور کے سپرد کیا تو پھر سمجھ لینا میں اکیلا نہیں ہوں۔"

"زبان دے چکی ہوں میاں!" کرمن ٹھنڈی سانس بھر کے بولی۔

میں نے شہ پارہ کو ایک نظر دیکھا اور ڈیوڑھی سے باہر نکل آیا۔ اُس کی ٹمٹماتی آنکھیں دُور تک میرے ساتھ چلتی رہیں۔

گلی سنسان پڑی تھی۔ ٹلو اڈّے کے باہر کھمبے کی روشنی میں چوسر کھیل رہا تھا۔ اُسی نے بتایا کہ بھجل، پیرو اور جامو اُوپر فلیٹ میں جا کے پھر نیچے نہیں آئے۔ تھوڑی دیر میں کبن خاں، وزیر اور وہ تمام آدمی بھی آ گئے جو ہم سے الگ ہو کے دوسرے بالاخانوں پر گئے تھے۔ کانتے نے وہیں کسی آدمی کے ذریعے اُن سے کہلوا دیا تھا کہ وہ ہمارا انتظار نہ کریں، گانا سُننے کے بعد خود اڈّے پر پہنچ جائیں۔ کبن خاں آہیں بھرتا ہوا آیا تھا۔ "لُوٹ لیا کلکتے والی نے۔ لُوٹ لیا کانتے! ہائے تمھارے کبن کو لُوٹ لیا۔" وہ کانتے کے سینے پر سر رگڑتے ہوئے بولا۔

"سنبھل کبن! ہر وقت مسخری اچھی نہیں ہوتی۔" کانتے ترشی سے بولا۔ کبن خاں یک لخت سیدھا ہو گیا اور کانتے کو گھورنے لگا۔ آنے والے شور مچاتے ہوئے آئے تھے پر ہم میں سے کسی نے اُن سے کچھ نہیں کہا تھا۔ "کانتے!" کبن خاں منہ بگاڑ کے بولا۔ "تیری ماں سر گئی ہے کیا؟"

"ہاں کبن! کچھ ایسا ہی جان لے۔"

"کیا بات ہے جانی؟" کبن خاں نے اُسے بازوؤں میں بھر لیا۔

"کبن! اس وقت کچھ بات مت کر، جا کے سو جا۔" کانتے اکتا کے بولا۔

"بتائے گا نہیں تو نیند نہیں آئے گی کنٹو!"

معلوم نہیں، کانتے نے کبن خاں کو کیا بتایا۔ میں اُن کے درمیان سے ہٹ کے اُوپر چارپائی پر آ کے لیٹ گیا۔ مجھے گہری نیند آ گئی۔ صبح نصیب میاں نے میرے پیر کا انگوٹھا ہلایا تو میری آنکھ کھلی "اُٹھ جاؤ نوشہ! اُٹھو سونے والو کہ میں آ چکی ہوں۔" وہ آہستہ آہستہ مجھے آوازیں دے رہا تھا۔ "دھوپ منہ پر آ گئی ہے۔ نیچے شہزادے کا انتظار ہو رہا ہے۔" میں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ نصیب میاں سچ کہہ رہے تھے۔ دھوپ میرے سارے جسم پر پھیلی ہوئی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کے میں نیچے آیا تو سب میرا انتظار کر رہے تھے۔ سب کی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ رات والی بات بھجل کو معلوم ہو گئی ہے لیکن نہ بھجل نے مجھ سے کچھ کہا، نہ کسی اور نے۔ ناشتے کے بعد میرا ارادہ کانتے کو بینک لے جانے کا تھا۔ پتہ چلا کہ گاڑیاں آ چکی ہیں۔ کل کی طرح آج بھی بھجل نے ہم سے گردیال کے باغ میں جانے کو کہا۔ وہاں سے واپسی شام کو ہوتی اور بینک بند ہو جاتا۔ بس یہی اچھا ہوا کہ بھجل اور پیرو ہمارے ساتھ نہیں گئے، نہیں تو مجھے باغ سے لوٹ کے آنا پڑتا۔ راستے میں ایک بینک نظر آیا تو میں نے گاڑیاں رکوا لیں اور کانتے کے ساتھ عمارت میں داخل ہو گیا۔ میں نے کانتے کے نام دو لاکھ روپے کا ایک چیک لکھ کے اور اُس کے اکاؤنٹ کا فارم بھر کے

مینیجر کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ اتنی بڑی رقم کا چیک دیکھ کے تذبذب میں پڑ گیا۔ میں نے اُس کی تسلی کے لیے جمع کی ہوئی رقم کی رسیدیں دکھا دیں۔ ہم سے پوچھے بغیر اُس نے ہمارے لیے سوڈا لیمن کی ٹھنڈی بوتلیں لانے کا حکم دیا۔ میں انکار کرتا رہا۔ وہ نہیں مانا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ کیا میں بمبئی میں رہتا ہوں؟

"کبھی رہتا تھا۔" مجھے چلنے کی جلدی تھی سو میں نے مختصر بات کی۔

"کیا کاروبار ہے جناب کا؟"

"کوئی خاص نہیں۔" میں نے سرسری جواب دیا۔

"زمیں دار ہوں گے؟" وہ مسکرا کے بولا۔

"ہاں، یہی سمجھیے۔"

"اب اِدھر کلکتے میں رہنے کا ارادہ ہے؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

"کلکتے میں رہیں تو مجھے خدمت کا موقع دیجیے گا۔" میں نے سر ہلا کے حامی بھری۔

ضروری کاغذوں کی خانہ پُری کے بعد سب سے بڑا مرحلہ کانتے کے فارم کی تصدیق کا تھا۔ تصدیق وہی شخص کر سکتا تھا جس کا اکاؤنٹ بینک میں ہو۔ ڈھونڈنے سے ایسا آدمی مل بھی جاتا مگر وقت نہیں تھا۔ میں نے مینیجر کی منت کی کہ وہ خود ہی تصدیق کر دے۔ وہ ہچکچایا۔ میں نے چیک اور فارم میز سے اُٹھا لیے، میں انھیں پھاڑنے ہی والا تھا کہ مینیجر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "آپ تو ناراض ہو گئے؟ یہ خانہ پُری کچھ ضروری ہوتی ہے۔" وہ مہذب لہجے میں بولا۔ "لائیے، میں دستخط کیے دیتا ہوں۔"

مختلف فارموں پر دستخط کرانے کے بعد اُس نے کانتے سے کہا کہ وہ تین چار روز میں چیک بُک لے جائے، وہ نہ آیا تو ڈاک سے بھیج دی جائے گی۔ کانتے نے اڈّے کے بجائے گلی کے ایک دوست دکان دار کا پتہ لکھوا دیا تھا۔ مینیجر ہمیں عمارت کے باہر تک پہنچانے آیا۔

کانتے سے ضبط نہیں ہوا۔ باغ میں نشانے بازی کی مشق کرتے ہوئے وہ پوچھ ہی بیٹھا۔ "لاڈلے! ایک بات بول! تیرے پاس اتنی دولت کدھر سے آئی؟"

مجھے شبہ تھا، اُسے سب معلوم ہوگا، بمبئی میں جولین اور جمیا نے شاید اُسے بتا دیا ہوگا مگر اس کا مطلب یہ تھا کہ جولین نے میری طرف سے اپنے نام کرشنا جی کی آدھی رقم کا چیک ملنے اور لوٹانے کا کوئی ذکر اُس سے نہیں کیا تھا۔ "آ گئی بس۔" میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آسمان سے گری تھی۔"

"مجھ کو پتہ ہے لاڈلے! تو نے زری بہن کی حویلی اور زمینوں کے کاغذات چھُو کے بھی نہیں دیکھے۔ مجھ سے بولنے میں کوئی حرج ہے کیا؟"

"نہیں کانتے! اچھا ہے تجھ کو پتہ رہے کہ یہ پیسہ بہت عزت کا

نہیں ہے۔ اس کا ایک ایک پیسہ میرے لیے لاکھ روپے کے
ین نے اس سے پہلے صرف ایک بار اس میں سے کچھ رقم نکالی
جی نے جانے سے پہلے اپنی تمام جائداد اور نقدی میرے نام
کرشنا جی کو تو تو جانتا ہی ہے۔"
ھوں نے!" وہ آنکھیں پھاڑ کے بولا۔ "میں نے اُن کی تصویر
رے میں دیکھی تھی۔ وہ روز اُس پہ ہار ڈالتی ہے۔"
ہی تھے، جولین کو بھی وہ بہت پسند تھے اور مجھے اپنا بیٹا
۔ ایک ماں کے سوا اُن کا کوئی نہیں تھا، ماں بھی مر گئی۔" میرا
نے لگا۔
انے بازی بھول کے وہ مجھ سے کرشنا جی کی باتیں سنتا رہا۔
اب فسانہ تھیں لیکن اب بھی کبھی کسی لمحے ایسا محسوس ہوتا
شنا جی کسی گوشے میں چھپے کھڑے ہیں اور مجھے دیکھ رہے
اچانک میرے سامنے آ جائیں گے۔ باغ میں گولیاں چل رہی
ب نشانے لگا رہے تھے۔ میں اور کانتے چوکی دار کی چارپائی
ے کرشنا جی کی باتیں کرتے رہے۔ دوپہر کو پیرو اور بھجل باغ
ادر آتے ہی انھوں نے ایک ایک آدمی سے نشانے لگوا کے
بھی کے ہاتھ تمنچوں اور بندوقوں پر رواں ہو گئے تھے۔ "مڈے
ب میں تیز تھا۔ اُس نے ایک اُڑتے ہوئے پرندے کو گولی
۔ اِس کے باوجود بھجل نے اُسے ساتھ لے جانے سے صاف

ی رات جب ہم اڈّے واپس پہنچے تو بھجل نے ہم سب کو
ے کمرے میں بلا کے اپنی روانگی کا اعلان کر دیا۔ ساتھ جانے والوں
ں کے نام اُس نے لیے اُن میں پیرو، جامو، زورا، مارٹی، وزیر،
لو مینی، متن میاں، پلٹو، بھجل اور میں شامل تھے۔ بارہ سے
یں۔ اُس نے ماچھی کا نام نہیں لیا تھا۔ کبن خاں اور کانتے
یں وہ پہلے ہی منع کر چکا تھا۔ ماچھی کا منہ لٹک گیا۔ بھجل کو
حساس تھا۔ وہ ماچھی کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے نرمی سے
یں ساتھ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ پر تجھے اُدھر بمبئی میں ہی رہنا
ر پیرو بھی نہیں ہے۔ میں نے رائے بدل دی ہے۔"
ند اپن سارا فٹ فاٹ کر کے آیا ہے استاد! پیرو داوا سے
ی اُداسی سے بولا۔
یرو کی منشا بھی یہی ہے کہ تجھ کو اُدھر سے اتنی دیر دُور نہیں
ہم کو آنے میں دیر بھی لگ سکتی ہے۔"
ماری مرضی! اپن نے تو پہلے ہی بول دیا تھا۔"
سانے بھی سب سے پہلے بول دیا تھا۔"
بھجل کے سوا کسی نے زبان نہیں کھولی اور ماچھی نے بھی پہل نہیں

کی تھی۔ بھجل خود نہ کہتا تو ماچھی بھی چپ رہتا۔ "چھیدا ابھی بمبئی جا کے اڈّے کو دیکھے گا۔" بھجل نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔ "مڈا بھی ان دونوں کے ساتھ اُدھر لوٹ جائے گا۔"

"اپن روز سب کی چمپی کریں گا۔" مڈا اُچھل کے بولا۔

"اُدھر سر اور بدن کھلا رکھنے کی نوبت آئے تبھی تو ایسا کرے گا مڈے!" بھجل نے بوجھل آواز میں کہا۔ "بمبئی جا کے جولی کی خیر خبر رکھنا۔"

رات آگے بڑھتی جا رہی تھی اور بھجل کے جلد اُٹھنے کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ اگر میں بیچ میں کسی بہانے اُٹھ جاتا تو سب کو محسوس ہوتا کیونکہ بھجل سب کو مختلف ہدایتیں دے رہا تھا جیسے اس کے بعد ہم لوگوں کا پھر اکٹھا ہونا ممکن نہیں ہوگا۔ بھجل آج ہی رات یا کل صبح روانگی کا ارادہ رکھتا تھا۔ میرا وہاں بیٹھنا ضروری تھا۔ میرے لیے بھجل کے منہ سے نکلنے والی ہر بات تجسس انگیز تھی۔ ساری باتیں کسی نہ کسی طرح سفر سے متعلق تھیں مگر نہ کسی نے پوچھا تھا، نہ بھجل نے اب تک بتایا تھا کہ وہ کون سی سمت کا رُخ کرے گا۔ اُس کے لہجے سے ایک بات تو صاف نمایاں تھی کہ ہم کسی آسان سفر پر نہیں جا رہے ہیں اور سب ساتھ ہی جا رہے ہیں، الگ الگ نہیں، جیسا کہ ایک بار میرے ذہن میں آیا تھا۔ اُس کے لہجے میں یقین کی کمی تھی۔ کانتے اور کبن خاں کو اُس نے ہدایت کی کہ وہ اپنے ہاتھ پیر اور زبان کی باگیں کھینچے ہی رکھیں۔ ماچھی سے بھی اُس نے یہی کچھ کہا تھا۔ وہاں کلکتے کے دوسرے اڈّوں کے جو لوگ موجود تھے اور جو ہمارے ساتھ نہیں جا رہے تھے، اُن سے بھی وہ کچھ اسی قسم کی باتیں کر رہا تھا۔

اِس بار ہمارے کلکتے آنے کے بعد صورتِ حال وہ نہیں تھی، جو پہلے تھی۔ کانتے کی زبانی اشارتہً مجھے معلوم ہوا تھا کہ جامو کی زیادہ سختی کی وجہ سے کچھ عرصے تک تو شہر کے اڈّوں میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی مگر رفتہ رفتہ لوگ اُکھڑنے لگے۔ ایک افواہ یہ بھی مشہور تھی کہ جامو نے بھجل کو کسی بڑی مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ اِس لیے اُس کا کلکتے واپس آنا مشکل ہے، بھجل کی جامو سے کوئی کور دبتی ہے، بھجل بوڑھا ہو گیا ہے اور اب اڈّے سے بھاگنا چاہتا ہے۔ میرے اور اُس کے تعلق کے بارے میں بھی قسم قسم کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ بھجل کی کمزوری لاڈلا ہے، وہ بس اُسی کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ ان افواہوں کے نتیجے میں کئی آدمی اُکھڑ گئے اور شہر میں اُن کا بس نہیں چلا تو نواحی علاقوں میں جا کے اٹھائی گیری کرنے لگے۔ بھجل پھر واپس جا رہا تھا۔ کسی وقت بھی یہ لوگ زور پکڑ سکتے تھے اور کانتے اور کبن خاں کے لیے اُلجھنیں کھڑی کر سکتے تھے۔ ان میں زیادہ تر موجمدار کے پُرانے آدمی تھے۔ اُس کے ختم ہونے کے بعد وہ بہ ظاہر بھجل کے ساتھ ہو گئے تھے مگر بہ باطن ساتھ نہیں تھے۔ گھوشی کی مثال سامنے تھی۔ بھجل اگر کلکتے میں رہتا تو شاید اُن کا رویّہ یہ نہ ہوتا۔

نصیب میاں نے بھی دبے لہجے میں مجھ سے جامو کے سلسلے میں بات کرنی چاہی تھی، میں نے توجہ نہیں دی تو نصیب میاں چپ ہو گئے۔ وہ ایک طرح کی شکایت ہی تھی۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ فرصت ملی تو کسی سے کہے بغیر اُن لوگوں کے پاس جاؤں گا تاکہ اُنھیں پتہ چل جائے کہ بجھل کی دو آنکھیں نہیں ہیں۔ ایک مرتبہ میں گھونٹی کو بھی بجھل کے پاس پکڑ کے لایا تھا، بجھل نے میرے کہنے پر اُسے معاف کر دیا حالانکہ اُس نے اُسی وقت کہہ دیا تھا کہ یہ پھر کمینہ پن کرے گا۔ کاش بجھل میری بات نہ سُنتا۔ ہمارے جانے کے بعد گھونٹی پھر بدل گیا اور جامو کو اُسے آخری سزا دینی پڑی۔ جامو کی بھی کوئی غلطی نہیں تھی۔ وہ سختی نہ کرتا تو اب تک تو آدمیوں نے نواحی علاقوں ہی میں اڈے جمائے تھے، رفتہ رفتہ شہر میں جم جاتے۔ غلطی تو میری تھی کہ میں سب کچھ جاننے بوجھنے کے باوجود بجھل کے ساتھ لگا رہا۔ بمبئی آکے اُس نے مجھے ڈھونڈ لیا تھا مگر اُس کے بعد بھی کئی مواقع مجھے اس سے دُور ہونے کے ملے تھے۔ البتہ اب دُوری کا کوئی امکان نہیں تھا۔

مگر اس وقت بجھل نے یہ بتا کے سب کو دنگ کر دیا کہ نواحی علاقوں میں جمنے والے تمام اڈے شہر کے دوسرے اڈوں کی طرح کانتے اور کبن خاں کو مسلسل بھتا پہنچایا کریں گے۔ "میں اُن سب کو دیکھ چکا ہوں، اُن لوگوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔" بجھل نے ہمیں بتایا۔ "صرف کاشی پور میں ایک سلطان باقی رہ گیا ہے۔ آج رات مجھے اُسی کو دیکھنا ہے۔"

میں سلطان کا ذکر کانتے سے سُن چکا تھا۔ ایک دو بار اُس سے جیل میں ملا بھی تھا۔ کسی زمانے میں وہ بجھل کے اڈے سے متعلق تھا پھر قتل کے ایک معاملے میں اُسے چار سال دلّی جیل میں کاٹنے پڑے۔ واپس آیا تو بجھل نے اُسے اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ وہ پہلے اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور بعد میں موجمدار کے اڈے سے مِل گیا پھر جب موجمدار کے تمام اڈے بجھل کی تحویل میں آ گئے تو اُس نے سلطان کو نہیں نکالا۔ سلطان لمبے قد کا ایک پھرتیلا آدمی تھا۔ عمر اب کوئی تیس سے اُوپر ہوگی۔ چاقو پر اُس کی گرفت مضبوط تھی۔ بجھل ہی نے اُسے چاقو تھامنا سکھایا تھا۔ وہ بلند شہر کا رہنے والا تھا اور بجھل کے پاس بچپنے میں آ گیا تھا۔ درمیان میں سلطان نے اپنی عادت سے مجبور ہو کے پھر ہٹر لونگ مچانی شروع کی تھی۔ جامو نے اُسے تنبیہ کی مگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا۔ نتیجتہً جامو نے اُس سے اڈا چھین لیا اور اُسے کلکتے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ وہ شہر کی ایک نواحی بستی کاشی پور میں چلا گیا۔ وہاں اُس نے اِدھر اُدھر سے آدمی اکٹھے کرنے شروع کیے۔ پھر ایک دن کاشی پور کے اُستاد جلو کو بے دخل کر کے خود اڈے کا مالک بن بیٹھا۔ کاشی پور زیادہ آمدنی کا علاقہ نہیں تھا اور پھر سلطان شہر کے اڈوں سے چھیڑ چھاڑ بھی نہیں کرتا تھا اس لیے جامو نے اُسے ڈھیل دی مگر ضرور جامو کو اُس سے نمٹنے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش ہوگی۔ جامو کرنے کے لیے کھلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اِدھر جامو کو شہر سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ بجھل کی زبان سے سلطان کا نام سن کے کان کھڑے ہوئے۔ رات کا کھانا ہم نے خاصی دیر سے کھایا۔ اُوپر فلیٹ میں جانے کے بجائے مجھے بیرو، جامو، کانتے اور ماچھی کو لے کے اڈے سے باہر نکل آیا۔ ظاہر ہے وہ جانتا ہوگا۔ وقت گزرا جا رہا تھا۔ مجھے اُدھر شہہ پارہ کی فکر تھی، اُس نے دن بھر میرا انتظار کیا ہوگا۔ میں اب بھی نہ پہنچا تو وہ مایوس ہو کر کھڑکی میں کھڑی ہر آنے جانے والے کو تکتی ہوگی۔ ہر آہٹ پر اُس کے کان لگے ہوں گے اور بار بار اُسے کرم نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ پچیس ہزار روپے کا چیک رکھا تھا جو میں نے بینک ہی میں لکھ لیا تھا لیکن دن بھر مجھے دونوں کو وقت نہیں ملا۔ ہم میں سے کوئی ایک ہی تھا۔ میں نے نصیب میاں کی بابت سوچا تھا کہ اُنھیں بھیج دوں گا لیکن اُن سے کہنا مناسب نہیں لگا۔

اڈے سے کاشی پور کا فاصلہ دس میل سے کم نہ ہوگا

تو سلطان اپنے آدمیوں کے ساتھ اڈے کی گلی کے نکڑ پر... کی صحت پہلے سے اچھی تھی، رنگ کھل رہا تھا۔ قد تو اُس کا تھا، اب جسم بھاری پڑنے سے وہ کچھ اور توانا لگنے لگا تھا۔ پڑتے ہی اُس نے تن دہی سے اُسے سلام کیا اور اُس کے اُس کے ساتھ کے سبھی آدمیوں نے اُس کی تقلید کی لیکن کے کسی آدمی نے ہمیں سلام نہیں کیا۔ اُس کے انداز سے کہ اُسے بجھل کے آنے کی خبر تھی۔ بجھل ہی نے کہلوایا ہوگا۔ لمحے اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اُس نے بجھل سے پوچھا:

"ہاں رے، راستہ بڑا ہے۔" بجھل نے بھاری لہجے

سلطان ہمیں اڈے کی عمارت میں لے گیا۔ عمارت بڑی نہیں تھی لیکن صاف ستھری تھی۔ صحن میں تخت پر سفید تھی۔ اُس نے بجھل کو وہیں بٹھا دیا اور خود کھڑا رہا۔ بجھل بھی تیار تھا۔ شروع شروع میں وہ کچھ گھبرایا ہوا نظر آتا تھا کے چہرے پر ایک ٹھہراؤ پیدا ہو گیا اور وہ اپنے آدمیوں کو مدارات کے حکم دینے لگا۔ "رہنے دے۔ مجھ کو جلدی ہے۔" اُسے منع کر دیا۔

"کیسے میرے بھاگ کھلے، اُستاد غریب کی جھونپڑی۔" لچک دار آواز میں بولا۔ "مجھ کو بلا لیا ہوتا۔"

"تجھ کو دیکھنا تھا سلطانے کہ تو نے کیا تیر مارے ہیں۔"

"تیر کیا!" وہ کندھے اُچکا کے بولا۔ "جینے کا سہارا کر لیا۔"

...ل سر ہلانے لگا۔ "پر اب کیا تیرے سر میں ہے؟"

...ستاد!" وہ برہمی سے بولا۔ "کیا تم یہی کہنے آئے ہو؟"

...رے پاس وقت نہیں ہے سلطانے کہ میں تجھ سے لمبی باتیں ...ں نے اِدھر کاشی پور میں اُستاد جلو کو رکھا تھا اور اپنی جگہ ...جامو کو چھوڑ گیا تھا۔ تُو نے جلو سے اڈا لے لیا۔ کیا یہ سمجھ کے ...مر گیا ہے؟"

...را مت مانا اُستاد! اب سب یہی کہتے ہیں کہ اُستاد ختم ہو گیا ...ی بات دوسری تھی لیکن اپنے کو کسی اور کی تابع داری کرنی ...اور پھر جامو نے خود ہی پھبتی کی۔ بار بار ٹانگ اَڑاتا تھا۔ ...کہ آدمیوں کے سامنے اپنے کو بے عزت کیا۔ پیٹھ پیچھے نہیں ...سامنے کہہ رہا ہوں۔ ہم نے بھی سب تمھارے ہاتھوں سے سیکھا ...بھی تم پر کچھ حق بنتا ہے۔ نئے نئے آدمی آکے تمھارے سر پہ ...پُرانے سالے اور پیچھے چلے گئے۔ کبھی تم نے نہیں پوچھا، ...تیرے منہ میں کے دانت ہیں، نخرا کیوں بھر رہا ہے۔ مجبوراً ...موجمدار کی گلی میں جانا پڑا۔ میں جلو کو اب بھی کاشی پور سے نہ ...تو ٹھیک طرح چلتا۔ اپنی بھی کوئی عزت ہے اور یہ تمھاری ...ئی ہے۔"

...ل سب سُنتا رہا، جامو اُس کے پیچھے کونے میں گردن ...ٹائے تھا۔ "اور کچھ بولنا ہو تو بول لے۔" بجھل نے تھمی ہوئی ...لہا۔

...ور کیا بولوں، تم سب سمجھتے ہو۔" وہ بگڑ کے بولا۔

...اور رہ گیا ہو تو بھڑاس نکال لے۔"

...ی پہلے بھی ایسے کہنے کا موقع دیتے۔ سدا پھٹکارتے رہے جیسے ...تمھارا کوئی ناتا نہیں تھا۔ میں نے بھی پھر اپنا حق لے لیا ہے اُستاد! ...جی تو میں زندہ ہوں سلطانے! حصے بخرے مرنے کے بعد کرتا۔" ...نے پوچھا ہے تو ساری بات بتا دی ہے۔ تم سدا زندہ رہو۔ ...ملکا بچہ تمھارا دشمن ہے۔"

...ہے۔" بجھل مدھم لہجے میں بولا۔ "تُو نے کبھی دھیان نہیں دیا ...تیرے سر پر کیوں چڑھ بیٹھا؟"

...ہنسے وہ بات نہیں ہوتی جو اور لوگ تمھارے ساتھ کرنے ...تے ہو، اپنی زبان بھی چھُٹی ہوئی ہے، ہاتھ بھی اپنے کو برداشت ...امان بولتے ہیں۔"

...یلاہٹ بن۔ اڈا کسی کے باپ کی جاگیر نہیں ہوتا اور اگر کوئی ایسا ...ہے تو یہ جاگیر زیادہ دیر تک نہیں رہتی۔ اڈے کا بٹوارا، ماں باپ ...طرح نہیں ہوتا۔ اُسی کو ملتا ہے جس کا سَر اور ہاتھ پیر کانٹے ...اُترتے ہوں، جو اس کا بوجھ اُٹھا سکے اور جس کا ہاضمہ ٹھیک ہو۔ تیرا ہاضمہ پہلے ہی سے خراب رہا ہے۔ تیرے ہاتھ پیر بہک جاتے ہیں سُلطانے! ٹھیک چلتا چلتا پچھاڑی دکھانے لگتا ہے۔ تجھ کو تو منہ کھولنا بھی نہیں آتا۔"

"تمھارے ہی ساتھ رہا ہوں۔"

"میرے ساتھ رہ کے بھی میرے ساتھ نہیں رہا سُلطانے! ورنہ جوتی نہیں مارتا، سُن لے! میں پھر جا رہا ہوں کانتے اور کبن کو جامو کی جگہ چھوڑ کے، تیری رائے کیا ہے؟"

"آج میری رائے پوچھنے کی ضرورت کیسے پڑ گئی۔" وہ زہرخند سے بولا۔

"اس لیے کہ بعد کو تُو اپنی کھال میں ہی رہے۔ اوقات بھی بولتے ہیں اسے۔ کیوں لاڈلے؟" وہ مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔ میں چپ رہا۔ وہ کہنے لگا: "میں کانتے اور کبن دونوں کو لایا ہوں اور بھی لوگ ہیں۔ اپنا حق جتانا ہے تو چاقو کھول کے جتا لے اور ایک بار پھر ذرا غور سے دیکھ لے کہ کون لوگ میرے سَر پہ بیٹھے ہیں۔ نکال لے اپنی حسرت ان کے سامنے چاقو کھولتے ہوئے تجھے لاج آتی ہے تو اور بھی ہیں، اِدھر میں بھی ہوں۔ دیکھتا ہوں تیرا ہاتھ کتنا کھُلا ہے۔ ویسے ڈیل تو تُو نے بَیل کی طرح پھیلا لیا ہے۔"

"کیا تم اسی ارادے سے آئے ہو؟"

"میں نے تجھ سے کہلوایا تھا۔ تیرے خانے میں بھیجا ہوتا تو میرے پاس خود آ جاتا مگر تُو نے میرا اِدھر انتظار کیا۔ شیر کی اولاد! چاقو یہ رکھا ہے۔ بول، کس کو دوں؟ فیصلہ کر لے کہ کس کا حق بنتا ہے۔ پھر تو ٹھنڈک پڑ جائے گی تیرے کلیجے میں؟ بٹوارا اسی طرح ہوتا ہے۔ تیرے نار کسنے کی ضرورت ہے تبھی سُر سیدھے نکلیں گے۔" سُلطان کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔

"دیر نہ کر، رات بہت ہو گئی ہے۔ لَوٹنا بھی ہے۔ میں بولتا ہوں سارا کلکتہ تیرا ہے، تیرے باپ کا ہے۔ ہم سب اِدھر سے اپنا بوریا بستر سمیٹ کے چلے جائیں گے۔ تُو اِدھر مستی کرنا۔ جامو کو ہی اُٹھا لے یا جسے تُو چاہے۔ اور بھی لوگ اُدھر اڈے پر پڑے ہیں۔ تُو بولے تو اُن میں سے کسی تیرے جوڑی دار کو بُلا لوں؟"

سُلطان نے کوئی حرکت نہیں کی، بُت کی طرح کھڑا رہا۔

"کیوں کاہے جھجک کرتا ہے۔ اُٹھا ہتھیار۔"

سلطان دَم سادھے اُسے تکتا رہا۔

"جب تک میری آنکھیں کھُلی ہیں سلطانے! میرا واسطہ تجھ سے ہے۔ میں کُتیا کے پلے کو ہی کیوں نہ اپنی جگہ بٹھا جاؤں، تُو اُس کو چاقو دکھائے گا، پر پیچھے تو پلّے کے میں کھڑا ہوں، بٹھایا تو میں نے اُسے ہے اور کچھ دھیان کر کے ہی بٹھایا ہوگا۔ اس سے تکرار اُس سے نہیں، مجھ سے ہے اور مجھ سے تکرار اُس وقت تک تیرے لیے بند ہے جب تک میرے پاس چاقو ہے اور میرے ہاتھ کو اسے سنبھالنا آتا ہے اور میں

کوٹ لوٹ کے آثار ہوں گا میرے بعد تو جس سے چاہے زولا کر کے دیکھ لینا۔ اب ان کے پیچھے تو میں ہوں۔"

سلطان نے اپنا چاقو نکال لیا۔ چند لمحوں تک وہ آنکھیں بند کیے اور ہونٹ بھینچے کھڑا رہا۔ پھر اُس نے جھپٹتے ہوئے انداز میں اپنا چاقو اور سر بٹھل کے پیروں میں ڈال دیا۔

بٹھل نے اُس کے بال پکڑ کے کھینچنے شروع کر دیے۔ سلطان بڑبڑانے لگا۔ "اکیلا چاقو کچھ نہیں ہوتا رے! جانتا ہوں تیرا ہاتھ خوب چلتا ہے۔ پر صرف ہاتھ ہی نہیں چلتا، کچھ اور بھی چلتا ہے اور اُس میں تیرے کیڑے پڑے ہیں۔ چل میرے ساتھ۔"

بٹھل نے اُسے اُٹھایا تو وہ سینے سے چمٹ گیا۔ بٹھل اُسے اڈے ہی پر لے آیا پھر جامو اور ہیرو کے ساتھ اُوپر فلیٹ میں لے گیا۔

رات کے ڈھائی بجے ہوں گے۔ اب شہہ پارہ کے پاس جانے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ میں یا کانتے اتنی رات گئے۔ دروازہ کیسے کھٹ کھٹاتے۔ پہنچتے پہنچتے اور رات ہو جاتی۔ ہم دونوں بستروں پر لیٹ گئے مگر میرا جی نہیں مانا۔ میں نے آخر کانتے کو جھنجوڑا۔ وہ جاگ رہا تھا۔

"کانتے! اُسے بھی نیند نہیں آ رہی ہوگی۔ جا کے یہ چیک دے آ۔" میں نے اُس کی منت کی۔

"صبح دے آئیں گے لاڈلے!" وہ غنودہ لہجے میں بولا۔

"صبح اگر پھر وقت نہ ملا جیسے آج . . ."

"ایک دو دن دیر بھی ہو جائے تو کیا حرج ہے۔"

"وہ کیا سمجھے گی، مجھے اُس کا خیال نہیں آتا؟"

کانتے نے کچھ ہی دیر سوچا پھر ہم دونوں نیچے آ گئے۔ باہر کا دروازہ بند تھا۔ کانتے نے ٹلوا کو جگا کے دروازہ کھلوایا۔ سواری ڈھونڈنے میں اور وقت گزر گیا۔

وہاں گلیوں میں ابھی تک اِکّا دُکّا دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ سپاہی گشت کر رہے تھے۔ بعض بالا خانوں پر بھی روشنی تھی مگر کسی طرف سے گانے بجانے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کرمن بیگم کا سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں ڈیوڑھی کے باہر نزدیک ہی ایک جگہ رُک گیا۔ کانتے نے مجھ سے بھی چلنے کو کہا لیکن میں آگے نہیں گیا۔ شہہ پارہ مجھے روک لیتی اور اُس کے سامنے کرمن بیگم کو چیک دیتے ہوئے بھی مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کانتے نے آنے میں دیر لگا دی حالانکہ دروازہ کھلنے میں دیر نہیں ہوئی تھی۔

"کیا ہوا؟" اُس کے آتے ہی میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"دے دیا۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

"کرمن بیگم ملی تھی؟"

"وہ بھی تھی۔"

"کچھ کہتی تھی؟"

"کہتی کیا چھنال۔ اندر لے گئی، کولھے مٹکا کے بولنے لگ[illegible] ضرورت نہیں ہے۔ لاڈلے میاں جب بھی آئیں، آ کے نثار[illegible] جائیں۔ میں نے چیک اُس کے آگے ڈال دیا اور چلا آیا۔"

"پھر تجھے اتنی دیر کیسے ہو گئی؟"

"ڈیوڑھی میں شپارے نے مجھے روک لیا۔ تیرا خیال[illegible] وہ جاگ رہی تھی۔ دروازے پر دو تین ہی بار کھٹکا کیا ہوگا[illegible] پوچھتی رہی کہ لاڈلے کیوں نہیں آیا۔ میں نے بولا، لاڈلے کو کچھ[illegible]"

"کیسی تھی وہ؟"

"بہت خوش تھی لاڈلے! میں نے شپارے کو اتنا[illegible] دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی گال پھول کی طرح کھِل گئے۔ بس جان[illegible] میں سمجھ، سارے پیسے وصول ہو گئے۔ تیرے آنے میں اگر[illegible] میں اُسے پیسے دے کے لے آؤں گا اور ممبئی سے جولی کو[illegible] بلا لوں گا۔ اُستاد نے اڑی کی تو اُس کو بھی دیکھ لوں گا۔"

"ایسا ہو جائے تو کیا بات ہے کانتے! جتنی جلد[illegible] یہاں سے نکال لے، اچھا ہے۔ مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔" کا[illegible] زور سے تھپڑ مارا اور گلے لگا لیا۔

میں آ کے سو رہا۔ اُس دن نصیب میاں نے[illegible] اُٹھایا۔ آنکھ کھلی تو دن نکل آیا تھا۔ نیچے بٹھل موجود نہیں [illegible] کئی لوگ نہیں تھے۔ نصیب میاں نے مجھے بتایا کہ بٹھل[illegible] دوسرے آدمیوں کو اسٹیشن پہنچانے گیا ہے۔ مجھ سے ناشتہ [illegible] گیا۔ نصیب میاں کو اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا پھر بار[illegible] پتہ چلا کہ وہ دونوں ہلاکو، جینی، پلٹو، زورا اور وزیر کے ہمر[illegible] روانہ ہو چکے ہیں۔ اُن کی سمت کی خبر مارتی کو بھی نہیں تھی۔ [illegible] کے مطابق اُن کے ساتھ سامان زیادہ نہیں تھا۔ سوچتے سو[illegible] بھیٹنے سا لگا۔ ہزاروں وسوسے ذہن میں گردش کر رہے [illegible] پہلے سے روانگی کے باعث مجھے اپنا یہ اندازہ درست [illegible] کہ بٹھل انھیں مختلف مقامات پر بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہے[illegible] وہ ایک ساتھ گئے ہیں، آگے کسی مقام سے جُدا جُدا بھی ہو [illegible] وہ یہیں سے دو دو جا سکتے تھے اور اس میں پردہ پوشی کی [illegible] بات تھی۔ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی یا وہ سب مجھ سے چھپا[illegible] بٹھل کی یہ احتیاط بے سبب تو نہیں ہوگی۔ جب ہمیں سا[illegible] تھا تو بتا دینے میں کیا رکاوٹ تھی اور نہ بتانے میں کون سی مصا[illegible]

دن کے باقی حصے میں وہ اڈے سے غائب رہا۔ سلـ[illegible] متن کو لیے نہ جانے کہاں کہاں گھومتا رہا۔ رات کو اُس کی [illegible]

میں نے بالکل عہد کر رکھا تھا کہ آج اُس سے ضرور بات کروں گا لیکن پھر اس کی صورت دیکھ کے میری ہمت پست ہو گئی۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آتا تھا۔ چہرے پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں، رات کا کھانا بھی اُس نے نہیں کھایا۔ میں نے متن اور سلطان کو ٹٹولنے کی کوشش کی تو اُن سے اس کے سوا کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی کہ وہ بازار میں خریداری کرتے رہے اور بٹھل انھیں باہر چھوڑ کے شہر کی کئی دکانوں میں گیا۔ فلیٹ میں اُوپر سونے کے لیے جاتے وقت بٹھل نے ہمیں جلد اُٹھنے کی تاکید کی اور بتایا کہ صبح ہم لوگوں کی روانگی ہے۔ مجھے کسی قدر سکون ہوا۔ ایک رات کی بات اور تھی مگر رات بھر ایک پل کے لیے میری آنکھ نہیں لگی۔ صبح سب سے پہلے میں نیچے آ گیا۔ ناشتہ کرتے ہی بٹھل، نصیب میاں اور دوسرے لوگوں سے گلے مل کے اڈے سے چل پڑا۔

اسٹیشن پر ہمیں رخصت کرنے کے لیے بھیڑ نہیں تھی۔ کانتے تھا، کپتن خاں، ماچھی، سلطان، چھیدا اور منڈا۔ اُس وقت سبھی بٹھل کو دیکھتے رہ گئے جب اُس نے سلطان کو گاڑی سے نہیں اُترنے دیا، اپنے ساتھ ہی بٹھائے رکھا۔ میرے، سلطان اور بٹھل کے علاوہ ڈبے میں سارٹے، متن اور مارتی بھی تھے۔ کانتے اور کپتن خاں مجھ سے لپٹ کے رونے لگے اور نہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔ جب تک گاڑی نہیں چلی، منڈا میری ٹانگوں سے چپکا کھڑا رہا۔

میری آنکھوں پر پٹی نہیں بندھی تھی۔ میں گزرتے ہوئے تمام اسٹیشنوں کے نام صاف پڑھ سکتا تھا۔ جیسے جیسے گاڑی آگے بڑھتی گئی میری حیرت سوا ہوتی گئی۔ ہم بنگال عبور کر کے آسام کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان علاقوں سے کبھی میرا گزر نہیں ہوا تھا۔ بٹھل درمیان میں کہیں نہیں ٹھیرا۔ دوسرے دن ہم شمالی آسام کے ایک بڑے قصبے یا ایک چھوٹے شہر ڈبرو گڑھ میں اُتر گئے۔ جیسے ہی گاڑی رُکی، سامنے پلیٹ فارم پر جامو کو دیکھ کے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا مگر وہ ہمارے قریب نہیں آیا، دُور کھڑا ہمیں دیکھتا رہا۔ میں نے اُس کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا تو بٹھل نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ جامو اجنبیوں جیسے انداز میں ہماری جانب سے گزرتا ہوا اسٹیشن سے باہر نکل گیا۔ اُس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ وہ شخص کلکتے میں چائنا ٹاؤن کے اڈے سے تعلق رکھتا تھا۔ میں اُس کا نام تو نہیں جانتا تھا لیکن صورت آشنا تھا۔ صورت بھی مجھے یوں یاد رہ گئی کہ اُس کے خط و خال برمیوں اور چینیوں جیسے تھے۔ سفر کے دوران کتنے ہی موقع آئے کہ میں بٹھل سے کچھ پوچھ سکوں مگر میں یہ سوچ کے ہر بار خود کو روک لیتا تھا کہ اب جلد ہی سب کچھ خود بخود معلوم ہو جائے گا، بٹھل کب تک خاموش رہے گا۔ ڈبرو گڑھ کے پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہوئے میرا خون رگوں میں سن سنانے لگا تھا۔

شہر میں پختہ مکانات کم، لکڑی اور بانس کے گھر کثرت سے تھے۔ مچھروں کی بہتات تھی۔ ٹھنڈ بھی اچھی خاصی تھی۔ بٹھل کے کہنے پر ہم سب نے گرم کپڑے پہن لیے تھے۔ ہمیں اسٹیشن سے بہت دور نہیں جانا پڑا۔ قریب ہی ایک سرائے جیسے ہوٹل میں پہنچ کے ہم ٹھیر گئے۔ وہاں ہم سے پہلے ہیرو، زورا، جینی، پلٹو اور ہلاکو موجود تھے۔ سرائے میں ہمیں داخل ہوتے وقت اُنھوں نے بس ایک اچٹتی نظر سے دیکھا اور قہوہ پیتے رہے۔ ہم میں سے کسی نے آپس میں بات چیت نہیں کی۔ کچھ دیر بعد جامو بھی وہاں پہنچ گیا۔ بٹھل کے ساتھ کئی ٹرنک سامان تھا، بستر بند الگ تھے۔ یہ چیزیں ہم جھونپڑیوں جیسے کمروں میں محفوظ کر کے شہر دیکھنے کے لیے باہر نکل آئے۔ متن، سارٹے اور سلطان کو بٹھل نے ہوٹل ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ ڈبرو گڑھ میں چھوٹے موٹے کئی بازار تھے۔ طرح طرح کی شکل و صورت، رنگ روپ کے لوگ نظر آ رہے تھے، عام طور پر پستہ قد اور سیاہ۔ اُس دن ہندوؤں کا کوئی تہوار تھا۔ بڑے بازار میں شور مچا ہوا تھا۔ سنکھ بج رہے تھے۔ لوگ جلوس کی شکل میں ایک بڑی مورتی اُٹھائے اُس پر پھولوں کی پتیاں پھینکتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ کچھ دُور جا کے ہمیں بدھوں کا ایک مندر بھی دکھائی دیا۔ اچانک تیز بارش ہو گئی۔ جلوس تتر بتر ہونے لگا۔ ہم بھی دوڑتے ہوئے ہوٹل میں واپس آ گئے۔

ہوٹل میں بجلی بھی نہیں تھی۔ لیمپ اور گیس کے ہنڈوں سے روشنی کی جاتی تھی۔ ہم سے کسی کل سیدھا نہیں بیٹھا جاتا تھا۔ مچھر کانوں میں بھن بھنا رہے تھے اور جسم سے چمٹ چمٹ جاتے تھے۔ رات کو کھانے کے وقت یکایک ہوٹل میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ سارٹے اور زورا میں کسی بات پر تو تو میں میں شروع ہوئی اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ ہم نے اور ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے دوسرے لوگوں نے بیچ بچاؤ کرایا تو ہنگامہ فرو ہو گیا۔ سارٹے اور زورا اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے لیکن ہوٹل کی فضا میں ایک تکدر پیدا ہو گیا تھا۔ ہوٹل کے بنگالی مالک نے انھیں تنبیہ کی اور ہم سے معذرت چاہی۔ بیچ بچاؤ میں بٹھل اور ہیرو کی بات چیت شروع ہو گئی تھی۔ وہ آپس میں ایک دوسرے سے ایسے ملے جیسے پہلی بار مل رہے ہوں۔ مسافروں اور ہوٹل کے لوگوں کو دُور دُور تک گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ اُن میں تھوڑی ہی دیر بات ہوئی، پھر وہ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ہوٹل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ رات شاید وہاں جلد ہو جاتی تھی۔ ہم تین تین ایک ایک کمرے میں تھے۔ بٹھل، مارتی اور میں ایک کمرے میں، دوسرے میں سارٹے، متن اور سلطان۔ کمرے میں اندھیرا گھپ تھا اور روشنی اس سے تیز کی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ مجھے وحشت ہو رہی تھی اور ڈر سا بھی لگ رہا تھا جیسے ابھی کچھ ہو جائے گا۔ دل کبھی ڈوبنے لگتا، کبھی اتنا تیز دھڑکتا کہ میں ہانپنے لگتا۔ مجھ سے ایک کروٹ نہیں لیٹا جا رہا تھا۔

مارتی کو نیند آ گئی تھی۔ بٹھل اپنی چارپائی پر پڑا لمبی لمبی سانسیں

کھینچ رہا تھا۔ کمرے میں بہت سردی تھی۔ روزنوں سے ہوا اندر تک آ رہی تھی اور لیمپ کی بتی بھڑک اٹھتی تھی۔ رات کو کسی وقت مجھے تجّل کی آواز سنائی دی، میرا سارا جسم دہل سا اُٹھا۔ وہ مجھ کو پکار رہا تھا۔ جواب دیتے ہوئے میری زبان لکنت کرنے لگی۔ وہ اُٹھ کر میرے ہی بستر پر چلا آیا اور میرا سر تھپ تھپاتے ہوئے آہستگی سے بولا "سویا نہیں رے؟" میری چالل کر چیخنے لگوں، میں نے اپنے ہونٹ بند ہی رکھے۔

"مجھ کو پتہ ہے تُو مجھ سے خفا ہوگا پر میں تجھ سے کیا بات کرتا۔ مجھ سے ایک دن بھی چین سے نہ کاٹا جاتا۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے لرزیدہ لہجے میں کہا۔

"رسان سے رہ۔ کئی بار جی میں آیا، تجھ کو بول دوں پر اس لیے چُپکا رہا کہ تو ٹھیک طرح ہاتھ پیر بھی نہیں چلانے دے گا۔"

"کیا بات ہے؟"

"بات بڑی نہیں ہے پر بڑی بھی ہو سکتی ہے۔"

"پہیلیاں مت بجھواؤ۔ جلدی بتاؤ۔"

"بولتا ہوں رے!" وہ خفگی سے بولا "اُدھر فیض آباد میں چلنے سے تین چار دن پہلے بمبئی سے شُکلا کی چٹھی آئی تھی۔ میں نے تجھ کو نہیں دکھائی۔ شُکلا نے لکھا تھا کہ تیرے باوا کو ڈیڑھ دو مہینے پہلے شیلانگ میں دیکھا گیا ہے۔"

"نہیں" میری آواز گلے میں گُھٹ گئی۔

"ہاں رے! بیچ میں مت بول، سن تو رہ۔ چٹھی ملنے میں شُکلا کو دیر لگی۔ وہ اُدھر بمبئی میں نہیں تھا۔ شملے چھٹی پر گیا ہوا تھا۔ آگے اس نے چٹھی پڑھی، لکھا تھا کہ تیرے باپ کی صورت کا آدمی شیلانگ میں دیکھا گیا ہے۔ ایک پولیس والے نے تیرے باوا کے سامنے اُس کا اصل نام بولا تو وہ گھبرا گیا۔ ہوٹل میں اُس نے دوسرا نام لکھوایا تھا پر اُس کا حلیہ وہی تھا جو کرشنا جی نے چٹھیوں میں لکھا تھا۔ پولیس والے نے اُس سے پوچھا کہ کیا تم صفدر زماں کو جانتے ہو؟ تیرے باوا نے منع کر دیا مگر اُس کی گھبراہٹ دیکھ کے پولیس والا ہوشیار ہو گیا۔ اُس کے پاس کوئی چالان نہیں تھا، نہ اُسے کسی جُرم کا پتہ تھا۔ وہ چُپ چاپ چلا آیا اور اُس نے بمبئی پولیس کو لکھا، چٹھی پڑھنے پر شُکلا نے فوراً شیلانگ تار دیا۔ جواب آیا کہ وہ اُدھر نہیں ہے۔ پولیس والا دوسرے ہی دن اُسے دیکھنے گیا تھا مگر وہ ہوٹل سے جا چکا تھا۔ پھر شُکلا نے تجھ کو سارا حال لکھ کے بھیج دیا۔"

میرے کان جلنے لگے۔ تجّل کہہ رہا تھا کہ جیسے ہی اُسے ایس، پی شُکلا کا خط موصول ہوا، اُس کے دل میں آئی کہ وہ فوراً فیض آباد سے آسام کی طرف چل پڑے لیکن اُس نے تامّل کیا۔ شُکلا کے خط کے مطابق اباجان ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اُن کے ساتھ گھر کا کوئی فرد نہیں تھا۔ میں نے اباجان سے متعلق ایک ایک بات تجّل کو بتائی تھی اور بمبئی میں اباجان کے دوست مولوی اکرم سے ملنے کا واقعہ بھی وہ مجھ سے سُن چکا تھا۔ پھر اسے ان کے بارے میں جہاں گیر سے معلومات حاصل ہوئی ہوں گی۔ میرے گھر سے نکلنے کے بعد ایک عرصے تک اباجان کے ساتھ وہی رہا تھا۔ اُس نے بھی اُسے یہی بتایا ہوگا کہ وہ اُن کاغذات کی چھان بین میں شب و روز مصروف رہتے تھے۔ نہ انھیں صبح کی فکر تھی، نہ شام کی۔ کورا اُن کاغذات کے ساتھ جو جواہر لائی تھی، اُنھیں بیچ بیچ کے وہ اپنا گزارا کرتے تھے۔ مکان اور زمینوں کی فروخت سے بھی اُنھیں ایک معقول رقم حاصل ہوئی ہوگی، کچھ نقدی اُن کے پاس بھی ہو گی۔ وہ جواہر اتنے بیش قیمت تھے کہ شاید اُنھیں اپنی نقدی چھونے کی ضرورت بھی نہ پڑی ہو۔ بمبئی میں کرشنا جی کے ساتھ مَیں جس جوہری سے مِلا تھا، اُس کی باتوں سے اُن جواہر کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا تھا۔ کاش کورا اُس رات خالی ہاتھ آ جاتی، جواہر اور کاغذات سمیٹ کے اپنے ساتھ نہ لاتی پھر شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ نہ یہ کاغذات ہوتے، نہ اباجان اپنے آپ سے اتنے بے خبر ہوتے اور امّی اتنی جلدی یوں نہ مر جاتیں۔ اباجان میری تلاش میں ضرور نکلتے یا رو پیٹ کے بیٹھ جاتے مگر سب گھر ہی میں رہتے اور فہمیدہ مجھے دیکھ کے اس طرح کھڑکی سے کود نہ جاتی۔ مولوی اکرم نے جب بھی اباجان کو ٹوکا، انھوں نے ایک ہی بات دُہرائی کہ مولوی اکرم! تم نہیں جانتے، اِن کاغذات میں کیا چھپا ہوا ہے، میں اِن میں صرف ہونے والے ایک ایک لمحے کی قیمت وصول کروں گا اور اس دوران اُنھوں نے فہمیدہ کو ضائع کر دیا۔ تجّل کو معلوم تھا کہ مرنے سے پہلے کرشنا جی نے ہندوستان بھر کی پولیس کو اباجان کے بارے میں خط لکھے تھے۔ کرشنا جی کو اُمید تھی کہ ایک دن وہ اُن کا سراغ یقیناً لگا لیں گے۔ کرشنا جی زندہ رہتے تو اُنھیں ڈھونڈنے کی اور کوئی تدبیر ضرور اختیار کرتے۔ اُن کا کام ہی سراغ لگانا تھا لیکن وہ بھی چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد ایس، پی شُکلا کو دو ایک جگہ سے کرشنا جی کے لکھے ہوئے خطوط کے جواب موصول ہوئے مگر سب بعد از وقت تھے۔ اباجان وہ شہر چھوڑ کے پہلے ہی جا چکے تھے۔ کرشنا جی کی طرح شُکلا جی کو بھی اُمید تھی کہ جلد یا بدیر کہیں سے کوئی تسلّی بخش جواب آ جائے گا۔ اُنھوں نے پھر اسی مضمون کے خط مختلف شہروں کو بھیجے تھے۔ ممکن ہے کہیں اور سے جواب آیا بھی ہو مگر شُکلا جی نے مجھے اطلاع دینا اس لیے ضروری نہ سمجھا ہو کہ اباجان اُس شہر سے بھی روانہ ہو چکے ہوں۔ شُکلا جی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی تمام کوششیں جاری رکھیں گے، بار بار ریمائنڈر بھیجتے رہیں گے۔

تجّل کہہ رہا تھا کہ فیض آباد میں جب شُکلا جی کا خط ملا تو صرف ارشد اُس کے قریب تھا۔ ارشد نے بی اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ تجّل نے ارشد سے مدد لی اور شیلانگ کے محلِ وقوع کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ یہاں تک کہ اُس نے نقشہ بھی منگوا کے دیکھا۔ ہم اباجان کی

تلاش میں گیا شہر کے قریبی علاقوں میں دانستہ نہیں گئے تھے کیونکہ اباجان کیا سے دُور دُور کے علاقوں میں جا سکتے تھے جہاں اُنھیں بدھ راہبوں، فتنے وار وں یا تنا ساؤں سے آمنا سامنا ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ چنانچہ وہ بمبئی گئے۔ بمبئی انسانوں کا جنگل ہے۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں ہوتی۔ نیچے کی منزل والے کو اُوپر کی منزل والے سے تعلق نہیں ہوتا۔ بمبئی میں طویل ... کے بعد اباجان شہر بدلتے رہے ہوں گے۔ آج یہاں، کل وہاں، تین مہینے اِس بستی میں، تین مہینے اُس بستی میں۔ وہ فہمیدہ کے واقعے کا اعادہ نہیں چاہتے ہوں گے اور سب سے زیادہ فکر تو اُنھیں کاغذات کی ہوگی کہ ان کی کسی کو بھنک نہ مِل جائے۔ زیادہ عرصے ایک جگہ رہنے سے آس پاس کے لوگ دلچسپی لینا شروع کر دیتے ہیں۔ کاغذات پر تحقیق کے لیے اُنھیں لائبریریوں کی ضرورت بھی پڑتی ہوگی۔ مولوی اکرم کے سوا اُنھوں نے کاغذات کا کسی سے ذکر نہیں کیا ہوگا۔ مولوی اکرم سے بھی تب کیا ہوگا جب اُنھیں اُن پر پورا اعتماد ہو گیا ہوگا۔ اِدھر مولوی صاحب اور کورا کے ساتھ بھی یہی تھا۔ کلکتے یا مراد آباد کے علاقوں اور بدھ راہبوں کے مرکزوں سے دُور ہی رہنے میں اُن کی عافیت تھی۔ جانگ قبیلے کے لوگ کورا کی جستجو میں تھے۔ ہم نے یہی سوچ کے بنگال اور آسام کے علاقوں کا رُخ نہیں کیا تھا تاہم وہ کہیں اور نہ ملتے تو ہمیں اس طرف بھی آنا پڑتا۔

اباجان کا کسی ایسی جگہ نظر آنا تجّل کے لیے چونکا دینے کا سبب تھا جہاں بدھ راہبوں کے قافلے گزرتے ہوں اور گرد و نواح میں بڑی بڑی بدھ خانقاہیں موجود ہوں۔ نو سال سے اُوپر ہو چکے تھے۔ اس مدت میں کاغذات کی تفتیش کے بعد اباجان نے اپنی دانست میں کوئی نتیجہ برآمد کیا ہوگا۔ اتنا وقت اُنھوں نے صرف گنوایا تو نہیں ہوگا۔ وہ پاگل تو نہیں تھے۔ ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد تجّل بھی اس نتیجے پر پہنچا کہ کہیں اُن کے شیلانگ میں ہونے کا مطلب تبت کی طرف کوچ کرنا تو نہیں ہے۔ اگر انھیں خزانہ مطلوب تھا تو ایک نہ ایک دن تبت جانا ہی تھا۔ تجّل نے فوراً بیرو کو بمبئی اور وزیر کو آسنسول تار دیے پھر مٹّن اور کپتن خاں کو ساتھ لے کے کلکتے آ گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ تبت میں داخلے کے لیے باقاعدہ پروانہ ضروری ہے اور اُسے حاصل کرنے میں دن بھی لگ سکتے ہیں، درخواست نامنظور بھی ہو سکتی ہے۔ کلکتے کے بہت سے مال دار لوگوں کے کارخانے بنگال اور آسام میں پھیلے ہوئے تھے اور کلکتے کے اُستاد کی حیثیت سے اُس کا واسطہ اُن لوگوں سے پڑتا رہتا تھا۔ کسی سے کم، کسی سے زیادہ۔ کلکتے آنے کے بعد وہ مختلف جگہوں پر مختلف طبقوں کے لوگوں کے پاس جاتا رہا۔ ایک طرف اُس نے نواحی علاقوں میں قائم ہونے والے اڈّوں کا بندوبست کیا، دوسری طرف رات دن سفر سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اُس نے چائنا ٹاؤن کے اڈّے کے ایک تبتی باشندے سُولم سے بھی رابطہ قائم کیا۔ سُولم تبتی زبان بھی جانتا تھا اور ان راستوں سے گزر چکا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جسے ڈبرو گڑھ اُترتے وقت میں نے جامو کے ساتھ اسٹیشن پر دیکھا تھا۔

ہم دونوں اکیلے بھی جا سکتے تھے لیکن تجّل کے کہنے کے مطابق وہ یہ مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ کچھ تو اُسے خود بھی اندازہ تھا اور کچھ اُسے بتایا گیا تھا کہ یہ سفر اور سفروں کے مانند اتنا آسان نہیں ہے۔ دشوار گزار پہاڑی راستے ہیں، اُونچی اُونچی برفیلی چوٹیاں ہیں۔ نہ ریل ہے، نہ موٹر۔ نہ سڑکیں ہیں، نہ منزلوں کے نشان۔ قدم قدم پر قبائلی قزاقوں کا خدشہ۔ کاغذات کا تعلق جانگ قبیلے سے ہوگا۔ جانگ قبیلے کے لوگ اُنھی کے لیے اب تک کورا کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ تجّل کے ذہن میں کچھ اور اُلجھنیں بھی ہوں گی اسی لیے اُس نے اکیلے جانے کے بجائے لوگوں کو ساتھ لے چلنے کا فیصلہ کیا۔ اُسے اباجان کے تبت کی طرف کوچ کرنے کا ایسا ہی مکمل یقین ہوگا۔

سردی کے باوجود میرا سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اُس کی باتیں مجھے ایک خواب معلوم ہو رہی تھیں۔ میں نے کسی بات کی تردید نہیں کی۔ شُکلا جی نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ پولیس والے نے اباجان کو تنہا دیکھا تھا، اُن کے ساتھ کوئی اور نہیں تھا اور وہ ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ میری نظروں میں اُن سب کے چہرے گھوم رہے تھے۔ رہ رہ کے یہی خیال آ رہا تھا کہ اباجان تنہا کیوں تھے۔ اُنھوں نے اُن سب کو کہاں رکھا؟ کہیں وہ بھی اُن سے جہاں گیر اور فہمیدہ کی طرح جُدا تو نہیں ہو گئے؟ ممکن ہے پولیس والے ہی کو غلط فہمی ہو گئی ہو۔ پولیس کو دیکھ کے لوگ یوں بھی گھبرا جاتے ہیں اس لیے شاید اُس نے خواہ مخواہ فرض کر لیا ہو کہ یہی شخص صفدر زماں ہیں لیکن تجّل کا یہ کہنا بھی قرینِ قیاس تھا کہ بالآخر اُنھیں تبت جانا ہی تھا۔ اُن کا تنہا ہوٹل میں ٹھیرنا اور تبت کی سرحد سے قریب شیلانگ میں نظر آنا تجّل کے ہر شبہے کی تائید کرتا تھا۔ اباجان فرح، نریال، فارحہ اور اکبر کو کسی محفوظ جگہ چھوڑ سکتے تھے۔ اتنی مدت میں اُن کا بمبئی کے مولوی اکرم جیسا کوئی اور قابلِ اعتماد دوست بن گیا ہوگا یا ہو سکتا ہے کہ وہ گیا واپس چلے گئے ہوں اور سب کو کسی عزیز کے حوالے کر آئے ہوں۔ وہ گیا سے کوئی جرم کر کے تو آئے نہیں تھے جو واپس نہ جا سکتے۔ فہمیدہ کے بارے میں لوگوں نے پوچھا ہوگا تو اُنھوں نے کہہ دیا ہوگا کہ اُس کی شادی ہو گئی یا وہ مر گئی اور جہاں گیر بھی مر چکا ہے۔ وہ تبت میں تین لڑکیوں اور ایک لڑکے کے کنبے کو ساتھ لے کے کیسے جا سکتے تھے۔

تجّل مجھے ٹھوکا مار کے پوچھنے لگا "کیوں رے، تو کچھ نہیں بولتا؟"

میں کیا بولتا، میرے کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ مجھے اس خیال سے وحشت ہو رہی تھی کہ اباجان ان علاقوں میں آ کے کسی بڑی مصیبت میں نہ گرفتار ہو گئے ہوں۔ اُن کے ساتھ اگر کاغذات ہیں تو

وہ کہاں کہاں اُنھیں چھپاتے پھر رہے ہوں گے۔ جانگ قبیلے کے کسی آدمی کو اُن کی ہوا لگ گئی تو!۔۔۔ میرے جسم پہ کپکپی سی طاری ہوگئی تھی۔ جھل میرے کان تھپتھپانے لگا۔

تیسرے دن ہم ڈبروگڑھ سے تن سکیا روانہ ہوگئے۔ راستے میں تن سکیا پہلے آتا تھا مگر جھل کو کلکتے میں لوگوں نے مشورہ دیا تھا کہ وہ پہلے ڈبروگڑھ اُترے، وہاں سے اُسے ایسے آدمی مل سکتے ہیں جو چیک پوسٹ کے بجائے کسی اور راستے سے تبت کی سرحد پار کرادیں گے۔ تبتی باشندے روزادھر سے اُدھر منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے چہرے اُن جیسے نہیں تھے، نہ ہم اُن کی زبان سے واقف تھے۔ دو دن تک سُولم ڈبرو گڑھ میں کام کے آدمی ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا۔ ہوٹل میں مختلف قسم کے چند لوگ ہم سے ملنے کے لیے بھی آئے۔ کچھ تاڑ جھاڑ لینے آئے تھے اور کچھ کو سُولم اپنے ساتھ لایا تھا۔ اُنھوں نے پیرو اور جھل سے علیحدہ علیحدہ بات کی۔ سب کی رائے یہی تھی کہ ہم آگے جانے کا ارادہ ترک کر کے اپنے سامانِ تجارت کا سودا یہیں کرلیں، یہاں بھی ہمیں خاصے اچھے پیسے مل جائیں گے۔ روانہ ہونے سے پہلے کلکتے میں جھل نے بہت سامان خریدا تھا۔ قینچیاں، چمچے، بلیڈ، سگریٹ، تمباکو، تالیں، ریشمی کپڑا، گوٹا کناری، مفلر، کمبل، پرانے کوٹ، شراب کی بوتلیں وغیرہ وغیرہ۔ مارٹی کو ٹھیک خبر نہیں تھی۔ پیرو بھی اپنے ہمراہ تقریباً اتنا ہی سامان لایا تھا۔

جھل نے کئی وجوہ سے ہمیں دو ٹولیوں میں تقسیم کردیا تھا۔ اتنے زیادہ آدمی ایک ساتھ کہیں آتے جاتے دکھائی دیتے تو شک کا نشانہ بن سکتے تھے۔ تاوقتیکہ ڈبروگڑھ میں کوئی بہتر صورتِ حال پیدا ہونے کی اُمید نہ بندھے، ہمارا ایک دوسرے سے الگ ہی رہنا مناسب تھا۔ جھل کو بتایا گیا تھا کہ اگر اُسے آسانی سے پروانۂ راہ داری نہ ملا تو بعض مخصوص مقامی باشندوں سے اُسے رابطہ قائم کرنا ہوگا۔ یہ لوگ نوواردوں کو خوب لوٹتے اور طرح طرح پریشان کرتے تھے۔ دو الگ الگ قافلوں کی صورت میں اُن کے ہتھکنڈوں سے بڑی حد تک محفوظ رہا جاسکتا تھا۔ اس طرح اُن سے سودے بازی کرنے میں بھی آسانی رہتی۔ ایک قافلہ مقامی باشندوں کی بڑے معاوضے کی پیش کش قبول کرلیتا تو دوسرا انکار کردیتا۔ دوسرے کو بھی ساتھ لے جانے کے لیے نتیجتاً انھیں کم پر آمادہ ہونا پڑتا۔ اس تدبیر میں اور بھی بہت سے تحفظات تھے۔ ایک قافلہ دوسرے کا نگراں رہتا۔ کوئی افتاد پڑنے کی صورت میں ایک دوسرے کے لیے ڈھال بن سکتا تھا۔ یہ دوسری بات تھی کہ دونوں قافلوں پر ایک ساتھ اُفتاد آتی۔ پیرو کو پہلے ڈبروگڑھ بھیجنے میں جھل کی یہی مصلحت تھی۔ اس کے علاوہ اُسے اُمید تھی کہ وہ شاید معاملہ طے کر کے ہی رکھیں اور اِدھر جھل کو کلکتے میں سفر کے لیے معاون بعض اور لوگوں سے ملنے کا ایک دن مل جائے۔

دو دن گزر گئے تھے۔ مسافروں اور ہوٹل والوں کی نظر میں ابھی ہم دونوں گروہوں کا تعلق رسمی تھا، محض مسافرانہ میل ملاپ جیسے ایک مقصد کے مسافر اچانک کہیں مل جاتے ہیں اور آپس میں دلچسپی لینا شروع کردیتے ہیں مگر اس ناٹک سے ہمیں کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا۔ ڈبرو گڑھ میں ہمیں اپنے مطلب کے آدمی نہیں مل سکے۔ جھل کلکتے میں لوگوں کے دیے ہوئے بعض پتوں پر بھی گیا۔ سب قدم قدم پر سرحدی سختیوں اور پابندیوں کا عُذر کردیتے تھے۔ بستی میں مسلمان کم تھے لیکن ہم نے احتیاطاً اُن کے ٹھکانوں پر آبا جان کے بارے میں بھی پوچھ کے دیکھ لیا۔ کسی سے کوئی کارآمد بات نہیں معلوم ہوسکی۔ ہم تقریباً تیس میل پیچھے ہو کے تن سکیا آگئے۔ تن سکیا اور ڈبروگڑھ کے راستے میں گھنے جنگلات تھے۔ کہیں کہیں ہمیں وہاں ہاتھی بھی دکھائی دیے۔ دونوں بستیوں کے درمیان دریائے برہم پترا کی ایک بڑی شاخ ہے جسے اسٹیمر سے پار کرنا پڑتا ہے۔ تن سکیا سے ہم اُوپر کی طرف آگے بڑھ گئے اور قصبہ دری ای میں آکے دم لیا۔ یہاں ہندوستان کے پولی ٹیکل ایجنٹ، انٹلی جینس افسر اور ٹریڈ ایجنٹ وغیرہ کے دفاتر تھے۔ دری ای میں بھی سُولم نے خاصی تگ و دو کی۔ جھل کے پاس کلکتے کے بڑے آدمیوں کے کئی سفارشی خطوط تھے۔ وہ خطوط دکھانے کی نوبت نہیں آئی۔ ہمیں پروانۂ راہ داری میں پیش آنے والی دشواریوں کا ابتدا ہی میں علم ہوگیا تھا۔ پولی ٹیکل ایجنٹ کے پاس جا کے ہم خواہ مخواہ اُس کی نظروں میں آتے۔ دری ای کے بعد ہم نے کچھ اور فاصلہ طے کرلیا اور دینگ اِنگ پہنچ گئے، وینگ انگ سے تھ نال پانگ، وہاں سے سارہا۔ قصبہ سارہا خاصا بڑا قصبہ تھا۔ یہاں بازار بھی تھے اور تبتی قلی بھی جگہ جگہ موجود تھے۔ ہم سارہا میں ایک پہر ہی ٹھہرے ہوں گے کہ قصبہ موچی ماسے گزرتے ہوئے قصبہ نارا میں آگئے۔

سارہا سے نارا تک کا راستہ ہم نے کرائے کی جیپوں سے طے کیا تھا اور یہ ہمارے اب تک کے سفر میں سب سے مشکل راستہ تھا۔ نارا میں سکھ معقول تعداد میں بسے ہوئے تھے۔ ایک بڑا فوجی اڈا بھی تھا۔ سُولم شام کے وقت ہمیں ایک ایسی جگہ لے گیا۔ جہاں جنگی رقص ہو رہا تھا۔ نارا میں ایک اسکول بھی تھا، آخری اسکول۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے جا رہے تھے، سردی بڑھتی جاتی تھی۔ کسی مقام پر ستانے کے لیے ٹھہر جاتے تو جسم جلنے لگتا۔ ہم نے ابھی تک یہی ظاہر کیا تھا کہ ہم سرحدی چوکی والنگ پر اپنا سامان فروخت کرنے جا رہے ہیں، ایسا عموماً ہوتا رہتا تھا اس لیے قلیوں، گائڈوں اور گزرنے والی بستیوں کے باشندوں نے ہم پر غیرضروری توجہ نہیں دی۔ یہ ہندوستان تھا اور ہم آخری سرحدی چوکی والنگ تک کسی روک ٹوک کے بغیر جا سکتے تھے۔ نارا سے سات میل دُور قصبہ چنگ وتی تھا۔

چنگ وتی پر آکے جیپیں لوٹ جاتی تھیں کیونکہ آگے اُن کے جانے کے لیے کوئی سڑک نہیں تھی۔ خچر اور گھوڑے ہی ان راستوں پہ چل سکتے

وہیں ہمیں متعدد قلی مل گئے۔ اُن کے ساتھ اُن کے خچر بھی تھے۔ ان خچروں پر لاد دیا گیا۔ ہم نے گائڈ اور قلیوں کی معیت میں پیدل پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ قلی ایک منزل سے دوسری منزل تک جاتے تھے نچہ ہم ہر منزل پر قلی بدلتے رہے۔ چنگ وتی کے بعد کا راستہ اور کٹھن ہر طرف بڑے پاٹ کے دریا، گھاٹیاں، اُونچی چوٹیاں، کیڑے مکوڑے، نگلات، درندے۔ ہمیں قلیوں اور گائڈوں کی مدد نہ ملتی تو شاید ہمارا آگے جانا ناممکن ہوجاتا۔ یا تو ہم کسی قافلے کے انتظار میں پڑے رہتے ٹ آتے اور قافلوں کے ساتھ ہم اسی صورت میں ہو سکتے تھے ب ہمارے پاس اُن کی طرح اجازت نامہ ہوتا۔ اِدھر مارٹی کو تیز بخار یا تھا۔ جہاں تک بن پڑا، وہ چلتا رہا۔ قلیوں نے اُسے چند بوٹیاں لادی تھیں۔ اس سے بخار کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گیا۔ ہم نے ے اُلٹا خچر پر لٹا دیا اور کمر سے رسّی باندھ دی اور چنگ وتی سے آٹھ ں کی دوری پر خودرَو گھاس سے گھری ہوئی بستی من زانگ میں آکے تبتی طبیب کو دکھایا۔ مارٹی کی وجہ سے ہمیں ایک دن من زانگ قیام کرنا پڑا۔ اُس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو ہم پھر آگے بڑھنے لگے۔ زانگ کے کچھ ہی دُور بعد وڈ ننگ اور ساتی نامی دو بستیوں سے ہمارا رہوا۔ دونوں میں دُہری شہریت کے لوگ رہتے ہیں۔ جز وقتی تبتی، جز ی ہندوستانی۔ پیدل چلتے چلتے ہماری ٹانگیں اینٹھنے لگیں۔ پاؤں میں لے پڑ گئے تھے لیکن کوئی بھی واپس جانے کو آمادہ نہیں تھا۔ ایک منزل ے دوسری منزل کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن میدانی علاقوں کی نسبت ی علاقوں میں ایک میل کا فاصلہ کئی میل کے برابر ہوتا ہے۔ جب ہم لنے لگتے تو اور تیز چلنے لگتے۔ پہاڑوں پر رفتار پہاڑوں کی تابع ہوتی آدمی کے نہیں۔ ڈبروگڑھ سے ۱۴ دن کی مسافت کے بعد ہم آخری رحدی چوکی والنگ کے قریب پہنچ گئے۔ باقی سب دُور ٹھہرے رہے۔ ن میں اور جھل سُولم کے ساتھ بستی میں داخل ہوئے۔ والنگ ہندوستانی ب وطن کا آخری دروازہ ہے۔ یہاں بہت سی چیزیں آخری ہوتی ں، آخری گھڑی جس سے وقت کا اندازہ ہوتا ہے، آخری ہندوستانی گریزی اخبار، آخری چاکلیٹ، آخری ہندوستانی سکہ جو آگے نہیں چلتا، ری کرسی اور میز، آخری تحریری قانون۔ آگے لاماؤں کے غیرتحریری ن کی حکومت ہے۔ والنگ میں ہمیں کئی تبتی قافلے دکھائی دیے، وفا بدھ بھکشوؤں کے۔ بھکشوؤں کے تبت میں داخلے پر کوئی دی نہیں ہوتی لیکن اُن کے ساتھ سامان مختصر ہوتا ہے، ایک آدمی روریات کی حد تک۔ میں نے جھل کو مشورہ دیا کہ کیوں نہ ہم بدھ کشوؤں کے لباس میں تبت میں داخل ہوں۔ سامان یہیں بیچ دیں ر چند لوگوں کو یہیں روک دیں جو اسے بیچتے رہیں اور واپس ڈبروگڑھ کے ہمارا انتظار کریں۔ جھل تیار نہیں ہوا۔ تین دن ہم والنگ کی خاص بستی کے نزدیک خیمہ لگائے پڑے رہے۔ پہاڑوں پر صرف ایک راستہ نہیں ہوتا۔ سُولم بھی اس کی تائید کرتا تھا کہ پہاڑوں سے اور راستے بھی نکلتے ہیں مگر میلوں کا فرق پڑجاتا ہے۔ اُنھیں مقامی قلیوں کے تعاون کے بغیر عبور نہیں کیا جاسکتا۔ چونکہ وہ عام گزرگاہیں نہیں ہیں اس لیے قلی بھی شاذونادر ہی تیار ہوتے ہیں۔ مارٹی کی طبیعت پوری طرح نہیں سنبھلی تھی۔ مِتن بھی اَدھ مُوا سا نظر آتا تھا۔ ہر منزل پر جسم کو مزید کپڑوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ ۱۴ روز بعد والنگ میں ہمیں تین دن ٹھہرنے کو ملے تو اعصاب میں کسی قدر توانائی محسوس ہوئی۔

تیسرے دن سامان اور نقدی کی بڑی پیش کش اور ایک بندوق کے عوض چند تبتی قلیوں کا ایک گروہ ہمیں دوسرے راستے سے آگے لے جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ یوں ہم ہندستان کی سرحدی چوکی والنگ سے براہِ راست تبت میں داخل ہوتے تو تبت کی پہلی سرحدی چوکی ساما سے فاصلہ بیس میل سے زیادہ نہ ہوتا۔ ان بیس میلوں کی مسافت میں دو دن صرف ہوتے ہیں۔ ہم نے ایک طویل اور دشوار گزار راستہ منتخب کیا تھا۔ درمیان میں تیز بہاؤ کے دریا بہتے تھے۔ ان دریاؤں کو عبور کرنے کا رسّیوں کے پُل کے سوا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ مُونج کی پتلی رسّیاں بٹ کے یہ بڑی رسّی بنائی جاتی ہے اور اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ قافلے اس پر سے گزر جاتے ہیں۔ دو رسّیاں ایک ساتھ چلتی ہیں اور اُنھیں یکساں دُوری پر آپس میں باندھ دیتے ہیں اور درمیان میں تختے تاروں سے جکڑ دیتے ہیں۔ بعض پُل صرف ایک رسّی کے ہوتے ہیں۔ دو پہاڑوں کے بیچ میں تار کی طرح رسّی تنی رہتی ہے۔ ان علاقوں میں رہنے والے اُنھیں پکڑ پکڑ کے آسانی سے درمیان کا فاصلہ عبور کرلیتے ہیں خصوصاً عورتیں کمر سے بچّہ باندھ کے روانی سے گزر جاتی ہیں۔ اُنھیں نیچے بہتے ہوئے پُرشور دریا سے بھی خوف نہیں آتا۔ ہم نے ان رسّیوں پہ دریا کا پاٹ طے کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ ویسے بھی سامان کی وجہ سے ہم اُنھیں استعمال نہیں کرسکتے تھے۔

تبت کی پہلی چوکی ساما کے نزدیک ہم نے قلیوں کو باقی آدھا معاوضہ دے کے رخصت کردیا اور نئے قلی تلاش کیے۔ ساما میں شدید سردی تھی۔ ہماری اُنگلیاں جمنے لگیں۔ ہونٹ پھٹے جاتے تھے۔ ہوا تیز ہوتی تو چہرے پر چاقو سے چلنے لگتے۔ کئی کئی مفلروں سے ہم نے اپنا سر اور گردن ڈھانپ رکھی تھی پھر بھی سردی کم نہیں ہوتی تھی۔ ساما سے آگے رات کو سونا مشکل ہوجاتا تھا۔ رات کو قلی لکڑیاں توڑ کے الاؤ روشن کر دیتے۔ الاؤ سے جسم میں کچھ حرارت آتی۔ دن کے درمیانی حصے میں ہم کچھ دیر سوتے پھر چلنے لگتے۔ وزیر نے تجویز پیش کی کہ ہم میں سے آدھے لوگ بھکشوؤں کا لباس پہن لیں اور آدھے تاجروں کا روپ اختیار کرلیں تو بہتر ہوگا۔ بھکشوؤں کے ساتھ ہونے کی وجہ سے تبتی ہر جگہ ہمارا لحاظ

کریں گے اور ہم اُن کے شک سے بھی محفوظ ہو جائیں گے۔ بدھ بھکشو دنیا بھر سے تبت آتے ہیں، اُن کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ تبتی زبان سے بھی واقف ہوں۔ سولم کہتا تھا کہ قبائلیوں کے نزدیک بھکشو شاکیہ منی گوتم بدھ کا رُوپ سمجھے جاتے ہیں۔ ہنجل کو وزیر کی یہ تجویز پسند تو آئی لیکن اُس نے عمل نہیں کیا۔

راستے میں قلی تبت کی کہانیاں سنانے لگتے تھے۔ سولم اُن کا ترجمہ کر دیتا یا قلی گانے لگتے۔ کبھی سلطان، مارٹی، منّن اور وزیر بھی اُن کی آوازوں سے الل ٹپ آوازیں ملانے لگتے۔ سہ پہر کو جیسے ہی دھوپ نرم پڑتی، پہاڑوں پر رفتہ رفتہ دبیز کہر چھانے لگتی اور آگے کا راستہ دکھائی دینا مشکل ہو جاتا۔ دن میں تو کچھ نہیں ہوتا لیکن شام ہوتے ہی میرا جی گھبرانے لگتا۔ اندھیرے میں اونچے پہاڑوں کے سائے دیکھ کے مجھے خوف سا لگتا تھا۔ جہاں تک بن پڑتا، شام کو بھی ہم چلتے رہتے، جب ناممکن ہو جاتا تو پڑاؤ ڈال دیتے۔ اب تک بستیاں قریب قریب آتی رہی تھیں، والنگ کے بعد غیر آباد پہاڑوں کی وجہ سے ہمارے کھانے پینے کا سامان کم ہونے لگا۔ ہر چند کہ ہم پہلے ہی خاصا ذخیرہ ساتھ لے کے چلے تھے۔ نتیجتہً ہمیں اپنی بندوقیں نکالنی پڑیں۔ شکار کی وہاں کوئی کمی نہیں تھی۔ جو کچھ بھی ہم دن میں مارتے، رات کو الاؤ پہ بھون لیتے۔ تبتی قلی بھی رفتہ رفتہ ہمارا شکار کیا ہوا بھنا گوشت کھا کے خوش خوش رہتے تھے۔

ہر تبتی قلی کلہاڑی اور تلوار سے ہر وقت مسلح ہوتا تھا۔ یاک یا بھیڑ کی اُون کا لباس، چمڑے کا جوتا، کانوں تک لمبی چوڑی اُونی ٹوپی اُن کا عام پہناوا تھا۔ بستیوں میں امیر لوگ فر کے کوٹ، سلک کی چادر اور اپنے مخصوص مفلروں میں ملبوس رہتے تھے۔ ساما کے بعد جن چھوٹی چھوٹی بستیوں میں ہم جاتے اور بستی کے لوگوں کو مہمانوں کی رسم کے مطابق تحائف پیش کرتے تو وہ اپنے گھر کے دروازے ہمارے لیے کھول دیتے۔ دروازہ کھلنے کے لیے تحائف ہی شرط نہیں تھے، مسافر جس دروازے پر چلا جائے مہمان سمجھا جاتا ہے۔ وہاں میزبان اور مہمان گلوبند تبدیل کر کے دوستی کا اظہار کرتے ہیں اور ہمارے پاس گلوبندوں کی ایک وافر تعداد موجود تھی۔ مہمانوں سے میزبانی کی کوئی قیمت طلب نہیں کی جاتی۔ سارے راستے ہمیں کوئی سرائے نظر نہیں آئی۔ گو ہم ساما کے بعد دو تین ہی گھروں میں بہت مختصر وقت کے لیے مہمان ہوئے لیکن میزبانوں نے اس مختصر وقت میں بھی ہماری تواضع میں یاک کا دودھ، انڈے، تبتی شراب پیش کی، مکھن اور نمک ملی ہوئی چائے ہمیں پلائی۔ چائے کے بغیر وہ شاید زندہ نہیں رہ سکتے۔ سولم کی وجہ سے اُن سے بات کرنے میں ہمیں زبان کی کوئی دقت نہیں تھی۔ وہ لوگ ہفتوں منہ ہاتھ نہیں دھوتے، پانی سے اُن کا جسم کٹنے لگتا ہے۔ اُن لوگوں کی طرح ہم نے بھی ساما میں اپنے جسموں پہ روغن کی مالش کر لی تھی۔ قلی عام طور پر ایک گیت سناتے تھے جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا: "تُو اپنے باہر سے نہیں، اندر سے ہے۔ تیرا ظاہر ایک دھوکا ہے، تیرا اصل تیرا باطن ہے۔ تیری اہمیت بس تیری اندرونی شخصیت سے ہے۔ سو اُسے پاک صاف رکھ۔"

ہر جگہ تبتی اسی پر عمل کرتے تھے، باہر سے بہت گندے مگر اندر سے دُھلے ہوئے۔ ہم نے کسی تبتی کو روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ساما سے مختلف بستیوں میں ہوتے ہوئے تبت کے سب سے پہلے شہر زالپول میں داخل ہوتے ہی ہم نے چند معززین کے گھروں پہ جا کے حسبِ سابق تحائف پیش کیے۔ زالپول دریائے رونگو اور دریائے سونگو کے سنگم پر واقع ایک گندا شہر ہے۔ اس کا ایک دوسرا نام شیگا تھانگ بھی ہے۔ قلیوں نے ہمیں بتایا تھا کہ یہاں تبت کا ایک تیسرا بڑا افسر رہتا ہے جس کا لقب ہے زانگ بون (سول گورنر)۔ زالپول میں اگر ہم دو دن آرام نہ کرتے تو آگے نہیں چل سکتے تھے۔ پلٹو بھی اپنی ہمت سے چل رہا تھا، اُسے ٹھنڈ لگ گئی تھی اور کئی بار تیز بخار آ چکا تھا۔ میرے، بیرو، ہنجل اور زورا کے سوا سبھی باری باری بیمار پڑتے رہے۔ بیرو بھی کھانسنے لگا تھا۔ اُن مجھے کچھ پتہ نہیں لیکن ہر منزل پر مجھے اپنی رگوں میں خون جمتا محسوس ہوتا تھا۔ رات کو جب پہاڑوں پہ دھند چھا جاتی اور میرا دل ہولنے لگتا تو میں الاؤ میں اور لکڑیاں ڈال دیتا، روشنی سے مجھے کچھ سکون ملتا تھا۔ کتنی ہی بار میں نے اُن سے کہا کہ واپس چلیں۔ یہ سنتے ہی بیرو مجھے گھونسے مارنے اور قہقہے لگانے لگتا۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مصنوعی قہقہے لگا رہا ہے۔

ہندوستانی سرحدی چوکی والنگ اور تبتی سرحدی چوکی کے سوا راستے میں پڑنے والی تمام بدھ خانقاہوں اور مندروں میں ہمارا جانا ایک معمول تھا۔ والنگ سے ساما تک ہم ایک طویل چکر کاٹ کے پہنچے تھے اس لیے وہاں کی خانقاہوں اور مندروں میں نہیں جا سکے۔ زالپول میں بستی کے لوگوں نے ہماری بہت خاطر کی۔ زالپول سے آگے چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں، ہم نے اتنی ہی دیر وہاں قیام کیا جتنی دیر میں کھانے پینے کا سامان اکٹھا کر سکتے تھے اور نئے قلیوں کو ڈھونڈ سکتے تھے۔ زالپول کے بعد برف پوش پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ دن میں برف پر دھوپ کی چمک سے آنکھیں درد کرنے لگتیں اور ہماری صرف آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ باقی سارا چہرہ اُونی ٹوپیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بات کرنے کے لیے ہمیں ٹوپیاں سر سے اوپر کرنی پڑتیں۔ بستی کی ای گانگ سے چند میل بعد دریائے پوزانگ پر واقع ایک بستی ڈروواگومپا ہے۔ اس سے کچھ آگے قصبہ ساری ہے۔ ہم وہاں پہنچے تو اتفاق سے سالانہ مقدس میلا لگا ہوا تھا۔ تبت کے بڑے چھوٹے لاما وہاں موجود تھے اور بھکشوؤں کا ایک بڑا اجتماع تھا۔ میلے کی

وجہ سے ہم دو دن کے لیے وہاں رک گئے اور ہم نے اپنا بیشتر وقت میلے ہی میں گزارا۔ راستے میں قلیوں کی مدد سے ہمیں چند تبتی لفظ آ گئے تھے۔

"باڈگے پاک بوکی۔ اِن گی یاڈ۔ ڈرو": خوب، تم تبتی زبان اچھی طرح جانتے ہو۔

"لاک": نہیں۔

"پاک بوتی گی مڈ": اچھی طرح نہیں۔

"لاکس سوتو جے چھے": مہربانی، آپ کا شکریہ۔

"پاہ لالنگ": اُٹھ جاؤ۔

"مہ ترمی یار": آگ روشن کرو۔

"چا بزنگ": چائے بناؤ۔

جو قبیلہ جتنی بلندی پر ہوتا تھا، اتنا ہی معزز سمجھا جاتا تھا۔ جو جتنا نیچے، اتنا ہی بے عزت۔ اس اعتبار سے ہم نیچے کی نسبت زیادہ عزت دار بستیوں سے گزر رہے تھے۔ ساری سے ہم چار راستوں کے سنگم گرٹے لٹ سا کے مقدس مقام پر آ گئے۔ یہاں بھی ایک بڑا مندر تھا۔ گرٹے لٹ سا سے ساوا چوڈن تک ہمیں کوئی مکان نہیں ملا۔ تمام راستہ بلند ترین پہاڑوں، گھاٹیوں اور چھوٹے بڑے دریاؤں سے ہو کے نکلتا تھا۔ قدم قدم پر رسیوں کے پُل، بعض صرف جانوروں کے لیے اور بعض انسانوں کے لیے مخصوص۔ بیشتر نشیب ہونے کے سبب یہاں ہر موسم میں سیلاب آتے ہیں۔ گرٹے لٹ سا اور ساوا چوڈن کا سارا علاقہ ہمارے تصور سے بعید تھا۔

ڈیڑھ مہینے کی مسافت کے بعد ایک دن جب قلیوں نے ہمیں بتایا کہ آگے چند میل کے فاصلے پر جانگ قبیلے کی بستی ہے تو کسی کو یقین نہیں آیا۔ اونچائی کے باوجود ہماری رفتار تیز ہو گئی۔ وہ کورا کا وطن تھا۔ جانگ قبیلے کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے میرے پیر ڈگمگانے لگے۔ کورا انھی راستوں سے ہو کے گئی ہو گی۔ جبھی تو اُس میں ایسی ہمت تھی، ایسا عزم تھا۔

ہر بستی کے مانند جانگ قبیلے کے لوگوں نے ہماری آمد پر ہمیں مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ ہم نے کہیں اور جانے کے بجائے سیدھے جانگ قبیلے کے سردار کے رُو بہ رُو ہو کے اُسے چند تحائف پیش کیے۔ سولم نے ہماری ترجمانی کی۔ سردار نے ہمارے سفر کا مقصد تجارت جان کے سر ہلایا، گلوبند بدلا اور اس طرح ہم نے کچھ کہے اور اُس سے کچھ سنے بغیر روایتی انداز میں چند دن درونگ بستی میں رہنے کی اجازت حاصل کر لی۔

جانگ قبیلے کے لوگ عام تبتیوں کے مقابلے میں سُرخ و سفید اور لمبے چوڑے تھے۔ چھوٹے چھوٹے دانت، چمکتی ہوئی تیز آنکھیں۔ عورتیں بہت خوب صورت تھیں، اُن کے بال لمبے اور قد اُٹھتے ہوئے تھے۔ سولم کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ قبیلے کا موجودہ سردار عارضی ہے۔ ہر سردار کو مہلت دی جاتی ہے کہ وہ گیارہ مہینے کے عرصے میں کھوئے ہوئے متبرک کاغذات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ ناکامی کی صورت میں اُسے یا تو قبیلہ بدر کر دیا جاتا ہے یا مار دیا جاتا ہے۔ بستی کئی پہاڑوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ قبیلے کا ہر شخص غور و فکر میں ڈوبا ہوا، پریشان اور گھبرایا ہوا نظر آتا تھا۔ ہمیں ابتدا ہی میں محسوس ہو گیا تھا کہ وہ ہماری نقل و حرکت کی پوری نگرانی کر رہے ہیں۔ ہم نے بیرو، وزیر، پلٹو، زورا، سارٹے، جینی، منّن خاں اور رہلا کو بستی سے دُور ایک فاصلے پر روک دیا تھا۔ ہنجل نے انھیں ہدایت کی تھی کہ وہ چار روز بعد بستی کا رُخ کریں۔ ہم صرف پانچ، ہنجل، میں، جامو، مارٹی اور سلطان بستی میں داخل ہوئے تھے۔ ہم بھی ہر طرح محتاط تھے۔ تمنچے ہم نے اپنے کوٹوں کی جیبوں میں رکھ لیے تھے۔ تین دن تک ہم بستی کے لوگوں سے سُن گُن لینے کی کوشش کرتے رہے مگر ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ قبیلے کے لوگ صبح و شام عبادت کرتے تھے۔ جس شخص چن وسا کے ہم مہمان تھے، اُس نے چوتھی رات زبان کھولی اور ہمیں بتایا کہ قبیلے کے لوگ برسوں سے ایک عذاب میں مبتلا ہیں، وہ اُن متبرک کاغذات کے امین نہیں رہے جو اُن کے قبیلے کے لیے باعثِ افتخار تھے۔ ہم نے کوئی تبصرہ کیے بغیر صرف دُکھ کا اظہار کرنے پر قناعت کی۔

دوسرے دن جب ہم اِرد گرد کے پہاڑوں سے واپس بستی میں اپنے میزبان کے مکان پہ پہنچے تو سامان پر ایک نظر ڈالتے ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ اس کی تلاشی لی گئی ہے۔ انھوں نے کوئی چیز چوری نہیں کی تھی اور تمام چیزیں جوں کی توں ترتیب سے رکھ دی تھیں۔

بستی سے چند میل کی دُوری پہ بدھوں کی پتھروں سے بنی ہوئی ایک بڑی خانقاہ تھی۔ ابھی بیرو اور دوسرے لوگ چوتھا دن گزر جانے کے باوجود بستی میں نہیں آئے تھے۔ یقیناً کوئی بیمار پڑ گیا ہو گا یا انھیں کوئی اور اُفتاد پیش آ گئی ہو گی۔ ہم اُن کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ پانچویں دن ہم نے خانقاہ کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو راہب گوتم بدھ کی ایک بڑی مورتی کے سامنے عبادت کر رہے تھے۔ ہم بھی وہیں بیٹھ گئے۔ ہم سب کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ عبادت ختم ہونے کے بعد راہب منتشر ہو گئے اور مختلف جگہوں پر بیٹھ گئے۔ ہم وہاں سے واپس آ رہے تھے کہ ایک مندر کے نزدیک سے گزرتے ہوئے میری سانس سینے میں اٹکنے لگی۔ ایک بوڑھے راہب کی شکل مجھے کچھ جانی پہچانی محسوس ہوئی۔ اُس کا چہرہ سپاٹ اور سر منڈا ہوا تھا۔ گالوں کی ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں۔ وہ آنکھیں بند کیے ریاضت میں مصروف تھا۔ میں نے ہنجل کا بازو زور سے پکڑ لیا۔ میری سسکی نکل گئی۔ ہنجل نے مجھے سرزنش کی اور میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ میں انھیں اس حلیے میں بھی پہچان سکتا تھا۔ وہ آبا جان کے سوا کوئی نہیں ہو

سکتا تھا۔

وہی اُن کی لمبی ناک، پتلے پتلے ہونٹ، دھنسی ہوئی آنکھیں، بھاری چہرہ۔ اُن کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ بہ ظاہر وہ سکون سے پلکیں مُوندے بیٹھے تھے لیکن اُن کی پیشانی پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ تھل نے اپنے پنجے میں میرا ہاتھ جکڑ لیا تھا۔ میری پھٹی ہوئی آنکھیں اُنھی پر مرکوز تھیں۔ وہ میرے اباجان ہی تھے۔ سولہ سترہ سال تک صبح و شام، ہر ساعت میں نے انھیں دیکھا تھا۔ اُن کے چہرے کا ایک ایک نقش میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ میں نے تھل کے پنجے سے اپنا ہاتھ چھڑا کے اُن کی طرف بڑھنا چاہا لیکن تھل نے میرا بازو کھینچ لیا۔

مندر کے اطراف اباجان سے دُور و نزدیک پہاڑیوں پر اُنھی کی طرح دوسرے راہب اپنے آپ میں گم بیٹھے تھے۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ تھل نے بھنچی ہوئی آواز میں مجھے ٹھیرے رہنے کی ہدایت کی اور اباجان کو گھورتا رہا۔ میرے ہاتھ پیروں میں بالکل دم نہیں رہا تھا۔ تھل کی سرگوشی کی بھنک شاید اباجان کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی کہ انھوں نے یک بارگی پلکیں اُٹھا کے سرسری نظر سے ہماری جانب دیکھا۔ ہم سب اُن سے کچھ فاصلے پر سامنے ہی کھڑے تھے۔ دوسرے لمحے انھوں نے آنکھیں بند کر لیں مگر پھر فوراً کھول دیں۔ ہم سب نے تھل کی پیروی میں اُن کے آگے سر جھکا دیے۔ اباجان کے کپکپاتے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُن کی نظر سیدھی مجھی پر آئی۔ ایک لمحے کے لیے میرے سارے جسم پر رعشہ سا طاری ہو گیا اور مجھے اپنی آنکھوں کی دُھند میں ایسا دکھائی دیا جیسے اُن کی پلکیں پھڑکی ہیں اور اُن کا منہ کھل گیا ہے لیکن یہ میرا وہم تھا۔ انھوں نے بس نگاہ بھر کے ہم سب کو دیکھا ہو گا اور ہاتھ اُٹھا کے ہمیں جواب دیا ہو گا کہ پہلے کے مانند پتھر کی طرح منجمد ہو گئے۔ تھل چند لمحے وہیں کھڑا رہا، پھر میرا ہاتھ تھامے ایک طرف چل دیا۔ میں نے مُڑ کے پیچھے دیکھنے کا کئی بار ارادہ کیا لیکن تھل کے خیال سے پگ ڈنڈی پر گرتا پڑتا اُس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ میری ٹانگیں لرز رہی تھیں اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ہم زیادہ دُور نہیں گئے۔ تھل قریب ہی ایک پہاڑی پر آ کے بیٹھ گیا۔ جامو، مارتی، سلطان اور سُولم کی مضطرب سوالیہ نظریں بار بار میری اور تھل کی جانب اُٹھتی تھیں۔ تھل کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ "لاڈلے! تیری آنکھیں ٹھیک ہی بول رہی ہیں نا؟"

میری سسکیاں نکل پڑیں۔

تھل نے پھر مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ سر جھکائے کچھ سوچتا رہا۔ "کیا بات ہے اُستاد؟ کچھ اپنے کو بھی بولو۔" جامو نے بے چینی سے پوچھا۔

"کیا بولوں رے۔" تھل نے گہری سانس بھر کے تلخی سے کہا۔

"کون ہے وہ؟"

"وہی ہے جس کے لیے اِدھر آئے ہیں۔"

"نہیں۔" جامو حیرت سے اچھل پڑا اور میرا کندھا جھنجوڑنے لگا۔ "اُستاد ٹھیک کہتے ہیں کیا؟" وہ سٹ پٹاتے ہوئے بولا۔

میں نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"لاڈلے! لاڈلے!" جامو مجھے زور زور سے دبوچنے لگا۔ سُلطان اور سولم بھی مجھ سے چمٹ گئے اور مجھے پیار کرنے لگے۔

"کپڑے مت پھاڑو۔" تھل تندی سے بولا۔ "تو بھی بھانڈ! جامو! اِدھر یہ تیرا اڈّا نہیں ہے رے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پر تھل بھائی!..." جامو کچھ کہتے کہتے رُ

"بیٹھا رہ۔" تھل ناگواری سے بولا۔

"قسم سے اپنے کو یقین نہیں آتا۔" تھل نے جواب نہیں تنک کے بولا۔ "ایسے منہ سی کر کے مت بیٹھو اُستاد!"

"تیری نشا ہے، ناچنے لگوں کیا؟"

"تم تو فضول میں بگڑ رہے ہو۔" جامو منہ بنانے لگا۔

جامو کے ساتھ سلطان، مارتی اور سُولم بھی میرے پاس گئے۔ دُور اباجان گم سم بیٹھے تھے۔ گو اُن کے چہرے کے بدلتے ہم آسانی سے نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن وہ کوئی جنبش کر ہماری نظروں سے اوجھل نہ رہتی۔ دُور سے وہ کوئی بُت معلوم تھے۔ میرا خیال تھا، شاید وہ ایک بار پلٹ کے دیکھیں مگر انھوں ثانیے کے لیے بھی ہماری جانب نگاہ نہیں کی۔ ممکن ہے اُس میں اُن کے سامنے کھڑا ہوا تھا، اُن کے دماغ میں میرا خیال گز کہیں میں اُن کا بیٹا بابر تو نہیں ہوں مگر انھوں نے فوراً یہ واہمہ جھٹک دیا ہو گا۔ اتنی مدت بعد اور اتنی دُور افتادہ جگہ میں انھیں نظر آ سکتا ہوں۔ میرا چہرہ بھی پہلے سے بہت بدل گیا تھا۔ اباجا چہرہ یاد ہو گا جب میں گھر میں رہتا تھا۔ اُن کے خیال میں میں مر کھپ چکا ہوں گا۔ عجب نہیں کہ وہ اب مجھے کبھی یاد بھی ہوں۔ شروع شروع میں اگر کبھی میرا خیال آتا ہو گا تو اُن کا دل ہو گا اِس لیے انھوں نے میرا نام ہی سینے سے کھرچ کے پھینک کہ کبھی اُن کا کوئی بیٹا تھا۔ وہ اتنے ہی سخت اور ضدی تھے۔ کسی سے ناراض ہو جائیں تو عمر بھر منہ نہ دیکھیں اور جب سخاوت گھر کا گھر لٹا دیں۔ جانگ قبیلے میں آتے ہی انھیں معلوم ہو گیا ہو ابھی تک قبیلے کے لوگوں کو نہیں ملی ہے۔ یہ جان کے انھیں یہ رہنے کا گماں ضرور ہوا ہو گا۔ ہم وہیں پہاڑی پر بیٹھے انھیں دیکھ

وہاں کوئی ایک مندر نہیں تھا۔ چھوٹے بڑے بہت سے کوئی اُس پہاڑی پر، کوئی اِس پہاڑی پر۔ سارا علاقہ اونچے نیچے

پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اب تک ہمارا جتنے علاقوں سے اُن میں یہ جگہ سب سے سرسبز تھی۔ بستی اور مندروں کے قصبے کے اطراف سارے پہاڑوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ رنگ اور مندروں کو برف نے نہ جانے کیوں چھوڑ دیا طرف برف پوش پہاڑیوں کے بیچ میں یہ سبزہ زار علاقہ سفید رکھے ہوئے ایک گل دستے کے مانند تھا۔ ندی، نالے، آبشار پھولوں کے تختے۔ اونچے درختوں کے درمیان مسطح پہاڑوں پر جابجا بلند و بالا عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں۔ ہر سُو سکوت چھایا ہوا تھا۔ جھلی پتّوں سے چھَن چھَن کے عمارتوں پر بکھری ہوئی تھی۔ ہر جگہ دیو ہیکل مورتیاں نصب تھیں۔ کہیں پہاڑوں میں ترشی ہوئی، زمین پر اُگی ہوئی۔ مندروں کی دیواروں اور ستونوں پر بھی ایسے تھے۔ دیواروں میں ہزارہا طاق تھے۔ اور ہر طاق میں ایک مورتی تھی۔ سب سے بڑا مندر ایک اُونچی پہاڑی پر واقع تھا۔ اُس کے چھوٹے بڑے مندر اور دوسری عمارتیں تھیں۔ سُولم کی زبانی ہمیں تھا کہ یہیں بدھوں کی کوئی درسگاہ جیسی ایک درس گاہ ہے۔ بھر سے بدھ یاتری اور طالبِ علم بدھ تعلیمات کے لیے آتے برسوں یہیں رہتے ہیں۔

دوپہر گزر گئی۔ اباجان نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی، نہ ہی جگہ سے ہٹے لیکن ہم وہاں کب تک یوں بیٹھے رہتے۔ بستی کے راہب اور خدمت گار پجاری ہمارے اِردگرد کی پگ ڈنڈیوں پر ہوئے ہمیں چھچھلتی نظروں سے ضرور دیکھتے تھے۔ شام ہونے لگی، سے نہیں اُٹھا۔ سورج کا سُرخ گولا پہاڑوں میں آدھا چھپ گیا تھا کے جسم میں جنبش ہوئی۔ ہم سیدھے ہو گئے۔ اباجان نے گردن جھٹک کے آنکھیں کھولیں، آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے پاس کول نما برتن اُٹھا کے کھڑے ہو گئے۔ ہماری نگاہیں اُن کی ایک ایک کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ وہ سب اُن کی طرف لیکن یہ بات میں اُن سے کیسے کہہ دیتا۔ پہاڑی پر کھڑے ہو کے اباجان نے نظر ڈالی۔ اُن کے ساتھ نزدیک و دُور بیٹھے ہوئے دوسرے اُٹھتے گئے۔ انھوں نے اپنے قریب ترین ساتھی کو سر ہلا کے یا شاید اُس سے کچھ کہا۔ ہم اتنے فاصلے سے کچھ سُن نہیں سکتے پہاڑ خاموشی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ یقیناً اباجان کو خبر نہیں بزرگ اُن سے کچھ دُور ایک دوسری پہاڑی پر بیٹھے ہوئے اُن ہیں۔ مندر کی طرف جانے سے پہلے انھوں نے سر گھما کے سمتوں دیکھا۔ ہم پر اُن کی نظر نہیں پڑی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے مندر کی عمارت میں گم ہو گئے۔

ہم اُن کے تعاقب میں مندر کے راستے پر نہیں گئے۔ تھل مختلف پہاڑیوں کے بیچ کاٹتا ہوا واپس بستی کے راستے پر چلنے لگا۔ بستی کسی قدر نشیب میں واقع تھی۔ مجھ میں تھل سے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں تھی کہ وہ اباجان کے پاس جانے کے بجائے بستی کی طرف کیوں جا رہا ہے۔ میں خود بھی بہت سی باتوں کا اندازہ کر سکتا تھا۔ میرا بس چلتا تو تمام پہاڑیاں پھلانگ کے اباجان کے پاس پہنچ جاتا اور اُن کے قدموں پر سر رکھ کے اپنے سینے میں چاقو مار لیتا۔ مجھ سے تو اُن کے سامنے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ مجھے معاف کر دیں۔ انھوں نے اپنی جو یہ حالت بنا رکھی تھی، یہ سب کچھ مجھ منحوس کے سبب سے تھا۔ اُن کا جسم ڈھانچا بن گیا تھا۔ ساری پسلیاں اُبھری ہوئی تھیں۔ کھال جیسے ہڈیوں پر منڈھ دی گئی ہو۔ بس اُن کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ ایسی چمک جسے دیکھ کے ڈر لگے۔ ہم واپس بستی میں پہنچے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ ہمارا میزبان چن وسا ہمارا منتظر تھا۔ وہ لوگ رات کا کھانا جلدی کھا لیتے تھے اور رات بھر جب تک نیند نہیں آتی تھی، چائے پیتے رہتے تھے یا دس دس بارہ بارہ کی ٹولیوں میں الاؤ کے گرد بیٹھے رات کا بیشتر حصّہ گزار دیتے تھے۔ ان چار پانچ دنوں میں بستی کے بہت سے لوگ ہم سے واقف ہو چکے تھے۔ کل صبح اور پرسوں ہم نے بستی کی چند دکانوں کے نزدیک ایک کشادہ جگہ اپنا سامان صندوقوں سے نکال کے نمائش کے لیے سجایا تھا۔ دونوں دن ہمارے گرد ایک بھیڑ لگی رہی۔ لوگ خریدتے کم اور چیزیں حیرت سے دیکھتے زیادہ تھے۔ اُن کے لیے بہت سی چیزیں نئی تھیں۔ زنانہ ریشمی کپڑے عورتیں اور لڑکیاں چھو چھو کے دیکھتی تھیں۔ گاہکوں کے قیمت پوچھنے پر تھل نے چیزوں کے دام بتانے شروع کیے تو ہم سب کو حیرت ہوئی۔ وہ چوگنی، آٹھ گنی قیمتیں بتا رہا تھا۔ جامو اور تھل سامان کے پاس ایسے بیٹھے تھے جیسے اُن کا پیشہ یہی رہا ہو۔ وہ مول تول کر رہے تھے۔ ہم نے کسی کو کم قیمت پر سامان نہیں بیچا۔ قیمتیں زیادہ ہونے کی وجہ سے سامان زیادہ نہیں بک سکا۔ تھل کی خواہش بھی یہی تھی کہ سارا سامان ایک دم نہ بک جائے، ہمارے پاس ذخیرہ باقی رہے۔ سلطان نے لڑکیوں کے ہاتھوں میں چوڑیاں پہنائیں، اُن کے پیروں میں پازیب ڈالی، گھنگرو باندھے۔ وہ چل چل کے دیکھتیں تو چھن چھن کی آواز سُن کے بہت خوش ہوتیں۔ جامو نے لڑکیوں کے بالوں میں کلپ اور پنیں لگائیں اور چٹیا گوندھنے کا طریقہ بتایا۔ جب تک ہم بازار لگائے بیٹھے رہے، بستی کی نوجوان لڑکیوں کا تانتا بندھا رہا۔ سُولم، سلطان، جامو اور مارتی اُن کی پنڈلیوں، گلوں، ہاتھوں اور پیروں میں زیور سجاتے رہے۔ جانگ قبیلے کی ہر لڑکی کا رنگ سُرخ و سفید، ہاتھ نازک، انگلیاں چھوٹی چھوٹی، پتلی پتلی، لمبی گردنیں اور بدن ریشم کے سے تھے۔ جامو اور سلطان زیور، چوڑیاں پہنا کے انھیں آئینہ دکھاتے تھے تو وہ شرما جاتی تھیں۔ اُن کے چھوٹے چھوٹے سفید دانت کھل

کھلانے لگتے تھے۔ سہ پہر کو دھوپ ڈھلنے کے بعد ہم نے سامان صندقوں میں واپس رکھنا شروع کیا تو سلطان وہاں سے اُٹھنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ تجھل نے اُسے ڈانٹ کے اُٹھایا۔ وہ بار بار یہی کہتا تھا: "استاد! سلطان واپس نہیں جائے گا یا اِدھر ہی بستی کی لڑکیوں کے ہاتھوں میں چوڑیاں پہناتا، جھومر سجاتا اور آئینہ دکھاتا رہے گا۔"

اُس وقت بھی اُسے بستی میں واپس چلنے کی جلدی تھی۔ جیسے ہی تجھل نے بستی میں اُترنے کے لیے قدم بڑھائے، سلطان پگ ڈنڈی پر قلانچیں بھرنے لگا۔ اِس تیزی میں ایک پھسلواں جگہ اُس کا پاؤں رپٹ گیا اور پیر میں موچ آگئی۔ تجھل راستے بھر اُسے پھٹکارتا رہا۔ تکلیف کی وجہ سے سلطان سے چلا نہیں جا رہا تھا اسی لیے ہمیں بستی واپس پہنچنے میں دیر ہوگئی اور اندھیرا ہوگیا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں جا چکے تھے۔ بند مکانوں کی درزوں سے کہیں کہیں مدھم روشنی پھوٹ رہی تھی اور پہاڑوں میں ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ سردی اتنی زیادہ تھی کہ اگر ہم کچھ دیر اور پہاڑی پہ بیٹھے رہتے تو ہمارے جسم اکڑ جاتے۔ آج یہ پہلا دن تھا کہ ہمیں اپنے آس پاس، آگے پیچھے نگرانی کے لیے کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پچھلے تمام دنوں وہ ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے اور اپنے خیال میں یہ سمجھ رہے تھے جیسے ہم اس سے بے خبر ہیں۔ جہاں جہاں ہم جاتے، اُن کی نگاہیں ہمارا پیچھا کرتی رہتیں، جدھر سے ہم گزرتے، لوگ ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے۔ وہ ہم سے کچھ کہتے تو نہیں تھے لیکن اُن کی مُنبھتی ہوئی آنکھیں ہر لمحے ہمیں اپنے چہروں پر محسوس ہوتی تھیں۔ بستی کے مکانوں کے درمیان تنگ راستے سنسان پڑے تھے پھر بھی ہم تمام تر احتیاط سے، پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے بستی میں داخل ہوئے۔ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا تھا۔ تجھل نے سب کو منع کر دیا تھا کہ وہ تنہائی میں بھی غیر ضروری اشاروں اور تبصروں سے اجتناب کریں۔ وہ خود بھی بس ضرورت کے وقت بولتا تھا۔ آگے جا کے ایک کھلی اور ہموار جگہ ہمیں اندھیرے میں چند سائے رینگتے نظر آئے۔ شاید ہمارے بستی میں جلد نہ پہنچنے کی وجہ سے اُنھیں تشویش ہوگئی تھی۔ قریب جانے پر پتہ چلا کہ وہاں کئی نوجوان اور لوڑھے آدمی موجود ہیں۔ ہماری آہٹ سُن کے وہ چُپ ہو گئے اور ہمیں گھورنے لگے۔ اندھیرے میں اُن کے چہرے دھندلے دھندلے تھے، کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہماری تلاش میں نکلنے والے تھے۔ اُن میں ہمارا میزبان چن وسا بھی تھا۔ کسی نے ہم سے کچھ پوچھا نہیں۔ چن وسا سب سے پہلے آگے بڑھا اور سلطان کی حالت دیکھ کے ٹھٹک گیا۔ کچھ کہے سُنے بغیر وہ ہمیں ایک طبیب کے پاس لے گیا۔ طبیب نے جڑی بوٹیوں کے تیل سے سلطان کے پیر کی مالش کر دی اور لیپ کر کے پٹے باندھ دیے۔ درد سے سلطان کا بُرا حال تھا مگر دیکھتے دیکھتے اُسے افاقہ ہونے لگا۔

چن وسا نے گھر آ کے اُسے گرم کپڑوں میں لپیٹ کے فرش پر [illegible] کوئی ایسی نشہ آور چیز کھلا دی کہ سلطان گہری نیند سو گیا۔

مجھے اندیشہ تھا کہ سلطان کی چوٹ ہمارے کہیں آڑے [illegible] پھر ایک رکاوٹ بن جائے گی۔ سفر میں بھی روز کوئی نہ کوئی [illegible] اور ہماری رفتار میں فرق آ جاتا تھا۔ میری سمجھ میں اب تک [illegible] آئی تھی کہ تجھل کو اتنے لوگ ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ [illegible] رکاوٹیں اتنی ہی کم ہوتیں اور پھر اُس نے سلطان کو کیوں ساتھ رکھا [illegible] کی مسلسل تنبیہ کے باوجود تین دن سے سلطان اُوٹنگی بوٹنگی حرکتیں [illegible] بالکل بچوں کی طرح ضد کرنے لگتا۔ بعض اوقات تو مجھے اُس پر [illegible] تھا۔ چن وسا کی فوری توجہ سے سلطان کی مشکل بہر حال دُور ہو [illegible] دیر سے آنے کا جواز بھی پیدا ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ بستی میں [illegible] کے بعد تجھل کے ذہن میں ابا جان کے متعلق کوئی تدبیر ضرور [illegible] جان کو دیکھ کے یوں وہاں سے لَوٹ نہیں سکتا تھا لیکن [illegible] ہو یا نہ ہو، وہاں سے لوٹے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ہمیں [illegible] میں واپس آنا ہی تھا۔ ہم نہ آتے تو ہماری تلاش میں [illegible] نیچے ہمارا سامان بھی پڑا تھا اور ہمیں ابھی اور نہ جانے کب تک [illegible] درمیان رہنا تھا۔ جاتنگ قبیلے کی ایک یہی بستی نہیں تھی جس [illegible] ہوئے تھے، قریب قریب کے پہاڑوں پر قبیلے کی اور بھی [illegible] چن وسا نے ہمیں بتایا تھا کہ مندروں کے اُس پار بھی قبیلے کی [illegible] مشرق، مغرب، جنوب تینوں سمتوں کے پہاڑوں پر جاتنگ [illegible] پھیلے ہوئے تھے۔ شمال کے پہاڑوں میں سال کے ہر مہینے [illegible] تھی اس لیے وہاں کسی انسانی بستی کا قیام ناممکن تھا۔ چن [illegible] باتوں میں ہمیں یہ جتا دینا بھی ضروری سمجھا تھا کہ بستیوں کے [illegible] اور سردار کے احکام جلد منتقل کرنے کے عمدہ انتظامات [illegible]

چن وسا نے غلط نہیں کہا ہوگا۔ جاتنگ قبیلہ دو [illegible] نسبت زیادہ خوش حال اور مہذب تھا۔ بستی میں چند دکا[illegible] صاف ستھرا مختصر بازار تھا اور بانس کے مکانوں کے ساتھ [illegible] کے مکانات بھی بنے ہوئے تھے۔ ہر شخص ہر وقت مسلّح [illegible] پاس ایک خنجر ہونا تو از بس لازم تھا۔ اُن کی زبان میٹھی، [illegible] پُر نرمی بھی۔ ہمارا قیام جس بستی میں تھا، اُسے تمام بستیوں میں [illegible] مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ایک تو یہ کہ وہ مندروں کے مقد[illegible] تھی۔ سردار اور اُس کے رفقا بھی یہیں رہتے تھے۔ یہاں [illegible] اور اسی لیے راستے بھی پہاڑوں پر واقع دوسری بستیوں کے [illegible] قدر کشادہ تھے۔ بستی کے درمیان سے ایک تیز ندی گزرتی [illegible] کناروں پر قبیلے کے لوگ چھوٹی موٹی کاشت کرتے تھے [illegible] روایتیں دردنگ کی مرکزی بستی کے متعلق مشہور تھیں۔ [illegible]

[illegible] رسم و رواج کے خلاف کوئی بات نہیں کی تھی۔ بازار میں سامان [illegible] تجھل نے اگرچہ گاہکوں سے حجت کی تھی لیکن قبیلے کے معزز [illegible] لوں میں تحائف بھی تقسیم کیے تھے تاہم ایک ذرا سی لغزش [illegible] احتیاط خاک میں مل سکتی تھی۔ ہم وہاں اجنبی تھے اور جاتنگ [illegible] کے تیور سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اجنبیوں کے معاملے [illegible] حساس ہیں۔ کبھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کو [illegible] نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

[illegible] سلطان کو علیحدہ کمرے میں لِٹانے کے بعد چن وسا ہمیں اپنے مکان [illegible] کے بڑے کمرے میں لے آیا اور ہم یہ دیکھ کے دنگ رہ [illegible] پہلے سے چند آدمی موجود تھے۔ پانچ بوڑھے آدمی، جن کے زرد [illegible] چہرے آتش دان کے شعلوں کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ [illegible] اُن کی موجودی ہمارے لیے حیرت کا سبب تھی۔ حالانکہ فوراً [illegible] نے یہ بتا کے ہماری اُلجھن دُور کرنے کی کوشش کی کہ آج ہمارے [illegible] آنے پر اُس نے بستی کے چند معزز لوگوں کو مدعو کیا ہے اور [illegible] ہمارا منتظر تھا۔ ہم نے قبیلے کی روایت کے مطابق انھیں سلام [illegible] کے ساتھ ہی فرش پر بیٹھ گئے۔ اُن میں سے تین آدمیوں سے [illegible] چکے تھے اور اُنھیں تحائف دے چکے تھے۔ اُن کی وہاں موجودی [illegible] ہو، اب یہ بات طے تھی کہ جب تک وہ موجود تھے، ہم [illegible] نہیں جا سکتے تھے۔ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ سوچ کے [illegible] لوگوں کے ساتھ بیٹھنا پڑے گا، میرا دل ڈوبنے سا لگا۔ [illegible] ابا جان کو دیکھا تھا، طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ اُن [illegible] سامنے آ جاتا تھا۔ لگتا تھا جیسے سب کل کی بات ہے۔ [illegible] کانوں میں بجنے لگے تھے اور اُن سب کے چہرے۔ فرخ، [illegible] اکبر۔ پتہ نہیں کون کہاں تھا، ابا جان اُنھیں کس کے پیچھے [illegible] تھے۔ شاید اب کوئی بھی اُن کے ساتھ نہیں رہا تھا ورنہ وہ [illegible] سے یہاں کیسے بیٹھے رہتے۔ پر ابا جان کا حوصلہ بہت بڑا تھا۔ [illegible] جھل گیر کھو گئے۔ میں گھر سے نکل گیا اور بعد میں نہ جانے کون [illegible] اُن کے حوصلے میں فرق نہیں آیا۔ اُنھیں یہ سب دیکھنے کی [illegible] تھی۔

[illegible] وسا ایک سن رسیدہ آدمی تھا لیکن جسم کی مضبوط ساخت کی [illegible] اتنی عمر میں بھی توانا اور سُرخ نظر آتا تھا۔ قبیلے میں اُسے [illegible] تھی۔ دوسرے امیر لوگوں کی طرح ایک ہموار جگہ پر اُس کے [illegible] کا ایک پختہ مکان تھا جس کی دیواریں، چھت اور ستون پتھر [illegible] بھاری دروازہ لکڑی کا تھا۔ بستی میں کم ہی لوگوں کے پاس اس [illegible] ات تھے۔ سردار نے اُسے ہماری مہمانی کے لیے خاص طور پر [illegible] تھا۔ پہلے دو دن تک تو وہ محتاط محتاط رہا پھر رفتہ رفتہ اُس کی پیشانی اور آنکھوں کا کھنچاؤ کم ہوا۔ اُس رات اُس نے خاصا اہتمام کیا تھا۔ یاک کا بُھنا ہوا گوشت، پہاڑوں پہ کاشت کی ہوئی اُبلی ہوئی سبزیاں، یاک کا رنگین مکھن اور قسم قسم کی چیزیں موجود تھیں۔ ہم نے اپنی جانب سے اُس کی خدمت میں ولایتی شراب کی بوتل پیش کی۔ بوتل دیکھ کے چن وسا اور اُس کے بوڑھے ساتھیوں کی آنکھوں میں چنگاریاں سی لپکنے لگیں۔ پہلے چن وسا نے یہ تحفہ قبول کر لیا تھا لیکن پھر یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ اتنی قیمتی چیز کا اصل حق دار قبیلے کا سردار ہے۔ تجھل نے اُسے یقین دلایا کہ سردار کے لیے اُس کے پاس اور بوتلیں ہیں جو اُس نے چلتے وقت اُسے پیش کرنے کے لیے علیحدہ رکھ لی ہیں۔ چن وسا نے بوتل شکریے کے ساتھ قبول کر لی اور ہمیں بتایا کہ قبیلے کے برگزیدہ لوگوں نے عرصہ ہوا، کسی عہد کے بغیر خود ہی اپنے لیے شراب ممنوع قرار دے رکھی ہے لیکن تجھل کے اصرار پر اُنھوں نے چند گھونٹ حلق سے اُتار لیے۔ اندر سے چن وسا کی تلی جیسی آنکھوں والی گڑیا سی نوجوان خادمہ گرم گرم گوشت لا رہی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر خادم دروازے کے پاس مستعد کھڑا تھا۔ وہ سب کھانا کھا رہے تھے اور شراب پی رہے تھے، تجھل کو جیسے یاد نہیں رہا تھا کہ اُسے کوئی اور بھی کام ہے۔ پہلی بار وہ اُن سے پُرانے واقف کاروں کے مانند باتیں کر رہا تھا۔ مجھ سے نہ کچھ کھایا گیا، نہ پیا گیا۔ میرے جی میں آتا تھا کہ تمنچا نکال کے اُن سب کو گولی مار دوں یا شراب کی پوری بوتل حلق میں لَوٹ لوں، اپنا سر دیوار سے پھوڑ لوں۔

کمرہ گرم تھا۔ روشن دان بھی بند رکھے گئے تھے۔ ایک طرف کونے میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی لکڑی زور سے چٹخ اٹھتی تھی۔ چھت سے اُوپر آگ کا دھواں نکلنے کا باقاعدہ انتظام تھا۔ کمرے کے درمیان دری جیسا ایک موٹا کپڑا بچھا ہوا تھا۔ سب لوگ کھانے کے اطراف دائرہ بنائے ہوئے بیٹھے تھے اور اُن سب کے جسموں کے کُھلے ہوئے حصے آگ کی روشنی میں لال ہو رہے تھے۔ تجھل چن وسا کی باتیں نہایت توجہ سے سُن رہا تھا اور سوالوں کے ذریعے بیچ بیچ میں ٹوکتا جاتا تھا۔ چن وسا بہت سی باتیں ہمیں پہلے ہی بتا چکا تھا البتہ بعض ہمارے لیے نئی تھیں۔ میرے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ چن وسا کے بیان کے مطابق ہفتے میں ایک بار سردار قبیلے کی تمام بستیوں میں جاتا تھا اور مہینے میں ایک بار جاتنگ قبیلے کی ہر بستی کے لوگ مندر میں اکٹھے ہوتے تھے۔ ہر چار مہینے بعد ایک بستی دوسری بستی کو دو دن دو راتوں کے لیے مہمان کے طور پر مدعو کرتی تھی۔ یہ ایک طرح کا میلا ہوتا تھا۔ قبیلے کی نوجوان لڑکیاں اور لڑکے زیور اور ہتھیار سجا کے ان میلوں میں جاتے تھے اور وہیں رشتے طے ہوتے تھے۔ اگر کوئی لڑکی بہت سے لڑکوں کو مطلوب ہوتی تو قبیلے کے معمر لوگ اُن میں سے ایک سے دوسرے کے لیے اپنا مطالبہ ترک کر دینے کی درخواست کرتے، بصورتِ دیگر قرعہ ڈال لیتے۔ قرعے پر بھی لڑکے آمادہ نہ ہوتے تو اُن کے درمیان مختلف قسم کے مقابلے ہوتے۔

جو مقابلہ جیت جاتا، وہی اپنی مطلوبہ کو لے جاتا۔ یا پھر لڑکی سے یہ کہا جاتا کہ وہ اپنی طرف سے اپنے امیدواروں کے لیے شرطیں عائد کرے۔ لڑکیاں عموماً بولتی نہیں تھیں مگر انھیں کوئی امیدوار ناپسند ہوتا تو وہ ہر ایک پر مختلف قسم کی شرطیں عائد کرتیں۔ جو لڑکا انھیں سب سے زیادہ پسند ہوتا اُس کے لیے وہ شرطیں نرم رکھنے کا اختیار رکھتی تھیں۔ اُس وقت زیادہ دقت پیش آتی جب ایک لڑکی کے بہت زیادہ امیدوار ہوتے اور ایسا اکثر ہوتا تھا۔ اگر کورا یہاں ہوتی تو سارا قبیلہ اُس کا امیدوار ہوتا مگر وہ تو ایک شہزادی تھی، جانگ قبیلے کی ہونے والی ملکہ۔ میں نے چن وسا سے نہیں پوچھا کہ کیا اُس کے لیے بھی اسی طرح امیدوار کھڑے ہوتے مگر کورا اُن میں سے کسی کو پسند نہ کرتی۔ اُس کا رشتہ تو شروع ہی سے میرے ساتھ طے ہو گیا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ اُس نے میرے ملنے سے پہلے مجھے دیکھ لیا تھا۔ کلکتے میں جب ہم ایک ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے تھے اور میرے ماتھے پر اُس کی انگلیاں سرسرا رہی تھیں، اُس نے مجھ سے یہی کہا تھا اور میں نے اُسے پہلی بار گیا اسٹیشن پر دیکھا تھا تو مجھے بھی اُس کا چہرہ جانا پہچانا محسوس ہوا تھا جیسے وہ مجھ سے کبھی بچھڑ گئی تھی پھر مل گئی۔ جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کو ڈھونڈ رہے تھے۔ بُدھ گیا میں اپنے اتالیق اُجین کے قتل ہونے کے بعد وہ کسی اور جگہ پناہ لینے کے لیے نہیں گئی، سیدھی میرے گھر آئی تھی۔

چن وسا کہہ رہا تھا کہ پہلے یہ رسم دھوم دھام سے منائی جاتی تھی مگر اب مدت ہوئی، وہ جوش و خروش نہیں رہا ہے۔ لوگ ملتے ہیں تو عبادت کرتے ہیں۔ قبیلے کے بہترین لڑکے ہر سال اپنے متبرک کاغذات کے حصول کے لیے بستی سے نکل جاتے ہیں۔ کبھی واپس آجاتے ہیں، کبھی نہیں۔ قبیلہ جانگ کو اپنے محلِ وقوع، اپنے ماضی، مقدس مذہبی مقام، برتر جسمی خصوصیات کے اعتبار سے دُور دُور تک مرتبت حاصل تھی۔ چن وسا کے بقول اُن کا یہ اعزاز قائم نہیں رہ سکا کیونکہ وہ مقدس امانت کی حفاظت نہیں کر سکے۔ اُن کی سرفرازی اُن سے چھن گئی اور وہ برسوں سے عذاب میں مبتلا ہیں۔ تجّل نے بوجھل لہجے میں پوچھا کہ آخر ایسا کیوں ہو گیا؟ اُس کے استفسار پر چن وسا کی آنکھوں میں ویرانی چھا گئی۔ اُس نے اضطراب آمیز انداز میں اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، وہ گردنیں جھکائے ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھر رہے تھے۔ چن وسا کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے اور آواز گلوگیر ہو گئی۔ اُس کی زبان پر کورا کا نام آیا تو میرے کان سن سنانے لگے۔ چن وسا بتا رہا تھا کہ خدا نے اُسے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا، وہ آسمانوں سے اُتری ہوئی کوئی پری تھی، وہ ایک نیک اور بہادر سردار کی بیٹی تھی، سردار بے وقت مر گیا، قبیلے والوں نے اپنے محبوب سردار کی چہیتی اور اکلوتی بیٹی کی حفاظت نہیں کی، وہ اُسے کھو بیٹھے۔ اُسے اپنے باپ کی وصیت کے مطابق قبیلے کی رانی بننا تھا لیکن ابھی اُس کی عمر کم تھی۔ اُس کے چچا نے اُس کے ساتھ ظلم کیا

اور قبیلے کی سربراہی کے لالچ میں اپنی بھتیجی کا حق غصب کر [illegible] یہاں رہتی تو وہ یقیناً اُسے زندہ نہ رہنے دیتا۔ اس لیے اُس [illegible] شفیق اور بزرگ اتالیق اُسے قبیلے سے دُور لے گیا اور اپنے [illegible] دستاویزیں بھی لیتا گیا۔ مجھے یہ ساری باتیں خود کورا نے بتائی تھیں [illegible] میں ایک بھکشو نے میرے گلے میں کورا کی دی ہوئی مالا [illegible] مجھ پر حملہ کیا تھا اور میں نے اُسے خیمے میں ختم کر دیا تھا تو اُس [illegible] کچھ کہا تھا۔ ہر گیارہ مہینے بعد سردار مرتے رہے یا قبیلہ بدر کیے [illegible] ہر سردار اپنا عہدہ سنبھالتے وقت قبیلے کے سامنے عہد کرتا [illegible] متبرک دستاویزیں واپس لا کے قبیلے کو شاد کام کرے گا۔ پھر [illegible] ہو جائیں گی۔ ناکام ہونے پر وہ خودکشی کر لیتا ہے یا قبیلے [illegible] موت کی سزا دے دیتے ہیں۔ کوئی معتبر آدمی ہو تو اُسے قبیلہ [illegible] کر دیا جاتا ہے۔ قبیلے والے متفق ہو کے اپنے لیے نئے سردار [illegible] کرتے ہیں یا پھر کوئی شخص خود سرداری کے لیے آگے آ جاتا [illegible] لیے جاتے ہیں، رفت دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ ہر سردار نئے [illegible] اِدھر اُدھر دوڑتا ہے۔ قبیلے والوں کے فیصلے کے مطابق [illegible] کامیاب ہو گا، وہی ہمیشہ قبیلے کا سردار رہے گا، وہ یا اُس کا [illegible]

چن وسا کی آواز یکایک پھٹنے لگی۔ وہ کہنے لگا کہ اُن [illegible]

تھے۔ پہلا لڑکا قبیلے کے اور بہت سے نوجوانوں کی طرح یہ عہد [illegible] چلا گیا کہ وہ اپنی متبرک امانت کا کھوج لگا کے ہی لوٹے گا۔ وہ [illegible] آسکا۔ سات آٹھ ماہ تک وہ مارا مارا پھرتا رہا پھر ایک دن [illegible] کسی نے مار دیا۔ میری رگوں میں خون جمنے لگا۔ مجھے اچانک [illegible] جیسے چن وسا براہِ راست مجھ سے مخاطب ہے اور مجھی کو سنا [illegible] یہ سب کچھ کہہ رہا ہے۔ میں نے اپنی ٹھٹھری ہوئی نظریں اُس [illegible] مجھ سے چن وسا کا بھیگا ہوا انگارا چہرہ دیکھا نہیں جا سکا۔ اُس [illegible] لفظ میرا سینہ کاٹ رہا تھا۔ میں نے اُن کے درمیان سے اُٹھ [illegible] جانے کا ارادہ کیا لیکن میرا سارا جسم برف کا تودا بن گیا تھا [illegible] میں نے خود کو اُن سب کی نظروں سے چھپانے کی کوشش [illegible] بنا بیٹھا رہا۔ چن وسا کہہ رہا تھا کہ اُس کے بیٹے کی اُٹھان [illegible] تھی۔ وہ ایک بے باک، بے جگر آدمی تھا۔ یقیناً وہ اُس شخص [illegible] ضرور پہنچ گیا ہو گا جس کی تحویل میں قبیلے کی امانت تھی۔ کچھ [illegible] کے بعد اُس کا دوسرا بیٹا سردار بنا دیا گیا اور اُس کا حشر بھی وہی [illegible] سرداروں کا ہوتا رہا ہے۔ گیارہ مہینے اپنی مدت پوری کر [illegible] اُس نے خودکشی کر لی۔ اُس کا تیسرا بیٹا اپنے بڑے بھائی [illegible] ہندوستان چلا گیا۔ دو سال سے زیادہ ہو گئے ہیں، وہ واپس [illegible] اُس کے تینوں بیٹے بہت بہادر اور ہٹیلے تھے۔ انھیں اپنی [illegible] عزت کا بہت پاس تھا۔ اب اُس کے پاس صرف ایک بیٹی [illegible]

بیوی اپنے دونوں بیٹوں کا صدمہ برداشت نہ کر سکی، پھر تیسرا بھی چلا گیا۔ وہ مر گئی۔ میں نے سوچا، چن وسا سے کہوں کہ اُس کا بیٹا خود ہی میرے آڑے آ گیا تھا۔ میں اُسے نہ مارتا تو وہ مجھے مار دیتا اور میرا اُسے مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مجھے تو یہ بھی خبر نہیں تھی کہ وہ کون ہے۔ میں تو خود اُس سے کورا کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا اسی لیے میں نے اپنی مالا کپڑوں سے باہر نکالی تھی۔ چن وسا کے دوسرے ساتھی بھی رو رہے تھے اور چن وسا بتا رہا تھا کہ ان کے بیٹے بھی اسی طرح ان سے جدا ہو گئے ہیں۔ انھیں کون بتاتا کہ اور بھی لوگ ہیں، جن کے گھر اجڑے ہیں۔ کاش کورا وہ کاغذات اپنے ساتھ نہ لاتی، انھیں وہیں چھوڑ کے آ جاتی۔ پھر نہ لوگ اُس کی تلاش کرتے، نہ آبا جان یوں گھر سے بیگانہ ہوتے، نہ امّی مرتیں، نہ گھر بکتا۔ ہم دونوں گھر سے نکل جاتے تب بھی گھر تو موجود رہتا۔

تجّل، جامو، مارٹی اور سولم اُن کی صورتیں تک رہے تھے۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ تجّل نے سولم کے ذریعے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اُن سے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔ چن وسا نے کاغذات میں خزانے سے متعلق کسی بات کا ذکر نہیں کیا تھا مگر اُس نے اشارۃً بتایا کہ اگر وہ کسی سمجھ بوجھ کے آدمی کی تحویل میں آ گئے ہیں تو وہ شاید کبھی اس طرف ضرور آئے گا۔ میری توقع کے خلاف تجّل نے اُس سے اس کا سبب نہیں پوچھا۔ چن وسا نے خود ہی کہا کہ اُس رات بُدھ گیا میں اجین کے قتل کے بعد کورا یہ کاغذات لے کے فرار ہو گئی تھی۔ اُسے اِن کی اہمیت و افادیت، ان کے تقدس اور حرمت کا پورا اندازہ ہو گا اور وہ زندہ ہو گی تو کاغذات بھی محفوظ ہوں گے۔ ممکن ہے، وہ کسی شخص کو یہاں بھیجے یا کوئی شخص خود ہی یہاں آئے۔ ہم اُسی شخص کے انتظار میں ہیں۔ سالوں گزرے، یہاں سے سوداگروں کا ایک قافلہ گزرا تھا۔ قبیلے والوں کو شک ہوا۔ انھیں افسوس ہے، شک میں وہ سارے سوداگر مارے گئے۔ اُن کے پاس سے کچھ برآمد نہیں ہوا۔ چن وسا کو اس ماحول میں ہمیں یہ نہیں بتانا چاہیے تھا مگر غالباً یہی سب بتانے کے لیے اُس نے آج کی رات منتخب کی تھی۔ چن وسا کے نرم لفظوں کے پیچھے تنبیہہ و تاکید کی سختی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ تجّل کے کان سُرخ نہیں ہوئے۔ وہ تجسس آمیز انداز میں چن وسا کی باتیں سنتا رہا۔ وہ ہمارے غیاب میں سامان کی تلاشی لے ہی چکے چن وسا زمانے بھر کی باتیں کر چکا تو بولا کہ قبیلہ ان کاغذات کے عوض زر و جواہر کے انبار دینے کے لیے تیار ہے۔ جو کچھ ان کے تصرف میں ہے، سب نثار کر دیں گے۔ قبیلہ بہت سی شرطیں پوری کر سکتا ہے۔ صرف ایک اس شرط پر کہ کاغذات انھیں واپس کر دیے جائیں۔ مقدس دستاویزات جانگ قبیلے کا اعزاز ہیں۔ وہ اُن کے پاس آ جائیں گی تو قبیلے سے یہ نحوستیں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ جو کچھ وہ اُن کے عوض

صرف کریں گے، اُن کے طفیل دوبارہ جلد ہی حاصل کر لیں گے۔ مقدس دستاویزات جانگ قبیلے کی فضیلت ہیں۔ جس کی فضیلت ہے، وہ اُس کے سپرد کر دینی چاہیے۔ معلوم نہیں، تجّل، جامو، مارٹی اور سولم نے کیا سمجھا ہو۔ میں نے اپنے طور پر یہی جانا کہ سرِ دست چن وسا کی یہ پیش کش ہمارے لیے ہے اور کھلے لفظوں میں یوں نہیں ہے کہ انھیں ہم پر کاغذات کے امانت دار ہونے کا مکمل یقین نہیں ہے اور یہ پانچوں جہاں دیدہ بوڑھے آج رات بے سبب ہمارے سامنے اکٹھے نہیں ہوئے ہیں۔ ان کا مقصد کچھ اور ہے۔ کوئی نتیجہ اخذ کرنا، کوئی رائے قائم کرنا، اپنے سردار کو ہمارے بارے میں کسی قسم کی سند دینا۔ اُن کی آنکھیں ترازو کے پلڑے ہیں اور انھوں نے یہ باتیں دانستہ چھیڑی ہیں۔ اُن کا لہجہ متعیّن نہیں تھا۔ اس میں عاجزی بھی تھی، فریاد بھی، تلخی بھی اور ایک بیزاری بھی جھلکتی تھی یا یہ سب میرے دماغ کے ہیولے تھے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

رات گئے تک وہ نہیں اُٹھے۔ آتش دان میں لکڑیاں کم ہو جاتیں تو کوئی بھی نئی لکڑیاں آگ میں جھونک دیتا۔ انھوں نے بہت کم شراب پی تھی۔ اتنی دیر میں صرف آدھی بوتل خالی ہوئی تھی۔ کاغذات کے ذکر پر چن وسا کی آواز کبھی تمتمانے لگتی، کبھی اُس پر یاسیت غالب آ جاتی۔ آبا جان یہیں قریب تھے۔ اچھا ہوتا، وہ بھی اس وقت ہمارے درمیان ہوتے اور اپنے کانوں سے چن وسا اور اُس کے ساتھیوں کی باتیں سُن لیتے۔ میرے مساموں سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ آبا جان کی صورت ایک لمحے کے لیے میری نظروں سے دُور نہیں ہوتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تجّل کے پاس ایسی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ آج رات قبیلے کے لوگ اُن تک نہیں پہنچ جائیں گے اور آج رات آبا جان یہاں سے کہیں دُور کسی اور طرف نہیں نکل جائیں گے۔ ہو سکتا ہے، انھوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہو اور جانگ قبیلے میں یہ اُن کا آخری دن ہو۔ تجّل کے پاس ایسی بھی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ مندروں میں کسی نے ہمیں آبا جان کے سامنے چونکتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ جانگ قبیلے سے متعلق جو بھکشو مستقل یہاں رہتے ہیں، وہ بھی چاروں طرف نظر رکھتے ہوں گے لیکن ہم میں سے کوئی بھی یہاں سے نہیں اُٹھ سکتا تھا، کوئی بھی نہیں۔ جامو نے کئی بار جماہیاں لے کے اپنی تھکن اور اکتاہٹ کا اظہار کرنا چاہا، انھوں نے توجہ نہیں دی۔

پھر رات کو کسی وقت چن وسا کے پانچوں بوڑھے ساتھی ٹوپوں اور کمبلوں سے اپنے جسم ڈھانپ کے کسمساتے ہوئے اچانک اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شاید اب اُن کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ انھوں نے رسمی انداز میں ہم سے معذرت چاہی اور باہر نکل گئے۔ تجّل ہونٹ مسلنے لگا۔ اُن کے جاتے ہی جامو نے کچھ کہنا

چاہا مگر ہتھل نے اشارے سے اُسے روک دیا۔ "تیرے ساتھ ایسا ہونا نے جامو کستاد!" وہ تھکی ہوئی آواز میں بولا۔ "اِن لوگوں نے ہم پر بھروسا کیا ہے، سویرے گکڑوں کوں کرلینا۔ ابھی رات باقی ہے۔"

اور اُس وقت ہتھل کے لہجے اور اشارے سے مجھ پر یہ خدشہ کسی حقیقت کی طرح آشکارا ہوا کہ اِن میں سے کوئی ہندوستانی سے واقف ہوسکتا ہے۔ جامو نہیں سمجھا۔ اُس نے حجت کی تو ہتھل نے اُسے ڈانٹ دیا۔ جاتے ہوئے چن وسا نے ہم سے کچھ نہیں کہا تھا اس لیے ہم اُسی کوٹھری نما کمرے میں لیٹ گئے۔ بہت دیر بعد جب مکان میں ہر آہٹ معدوم ہوگئی تو ہتھل میرے قریب کھسک آیا اور میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ "شہزادے! بدن کو نیچے ہی رکھنا۔"

"نہ جانے مجھے کیا ہورہا ہے۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں کھینچ لیا۔ "کھونٹے پہ بندھا رہ لاڈلے!"

"میرا جی اُڑ رہا ہے۔"

"جی کو میان میں ہی رہنے دے۔"

"یہ سب کیا ہورہا ہے؟" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہی ہورہا ہے جانی!" وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔

"میرا دماغ پھٹ جائے گا۔"

"تو اتنا بوجھ کیوں اُٹھاتا ہے، بس آنکھیں کُھلی رکھ۔"

"کاش میری آنکھیں بند ہوجائیں!"

وہ مجھے تھپکنے لگا۔ "اپنا نہیں تو دوسروں کے ہاتھ پیروں کا ہی دھیان کرلے۔"

"ہم یہاں بیٹھے ہیں۔" میں نے دہشت سے کہا۔

"پر چھت کے نیچے ہیں۔"

"فرض کرو، اگر آج ہی وہ وہاں سے نکل گئے تو!..."

"اِس سے بھلا اور کیا ہوگا رے!"

"لیکن پھر۔ پھر...!"

"پھر بہت سا ٹنٹا ختم ہوجائے گا، پر ایسا دِکھتا نہیں ہے۔"

"مگر تم نے سوچا کیا ہے؟"

اُس نے آنکھیں میچ لیں اور چُپ رہا۔

"مجھے بتانے میں کوئی حرج ہے؟"

"کوئی حرج نہیں۔"

"تو پھر زبان کیوں نہیں کھولتے؟"

"زبان سالی اینڈ رہی ہے۔"

"مجھے معلوم تھا، تمہارا جواب یہی ہوگا۔"

"تو کُہنی کیوں مارتا ہے۔" وہ درشتی سے بولا۔

"ایک بات کہوں؟" میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

"بول۔!"

"باقی سب لگڑ، کو واپس کردو۔"

"تیرا گھڑیال ٹھیک نہیں چل رہا ہے۔" اُس نے زور سے میرے بال پکڑ لیے۔

"تمہارا تو ٹھیک چل رہا ہے۔"

"بدل لے پھر۔" وہ تنک کے بولا۔

میں نے پھر اُس سے بات نہیں کی لیکن نہ اُسے نیند آئی، نہ مجھے۔ ہم دونوں چُپ پڑے رہے تھے۔ جامو، مارٹی اور سُولم تھوڑی دیر بعد ہی سو گئے تھے اور ہلکے خراٹے لے رہے تھے۔ شاید دس پندرہ منٹ اور گزرے ہوں گے کہ دفعتہً ہتھل اُٹھ کے بیٹھ گیا اور میرا بازو ہلا کے کہنے لگا۔ "لاڈلے! ذرا گھڑی دیکھ۔"

ہم میں سے صرف مارٹی کے پاس گھڑی تھی۔ میں نے جلدی سے اُس کے کمبل میں ہاتھ ڈال کے جیب ڈھونڈنی چاہی۔ مارٹی ہڑبڑا اُٹھا۔

"ٹائم بتادے، مارٹی!" میں نے آہستگی سے کہا۔

مارٹی گھبرا گیا۔ میرا ہاتھ اُس کے منہ کے قریب ہی تھا تاکہ اگر وہ زور سے بات کرے تو اُس کا منہ بند کردوں۔ مارٹی کا ہاتھ سیدھا میری گردن پر آیا تھا لیکن دوسرے لمحے وہ ٹھہر گیا۔ "کیا بات ہے راجا اُستاد؟" وہ حیرانی سے بولا۔

"بات مت کر، ٹائم بتادے۔"

مارٹی کی گھڑی میں تین بجے تھے۔ میں نے ہتھل کو بتایا تو وہ تیزی سے کھڑا ہوگیا۔ مارٹی کو اُس نے اُٹھنے نہیں دیا۔ چن وسا باہر جاتے ہوئے دروازہ بھیڑ گیا تھا اور ہم نے معمول کے مطابق اندر سے کُنڈی نہیں لگائی تھی۔ ہتھل پنجوں کے بل لپکتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا اور چند لمحے وہیں ٹھٹکا کھڑا رہا، دروازے کے پار کوئی آہٹ نہیں تھی۔ ہتھل نے آہستگی سے کُنڈی پکڑی پھر آہستہ آہستہ کواڑوں کو اندر کی طرف کھینچا۔ میں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی مگر اُس نے میرے سینے پر ہاتھ مار کے مجھے پیچھے ہی رہنے دیا اور خود کواڑ تھامے رہا، اُس کی تاخیر سے مجھے اُلجھن ہورہی تھی۔ دروازہ ذرا سا کُھلا ہوگا کہ ایک ہلکی چرچراہٹ کی آواز اُبھری اور سرد ہوا کا ایک تھپیڑا میرے گالوں سے ٹکرایا۔ مجھے جھرجھری آگئی۔ ہتھل بھی رُک گیا۔ دروازے کے کُھلے ہوئے حصے سے اُس نے آنکھیں لگا کے باہر دیکھا، باہر گہرا اندھیرا تھا۔ نہ جانے ہتھل کو کیا ہوا کہ اُس نے ارادہ بدل دیا اور کواڑ کھسکانے کے بجائے انھیں ایک دم کھول دیا۔

ہم کسی ضرورت کے تحت بھی رات کو اپنے کمرے سے نکل سکتے تھے۔ یہ قید خانہ نہیں تھا، ایک مکان تھا جہاں ہم مہمان تھے۔ ہتھل گھر کے کسی مکین کو اپنے کمرے سے باہر نکلنے کی خبر کرنا نہیں چاہتا تھا مگر بھاری دروازہ آواز کے بغیر نہیں کُھل سکتا تھا ورنہ دیر بہت ہوجاتی۔ چن وسا کے گھر کی مکانیت سے ہم اچھی طرح واقف ہوچکے تھے۔ وہ کوئی پیچیدہ اور بڑا مکان نہیں تھا۔ قبیلے کے عام مکانوں کے لحاظ سے بڑا، شہروں کے مکانوں کی نسبت سادہ۔ ایک طرف دو کمرے بنے ہوئے تھے جن میں سے ایک میں ہم تھے، دوسرے میں سلطان۔ اُن کے آگے پختہ چھت کا ایک مختصر سائبان۔ سائبان بائیں طرف بھی انگریزی حرف ایل کی طرح چار دیواری تک چلا جاتا تھا۔ جہاں کوٹھریوں جیسے چھوٹے موٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ چن وسا، اُس کی بیٹی اور ملازم انھی میں رہتے تھے۔ سائبان کے بعد ایک کشادہ صحن تھا۔ ہمارے کمروں کے پچھواڑے بھی ایک تنگ سائبان کے ساتھ تھوڑا سا صحن تھا۔ ہر طرف درخت اور مختلف پودے لگے ہوئے تھے۔ پتھر کی ایک چھوٹی موٹی اور اُونچی نیچی دیوار سارے مکان کا احاطہ کرتی تھی۔ زمین نسبتہً ہموار تھی۔ ہمیں غسل خانے وغیرہ کے لیے سامنے صحن کی طرف کُھلنے والے دروازے سے نکل کے پیچھے جانا پڑتا تھا، کمروں میں صرف ایک ہی دروازہ تھا اور عقبی دیوار پر روشن دان کے مانند ایک کھڑکی تھی جو عموماً بند رہتی تھی۔ چھت کے ساتھ دیواروں پر بھی ایسے ہی موکھلے بنے ہوئے تھے جنھیں درختوں کی چھال یا کسی اور قسم کے کپڑوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔

ہتھل نے مارٹی کو ہاتھ کے اشارے سے جاگتے رہنے کی ہدایت کی اور باہر نکل آیا۔ ہر سُو قبرستان جیسی خاموشی اور قبر جیسا اندھیرا تھا۔ قریب و دُور کی کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ باہر آکے اندازہ ہوا کہ ہوا اچھی خاصی تیز ہے۔ میری انگلیاں ٹھٹھرنے لگیں۔ پیروں میں ہم اُونی جرابیں پہنے ہوئے تھے۔ میں نے ہتھل کا ہاتھ تھام لیا۔ ہم اندھوں کی طرح ہاتھ پھیلائے ٹٹول ٹٹول کے سائبان کے فرش پر قدم رکھ رہے تھے۔ پہلے رات کو کسی وقت باہر نکلنے کا اتفاق ہوتا تو ہم مشعل ساتھ رکھتے تھے۔ ساری رات سائبان کے ایک کونے میں بھی مشعل جلتی رہتی تھی۔ آج وہ بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ چن وسا کے ساتھی جاتے ہوئے اُسے اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔ ہتھل کی جیب میں بیٹری بھی ہوگی لیکن بیٹری اُسے استعمال نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ہم نے قدموں کے اندازے سے سائبان کا فاصلہ طے کیا اور کھمبا پکڑنے میں کامیاب ہوگئے۔ نیچے صحن میں اُترنے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ ہم تھم کے ساتھ چپکے ہوئے نیچے اُتر گئے۔ پہلے ہتھل، پھر میں۔ کپڑوں کے باوجود صحن میں قدم رکھتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے ہم ٹھنڈے پانی میں اُتر گئے ہوں۔ سردی سے میرے ہونٹ پھڑکنے لگے تھے۔ چند لمحوں میں کتنی ہی بار میں نے سر کو جھٹکا دیا۔ یہ گہرا اندھیرا کہر کی وجہ سے تھا، یخ بستہ کہر۔ پہلے ہی دو چار قدموں میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ باقی فاصلہ طے کرنا آسان نہیں ہے۔ میں ہتھل سے لَوٹنے کے لیے کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ اور آگے چل پڑا۔ بیٹری اُس نے اب بھی روشن نہیں کی تھی۔ ہم تقریباً ایک ایک دو دو انچ کھسکتے ہوئے چار دیواری کی طرف بڑھتے گئے۔ ہم دونوں نے اپنے چہرے پوری طرح ڈھانپ رکھے تھے۔ صحن کے درختوں سے بچتے ہوئے ہم کسی نہ کسی طرح دروازے تک پہنچ گئے۔ دیوار پتھروں کی تھی اور زیادہ اونچی نہیں تھی، ہم کود کے بھی مکان کے باہر ہوسکتے تھے۔ میں ایک موہوم اُمید کے سہارے ہی ہتھل کا ساتھ دے رہا تھا کہ شاید دیوار کے اُس پار ایسا اندھیرا نہ ہو۔ ہتھل نہ جانے کس وجہ سے چپ تھا۔ غالباً مجھے یہ باور کرانے کے لیے کہ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں اور بعد میں اُس سے کچھ کہنے کے لیے میرا منہ نہ پڑے۔ مکان میں کوئی شخص نہیں جاگا تھا، ہماری چاپیں صرف ہم تک محدود رہی تھیں۔ کھردرے پتھروں پر پیر ٹکا کے ہم دونوں نے ایک ساتھ اپنے سر اُوپر کیے۔ ہتھل دیوار پر چڑھ گیا تھا کہ میں نے اُس کے پیر پکڑ لیے۔ ہم نے آپس میں بات کرنے سے پرہیز کیا۔ چار دیواری کے باہر تاحدِ نظر صرف ایک چیز نظر آتی تھی۔ بس دُھند جیسے برف سے سیاہ دُھواں اُٹھ رہا ہو اور ساری فضا پر چھا گیا ہو۔ آگے اُونچی پہاڑیاں تھیں اور آڑی ترچھی پگ ڈنڈیاں، ہمارے پیروں سے نامانوس راستے، ہم کسی طرف بھٹک جاتے تو صبح تک کبھی لَوٹ نہ پاتے۔ بستی سے مندروں کا علاقہ اتنی دُور نہیں تھا پھر بھی چند میل سے کم نہیں تھا اور ساری کی ساری چڑھائی تھی۔ بیٹری بھی ساتھ نہ دیتی۔

سائبان تک ہم رینگتے ہوئے واپس آئے لیکن سائبان میں آ کے ہم نے اپنی رفتار معمول کے مطابق کرلی۔ ہتھل نے بیٹری جلادی۔ ہمیں جیسے اپنی آنکھیں واپس مل گئیں۔ سائبان میں بھی دُھند تھی اور بیٹری کی روشنی بھی اُس میں دُھندلا گئی تھی۔ بہرحال اب گھر کا کوئی مکین جاگ جاتا، ہمیں اتنی فکر نہیں تھی۔ ہمارا کمرہ سامنے تھا۔ ہتھل اندر جانے کے بجائے سلطان کے کمرے کی طرف مُڑ گیا۔ اُس کا خیال ہوگا کہ باہر نکلے ہیں تو ایک نظر سلطان کو بھی دیکھ لیں۔ اسی کمرے میں ہمارا سامان رکھا ہوا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ ظاہر ہے، اندر سے کُنڈی نہیں لگی ہوگی۔ ہتھل نے دروازے پر ہاتھ رکھ کے اُسے جھٹکا دیا تو وہ ایک ہلکی آواز کے ساتھ کُھل گیا۔ کمرے میں مدھم روشنی تھی لیکن اندر کا منظر دیکھ کے ہماری آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ کمرے میں ایک اُونچی جگہ سلطان لیٹا ہوا تھا اور کوئی اُس کے سینے پر نیم دراز تھا۔ دروازہ کُھلتے ہی ایک گُھٹی ہوئی سسکی بلند ہوئی۔ وہ بجلی کی طرح سلطان کے سینے سے اُٹھ کے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھنے لگی۔ ہتھل نے بیٹری کی روشنی اُس کے چہرے پر پھینکی تو اُس نے منہ پھیر لیا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چُھپا لیا۔ ہمیں اُسے پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ وہ چن وسا کی لڑکی تھی۔ گھر میں آتے جاتے بارہا ہمارا اُس سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے تذبذب کے بعد ہتھل نے بیٹری

دی اور دروازہ بھیڑ کے اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

سلطان کو اپنی سُدھ بُدھ نہیں تھی۔ چن وسا کی نوجوان لڑکی تشانم کا سر اُس کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ مجھے اپنی بینائی پر شبہ ہوا۔ تجھل کی بھی یہی حالت ہوگی۔ نہ جانے ہم نے کیا دیکھا تھا۔ روشنی میں تشانم کا رنگ چمک رہا تھا۔ میں نے اُسے دن میں بھی دیکھا تھا۔ وہ ایک شرمیلی اور نازک سی لڑکی تھی۔ اُس کے بال کوراکے بالوں کی طرح اتنے لمبے تھے کہ کولھوں تک آتے تھے۔ چہرے کا سنہرا رنگ دمکتا تھا۔ کوئی بھی ایک بار اُسے دیکھ لے تو بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہوگا۔ اُس کی آنکھیں بڑی بڑی اور شربتی تھیں۔ تجھل نے اُسے چند تحفے دیے تھے تو اُس کے گالوں پر سُرخی چھا گئی تھی۔ اُس وقت سلطان نے اپنے ہاتھ سے اُسے چوڑیاں پہنائی تھیں مگر یہ چار ہی دن پہلے کی بات تھی۔

کواڑ کھلا تو ہماری نظر سب سے پہلے مارٹی پر پڑی۔ وہ دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا، ہاتھ میں کھلا چاقو تھا۔ تجھل نے اُس کے گال اور کان تھپ تھپائے اور آتش دان کی بھوبھل میں پھونکیں مارنے لگا۔ مارٹی نے اُس میں کچھ اور لکڑیاں ڈال دیں۔ تجھل کچھ دیر تک ہاتھ تاپتا رہا پھر آکے چپ چاپ بیٹ گیا۔ نہ اُس نے مجھ سے کچھ کہا، نہ میں نے اُس سے مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

مجھے توقع تھی کہ صبح ہوتے ہی تجھل باہر نکلنے میں جلدی کرے گا لیکن یک تو وہ دیر میں بستر سے اُٹھا، پھر یوں ہی خاموش بیٹھا وقت گنوا تا رہا۔ آج پہلا دن تھا کہ خلافِ معمول چن وسا ناشتے کے دوران ہمارے درمیان موجود نہیں تھا۔ اُس کے خادم نے بتایا کہ وہ سویرے ہی کسی کام سے باہر چلا گیا تھا اور اُسے ہدایت کر گیا تھا کہ مہمانوں کا خیال رکھنا۔ روز کی طرح منہ ہاتھ دھونے کے لیے گرم پانی تیار تھا۔ چن وسا کی خادمہ دودھ اور مکھن میں گندھے ہوئے جوار کے آٹے کی گرم روٹیاں، اچار اور جانگ قبیلے کا مخصوص ساگ لا رہی تھی۔ ہم سب نے کئی کئی پیالیاں چائے پی۔ خلافِ معمول آج تشانم بھی ہمارے سامنے نہیں آئی تھی۔ ناشتے کے بعد خاصا وقت گزار کے تجھل سلطان کے کمرے میں گیا۔ سلطان بستر میں دبکا ہوا چائے پی رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر تازگی تھی اور بالکل ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ رات اُسے گہری چوٹ لگی ہے۔ پٹیاں کھلی ہوئی تھی مٹی کے ایک کونڈے میں آگ دہک رہی تھی اور سلطان اپنا پیر سینک رہا تھا۔ تجھل نے اُس سے رات کے متعلق کوئی بات نہیں کی، نہ ہی زیادہ دیر وہاں ٹھیرا۔ جب ہم اُسے چھوڑ کے جانے لگے تو سلطان بے چینی سے بولا "اب میں چل سکتا ہوں اُستاد!"

تجھل نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ پلٹ کے اُسے دیکھا اور ٹھیری ہوئی آواز میں بولا "ایک دن اور بتا لے رے، تیرے دن ویسے بھی مجھے کم دکھائی دیتے ہیں۔"

سلطان پلکیں جھپکانے لگا "تم کیا... کیا؟..." وہ ہکلانے لگا۔

"ٹھیک ہی بول رہا ہوں سلطانے شاہ!"

"تم مجھ سے کچھ خفا لگتے ہو" وہ لنگڑاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"خفا تو تم سے کچھ ہو گیا ہے ساجن!" تجھل سرد لہجے میں بولا۔

"مجھ کو بتاؤ" سلطان چیخ کر بولا لیکن پھر اُس کی آواز خود بخود ماند پڑ گئی اور وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولا "سلطانے کو غلط مت سمجھو اُستاد!"

تجھل کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلے اور بند ہو گئے۔ وہ صرف سر ہلا کے رہ گیا اور مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ جامو، سولم اور مارٹی حیرت سے اُن دونوں کو تک رہے تھے۔ جامو وہیں رُک گیا۔ دروازے سے گزرتے ہوئے تجھل مڑ کے بولا "جامو! سلطانے اُستاد کے بدن میں مجھ کو کچھ چیزیں بڑھی ہوئی لگتی ہیں۔ ہو سکے تو ان کو چھانٹ دے۔ اُستاد کو شاید پھر رنگ دکھائی دینے لگے۔"

"اُستاد!۔ تجھل بھائی!" سلطان ہذیانی انداز میں بولا۔

تجھل اُس کے کمرے سے چلا آیا اور مجھے باہر آکے معلوم ہوا کہ اُس نے سامان کے لیے خادم کو قلی بلوانے بھیجا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آج پھر تجھل کا بازار لگانے کا ارادہ ہے۔ بازار سے واپس آتے آتے دوپہر ہو جائے گی۔ چند گھنٹے تو وہاں گزارنا ہی پڑیں گے۔ اُس نے صرف دو ٹرنک سامان اٹھوایا تھا۔ ہم قلیوں کے پیچھے چلنے لگے تو جامو بھی اندر سے آگیا۔ اُس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھ کے تجھل کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تیرنے لگی۔ سارے راستے جامو نظریں جھکائے چلتا رہا۔ اور دِلّوں کی طرح بازار میں خوب چہل پہل تھی۔ ہم نے سامان نکالا تو دیکھتے دیکھتے بھیڑ جمع ہو گئی۔ تجھل نے آج بھی کوئی رعایت نہیں کی۔ وہ بہ ظاہر چیزوں کے دام بتا رہا تھا لیکن اُس کے لہجے میں تیزی اور چہک نہیں تھی۔ کبھی دام اتنے اُلٹ پُلٹ بتا دیتا کہ بعد میں تردید کرنی پڑتی۔ میں اُن سے الگ تھلگ ایک گوشے میں اپنے آپ کو سمیٹے بیٹھا تھا۔ میں نے نہ کسی گاہک سے بات کی، نہ سامان کو ہاتھ لگایا۔ تھوڑی سی چیزیں بکی ہوں گی کہ اُس نے یکایک سامان پھر سے ٹرنکوں میں بھرنے کو کہا اور قلیوں کو اُسے گھر پہنچانے کی ہدایت کی۔ میری رگوں میں سن سناہٹ ہونے لگی۔ اب ضرور تجھل کا اوپر جانے کا ارادہ ہوگا۔ اُوپرا باجان موجود ہیں مگر کیسے؟ میں جتنا سوچتا، اتنا ہی میرے دماغ میں اندھیرا ہونے لگتا۔ آج موسم میں کوئی غیر معمولی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ آج کا دن بھی کل کی طرح تھا لیکن تجھل کے اچانک اُٹھ جانے کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ اُس کے ذہن میں کوئی بات ضرور آئی ہے۔

آج چھٹا دن تھا۔ پیرو، زورا، سارلے، منّن میاں، بلٹو، ہلاکو، جینی اور وزیر میں سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ اُن سب کو ایک ساتھ ہی آنا تھا۔ تجھل نے اُن سے اپنے جانے کے چار روز بعد بستی کا رُخ کرنے کو کہا

تھا۔ وہ بستی سے زیادہ دُور نہیں تھے مگر وہ جگہ جانگ قبیلے کی حدود میں نہیں آتی تھی جہاں ہم اُن سے جُدا ہوئے تھے۔ وہ اگر راستہ گھوم کے نہ آتے تو زیادہ سے زیادہ دو پہر لگتے، کوئی ایسی ہی بات ہو گئی ہوگی۔ کوئی بھی بات ہو سکتی تھی۔ اُدھر جنگل بیابان تھا۔ قریب کوئی بستی بھی نہیں تھی۔ ہم نے جان بوجھ کے اُن کے پڑاؤ کے لیے ایک سنسان جگہ منتخب کی تھی۔ یہاں آنے کے بعد ہمارا اُن سے کوئی رابطہ نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ یہاں سے کوئی جا کے اُن کی خبر لے سکتا تھا اور نہ وہاں سے کوئی آکے ہمیں اُن کے نہ آنے کا سبب بتا سکتا تھا۔ ایک دن کی دیر ہو سکتی تھی مگر اب دو دن گزر گئے تھے۔ اُنھیں خود جلد سے جلد ہم تک پہنچنے کی فکر ہوگی کہ کہیں قبیلے میں ہم پر کوئی افتاد نہ پڑ گئی ہو۔ اُنھیں اس حقیقت کا بخوبی احساس ہوگا کہ بستی میں ہمارا قیام بستی کے باشندوں کی مرضی پر منحصر ہے۔ ہم اپنے قیام کو طول دینے کا کوئی نہ کوئی معقول عذر اُنھیں ضرور پیش کریں گے لیکن اُسے قبول کرنے نہ کرنے کا سارا دار و مدار قبیلے کے لوگوں اور اُس کے سردار پر ہے اور اُنھیں یہ بھی احساس ہوگا کہ ہم جس مقصد کے لیے آئے ہیں، قبیلے میں جا کے فی الفور ہمارا اُس سے سامنا پڑ سکتا ہے۔ تجھل نے سامان بچا بچا کے رکھا تھا تاہم قبیلے کے لوگوں کے خیال میں یہاں ہمارا قیام تجارتی اعتبار سے سودمند ثابت نہیں ہو رہا تھا تو ہمیں جلد ہی آگے کہیں اور چلے جانا چاہیے تھا۔ موسم بھی خراب نہیں تھا کہ آگے سفر کرنا ناممکن ہو۔

پیرو کے نہ آنے سے اب تک اُس کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ کم وقفے میں یکے بعد دیگرے دو تجارتی قافلوں کی آمد کو قبیلے کے لوگ اتفاق سمجھنے میں اکراہ کرتے۔ گو ہماری پوری کوشش ہوتی کہ ہم یہ اکراہ دُور کریں۔ جُدا ہونے سے پہلے بستی میں دوبارہ ملنے کے متعلق ہمارے سامنے تجھل نے پیرو سے ہر بات صاف کر لی تھی۔ اُس وقت کچھ لوگوں کو دُور روک دینا ہی مناسب تھا۔ ایک ساتھ اتنے لوگوں کا بستی میں داخل ہونا موجودہ صورت کے مقابلے میں کسی کو بھی بہتر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ہم آگے کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں جانتے تھے۔ ایسی صورت میں کچھ لوگوں کا پیچھے آنے کے لیے باقی رہنا اور پیچھے رہ جانے والوں کے لیے آگے چند لوگوں کا پیش قدمی کرنا ہی ٹھیک تھا۔ جانگ قبیلے کی مختلف بستیوں میں چار دیواریاں کھنچی ہوئی نہیں تھیں۔ کوئی بھی شخص یہاں آ جا سکتا تھا چنانچہ بستی کے مکین پہلے پہنچنے والے اجنبیوں سے فوراً ہی کوئی معاندت نہ رکھتے۔ اُنھیں اُن کی آمد کا مقصد پہچاننے میں کچھ وقت ضرور لگتا کہ اتنی دیر میں دوسرے لوگ پہنچ جاتے۔

آخری منزلوں میں ہم نے قلی بھی ایسے منتخب کیے تھے جو آگے جانے کے بجائے پیچھے واپس ہو جائیں۔ پھر پیرو سے الگ ہو کے جانگ قبیلے میں داخل ہونے سے پیشتر ہم نے ایک اور منزل پر پڑاؤ کیا تھا اور وہاں بھی قلی بدل دیے تھے۔ سارے سفر میں ہم قلیوں سے یہی کہتے آئے تھے کہ ہم دو قافلے ہیں، دونوں کی منزلیں مختلف ہیں۔ جہاں تک منزلیں یکساں ہیں، وہیں تک ساتھ ہے اور پیرو کے آجانے کے بعد ہم کُھل کے قبیلے والوں سے یہ اعتراف کر سکتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ ہم نے سفر کا ایک بڑا حصہ ساتھ کاٹا ہے۔ بعد میں اُنھیں کسی ذریعے سے ہمارے سفر کی رفاقت کے سلسلے میں خبر مل جاتی تو آپس میں شناسائی کے اس اعتراف کے بعد اس خبر کی حیثیت اُن کے لیے انکشاف کی نہ ہوتی اور پیرو بستی میں آکے اُنھیں یہ کہہ کر خاموش کر سکتا تھا کہ اُس کا بیشتر سامان دوسری بستیوں میں فروخت ہو چکا ہے۔ باقی کے لیے اُس نے جانگ قبیلے میں اپنی قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا ہے جس کا اس نے دوسری بستیوں میں بہت شہرہ سُنا تھا اور اُسے معلوم تھا کہ ایک اور قافلہ بھی اُس طرف سامان لے کے گیا ہے۔ ضروری نہیں تھا کہ قبیلے میں سب سے پہلے اُن کی مڈبھیڑ ہمی سے ہو اور ہمیں اُنھیں یہ بتانے کا موقع مل جائے کہ وہ کس قسم کی بات کریں۔ قبیلے والوں کے سامنے ہم دونوں کے روبہ رو ہونے پر پیرو کا ردِعمل تجھل کے طرزِ عمل سے مشروط ہوتا کہ وہ ایک دوسرے سے کس حد تک واقفیت کا اظہار کریں۔ یہ جانچنے کے لیے پیرو کو چند ہی لمحوں کی مہلت درکار ہوتی۔

اُنھیں بہر صورت اب آجانا چاہیے تھا۔ چلتے چلتے مارٹی اور جامو کی نظریں اپنے اِردگرد پہاڑیوں پر منڈلانے لگتی تھیں۔ ابھی چند لمحے ہوئے، ہمارے پیچھے بستی میں اچانک شور اُٹھا تھا۔ سب یہی سمجھے کہ وہ آگئے ہیں لیکن پتہ چلا کہ ایک برفانی ریچھ بستی میں گھس آیا ہے اور کہیں چھپ کے بیٹھ گیا ہے۔ بستی والے اُس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اندیشہ ہے کہ وہ قبیلے کی کسی عورت یا بچے کو پکڑ کے نہ لے جائے۔ جتنا وقت بیت رہا تھا، طرح طرح کے وہم آرہے تھے۔ منّن میاں کی حالت ویسے بھی ٹھیک نہیں تھی۔ وزیر بھی کئی بار بیمار پڑ چکا تھا۔ وہ راستہ بھی بھٹک سکتے تھے۔ ممکن ہے اُنھیں قلی نہ مل سکے ہوں۔ اُن کے ساتھ بڑی تعداد میں سامان تھا۔ قبائلی قزاق بھی اُن کے آڑے آسکتے ہیں۔ کچھ بھی ممکن تھا۔

ابھی ہم بستی ہی میں تھے کہ راستے میں تجھل نے ایک بوڑھے آدمی کوروک کے چن وسا کے متعلق دریافت کیا۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد چن وسا سردار کے مکان کے قریب ایک عمارت سے باہر آتے ہوئے ہمیں مل گیا۔ سولم نے تجھل کی ترجمانی کی۔ تجھل نے کہا تھا کہ وہ اپنے معزز مہمان کی وساطت سے قبیلے کے سردار سے ملنا چاہتا ہے۔ یہ سُن کے چن وسا کچھ متذبذب سا ہو گیا اور کوئی جواب دیے بغیر عمارت کے اندر چلا گیا۔ ہم باہر ہی ٹھیرے رہے۔ چن وسا واپس آیا تو اکیلا نہیں تھا۔ ایک معمر شخص بھی اُس کے ہمراہ تھا۔ دونوں نے جواب طلب نظروں سے ہمیں دیکھا لیکن کوئی سوال نہیں کیا اور کسی قدر تیز رفتاری سے ایک سمت چل پڑے۔

جتنا ہم آگے بڑھتے گئے، پگ ڈنڈی کشادہ ہوتی گئی۔ اونچائی کا ایک مختصر فاصلہ عبور کرنے کے بعد ہم سردار کے مکان کے سامنے موجود تھے۔ پہلے دن جب ہم سردار سے ملے تھے اور نوواردوں کی روایت کے مطابق ہم نے اُسے تحائف پیش کیے تھے تو وہ جگہ اور تھی۔ کچھ نیچے، اسی عمارت کے نزدیک۔ یہاں وہ خود رہتا تھا۔ پتھر کی اُونچی نیچی دیواریں ایک بڑے رقبے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ باہر دروازے پر کوئی خاص پہرا نہیں تھا۔ آس پاس اور بھی کئی لوگ اُدھر سے گزرتے ہوئے ہمیں نظر آئے۔ ہم فصیل نما چاردیواری کے باہر انتظار کرتے رہے۔ ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کچھ ہی دیر میں ایک مستعد نوجوان بلند دروازے پر ظاہر ہوا۔ اُس کے حکم پر پہرے دار ایک طرف ہو گئے۔ دروازے میں قدم رکھتے ہوئے میرے پیر ڈگمگانے لگے۔

سامنے کوئی سو گز کی دُوری پر چھوٹی بڑی کئی عمارتوں کے بیچ میں ایک بلند و بالا دو منزلہ عمارت کھڑی تھی۔ سب سے پہلے اُسی پر نظر جاتی تھی کیونکہ وہی ان میں سب سے نمایاں تھی اور کسی قدیم چینی محل کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ ڈھلواں چھت، اُوپری منزل پر اَن گنت دروازے، نیچے سے پھیلی ہوئی اُوپر جاتے جاتے ایک گول دائرے میں سمٹتی گئی تھی۔ اطراف میں قسم قسم کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ باغیچے میں بھی مختلف رنگوں کے پتھر کی لاٹیں ایستادہ تھیں۔ چاردیواری کے ساتھ اونچے گھنے درخت تھے اور اُن کے درمیان کہیں کہیں کٹیائیں بنی ہوئی تھیں۔ اندر دروازے کے پاس ہی ایک اُونچی پہاڑی پر چشمہ پھوٹ رہا تھا اور اُس کے گرتے ہوئے پانی پر کسی آبشار کا گمان ہوتا تھا۔ کبھی یہ کورا کا گھر تھا۔ اسی دروازے سے گزر کے وہ بستی میں جاتی ہوگی۔ اس جگہ کے چپے چپے نے اُسے دیکھا ہوگا اور چپے چپے پر اُس کے قدموں کے نقش ثبت ہوں گے۔ میں کورا کے گھر میں تھا۔ جہاں اُس نے آنکھ کھولی تھی اور سارا بچپن، لڑکپن گزارا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں پہلے بھی یہاں آچکا ہوں۔ کبھی کورا مل گئی تو میں اُسے بتاؤں گا کہ میں درونگ بستی کی سب سے اُونچی پہاڑی پر واقع اُس کے گھر گیا تھا تو اُسے یقین نہیں آئے گا۔ میں نے دل میں طے کیا تھا کہ ثبوت کے لیے یہاں کی کچھ مٹی جیب میں رکھ لوں گا۔ کہتے ہیں مٹی میں خوشبو ہوتی ہے۔ کورا یہ خوشبو پہچان لے گی۔ وہ بہت حیرت زدہ ہوگی اور تب اُسے یقین آجائے گا کہ میں کہاں کہاں گیا۔ کاش وہ اندر ہی موجود ہوتی۔ مجھے یہاں دیکھتی تو اُسے سکتہ سا ہو جاتا۔ سمجھتی کہ خواب دیکھ رہی ہے۔ آج سورج مشرق کے بجائے مغرب سے کیسے طلوع ہو گیا۔

میری آنکھیں سُن ہو گئی تھیں یا جیسے میں چلتے چلتے سو گیا تھا۔ ہنجل نے ٹھوکا مار کے مجھے چونکا دیا۔ ہم بڑی عمارت کے بیرونی ستونوں سے گزر رہے تھے۔ چن وسا اور اُس کا ساتھی ہمیں عمارت کے باہر کھڑے ہوئے ملے۔ اُن کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ اُن سب کی معیت میں ہم عمارت میں داخل ہوئے۔ اندر سے عمارت خاصی سجی ہوئی تھی مگر کوئی غیر معمولی سرگرمی نظر نہیں آتی تھی۔ عمارت کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے ہمیں ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ کمرے کے وسط میں دیوار سے لگے ہوئے تخت پر قبیلے کا کسرتی جسم اور درمیانے قد کا سردار آلتی پالتی مار کے بیٹھا تھا۔ اُس کا رنگ شہابی تھا۔ مونچھوں اور سر کے بالوں کا رنگ بھورا، دانت چھوٹے چھوٹے، پیشانی چوڑی، سینہ اُٹھا ہوا اور ہونٹ پتلے پتلے تھے۔ ہم پانچوں نے قبیلے کی رسم کے مطابق اُسے تعظیم دی اور جب تک اُس نے بیٹھنے کا حکم نہیں دیا، کھڑے رہے۔ سردار کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کسی جگنو کے مانند چمک رہی تھیں۔ ہنجل نے اُسے جڑاؤ دستے کا ایک قیمتی خنجر پیش کیا۔ سردار نے اُسے تین چار بار اُلٹ پلٹ کے دیکھا اور اُس کے ہونٹوں پر ایک ثانیے کے لیے مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر وہ پہلو بدل کے ہماری جانب متوجہ ہو گیا۔ پہلے دن کی طرح آج بھی اُس کا چہرہ اُس کے اندرونی اضطراب کی صاف غمازی کر رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد ہماری زبان سے کچھ سننے کے لیے بے تاب تھا۔ ہنجل نے کچھ کہنے سے پہلے وہاں موجود دوسرے لوگوں کی طرف متردد انداز میں نگاہ ڈالی۔ سردار فوراً سمجھ گیا اور اُس نے اُن سب کو باہر جانے کا حکم دے دیا۔ چن وسا بھی چلا گیا مگر تخت کے پاس کھڑا ہوا ایک شخص موجود رہا۔

”سولم! سردار سے بولو کہ اِدھر قبیلے میں ہم اس کی خاطرداری سے بہت خوش ہیں“ ہنجل کی بھاری آواز گونجی۔ ”اور بولو کہ اپنے پاس اُس کا بدل دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔“

سولم نے ہنجل کی کہی ہوئی بات تبتی زبان میں سردار سے دہرا دی۔ سردار نے سر ہلایا اور خاموش رہا۔

”بولو کہ ہم کو رات چن وسا کی زبانی ساری بات کا پتہ چلا ہے۔ ابھی ہم اس بارے میں قبیلے یا سردار کے لیے کوئی بھی کام کر سکتے ہیں تو ہم کو بولو اور ہم پر بھروسا کرو۔ ذرا ٹھیک ٹھیک بولو۔“

ہم سب چونک پڑے۔ سردار بھی اپنی نشست پر جما نہ رہ سکا اور متحیر نظروں سے ہنجل کو گھورنے لگا۔ ”مگر تم لوگ کیا کر سکتے ہو؟“ وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

”ہم لوگ سوداگر ہیں۔ سودا کرنے پھرتے ہیں۔ چن وسا نے بولا ہے کہ اِدھر قبیلے کے لوگ بہت دنوں سے پریشان ہیں۔ اگر کاغذات قبیلے کو مل گئے تو قبیلہ اپنا سب کچھ، جو کچھ بھی اس کے پاس ہے اور اپنے سے الگ کر سکتا ہے، حوالے کر دے گا۔ ایسا ہے کہ نہیں ہے؟“

”ایسا ہی ہے۔“ سردار کی آواز لرزنے لگی۔ ”کیا تم..... تم اس سلسلے میں کچھ جانتے ہو؟“

”سودا اچھا ہے تو ایک بازی ہم بھی کھیلیں گے۔“

”کیا تم کچھ جانتے ہو؟“ اُس نے دوبارہ پوچھا۔

”ابھی کچھ نہیں سمجھو، پر جب جاننے کا جتن کریں گے تو جان بھی لیں گے۔“ ہنجل نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

سردار کی چمکتی ہوئی آنکھیں بجھ گئیں۔ ”بہت دن ہو گئے۔“ وہ مایوسی سے بولا۔ ”بہت دن ہو گئے ہیں۔“

”ہم کو پتہ ہے، دن بہت ہو گئے ہیں۔“ ہنجل اُونچی آواز میں بولا۔ ”پر تم لوگوں نے دن بیت جانے سے اُمید نہیں کھودی ہے۔“

”قبیلے کا آخری آدمی اپنی آخری سانسوں تک اُنھیں دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔“ سردار نے جوش میں کہا۔

”تو پھر اب ہم کو بھی اپنے ساتھ شامل سمجھو۔ ہم کو ساری بات بول دو۔ کاغذات کدھر رکھے تھے؟ لڑکی کیسی اور کس عمر کی تھی؟ اُس کا رنگ روپ.....“

”وہ ہندوستان میں ہے“ سردار تیزی سے بولا۔ ”اور ہندوستان کوئی چھوٹا ملک نہیں ہے۔ قبیلے کے ہزاروں آدمی نو سال سے اُسے ڈھونڈتے رہے ہیں۔ تم کہاں کہاں جاؤ گے۔ تم ہر گھر میں گھس کے اُسے نہیں دیکھ سکتے۔“

”کوئی بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ پر ہم ہندوستانی لوگ ہیں۔ تمھارے مقابلے میں ہم اُدھر زیادہ کھوج کر سکتے ہیں اور کام کے لیے بہت سے آدمی اکٹھے کر سکتے ہیں۔ منظور ہو تو بولو۔“

”منظور!“ سردار تلخی سے بولا۔ ”قبیلے میں کس کو یہ نامنظور ہو سکتا ہے۔“

”پھر جو کچھ رات چن وسا سے ہم نے سُنا تھا۔ ہم سمجھیں، وہ ٹھیک ہے۔ ہماری ایک شرط اور بھی ہے کہ کامیاب واپسی پر چانگ قبیلہ سدا کے لیے صرف ہمارے اور ہمارے بھیجے ہوئے قافلے کو راہ داری دے گا، کسی اور کو نہیں۔“

”سب ہم کو منظور ہے۔“ سردار کے لہجے میں اُکتاہٹ آگئی۔

”ایسا مت بولو سردار! بولنے سے پہلے سوچ لو۔“

”پہلے کاغذات لے آؤ، پھر بات پکی کرو۔“

”پہلے بات پکی کرو۔“ ہنجل نے زور دے کر کہا۔

سردار اُچھل کے تخت سے اُتر آیا اور سیدھا ہنجل کے پاس گیا۔ ہنجل بیٹھا رہا۔ سردار چند لمحوں تک خشمگیں نظروں سے اُسے دیکھتا رہا پھر اُس کے پاس سے ہٹ کے کمرے میں ٹہلنے لگا اور اچانک بھڑک کے درشتی سے بولا۔ ”تم قبیلے کے سردار کے سامنے ہو۔“

”ہم جانتے ہیں۔“ ہنجل نے تھمی ہوئی آواز میں کہا۔ ”پر سردار ایک ضرورت مند ہے اور ہم سوداگر۔ یہ سودا عام سودا نہیں، الگ قسم کا ہے۔ چیزوں کا نہیں، جان کا ہے۔ ہم سے اس معاملے پر بات کرنا ہے تو ایک سردار کی طرح نہیں، دکان دار اور گاہک کی طرح بات کرو۔ ویسے ہم تمھاری جگہ میں ہیں۔ ہم کو اس کی پوری جان کاری ہے۔“

”تم آگے بات کرو۔“ وہ تلملا کے بولا۔

”ابھی تمھاری سرداری کی مدت کتنی رہ جاتی ہے؟“

”سات مہینے۔“ اُس نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

”بہت ہے۔“ ہنجل نے آہستگی سے کہا۔ ”شاید ہم کو اتنا ٹائم نہیں لگے۔ ہم کو چار مہینے کا ٹائم بہت ہو گا۔“

”چار مہینے۔! کیسے چار مہینے؟“

”چار مہینے میں ہم یا تو تمھاری امانت تم کو لوٹا دیں گے یا پھر کبھی لوٹ کے نہیں آئیں گے۔“

”مگر تم..... تم اتنے اعتماد سے کیسے کہہ رہے ہو؟“ سردار کی آواز میں ایک خفیف سی لرزش پیدا ہو گئی تھی۔

”یہ سوچنا تمھارا کھٹ راگ نہیں ہے۔ تم ہر بات پر نظر رکھو۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“

”دیکھو سردار!“ ہنجل اپنی نشست سے اُٹھ کے اُس کے تخت کے قریب آگیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ”ہم زیادہ بات نہیں کرتے۔ تم بولتے ہو، نو سال سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ تم نے ہر جتن کر کے دیکھ لیا ہے۔ تم کو کیا ملا ہے؟ اب ہم کو کچھ نہیں ملا تو تم کو کوئی کھٹک نہیں ہونی چاہیے۔ یہ تمھارا اتنا بڑا گھاٹا نہیں ہے، جتنا اپنا ہے۔ خوار ہم ہوں گے، تم اِدھر ہی رہو گے۔ پر کام شروع کرنے سے پہلے ہم کو تم سے ہر بات صاف کر دینا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ سر جھٹک کے بولا۔ ”ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہمیں ہماری چیز مل جائے۔ جو چن وسا نے تم سے کہا ہے، سب درست ہے۔ ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں۔“

”ہم تمھارے وعدے پر بھروسا کرتے ہیں۔ پر کاغذ ہم کو مل گئے تو ہم اپنی جگہ اُن کو تمھارے حوالے کریں گے اور تم ہماری چیز ہمارے حوالے کرنا۔“

”تم جہاں بھی کہو۔“ سردار کی زبان اٹک رہی تھی۔ ”یہ ہمارا وعدہ ہے۔“

”ایک بات اور سُن لو۔ تم بولتے ہو، کاغذ دوسرے کے لیے بے کار ہیں، پر ایسا نہیں ہوگا۔ اِن کی اور لوگوں کو بھی ضرورت ہوگی۔ نہیں ہوگی تو پیدا کی جا سکتی ہے۔ آگے لاماؤں کو بھی اِن کی قدر معلوم ہوگی۔ پر ہم نے تم کو زبان دی ہے۔ چار مہینے تک تم ہم سے کچھ نہیں بولو گے۔ ہم اِدھر رہیں یا کہیں اور۔ ہم اپنے کچھ آدمی بھی اِدھر چھوڑ سکتے ہیں جو نیچے بستی یا اُوپر مندروں کے علاقے میں آتے جاتے لوگوں کی خیر خبر رکھ سکتے ہیں۔ ضرورت پڑی تو ہم اِدھر تمھارے آدمیوں سے بھی پوچھ گچھ کریں گے۔ پر یہ سب بعد کی بات ہے۔ تم نے یا تمھارے قبیلے کے کسی آدمی نے ہمارے درمیان دخل دینے کی کوشش کی تو تم کبھی کچھ نہیں پا سکو گے۔ ہم

کو مرتے وقت اکیلے جانا نہیں بتایا گیا۔ کوئی ٹیڑھی بات ہوئی تو بھگتنا تمھارا کام ہوگا، اپنا نہیں ہم کو ادھر تمھاری جگہ پر اڑا نہیں جمانا ہے اور ہمارا تمھارا کوئی پرانا بیر بھی نہیں ہے اور نہ ہم تم سے کوئی پیشگی لے کر ٹانگ رہے ہیں پھنسنے میں جا رہے ہو سردار! اچھی طرح سوچ لو۔ ابھی ہم اِدھر تمھارے مہمان ہیں۔"

"تمھاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم ضرور کچھ جانتے ہو؟"

"ہم نے بول دیا ہے، ابھی ہم نہیں جانتے۔ پر اگر جانتے بھی تو جب تک ہم نہ چاہتے، تم کچھ نہیں جان سکتے تھے۔ اتنی باتیں بولنے کا مطلب یہ ہے کہ تم سے کچھ اُلٹ نہ ہو جائے۔"

سردار کے جسم کا تمام خون اُس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا اور وہ بیٹھے بیٹھے یوں اُچکنے لگا تھا جیسے اُس کے کپڑوں میں کوئی بچھو گھس گیا ہے۔ سُولم نے یکساں اور سپاٹ زبان میں تجھل کی تمام باتیں اُسے منتقل کی تھیں۔ تجھل کے چپ ہو جانے پر سردار گردن جھکائے اپنی انگلیاں مروڑتا رہا۔ ہم سب اپنی جگہوں پر ساکت بیٹھے ہوئے تھے۔ "سردار اتنی گاکو سوچنے کا ٹائم دو۔" تجھل نے سُولم سے کہا۔ اُس کا جملہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ یک لخت سردار تخت سے اُٹھ کر دوبارہ تجھل کے سامنے آکے کھڑا ہو گیا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورنے لگا۔ اُس کا سر تجھل کے کندھے پر آ رہا تھا۔ تجھل کی پلکوں میں جنبش نہیں ہوئی مگر اُس کی آنکھیں سردار کی آنکھوں کی طرح سُرخ نہیں تھیں۔ تھکی اور بجھی ہوئی سی تھیں۔ یکا یک سردار نے اُس کا گریبان پکڑ لیا۔ جامو نے اِدھر چاقو نکال لیا تھا، اُدھر تخت کے پہلو میں کھڑے ہوئے سردار کے آدمی نے بھی خنجر تان لیا تھا۔ تجھل کا جسم بے حرکت رہا۔ پھر سردار نے اپنے ہاتھ پھیلائے تو تجھل کے ہاتھ بھی پھیل گئے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ زور سے پکڑ لیے۔

"تمھارے تارے قبیلے میں مجھ کو سب سے اچھے لگتے ہیں۔"

سردار کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا ہوگا کیونکہ سُولم خاموش کھڑا عجز بز نظروں سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ سردار کے چیخنے پر اُس کا آدمی بھاگتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

جب ہم سردار کے مکان سے باہر آئے تو دھوپ اُتر رہی تھی۔ دوپہر کا کھانا ہم نے سردار کے ساتھ ہی کھایا تھا۔ اُس کے حکم پر کمرے میں کئی خادم اور خادمائیں جمع ہو گئے تھے جنھوں نے ہمارے آگے چاول، بستی میں بنی ہوئی مٹھائیوں اور سردار کے لیے خاص طور پر پکائے ہوئے کھانوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ چین سے آئی ہوئی خوشبودار چائے سب سے خوش ذائقہ تھی۔ ہم نے ایسی چائے پہلے کبھی نہیں پی تھی۔ مسلسل وہی پیتے رہے۔ تجھل اور سُولم وہیں رہ گئے تھے۔ میں، مارٹی اور جامو اُنھیں وہاں چھوڑ کے اُٹھنا نہیں چاہتے تھے مگر خود تجھل ہی نے ہمیں باہر جانے کو کہہ دیا تھا۔ اِدھر اُدھر بے کار گھومنے اور گھر جانے کے بجائے ہم وہیں ایک پہاڑی پر بیٹھ کے اُن کا انتظار کرتے رہے۔ آج کا دن بھی گزرا جا رہا تھا۔ اب اُوپر مندروں کے علاقے میں جانے اور اندھیرا ہونے سے پہلے واپس آنے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ دھوپ پہاڑوں پر چڑھ رہی تھی۔ ہم تینوں کی نگاہیں سردار کے مکان کے اُونچے دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور شاید ہم ایک ہی بات سوچ رہے تھے کہ اگر تجھل اور سُولم کچھ دیر اور نہ آئے تو... لیکن سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ دروازے پر ایک ساتھ کئی آدمی باہر نکلتے دکھائی دیے۔ اُن میں وہ دونوں بھی تھے، چن وسا اور قبیلے کے کئی لوگوں کے درمیان۔ ہم نے تقریباً بھاگتے ہوئے بستی کی طرف جانے والے راستے پر اُنھیں جا لیا اور تجھل کا چہرہ دیکھ کے ہماری پھولی ہوئی سانسیں بیٹھنے لگیں۔

بستی کے مرکزی مقام پر باقی تمام لوگ منتشر ہو گئے۔ صرف چن وسا ہمارے ساتھ رہ گیا۔ راستے میں نہ جانے کیوں تجھل بار بار آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔ اُسے بھی دن نکل جانے کا احساس ہوگا۔ مجھے معلوم تھا، اب ہم اور کہاں جا سکتے ہیں۔ دروازہ چن وسا کی لڑکی تشانم نے کھولا مگر ہمیں مقابل دیکھ کے اُس کا سراپا کانپ سا گیا۔ وہ جلدی سے دروازے کی آڑ میں سمٹ گئی تھی کہ تجھل نے جھٹ ہاتھ بڑھا کے اُسے اپنے بازو میں گھسیٹ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کی ٹھوڑی اُٹھا کے ماتھے کو بوسہ دیا۔ وہ اور سکڑ گئی۔ چن وسا مسکرانے لگا اور اپنی زبان میں پتہ نہیں کیا کیا کہتا رہا۔ "ہم پردیسی ہیں رانی!" تجھل اُس کا سر تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ سُولم نے فوراً ترجمہ کر دیا۔ تشانم نے ایک پل کے لیے بھی اپنی تھرتھراتی پلکیں نہیں اُٹھائیں۔ اُس کے نتھنے بری طرح پھڑک رہے تھے اور رخساروں کا سُرخ رنگ جھلملانے سا لگا تھا۔ تجھل سے ہاتھ چھڑا کے وہ سرپٹ بھاگتی ہوئی آناً فاناً کہیں اوجھل ہو گئی۔ "بالکل بولتی گڑیا ہے، بغیر چابی کی"۔ تجھل نے ہنس کے کہا اور مارٹی کی گردن پکڑ کے جھٹکے دینے لگا جو مبہوت سا کھڑا تھا۔ ہم سب سیدھے سلطان کے کمرے میں آ گئے۔ وہ آنکھیں موندے بستر پر آرام کر رہا تھا۔ ہماری آہٹ پر وہ اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ تجھل نے تین چار بار اُس کا پیر جھنجھوڑا اور مروڑ کے دیکھا۔ اب اُسے کوئی خاص تکلیف نہیں معلوم ہوتی تھی لیکن اُس کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ جیسے دن بھر روتا رہا ہو۔ وہ گردن ڈالے ہوئے "ہوں ہاں" میں تجھل کو جواب دیتا رہا۔ تجھل اُس کے پاس چند منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرا ہوگا کہ جامو اور مارٹی کو اپنے واپس آنے تک گھر میں رہنے کی ہدایت کر کے پھر سائبان میں آ گیا اور چن وسا کو بلا کے اُس نے مندروں کے علاقے میں جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں سمجھا کہ تجھل چن وسا کی ٹوہ لینے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے۔

شام ہو رہی تھی اور ابر چھا گیا تھا۔ چن وسا نے دبے لہجے میں وقت زیادہ ہو جانے کا عذر کر کے روکنے کی کوشش کی لیکن تجھل اُس کی بات سنی اَن سنی کرتا ہوا دروازہ کھول کے باہر نکل آیا۔ سُولم کو بھی اُس نے ساتھ رکھا تھا۔

اُوپر جانے کے خیال سے میرا دل ایک دم دھڑ دھڑانے لگا تھا۔ میں نے سوچا، تجھل کو منع کر دوں۔ مجھ سے اباجان کے سامنے نہیں جایا جائے گا، میں تو اُن کے سامنے کھڑا بھی نہ رہ سکوں گا، میں اُن سے کیا کہوں گا، میری زبان سے ایک لفظ نہیں پھوٹے گا اور اُنھوں نے اگر کچھ کہا تو مجھ سے سُنا نہیں جائے گا۔ مجھے اُن کی آنکھوں سے شروع ہی سے ڈر لگتا ہے اسی لیے میں کورا کو لے کے گھر سے نکل گیا تھا۔ میں نے پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ وہ وہاں رہے گی تو مجھے اور اُسے ہر وقت اُن کی نگاہوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور اگر اُن کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل گئی! وہ کچھ خیال ہی نہیں کرتے تھے، جو دل میں ہوتا تھا، فوراً کہہ دیتے تھے اور اُنھوں نے تو کہہ بھی دیا تھا۔ اگر میں جلدی نہ کرتا اور تین چار دن گھر میں اور رُک جاتا، اُن کی خوشامد کر لیتا کہ وہ کورا کو پولیس کے حوالے نہ کریں تو ممکن تھا، اس دوران وہ کورا کے لائے ہوئے کاغذات پر نظر ڈال لیتے اور شاید کورا سے اُن کا رویّہ بدل جاتا۔ وہ اُسے محفوظ کر کے رکھتے مگر پھر وہ اُس سے جلد سے جلد چھٹکارا بھی حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے تھے کیونکہ کورا کا گھر میں ہونا ایک مسلسل خطرہ تھا۔ میں نے ٹھیک ہی کیا تھا۔ میرے پاس اِس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی کہ میں اُسے لے کے دُور نکل جاؤں۔ میرے سینے میں شور سا ہو رہا تھا۔ ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ تجھل اُوپر بڑھتا رہا۔ ہم بیچ میں کہیں نہیں رُکے تھے مگر آدھا راستہ طے کیا ہوگا کہ بوندا باندی ہونے لگی اور پھر ہر طرف وہی اندھیرا چھانے لگا جس سے مجھے بہت وحشت ہوتی تھی۔ شام ہوتے ہی پہاڑوں پر ہُو کا عالم طاری ہو جاتا جیسے دُنیا میں سب مر گئے ہوں اور پہاڑ اُن کے سوگ میں خاموش کھڑے ہوں۔ کچھ دیر تک اندھیرا سرمئی سرمئی سا رہا۔ پگ ڈنڈیاں نظر آتی تھیں۔ اُوپر پہنچتے پہنچتے ہر سُو دھند پھیلی ہوئی تھی۔ ابر کی وجہ سے چاند بھی چھپا ہوا تھا۔ ہوا تیز نہیں تھی اور دھند بھی ابھی بہت کم تھی۔ ہماری آنکھوں میں اتنا اندھیرا نہیں تھا اور تجھل نے ٹارچ بھی روشن کر دی تھی۔ ایک دوسرے کو پکڑتے ہوئے ہم سنبھل سنبھل کے نم اور پھسلواں زمین پر پیر رکھ رہے تھے۔ ہمارے پیچھے کسی کی چاپ نہیں تھی۔ نیچے دُور ہی سے مندروں کے علاقے میں بھڑکتی ہوئی شعلوں کی روشنی دکھائی دینے لگی تھی۔ لگتا تھا کہ فاصلہ اب بہت کم رہ گیا ہے لیکن یہ نظروں کا دھوکا ثابت ہوتا تھا۔ بارش تیز ہو جاتی تو سارے کپڑے بھیگ جاتے۔ یہاں کوئی سایہ بھی نہیں تھا۔ بستی اور مندروں کے درمیان ایک بڑا علاقہ غالباً اس لیے خالی رکھا گیا تھا کہ مندر پُرسکون رہیں۔ اُوپر جانے کے لیے کہیں کہیں پہاڑوں پر سیڑھیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ ہم نے اپنی ڈگر نہیں چھوڑی اور اس احتیاط کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم بہت جلد مندروں کے علاقے میں پہنچ گئے۔ اُوپر زمین خشک پڑی تھی۔

تمام بڑے اور چھوٹے مندروں میں مشعلیں روشن تھیں۔ کھلے آسمان کے نیچے گوتم بدھ کی دیو قامت مورتی کے سامنے ایک بڑا الاؤ دہک رہا تھا اور مختصر تعداد میں راہب گم سُم بیٹھے ہوئے تھے۔ سب سے بڑی عمارت کے اندر بھی دھیمی روشنی ہو رہی تھی اور راہ داری میں راہبوں کی چہل پہل تھی۔ گزرتے ہوئے چند ہی راہبوں نے رُخ پلٹ کے ہمیں دیکھا ہوگا۔ ہمارے کپڑے خاصے بھیگ گئے تھے۔ ٹھنڈ سے جسم جمے جا رہے تھے۔ سُولم تو دانت کٹکٹا رہا تھا اس لیے ہم مورتی کے سامنے راہبوں کے ساتھ الاؤ کے گرد بیٹھ گئے۔ آگ کی تپش سے جسم میں کسی قدر حرارت محسوس ہوئی مگر میرے ہاتھ پیروں کی کپکپی دُور نہیں ہوئی۔ ہم کن انکھیوں سے وہاں موجود راہبوں کے چہرے غور سے دیکھتے رہے۔ اِن میں اباجان نہیں تھے۔ اباجان ہمیں اور بھی کئی مندروں میں نظر نہیں آئے۔ مندروں میں کسی نے ہماری موجودی پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ جس وقت ہم بڑے مندر کی سیڑھیاں طے کر کے وہیں ایک درمیانی جگہ پر بیٹھے تو کھانا تقسیم ہو رہا تھا۔ یہ ایک بڑی عمارت تھی۔ بڑے بڑے ہالوں اور کمروں کے اطراف چوڑے اور لمبے تھموں پر ٹکی ہوئی راہ داری تھی۔ اندر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے ایسی ہی تنگ اور کشادہ گلیاں تھیں۔ مشعلیں ہر کونے پر نصب تھیں لیکن روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ کھانا تقسیم کرتے ہوئے پجاری جب ہماری جانب آئے تو ہم سے پوچھے بغیر ایک نے ہمارے آگے مٹی کا پیالہ رکھ دیا، دوسرے نے اُس میں پتلی دال اور سبزی کا ایک ایک چمچا ڈال دیا۔ تیسرے نے موٹی روٹیاں چٹائی پر رکھ دیں۔ راہ داری میں ہر طرف راہب قطار سے بیٹھے ہوئے تھے۔ جہاں تک ہماری نظر پڑتی تھی، اباجان نہیں تھے۔ تجھل اور سُولم نے سیر ہو کے کھانا کھایا۔ میرے حلق سے ایک لقمہ بھی نہیں اُتر رہا تھا۔ کھانے کے بعد راہب منتشر ہونے لگے۔ ہم نے عمارت کے گرد پوری راہ داری کا چکر لگا کے دیکھ لیا لیکن مندروں میں رہنے والے تمام راہب صرف یہیں نہیں تھے اور بھی عمارتیں فاصلے فاصلے پر بنی ہوئی تھیں۔ چند کو ہم یہاں آنے سے پہلے ہی دیکھتے آئے تھے۔ ہمارا یوں ہر عمارت میں رُکنا اور کچھ دیر ٹھہر کے واپس آ جانا مناسب نہیں تھا پھر بھی ہم مختلف مندروں میں جاتے رہے۔ باہر کھلی ہوئی جگہوں پر اِکا دُکا راہب دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے آپ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اُنھیں سردی بھی نہیں لگ رہی تھی۔ اندھیرے میں اُن کے خط و خال صاف نظر نہیں آتے تھے مگر اُن میں اباجان ہوتے تو اُن کا جثہ ہم علیحدہ سے

پہچان سکتے تھے اور وہ ایسی مشقت کے عادی نہیں ہوں گے۔ اُنھیں یہاں آئے ہوئے وقت بھی زیادہ نہیں ہوا تھا یا شاید وہ عادی ہوں بھی، کون کہہ سکتا تھا کہ اتنے عرصے اُنھوں نے کہاں کہاں وقت گزارا ہے۔

چلتے چلتے ہماری ٹانگیں اکڑنے لگی تھیں۔ کئی عمارتوں میں اُن کا کوئی نشان نہ ملا تو ہم دوبارہ بڑے مندر میں آ گئے۔ اب ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ راہبوں کے آشرم کا رُخ کریں جہاں اَن گنت کٹیائیں بنی ہوئی تھیں۔ ہم نے اب تک سرائے یا آشرم میں جانے سے اسی سبب پہلو تہی کی تھی کہ ابھی رات زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ راہبوں کی ایک بڑی تعداد مندروں میں موجود تھی۔ بڑے مندر کی عمارت میں دبی دبی سرگوشیاں گونج رہی تھیں اور اباجان کا دُور دُور پتہ نہیں تھا۔ کہیں وہ چلے نہ گئے ہوں۔ مجھے بار بار یہی خیال آ تا تھا حالانکہ یہ عجیب سی بات تھی۔ جس دن ہم نے اُنھیں دیکھا تھا، اُنھیں اُسی دن یا اُس کے دوسرے ہی دن روانہ ہو نا رہ گیا تھا۔ اچھا ہے کہ وہ چلے ہی گئے ہوں۔ مجھے چاہے وہ نہ ملیں، پھر سے کہیں کھو جائیں مگر کسی طرح یہاں سے دُور ہو جائیں میرا دل اُن کے لیے یہی دعا کر رہا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہوں گے۔ خدا کرے، وہ کامیاب ہی لوٹے ہوں ورنہ پھر وہ زندہ نہیں رہیں گے۔ اتنے عرصے کوئی بھی اپنی اُمیدیں ناکام ہونے پر زندہ نہیں رہتا۔ ایک میں ہی بے حس تھا۔

تھل اور سُولم ابھی مایوس نہیں ہوئے تھے۔ راہبوں سے مندر خالی ہونے لگا۔ مشعلیں کم ہوتی گئیں اور ایک سوگوار سکوت عمارت کے در و دیوار پر مسلط ہو گیا تو ہمیں روک کے تھل خود عمارت میں گھومنے چلا گیا۔ وہ چھپتا چھپاتا گیا تھا اور خاصی دیر بعد واپس آیا۔ واپسی میں اُس کی چال ہی سے مجھے اُس کی ناکامی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ مندر میں چند راہب رہ گئے تھے اور وہ سب کے سب مراقبوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ کئی پجاری ہمیں وہاں بیٹھا ہوا دیکھ کے جھجکتے ہوئے گزر گئے۔ اُن کا تعلق یقیناً مندر کے انتظام سے ہو گا۔ پھر ایک معمّر پجاری نے آ کے نرم لہجے میں ہم سے پوچھا کہ ہمیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ ہمارے بجائے سُولم نے جواب دیا کہ ہم ایک رات گزارنا چاہتے ہیں۔ سردی سے اُس کی آواز ٹھٹھر رہی تھی۔ پجاری نے ہم تینوں کو ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھا اور مشورہ دیا کہ ہم سرائے چلے جائیں، وہاں ہم رات آرام سے گزار سکیں گے لیکن تھل سرائے جانا نہیں چاہتا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اباجان اپنی کٹیا سے باہر ہوں۔ ہم ہر کٹیا میں جھانک کے بھی نہیں دیکھ سکتے تھے تاہم ہمیں مندر سے اٹھنا ہی پڑا۔ ویسے بھی ہم وہاں ساری رات گزارنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ دُھند بڑھتی جا رہی تھی۔ اس سے ہمیں عمارتوں کے درمیان آنے جانے میں آسانی ہو گئی کیونکہ نقل و حرکت چند گز کے فاصلے ہی تک دیکھی جا سکتی تھی۔ یہاں سے وہاں، اس جگہ سے اُس جگہ تک مسلسل

چلنے پھرنے میں رات کا بڑا حصہ بیت گیا تھا۔ سُولم اور تھل کی رفتار میں پہلے جیسی تیزی نہیں رہی تھی۔ میری ٹانگیں تو پہلے ہی شل تھیں۔ ناچار ہم سرائے میں آ گئے۔ یہاں مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پتھروں کی کٹیاؤں کے بیشتر دروازے بند تھے۔ پہلے ہم دو رویہ کٹیاؤں کے درمیان ڈھکے ہوئے راستوں کے چکر لگاتے رہے۔ وہاں بھی اُن کی کوئی سُن گُن نہیں ملی تو سرائے کے ایک وسیع و عریض ہال میں چلے آئے۔ سالانہ میلوں کے درمیان اس ہال میں گہما گہمی رہتی ہو گی، اب ویران پڑا تھا۔ اندر کسی حد تک گرمی تھی لیکن ایسی بھی نہیں کہ ہم کسی تھم سے کمر ٹکا کے رات گزار دیں۔ بڑے مندر کے پروہت نے کہا تھا کہ سرائے میں ہمیں بستر مل جائیں گے۔ یہاں کوئی شخص جاگا ہوا نہیں تھا۔ کسی متعلق آدمی کو ڈھونڈنے کی کوشش میں سُولم کو ہال کے انتہائی گوشے میں ایک شخص سوتا ہوا مل گیا۔ سُولم کسی جھجک کے بغیر اُسے جھنجوڑنے لگا۔ وہ ہڑبڑا کے اُٹھا اور ہمیں دیکھ کے بوکھلا سا گیا۔ حواس بجا ہونے پر اُس نے ہال میں ایک جانب بنی ہوئی کوٹھریوں کی طرف ہذیانی انداز میں اشارہ کیا۔ وہاں بستروں کا انبار لگا ہوا تھا۔ اُسی شخص نے ہمیں کُھلی ہوئی کٹیاؤں میں جانے کی صلاح دی تھی مگر ہم ہال کے کنارے دروازے کے قریب بستر لگا کے لیٹ گئے۔

رات بھی جیسے سردی سے کانپ رہی تھی اور ٹھٹھرتی ہوئی بیت رہی تھی۔ تھل اپنا جسم سُکیڑے لمبی لمبی سانسیں کھینچ رہا تھا۔ سُولم بھی کروٹیں بدل رہا تھا۔ بستر سرد تھے۔ رفتہ رفتہ وہ ہمارے جسم کی حرارت سے گرم ہوئے اور اُن میں سیلن کی ایک بُو بھی بسی ہوئی تھی لیکن ہم کسی طور اُنھیں اپنے جسم سے جُدا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے بلکہ ہمارا بس چلتا تو اُنھیں اپنے اندر جذب کر لیتے۔ اگر ہم ہال میں کچھ اندر بستر لگاتے تو شاید اتنی ٹھنڈ محسوس نہ ہوتی۔ کنارے پر ہونے کی وجہ سے یخ بستہ ہوا ہمارے گالوں پر طمانچے مارتی گزر رہی تھی۔ ہم تینوں میں سے کسی کو بھی نیند نہیں آئی۔

رات کا آخری حصہ ہو گا کہ ہم نے کسی کی آہٹ سُنی۔ سب سے پہلے تھل چونک کے اُٹھا پھر میں۔ کُھلے دروازے کے ستونوں میں ہمیں کوئی سایہ سا رینگتا ہوا نظر آیا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ دُور چلا جاتا اور دُھند میں اوجھل ہو جاتا، تھل بستر سے اُچھل کے پنجوں کے بل بھاگنے لگا۔ میں نے اور سُولم نے بھی بستر چھوڑ دیے۔ قریب جا کے تھل ٹھٹک کے رُک گیا۔ وہ کوئی راہب تھا۔ تمام جسم کمبل کے سے لبادے میں لپٹا ہوا، سر اور منہ مفلروں میں چھپے ہوئے۔ اُس نے بھی ہماری چاپ سُن لی تھی، رُک کے ہماری طرف دیکھا۔ تھل فوراً اُس کے آگے آ گیا اور اس سے پہلے کہ راہب اُس سے کچھ پوچھتا، تھل نے اُس کے منہ پر ہاتھ مار کے مفلر نیچے کھینچ لیا اور بیٹری کی روشنی اُس کے چہرے پر پھینکی۔ میرے دل کی حرکت بند ہونے لگی۔ وہ اباجان ہی تھے۔ روشنی سے اُن کی آنکھیں چُندھیا

گئیں اور اُنھوں نے اپنا منہ پھیر کے ہذیانی انداز میں پوچھا "کیا ہے؟" اُنھوں نے تبتی زبان میں کہا تھا۔

"ذرا ہمارے ساتھ آؤ بڑے صاحب!" تھل نے بیٹری بُجھا کے سرگوشی کی۔

اباجان نے پھر تبتی زبان میں سراسیمگی سے کچھ کہا۔

"بڑے صاحب! ہم کو پتہ ہے آپ ہندوستانی سمجھتے ہو۔ جیسا میں بول رہا ہوں ویسا ہی کرو۔" تھل نے نرمی سے کہا۔ "ہم کو آپ سے کچھ بات کرنا ہے۔"

"میں... میں ہندوستانی سمجھتا ہوں۔" اباجان نے لرزیدہ لہجے میں کہا "مگر آپ، آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟"

"کچھ کام ہی ہے، پر یہ جگہ بولنے کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔"

"آپ کون لوگ ہیں؟"

"اپنے ہی ہیں۔ میں بولتا ہوں۔ گھبراؤ نہیں بڑے صاحب!"

"مگر آپ، آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"آپ کا بھلا ہی چاہتے ہیں؟"

"کیسا بھلا! میں... میں ایک۔"

"ادھر نہیں بڑے صاحب!" تھل نے تحمل سے کہا۔

"پھر کہاں؟" اباجان نے کسی قدر ناگواری سے پوچھا۔

"جہاں آپ اچھا سمجھو، کسی کٹیا میں چلو۔"

اباجان کی آواز وہی تھی، گو وہ سرگوشی میں بات کر رہے تھے لیکن ان کے لہجے میں وہی بھاری بھرکم پن تھا، وہی گونج تھی۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں تھل کی زبان سے کچھ نکل نہ جائے۔ اُنھیں غصہ آنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی تھی۔ تھل نے جب اُن کے چہرے سے مفلر کھینچا تھا تو وہ بہت گھبرا گئے تھے۔ اُن کا سارا وجود لرز کے رہ گیا مگر اُنھوں نے بہت جلد اپنی آواز پر قابو پا لیا اور تبتی زبان میں بات کرنے کی حجت بھی نہیں کی۔ میرا حلق خشک ہو گیا تھا۔ آنے والے لمحوں کے خیال سے میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔

"آپ کو کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔" اباجان نے ملائمت سے کہا۔

"ہو سکتا ہے بڑے صاحب! پر اُسے دُور کرنے کے لیے ہی اپنے ساتھ چلو۔"

اباجان نے زیادہ تامّل نہیں کیا اور خود ہی کٹیاؤں کی طرف بڑھ گئے۔ زمین میرے پیر کھینچے لے رہی تھی۔ تھل نے پشت سے میرا کوٹ پکڑ لیا۔ ہم آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے کُھلی ہوئی کٹیاؤں کے وسط کی ایک کٹیا میں آ گئے۔ وہ زیادہ لمبی چوڑی نہیں تھی۔ زمین پر خشک گھاس بچھی ہوئی تھی اور اندر گہرا اندھیرا تھا۔ سُولم کو باہر رہنے کی ہدایت کر کے تھل نے دروازہ بند کر لیا۔ پتھروں کی ان موٹی دیواروں سے ہماری آواز باہر نہیں جا سکتی تھی۔ اباجان بالکل ساکت بیٹھے تھے۔ تھل نے دیا سلائی جلا کے چراغ

روشن کر دیا۔ کُٹیا میں لرزتی ہوئی روشنی پھیل گئی۔ "بڑے صاحب! زیادہ بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ہم آپ کی تلاش میں بہت دُور سے آئے ہیں۔"

"میری تلاش میں!" اباجان نے تعجب سے کہا۔

"ہاں جی، آپ کی تلاش میں اور ہم کو سب پتہ ہے۔ آپ ہم سے کچھ چھپانا مت ورنہ ٹائم برباد ہو گا۔ پہلے میں بول دوں کہ ہم لوگ آپ کے غیر نہیں ہیں۔ اپنے دل سے ایسے تمام خیال نکال دو۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔" اباجان کی آواز ٹمٹماسی رہی تھی۔

"آپ کی سمجھ میں سب آ جائے گا۔ کل بھی ہم نے اِدھر آپ کو دیکھا تھا۔ پر آپ سے اتنے لوگوں کے سامنے بات کرنا ٹھیک نہیں تھی۔"

"آپ اپنا مقصد... آگے بات کریں۔"

"کیا بات کریں بڑے صاحب، سوچتے ہیں کدھر سے کریں۔" تھل کسمساتے ہوئے بولا۔ "آپ سُن بھی سکو گے یا نہیں۔"

"میں سب سُن رہا ہوں۔" اباجان نے بے چینی سے کہا "مگر میں آپ سے پھر کہتا ہوں، آپ کو کوئی بڑی غلط فہمی ہو رہی ہے۔"

"آپ صفدر خاں صاحب نہیں ہو!"

اپنا نام سُن کے اباجان کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ "میں۔ میرا نام۔ میں ایک بھکشو ہوں اور میرا نام صفدر خاں نہیں ہے۔" اُنھوں نے تیزی سے کہا۔

"اب تو کچھ بھی نہیں، پر پہلے کبھی تھا۔" تھل کی آواز دھیمی ہی رہی۔ "میں گیا شہر میں آپ کا پتہ بھی بولوں کیا؟ بڑے صاحب! آپ اپنا حلیہ بدل سکتے ہو، نام تو نہیں۔ نام ایک ہی رہتا ہے۔"

"مگر میں آپ سے کیا کہہ رہا ہوں۔"

"میں جان رہا ہوں بڑے صاحب! خیر نام کا فیصلہ پھر کر لینا۔ اِدھر دیکھو یہ کون بیٹھا ہے۔ یہ کون بیٹھا ہے۔ اس جوان کا نام بابر ہے۔ یاد ہے آپ کو ایسا کوئی نام!"

"ب۔ بابر۔" اباجان کی آواز گھٹ گئی۔

مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اباجان مجھے بھی پہچاننے سے انکار کر دیں گے۔ ممی اور جہانگیر کے جُدا ہو جانے پر اُنھوں نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا تھا۔ تھل کی زبانی میرا نام سُن کے ان پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے تکنے لگے۔ تھل نے میری ٹھوڑی اُوپر اُٹھا کے بیٹری کی روشنی دکھائی "کچھ جان پڑتا ہے بڑے صاحب؟"

اباجان کی پُتلیاں پھیل گئی تھیں اور اُن کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن میری سسکیاں نکل پڑیں۔

"نہیں۔ نہیں۔" اباجان کی دہلتی ہوئی آواز اُبھری۔

"روشنی اور کروں بڑے صاحب؟"

اباجان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے اُن کے قدموں پر سر رکھ دیا اور پھر مجھے نہیں معلوم کیا ہوا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ نہ جانے کب اُن کی کانپتی ہوئی سرد انگلیاں مجھے اپنے بالوں میں سرسراتی محسوس ہوئیں۔ میری ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ جب اباجان نے میرا چہرہ اپنے استخوانی ہاتھوں سے سامنے کیا تب میں انھیں دیکھ سکا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے جھپٹ کے میرا چہرہ اپنی گود میں دبوچ لیا۔ "بابر!" اُن کی دھڑکتی ہوئی آواز جیسے کہیں دُور سے آ رہی تھی۔ "یہ تُو ہی ہے۔ بیرو!"

میری زبان پر فالج گر گیا تھا۔

"تُو کہاں چلا گیا تھا؟"

"اس سے کچھ مت پوچھو بڑے صاحب! ہاتھ پیر دیکھ لو۔ ٹھیک سلامت ہیں۔" تھجل نے کہا۔

"شاید میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میرے دماغ میں نہ جانے کیا کیا۔۔۔" اُن کا گلا رُندھنے لگا۔ "لیکن میرا دل کہتا تھا، میرا بابر کبھی مجھ سے ضرور ملے گا۔"

وہ منہ ہی منہ میں نہ معلوم کیا کیا کہتے رہے۔

"اور اس کا دل بھی ایسا ہی بولتا تھا۔"

"اوہ میرے خدا۔ میرے خدا!" وہ میری پیشانی اور انگلیاں بے تحاشا چومنے لگے۔ اُن کے ہاتھوں کو قرار نہیں تھا۔ کبھی وہ میرا چہرہ ٹٹولتے، کبھی بازو۔ کبھی میری پیشانی کو بوسے دیتے، کبھی آنکھوں کو۔ انھیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اُن کے سامنے ہوں اور مجھے بھی یہ سب ایک تصور سا لگ رہا تھا۔ دیر ہوگئی، وہ مجھے اپنے سینے میں بھینچے آہیں بھرتے رہے۔ "مگر تُو۔ تُو یہاں تک کیسے آ گیا؟" انھیں ایک دم خیال آیا۔

"بس آ گیا بڑے صاحب!" تھجل نے کہا۔ "ہم نے سوچا، آپ جس چیز کی تلاش میں اِدھر آئے ہو، ہم راستے میں ہی جا کے آپ کو اُس سے بڑی خبر دے دیں۔"

"آپ۔۔۔ آپ کا۔" اباجان خفقانی انداز میں بولے۔ "کس چیز کی تلاش!"

"بڑے صاحب! ایسے وقت میں مجھ کو آپ سے کچھ بولنا نہیں چاہیے تھا۔ پر رات بھاگ رہی ہے۔ سویرا ہونے سے پہلے ہم کو اِدھر سے دفع ہو جانا چاہیے۔ ایک تو ہم کو اس کو دکھانا تھا پھر ایک بات اور بولنی تھی۔"

"کہیے، کہیے۔" اباجان بے قراری سے بولے۔

"آپ بہت بڑے خطرے میں ہو۔"

"آپ کا کیا مطلب ہے؟"

"میری بات پہلے پوری طرح سن لو بڑے صاحب! یہ قبیلے کے لوگ نو سال میں کٹ کھنے ہو گئے ہیں۔ اِن کے سر کا کوئی بھروسا نہیں ہے، کس وقت اُلٹ ہو جائے۔ اپنے آپ پر بھی شک کرتے ہیں۔ آپ سمجھتے ہو کہ آپ یہاں محفوظ ہو۔ اِدھر بھی اِن کے لوگ آپ جیسے بہروپ میں ہوں گے۔ اِدھر آپ اکیلے ہو، ہم بھی اب آ گئے ہیں۔ پر جگہ اُنھی کی ہے اور راستے بھی سیدھے نہیں ہیں۔ اُن کی آنکھ میں کوئی دانہ پڑ گیا اور کسی دن زیادہ دیکھنے لگا کہ اِدھر ایسا کوئی ہے جو اُن کی امانت اپنے پلّے رکھتا ہے تو جنگل میں رہنے والے یہ لوگ جنگل کی بولی بولیں گے۔ ابھی ٹھیک طرح بات کرتے ہیں تو ٹھیک ہے۔" اباجان نے بیچ میں دخل دینے کے لیے لب کھولے۔ تھجل نے انھیں روک دیا۔ "آپ سُنتے رہو، مجھ کو پتہ ہے، آپ کیا جواب دو گے پر بڑے صاحب! سوچ سمجھ کے بولنا، اُلٹے جواب سے کام اُلٹا ہو جائے گا۔ آپ یہاں سے فوراً لوٹ چلو۔ ابھی آپ کو یہ شیر ببر سینہ زبر مل گیا ہے۔ یہ بھی آپ کے لیے دولت ہے۔"

"آپ کس امانت کی بات کر رہے ہیں؟" اباجان وحشت سے بولے۔

"وہی جو اُس رات لڑکی آپ کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ بڑے صاحب! ہم کو سب پتہ ہے۔ ہم کو ٹوٹل کے ٹائم اکارت مت کرو۔ وہ اپنے کاغذوں کے لیے سینگ نکالے پھر رہے ہیں۔ میں نے اُن سے بولا ہے کہ یہ میں اُن کو دے دوں گا اور اس کے بدلے وہ ہمیں دولت دیں گے۔ آپ وہ ساری دولت لے لینا۔ پہلے لے لینا، بعد کو کاغذ اُن کے متھے مارنا۔ وہ بھی کچھ کم نہیں ہوگی۔"

"میرے پاس ایسے کوئی کاغذات نہیں ہیں۔" اباجان نے تلخی سے کہا۔

"بڑے صاحب! ہم پہ بھروسا کرو، ہم کو کچھ نہیں چاہیے۔ ابھی دیکھو اِدھر بابر تمھارے سامنے ہے۔ اُدھر چھوٹا جہاں گیر بھی ہم کو مل گیا ہے۔"

"جہاں گیر! منّا، وہ کہاں ہے؟"

"وہ بھی بابر کے ساتھ ہے۔" تھجل نے فمی کا ذکر نہیں کیا۔ میرے منہ پر اُس کا نام آتے آتے رہ گیا لیکن میں فمی کے بارے میں اُن سے کہتا بھی کیا؟ کیا یہ بتاتا کہ وہ مجھے کہاں نظر آئی تھی اور کتنی دیر کے لیے؟

"اُدھر آپ کے دو بیٹے ہیں۔ اس کے پاس بھی بہت پیسہ ہے۔ نقدی، حویلی، جاگیر۔ پیڑھیاں کھائیں پھر بھی بچ جائے اور یہ سب نہ بھی ہوتا تو ہاتھ پیر کا تگڑا ہے۔ سر ذرا اس کا اکیس ہے۔ پر یہ سارا سونے کا ہے۔"

"منّا کیسا ہے؟" اباجان رعشہ زدہ آواز میں بولے۔

"منّا ایک دم ٹھیک ہے۔ پڑھتا ہے۔"

"وہ کہاں سے ملا؟"

"اچھی جگہ ملا۔" تھجل نے تند لہجے میں کہا۔ "آپ میری بات کا جواب دو، یہ سب بعد میں، وقت ملے تو پوچھنا۔"

"آپ کیا پوچھ رہے تھے؟"

"میں کاغذ کی بابت بول رہا تھا۔"

"مگر میرے پاس کوئی کاغذات نہیں ہیں۔"

"بڑے صاحب! نو سال سے آپ رات دن کیا کھوج رہے تھے؟ آپ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ ٹھیک ہے، آپ کے پاس وہ نہیں ہیں تو آپ ہمارے ساتھ واپس چلو۔ ابھی ہم اِدھر سے نکل سکتے ہیں۔"

"میں۔۔۔ میں ابھی یہاں سے نہیں جا سکتا۔"

"آپ کو چلے جانا چاہیے بڑے صاحب!"

"مجھے یہاں سے جانے میں کچھ عرصہ اور لگے گا۔"

"وہی میں بول رہا ہوں، آپ اس عرصے کو جہنم میں ڈالو، سب چھوڑ کے ہمارے ساتھ چلے چلو۔ ہماری بات مان لو۔ نہیں تو لاڈلے سے پوچھ لو۔ میرا نہیں تو اِس کا ہی بھروسا کر لو۔ اس کا خون سچا ہے تو یہ آپ سے بیر نہیں کرے گا۔"

"میں نے آپ سے کیا کہا ہے، میں ابھی واپس نہیں جا سکتا۔"

"کوئی بھی اتنی مدت دوڑ دھوپ کرنے اور اِدھر دُور آنے کے بعد واپسی کو تیار نہیں ہوگا۔ مجھ کو پتہ ہے، آپ بھی انکار کرتے رہو گے۔ بڑے صاحب! میں نہیں بولتا کہ آپ کے کاغذ میں جو لکھا ہے، وہ سب اُس سے بیشی نہیں ہے، اس سے بہت بیشی ہو سکتا ہے۔ پر یہ سب چکر ہے۔ آپ کو لگام پکڑنے میں اتنا وقت لگا ہے۔ لگام اب بھی چھوٹ سکتی ہے۔ آگے راستہ اتنا صاف نہیں ہوگا۔ اب تک آپ دیواروں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پر اِدھر کوئی دیوار نہیں ہے۔ واپسی کا راستہ مشکل ہے۔ کہیں پیر اُلٹ ہو گیا تو دوبارہ جمانے کا موقع نہیں ملے گا اور اُٹھانے والا بھی اِدھر کوئی نہیں ہوگا۔ تھوڑے کہے کو بہت جانو۔"

"جناب! میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ ازراہِ کرم اس سلسلے میں کوئی دخل مت دیجیے۔ آپ کے بقول میں نے اتنی تگ و دو کی ہے تو یوں ہی نہیں کی ہوگی۔ میں یہاں تک آ کے پیچھے نہیں جا سکتا، ازراہِ مہربانی مجھے معذور سمجھیے۔"

"لیکن بڑے صاحب! ہم تو معذور نہیں ہیں۔"

"میں نے درخواست کی ہے۔"

"وہ دوڑ دھوپ اور تھی بڑے صاحب، یہ اور ہے۔ مجھ کو بیچ میں بولنا نہیں چاہیے۔ پر ساری زندگی اپنا کام یہی رہا ہے۔"

"دیکھیے، مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔"

"آپ ہم کو نہیں جانتے ہو۔ آپ کو ہمارے کہنے پر شک ہے نا۔ بابر کے گلا پڑا ہے۔ اس کے پاس جاتو بھی ہے تمنچا بھی۔ دونوں کو چلانا بھی آتا ہے۔ میں اس کو دکھا کے آپ سے کچھ مانگنے نہیں آیا ہوں۔ پیسہ اپنے کو بھی اچھا لگتا ہے، پر اپنے سے زیادہ نہیں۔ آپ کے پاس پیسہ ہوگا، اپنا کچھ نہیں بگڑے گا۔ پر ہم کو یقین ہو کہ آپ کا بھی کچھ نہیں بگڑے گا تو ہم اِدھر سے چلے جائیں گے۔"

"میرے ذہن میں بدگمانی نہیں ہے۔ جانا نہ جانا آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔" اباجان نے ترش روئی سے کہا۔ "آپ کا یہاں آنے سے صرف ایک ہی مقصد تھا۔ یہ مجھے افسوس ہے اور میرے پاس لفظ نہیں کہ بابر کے سلسلے میں آپ سے کچھ کہہ سکوں۔ میرے لیے یہ کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ میں مجبور ہوں، لوٹ نہیں سکتا۔ جتنا آپ اصرار کریں گے، مجھے شرمندگی ہوگی۔ میرا یہاں کچھ بگڑ جائے گا تو اس کا سزاوار میں خود ہوں گا۔ اگر اب بھی آپ کے دل میں ہے کہ میرے پاس کوئی کاغذات ہیں تو ایسا نہیں ہے۔ میں اتنی بڑی غلطی نہیں کر سکتا تھا کہ انھیں اپنے ساتھ لاتا۔"

"مجھ کو ایسا ہی لگتا ہے۔ ایسا ہے تو بہت اچھا ہے بڑے صاحب!"

"یہی سمجھیے۔"

"آپ بولتے ہو تو یہی سمجھ لیتے ہیں۔ پر آپ سے ایک بات اور پوچھنا ہے کہ آپ یہاں آ کے کتنا آگے بڑھے ہو؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"بڑے صاحب! ہم اِدھر آ کے اور جان بوجھ کے آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم کو کچھ نہیں، صرف آپ کی ضرورت ہے۔ ہم کو بولو کہ آپ کے راستے میں ابھی کیا روڑا ہے۔ آپ کو بول دینا چاہیے۔"

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔" اباجان جھجکتے ہوئے بولے۔ "اگر آپ کی مراد میری مدد سے ہے تو مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔"

"آپ پوری بات نہیں سمجھ رہے ہو بڑے صاحب! اتنی باتیں سُن کے بھی اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو۔ ہم بولتے ہیں کہ ہم حصّہ لینے نہیں آئے ہیں، جاننے کا حصّہ۔ جو جان گیا ہے، اُسے آپ نہیں روک سکتے ہو، نہ اُس کا بھیجا پھیر سکتے ہو۔ پر وہ خود ہی آپ سے کچھ نہیں بول رہا ہے۔ معاملے کی بات ہوتی تو اتنی دیر نہ لگتی۔ آپ کے پاس کاغذ نہیں ہیں۔ پر آپ تو اِدھر ہو اور آپ ہی بتاؤ، یہ جانتے ہوئے کہ کوئی اور بھی اِدھر آ گیا ہے۔ آپ آگے ٹھیک کام کر سکتے ہو؟ وہ چاہے تو آپ۔۔۔ آپ۔"

"تھجل بھائی!" میں نے پہلی بار زبان کھولی۔ تھجل کی آواز میں لکنت آ گئی تھی۔ مجھے اُس کی آواز کی خوب پہچان تھی۔

"لاڈلے! تُو چپ رہ، مجھ کو بولنے دے۔"

"اباجان۔" میں نے اُن کے پیر پکڑ لیے۔ "تھجل بھائی کے متعلق غلط مت سمجھیے۔"

اباجان کے پیر اس سردی میں پسینے سے بھیگے ہوئے تھے۔

"لیکن کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھ سے کچھ حاصل ہو جائے گا؟" وہ بھینچے

ہوئے لہجے میں بولے۔

"پر آپ کو بھی کچھ نہیں حاصل ہوگا، کسی کو بھی نہیں ہوگا۔"

"تو آپ کوئی معاملہ کرنا چاہتے ہیں؟" اباجان نے زیرِ خند لہجے کہا۔

"نہیں بڑے صاحب! ہم نے پہلے منع کر دیا ہے۔"

"یعنی آپ صرف....."

"جی بڑے صاحب! اپنے کو اندھی کل کی فکر نہیں ہوتی۔"

"میں آپ کو نہیں جانتا۔"

"بابر کے ہوتے ہوئے ایسا مت بولو، یہ سب جانتا ہے۔"

"لیکن میں.... میں" اباجان کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

"تجھل بھائی سب آپ کی بہتری کے لیے کہہ رہے ہیں" میں ہاتھ جوڑ کے اُن سے فریاد کی۔ "آپ ہمارے ساتھ لوٹ چلیے۔ یہاں قدم قدم پر خطرہ ہے۔ آپ کو اب کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، ں اب کبھی آپ کے پاس سے نہیں جاؤں گا۔"

"بیرو!" اباجان میرے سر پہ اضطراری انداز میں ہاتھ پھیرنے لے۔ "بیرو! میں جلد ہی واپس آجاؤں گا۔ تجھے دیکھنے اور ملنے کی خبر ننے کے بعد ایک لمحے کے لیے میرا دل یہاں نہیں لگے گا مگر تُو مجھتا نہیں ہے، میں تجھ سے کیا کہوں، بس اتنا جان لے کہ واپسی میرے ختیار میں نہیں ہے۔ اتنی دُور آ کے میں اب واپس نہیں ہو سکتا۔ یری منزل قریب ہے، بہت قریب اور کوئی تصور نہیں کر سکتا کہ ہ سب کیا ہے۔"

"لاڈلے! تو اِدھر سے چلا جا۔ میں خود ہی بڑے صاحب سے ت کرلوں گا۔ ابھی ذرا وقت ہے۔ باہر رہ کے میرا انتظار کر۔ اُدھر ولم بھی کھلے میں کھڑے کھڑے جم گیا ہوگا۔"

"تجھل بھائی!" میں نے اُس سے التجا کی۔

"جا لاڈلے! تو جا، بڑے صاحب تیرے ہی باوا ہیں۔ مجھ کو پتہ تھا، ن سے اتنی ہی باتیں بولنی پڑیں گی اور بار بار۔ ایک بار اور سہی رے۔ بڑے ماحب نے دل ٹھنڈا نہیں کیا۔ ہم لوٹنے کو بول رہے ہیں۔ کاغذ وہ اُدھر ا کے جلادیں۔ جا، میں آتا ہوں۔"

یری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ تجھل کی بات مان لوں یا وہیں یٹھا رہوں۔ میرا وہاں سے نہ اُٹھنے کو جی چاہتا تھا، نہ بیٹھنے کو۔ میں وہیں بیٹھا رہا تو تجھل نے میرا کندھا پکڑ کے مجھے اباجان کے پہلو سے جدا کر دیا۔ پھر میں نے مُڑ کے نہیں دیکھا۔

سُولم باہر سردی سے کپکپا رہا تھا۔

صبح ہونے میں بس کچھ دیر جاتی تھی کہ تجھل ہمیں کٹیا کے دروازے پر کھلا ہوا دکھائی دیا۔ ہم تینوں ٹپکتے ہوئے ہال میں اپنے بستروں پر آ کے دراز ہو گئے۔ مجھے اُس سے اباجان کے متعلق پوچھنے کی بے کلی تھی لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ تجھل کا چہرہ بھی اس طرح اندھیرے میں چھپا ہوا تھا کہ کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ "سب ٹھیک ہے لاڈلے!" کچھ توقف کے بعد جب بستر میں کسی قدر گرمی ہوگئی تو اُس نے میری گردن میں ہاتھ ڈال کے کہا۔

"کیا وہ تیار ہو گئے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"کیا بولیں رے۔" وہ پژمردگی سے بولا۔

"بتاؤ نا مجھے۔"

"دیوتیں کے آگے اپنا چاتو بھی سالا کُٹنے لگتا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"وہ بھی تو ایک دیوی کے جیل خانے میں ہے۔"

"کیسی دیوی؟"

"تیری طرح ایک دیوی کے۔"

میں سمجھ گیا کہ اُس کی مراد کیا ہے۔ "یعنی وہ تیار نہیں ہوئے!"

"ہو بھی گئے، نہیں بھی۔"

"کیا مطلب؟"

"ابھی کل دیکھیں گے۔"

"مگر ہم روز تو یہاں نہیں آسکتے۔"

"آنا ہی ہوگا لاڈلے!" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

تھوڑی ہی دیر میں اندھیرا چھٹنے لگا۔ ہم بے نیند وہیں پڑے رہے۔ سرائے میں لوگوں کی آمد و رفت کی گونج ہمارے کانوں میں بڑھنے لگی تو ہم نے بستر چھوڑ دیا۔ بہت سے بھکشو ہال میں موجود تھے اور کچھ لوگ انھیں چائے پلا رہے تھے۔ ہم بھی جا کے اُنھی میں شامل ہو گئے۔ ہلکا پھلکا ناشتہ چائے کے ساتھ تھا۔ ہم نے بھنے ہوئے گندم کی چند پھنکیاں لی ہوں گی کہ اباجان ہال میں آتے نظر آئے اور ہمیں دیکھ کے ٹھٹک سے گئے مگر کسی تاخیر کے بغیر آگے بڑھ کے بھکشوؤں کی قطار میں بیٹھ گئے۔ انھوں نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ چائے پیتے ہی تجھل نے وہاں سے چلنے میں جلدی کی۔ اباجان وہیں بیٹھے رہے۔ مندروں کے علاقے سے نیچے بستی میں آتے ہوئے دھوپ کے چھینٹے پہاڑیوں پر پڑنے لگے تھے۔ رات کے مقابلے میں ہماری رفتار تیز تھی اور پھر نیچائی بھی تھی۔

چن وسا نے ہم سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اُسے معلوم ہوگا کہ کل شام جس وقت ہم اُوپر جا رہے تھے، رات کو ہماری واپسی ممکن نہیں تھی لیکن جامو اور مارٹی بے چینی سے ہمارے منتظر تھے۔ سلطان بھی اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا ہوا تھا اور چپ چپ سا تھا۔ اُس دن بھی دوپہر تک ہم سب بازار میں مال سجائے بیٹھے رہے اور تجھل نے پہلی مرتبہ بستی کے بعض دکان داروں سے اپنی لائی ہوئی چیزیں انھیں دکھا کے ہندوستان سے اُن کی مستقل رسد کے متعلق بات چیت کی۔ اسی اثنا میں سردار کے مکان سے ہمارا بلاوا آگیا۔

اپنے خاص کمرے کے بجائے سردار مکان کے باہر ہی ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ فوراً اندر لے گیا۔ سلطان بھی ہمارے ساتھ تھا۔ کل کی نسبت سردار آج کچھ زیادہ مضطرب نظر آتا تھا۔ آج بھی اُس نے ہمارے آگے پھلوں اور کھانوں سے بھری ہوئی چینی کی پلیٹوں کا انبار لگا دیا لیکن اُس کا مقصد بہت واضح تھا۔ وہ تجھل کی زبان سے کچھ اور سننے، کچھ اور جاننے کی جستجو میں تھا۔ لوٹ پھیر کے وہ اُس سے کاغذات ہی کا ذکر کرنے لگتا۔ جیسے کل کی تجھل کی کہی ہوئی باتوں سے اُس کا اعتبار اُٹھ گیا ہو اور وہ دوبارہ اپنے سُنے ہوئے کی توثیق چاہتا ہو۔ تجھل نے نہ کوئی تردید کی، نہ اضافہ کیا۔ اُس نے اپنی گزشتہ روز کی گفتگو کے اعادے کے سوا کچھ نہیں کہا لیکن شاید تجھل کا لہجہ آج اتنا بے ساختہ اور برجستہ نہیں تھا کہ سردار کی تسلی ہو سکے۔ وہ کچھ اور متفکر سا ہو گیا۔ تجھل سے تحمل کی تلقین سن کے اُس کی کنپٹیاں انگارا ہو گئی تھیں۔ شام تک اُس نے ہمیں اپنے مکان سے جانے نہیں دیا۔

ایک دن اور گزر رہا تھا۔ پیروا اور دوسرے لوگوں کا اب تک کوئی پتہ نہ تھا۔ تجھل کو یہی اُلجھن ہوگی، اسی لیے وہ سردار سے ٹھیک طرح بات نہیں کر سکا۔ سورج غروب ہونے پر جب اُس نے جامو، سلطان اور مارٹی کو وہیں چھوڑ کے پھر اُوپر جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو جامو بہت مشکل سے آمادہ ہوا۔ "اپن کو بھی ساتھ لے چلو کِنگ!" جامو کے ساتھ مارٹی بھی مچلنے لگا۔

"دو تین راتیں اور کاٹ لے ماسٹر!"

"تم بولو تو ہزار راتیں کاٹ دے۔" مارٹی نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "پر ادھر سالا ایک دم قبر کے مانک ہے۔ اُلو بھی نہیں بولتا۔ راجا جانی کو ادھر ہی چھوڑ دو کِنگ!" اُس نے تجھل سے التجائی لہجے میں کہا۔

"راجا کا اُوپر کام ہے رے۔" تجھل اُسے چمٹاتے ہوئے بولا۔ "قبر کا نقشہ پہلے ہی پتہ چل جائے تو اچھا ہے۔ ماسٹر! نکال دے ایک اور رات۔"

مارٹی ہنسنے لگا۔ "ادھر پڑے پڑے چاتو بھی کُھٹل ہو جائیں گا۔ اپن سوچتا ہے ان کو سردی مار گیا تو....."

"چاتو دوسرے بن جائیں گے ماسٹر! ہاتھ کُھٹل مت ہونے دینا۔"

"ہاتھوں میں اب کھجلی ہو رہی ہے اُستاد!" جامو منہ بنا کے بولا۔

"اچھا ہی شگون ہے رے، بڑھنے دے۔"

ہم نے کئی مفلر گلے میں ڈال لیے تھے اور اُوور کوٹ بھی پہن لیے تھے۔ تینوں کے پاس بیٹریاں اور بھرے ہوئے تمنچے تھے۔ چلتے وقت بوڑھا چن وسا بالکل خاموش رہا تھا۔ تجھل نے بھی اُس سے زیادہ بات نہیں کی، نیچے ہی اندھیرا ہو چلا تھا۔ راستے میں ہمیں کل کے مقابلے میں زیادہ مشکل پیش آئی مگر آج بارش نہیں تھی، آسمان بھی صاف تھا۔ ہم خاصی دیر سے اُوپر پہنچے اور جیسے ہی ہم نے گوتم بدھ کی بڑی مورتی کے اطراف ہموار زمین پر قدم رکھے، ہمیں مشعلوں کی روشنی میں بستی کے چند باشندے وہاں گھومتے نظر آئے۔ بڑے مندر میں بھی وہ موجود تھے۔ رات کا کھانا ہم نے بڑے مندر ہی میں کھایا۔ ہم نے اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ ہمارے اُٹھنے پر وہ وہیں بیٹھے رہے ہیں لیکن باہر کچھ ہی فاصلے پر اور لوگ موجود تھے۔ بڑے مندر سے قریب دو تین ہی مندروں میں جا کے ہمیں اندازہ ہو گیا کہ اُن کی تعداد کم نہیں ہے، اس کے باوجود کل کی طرح ہم ایک مندر سے دوسرے مندر میں جاتے رہے۔ ہم نے بعض مندروں میں دانستہ دیر بھی لگائی اور گوتم بدھ کی مورتی کے سامنے ساکت و جامد بیٹھے رہے لیکن جیسے ہی ہم عمارت سے باہر نکلتے، نزدیک و دُور وہ کہیں نہ کہیں نظر آجاتے۔ ایک مندر سے دوسرے مندر کے درمیان جہاں فاصلہ زیادہ تھا اور جہاں وسط میں مشعلوں کی روشنی نہیں پہنچ پا رہی تھی، وہاں گہرا اندھیرا تھا۔ انھیں آزمانے کے لیے ہم ایک ایسی ہی جگہ اندھیرے میں لپٹے خاموش کھڑے رہے مگر جلد ہی اُن کی چاپیں ہمیں اپنے قریب آتی سنائی دینے لگیں۔ نتیجتہً ہم آگے بڑھ کے روشنی میں آ گئے۔ وہ غالباً سارے علاقے میں بکھرے ہوئے تھے اور وہ کوئی ایک گروہ نہیں تھا، کئی تھے۔ اُن کا طور طریق گلیوں میں گشت کرنے والے سپاہیوں جیسا تھا، تاہم نہ وہ ہمارے قریب آئے، نہ اُنھوں نے ہم سے کوئی بازپرس کی۔ جب تک دوسرا گروہ انھیں نظر نہ آجاتا، پہلا ہم سے دُور دُور منڈلاتا رہتا پھر واپس ہو جاتا۔ سرائے تک جانا مشکل نہیں تھا لیکن ایسی صورت میں اباجان سے ملنا ممکن نہیں تھا۔ سرائے میں بھی وہ موجود ہوں گے۔ تجھل پھر ایک مندر میں جم کے بیٹھ گیا۔ ہمیں گزشتہ روز کا تجربہ تھا کہ رات گئے مندر میں جلنے والی مشعلوں کی روشنیاں کم ہونے لگتی ہیں۔ اس وقت سردی بھی تیز ہو جاتی ہے اور دھند بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ دوسری بات تھی کہ وہ اپنے ساتھ روشنی لے کے چلیں مگر ایسا ہوتا تو ہمارے لیے آسانی تھی کہ اُن کی نقل و حرکت ہماری نظروں میں آتی رہتی۔ میری توقع کے خلاف تجھل مندر میں زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ اچانک ہی وہ چل پڑا۔ مندر کے باہر کچھ ہی دُور دھند میں اُن کے سائے رینگ رہے تھے لیکن جس حد تک وہ ہمیں نظر آ رہے تھے، ہمیں بھی وہ اسی حد تک دیکھ سکتے تھے۔ تجھل نے اُن کی موجودی کا خیال نہیں کیا اور اُن کے پاس سے گزرتا ہوا ایک طرف بڑھتا رہا۔ وہ سرائے سے بھی آگے نکل گیا۔ راستے میں کئی ایسی پہاڑیاں اور جھنڈ پڑتے تھے جہاں ہم چھپ کے کسی مناسب وقت باہر آ جاتے مگر تجھل چلتا رہا اور کسی قدر نشیب میں جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان واقع ایک دیو ہیکل عمارت کے سامنے آ کے رُک گیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا، ہم اِس طرف پہلے نہیں آئے تھے۔ یہ جگہ بڑے مندر سے دُور تھی لیکن مندروں کے دُور دراز تک پھیلے ہوئے سلسلے ہی سے تعلق رکھتی تھی اور ہموار نہیں تھی۔ گھنے درخت، تنگ پگ ڈنڈیاں اور اِرد گِرد اُونچی نیچی زمین، ٹیلے اور پہاڑیاں۔ وہ ایک قدیم عمارت تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ یہاں کیوں نہیں ہیں مگر سامنے عمارت کے بیرونی حصے میں سیڑھیوں کے پاس ایک مختصر الاؤ روشن کیے

وہ ہمیں دکھائی دے گئے۔ اُن کی تعداد چار سے زیادہ نہیں تھی۔ ہماری آمد کی آہٹ پا کے وہ چوکنے سے ہو گئے۔ ہم انھیں نظرانداز کرتے ہوئے عمارت میں داخل ہو گئے اور اندر جا کے پتہ چلا کہ وہ ایک وسیع عمارت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے نشیبی محلِ وقوع اور دوسری وسیع و عریض عمارتیں بن جانے کے سبب سے اُس کی حیثیت وہ نہیں رہی جو کبھی ہو گی۔ شروع کے تین چار گزرگاہ والے کمروں کے بعد ایک گول کمرے میں صرف ایک مشعل روشن تھی۔ بیچ میں گوتم بدھ کی ہشت پہلو مورتی تھی جو ایک بڑی چٹان تراش کے بنائی گئی تھی۔ اُس کی نسبت سے کمرہ بھی بڑا تھا۔ مورتی کے آگے ستونوں کی آٹھ قطاریں دیوار تک مثلث بناتی ہوئی پھیلتی گئی تھیں۔ چٹان میں قریب قریب ایک جیسی آٹھ شبیہیں کندہ تھیں تاکہ ستونوں کے ہر مثلث میں بیٹھنے والوں کے لیے گوتم بدھ کا چہرہ سامنے رہے۔ دیوار بھی مورتیوں سے منقش تھی۔ چار سمتوں میں چار دروازے تھے اور باہر سے اندر بڑے کمرے میں جانے کے لیے راستہ گلی کی شکل کا تھا۔ گلی میں دونوں طرف کمروں کے دروازے تھے۔ یقیناً وہاں بھی مورتیاں ہوں گی لیکن وہ سب بند تھے۔ صرف درمیان کا کمرہ کھلا ہوا تھا جس میں ہم داخل ہوئے تھے۔ ساری عمارت پر ایک ہیبت سی طاری تھی۔

باہر الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے بستی کے آدمی ہمارے پیچھے نہیں آئے۔ کمرے میں اِدھر اُدھر مختلف جگہوں پر گنتی کے چند ہی بھکشو موجود تھے اور انھیں جیسے اپنے آپ کا ہوش نہیں تھا۔ سب آنکھیں بند کیے بے جنبش، جسم باندھے اپنی مخصوص نشست میں کہیں کھوئے ہوئے تھے۔ شاید اُن کی سانس بھی نہیں چل رہی تھی۔ دروازے سے دوسری ستون کی قطار میں اباجان کو دیکھ کے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ بجھل نے بھی انھیں دیکھ لیا تھا۔ سُولم کو دروازے پر رُکنے کا اشارہ کر کے وہ دیوار کے ساتھ کھسکتا ہوا اباجان کے پاس پہنچ گیا۔ اباجان کے سر میں ایک خفیف سی جنبش ہوئی۔ انھوں نے ایک پھسلتی نگاہ سے ہمیں دیکھا ہو گا۔ بجھل اُن کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اباجان اُٹھنا ہی چاہتے تھے کہ اُس نے اُن کی کمر پہ ہاتھ رکھ کے انھیں روک دیا اور اُن کے کانوں میں سرگوشی کی "ابھی نہیں، پھر کسی ٹائم، یہیں۔"

اباجان نے ہنکاری بھری اور آہستگی سے سر ہلایا۔

"ہم لوٹ رہے ہیں، آپ اپنا کام کرو۔" اِن چند لفظوں کے سوا بجھل نے اُن سے کچھ نہیں کہا اور فوراً وہاں سے ہٹ کے ستونوں کی ایک اور قطار میں چپ چاپ دوزانو ہو گیا۔ جب تک ہم وہاں رہے، اباجان نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی اور ہم نے زیادہ وقت نہیں لگایا۔ باہر موجود لوگوں کے بیچ میں ہوتے ہوئے کسی اور مندر کا رُخ کرنے کے بجائے ہم سیدھے سرائے میں آ گئے۔ اُس رات ہمیں بستر ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی اور اُس رات ہم ہال میں تنہا نہیں تھے، اور بھی

کئی آدمی ہمارے ساتھ رات کاٹ رہے تھے۔ پتہ نہیں وہ کب تک جاگتے رہے۔ بجھل اور سُولم کو بستر پہ کمر ٹکاتے ہی نیند آ گئی اور میری آنکھیں بھی کسی وقت بند ہو گئیں۔ سویرے بھکشو ناشتہ کر کے سرائے سے جا چکے تھے اور خوب اُجالا ہو چکا تھا کہ سرائے کے کسی پجاری نے ہمارے بالیں آ کے آہستگی سے پکارنا شروع کیا، تب ہم اپنے حواس میں آئے۔ سرائے سے نکلنے کے بعد بجھل نے واپسی میں کوئی عجلت نہیں کی۔ وہ یوں ہی تا دیر بڑے مندر میں گشت کرتا رہا اور رات کی طرح بستی کے آدمی مندر کے علاقے میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔

اندازاً دن کے گیارہ بارہ بجے ہوں گے، کہیں درختوں پر دھوپ کھل رہی تھی، کہیں ابر چھایا ہوا تھا۔ چن وسا کے مکان کی چار دیواری کے باہر ایک ٹیلے پر جامو، مارٹی اور سلطان سر جھکائے بیٹھے تھے، ہمیں دیکھتے ہی اُن کے جسم پھڑکنے لگے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے وہ بھاگتے ہوئے خود ہمارے پاس آ گئے۔ میری طرح بجھل نے بھی یہی سمجھا ہو گا کہ پیر دِا آ گیا ہے اور وہ اس کی خبر سنانے کے لیے مضطرب ہیں لیکن اُن کے پاس ایسی کوئی خبر نہیں تھی۔ بستی میں ہمیں آئے ہوئے یہ آٹھواں دن تھا۔ جامو شکایت کرنے لگا کہ ہم نے اتنی دیر کیوں لگا دی۔ تینوں کہہ رہے تھے کہ رات بھر انھیں ایک پل کے لیے نیند نہیں آئی۔ وہ ہمارا کچھ اور انتظار کرتے، پھر انھوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ تینوں سردار کے مکان کا رُخ کریں گے۔ "مجھ سے پوچھے بنا ایسا مت کیجو رے۔" بجھل نے اُسے سختی سے تاکید کی۔

"تم نے بولا تھا کہ سویرے جلد آ جاؤ گے۔" جامو ناراضی سے بولا۔

"جامو استاد! تیرا جی نہیں اٹک رہا ہے تو تو لوٹ جا۔"

"یہ تم سے کون حرامی کہہ رہا ہے۔"

"پھر منہ ٹیڑھا کیوں کرتا ہے۔ اُدھر اُدھر اپنی اماں کو رُلے نہیں مٹکا رہی ہے۔" بجھل اپنا منہ کھسوٹنے لگا۔

جامو نے منہ پھیر لیا۔ ہم اندر مکان میں نہیں گئے۔ قلیوں کے ساتھ سلطان اندر جا کے سامان باہر لے آیا۔ ابھی بستی کے چوک میں ہم نے ٹرنک کھولے ہی تھے کہ دو مسلح آدمی ہمارے سروں پہ آ کے کھڑے ہو گئے۔ وہ سردار کا پیغام لائے تھے۔ بجھل نے دوپہر بعد آنے کا وعدہ کر کے انھیں لوٹانا چاہا لیکن انھوں نے اصرار کیا کہ سردار نے ہمیں فوراً حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔ ہم نے سامان ٹرنکوں میں واپس رکھ دیا اور قلیوں کے سپرد کر کے چوک سے اُٹھ گئے۔

آدھ گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم سردار کے سامنے تھے۔ وہ ایک لمبے چوڑے کمرے میں بستی کے مختلف عمر کے لوگوں کے ساتھ پتھر کے ایک اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ وہ کمرہ نہیں تھا جہاں وہ گزشتہ دو دنوں تک ہم سے ملتا رہا تھا۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی تمام رنگ رنگ کمرے سے چلے گئے اور صرف وہی رہ گئے جو دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے مستعد کھڑے

...ستی میں پندرہ سے کم نہیں تھے۔ ہم سب نے سردار کو قبیلے کے ...مطابق سلام کیا۔ خلافِ توقع اُس نے ہم سے بیٹھنے کو نہیں ...ں تک وہ ہم پر نگاہیں جمائے کچھ سوچتا رہا۔ اُس کا ایک پیر ...ل رہا تھا۔ کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ ہم سے بات کرنے ...وہ اپنی آواز اور لہجہ متعین کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

...م کو کیوں بلایا ہے؟" بجھل ہی نے پہل کی۔

...ردار کو زبان کھولنے میں جھجک ہوئی۔ "ہم نے تمھیں ایک بات ...کے لیے بلایا ہے۔" وہ تھمی ہوئی آواز میں بولا۔

...م نے ہر بات بول دی تھی۔"

...م نے سب کچھ کہہ دیا تھا لیکن یہ نہیں بتایا کہ اگر تم مقررہ مدت ...ں دستاویز ہمارے سپرد کرنے میں ناکام ہو گئے تو ہم تمھارے ساتھ ...کریں۔"

...بھی ہم نے بول دیا تھا۔" بجھل نے اُونچی آواز میں کہا۔ ترجمہ کرتے ...ی زبان رُکنے لگی۔ "تم کو یاد نہیں رہا۔ ہم نے بول دیا تھا کہ اگر ...گئے تو ناکامی ہماری اپنی ہو گی، تمھاری نہیں۔ تم نو سال سے ...ہے ہو۔"

...ہیں یاد ہے لیکن ایسی صورت میں جب ہمیں یہ شبہ ہو چلا ہے ...ے میں ضرور کچھ جانتے ہو، ہم دستاویز کی اہمیت کے پیشِ نظر ...روایت کے مطابق تم پر کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں چونکہ ...بیلے میں ہو۔"

...یا ہے تو ہم اِدھر سے چلے جاتے ہیں۔ پر ہم کوئی جبر ظلم قبول نہیں ...؛ بجھل نے تیزی سے کہا۔

...ں جب ہم تم کو جانے دیں تب..."

...ردار!" بجھل کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ "تم اپنے لیے بُرا کرو گے تم ...یا تو سدا کے لیے اپنی چیز نہیں پاؤ گے۔"

...تمھیں نہیں کھوئیں گے، تمھیں اِدھر ہی رکھیں گے، تمھیں یا ...وں کو۔ جب تک ہماری امانت ہمارے حوالے نہیں کر دی ...م تمھارے آدمی تمھارے حوالے نہیں کریں گے۔"

...ایسا کرو گے تو ہم سمجھیں گے، تم سودا کرنا نہیں مانگتے۔ تم کو کاغذ ...نہیں اور دوسرے سرداروں کی طرح تم نے بھی اپنی موت کا ...یا ہے۔"

...تو یہ ہے کہ تم اپنے آدھے آدمی ہمارے پاس امانت کے طور پہ ...انھیں اپنا مہمان رکھیں گے۔ کہو منظور ہے؟" سردار کی آواز ...رنجنے لگی۔

...چھ منظور نہیں۔"

...تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم ہماری زمین پر ہو۔"

"اور تم کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس زمین کی نکیل ہمارے ہاتھ میں ہے۔ سردار! ہم کو زیادہ بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔ ایسا ویسا کوئی ٹنٹا مت کھڑا کرنا۔ ہم نے بولا تھا، ہم کو آگے پیچھے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پیچھے چلے جائیں گے تو دنیا اُلٹی نہیں چلنے لگے گی۔ تم ایسا نہیں کر سکتے ہو۔ ہم کو نہیں لگتا، تمھارا سر اُوپر سے بس دیکھنے کا ہے اور تم اپنے آپ سے اتنے بگڑے ہوئے ہو، تم نے اپنے سر کو ہلایا چلایا نہیں ہے۔ تم کو ہم نے کھل کے بول دیا تھا کہ بیچ میں روڑا اٹکاؤ گے تو ہماری طرف سے بات ختم سمجھنا۔"

"اُلٹی سیدھی باتیں مت کرو۔ ہم یہ سودا اور پختہ کرنا چاہتے ہیں، ضمانت کے لیے تم اپنے تین آدمی ہمارے حوالے کر دو۔ ہم تمھارے درمیان پھر کوئی دخل نہیں دیں گے۔ تمھارا انتظار کریں گے۔"

"اب انتظار چھوڑ دو سردار!"

"کیا تمھیں ہماری شرط منظور نہیں؟"

"تم اپنے کانوں کی صفائی کراؤ۔"

"تم... تم ہماری پناہ میں ہو۔" سردار نے گرج کے کہا۔

"جب تک ہم اِدھر ہیں، اپنے کو تمھارا مہمان سمجھتے ہیں۔"

"لیکن یہ ہماری مرضی پر منحصر ہے۔"

"تو تم اپنی مرضی پوری کرو۔"

"ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے تمھارے درمیان کوئی دراڑ پیدا ہو، تمھارے آدمی یہاں محفوظ رہیں گے۔"

"دراڑ تم خود ڈال رہے ہو۔ اپنا کوئی آدمی اِدھر نہیں رہے گا۔"

"کیا تم نہیں جانتے کہ ہم تمھیں مجبور کر سکتے ہیں؟"

"ہاں، پر ہم مجبور ہوں، تب۔"

"تمھیں سوچنے کا وقت دیا جا سکتا ہے۔"

"ہم نے سب سوچ کے بولا ہے۔"

"ہم نہیں چاہتے کہ اپنے آدمیوں کو حکم دیں۔"

"ہم بھی نہیں چاہتے کہ تم یہ غلطی کرو۔" بجھل دبے لہجے میں بولا۔

لیکن سردار نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ کمرے میں نیزا بردار آدمیوں کی موجودی بے سبب نہیں تھی۔ وہ سردار اور بجھل کے درمیان ہونے والی گفتگو غور سے سن رہے تھے اور ہم نے آتے ہی دیکھ لیا تھا کہ اُن کے ہاتھوں میں نیزے ہیں اور کمر سے بندھی ہوئی پیٹیوں میں خنجر اُڑسے ہوئے ہیں۔ جہاں وہ کھڑے تھے، وہاں دیواروں پر تلواریں اور ڈھالیں آویزاں تھیں۔ اُن کی آنکھوں میں بھی خنجر کی سی چمک تھی اور وہ پر تولے ہوئے کھڑے تھے کہ کب سردار کا اشارہ ہو اور کب وہ آگے بڑھیں۔ دیوار کے ایک کنڈے میں لوہے کی زنجیر بھی لٹک رہی تھی۔ بہ طورِ خاص اس جگہ ہمیں طلب کرنے میں سردار کی مصلحت یہی ہو گی کہ ہم یہ

سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں حالانکہ اُس کا بدلا ہوا لہجہ ہی ہمارے لیے کافی تھا۔ اُس نے دو میں سے ایک فیصلہ کرنے کے لیے ہمیں حکم دیا تھا۔ کوئی اور گنجائش نہیں رکھی تھی۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ یہ سب محض دکھاوا ہے اور وہ اس طرح یہ حقیقت جاننے کا متلاشی ہے کہ ہم نے کس بنیاد پر اُس سے کاغذات کا ذکر کیا ہے۔ کوئی بنیاد ضرور ہوگی اُس کے کہنے کے مطابق اگر ہم اپنے تین آدمی اُس کی تحویل میں دے دیتے تو اُس کا شبہ یقین میں بدل جاتا۔ ہم اُس کے یقین کے لیے اپنے آدمیوں میں سے کسی کو بھی داؤ پر نہیں لگا سکتے تھے، نہ اُس کا یقین ہمارے لیے سود مند تھا۔ ہمارے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ بتھل کی جگہ میں ہوتا تو بھی یہی جواب دیتا اور یہ ہمارا گمان تھا کہ وہ صرف حقیقت جاننے کی جستجو میں ہے۔ اُسے یقین آچکا تھا ورنہ وہ بتھل کی بات پوری ہونے سے پہلے ہاتھ اُٹھا کے اپنے آدمیوں کو حکم نہیں دیتا۔ ابتدا میں سردار کی آواز اکھڑی ہوئی اور بکھری ہوئی سی تھی۔ رفتہ رفتہ اُس میں ٹھہراؤ آتا گیا۔ ہمیں اُس کے آدمیوں کے تیوروں سے اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ کس حد تک آگے جا سکتے ہیں۔ جیسے ہی سردار نے ہاتھ اُٹھایا، اُنھوں نے نیزوں پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ وہ اگر مستعد تھے تو ہم بھی پوری طرح محتاط تھے۔ وہاں ایک دوسرے سے کچھ کہنے کا موقع نہیں تھا۔ بتھل نے کسی کو اشارہ نہیں کیا تھا مگر ہم سب کے ہاتھ بھی اپنی جیبوں کے قریب تھے۔ اُن کے ہاتھ میں نیزے تھے لیکن اُنھیں تولنے اور ہم پہ وار کرنے کے لیے پیچھے کی جانب اُن کے پاس جگہ نہیں تھی اور ہمیں معلوم تھا کہ وہ ہم پر حملہ کرنے کے انداز میں نہیں جھپٹیں گے کیونکہ ہماری طرف سے کسی مزاحمت کا امکان اُن کے ذہن میں دُور دُور تک نہیں ہوگا، ہم نے اُنھیں اُن کی جگہ سے آگے بڑھنے دیا۔ دیوار سے ہٹتے ہی اُن کے نیزوں کی اَنیاں ہمارے سینوں کی جانب ہو گئی تھیں۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اُن کی رفتار میں تیزی نہیں تھی۔ قبیلے کے بزرگ آدمی جو ہمارے آتے وقت یہاں بیٹھے ہوئے تھے، جاتے جاتے پیچھے کا دروازہ بند کرتے گئے۔ پیچھے ہٹنے اور بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو ہمارے لیے بے کار تھا۔ ہمیں چُپ دیکھ کے سردار کے بڑھتے ہوئے آدمیوں کے قدم اور سُست ہو گئے۔ وہ یہی کر سکتے تھے کہ تین اطراف سے آکے ہم پر نیزے تان لیں اور سردار کے حکم کا انتظار کریں۔ تعداد میں وہ پندرہ تھے، ہم صرف چھ۔ اُن کے پاس نیزے تھے اور ہمیں چاقو نکالنے کی بھی مہلت نہیں تھی مگر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ نیزے ہم سے بہت قریب نہیں ہونے چاہئیں تھے، پھر ہمارے لیے حرکت کرنا مشکل ہو جاتا۔ ہمیں ایک فاصلے پر اُنھیں روک دینا چاہیے تھا اور ہم نے اُنھیں یہ فاصلہ طے کرنے دیا۔ کسی سے کچھ کہنے سننے کا سوال ہی نہیں تھا۔ جامو، سلطان، مارتی، سُولم اور میں۔ سب کی آنکھیں اور کان کُھلے ہوئے تھے۔

"سُوت کے۔" بتھل نے آہستہ سے صدا لگائی۔ ایسی ما
بتھل کی ہدایت پر عمل کرنا مشکل ہوتا تھا۔ اُن کے نیزے ہم
ڈیڑھ گز دُور تھے اور دوسرے لمحے ہمارے سینے تک پہنچ
کہ دفعتہً ہم سب نیچے بیٹھ گئے۔ اُسی لمحے بجلی کی سی تیز
نے ضرورتہً اپنی نشست تبدیل کی اور اُسی مدت میں
کے نیزے پکڑ لیے اور انھیں ایک طرف دھکیلتے ہوئے بڑ
میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک ہی نیزا آسکتا تھا لیکن نیزا
بعد ہماری جھونک اس قدر اچانک اور تیز تھی کہ قریب کھڑے
آدمی اُس کی لپیٹ میں آگئے۔ نیچے جھکتے ہی ہم نے چاقو نکال
اُوپر اُٹھتے ہوئے ایک ہاتھ سے نیزا پکڑتا تھا تو دوسرے
کی ٹانگوں پر چاقو سے لکیریں ڈالتے گئے تھے۔ کمرے میں اُن
چیخیں گونجنے لگیں۔ جیسے ہی وہ فرش پر دھاڑتے ہوئے
اُچھل کے سردار کی طرف بھاگا بس لمحے گزرے تھے۔ اُس
ابھی اپنے دیکھے ہوئے ہی پر ششدر تھیں کہ میں نے
پر پوری طاقت سے ترچھے ہو کے ہاتھ مارا۔ وہ اپنا جسم سنبھ
لڑکھڑاتا ہوا گرا ہی چاہتا تھا کہ میں نے خود اُسے سنبھال
پہلے کہ وہ خنجر نکال لیتا، میرے چاقو کی نوک اُس کی چھاتی پر

اُدھر جامو، مارتی، سلطان اور سُولم کے ہاتھوں میں
اور اُنھوں نے دوبارہ اُٹھنے کی کوشش کرنے والے آد
کے نیزوں سے زور ڈال رکھا تھا۔ کئی کی ٹانگوں اور کولھو
سے خون پھوٹ رہا تھا۔ جنھیں چاقو نہیں لگ پائے تھے
گرے ہوئے جامو، مارتی، سلطان اور سُولم کے نیزوں اور چا
دباؤ میں تیزی سے بدل جانے والی صورتِ حال کا جیسے خود
رہے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ اُن کی آنکھوں کی چمک معدوم ہوتی جا
نے اپنے سردار کو بھی دیکھ لیا تھا۔ میں نے ذرا جلدی کی، ا
سردار تک پہنچنے کا ارادہ نہ کرتا تو بتھل آجاتا۔ چند ثانیوں
اسی غرض سے سردار کی طرف جھپٹا تھا لیکن مجھے دیکھ کے
اور اُس نے اچانک ایک آدمی کی پیٹی سے خنجر نکال لیا۔ سر
میں پھڑکنے لگا تھا۔ بتھل نے خنجر زور سے سامنے کی دیوار پر
جہاں ایک عورت کی مورتی بنی ہوئی تھی۔ خنجر مورتی کی سید
جا کے گڑ گیا۔

وہ پندرہ کے پندرہ پوری طرح جامو، سلطان، مارتی
قبضے میں تھے جنھیں چاقو لگے تھے، وہ بُری طرح کراہ رہے
کے بہتے خون اور چیخنے چلانے ہی سے حواس باختہ ہو گئے
چاقو نہ کھولتے تو نیزے پکڑنے کے بعد وہ ہماری جھونک
کر لیتے لیکن اپنے ساتھیوں کی چیخیں سُن کے وہ منتشر ہو گ

سامنے یہی کچھ کیا جا سکتا تھا۔ بتھل نے ہاتھ سوت کے چلانے
ورنہ جاقو صرف لکیریں کھینچنے پر اکتفا نہ کرتے اندر تک چلے جاتے
اُن میں سے زیادہ دیر تک نہ بلبلا پاتا۔ ہاتھ کھول کے چلانے
کے چلانا مشکل ہوتا ہے۔ ایک دم نیچے بیٹھنا پھر فوراً
ہوا رکھنا اور نیزا پکڑنا، ایک ساتھ اتنے کام ہم نہ کرتے
نٹنے میں وقت لگ جاتا۔ اُن کی تعداد زیادہ ہونے کے سبب
زیادہ وقت نہیں دینا چاہیے تھا۔ جامو کا اب بھی بس نہیں چلتا
سب کو ختم کردے۔ وہ بتھل کے اشارے کا منتظر تھا۔ بتھل نے
حکم نہیں دیا۔ مورتی کی آنکھ چھوڑنے کے بعد وہ کمرے کے
کھڑا رہا۔ پھر اُس نے ٹھیری ہوئی آواز میں جامو سے کہا۔
جامو!"
جامو نے فرش پر تھوکتے ہوئے نیزے سے ہاتھ اُٹھا لیے
اور سُولم نے بھی جھٹکنے کے انداز میں نیزے سردار کے
پھینک دیے اور چند قدم پیچھے چلے آئے۔ سردار کے کسی آدمی
نہیں اُٹھایا۔ البتہ جامو، سلطان، مارتی کے ہاتھ میں چاقو
ہوئے تھے ادھر سردار اپنی زبان میں چلا چلا کے نہ جانے
اُس نے میری گرفت سے نکلنے کی کوشش ختم کردی تھی۔
تکے قدموں سے چلتا ہوا سردار کے پاس آیا اور اُس نے میرا
چھاتی سے ہٹا کے مجھے اُس سے دُور ہو جانے کی تاکید کی۔
دار کی گردن چھوڑ دی۔
چھوڑ دو سردار!" بتھل نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔" اور ان کو باہر
دو۔" بتھل بھول گیا تھا کہ سردار اُس کی زبان نہیں سمجھ سکتا تھا۔
جھجکتے دیکھ کے اُسے اس کا احساس ہوا اور اُس نے سُولم کو
کہا: "سردار کو بولو۔ اتنا ٹھیک ہے تو ہم بیٹھ جائیں۔"
سولم نے اُس کی بات سردار سے دُہرادی۔

سردار ہمیں اپنے خاص کمرے میں لے آیا تھا۔ بتھل جامو اور سلطان
سردار پر کھانے سے پہلے بستی کے معزز مہمانوں کے لیے خاص
ہوئی تھوڑی سی شراب پی لی تھی۔ سردار کی نوجوان خادمائیں
اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ پلکیں ڈھانپے ہوئے
تی تھیں جیسے اُن کی آنکھیں بند ہوں، شرمائی اور سہمی ہوئی۔
رنگ برنگے کپڑے پہنے ہوئے، گُندھی ہوئی دو چوٹیاں
ہوئی۔ جُوڑے کی جگہ بالوں میں جالی دار ٹوپی، کان سفید
بھرے ہوئے۔ تمتماتا ہوا سونے جیسا رنگ، سب کے نقش و نگار
جیسے تھے۔ عمریں بھی تقریباً سب کی یکساں تھیں۔ جاپانی
کی طرح اُن کے گالوں پر لال پھوٹی پڑتی تھی۔ جامو انھیں

گل بُجنی کہتا تھا۔ واقعی اُنھیں دیکھ کے ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے اُن کے گالوں میں تازہ تازہ چٹکی بھری ہو۔ ابھی کچھ دیر پہلے جامو بتھل سے کہہ رہا تھا۔
"اُستاد! یہ انار کی کلیاں اُدھر اپنی طرف چلی جائیں تو اُدھر کی ساری لقا کبوتریوں کا دیوالا پٹ جائے۔"

جامو نے کورا کو نہیں دیکھا تھا۔ دیکھتا تو نہ جانے اُس کا کیا حال ہوتا۔ اُس کے گالوں پر بھی ایسی ہی سُرخی پھوٹتی تھی، ان سے کہیں زیادہ۔ بتھل کی نظریں بچا کے جامو نے ایک پیالہ اور پی لیا تھا۔ اُس کی آنکھیں چڑھنے اور زبان بہکنے لگی تھی۔ سردار کی خادماؤں کو وہ طرح طرح کے خطابات دے رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے ہمیں سہ پہر ہو گئی۔ ہم رخصت ہی ہوا چاہتے تھے کہ ایک خادمہ نے لپکتے جھجکتے ہوئے اندر آکے سردار سے سرگوشی میں کچھ کہا۔ سردار کو یہ دخل اندازی بُری لگی۔ اُس نے برہمی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ خادمہ اُلٹے قدموں کمرے سے واپس چلی گئی اور اُسی وقت ایک خادم اندر داخل ہوا۔ وہ پہلا مرد تھا جو ہمارے آنے کے بعد اس کمرے میں آیا تھا۔

پتہ نہیں اُس نے کیا کہا تھا کہ سردار کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ہماری جواب طلب نگاہیں بے اختیار سُولم کے چہرے پہ مچلنے لگیں۔ وہ بھی بے چین ہو گیا تھا اور اُس کے منہ پر جیسے کوئی بات آتے آتے رہ گئی تھی۔ سردار نے چند سوال کر کے خادم کو لوٹا دیا اور بے تابانہ ہم لوگوں کو دیکھنے لگا۔

"کیا ہے سردار؟" بتھل نے پوچھا۔

"معلوم ہوا ہے کہ سوداگروں کا ایک اور قافلہ بستی میں آیا ہے۔" اُس نے کسمساتے ہوئے جواب دیا۔

سُولم کے سوا ہم سب چونک پڑے اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"کون لوگ ہیں؟" بتھل نے ہلکی آواز میں پوچھا۔

"اپنے آپ کو سوداگر کہتے ہیں، سامان بھی اُن کے ساتھ ہے۔"

"سوداگر ہیں۔" بتھل زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے بولا۔" ہو سکتا ہے، یہ وہی قافلہ ہو جو سفر میں دُور تک ہمارے سنگ رہا تھا یا کوئی اور ہو۔"

"تمھارے ساتھ؟" سردار نے تجسس سے پوچھا۔

"ہاں! پھر ایک جگہ ہم الگ ہو گئے تھے۔ چل کے دیکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے، وہی لوگ ہوں پر وہ اِدھر آنے والے نہیں تھے۔ اُن میں سے کسی کو بُلا کے دیکھو۔"

"وہ باہر کھڑے ہیں۔" سردار نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔" وہیں جا کے بات کرتے ہیں۔"

ہمارے ساتھ چلنے پر سردار نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اس لیے ہم بھی اُس کے پیچھے پیچھے باہر آگئے۔ پیرو، وزیر، متن میاں، زورا، پلٹو، جینی وزیرا اور ہلاکو۔ اُن آٹھوں کو دوبارہ دیکھنے کے لیے ہم سب جلد سے جلد اُن کے پاس پہنچ جانا چاہتے تھے لیکن کمرے سے نکلتے ہی بتھل نے سردار کو

روک لیا۔ایک بات سن لو سردار! ہم سے عجلت مت کرنا۔" وہ سپاٹ آواز میں بولا۔"اِن سے کاغذ کی کوئی بات مت بولنا۔"

سردار کی بھویں سکڑ گئیں۔ تجّل کی تاکید اُس کے لیے تعجب انگیز تھی۔

"پتہ نہیں وہ اِدھر کس بات کی کھوہ میں آئے ہیں۔" تجّل نے ترشی سے کہا۔"سمجھ گئے؟"

"کیا مطلب؟" سردار کبیدگی سے بولا۔

"مطلب صاف ہے سردار!"

"لیکن وہ۔ کیا تمھارے خیال میں وہ بھی اُن کے بارے میں کچھ جانتے ہوں گے۔" سردار کی آواز پر حیرت چھائی ہوئی تھی۔

"ہم نہیں بول سکتے، پر وہ جان سکتے ہیں۔"

"مگر کیسے؟"

"کیسے ویسے ہم سے مت پوچھو، ہم احتیاط کو بول رہے ہیں۔ وہ بھی سوداگر ہیں۔ تمھارے آدمی نو سال سے ہندوستان میں سردار رہے ہیں۔ یہ بھی ساری دُنیا گھومتے رہتے ہیں۔ ان کو بھی پتہ چل سکتا ہے۔"

"لیکن وہ یہاں کیوں آئیں گے۔" سردار اُلجھتے ہوئے بولا۔"متبرک دستاویزیں ہندوستان سے گئی ہیں۔ وہ ہندوستان میں ہوں گی۔ یا تو دستاویزیں وہاں نہیں ہیں، یہیں ہیں یا پھر وہ اُنھیں لے کے آئے ہیں اور تمھاری طرح اُن کا سودا کرنا چاہتے ہیں یا اُنھیں ہندوستان میں کسی ایسی جگہ کا پتہ ہے جہاں دستاویزیں موجود ہیں اور وہ تقین کرنا چاہتے ہیں کہ ہم اُنھیں اس کے عوض کیا کچھ دے سکتے ہیں تاکہ وہ کوئی نفع بخش تگ و دو کر سکیں۔"

سردار کو قبیلے کا سردار یوں ہی نہیں بنایا ہوگا۔ اس میں دوسروں سے زیادہ سوجھ بوجھ ہوگی۔ تجّل کے کہنے کے مطابق اگر نئے آنے والوں کو بھی کاغذات کا کوئی علم ہو سکتا ہے تو سردار کے ذہن میں اُٹھنے والے تمام سوال جائز تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ تجّل ان کا کیا جواب دے گا۔"ہم نہیں جانتے کہ کون سی بات ٹھیک ہے، پر ایک بات تم نہیں بول رہے ہو۔" تجّل نے پُرسکون لہجے میں کہا۔"وہ کسی اور وجہ سے بھی اِدھر آ سکتے ہیں۔ کاغذ کے بارے میں ان کو کچھ جان پڑا ہو، کوئی ان کو لے کے ہم دونوں سے پہلے ہی اِدھر آ گیا ہو—اور کاغذ میں کچھ اور بھی لکھا ہو۔" تجّل نے وضاحت نہیں کی کہ کاغذات میں اور کیا رمز ہو سکتی ہے۔ سردار نے اُن کا ذکر کرتے ہوئے خود بھی اس سے پہلو تہی کی تھی۔ کورا نے مجھے بتایا تھا کہ قبیلے میں چند ہی بزرگ لوگوں کو کاغذات کی متبرک حیثیت کی سوا دوسری خوبی کا علم ہے۔ اُس کا اتا لیق اچین اسے جانتا تھا۔"ہم ابھی کچھ نہیں بول سکتے۔" سردار کو متذبذب دیکھ کے تجّل نے کہا۔"یہ ہمارا خیال ہے۔ وہ ویسے بھی اِدھر آ سکتے ہیں۔ اِدھر کوئی دروازہ تو نہیں ہے اسی لیے ہم احتیاط کو کہہ رہے ہیں۔ اُن کو کچھ پتہ نہیں ہے اور پتہ چلا تو ہمارے کام میں حرجا

ہو سکتا ہے۔"

"اور اگر اُنھوں نے خود ذکر کیا؟"

"تو اگر وہ کاغذ اپنے ساتھ لائے ہیں، اُن سے لے لینا۔ ہم اپنا... اُٹھا کے چلے جائیں گے اور اگر اُنھوں نے ہماری طرح کی بات... جس سے سودا پہلے ہوا ہے اس کا تم کو دھیان رکھنا ہوگا۔ تم اُن... کرنا پر ہم کو ضرور بتانا۔ شاید تمھارا کام پھر کچھ جلدی ہو جائے... بعد بھی اگر وہ کاغذ ہم سے پہلے لے کے تمھارے پاس آ گئے تو ہم کچھ... بولیں گے، تمھیں سلام کر کے اپنا منہ کالا کر لیں گے۔ پر تم اُن سے نہیں... کے کہ ہم سے بھی بات ہوئی ہے۔ تم نے ہم کو دیکھ لیا ہے۔" ابھی... معلوم ہوتا تھا، سردار کی سمجھ میں کچھ آیا ہے، کچھ نہیں۔ وہ گو مگو... میں گردن ہلاتا رہا۔ تجّل نے اُس کی پشت پر ہاتھ رکھ کے آگے بڑھ... تلقین کی تو پیش قدمی کرتے ہوئے اُس کے پیر ہچکچانے لگے۔ ہم مکان کے... اندرونی حصے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دالان میں پہنچتے ہی ہماری نظر... پڑی۔ پیرو کے ساتھ صرف وزیر تھا اور ان کے گرد قبیلے... آدمی۔ ان دونوں کی حالت نہایت شکستہ تھی۔ داڑھیاں بڑھی... کپڑے گندے اور چہروں پر دھول سی جمی ہوئی۔ ہم نے اُنھیں اور اُ... نے ہمیں دُور سے دیکھ لیا تھا۔ دونوں کی آنکھیں ٹمٹمانے لگیں۔ "وہ... اُن کے قریب جاتے ہوئے تجّل نے سردار کا ہاتھ پکڑ کے بدبداتے کہا اور تیز قدموں سے پیرو کی طرف بڑھ گیا۔ دونوں ایک دوسرے ملنے لگے۔"تم... تم اِدھر کیسے آ گئے؟" تجّل نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

پیرو کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ اُسے کیا کہنا چاہیے... زیادہ آگے نہیں جا سکے استاد!" وہ تھکی ہوئی آواز میں بولا۔"اپنا... کئی آدمی راستے میں ہی مرنے ترٹنے لگے۔ ادھر سالا چور پہاڑی لو... ایک رات اپن سے مسخری ماری۔ ان کو تو اپن نے سمجھ لیا، پر اپنے... کو کیسے سمجھاتا۔ سب آگے پیچھے ایک دم لیٹ گیا۔ ابھی اپن کیا بو... پیرو کے گلے میں کوئی پھانس سی چبھی ہوئی تھی۔"اپن ادھر آ گیا۔" سر جھکا کے کہا۔

"ٹھیک کیا، ٹھیک کیا۔" تجّل اُس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔"ادھر قبیلے کے لوگوں کے پاس گرمی بہت ہے۔ یہ تمھارے... قبیلے کا سردار اشی گا ہے۔"

پیرو نے گردن خم کر کے اُسے تعظیم دی۔"اپن لوگ ابھی ادھر... رہنا مانگتے ہیں سردار! اپن کا کئی آدمی سیدھا نہیں ہے۔"

سُولم نے پیرو کی ترجمانی کے فرائض انجام دیے۔

سردار نے انکار نہیں کیا اور مزید کوئی پوچھ گچھ کیے بغیر... ایک معمر آدمی کو بُلا کے پیرو اور اُس کے ساتھیوں کی دیکھ بھال...

...وہ معمر شخص چن وسا نہیں تھا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہمارے... نہیں رہیں گے، رہ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ آٹھ تھے اور چن وسا کا گھر... نہیں تھا۔ پیرو نے سردار کی اس مہربانی کے عوض اُسے کچھ سامان کی... پیش کرنی چاہی۔ سردار نے توجہ نہیں دی۔ وہ گہری نظروں سے مسلسل... دیکھتا رہا۔

"باقی سب کدھر ہیں؟" تجّل نے کہنی مار کے پیرو سے پوچھا۔

"ایک کم ہو گیا ہے اُستاد!" پیرو نے دبی زبان سے کہا۔

ایسا لگا جیسے کوئی بہت زور سے میرے کانوں میں چیخا ہو یا جیسے... نے بہت اُوپر سے مجھے دھکا دے دیا ہو۔ تجّل کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی... رہ گئیں۔"ایک کم ہو گیا ہے۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔"نہیں... کیسے ہو دادا؟"

"اپن نے بہت روکا، پر راضی نہیں ہوا، چلا گیا۔"

"کون.... کون؟" تجّل نے وحشت سے پوچھا۔

پیرو ہونٹ چبانے لگا۔"اپن کا متّن میاں۔"

"متّن میاں؟" جامو ہانپتے ہوئے بولا۔"نہیں دادا!"

"ہاں۔" پیرو کی آواز بھرّا گئی۔

جامو نے اپنا سر پکڑ لیا۔ تجّل، مارتی، سُولم، سلطان سبھی کی آنکھیں... بھی گئی تھیں۔ چند لمحوں تک ہمیں بالکل احساس نہیں رہا کہ ہم سردار... سامنے کھڑے ہیں اور قبیلے کے دوسرے لوگ بھی یہاں موجود ہیں۔ پیرو... کی نگاہیں نیچی کیے کھڑے تھے اور ہم اُنھی کو تک رہے تھے جیسے... نے ہم سے مذاق کیا ہے اور ابھی ابھی اس کا اقرار کر لے گا۔ پیرو نے... کوئی اقرار نہیں کیا لیکن اُسے جلد ہی اپنی غلطی کا اندازہ ہو گیا کہ سردار... قبیلے کے لوگوں کے سامنے اُسے ہم سے کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ وہ... مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے سردار سے بولا کہ وہ اور اُس کے... بہت تھکے ہوئے اور بیمار ہیں۔ اُنھیں آرام اور علاج کی ضرورت ہے۔... کسی طبیب کا انتظام کر دیا جائے اور اُس کے مرے ہوئے آدمی کو بستی میں... دفن کرنے کی اجازت دی جائے۔

ہم سب ساتھ ساتھ ہی باہر نکلے۔ مکان کی پہاڑی سے نیچے خاصے... پرے ایک جگہ وہ سارے کے سارے پڑے ہوئے تھے۔ ہلاکو اور زورا... ابھی آدھے نظر آ رہے تھے۔ جینی بُری طرح کھانس رہا تھا۔ پلٹو کو اُس... بھی تیز بخار تھا۔ متّن میاں کی میّت اُن کے بیچ میں رکھی ہوئی تھی۔... کو بھی کچھ ہوش آ گیا تھا۔ اُس نے متّن میاں کے چہرے سے کپڑا ہٹایا... سسکنے لگا۔ متّن میاں کے چہرے پر سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ اُس کی... آنکھیں بند تھیں جیسے گہری نیند سو رہا ہو اور کوئی خواب دیکھ رہا ہو یا کسی... مسکرا رہا ہو۔ اُس کے بند ہونٹوں میں کوئی شرارت سی چھپی ہوئی تھی۔ وہ... مرا ہوا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ لگتا تھا، ابھی آنکھیں کھول کے اُٹھ جائے گا

اور سب کو ڈرا دے گا۔ جامو اُس کی لاش سے لپٹنے کے لیے بے تاب تھا۔ تجّل نے اُسے میّت سے دُور رکھنے کے لیے سلطان کو اشارہ کر دیا تھا۔ قبیلے کے کئی آدمی بھی سردار کے مکان سے ہمارے ہمراہ آئے تھے۔ زورا، جینی، ہلاکو وغیرہ ہم سے دُور دُور ہی رہے اس لیے کہ تجّل نے رسمی طور پر اُن کی خیریت دریافت کی تھی لیکن ہمیں دیکھنے کے بعد اُن کے گالوں پر خون دوڑنے لگا تھا۔

جامو متّن میاں کا چہرہ بھی اچھی طرح نہیں دیکھ سکا۔ تجّل نے اُسے دُور دُور ہی رکھا۔ بچپن سے متّن میاں جامو کے ساتھ رہا تھا۔ جامو کلکتے آ گیا تو وہ اُس کے بھائی جمرو کی نگرانی میں فیض آباد کے اڈّے کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ اُس کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی، نہ شادی ہوئی تھی اور ایک خالہ کے سوا دُنیا میں اُس کا کوئی نہیں تھا۔ جامو اپنے بھائی جمرو کی طرح اُس کا خیال رکھتا تھا۔ شروع شروع میں جامو نے اُسے اڈّے سے دُور رکھنا چاہا تھا اور تعلیم بھی دلانے کی کوشش کی تھی مگر متّن میاں چل نہیں سکا۔ جامو نے پھر اُسے باقاعدہ اڈّے ہی پر رکھ لیا۔ ابھی چند مہینے پہلے متّن میاں نے فیض آباد کے اڈّے میں مجھ پر چاقو تان لیا تھا۔ سب سچ سمجھے لیکن وہ محض مذاق تھا۔ ہر وقت کسی نہ کسی کو چھیڑنا، مذاق کرنا اور ہنستے رہنا اُس کی عادت تھی۔ چاقو پر اُس کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ جامو ہی نے اُسے سب کچھ سکھایا تھا۔ تمنچے پر بھی اُس کا ہاتھ دوسروں کی نسبت زیادہ رواں ہو گیا تھا۔ تجّل اسی لیے اُسے فیض آباد سے کلکتے لے آیا تھا کہ وہ ہاتھ کا سچّا اور نظر کا تیز تھا۔ اُس کے جسم میں بہت لچک تھی۔ درمیانہ قد، گٹھا ہوا، کھنچا ہوا بدن۔ وہ بدن جس میں کبھی بجلی دوڑتی تھی، اب اُسے اپنی خبر نہیں تھی۔ کون کیا کر رہا ہے، رو رہا ہے، ہنس رہا ہے۔ کون اُسے دیکھ رہا ہے۔ پہلے فرش پر تنکا گرنے سے اُس کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔

قبیلے کے بہت سے آدمی ہمارے اطراف اکٹھے ہو گئے۔ جب ہم متّن میاں کی میّت کندھوں پر اُٹھائے بستی کے چوک میں آئے۔ جہاں پیرو کے ٹھیرنے کا انتظام کیا گیا تھا، وہیں متّن میاں کو غسل دیا گیا۔ کفن کے بجائے اُسے چادروں سے لپیٹ دیا گیا۔ قبیلے کے آدمیوں کی رائے تھی کہ اُسے اسی طرح دفن کر دیا جائے مگر تجّل نے غسل کے لیے اصرار کیا۔ میں تو باہر ہی بیٹھا رہا تھا۔ جامو کو بھی کسی نے اندر نہیں آنے دیا تھا۔ بانس کی ایک چارپائی پر متّن میاں کو لٹا دیا گیا تھا۔ اُنھوں نے بستی سے بہت دُور ایک جگہ کی نشان دہی کی تھی۔ وہاں پہنچتے پہنچتے اندھیرا پھیل گیا تھا۔ ہمارے ساتھ مشعلیں بھی نہیں تھیں۔ اندھیرے ہی میں تجّل، پیرو، سلطان، مارتی، سُولم، ہلاکو اور زورا گڑھا کھودتے رہے۔ پلٹو اور جینی کو بیماری کی وجہ سے وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ زمین نرم تھی مگر پتھر ملے ہوئے تھے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی کوشش میں اُنھوں نے قبر جیسا ایک گڑھا کھود لیا۔ متّن میاں کو لٹانے سے پہلے تجّل نے اُس کے منہ سے چادر کھول کے ٹارچ کی روشنی پھینکی ہی

نے جامو کو تھام لیا تھا کہ کہیں وہ اپنے اوسان نہ کھو بیٹھے۔ جامو خود ہی سنبھلا سنبھلا رہا۔ نہ وہ رویا' نہ اُس نے کوئی آہ بھری۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے متن میاں کو دیکھتا رہا۔ تھِل نے ایک دو منٹ بعد اُسے ...متن میاں کی نماز بھی نہیں ہو سکی۔ اُس کی قبر پر مٹی ڈالتے ہوئے سورۂ فاتحہ اور جتنی آیتیں مجھے یاد تھیں' میں دل ہی دل میں پڑھتا رہا۔ لمحوں میں متن میاں منوں مٹی کے نیچے چھپ گیا اور ہم دیر تک اُس کی قبر پر چپ بیٹھے رہے۔

●

جن وسا کے مکان سے دُور بستی کے آخری سرے پر اُنھوں نے پیرُو کے قیام کا بندوبست کیا تھا۔ اُن تک پہنچنے کے لیے ہمیں درمیان میں بستی کے ایک بڑے علاقے سے گزرنا پڑتا۔ ہم قلیوں اُنھیں وہاں چھوڑ کے واپس اپنے میزبان جن وسا کے مکان میں آ گئے تھے۔ بستی کے بہت سے لوگ متن میاں کی تدفین کے دوران سارے راستے ہمارے ہمراہ رہے تھے چنانچہ کسی سے کوئی بات نہیں ہو سکی۔ صرف ہلاکو کی زبانی سرسری طور پر اتنا پتہ چلا کہ ہمارے جُدا ہونے کے بعد دوسرے دن وہاں سخت سردی پڑنے اور تیز بارش ہونے لگی تھی۔ خیمے بھی اُس بارش میں نہ ٹھہر سکے۔ وہ سب بھیگ گئے۔ کوئی بستی قریب نہیں تھی۔ قریب میں جانگ قبیلے ہی کی بستی تھی اور تھِل کی ہدایت کے مطابق تین دن گزرنے سے پہلے وہ وہاں نہیں آ سکتے تھے۔ دوسرے دن وہ سب بیمار پڑ گئے اور چھ دن ایک دوسرے کی خبرگیری کرتے رہے۔ ایک اچھا نہیں ہوتا تھا کہ دوسرا بیمار پڑنے لگتا۔ جو سامان انھوں نے اپنی غذا کے لیے اکٹھا کیا تھا' وہ بھی کم پڑنے لگا تھا۔ پھر اُنھیں جنگلی پرندوں کے شکار پر قناعت کرنی پڑی۔ چوتھی رات جب آسمان صاف تھا' قبائلی قزاقوں کے ایک گروہ نے اُن پر حملہ کر دیا۔ تمنیوں کی آواز پر وہ اپنے تین آدمی گنوا کے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ لوٹنے والے قلیوں ہی نے پیرُو کے ٹھکانے کی خبر اُنھیں دی ہو گی۔ سامان اُٹھانے کے لیے وہ قلیوں کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ان میں سے کوئی جانگ قبیلے ہی میں آ کے قلی پکڑ کے لائے۔ متن میاں کی موت کے بعد وزیرا اور ہلاکو نے قلیوں کی تلاش میں جانگ قبیلے کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر اُنھیں یہاں تک آنے کی ضرورت نہیں پڑی' قلی راستے ہی میں مل گئے۔

اُس رات اُوپر جانے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ جب ہم گھر لوٹے تو رات بہت ہو چکی تھی۔ یوں بھی اگر ہم اُوپر جانے کا ارادہ کرتے تو آدھی رات سے پہلے وہاں نہ پہنچ پاتے اور میں خود تھِل کو منع کر دیتا۔ میرا دل کرتا تھا کہ رات کو کسی وقت' جب سب سو جائیں تو اکیلا ہی اُوپر جاؤں۔ یقیناً ابا جان اُسی مندر میں ہوں گے جہاں کل رات ہم نے اُنھیں دیکھا تھا۔ میں ایک آخری کوشش کر کے اور دیکھ لیتا ہوں۔ میں اُن سے فریاد کر لوں گا اور اُس وقت تک اُن کے پیر نہیں چھوڑوں گا' جب تک وہ ہاں نہ کر دیں۔ میں اُن کے سامنے دیواروں سے ٹکریں مارتا رہوں گا اور اپنا سر لہولہان کر لوں گا۔ میں چاقو نکال کے کہوں گا کہ اگر وہ تیار نہ ہوئے تو میں اسے اپنے سینے میں اُتار لوں گا۔ میں اُنھی کا بیٹا ہوں' اِس لیے اُنھیں یقین آ جانا چاہیے کہ میں ایسا کر سکتا ہوں۔ میں اُنھیں جہاں گیر' اکبر' فتح' فریا... فارہ سب کا واسطہ دے کے کہوں گا کہ وہ چلے جائیں۔ ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے مگر میں اتنی رات گئے اکیلا اُن تک کیسے جا سکتا... ضروری نہیں کہ وہ رات بھر ہمارے انتظار میں بیٹھے رہیں۔ جن وسا کے ...سے ہم نے کچھ کھانا زہر مار کر لیا تھا۔ جامو کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا' بالکل بے حرکت بیٹھا ہوا تھا۔ جن وسا کے کمرے سے جانے کے بعد تھِل نے اُس کا سر اپنے بازوؤں میں چھپا لیا۔ وہ اُسے اپنے پہلو میں لیے لیٹ گیا... آتش دان میں آگ سُلگ رہی تھی۔ کمرے میں کوئی آواز نہیں تھی۔ کبھی لکڑی چٹخ جاتی تو یہ سکوت ایک لمحے کے لیے درہم برہم ہو جاتا۔ میری آنکھوں کے سامنے بار بار متن میاں کا سفید چہرہ آ جاتا تھا۔

دوسرے دن ہم نے بستی کے چوک میں سامان نہیں سجایا۔ تھِل ...سے گھر سے نکلا اور اِدھر اُدھر بے مقصد گھومتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پیرُو اور دوسرے لوگوں کو دیکھنے جائے گا۔ دن کا ابتدائی حصہ تھا۔ اچانک مندروں کے علاقے کی پہاڑیاں چڑھنے لگا۔ پگ ڈنڈی پر بستی کے لوگ... کی آمد و رفت جاری تھی۔ جدھر پھلوں کے باغات تھے' وہاں بھی لوگ... تھے۔ جہاں نسبتاً چپٹی زمینیں تھیں' وہاں بھی وہ کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ باغات اور کھیتوں کا سلسلہ زیادہ دُور تک پھیلا ہوا نہیں تھا۔ جیسے جیسے چڑھائی بڑھتی جاتی تھی' جنگلی درختوں اور جھاڑیوں سے زمین ...ہی ڈھکتی جاتی تھی۔ مندروں کے علاقے کے اطراف کا وسیع رقبہ اُنھوں... باغات اور کھیتوں کے لیے استعمال نہیں کیا تھا۔ اُسے جنگل ہی رہنے دیا... گیا تھا۔ اُجالے کی وجہ سے ہم جلد اُوپر پہنچ گئے اور پہلے ہی مندر... ہمیں دکھائی دے گئے۔ دن میں بھی وہ وہاں تعینات تھے۔ ہر جگہ' ہر... مندر میں۔ بے چھت مورتیوں کے علاقوں میں بھی۔ تاہم ہماری آ... اُن کی نقل و حرکت میں کوئی غیر معمولی اضطراب نظر نہیں آیا جیسے اُنھ... ہمیں دیکھا ہی نہ ہو۔ ہم نے بھی یہی ظاہر کیا۔ ہم بڑے مندر میں ...جگہ نہیں ٹھہرے۔ کہیں ٹھہر جاتے' پھر چلنے لگتے۔ کُھلی ہوئی بڑی مورتی ...بستی سے مندروں کے علاقے میں آ کے سب سے پہلے پڑتی تھی مگر ہم ...طرف جانے کے بجائے سیدھے بڑے مندر میں چلے گئے تھے' وہ... اور مندروں میں۔ پھر ہم گھوم گھام کے بڑی مورتی کے پاس آئے تو پیرُو ...اور زورا کو وہاں دیکھ کے مارٹی اچھل پڑا۔ "یہ اُستاد!۔ اُو در' اُو در... وہ ہڑبڑاتا ہوا بولا۔

"دیکھ لیا ہے رے!" تھِل نے ناگواری سے کہا۔ مارٹی سہم گیا... ہم سب نے ایک دوسرے سے گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملا...

...گئے۔ اتنی گرم جوشی مسافروں' تنہا سائیں اور سوداگروں ہی کے درمیان ...ہے۔ پھر ہم ساتھ ساتھ ہی چلنے لگے۔ یہاں اُن سے کسی قدر کھُل کے ...سکتی تھی۔ بڑی مورتی کے قریب ایک سنسان جگہ آ کے تھِل کی رفتار ...ہو گئی' غیر ارادی طور پر چاروں طرف ہماری نگاہیں بھٹکنے لگیں' ...وہاں ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہماری چالوں پر اُن کی آنکھیں کھُل ...نے اُنھیں ایک نگاہ بھر کے بھی نہیں دیکھا کہ سب آگے نکل گئے ...نے پھر پیچھے مُڑ کے بھی نہیں دیکھا۔ مختلف جگہوں سے ہوتے ہوئے ...ے مندر سے فاصلے پر نشیب میں واقع اُسی مندر کے پاس آ نکلا ...جس رات ابا جان ہمیں ملے تھے۔ بستی کے چند آدمی اب بھی ...پر اونگھ رہے تھے۔ دیر ہو گئی تھی لیکن سرائے میں کھانا مانگنے پر ...دوپہر کا کھانا مل گیا اور رات ہونے سے پہلے ہی ہم اُتر کے نیچے بستی ...ئے۔ پیرُو کی قیام گاہ پہلے آتی تھی۔ وہ وہیں مُڑ گیا۔ ہم جن وسا کے گھر آ گئے۔

دوسرے دن پیرُو سے ہماری ملاقات بستی کے چوک میں ہوئی۔ ایک روز ...ے کے بعد ہم اپنا سامان کھولے بستی کے لوگوں کے ہجوم میں گھرے ...تھے کہ پیرُو' وزیر' زورا' ہلاکو اور بلٹو آ گئے۔ اُن کے چہروں پر تازگی ...ہوئی تھی۔ اُن کے لیے ہمارا اِس طرح مال کے ساتھ بیٹھنا اور گاہکوں ...تول کرنا بہت تعجب انگیز تھا۔ پیرُو لوگوں کو پیچھے ہٹاتا ہوا اندر ...یا۔ "مال بن رہا ہے اُستاد؟" اُس نے تیکھے لہجے میں صدا لگائی۔ ...مال کدھر دادا! سالا اِدھر دیدے زیادہ پھاڑتا' دمڑی کم نکالتا ہے۔" ...نے مسکرا کے کہا۔ "تم بولو' کدھر کا چکر لگ رہا ہے۔ سردار کو تو بڑا مال لگایا ...؟"

"اپن کے پاس تم جیسا مال کدھر ہے۔ تم نے پہلے ہی جادو مار ...ہے۔ سالا اُلٹا پڑا ہے۔" پیرُو نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

اِس کا مطلب یہ تھا کہ پیرُو سردار سے مل کے آیا ہے۔ تھِل یہی چاہتا ہو گا۔ پیرُو کے لہجے سے اطمینان ظاہر ہوتا تھا۔ چونکہ ہم ...میں مصروف تھے اِس لیے وہ وہاں نہیں رُکا۔ تھِل نے اُس دن ...کے داموں میں اچھی خاصی کمی کر دی تھی مگر لُوٹ نہیں مچائی تھی۔ ...یوں کے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ اپنی پسند کی چیزیں محفوظ کرنے ...کے گھر بھاگتی ہوئی جاتی تھیں اور ہانپتی ہوئی واپس آتی تھیں۔ ہم صرف ...بق اور چند تھیلے لے گئے تھے۔ اُس دن کافی سامان بِک گیا۔ مردوں ...اچرا ہیں' دستانے' مفلر' قینچیاں' بلیڈ' بچّوں نے کھلونے' چاکلیٹ' ...عورتوں نے ریشمی کپڑے' مصنوعی زیورات اور آرائش و زیبائش کا سامان ...ہری اور ہو جاتی اگر تھِل صندوق بند کر کے اُٹھ نہ جاتا۔ سردار نے اُس روز ...نہیں بلایا تھا لیکن کسی وقت بھی اُس کا ہرکارہ ہماری طلبی کا حکم ...سکتا تھا۔ سامان گھر واپس بھجوا کے تھِل کے ایما پر ہم سب پھر اُوپر ...گے۔ دوپہر کا وقت تھا اور ابر چھایا ہوا تھا۔ بارش کے آثار

تو نہیں تھے لیکن وہاں دیکھتے دیکھتے موسلا دھار پانی برسنے لگتا تھا۔ اِس کے باوجود تھِل کو جلدی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا۔ تھوڑی دُور چل کے سانس لینے کے لیے رُک جاتا' پھر چلنے لگتا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہم اُوپر نہیں پہنچ سکے۔ اُوپر مشعلیں روشن ہو چکی تھیں اور بھکشو اِدھر اُدھر سے سمٹ کے مندروں خصوصاً بڑے مندر میں جمع ہو رہے تھے۔ ہم بھی وہیں ایک گوشے میں اپنے جسم ڈھلکا کے بیٹھ گئے۔ رُک رُک کے چلنے سے تھکن زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ ٹانگیں اینٹھ سی رہی تھیں۔ جامو' سلطان' مارٹی اور سُولم سب جیسے چلتے چلتے' سوچتے سوچتے اور بولتے بولتے تھک گئے تھے۔ اُن کے چہرے سپاٹ تھے۔ بے جان جسم' جیسے اب سوچنے اور کرنے کو کچھ نہ رہ گیا ہو۔ کبھی اُوپر آنا' کبھی نیچے جانا۔ مندروں کے وسیع علاقے میں اِس سرے سے اُس سرے تک چکر لگاتے رہنا۔ پہاڑوں پر چڑھنا' اُترنا' نہ کھانے کا کوئی وقت' نہ سونے کا اور ہر وقت منہ بند رکھنا۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے لیکن اُن کی بے چمک آنکھیں اور اُن کے بے رنگ چہروں پر بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ پڑھنا چاہیں تو لوگ کورے کاغذ پر پڑھ لیتے ہیں۔ مجھے اُن سے نگاہیں ملاتے ہوئے خوف آتا تھا۔ ہر وقت یہ خیال رہتا کہ کہیں کوئی کچھ کہہ نہ دے' تھِل سے یا مجھ سے۔

رات گئے تک تھِل نے بڑے مندر سے حرکت نہیں کی۔ روشنیاں بتدریج کم ہونے لگیں تو وہ کسمسانے لگے۔ ہم نے اپنے بکھرے ہوئے جسم سمیٹے اور اُٹھ کے اُس کے ساتھ چل دیے۔ معمول میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ایک مقام سے دوسرا مقام' ایک جگہ سے دوسری جگہ۔ بستی کے آدمی اس وقت بھی ہر جگہ موجود تھے اور اُن کی وہی حالت تھی کہ ایک گروہ ایک عمارت پر تعینات تھا تو دوسرا دوسری عمارت پر۔ وہ ہمارا تعاقب نہیں کرتے تھے کہ اُنھیں ایسا کرنے کی ضرورت تھی' نہ اُنھیں ہماری منزل جاننے سے کوئی غرض تھی کہ وہ ہر عمارت میں موجود تھے۔ کھُلے آسمان کے نیچے ایک جگہ سے دوسری جگہ کے فاصلے کے دوران کہیں بھی ہمارے ہونے سے اُن کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ہم لوٹ پھر کے کسی عمارت ہی کی طرف آتے۔ بڑے مندر سے چلنے کے بعد وہ تیسری عمارت تھی جہاں قدم رکھنے پر ہماری رگوں میں جما ہوا خون کلبلانے لگا۔ ہم سے پہلے پیرُو' وزیر' زورا' ہلاکو اور بلٹو وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے درمیان بس رسمی بات چیت ہوئی۔ کچھ دیر ٹھہر کے ہم ایک ساتھ باہر نکلے۔ اندھیرے میں آتے ہی تھِل نے ہمیں دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ مارٹی اور سُولم کی جگہ پیرُو اور وزیر ہمارے ساتھ ہو گئے۔ اُدھر وہ پانچ کے پانچ ہی رہے۔ اِدھر جامو' سلطان' وزیر' پیرُو' تھِل اور میں' ہم چھ۔ تھِل نے سُولم کو آگے بڑھا دیا اور ہم سب ایک پتھر کی آڑ میں اُس وقت تک بیٹھے رہے جب تک ہمیں سُولم کے خاموشی سے آگے نکل جانے کا یقین نہ ہو گیا۔ سُولم ہر مرتبہ ہمارے ساتھ رہا تھا' اِس لیے راستوں سے خوب واقف ہو چکا تھا۔ بعد میں ہم کسی اور عمارت میں نہیں گئے بلکہ بیچ کی تمام عمارتیں چھوڑ کے

ہوئے ایک طویل راستہ کاٹ کے اُسی نشیب میں آگئے جہاں اُونچے درختوں اور جھاڑیوں میں گھرا ہوا قدیم مندر واقع تھا۔ مندر کی چھت نظر آتے ہی ہم نے اپنی رفتار بے حد کم کر دی تھی۔ پنجوں اور ایڑیوں کے بل تقریباً رینگتے ہوئے ہم عمارت کے عقب میں پہنچ گئے۔ سُولم اور بستی کے آدمیوں کی دبی دبی آوازیں ہمیں سُنائی دے رہی تھیں۔ تجھل نے سُولم کو ہدایت کی تھی کہ وہ سیڑھیوں پر موجود آدمیوں کو کسی طرح روکے رکھے، روکنے سے اُس کی مراد یہ تھی کہ اُن کا دھیان بٹائے رکھے، سُولم اُن کی زبان جانتا تھا۔ وہ اُن سے چائے طلب کر سکتا تھا، الاؤ کے گرد کچھ دیر بیٹھنے کی اجازت حاصل کر سکتا تھا اپنے کسی آدمی کی طبیعت اچانک خراب ہونے کا عذر کر سکتا تھا۔ وہ کسی طرح بھی انھیں باتوں میں لگا سکتا تھا اور اس اثنا میں ہم پیچھے سے جدھر سیڑھیاں نہیں تھیں، عمارت میں داخل ہو سکتے تھے۔ پہلی رات جب ہم یہاں آئے تھے تو صرف سامنے کا دروازہ کُھلا ہوا تھا۔ تجھل نے سُولم کو یہ ہدایت بھی دی تھی کہ پہلے وہ مندر میں جاکے عقبی دروازہ اگر بند ہو تو کھول دے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کسی طور انھیں سیڑھیوں سے دُور لے جائے۔ سیڑھیوں سے انھیں دور لے جانا کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔ مندر سے واپسی پر کچھ دُور جانے کے بعد کوئی بھی آدمی چیخنے چلّانے لگتا۔ یقیناً وہ صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے اُس طرف بھاگتے اور اس دوران ہم مندر میں داخل ہو جاتے۔ یوں ہم اُن سب پر پیچھے سے وار کر کے انھیں بے سدھ بھی کر سکتے تھے۔ اُس رات اور کل دن میں ہم نے اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ سیڑھیوں پر اُن کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ تین یا چار آدمی ہوں گے۔ سُولم کے جانے کے بعد ہم اندازاً آدھ گھنٹے کے وقفے سے اُس کے پیچھے روانہ ہوئے تھے۔ سُولم کو اندازاً آدھ گھنٹے بعد اُن سے رجوع ہونا چاہیے تھا۔ اُس نے یہی کیا۔ سیڑھیوں کی جانب سے اُن کی آوازیں آنے سے ظاہر تھا کہ عقبی دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ ہم نے اپنی چاپ میں گھونٹنے کی پوری کوشش کی تھی۔ پچھلا دروازہ سامنے کے دروازے سے قریب نہیں تھا۔ ایک بڑی عمارت دونوں کے بیچ میں کھڑی تھی۔

دروازہ کُھلا ہوا ہی تھا۔ سب سے پہلے تجھل اندر گیا۔ ہم سب دیوار کے ساتھ چپکے کھڑے رہے۔ چند ہی ثانیوں بعد تجھل نے واپس آکے جامو سلطان اور وزیر کو وہیں روک دیا۔ مجھے اور پیرو کو ساتھ لے کے عمارت کے وسطی حصے، ہشت پہلو ستونوں کے گول کمرے میں آ گیا۔ وہاں صرف تین بھکشو ایک چھوٹی سی مشعل کی ڈگمگاتی روشنی میں مراقبے میں غرق تھے اور اُن میں ابا جان بھی تھے۔ تجھل کھسکتا ہوا اُن کے پاس جاکے اور اُن کے زانو پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ گیا۔ ابا جان کے منجمد سراپا میں ایک ہلکی سی لرزش ہوئی۔ انھوں نے گھوم کے ہم تینوں کو غور سے دیکھا پھر کچھ کہے بغیر اُٹھ کھڑے ہوئے اور عمارت کے تاریک حصے میں آ گئے۔ اسی طرف عقبی دروازے کی راہ داری میں جامو سلطان اور وزیر چھپے کھڑے تھے۔ تجھل نے پیرو کو اشارہ کر کے انھیں بھی بُلا لیا۔

اُس رات عمارت کے اُس وسطی کمرے کی مکانیت کا ہمیں کچھ اندازہ ہو ہی گیا تھا۔ مرکزی مورتی سے دیوار تک پھیلے ہوئے ستونوں کی قطاریں تھیں اور اندر آنے جانے کے لیے سامنے اور پیچھے کے راستوں کے علاوہ دائیں بائیں دو اور راستے تھے۔ ہر راستہ یکساں تھا لیکن ایک راستے کو اس اعتبار سے فوقیت حاصل تھی کہ اُس کے آگے سیڑھیاں نہیں، باقی راستوں کے سامنے صرف چبوترا تھا اس لیے اُسے سامنے کا دروازہ کہا جا سکتا تھا۔ اسی کی نسبت سے ابا جان دائیں طرف کے راستے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے کیونکہ اُدھر روشنی تھی اور وہ ہمیں آسانی سے نظر آ سکتے تھے۔ وہ بائیں طرف کا راستہ تھا جہاں ابا جان مُڑ گئے تھے۔ مُڑتے ہی انھوں نے ایک دروازے پر آہستگی سے ہتھیلی کا دباؤ ڈالا تو کواڑ کُھل گئے۔ اندر گھپ اندھیرا تھا مگر وہ بھی کوئی کمرہ ہی تھا۔ پتھر کے فرش اور دیواروں پر اُبھرے ہوئے نقش و نگار سے یہی معلوم ہوتا تھا۔ دیوار ٹٹولتے ہوئے چند قدم چل کے ابا جان شاید پھر کسی دروازے پر آ گئے تھے۔ "احتیاط سے۔" انھوں نے سرگوشی میں کہا۔ "کواڑ بند کر دینا۔"

نیچے تنگ سیڑھیاں جاتی تھیں۔ ابا جان بے آواز قدموں سے نیچے اُترنے لگے۔ اندر دو آدمی ایک ساتھ نہیں گزر سکتے تھے۔ ذرا بھاری آدمی ہو تو دیواریں شانوں سے چھبنے لگیں اور اُسے ترچھا ہونا پڑے۔ ابا جان ہم سب سے آگے تھے۔ پیچھے تجھل، پیرو پھر میں اور میرے پیچھے جامو سلطان اور وزیر۔ ہم سب نے کمر سے ایک دوسرے کے کپڑے پکڑ رکھے تھے جیسے جیسے ہم اُترتے گئے، سیڑھیاں گھومتی گئیں۔ ابا جان کے پاس بھی ایک چھوٹی بیٹری تھی جسے انھوں نے کچھ آگے جاکے روشن کر لیا اور ہم دیواریں بھی اور قدمچے دیکھنے کے قابل ہو گئے۔ وہ سیڑھیوں کی کوئی سرنگ تھی۔ شاید پتھروں کا رنگ بھی سیاہ تھا۔ کوئی سو زینے اُترنے کے بعد سیڑھیاں کئی سمتوں میں بٹ جاتی تھیں ہر سُو ایک عجیب قسم کی بُو پھیلی ہوئی تھی اور گیلا دھواں سا چھایا ہوا تھا لیکن سانس لینے میں ایسی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ یقیناً کہیں سے ہوا آنے کا کوئی انتظام تھا چاہے وہ گھٹی ہوئی ہوا آ ہو یا دیر سے یہاں پہنچتی ہو۔ اتنی بہت سی سیڑھیاں نہ جانے کہاں کہاں جا تی تھیں۔ ابا جان اس طرح بے جھجک آگے بڑھ رہے تھے جیسے انھوں نے ساری زندگی انھی راستوں پر کاٹی ہو۔ کوئی بھی اُوپر سے عمارت دیکھ کے قیاس نہیں کر سکتا تھا کہ اُس کے نیچے، زیرِ زمین یہ راستے بنے ہوں گے پتہ نہیں اُن کا کیا مقصد تھا۔ کہاں تک وہ جاتے تھے یا سب ایک جگہ جاکے ختم ہو جاتے تھے۔ جہاں ابا جان ہمیں لے جا رہے تھے مگر اب نہیں ہو گا۔ ہم میں ہر شخص خاموش تھا۔ ابا جان نے بھی اُوپر کمرے میں احتیاط کی تلقین کرنے کے سوا کوئی اور بات نہیں کی تھی۔ وزیر کی سانس چل رہی تھی۔ اپنی کھانسی روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ تجھل اگر ابا جان کے

[اپنی] بیٹری بھی جلا لیتا تو روشنی کچھ زیادہ ہو جاتی اور ہم بار بار [دیوا]روں سے نہ ٹکراتے لیکن تجھل نے بیٹری جیب سے نہیں نکالی۔

ہم خاصے نیچے آ گئے ہوں گے کہ ایک کوٹھری پر آکے سیڑھیاں [ختم ہ]و گئیں۔ ابا جان نے بیٹری کی روشنی اُس کے اطراف میں ڈالی اُدھر [...] کچھا تھی، یا غار تھا۔ کسی بڑے تنور کے منہ جیسا راستہ اندر جانے کے لیے [بنا] ہوا تھا۔ ہم سب سر جھکائے ہوئے آسانی سے اُس میں داخل ہو گئے۔ کوٹھری [میں] ہوا اور روشنی کے لیے کوئی روزن نہیں تھا۔ فضا گرم تھی۔ ایک طرف دیوار [...] گوتم بدھ کی بلند قامت مورتی تراشی ہوئی تھی۔ ابا جان نے بیٹری بجھا دی۔ [...] گہرے اندھیرے میں ڈوب گیا۔ ہم سب اپنی جگہوں پر دم بہ خود کھڑے [تھے] کہ یکایک ہمیں ایک گڑگڑاہٹ سُنائی دی جیسے کہیں زمین دہل گئی ہو [یا کو]ئی چٹان اپنی جگہ سے ہل رہی ہو۔ ابا جان نے جب بیٹری روشن کی تو [ہما]ری آنکھوں کے سامنے ایک ناقابلِ یقین منظر تھا۔ ابا جان وہ جسیم مورتی [اپ]نے ناتواں جسم کے زور سے دھکیل رہے تھے اور مورتی اپنی جگہ سے کھسک [رہ]ی تھی۔

"میں آؤں بڑے صاحب؟" تجھل کی آواز کمرے میں گونجی۔

"آؤ۔" ابا جان کھنکتے لہجے میں بولے۔

تجھل نے اُن کے قریب جاکے ایک جانب سے مورتی پر زور [لگایا]۔ وہ اُس سے نہیں ہٹی تو پیرو اُس کی مدد کو پہنچ گیا پھر ہم سب لیکن ہم [سے مور]تی کی وہ چٹان ایک انچ نہیں کھسکا سکے۔

"ہٹ جاؤ۔" ابا جان نے کسی حد تک جھڑکنے کے انداز میں ہم سے [کہا]۔ ہم نے اُن کے حکم کی تعمیل کی۔ پھر وہ خود ہی مورتی پر زور ڈالنے لگے اور [ہمار]ے کانوں میں وہی گڑگڑاہٹ گونجنے لگی۔ مورتی کا ایک حصّہ پیچھے [جا] رہا تھا اور دوسری جانب سے ایک حصّہ اُبھر رہا تھا۔ سب حیران تھے۔ [ابا ج]ان کی نہ سانس پھول رہی تھی، نہ اُن کے تیور سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ [کوئ]ی طاقت صَرف کر رہے ہیں۔ "اسے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔" مورتی ترچھی [ہو]نے سے اندر ایک راستہ نظر آنے لگا تو ابا جان دھیمی آواز میں بولے۔

"اُس میں کوئی گُر ہے بڑے صاحب!" تجھل نے نرم لہجے میں کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" ابا جان نے جواب دیا۔ تجھل نے تکرار [نہیں] کی تو وہ خود ہی بولے۔ "تمام زینے ایسی ہی کوٹھریوں پر ختم ہو جاتے [ہیں۔ جب] بدھ راہب اپنے نفس کو کڑی آزمائش میں ڈالنے کے لیے یہاں [آ]کے محبوس ہو جاتے ہیں پھر انھیں دُنیا کی کوئی آواز نہیں سناتی۔"

"اِدھر تو راستہ کھوجنا مشکل ہے۔ ہر جگہ ایک جیسی سیڑھی ہے۔ آدمی کا [...] چکر میں پھر جاتا ہو گا۔ یہ تو ایک دم بھول بھلیاں ہیں بڑے صاحب!"

ابا جان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مورتی ہٹنے سے جو راستہ بن گیا تھا [ہم] کسی تردد کے بغیر اُس کے اندر چلے گئے اور جب تک ہم سب دوسری [طرف] نہیں پہنچ گئے اور انھوں نے مورتی دوبارہ دیوار کے برابر نہیں کی وہ آگے نہیں بڑھے۔ آگے کوئی زینہ نہیں تھا۔ غار کے اِس جانب ایک تنگ گلی تھی۔ چاروں طرف سے بند، کسی تابوت کی طرح۔ تابوت کی لمبائی چوڑائی محدود ہوتی ہے۔ اُس کی چوڑائی محدود تھی اور لمبائی لامحدود۔ زینے کے مانند اس میں بھی صرف ایک آدمی کے گزرنے کی گنجائش تھی۔ کچھ ہی دُور چل کے ہمیں ایک اور گلی کا موڑ نظر آیا۔ پھر اُن گلیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ ایک موڑ کے بعد دوسرا موڑ۔ ہر سمت دوراہے سہ راہے۔ دائیں بائیں، قدم قدم پر چکّر دار راستے پھوٹتے تھے۔ ابا جان جیسے آنکھیں بند کر کے، جدھر منہ اُٹھا، اُسی طرف جا رہے تھے۔ ایک گلی چھوڑ کے، دوسری گلی میں۔ تمام راستے انھیں ازبر تھے۔ وہ نہ کہیں رُکے، نہ انھیں کسی گلی کی شناخت میں کوئی دقت پیش آئی۔ ہر قدم پر میرا دل اُچھلنے لگتا تھا کہ اگر پیچھے غار والی مورتی دوبارہ نہ کُھلی! اگر ابا جان راستہ ہی بھول جائیں تو ہم کبھی یہاں سے نہیں لَوٹ سکتے تھے۔ گلیوں کی ہوا مسموم تھی اور دم گھٹنے سا لگا تھا۔ ابا جان نہ جانے کہاں کہاں کن کن راستوں پر ہمیں گھماتے رہے۔ وزیر کی طبیعت پہلے ہی خراب تھی کسی لمحے کسی کے بھی اعصاب جواب دے سکتے تھے۔ سینہ بند ہوا جاتا تھا میری طرح سبھی کے حلق میں کانٹے چبھ رہے ہوں گے۔ سب موٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے ورنہ بار بار دیواروں سے رگڑیں کھاتے ہوئے شانے اور کہنیاں چھل جاتیں۔ ذرا کہیں پیر اُلٹا پڑ جاتا تو دیواریں دھکا دیتی تھیں۔ زمین پر پھونک پھونک کر پیر رکھنے سے ٹانگوں میں درد اُٹھنے لگا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ گلیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ شاید ابا جان بھی راستہ بھول گئے ہیں لیکن آخر وہ اچانک ایک جگہ مُڑ کے رُک گئے۔ دیوار پر روشنی ہوئی تو ہم دیکھ سکے۔ ہر طرف نیلی نیلی ہری، لال روشنیوں کے ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ ہم ایک اوسط رقبے کے ہال میں موجود تھے۔ اسے ہال ہی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ ابا جان نے دیا سلائی جلا کے وہاں نصب ایک مشعل روشن کر دی تو چھت اور دیواریں جگمگانے لگیں۔ جیسے ہر طرف رنگ برنگے شعلے جل رہے ہوں یا چھوٹے چھوٹے بلب۔ دیر سے اندھیرے میں رہنے کے بعد یک بارگی اتنی روشنیوں میں آ جانے سے ہماری آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں۔ مشعل کی روشنی کے زیر و بم کے ساتھ ستارے بھی جھل مل رہے تھے۔ کبھی مدھم کبھی تیز۔ فرش پر رنگوں کی بوندیں سی ٹپک رہی تھیں۔ وہاں نہ گوتم بُدھ کی مورتی تھی، نہ کسی اور کی۔ کمرے کی ہوا بھی اتنی پراگندہ نہیں تھی۔ جتنی گلیوں کی تھی۔ ہم حیرت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھتے رہے۔ میں نے کتابوں میں کہیں ایسے کمروں کا ذکر پڑھا تھا۔ چھت اور دیواروں میں جا بجا چھوٹے چھوٹے شیشے اور پتھر جڑے ہوئے تھے جو روشنیاں منعکس کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے، وہ نگینے، ہیرے اور موتی ہوں۔ روشنیوں کی جھلملاہٹ سے نیند کی کیفیت طاری ہونے لگتی تھی۔ کمرے میں کوئی ستون نہیں تھا۔ ہر طرف دیواروں میں محراب نما در بنے ہوئے تھے جو سب کے سب بند تھے اور صرف وہیں یہ شیشے اور پتھر لگے ہوئے نہیں تھے۔

"بیٹھ جائیے۔" ابّا جان کی آواز بھی جھلملا رہی تھی۔ ہم سب فرش پر بیٹھ گئے اور پٹ پٹاتی نظروں سے اُنھیں دیکھنے لگے۔ "یہیں سب کچھ ہے۔" وہ سرد آواز میں بولے۔

"یہ تو اپن کو ایک سپنا لگتا ہے۔" پیرو نے پہلی بار زبان کھولی۔

"اتنے نیچے اِدھر لوگ کیسے پہنچ گئے؟" سلطان حیرت سے بولا۔

"یہ سب سوچنے کا وقت نہیں ہے۔" ابّا جان نے تنک کے کہا۔

"یہ تو رنگ محل ہے۔ اپنے لکھنؤ میں بھی ایسا نہیں ہے۔" جامو خوابیدہ آواز میں بولا۔ "اُستاد! اِدھر سب ہیرے چھپے ہوئے ہیں۔"

"بڑے صاحب!" بٹھل نے جامو کی بات پر توجہ نہیں دی اور ابّا جان سے مخاطب ہو کے بولا۔ "میں نے آپ سے اُس رات اِن سب کے لیے بول دیا تھا۔ اِن کی زبان تیز ہے۔ انیس بیس ہو جائے تو دھیان مت دینا۔ یہ اپنا پیرو ہے، اس کا نام جامو ہے۔ یہ سلطانے، یہ وزیرا۔ اِدھر پانچ آدمی اُوپر بیٹھے ہیں اور دو لبتی میں پڑے ہیں۔ ایک راستے میں دھوکا دے گیا، اُسے پرسوں ہم نے نیچے مٹی میں دبا دیا ہے۔ اِن سب کو بابرے کی طرح جانو۔ ہم کو بولو کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

ابّا جان سر ہلانے لگے۔ میرے اور بٹھل کے سوا سبھی نے اُنھیں ٹپٹاتے ہوئے سلام کیا۔

ابّا جان نے گردن جھکا کے انھیں جواب دیا اور گونجتی ہوئی آواز میں بولے "آپ نے سب دیکھ لیا ہے؟"

"دیکھ لیا ہے بڑے صاحب!" بٹھل نے تیزی سے کہا۔

"پھر کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"سوچنا کیا بڑے صاحب!"

"میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ لوگ یہاں وقت ضائع نہ کریں۔"

"ہم آپ کے لیے اِدھر آئے ہیں۔"

"مجھے دیر لگے گی۔ بہتر ہے کہ تکرار نہ کریں۔"

"اِدھر آپ کے اب بہت سے ہاتھ ہیں۔ اپنے کو ابھی اکیلا مت سمجھو۔"

"چلتے وقت بٹھل بھائی نے سب کو بول دیا تھا کہ سارا اگلا پچھلا معاف کر کے چلنا۔ اپن حساب چکتا کر کے آیا ہے۔" پیرو اٹک اٹک کے بولا۔ "اپن کو بولو یہ سب کیا ہے۔ اپن ابھی کدھر جائیں۔"

"آپ لوگ کچھ نہیں سمجھ رہے۔" ابّا جان کے لہجے میں بیزاری تھی۔

"قسم سے لاڈلا جانی آپ کے لیے بہت پریشان تھا بڑے صاحب!" پیرو بولا۔ "ابھی اپن کی دو کوڑی کی رائے مانو تو اِدھر سے جلدی سے جلدی لوٹ چلو۔"

"نہیں پیرو دادا!" بٹھل نے تندی سے کہا۔ "بڑے صاحب ایسے نہیں جا سکتے۔ ہم بھی اُن کے بدلے ہوتے تو اِدھر تک آ کے نہیں لوٹتے۔ اپنے کو وقت کا دھیان ہے۔ رات جا رہی ہے۔ ہم کو شاید لوٹنا بھی ہوگا۔ میں نے پہلے ہی سب بتا دیا تھا۔ اب کیا اِس کو دہرانے کی ضرورت ہے۔ بولو بڑے صاحب!"

ابّا جان ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگے۔ اُن کی آنکھوں سے بے بسی مترشح تھی۔ بٹھل نے اُن سے پھر کوئی اصرار نہیں کیا۔ پیرو نے کچھ بولنے کی کوشش کی تو اُس نے اُسے بھی روک دیا۔ سب چپ اُن کا منہ تک رہے تھے۔ بہ مشکل تمام اُن کے لب کھلے اور اُن کی بوجھل آواز کمرے میں اُبھری۔ "یہ جس میں ہم بیٹھے ہوئے ہیں، بدھوں کے دور سے پہلے بنائی گئی تھی۔ کسی زمانے میں یہ اِس خطّے کے حاکموں کی عشرت گاہ تھی۔ جب بدھ یہاں آنا شروع ہوئے تو اُس وقت سیانگ نامی حاکم نے اِس عمارت کے اُوپر مندر تعمیر کروا دیا اور سب کچھ یہیں محفوظ کر دیا۔ بدھوں کے عروج کے وقت اِس خطّے کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ یہاں جانگ قبائل کی ایک بڑی بستی تھی اور پہاڑی علاقوں کے مقابلے میں اُس کی زرخیز زمینیں اور دوسری خصوصیات اُس کی برتری کی ضامن تھیں اور ہیں بھی۔ بعد میں یہ علاقہ صرف مندروں کے لیے مخصوص کر دیا گیا اور قبائل کی بستی کو نشیب میں مختلف بستیوں میں بسا دیا گیا۔ روایت ہے کہ جب بدھ یہاں آئے تو یہ عمارت حاکمِ سیانگ کی حرم سرا تھی۔ یہاں اُس کی وہ خاص کنیزیں رہتی تھیں جنھیں دُنیا کے مختلف حصّوں سے لایا گیا تھا اور یہ گلیاں اِسی لیے بنائی گئی تھیں کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں۔ ممکن ہے اِن کا کوئی اور مقصد بھی ہو، یہ عشرت کے کسی کھیل کے کام میں آتی ہوں۔ جنگ میں یہ ایک بہترین پناہ گاہ بھی تھی۔ یہ جانگ قبیلے کی ثروت و دولت کا مرکز تھا۔ بدھ دُنیوی آلائش و ترغیبات پسند نہیں کرتے۔ اُن کی تعلیمات دُنیا سے کنارہ کشی اور قناعت پر مبنی ہیں۔ باور کیا جاتا ہے کہ جہاں جہاں اُنھوں نے تبلیغ شروع کی، حکومتوں اور لوگوں نے اپنا سب کچھ اُن کے حوالے کر دیا۔ راہبوں کا یہاں ٹھہراؤ ہوا تو یہ کثیر مال و اسباب بھی اُن کے ساتھ تھا۔ حاکم سیانگ نے اُن کی خوشنودی کے اظہار کے طور پر اُسے تمام خزانے سمیت اسے یہاں دفن کر دیا لیکن اُس کی نیت ٹھیک نہیں تھی۔ اُس نے تمام عمارت پاٹ کے ایک یہ کمرہ کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ بعد میں کبھی اِسے نکال سکے۔ اُس کا خیال ہوگا کہ جب بدھوں کے اثر کا یہ زور ٹوٹ جائے گا تو خزانہ دوبارہ اُس کی تحویل میں آ جائے گا لیکن بدھ راہب اپنی تعلیمات عام کرتے گئے اور بستیاں اور علاقے اُن کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ یہاں رہبانیت کا ایک نیا دَور شروع ہوا۔ جگہ جگہ سے راہب اِس علاقے میں جمع ہونے لگے اور گوتم بدھ کی تعلیمات کی تفسیریں اور اُن کے عملی نمونے پیش کرنے لگے اور اُنھوں نے یہاں نہایت عرق ریزی سے ایک دستاویز مرتّب کی۔ بدھ کے اقوال اور تعلیمات کی تفسیر و تشریح پر مشتمل یہ دستاویز مشہور ہے کہ اِن میں کوئی ایسا رقعہ بھی ہے جو گوتم بدھ کے ہاتھوں سے گزر کے یہاں پہنچا تھا اور اُس میں مقدس نکات بھی تھے۔ اُسے بدھ کی نگاہ کی سند حاصل تھی۔ وہ دستاویزیں محترم ہو گئیں اور تمام راہب اُس سے وابستہ ہو گئیں۔ ہر سردار نے اِسے جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ اِس لیے نہیں کہ اُس میں مدفون خزانے کی تفصیلات درج تھیں بلکہ اِس لیے کہ گوتم بدھ کی امانت تھی۔ ممکن ہے کہ سینہ بہ سینہ حاکموں اور سرداروں کو کسی خزانے کی موجودگی کا علم منتقل ہوتا رہا ہو اور اُنھوں نے اُس کی تحقیق و جستجو کی کوشش کی ہو لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اِس کا اندازہ اِسی سے ہو سکتا ہے کہ مجھے ایک مدّت لگ گئی۔ وہ کوئی عام نقشہ نہیں تھا بلکہ عمارتوں کا ہزار ہے۔ حاکم سیانگ نے اسے پیچیدہ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑا تھا۔ وہ سر بہ سر ایک سرِ نہاں تھا۔ اس میں رمزیں ہی رمزیں تھیں۔ رموز و اسرار دریافت کرتے ہوئے مجھے اتنا وقت گزر گیا۔" ابّا جان کی آواز ڈولنے لگی۔

سب ٹکٹکی باندھے اُنھیں دیکھ رہے تھے۔ کسی نے بیچ میں دخل نہیں دیا۔ سب سنتے رہے جیسے ابّا جان کے موٹے موٹے لفظ اُن سبھی کی سمجھ میں آ رہے ہوں۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ امّی اور فمی کی شکلیں بار بار سامنے آ رہی تھیں جیسے اُن کی روحیں اِس تہہ خانے میں آ گئی ہوں اور وہ سفید کپڑوں میں ملبوس میرے اور ابّا جان کے درمیان سر جھکائے کھڑی ہوں۔ ابّا جان کا بھی امّی اور فمی سے کوئی تعلق تھا۔ شاید اُنھیں بھی وہ نظر آ رہی تھیں۔ اُن کی تھرتھراتی آواز سے پتہ چلتا تھا کہ اُن کی آنکھیں بھی جل رہی ہوں گی۔ کچھ دیر سنّاٹا طاری رہا۔ نہ وہ بولے نہ کوئی اور۔ بولتے بولتے نہ جانے وہ کیا سوچنے لگے تھے۔ کہاں کھو گئے تھے۔ پھر کسی کے ٹوکنے سے پہلے اُنھیں خود احساس ہو گیا کہ اور لوگ بھی یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ "مجھے وقت لگ گیا۔ خاصا وقت۔" میری طرف نظریں اُٹھا کے اُنھوں نے پژمردگی سے کہا۔ "زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا۔ بابر کے گھر سے جانے کے بعد میں نے اِن کاغذات کی یوں ہی ورق گردانی کی تھی۔ اِسی خیال سے کہ شاید لڑکی کا کوئی سُراغ مِل جائے۔ وہی بابر کو کسی سمت لے گئی ہو۔ اِن دونوں کا کوئی پتہ تو نہ چل سکا۔ کاغذات کے تہہ در تہہ اسرار میری آنکھوں میں کُھبنے لگے۔ مجھے ایسا لگا جیسے ابّا جان مجھی سے مخاطب ہوں، مجھے سُنانے کے لیے یہ کہہ رہے ہوں۔ "حاکم سیانگ نے اُنھیں مشکل سے مشکل بنا دیا تھا۔ بہرحال جو وقت گزرنا تھا، وہ گزر گیا۔ وہ واپس نہیں آ سکتا۔" اُنھیں جھرجھری سی آ گئی۔ "آپ لوگ اِس کمرے کے بند دَر دیکھ رہے ہیں۔ اِن میں صرف چھ ایسے ہیں جن میں وہ سب رکھا ہوا ہے۔ اُنھیں تلاش کرنا ایک کارے دارد ہے۔ آپ کا خیال ہوگا کہ جن دیواروں کے پیچھے خلا ہوگا وہ آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ تمام دَر ٹھوس ہیں۔ اِن میں یہ جو آپ ایک دَر کھلا ہوا دیکھ رہے ہیں، میں نے اِس کا خزانہ ایک مناسب جگہ منتقل کر دیا ہے۔"

"اِسے آپ نے کھولا ہے؟" بٹھل نے وحشت سے کہا۔

"ہاں۔ ابھی پانچ باقی ہیں۔ پہلے خزانے سے جو کچھ برآمد ہوا ہے، میری توقع سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ باقی پانچ میں بھی اتنا ہی کچھ ہوگا اور میں اُنھیں کھولوں گا۔ اِس میں وقت صَرف ہوگا۔ مہینے دو مہینے چھ مہینے یا سال۔ میں صحیح وقت نہیں بتا سکتا۔"

"ابھی اپن اِدھر ہیں۔ اپن کو بولو۔" پیرو جلدی سے بولا۔

"آپ اِدھر ہیں اور میں نے آپ سے کوئی بات نہیں چھپائی ہے۔ گو میرے لیے یہ انتہائی دشوار مرحلہ تھا۔ مجھے یہ سب قبل از وقت محسوس ہوتا ہے مگر غالباً مجھے یہی کرنا چاہیے تھا۔" اُن کی آواز کہیں کھو سی گئی۔ "اور آپ کے ساتھ بابر ہے۔ بس یہی کافی ہے اور اس عمر میں آ کے مجھے اپنی بینائی اور سماعت پر کچھ اعتبار کرنا چاہیے۔ یوں بھی اب کچھ چھپانا شاید بہتر نہیں تھا کیونکہ میری شناخت ہو چکی ہے اور مجھے اس سارے کام میں اُس کے تحقیقی پہلو سے زیادہ غرض تھی۔ دوسری غرض بھی پیشِ نظر تھی لیکن اس قدر نہیں۔ مجھے آپ پر بھروسا ہے۔ کسی مجبوری سے نہیں۔ یہ میرے اپنے دیکھنے اور سُننے کا اعتبار ہے۔ یہ اعتبار غلط ہو تو غلطی میری ہوگی اس لیے کہ میں نے اپنا اختیار خود ترک کیا ہے، اُسے غصب نہیں ہونے دیا ہے۔ اتنی باتیں کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ میری احتیاط کو میرا شک نہ سمجھیں۔ جو میں آپ پر کر سکتا ہوں، مجھ پر بھی اعتبار کریں۔ میں آپ کو یہی ایک بہتر مشورہ دے سکتا ہوں کہ آپ اُن پُرپیچ راستوں سے دُور ہی رہیں، یہ ایک گورکھ دھندا ہے۔ یہ راستے صرف میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ نہ میں اُنھیں آسانی سے آپ کو منتقل کر سکتا ہوں، نہ آپ اتنی جلدی اُنھیں سمجھ سکتے ہیں اور یہاں آ کے آپ کے لیے اُن کا جاننا ضروری بھی ہے۔ ڈوریوں اور نشانات سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ لاحاصل ہے۔ آپ نے جس غار میں مورتی دیکھی تھی، وہی جگہ جہاں زینہ ختم ہو جاتا ہے، وہ مورتی صرف میں ہی اپنی جگہ سے ہٹا سکتا ہوں۔ اُسے کھود کے یا مسمار کر کے راستے سے ہٹایا جائے گا تو آگے کے راستے خود بخود مسدود ہو جائیں گے۔ سیانگ نے اِس میں یہی فنی خوبی رکھی تھی۔ مورتی گرائی جائے گی یا اُسے منہدم کیا جائے گا تو اُس کے پارگل کی چھت تھمی نہ رہ سکے گی۔ اُس کا ملبا نیچے گِر کے گلی بند کر دے گا اور کوئی بھی پھر اندر نہیں آ سکے گا۔ سیانگ نے یہ اہتمام اِس خیال سے کیا ہوگا کہ جسے خزانے کی دستاویز کا حقیقی علم ہو وہی اُس تک پہنچ سکے، کوئی دوسرا نہیں۔ یہاں قدم قدم پر احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔ آپ لوگ یہاں اندر ہوں اور اس دوران کوئی حادثہ پیش آ جائے، کہیں پیر اُلٹا پڑ جائے، کوئی بھی غلطی ہو جائے، کوئی راستہ بند ہو جائے یا کسی اور قسم کی اُلجھن پیش آئے تو ہم کبھی باہر نہیں نکل سکتے۔ میں اتنے لوگوں کی زندگی خطرے میں ڈالنے کی رائے نہیں دے سکتا۔ یہاں بند ہوا میں تا دیر رہنا بھی مشکل ہے۔ بار بار اس طرف مندروں میں اور خاص طور پر اِس مخصوص عمارت میں آپ کا آنا بھی مناسب نہیں ہے۔ جانگ قبیلے کی اِس جستجو سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھیں اپنے متبرک کاغذات کے ساتھ وہ دوسری دستاویز ہونے کا بھی کچھ علم ہے یا گمان ہے جس کا تعلق اس عمارت

کی زیرِ زمین دولت سے ہے۔ انھیں شبہ ہے کہ کوئی اِسے برآمد کرنے کی کوشش میں کبھی اِدھر رُخ کر سکتا ہے۔ ہر چند انھیں یقین ہو گا کہ وہ شخص اِسے حاصل نہیں کر سکتا مگر اِس طرح اِس شخص کے ذریعے انھیں اپنے کاغذات کا سراغ مِل جائے گا اور وہ صرف یہی چاہتے ہیں۔ دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اس مدت میں، مَیں وہ پہلا شخص ہوں جو یہاں تک پہنچ سکا ہے۔ مجھے ہر وقت یہی اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی زلزلہ نہ آگیا ہو، عمارت اپنی بنیادیں نہ چھوڑ چکی ہو اور کھنڈر نہ بن گئی ہو لیکن یہ عرصے تک بدھ راہبوں کا مرکز و محور رہی۔ انھوں نے اُس کی اچھی طرح دیکھ بھال کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اِسے بناتے اور مرمت کرتے رہے ہیں۔ عمارت کے نیچے جو زینے مختلف غاروں تک جاتے ہیں، وہ راہبوں کی عبادت و ریاضت کے کام آتے رہے ہیں۔ ممکن ہے اب بھی بہت سے غاروں میں راہب موجود ہوں۔ تاہم یہاں آنے سے پہلے میں نے جانگ قبیلے کے اِس مقدس مقام کی تمام عمارتوں کی تصدیق کتابوں اور مختلف حوالوں سے کر لی تھی۔ میں نے آپ سے کھُل کر سب بیان کر دیا ہے۔ آپ یہاں میرے ساتھ رہیں گے تو یہ خدشہ مجھے ہر لمحے کھٹکتا رہے گا کہ آپ کی ڈوری مجھ سے بندھی ہے۔ میں اپنی عمر گزار چکا ہوں۔ میرا وقت نہ جانے کب آجائے۔ میں نہ رہا یا مجھ پر کوئی اُفتاد پڑ گئی تو آپ یہاں سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ایک شخص اور مجھ جیسا سانسیں گننے والا شخص کیا ضمانت دے سکتا ہے کہ اُس کے اعصاب ٹھیک ہی رہیں گے۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ نے مجھ سے بابر کا حوالہ دیا تھا۔ میں بھی آپ کو اُسی کا حوالہ دے سکتا ہوں۔"

"ہم سب سمجھ رہے ہیں بڑے صاحب!" تجھل نے سر ہلا کے کہا۔

"پر اِدھر کسی کا بھی پتّا نہیں لکھا ہے۔ آپ اِس کو چھوڑو، ہم اِدھر رہ جائیں گے تو اپنے رونے والے اُدھر بہت کم ہیں۔"

"سمجھو بڑے صاحب اپن ٹکٹ کٹا کے آئے ہیں۔" پیرو اُچک کے بولا۔ "اپن ایک بات جانتا ہے کہ جیتے رہنا سالا بائی چانس ہے۔ اپن کا غم جانے دو۔ ابھی ہم آپ کو اِدر چھوڑ کے اُودر تالی بجاتے رہیں۔"

"بڑے صاحب! ہم کو حکم کرو، لاڈلا اپنا بھائی ہے۔" جامو آباجان کے پاس جا کے بیٹھ گیا اور اُن کے پیر چھوتے ہوئے بولا۔

"اپنے کو لو لو بڑے صاحب!" سلطان بھی لپک کے اُن کے پاس پہنچ گیا۔

"بولو تو ابھی اِدھر رک جائیں!" جامو نے اضطراری لہجے میں کہا۔

آباجان اِن دونوں کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کے مسکرانے لگے۔

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"اپن اس کو ایک ہفتے سے پہلے کھود کے برابر کر دیں گے سب کسی رات کو اِدر بند ہو جائیں گے۔ سالا باہر ڈھونڈتے پھریں گے کیوں تجھل بھائی!"

"کچھ ایسا ہی کرنا ہو گا دادا!" تجھل خوابیدہ لہجے میں بولا۔ "سب نیم تو آدھے کو اِدھر بھیجنا ہو گا۔ باقی سوچنا اپنا کام ہے۔ بڑے صاحب آپ اِدھر مندر میں ہمارا انتظار کرو۔ جب تک ہم نہ آئیں، اس طرح مر آؤ۔ ہم کل، پرسوں جب بھی ٹھیک ہو گا، آجائیں گے۔"

آباجان کے پاس شاید اب تمام لفظ ختم ہو چکے تھے۔ اُٹھے تو سبھی اُن کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُوپر بائیں طرف مندر کے مرکزی حصّے کو جانے والی راہ داری میں بنے ہوئے کمرے سے سب سے پہلے آباجان باہر نکلے۔ کچھ توقف کے بعد ہم سب۔ وسطی کمرے کی مشعل بجھ چکی تھی۔ ہر سُو تاریکی اور خاموشی کا تسلط تھا۔ سیڑھیوں کی جانب سے بھی کوئی نہیں آ رہی تھی۔ ہم اُس جانب گئے بھی نہیں بلکہ عقبی دروازے سے ملحق چبوترے سے پھسلتے ہوئے زمین پر آگئے۔ سُوانُم زودرا، پلٹو، ہلا کو اور ما ہمیں سرائے میں لیٹے ہوئے ملے۔ وہ جاگ رہے تھے۔ ہم نے بھی اُن کے پہلو میں بستر لگا لیے۔ آباجان وہیں رُک گئے تھے۔ ناشتے سے پہلے علی الصبح ہم نے مندروں کے علاقے سے اُترنا شروع کر دیا اور ابھی دھوپ پوری پھیلی نہیں تھی کہ واپس بستی میں پہنچ گئے۔ چوک میں دوپہر تک سامان کے بعد تجھل نے سیدھے سردار کے مکان کا رُخ کیا۔ سردار کا چہرہ جیسے میں تپا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اُس کے رویّے یکسانی نہیں تھی تاہم اُس نے خادماؤں کو بلا کے ہمارے لیے چائے اور دُو چیزیں منگوانے کا حکم دے دیا تھا۔ چائے کے دَوران جب تجھل نے بتایا کہ اُسے اپنا شبہ کچھ درست معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا قافلہ بھی کاغذا کے سلسلے میں دلچسپی رکھتا ہے تو سردار اُس کا منہ دیکھنے لگا۔ وہ اسی وا ہمارے سامنے ہی پیرو کو طلب کرنے کا حکم دینے والا تھا۔ تجھل نے اُسے کیا کہ ابھی وہ کچھ صبر کرے۔ سردار نے تجھل کی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ بستی کے چوک میں وزیر اور ہلاکر سے ہماری ملاقات ہوئی تو ہمیں معلوم کہ ہمارے جاتے ہی سردار نے پیرو کو طلب کر لیا تھا۔

شام ہوتے ہی ہم پھر یک ڈنڈلیوں پہ آگئے۔

میں، تجھل، جامو، سُولم، مارٹی اور سلطان صبح کپڑے بدلنے اور سا اُٹھانے کے لیے کوئی آدھے گھنٹے ہی اپنے میزبان جن وسا کے گھر تھے۔ اُس وقت جن وسا گھر سے نکل چکا تھا۔ شام کو ہم گھر کی طرف سردار کے ہاں سے آنے کے بعد کچھ وقت بستی کے چوک میں گزرا، پھر چڑھنے لگے۔ میرے دل میں آیا تھا کہ تجھل سے کہہ کے سلطان کو روک آج دوسری رات تھی۔ سلطان پھر ہمارے ساتھ اُوپر جا رہا تھا۔ صبح گھر داخل ہوتے وقت میں نے سلطان کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ وہ چاروں طر منڈلا رہی تھیں۔ تسانم ہمارے سامنے نہیں آئی تھی۔ عموماً وہی دروازہ تھی۔ دروازہ بھی خادمہ نے کھولا تھا۔ ہم کمرے میں گئے تو سلطان نہ کب چپکے سے باہر نکل گیا۔ ہم تیار ہو چکے تھے تب کمرے میں اُس

آئی۔ پتہ نہیں وہ اُسے ملی یا نہیں۔ ورنہ وہ اتنی دیر میں نہ لَوٹتا ۔ چہرہ کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ میں تجھل سے نہیں کہہ سکا اور کہتا تو کیا تھا کہ وہ میری بات مان ہی لیتا۔

بڑے مندر میں رات کا کھانا کھا کے ہم دوسرے مندروں کی طرف پروگرام کے مطابق پیرو اور وزیر وغیرہ چوتھے مندر میں موجود نے چوتھا نمبر اُسے اپنی سہولت کے لیے دیا تھا۔ مندر وہاں گنتی سے نے جاتے تھے۔ وہاں سے ہم سب ساتھ ہو گئے۔ سولم نے آگے جا کے بیر پر عمل کیا وہ قدیم مندر کی سیڑھیوں پہ بیٹھے ہوئے آدمیوں کے وف تھا کہ ہم اندر پہنچ گئے۔ آباجان ہماری راہ تک رہے تھے۔ ی زیادہ نہیں گزری تھی۔ ہم نے ہتھوڑیاں، چھینیاں، میخیں اور خیمے الے دوسرے اوزار صبح ہی اپنے اُوور کوٹ کی جیبوں میں چھپا لیے وکے ساتھ بھی یہی کچھ تھا۔ کل کی طرح مارٹی اور سولم کو ہم نے وڑ دیا تھا۔ اُن کی جگہ پیرو اور وزیر ہمارے ساتھ ہو گئے تھے۔ ہم تھے۔ زیرِ زمین زینوں اور سُرنگوں سے گزر کے جیسے ہی ہم جلتی بجھتی کے کمرے میں پہنچے، ہم نے ایک پل برباد نہیں کیا۔ آباجان نے اپنے ہوئے دَر سے تین دَر چھوڑ کے ایک دَر پہ نشان لگایا تھا۔ ہم نے اُسی لغ میخیں اور ہتھوڑیاں چلانی شروع کر دیں۔ تمام دروں پہ مٹی اور ی قسم کا دبیز پلاستر کیا گیا تھا۔ آباجان نے فرش سے ایک گز اُوپر کے کھدائی کرنے کی ہدایت کی تھی۔ پلاستر نے پہلی چند ضربیں جیسے ف لَوٹا دیں۔ اتنے برس گزرنے کے بعد بھی اُس کی سختی اور مضبوطی نہیں آیا تھا۔ فولاد کی چادر جیسا تھا۔ ہمارے پاس بڑے ہتھوڑے تھے۔ بہرحال جیسے تیسے ہم نے اپنا کام جاری رکھا اور فرش سے اُوپر تک مختلف جگہوں پہ ہتھوڑیاں مارتے اور چھینیاں چھوتے باجان کی کھدائی کا سامان کمرے ہی میں رکھا ہوا تھا۔ اس میں خاص ک دار چھینیاں تھیں۔ وہ ہمارے اوزاروں سے زیادہ کارآمد ثابت تھی لیکن اچانک آباجان نے ہمیں روک دیا اور ہم میں سے تین آدمیوں س پہ بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ تجھل، پیرو اور وزیر اُن کے کہنے پر دیوار ٹ گئے۔ دَر کی چوڑائی زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گز ہو گی۔ لمبائی آباجان ینچ کے محدود کر دی تھی۔ اتنی مختصر جگہ پہ بیک وقت ہم چھ آدمیوں کے لنے سے ہاتھ اُلٹے سیدھے پڑ رہے تھے اور ہم ایک دوسرے میں لتے تھے۔ آباجان کو کسی نے ہاتھ نہیں لگانے دیا تھا۔ انھوں نے یوں کو دیوار سے واپس بُلا لیا اور ہمیں دیوار میں قریب قریب چھینیاں کا مشورہ دیا۔ میں اس طرف، جامو اُس طرف، درمیان میں سلطان فاصلے سے دیوار کھودتے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم اپنی مقررہ حد میں ترتیب علامت نشان ڈال چکے تھے۔ کچھ نشان پہلے ہی پڑ چکے تھے۔ آباجان ہمیں وہاں سے ہٹا دیا اور تجھل، پیرو اور وزیر سے آگے بڑھنے کو کہا۔

قریب قریب ضربیں لگنے سے پلاستر کمزور ہو گیا تھا۔ تجھل پیرو اور وزیر کی چھینیوں سے جگہ جگہ پتھر جھانکنے لگے۔

آباجان نے ایک بار انھیں پھر ہٹا لیا اور ہمیں دوبارہ دیوار پر بھیجا۔ ہمارے ہاتھوں کو اُس وقفے میں سکون مِل گیا تھا۔ ہم نے وہ سارا پلستر پتھروں سے جُدا کر دیا۔ اندر موٹے موٹے سیاہ پتھر ننگے ہو گئے۔ اُن کی لمبائی چوڑائی سے اُن کی جسامت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ ہم وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتے تھے۔ اس سے پہلے کہ آباجان ہمیں پھر بُلاتے اور ہماری جگہ اور لوگ آتے، ہم نے پتھروں پہ بے تحاشا ہتھوڑیاں مارنی شروع کر دیں۔ ہر ضرب پر پتھر کی ایک چیخ سی بلند ہوتی تھی۔ میخیں ٹھونکتے ٹھونکتے ہم پر دیوانگی سی طاری ہو گئی تھی۔ آباجان نے ہی تجھل سے کہا ہو گا کہ اُس نے اور پیرو نے ہم پر جھپٹ کے ہمارے ہاتھوں سے اوزار چھین لیے اور ہمیں پیچھے دھکیل دیا۔

وہ سامنے کی بات تھی جو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ آباجان اسی کا اشارہ کر رہے تھے۔ ہمیں پتھروں کے درمیان صرف درزوں کے مسالے پر نشانے لگانے چاہیے تھے۔ درزوں میں مسالے کی تعداد اچھی خاصی تھی اور یہ ہمارے لیے ایک اچھی بات تھی۔ پتھر موٹے ہونے کی وجہ سے درزیں زیادہ بھی نہیں تھیں۔ ایک گز کی لمبائی میں اُوپر سے نیچے تک چار پتھر آتے تھے اور اِدھر چوڑائی میں چھ۔ تجھل پیرو اور وزیر نے آباجان کی ہدایت کے مطابق اُن کے جوڑوں میں لگے ہوئے مال ہی کو گرینے پر توجہ مرکوز رکھی۔ بعد میں اُن کی جگہ ہم پہنچ گئے۔ پھر اُسی طرح ہم باریاں تبدیل کرتے رہے اور اُس کے بعد ہم نے آباجان کی رائے کے بغیر کوئی چھینی نہیں ٹھونکی۔ باری باری آنے سے ہمیں اتنی تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن جیسا کہ آباجان نے کل رات کہا تھا، وہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ سبھی کو حیرت تھی کہ انھوں نے تنِ تنہا ایک دَر کیسے کھود لیا تھا۔ اس کا ملبا وہیں پڑا تھا۔ ہمارے ہاتھوں میں ایک ہی رات میں چھالے پڑنے لگے تھے اور ابھی دَر پوری طرح کھُدا بھی نہیں تھا۔ ساری رات کمرہ ٹھک ٹھک، ٹن ٹن کی صداؤں سے گونجتا رہا۔ اندر اتنی ٹھنڈ نہیں تھی جتنی باہر تھی۔ کھُدائی کرتے کرتے ہمارا سارا جسم پسینے میں بھیگ جاتا تھا۔ آباجان بار بار تاکید کرتے تھے کہ ہم آہستہ آہستہ ضربیں لگائیں لیکن جیسے ہی باری آتی تھی اور چھینی ہتھوڑی ہاتھ میں آتی تھی، جی چاہتا تھا کہ پتھر کے دو ٹکڑے کر دیں، اِسے تسخیر کر دیں۔ کاش اُن پر ہمارے چاقو چل سکتے۔ درزیں پتھر کی بڑی جسامت کی وجہ سے اتنی ہی گہری تھیں۔ ہم نے فرش اور پہلے پتھروں کے ساتھ جڑا ہوا مسالا نہیں چھوا۔ اتنے نیچے ہاتھ چلانا مشکل تھا۔ پہلے پتھر فرش ہی سے پیوست رہے لیکن یکسر تک اُن کے درمیان کی تمام درزیں ہم نے کھوکھلی کر دی تھیں۔ اس طرح اُن کی باہم پیوستگی خود بخود ڈھیلی پڑ گئی۔ سامنے کے جوڑوں کی بھرائی کا انھیں کوئی سہارا نہ رہا تھا۔ ہماری ہتھوڑیوں سے اور دوسرے اُن کے اپنے وزن کے دباؤ سے ایک دوسرے پر اُن کے گرنے میں صرف ایک ہی کسر رہ گئی

تھی کہ ہم پیچھے سے اُن کا مسالا نہیں چھیڑ سکے تھے۔ اُسی کے بل پر وہ ابھی تک اٹکے ہوئے تھے اور اپنی جگہ قائم تھے مگر مسالا مٹنے سے بیچ میں جو خلا پیدا ہو گئے تھے، اُن میں بڑی میخیں ڈالنے گاڑنے اور حرکت دینے کی گنجائش بہرحال نکل آئی تھی۔ ہمارے پاس کدال ہوتی تو اتنا وقت کبھی نہ لگتا۔ بستی سے کدالیں فراہم ہو سکتی تھیں لیکن انھیں ساتھ کیسے لایا جا سکتا تھا۔

ہمیں کوئی سا پہلا پتھر نکال دینا چاہیے تھا اسی لیے ہم نے اپنا سارا زور ایک ہی پتھر پر صرف کر رکھا تھا۔ پیچھے لگا ہوا مسالا ان مسلسل ضربوں کی تاب نہ لا سکا، اکھڑنے لگا۔ پہلے پتھر کے پچھلے جوڑ جیسے ہی کھلے وہ نیچے کے پتھر پر آ گرا۔ ہمارے ہاتھ اور بے قرار ہو گئے۔ ایک کے نکلنے کے بعد دوسروں کے پیچھے لگے ہوئے مسالے پر ہماری میخیں بآسانی پہنچ سکتی تھیں لیکن اسے اپنی طرف کھسکانا اور دوسروں سے جدا کرنا ہی کچھ کم دشوار نہ تھا۔ ہم نے اپنی انگلیوں سے مدد لی۔ انگلیاں چھلنے لگیں۔ پھر ہم نے میخیں ایک جانب اڑا کے زور لگایا۔ اُس کا ایک ذرا سا کونا ہی باہر نکل آتا تو وہ ہماری گرفت میں آ جاتا۔

اِسی ہڑ بڑ میں سلطان کی انگلی پر میری ہتھوڑی پڑ گئی اور وہ بلک پڑا۔ ابا جان فرش پر بیٹھے ہوئے تھل اور پیرو سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ تیزی سے اُٹھ کے ہمارے پاس آ گئے۔ سلطان کے بائیں ہاتھ کی چھنگلیا کا پورا ہتھوڑی سے پچک گیا تھا۔ میں نے جھٹ اُس کی انگلی اپنے منہ میں لے لی۔ مجھے آسنسول کے موتی اُستاد نے بتایا تھا کہ منہ کی گرمی سے خون نہیں جمتا اور لعابِ دہن اکسیر کا کام کرتا ہے مگر سلطان کو اس سے افاقہ نہیں ہوا۔ اُسے بٹھا دیا گیا۔ تھل ہولے ہولے اُس کا پورا دباتا رہا۔ کام رُک گیا۔ مجھے اُس سے بہت ندامت ہو رہی تھی حالانکہ سلطان کام جاری رکھنے پر آمادہ تھا بلکہ اصرار کر رہا تھا۔ تھل نے ہم تینوں کو دیوار سے ہٹا دیا اور ابا جان کی ہدایت پر بڑی میخیں ڈھیلے ہونے والے پتھر کے نیچے اڑا دیں۔ میخیں پوری طرح بیٹھ گئیں تو اُس نے انھیں ذرا اوپر اُٹھا کے پتھر کو جھنجوڑا اور اُس وقت بے اختیار سب کی چیخیں نکل گئیں جب پتھر کا ایک کونا باہر نکل آیا۔ پھر اُسے سموچا باہر نکالنا دشوار نہیں تھا۔ اُس کی جگہ اندر ایک فٹ گہرا خلا ہو گیا تھا۔ دوسرے پتھروں کے پچھلے جوڑوں کے مسالے پر ضربیں لگانے کے لیے اب کوئی بڑی رکاوٹ نہیں تھی۔

دوسرا پتھر جلد ہی ہٹ گیا۔ پھر تیسرا اور چوتھا۔ آدھے پیرو، وزیر اور تھل نکال چکے تھے کہ میں نے اور جامو نے اُن کے ہاتھوں سے اوزار لے لیے۔ سلطان نے بہت ضد کی مگر ہم نے اُسے بیٹھے رہنے دیا۔ باقی آدھے پتھر ہم دونوں نے جتنی جلدی ممکن ہو سکتا تھا، نکال باہر کیے۔ اندر کی اُدھڑی سی دیوار اب صاف نظر آنے لگی تھی۔ چھوٹے موٹے پتھر، کنکر، مٹی، چونا، ریت جو چیز بھی سامنے پڑی تھی اُنھوں نے شاید وہ سب ملا کے مسالا تیار کیا تھا اور اُسے پاٹ دیا تھا۔ ہم نے مختلف جگہوں پر ہتھوڑیاں مار کے اُس کی پختگی کا کسی حد تک تخمینہ لگا لیا تھا۔ مسالا مضبوط تھا، پتھر کنکر اس میں جکڑے ہوئے تھے لیکن اُس کی کھدائی میں آگے کی دیوار ... وقت پیش آنے کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔

تھکن ہماری پنڈلیوں تک پہنچ گئی تھی۔ سب کی سانسیں اُکھڑ ... تھیں۔ کمرے میں گرد و غبار جمع ہو گیا تھا اور روشنیاں بھی اُس میں ... گئی تھیں۔ نہ جانے کتنی بار پتھروں کا ریزہ ہماری آنکھوں میں پڑا تھا ... نکالتے نکالتے آنکھیں لال ہو گئی تھیں۔ ناک اور منہ میں بھی گرد ... تھی۔ شدید پیاس لگ رہی تھی اور پانی کی وہاں کوئی صورت ہی نہیں ... پیرو اور وزیر مسلسل کھانس رہے تھے۔ دھول نے سب کے چہروں ... کا رنگ بدل دیا تھا۔ انگلیاں جگہ جگہ سے چھل گئی تھیں اور ابھی ... دیوار سامنے تھی اور کوئی بھروسا نہیں تھا کہ ابا جان نے صحیح ... ہے۔ ممکن ہے ساری محنت ہی اکارت چلی جائے۔ اُس کے باوجود ... دیوار کی کھدائی کے لیے تیار تھے۔ چلتے وقت تھل نے مارٹی سے ... لی تھی۔ اُس نے ہمیں وقت بتایا اور باقی کھدائی ملتوی کرنے کا ... کر دیا۔ ابا جان نے اعتراض نہیں کیا۔ چار بج رہے تھے۔ ہمیں واپس ... تھا۔ ہم نے اپنے اوزار وہیں رکھ دیے۔

راستے میں ہم ایک چشمے پر منہ ہاتھ دھونے کے لیے کچھ دیر ٹھہرے ... اتنا ٹھنڈا تھا کہ ہاتھ جلے جاتے تھے لیکن سرائے میں جانے سے پہلے ... ٹھیک ہی رہنا چاہیے تھا۔ چند قطروں سے حلق تر کر کے ہم سرائے ... سولم کے ساتھ وہ سب وہاں موجود تھے۔ بستر پر لیٹتے ہی جسم میں ... لگیں۔ ہتھیلیوں میں درد اُٹھ رہا تھا۔ صبح بس ہوا ہی چاہتی تھی مگر ... بغیر ہمارا سفر کرنا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت تک ہمیں وہاں ... جب تک سرائے میں چائے کا انتظام نہ ہو گیا۔ اُس کے بعد ہم کہیں ... نیچے بستی میں آ گئے۔

پیرو نے تھل کو بتا دیا تھا کہ کل سہ پہر سردار نے اُسے ... اُس سے اُس کی کیا گفت گو ہوئی ہے۔ اُس کے بقول سردار نے ... کا ذکر چھیڑ دیا تو پیرو نے لاعلمی ظاہر نہیں کی۔ سردار نے اُس سے ... سوالات کیے جو تھل سے کیے تھے اور پیرو نے تقریباً وہی جوابات ... نے سردار کو دیے تھے۔ اُس نے بھی تھل کی طرح سردار سے راز دار ... لیا کہ وہ پہلے آنے والے قافلے سے اُن کے بارے میں کچھ نہیں کہے گا ... سردار کی تسلی کے لیے اور کم وقت دیا تھا، یعنی صرف دو مہینے ... کو جب یہ سب سنا رہا تھا، مجھے خیال آیا کہ اُس نے سردار سے ... کیوں کر کی ہوں گی۔ سولم جیسا کوئی آدمی اُس کے ساتھ نہیں تھا ... گیا۔ پیرو ایک مرتبہ پہلے بھی ہماری عدم موجودگی میں سردار سے مل ... ظاہر ہے سردار نے ترجمانی کے لیے ہندوستانی جاننے والے ... آدمی کو ضرور طلب کیا ہو گا اور قبیلے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ...

... نی سے خوب واقفیت رکھتے ہوں۔ کاغذات کی گم شدگی کے بعد ... ان آنا جانا اُن کا معمول تھا۔ سینکڑوں آدمیوں نے ہندوستان کا رُخ ... اور پھر تشانم! میرے ذہن میں یہ بات آئی ہی نہیں تھی کہ سلطان ... سے کون سی زبان میں بات کرتا تھا۔ سلطان تبتی نہیں جانتا تھا۔ ... کہ صرف دیکھتا ہی نہیں رہا ہوگا، اُس نے اُس سے بہت سی باتیں ... گی۔ عجیب عجیب باتیں۔ جیسے میں کیدا سے اور کورا مجھ سے کرتی ... کو بھی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی آتی تھی۔ میں اُسی وقت سلطان سے ... چاہتا تھا لیکن یہ فرصت کی بات تھی۔ ہم چوتھے مندر سے ابا جان ... ل جا رہے تھے۔ آواز تو کیا، ہم نے اپنی چاپیں بھی معدوم کر رکھی ... بہرحال اگر تشانم ہندوستانی جانتی تھی تو اُس کا مطلب ہے چن وسا ... جانتا ہوگا۔ اُس کے دو بیٹے ہندوستان جا چکے تھے۔ ہو سکتا ہے وہ ... وہاں گیا ہو اور تشانم بھی گئی ہو اور کیا عجب سردار نے اُسی سبب سے ... کو ہماری میزبانی کے لیے مقرر کیا ہو کہ وہ اپنے مکان میں ہمارے ... ن ہونے والی گفت گو کی سن گن لے سکے۔ ایسا ہی ہوگا۔ تھل نے اُسی ... ہم سب کو بند کمرے کے باوجود آپس میں گفتگو کرتے وقت احتیاط کی ... کی تھی۔ موٹی موٹی باتیں مجھ سے اوجھل ہو جاتی تھیں۔ میرا دماغ ہی ... کام نہیں کر رہا تھا۔ جب سے ابا جان کو دیکھا تھا، ہر لمحے بس اُنھی کا ... رہتا تھا یا کوئی دھیان ہی سر کے سے نہیں تھا۔ ہر وقت دل اُڑتا ... دماغ خالی خالی۔

اُسی دن پیرو نے بھی بستی کے چوک میں دوسرے کنارے پر اپنا ... لگایا۔ مرد، عورتیں، لڑکیاں اور بچے پھر اُسی کی طرف ڈھلنے لگے۔ ہمارا ... وہ کئی بار دیکھ چکے تھے۔ پیرو کے پاس ہم سے مختلف سامان تھا اور ... قیمت بھی کم لگائی۔ زورا اور وزیر جیسے ہمیں جتانے کے لیے صدائیں ... رہے تھے۔ اِدھر مارٹی اور سلطان نے بھی آوازیں لگانی شروع کر دیں۔ ... اُن کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ بستی کے چوک میں اچھی خاصی بھیڑ ... تھی۔ تھل نے کل کے مقابلے میں قیمتیں اور کم کر دیں۔ ہمارے دونوں ... خالی ہو گئے۔ اُس دن بھی چن وسا کے مکان سے ہم دو ہی صندوق ... تھے۔ پیرو نے خاصا سامان بیچ دیا۔ ہم نے احتیاطاً اپنے دستانے نہیں ... تھے، مبادا ہماری چھلی ہوئی انگلیوں پر اُن کی نظر پڑ جائے۔ بازار بڑھانے ... بعد جامو اور سلطان نے بستی کے دکان داروں سے مفلروں کے بدلے ... بھنا ہوا اناج، سردی سے بچنے کے لیے روغن اور کھانے پینے کی چند ... چیزیں خرید لی تھیں۔ اتنی ہی چیزیں کہ اُنھیں شک نہ ہو۔ پیرو نے بھی ... لیا ہوگا۔ بازار سے چن وسا کے مکان میں آ کے ہم نے اپنے ساتھ لائے ... سنگریزے بھی اُدھر کونوں میں چھپا لیے تھے۔ سورج غروب ہوتے ... اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ رات کو وہ ہمیں مقررہ جگہ پر مل گئے۔ مینی ... مارٹے اب بھی اُن کے ساتھ نہیں تھے لیکن وہ بتا رہے تھے کہ اُن کی ...

حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ تھل نے ایک تبدیلی کی۔ سلطان کی زخمی چھنگلیا کی وجہ سے اُسے سولم کے ساتھ باہر رہنے دیا جس کا کام معمول کے مطابق مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کی توجہ اتنی دیر تک اپنی جانب مبذول کرانا تھا جتنی دیر میں ہم مندر میں داخل ہوتے۔ بعد میں جب اُنھیں اندازے سے یقین ہو جاتا تھا کہ ہم اندر پہنچ گئے ہوں گے، وہ آزاد ہو جاتے تھے اور سرائے میں جا کے لیٹ جاتے تھے۔ سلطان اس تبدیلی پر بہت جھلایا۔ تھل نے اُس کی بات نہیں سنی۔ اُس کے بجائے اُس نے زورا کو ساتھ رکھ لیا۔ زورا سلطان کا صحیح بدل تھا مگر جب تھل سلطان کو اندر لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا تو اُسے گھر چھوڑ دینے میں کیا حرج تھا۔ سولم کے ساتھ آج ایک آدمی کم ہوتا تو سیڑھیوں پر موجود آدمی اتنے پریشان نہ ہوتے۔ سلطان نے دلیل بھی دی کہ زورا کی جگہ اُس کی تبدیلی وہ لوگ محسوس کر لیں گے۔ یہ دلیل بھی تھل کو متاثر نہ کر سکی۔ سالاؤ کی بھڑکتی روشنی میں مفلروں اور ٹوپیوں سے لپٹے ہوئے چہروں پر وہ اتنی نگاہ کہاں رکھتے ہوں گے۔ وہ بستی کے عام باشندے تھے اور صرف دو رونگ بستی کے نہیں جس میں ہم ٹھیرے ہوئے تھے، جانگ قبیلے کی دوسری بستیوں سے بھی اُنھیں بلایا گیا ہوگا۔ ابھی وہ ہمیں اتنا نہیں پہچانتے ہوں گے کہ چہروں میں امتیاز کرنے لگیں اور یہ لازم نہیں تھا کہ آج بھی وہی لوگ سیڑھیوں پر ہوں جو کل یا پرسوں یہاں تعینات تھے۔

ابا جان نے کوئی دیر نہیں کی۔ اندر پہنچتے ہی ہم نے اپنا ادھورا کام نمٹانا شروع کر دیا اور باریاں تبدیل کرتے رہے۔ دھول کل کی نسبت آج زیادہ اُڑ رہی تھی۔ مسالے میں مٹی کی آمیزش تھی۔ مٹی ملی ہونے کے سبب کھدائی میں اتنی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ سبھی طرح کے چھوٹے بڑے پتھر مسالے میں ڈال دیے گئے تھے، وہی تنگ کر رہے تھے۔ اُنھیں چھوڑ کے ہم اُن کے اِرد گرد جمے ہوئے مسالے ہی پر ضربیں مارتے تھے اُس سے وہ خود جگہ چھوڑنے لگتے تھے۔ پیرو کے سمجھانے کے باوجود زورا کی ہتھوڑیاں ہم میں سب سے تیز پڑ رہی تھیں۔ کل ہمارے ہاتھ دُکھنے لگے تھے تو آج عجیب قسم کے بودار مسالے نے سانس لینی مشکل کر دی تھی۔

جب میری باری ختم ہوتی تھی اور میں ابا جان کے پاس آ کے بیٹھ جاتا تھا تو میرا جسم سکڑنے اور کھنچنے سا لگتا تھا۔ ہر لحظے یہ دھڑکا رہتا تھا کہ وہ کچھ پوچھنے نہ لگیں۔ میں اُنھیں کیا کیا جواب دوں گا مگر ابا جان بیشتر مجھے دیکھتے ہی رہتے تھے، زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ کل بھی یہی ہوا۔ جامو اور سلطان کی باری بھی میرے ساتھ ختم ہوتی تھی۔ شاید اُنھی کی موجودگی کی وجہ سے وہ بات نہیں کرتے تھے۔ میری نظریں تو اُن کی طرف اُٹھتی ہی نہیں تھیں۔ بس ایک بار اُنھوں نے میرے ہاتھ ٹٹول کے دیکھے تھے، میرے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ اُن کا دل چاہتا ہوگا کہ وہ مجھے اپنے سینے میں بھینچ لیں۔ مجھے اُن کی عادت معلوم تھی۔ جو اُن کے دل میں ہوتا تھا، کسی کو اُس کا پتہ نہیں

چلنے دیتے تھے۔ گھر میں ہمہ وقت ہم سب کا خیال رکھتے تھے لیکن ہمیشہ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہم سب سے ناراض ہوں۔ صرف ممّی ایسی تھی جو اُن سے ہر بات منوا لیتی تھی۔ وہ اُس کا کہا کبھی نہیں ٹال سکتے تھے۔ ممّی اُن پر ایک طرح سے حکم چلاتی تھی۔ ہمیں اگر کوئی فرمائش کرنی ہوتی تو ہم ممّی ہی کے ذریعے ابّا جان سے کہلواتے تھے۔ کیا میں صبح سویرے میں اُن کے ساتھ ٹہلنے کیلیے جاتا تھا تو مجھ سے بس پڑھائی وغیرہ کے متعلق پوچھتے تھے مگر ایک دفعہ جب جہاں گیر کوٹھے سے گر گیا تھا اور بے ہوش ہو گیا تھا تو ابّا جان تین تین حکیم ڈاکٹر بُلا لائے تھے، مسلسل دو راتیں اُس کے سرہانے بیٹھے رہے تھے۔ جب تک جہاں گیر کو ہوش نہیں آ گیا، وہ اُس کے پاس سے نہیں اُٹھے۔ اُن کے قریب بیٹھ کے مجھے گھر یاد آنے لگتا تھا اور کبھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں گھر ہی میں بیٹھا ہوں اور میں بہت چھوٹا ہو گیا ہوں۔ چوکی والے کمرے میں امّی جان پان لگا رہی ہیں۔ ابّا جان ہوں ہاں کر رہے ہیں اور امّی انھیں سارے جہاں کی باتیں سنا رہی ہیں۔ اب نہ وہ گھر رہا تھا، نہ امّی تھیں۔ وہ سب خواب کی طرح گزر گیا تھا۔ ممکن ہے مجھے دیکھ کے ابّا جان بھی یہی سوچ رہے ہوں۔ کاش میں اُن کا دل پڑھ سکتا۔

کئی گھنٹے گزر چکے ہوں گے۔ ہم نے کوئی دو فٹ اندر تک دیوار کھود لی تھی۔ ابھی تک اُس میں سے کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی تھی۔ ابّا جان ہی کو معلوم تھا کہ ابھی اور کتنی کھدائی کرنی پڑے گی اور ہم نے اُن سے پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی کیونکہ وہ دیکھ ہی رہے تھے۔ جب تک وہ منع نہ کر دیں، ہمیں کھودنا ہی تھا۔ پانی ساتھ لانے سے بہت فائدہ ہوا۔ حلق میں گرد زیادہ ہو جاتی تھی تو ہم کُلّیاں کر کے منہ صاف کر لیتے تھے۔ ہم سے غلطی ہو گئی۔ کسی طرح ایک کیتلی لے آتے تو چائے بھی بن جاتی۔ فنجان جیب میں آسانی سے چھپائے جا سکتے تھے اور چائے کی پتی بھی۔ خشک لکڑیاں راستے ہی میں چُنی جا سکتی تھیں۔ کیتلی لانا البتہ مسئلہ ہوتا لیکن اُس کا بھی کوئی حل نکالا جا سکتا تھا۔ باری ختم ہونے پر ہم خشک میوہ ٹونگنے لگتے تھے۔ ہم نے کوئی آدھ فٹ کھدائی اور کی ہو گی کہ ابّا جان ہمیں روک کے دیوار کا غور سے جائزہ لینے لگے اور انھوں نے چھینی ہتھوڑی اپنے ہاتھ میں لے کے فوراً آہستہ آہستہ ضربیں لگانا شروع کیں۔ وہ اتنی احتیاط سے ہاتھ چلا رہے تھے جیسے پتھر تراش رہے ہوں، کسی مورتی کے خدوخال اُجاگر کر رہے ہوں یا کسی چیز کے پرت اتار رہے ہوں۔ ہم چند منٹ تک پوری توجہ سے انھیں دیکھتے رہے پھر ہم نے انھیں ہٹا دیا اور اُن کے بتائے ہوئے طریقے پر چھینیاں ہوست کرنے لگے۔ اُن کی بات کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی۔ ابّا جان کو اندر ضرور کچھ نظر آ گیا تھا۔ اِس خیال سے سبھی کے ہاتھ پیر پھولے جاتے تھے کہ ہماری محنت رائگاں نہیں جائے گی، ابّا جان نے صحیح دَر پر نشان لگایا ہے۔ اٹھارہ دروں میں یہ دوسرا دَر ہے جہاں کچھ چھپا ہوا ہے۔ ہم مٹی کھرچتے، مسالا کریدتے اور پتھروں کو ہاتھ ہی سے نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ دیوار کا نچلا

حصّہ تھا۔ فرش سے کچھ اُوپر۔ مَیں، جامو اور زورا دیوار پر تھے کہ زورا اُچھل پڑا، ابّا جان، پیرو، وزیر اور تجّل سب اُس کی طرف دوڑ پڑے۔ [...] کی لگائی ہوئی چھینی اندر تک چلی گئی تھی یقیناً اُدھر کوئی خول تھا۔ [...] کے کہنے پر ہم نے اُسی جگہ آہستہ آہستہ ہتھوڑیاں ماریں اور ایک سوراخ بن گیا۔ سوراخ میں ایک بڑی میخ ڈال کے ابّا جان نے اُسے اِدھر اُدھر گھما کے دیکھا۔ میخ کسی چیز سے ٹکرائی تھی۔ ہم نے سوراخ اور چوڑا کیا چوڑا کہ ہم اندر جھانک کے دیکھ سکیں۔ پہلے ابّا جان ہی نے اپنی چھڑی [...] کی روشنی میں جھانک کے دیکھا۔ جب وہ ہٹے تو اُن کے ہونٹ [...] رہے تھے اور آنکھوں میں جیسے قمقمے روشن ہو گئے تھے۔ انھوں نے [...] تجّل کے ہاتھ میں تھما دی۔ ہم سب نے اُسے دیکھ لیا تھا اور [...] کی گنجائش کا اندازہ بھی کر لیا تھا۔ زورا نے سوراخ اور بڑا کر دیا اور [...] میخ ڈال کے دیوار کو اپنی جانب زور سے جھٹکا دیا۔ کھدتے کھدتے [...] کا ایک حصّہ بہت پتلا اور کمزور ہو گیا تھا۔ زورا کے ایک ہی جھٹکے [...] گیا اور خول میں رکھا ہوا مٹی کا ایک بڑا برتن نمایاں ہو گیا۔

سب کی سانسیں ایک دم بندسی ہو گئی تھیں۔ ایک دوسرے [...] پہلو سے چمٹے ہوئے لمحوں تک ہم اُسے خیرہ کُن نظروں سے دیکھتے [...] وہ بالکل ٹھیک حالت میں تھا جیسے اُسے رکھے ہوئے چند ہی دن [...] اُس کی شکل عجیب و غریب تھی، اُسے نہ گھڑا کہا جا سکتا تھا، نہ جانے [...] گھڑے کے مانند چوڑا ہوتا ہوا وہ درمیان سے کچھ پچک جاتا تھا [...] مٹکے یا گھڑے کا درمیانی حصّہ کھینچ دیا جائے۔ اُس کی لمبائی کوئی ڈیڑھ دو فٹ کے قریب، چوڑائی کوئی سوا فٹ کے قریب ہو گی۔ چکنی مٹی [...] برتنوں پر جو شیشے اور نگ وغیرہ چسپاں کر دیے جاتے ہیں، اُس پر [...] کے شیشے اور نگینے پیوست تھے۔ جلد سفید رنگ کی تھی ایسی شکل کا [...] نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک چپٹی نما ڈھکن سے وہ بند تھا۔ [...] نہیں بڑھا سب ابّا جان کے منتظر تھے۔ ابّا جان ہی نے سب [...] اُنگلی میں چادر لپیٹ کے اُس کی جلد پر ہاتھ پھیرا اور اُس پر اُبھرے نگینوں کو ٹٹولا۔ اُن کی اُنگلیاں لرز رہی تھیں۔ پھر انھوں نے [...] غالباً وہ اُس کی مضبوطی کی پیمائش کرنا چاہتے تھے۔ "اسے احتیاط [...] اُن کی جھرائی ہوئی آواز اُبھری۔ "ٹوٹ نہ جائے۔"

زورا نے اُسے کولیا بھرنے کے انداز میں اُٹھانا چاہا [...] تھا۔ میں نے اُس کی مدد کی۔ ہم آہستہ سے اُسے اُٹھا کے فرش [...] آئے۔ ابّا جان نے نیچے چادر بچھا دی تھی تاکہ فرش کی ضرب [...] کا کوئی کونا ٹوٹ نہ جائے۔ "ڈھکن ہٹا کے دیکھو۔" ابّا جان نے حکم دیا [...] تجّل کھڑا رہا۔ زورا نے بڑھنے کی کوشش کی۔ اُس نے اُسے [...] دیا۔" میں نے کہا۔ "ڈھکن ہٹا کے دیکھو۔" ابّا جان تذبذب سے بولے [...]

"نہیں بڑے صاحب!" تجّل نے دبے لہجے میں کہا۔ "ہم کو [...]

کے کیا کرنا ہے۔ اِس کو دیکھنا آپ کا کام ہے، ہم کو دوسرا دَر بولو۔"

"دیکھیے تو اِس میں کیا ہے۔ کیا ہے؟"

"ابھی اِدھر کیا ہو گا بڑے صاحب!"

"یقیناً تصور سے سوا ہو گا۔ میں اِس دَر سے کچھ اور توقع کر رہا تھا۔" ابّا جان کی آواز دھک دھک کر رہی تھی۔ "ذرا دیکھیے تو کتنا بھرا ہے۔"

تجّل نے مزید ردّ و قدح نہیں کی، مجھے حیرت تھی کہ ابّا جان اُس کا ڈھکنا خود ہی کیوں نہیں اُٹھا دیتے لیکن وہ انکسار میں پیش قدمی نہیں کرنا چاہتے ہوں گے۔ جن لوگوں نے اُسے نکالا تھا وہ اُنھی کو موقع دینا چاہتے ہوں گے۔ تجّل نے ڈھکن ہٹا کے بیٹری کی روشنی ڈالی۔ اندر سے کرنیں پھوٹنے لگیں۔ تجّل کی آنکھیں چُندھیا گئی تھیں۔ اُس نے فوراً بیٹری بجھا دی۔ تجّل کو بہت اندر ہاتھ نہیں ڈالنا نہیں پڑا۔ وہ لبالب تھا۔ ہاتھ نکال کے تجّل نے مٹھی کھولی تو اُس کی ہتھیلی پر بہت سے پتھر جگمگا رہے تھے۔ تجّل نے اپنا ہاتھ ابّا جان کے آگے پھیلا دیا۔ ہم سب انھیں دیکھنے اُس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ تجّل کی ہتھیلی پر ستارے سے اُگ آئے تھے۔ ابّا جان مختلف ستارے اُٹھا اُٹھا کے انگلیوں میں تولتے اور سر ہلاتے رہے۔

"مبارک ہو بڑے صاحب!" تجّل مسکراتے ہوئے بولا۔ اُس کے ساتھ سبھی نے یک زبان ہو کے انھیں مبارک باد دی۔ صرف میں چپ کھڑا رہا۔ ابّا جان نے زبان سے کچھ نہیں کہا، تجّل کا بازو پکڑ کے ایک نظر اُسے دیکھا اور بولے "آپ نے اِسے دیکھا!"

"ہاں بڑے صاحب!" تجّل نے متانت سے کہا۔

"اندازہ کر سکتے ہیں کہ حاکم سیانگ کے پاس کتنا بڑا ذخیرہ تھا۔ بے شک بُدھ راہب بھی کچھ ذخیرہ اپنے ساتھ لائے تھے مگر.... مگر وہ اتنا نہیں ہو گا۔ اِس محل کی بناوٹ، اِس کمرے کی سجاوٹ سے اُس زمانے میں جانگ قبیلے کی خوش حالی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اِس میں بیشتر حاکم سیانگ کا جمع کیا ہوا ہو گا۔"

تجّل نے ہیرے دوبارہ برتن میں لوٹ دیے۔ "ابھی وقت ہے بڑے صاحب! اگلا دَر بولو۔"

"اگلا دَر.... اگلا دَر۔" ابّا جان کہیں کھوئے ہوئے تھے۔ تجّل کی آواز پر چونک پڑے۔ "میں اُسی کے بارے میں سوچ رہا ہوں اور ذہن میں کچھ تازہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دروں کے بارے میں کاغذات میں کوئی خاص وضاحت نہیں تھی یا شاید میں اُسے اخذ نہیں کر پایا ہوں۔ ایک جگہ کچھ اشارہ ملتا تھا، اُسی کی بنیاد پر میں نے اِن دروں کی آزمائش کی تھی۔ ہمارا وقت ضائع نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں ایک چھوڑ کے بعد کا دَر آزمانا چاہیے لیکن آپ لوگ تھک گئے ہوں گے۔ میرا خیال ہے باقی کل پر چھوڑا جائے۔"

"ابھی ٹائم پڑا ہے بڑے صاحب! اپن لوگ اُوپر کا پلستر ایک دم اُکھیڑ سکتا ہے۔" پیرو بولا۔ "جتنی جلدی ہو اچھا ہے۔"

ہم نے احتیاط سے برتن ایک کونے میں رکھ دیا تھا۔ اُسے لَوٹ کر نہیں دیکھا گیا۔ ابّا جان کی خواہش یہی معلوم ہوتی تھی کہ وہ اُسے لَوٹ کے ایک بار تمام کا تمام دیکھیں لیکن تجّل اور پیرو کی عجلت پر انھوں نے ارادہ دبا لیا۔ پہلے دَر کا تجربہ ہمیں خوب ہو چکا تھا۔ ہم نے اِدھر اُدھر چھینیاں مارنے کے بجائے ترتیب سے دیوار میں قریب قریب چھید کر دیے۔ پلستر تقریباً اُدھڑ چکا تھا اور اندر کے پتھر نظر آنے لگے تھے کہ تجّل نے چار بج جانے کی اطلاع دی۔ ہم نے کام چھوڑ دیا۔ دوسرے دن ہم نے دیوار کے پتھر نکال لیے۔ اُس رات ہم دیر سے پہنچے تھے۔ اِس لیے اندرونی دیوار کے پتھر نکالنے کے بعد پاٹا ہوا مسالا ڈیڑھ فٹ اندر تک ہی کھود سکے اور وقت ختم ہو گیا۔ تیسرے دن ہماری میخیں خول تک پہنچ گئیں۔ ابّا جان نے پھر صحیح دَر پر نشان لگایا تھا۔ اندر سے دھاتوں کے ٹکڑوں اور زیورات کا ایک بڑا ذخیرہ پھر برآمد ہوا تھا۔ وہ سب لکڑی کے ایک چھوٹے سے منقّش بکس میں رکھا ہوا تھا۔ سب اِن زیورات کو دیکھ کے دنگ رہ گئے۔ اِن میں طرح طرح کے گہنے تھے۔ ہار کے سوا ایسی طرز اور بناوٹ کے زیور اِس زمانے میں کہیں نہ بنتے ہوں گے۔ مختلف اوزان میں دھاتوں کے ٹکڑے الگ تھے۔ ابّا جان نے پتھروں سے گِھس کے انھیں دیکھا۔ وہ سب قیمتی دھاتیں تھیں۔ پہلا دَر ابّا جان نے کھولا تھا، دو ہم نے۔ پہلے دَر کے متعلق ہمیں کچھ نہیں معلوم ہو سکا کہ اُس میں کیا نِکلا تھا لیکن دوسرے دو دَروں سے جو چیزیں نکلی تھیں، وہی کچھ کم نہیں تھیں۔ میں ابّا جان سے کہتے کہتے رُک جاتا تھا کہ یہی دَر کافی ہیں لیکن کوئی اور مجھے اپنا ہم نوا نظر نہیں آتا تھا۔ دوسرے دَر کے بعد انھوں نے فوراً تیسرے دَر کے پلستر پر ہتھوڑیاں چلانی شروع کر دی تھیں۔ انھیں اِس کام میں شاید مزہ آنے لگا تھا۔ پانچ راتیں میخیں ٹھونکتے ٹھونکتے چھینیاں مارتے مارتے ہمارے ہاتھوں میں گٹّے پڑ گئے تھے مگر کوئی بھی اپنی تھکن کا دوسرے پر اظہار نہیں کرتا تھا بلکہ تقریباً ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ اُس کی باری ختم نہ ہو۔ دوسرا دَر کھلتے وقت اُن کے چہرے خوشی سے کِھل اُٹھے تھے۔ جیسے وہ کوئی بازی جیت گئے ہوں۔ جیسے ہی خول نظر آیا، وہ چیخ چیخ کر ابّا جان کو بلانے لگے۔ ابّا جان کے مشورے کے بغیر اب وہ ایک ہتھوڑی بھی زائد نہیں چلاتے تھے۔ سلطان کی ضد پر دوسری ہی رات تجّل نے اُسے ساتھ لے لیا تھا۔ اب اُوپر شولم سمیت چار آدمی رہ گئے تھے۔ جینی اور سارتے بھی چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے لیکن ابھی روز شام کو اُوپر جانے اور صبح بستی میں واپس آنے کی قوت نہیں رکھتے تھے۔

اِس دوران تجّل اور پیرو نے الگ الگ سعار کے مکان پر ایک مرتبہ اور حاضری دی تھی۔ انھوں نے اُسے مطمئن کرنے کی اپنی جیسی کوشش کی ہو گی مگر وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ اُسے زیادہ دیر تک روک نہیں

رکھ سکتے تھے۔ اِس کا احساس اُنھیں چوتھی رات مندروں کے علاقے میں بستی کے لوگوں کی بڑھی ہوئی تعداد سے ہو گیا ہوگا۔ شام ہوتے ہی دونوں قافلوں کے آدمی اُوپر کا رُخ کیوں کرتے ہیں۔ مختلف مندروں میں کیوں پھرتے رہتے ہیں۔ اُنھیں وہاں کس چیز کی تلاش ہے۔ کیا وہاں اُن کے کچھ اور لوگ بھکشوؤں کے بہروپ میں چھپے بیٹھے ہیں یا وہ کسی آدمی کی جستجو میں اُدھر جاتے ہیں جو اُن کے خیال میں کاغذات لے کے اِدھر آ گیا یا آیا ہی چاہتا ہے۔ سردار اور اُس کے ساتھیوں کے ذہن میں اَن گنت سوال اُبھرتے ہوں گے۔ اُس نے ایک بار اچانک ہمارے تین آدمیوں کو یرغمال بنانے کا فیصلہ اسی لیے کر لیا تھا کہ اسے ان سوالوں کے جواب جاننے کی بے چینی تھی۔ کسی وقت بھی وہ ایسا ہی کوئی اور فیصلہ پھر کر سکتا تھا۔ کم از کم یہی کہ ہم پر مندروں میں جانے کی پابندی عائد کر دے یا صرف دن کا وقت مقرر کر دے۔ دِن کو ہم کسی صورت میں قدیم مندر کے زیرِ زمین راستوں میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اُس نے ہمیں کھلا چھوڑ رکھا تو صرف اس لیے کہ ہمارے دو آدمی بستی میں بیمار پڑے تھے۔ ہمارا سامان بھی وہیں موجود تھا اور ہم بظاہر قبیلے کی زندگی میں کسی رخنے کا سبب نہیں بنے تھے اور ہمارے بقول ہم پر کوئی ایسی ویسی بندش عائد کرنے سے وہ کونپل مل جانے کا خدشہ تھا جو عرصے بعد قبیلے میں ہمارے آنے سے پھوٹی تھی۔ کاغذات ملنے کی یہ آس کسی طرح بندھی رہنی چاہیے۔ تجّل نے اُسے یہی تاثر دیا تھا کہ ہم بھی اُنھی کی کھوج میں ہیں مگر یہ تاثر کب تک قائم رہے گا۔ سردار کا پیمانہ ضبط کب تک نہیں چھلک پائے گا۔ پیرو نے اُس سے دو مہینے اور تجّل نے چار مہینے کی مہلت مانگی تھی۔ یہ مہلت خود اُن کی عائد کردہ تھی اور محض اس وجہ سے تھی کہ سردار کے پاس سوچنے کا سامان رہے۔ سوچ، جو اُس کے عاجلانہ فیصلوں میں رکاوٹیں کھڑی کر سکتی تھی اور ہمیں کچھ فراغت دے سکتی تھی لیکن فیصلے کی بنیاد ابھی تک موجود تھی اور سردار بستی میں اکیلا ہی نہیں تھا اور بھی لوگ، قبیلے کے بزرگ لوگ اُس کی سوچ میں شریک تھے۔

جب تجّل نے اُس سے کاغذات کا ذکر کیا تھا تو سب کو حیرانی ہوئی تھی کہ اُس سے کوئی لغزش تو سرزد نہیں ہو رہی ہے مگر اُس نے بستی میں چند دن گزارنے کے بعد سردار سے یہ ذکر کیا تھا۔ اگر وہ نہیں کرتا تو ہم اس طرح اُوپر آجا نہیں سکتے تھے اور سردار یہی کر سکتا تھا کہ وہ اُوپر چاروں طرف بستی کے آدمی پھیلا دے مگر وہ کچھ اور بھی کر سکتا تھا۔ وہ یہاں کا سردار تھا اور ہم پناہ گزیں۔

ابھی تین دَر باقی تھے اور یقینی نہیں تھا کہ اُن تین کی نشان دہی بھی اباجان ٹھیک ہی کریں۔ ٹھیک بھی ہو تو ایک دَر کے کھلنے میں ڈھائی راتوں کا وقت لگتا تھا۔ گویا تین دَروں کے لیے ایک ہفتہ۔ مزید ایک ہفتے تک ہم روز اُوپر جاتے اور واپس آتے رہیں گے اور سردار اپنے آدمیوں سے صرف ہماری سرگرمی کی اطلاعات سنتا رہے گا! اگر ہم کسی غلط دَر پر ہتھوڑیاں چلانے لگے اور باقی تین در سب سے آخر میں نمودار ہوئے تو ایک مہینہ بھی لگ سکتا تھا۔ اگر ہم اپنے تمام آدمی اُوپر لے جاتے تو دو دَروں پر بیک وقت کام کر سکتے تھے۔ ہم سب وہیں بند ہو جاتے اور دن رات وہیں رہتے تو چند دن لگتے۔ میں تجّل سے کہنا چاہتا تھا کہ یہی ایک تدبیر سب سے بہتر ہے۔ جینی اور سارٹے بھی ٹھیک ہو چلے ہیں۔ ایک رات پانی اور کھانا لے کے ہم سب بند ہو جائیں۔ وہ ہمارا سراغ کبھی نہیں لگا سکتے۔ تین دن تک ہم شب و روز محنت کر کے سارے در کھول لیں گے۔ ہو سکے تو کدالیں بھی ساتھ لے آئیں گے۔ اُس کے بعد جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ ہم اپنا کام تو کسی طور ختم کر ہی لیں گے اور ہمیں بار بار اُوپر نہیں آنا پڑے گا۔ تین دن بعد رات کے اندھیرے اور دُھند میں ہم برآمد ہوں گے تو کسی طرف بھی نکل جائیں گے۔ چلتے رہیں گے، چلتے رہیں گے اور جلد سے جلد اُس علاقے سے دُور ہوتے رہیں گے۔ پیچھے رکھے ہوئے سامان پر خاک ڈالی جائے۔ جتنا کچھ ہم بیچ چکے ہیں اور جتنا اور بیچ سکتے ہیں اُسی سے ہمارے پاس اتنے روپے ہوں گے کہ ہم آگے کسی منزل پر جا کے نئے قُلی اور سامان مہیا کر لیں۔

اچھا ہی ہوا کہ میں نے تجّل سے اپنی اُس تدبیر کا ذکر نہیں کیا۔ اُسے بتانے سے پہلے ہی مجھے اُس میں خامیاں نظر آنے لگی تھیں۔ تجّل سنتا تو شاید بہت ہنستا۔ اُوپر جانے کے بعد تین دن تک ہم باہر نہیں نکلیں گے تو وہ اپنی ساری آبادیاں اُوپر لے آئیں گے۔ اُن کے پاس بہترین قسم کے یاک ہیں جن کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے تو بھی راستے انھیں نظر آتے ہیں۔ بارش، برفانی طوفان وغیرہ کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ جھول داریوں، وافر غذا اور دوسرے سامان کے بغیر ہم کتنی دُور جا سکیں گے۔

ایک دَر کا خزانہ اباجان کے کہنے کے مطابق وہ ایک محفوظ جگہ منتقل کر چکے تھے۔ دوسرے دو دَروں کا خزانہ ہم نے بس اُس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے چھُو کے دیکھا تھا اور وہ بھی اباجان کی خواہش پر۔ جہاں تک میرے سامنے کی بات ہے کسی نے اباجان سے اُس کی منتقلی کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ اصولاً وہ بھی اُنھیں اُسی مخصوص جگہ پہنچا دینا چاہیے تھا۔ کاغذات سے اباجان کو تمام دروں سے نکلنے والے ذخیرے کا تھوڑا بہت علم ہوگا ہی اور اُنھوں نے اسی اعتبار سے اُس کے لیے کوئی بہت ہی محفوظ اور گنجائش کی جگہ ڈھونڈی ہوگی مگر کیا وہ پہلے سارا خزانہ اِسی جگہ پہنچانے کا ارادہ رکھتے تھے یا سارے در کھولنے کے بعد اُن کا ذخیرہ اُس کمرے میں کھلا رکھنے کا خیال تھا۔ کیونکہ وہ یہ تمام ہرگز اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے۔ ایک بھکشو زادِ راہ میں یہ انبار نہیں لیے پھرتا۔ وہ تھوڑا تھوڑا ہی ہندوستان منتقل کر سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ایک دَر سے نکلنے والے ذخیرے کے بقدر۔ اور یوں وہ قدیم مندر میں اپنی تلاش کی ہوئی محفوظ جگہ پر اتنا اعتبار نہیں کر سکتے تھے کہ تمام کا تمام پہلے وہاں پہنچا دیں اور اُس میں سے تھوڑا تھوڑا نکال کے ہندوستان لے جاتے رہیں اور

ہندوستان کا طویل دورہ کر کے واپس آئیں تو اُس جگہ پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ یہ بے احتیاطی اباجان سے ممکن نہیں تھی۔

تمام دَر ایک ہی بار کھودنے سے یہ اطمینان ہو جاتا تھا کہ اب بار بار زحمت نہیں کرنی پڑے گی۔ دوبارہ خزانے کی دوسری قسط لینے ہندوستان سے آئیں تو صرف آنا اور لے جانا ہی رہ جائے اور اُس طرح کل ذخیرے کا بھی اندازہ ہو جاتا تھا۔ ہمارے شامل ہونے کے بعد صورت کچھ بدل گئی تھی۔ اب وہ تنہا نہیں تھے۔ تمام دَروں کا ذخیرہ ایک ساتھ لے جایا جا سکتا تھا مگر کہاں سے؟ سرنگوں سے براہِ راست یا اباجان کی محفوظ جگہ سے؟ وہ محفوظ جگہ کہاں ہے؟ ظاہر ہے قدیم مندر سے زیادہ دُور نہیں ہوگی یا ہو بھی سکتی ہے۔ ہم قدیم مندر سے اپنے سروں اور کاندھوں پر لاد کے کیسے برآمد ہوں گے۔ ہر طرف قبیلے کے آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ سوچتے سوچتے میرا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ اباجان تک پہنچنا، دَر کھودنا مجھے اتنی بڑی بات نہیں معلوم ہوتی تھی جتنا دروں سے نکلا ہوا ذخیرہ اپنے صندوقوں میں منتقل کرنا اور بستی سے بہ خیریت دُور ہو جانا۔ ہو سکتا ہے اباجان اور تجّل کے درمیان کوئی بات ہوئی ہو۔ بہرحال دونوں دَروں کی دولت وہیں پڑی رہی۔ اُسے اباجان نے پہلے دَر کے مانند منتقل نہیں کیا۔ جواہر کا برتن اور زیوروں کا صندوق دونوں کمرے کے ایک گوشے میں رکھ دیے گئے تھے اور تیسرے دَر کی کھدائی شروع کر دی گئی تھی۔

تجّل نے سردار سے ایک بار کنایتہً کہا تھا کہ مندروں کے علاقے میں کاغذات سے متعلق کوئی اشارہ مِل سکتا ہے۔ بات واضح نہیں تھی مگر سردار کا ذہن وہاں موجود بھکشوؤں کی طرف جا سکتا تھا۔ گو وہ بھکشوؤں پر شک کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ اُن کے دل میں اُن کا درجہ بہت بلند تھا لیکن اِن حالات میں بربنائے مصلحت وہ یہ روایتی احترام بالائے طاق رکھ کے کوئی جرأت نہیں کر سکتے!۔ اور اُن کی نگاہ پھر فوراً ہندوستانی شکل و صورت کے بھکشوؤں پر جائے گی۔ اباجان اپنے منڈے ہوئے سر، بدلے ہوئے حلیے، تبتی زبان سے واقفیت کے باوجود صاف ہندوستان سے تعلق رکھنے والے آدمی تھے۔ دس مختلف قوموں کے بھکشوؤں کے درمیان اُن کے ہندوستانی خط و خال علیحدہ سے پہچانے جا سکتے تھے۔ ہم نے اپنی طرف سے اباجان یا کسی بھکشو سے اپنے تعلق کا شائبے کی حد تک بھی اُنھیں موقع نہیں دیا تھا مگر وہ خود ہی اپنے طور پر بھکشوؤں خصوصاً ہندوستان سے آنے والے بھکشوؤں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنی شروع کر سکتے تھے۔

⚜

دوسرا دَر کھولنے کے بعد ہم سرائے میں کچھ وقت گزار کے دِن کے اوّل پہر بستی میں واپس آ گئے تھے اور بازار لگا کے ہم نے اپنا کچھ سامان اور نکال دیا تھا مگر جلد ہی پیرو اپنے صندوق لے کے چوک میں آ گیا اور اونے پونے مال لٹانے لگا۔ جب تک ہم چوک میں بیٹھے رہے، پیرو کے سامان کے گرد تانتا بندھا رہا۔ اُس دن اُس کے پاس شاید ہی کچھ باقی رہ گیا ہو۔ اُنھی صندوقوں کا سامان جو وہ بستی کے چوک میں اپنی قیام گاہ سے نہیں لایا تھا، اُس نے ضرور کچھ روک کے رکھا ہوگا۔ مال فروخت کر کے پیرو نے بازار سے خریداری بھی کی۔ اناج کے تھیلے، چائے، چھینیاں، ہتھوڑی، کدالیں اور دوسری مختلف چیزیں۔ اسی شام ہم اپنے وقت کے مطابق مندروں کے علاقے اور مختلف مندروں میں گھومتے رہے۔ پیرو ہمیں کہیں نہیں ملا۔ ہم قدیم مندر میں بھی تھوڑی دیر کے لیے گئے۔ اباجان بھی وہاں موجود نہیں تھے۔ رات گئے ہم سرائے میں آ کے لیٹ گئے اور صبح سویرے بستی میں واپس آ کے سیدھے سردار کے مکان پر پہنچے۔ ہماری آمد بے وقت تھی۔ سردار نے ہمیں اپنے خاص کمرے میں طلب کر لیا۔ اُس کی گردن تنی ہوئی تھی۔

"اپنے کو پتہ چلا ہے کہ دوسرے قافلے کے کچھ لوگ اِدھر بستی سے واپس جا رہے ہیں۔" تجّل نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔

سردار نے اثبات میں صرف ایک ہی مرتبہ گردن کو جنبش دی۔

"وہ کیا بولتے ہیں، ہو سکے تو ہم کو بتاؤ۔"

سردار چند لمحے چپ رہا پھر سپاٹ آواز میں بولا۔ "وہ جانا چاہتے ہیں۔"

"کدھر؟ تم نے پوچھا کہ وہ کدھر جانا چاہتے ہیں؟"

"ہم نے ضرورت نہیں سمجھی۔"

"تم نے ضرور پوچھا ہوگا۔" تجّل اُونچے لہجے میں بولا۔ "ایسا نہیں ہوگا کہ تم نے نہیں پوچھا ہوگا۔ تم کو اُنھوں نے غلط بولا ہو تو یہ دوسری بات ہے۔"

"تمھارے خیال میں وہ کس طرف جانا چاہتے ہیں؟" سردار نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"تم بھی سمجھتے ہو، ہم سے کیا پوچھتے ہو۔"

"ہم کچھ نہیں سمجھتے۔"

"سردار!" تجّل نے ترشی سے کہا۔ "اپنے سے کچھ چھپاؤ گے تو اپنا بھلا نہیں کرو گے۔ خیر، جانے دو۔ اُس نے تم سے جو کچھ بولا ہے، ہم کو مت بتاؤ۔ تم کو جلد ہی اُجلے کالے کا پتہ چل جائے گا۔ ابھی ہم تم سے ایک بات بولنے آئے ہیں، اپنے دو آدمی بھی اُن کے ساتھ کر دو، تمھارے لیے یہ اچھا ہی ہوگا۔"

"کِس کے دو آدمی؟" سردار تردّد سے بولا۔

"ہمارے دو آدمی! سمجھو ہم کیا بول رہے ہیں۔ ہم کو تم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ ابھی ہم چاہیں تو وہ لوگ اِدھر سے سالے کبھی اپنے ہاتھ پیر ٹھیک نہیں لے جا سکتے۔ پہلے بات ہم سے ہوئی ہے — اور تم نے وعدہ کیا ہے کہ تم اپنی مدد کرو گے۔ ہم نے تم سے کوئی مدد نہیں مانگی ہے۔ ایک بات بولتے ہیں۔ سوچ سمجھ کے فیصلہ کرو۔ وہ واپس جانے کو

بولتے ہیں یا کِدھر ہی کو۔ بولو کہ یہ دو آدمی جو اُدھر جانا مانگتے ہیں اِن کو بھی ساتھ رکھ لو۔ تمھاری بات وہ منع نہیں کریں گے اور منع کرے تو زور دے کے بولو کہ کچھ ہی دُور تک اُن کو ساتھ رکھو۔ جہاں کوئی دوسرا قافلہ ملے۔ اِن کو الگ کر دینا۔ اُدھر پھر اپنے آدمی خود نبٹ لیں گے اور تم کو یہ سب بولنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وہ کبھی منع نہیں کریں گے۔"

"تم خود کیوں نہیں کہتے؟"

"تمھاری بات اور ہے۔ تمھارا اُس میں کچھ نہیں جاتا۔ پر ہم اِدھر بھاڑ جھونکنے نہیں بیٹھے ہیں۔ اپنا بہت کچھ جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے اپنا آدمی اُدھر سے اُن سے پہلے اِدھر واپس پہنچ جائے۔ اس میں تمھارا کیا حرج ہے؟"

"ہمارا کوئی حرج نہیں،" سردار بیزاری سے بولا۔

"پھر کیا ہے؟" تجّل نے کہا۔ "جیسا ہم بولتے ہیں ویسا ہی کرو۔ وہ سالا منمنائے گا پر ہم جانتے ہیں، اُس نے تم کو اپنے جانے کا صاف مطلب نہیں بولا ہوگا۔ ہم اپنے آدمی ویسے بھی اُن کے پیچھے کر سکتے ہیں۔ پر راضی خوشی بات بن جائے تو ہمارا تمھارا دونوں کا بھلا ہے۔"

سردار نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ تجّل نے اُس کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا۔ اُس سے اجازت لیے بغیر اُٹھ کے چلا آیا۔ اُسی دن سفر کے لیے کئی ضروری چیزیں ہم نے بازار سے خریدیں اور اُنھیں گھر میں رکھ کے شام کو ہم پیرو کی قیام گاہ پہنچے۔ سردار نے اُسے بلا کے کہہ دیا تھا۔ بستی کے دوسرے لوگ بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ پیرو ہم سے بہ ظاہر بے اعتنائی سے ملا۔ تجّل نے اُس سے اپنے دو آدمیوں کو ساتھ لے جانے کو کہا تو اُس نے بگڑے ہوئے منہ سے قبول کر لیا۔

رات بھر ہم چن وسا کے مکان ہی میں رہے۔ کوئی سات دن ہو گئے تھے۔ ہم کسی رات بھی سرائے میں ایک آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں سو پائے تھے یا سہ پہر کو کبھی کبھی پہاڑی پر دو ایک گھنٹے۔ سبھی کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ ٹانگوں میں رہ رہ کے درد اُٹھنے لگتا تھا اور جسم ٹوٹے سے جاتے تھے۔ چن وسا کے ساتھ رات کا کھانا کھا کے جیسے ہی ہم لیٹے، تن من کا ہوش نہیں رہا۔ سردار خان اُس رات بھی دیر تک نہیں سو پایا ہوگا۔ اتنی راتوں بعد آج تشانم سے بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ کھانے کے وقت میں نے کئی بار اُسے دیکھا تھا۔ اُس نے آج خوب صورت کپڑے پہن رکھے تھے اور شرمائی شرمائی سی لگتی تھی۔ گال اُس کے جیسے کچھ اور لال ہو گئے تھے۔

صبح ہوتے ہی مارٹی اور سولم سفر کے لیے تیار تھے۔ اُنھوں نے تمنچے، کارتوس، دو صندوق، ایک [illegible] بستر اور چند تھیلے اپنے ساتھ رکھ لیے تھے۔ تمام چیزیں جو کل شام ہم نے اُن کے لیے خریدی تھیں، آدھی سے زیادہ خود روک لی تھیں خصوصاً چائے، کھانے پینے کا سامان اور کدال۔ بستی کے کنارے مینی، پلٹو اور زورا روانگی کے لیے تیار کھڑے تھے اور ہماری آمد کے منتظر تھے۔ اُن کے پاس بھی دو بندوقیں تھیں۔ یاک کی کمر سے اُن سب کا سامان لٹکا دیا گیا جو پانچ یاکوں پر بخوبی آ گیا تھا۔ تین قلی اُن کے ہمراہ تھے۔ تجّل اور پیرو نے الگ الگ لے جا کے اپنے آدمیوں کو ہدایتیں دیں۔ سورج چڑھنے سے پہلے وہ ہم سے رخصت ہو گئے۔

تجّل نے اُس دن بھی مندروں کے علاقے کا رُخ نہیں کیا۔ سارا دن یا تو ہم بستی کا چکر لگاتے رہے یا اطراف کے پہاڑوں پر گشت کرتے رہے۔ تجّل اور جامو نے بندوق سے بہت سے پرندوں کا شکار کیا۔ اُس میں سے اچھا شکار اُنھوں نے سردار کے لیے بھجوا دیا۔ پیرو نے اُس روز بھی بازار لگایا تھا۔ سہ پہر کو وہ بھی ہمیں پہاڑوں میں گھومتا ہوا مل گیا تھا۔ ہم میلوں پگڈنڈیوں پر چلتے رہے تھے لیکن اندھیرا ہوتے ہوتے اپنے اپنے گھر لوٹ آتے تھے۔ دوسرا دن بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ میں نے اُن کی کچھ باتیں سُن لی تھیں اور چونکہ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے چُپ ہی رہا تھا۔ تیسرے دن ہم مندروں کے علاقے میں جا کے دن ہی دن میں واپس آ گئے۔ پیرو ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ ابا جان اُدھر کہیں ہمیں دکھائی نہیں دیے تھے۔ ہم قدیم مندر کی عمارت میں بھی نہیں گئے تھے اور ابا جان سے ملنا مقصود بھی نہیں تھا۔ اب بھی بستی کے آدمی اُوپر تعینات تھے لیکن اُن کی تعداد نسبتہً کم تھی۔ سولم کے نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں لوگوں سے بات کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔ اتنے عرصے میں جو تھوڑی بہت تبتی آ گئی تھی، ہم اُسی سے کام چلا رہے تھے۔ تشانم کے حوالے سے، ہمیں یقین تھا کہ ہمارا میزبان بوڑھا چن وسا بھی ہندوستانی جانتا ہے مگر وہ اٹکل اٹکل سے ہماری تبتی سنتا اور اشاروں میں ہمیں جواب دیتا رہا۔ اُس نے ایک ہندوستانی لفظ بھی منہ سے پھوٹ کے نہیں دیا لیکن سردار نے ایسا نہیں کیا۔ اُسے معلوم تھا کہ تبتی جاننے والا ہمارا آدمی اب ہمارے درمیان نہیں ہے۔ سو ہم تیسرے دن ولایتی شراب کی ایک اور بوتل، نفیس قسم کے کپڑے، قینچیاں اور اُسترے لے کے اُس کے پاس پہنچے تو اُس نے ایک بوڑھے ترجمان کو فوراً بلا لیا۔ سردار توقع کر رہا ہوگا کہ ہم اُس سے کوئی اہم بات کہنے آئے ہیں لیکن ہمارے پاس آنے والے دنوں کے لیے امیدوں اور آرزوؤں کے اظہار کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سردار بہت افسردہ تھا۔ تھکا تھکا سا، کھویا کھویا سا۔ اُس نے ہم سے زیادہ بات بھی نہیں کی۔ تجّل بھی زیادہ دیر اُس کے پاس نہیں بیٹھا۔

یہ تین دن ہم بستی کے پہاڑوں کی ایک طرح سے سیر کرتے رہے۔ دن بھر شکار کرتے اور گھر لوٹ کے سارا شکار چن وسا کے سپرد کر دیتے۔ وہ کچھ روک کے باقی سب بستی کے ممتاز لوگوں میں اپنے خادم کے ذریعے

تقسیم کرا دیتا۔ تین راتوں تک ہم اپنا شکار کیا ہوا بھنا گوشت کھاتے رہے۔ وہ یاک کے مکھن میں بھونا جاتا تھا۔ شروع شروع میں یاک کے دودھ اور مکھن سے ہمیں بہت کراہت محسوس ہوتی تھی، جی متلانے لگتا تھا۔ رفتہ رفتہ ہم اُس کی مہک کے عادی ہو گئے اور بہت سی چیزیں منہ کو لگ گئی تھیں۔ سولم اور مارٹی کے جانے سے ہم خالی خالی سے ہو گئے تھے۔ ہم صرف چار رہ گئے تھے۔ تجّل، میں، جامو اور سلطان۔ اُدھر بھی پیرو کو ملا کے چار ہی آدمی تھے۔ وہ خود، وزیر، سارٹے اور رہلا کو۔

اور ایک رات، ساری رات ہم سوتے رہے اور ناشتے کے بعد بید کی زنبیلیں اُٹھا کے پھر بستی کے اِرد گرد پھیلے ہوئے پہاڑوں کی طرف نکل گئے۔ گزشتہ دو روز سے شکار لانے کے لیے یہ زنبیلیں ہم اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ چلتے چلتے ہم بستی سے خاصی دُور گھنے جنگل میں چلے آئے۔ پیرو بھی کچھ دیر بعد ہمارے ساتھ آ ملا تھا۔ جب تک اندھیرا نہیں ہو گیا، ہم سب اُونچے درختوں کے ایک جھنڈ میں پڑے رہے۔ وہیں ہم نے خشک لکڑیوں کا ایک گٹھا تیار کر لیا تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی بستی میں واپس جانے کے بجائے ہم درختوں کے نیچے نیچے اور اُوپر بڑھتے گئے۔ جہاں تک ہم جوتے پہن سکتے تھے، پہنے رہے۔ بہت اونچائی پر آنے کے بعد ہم نے جوتے اُتار کے زنبیلوں میں رکھ لیے۔ موزوں پر ہی اکتفا کیا اور کانٹوں، جھاڑ جھنکاڑ سے بے نیاز آگے ہی بڑھتے رہے۔

آدھی رات کا وقت ہوگا کہ ہماری منزل سامنے تھی۔ قدیم مندر۔

تین دن تک یہاں آنے کے لیے ہم پہاڑوں میں ایسا ہی کوئی راستہ ڈھونڈنے کی تگ و دو کر رہے تھے۔ قدیم مندر دوسرے مندروں کے مقابلے میں کسی قدر نشیب میں واقع تھا اور بستی سے اُوپر ایک وسیع سبزہ زار پہاڑی سلسلے ہی سے متعلق تھا۔ اُس کے ایک جانب تو مندروں کا علاقہ تھا، دوسری طرف عموماً ڈھلوان، ستواں نشیبی سلسلہ تھا اور گھنا جنگل اُگا ہوا تھا۔ مندروں کے علاقے سے یہاں آنے کے لیے صاف راستے کی موجودگی میں لوگ یہ دُشوار گزار راستہ کیوں منتخب کرتے۔ انسانی پیروں سے بچے رہنے کی وجہ سے یہاں جھاڑ جھنکاڑ کی بہتات تھی۔ ہم سرِ شام ہی قدیم مندر سے قریب ایک نشیب میں آ کے رُک گئے تھے۔ اِس جگہ تک پہنچنے کے لیے ہمیں پہاڑوں پہاڑوں ایک طویل چکر کاٹنا پڑا تھا۔ ہم جنگل کے اندر اندر ہی چلتے رہے تھے۔ اُونچے درختوں نے ہماری نقل و حرکت پر ایک پردہ سا ڈال رکھا تھا۔ اُوپر سے کوئی ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن جب تک دن تھا، بھولے بھٹکے کسی کی نظر ہم پر پڑ سکتی تھی۔ ہم نے اِسی لیے اندھیرا ہونے کا انتظار کیا۔ اُس وقت تک ہمیں کوئی دیکھ بھی لیتا تو یہی سمجھتا کہ ہم شکار کرتے کرتے اِس طرف آ نکلے ہیں مگر پھر ہمیں آج کا دن ملتوی کرنا پڑتا۔ تین دن سے ہم کسی ایسی جگہ کی نشان دہی کی کوشش میں تھے جو چڑھائی کا باقی سفر طے کرنے کے لیے مندروں سے دُور نہ ہو اور جہاں اندھیرا ہونے تک ہم آسانی سے چھپ سکیں۔ آگے ہمیں کھائیوں اور دوسری ہزار قسم کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ یہ باقی سفر ہمیں اندھیرے میں عبور کرنا تھا۔ لہٰذا وہ جگہ لازماً قدیم مندر سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہونی چاہیے تھی تاکہ رات ہی رات میں ہم وہاں پہنچ سکیں۔ آگے کا راستہ ہمارا دیکھا بھالا نہیں تھا مگر اتنے دنوں پہاڑوں میں رہنے کے بعد ہم پیش آنے والی دشواریوں کا نقشہ بخوبی اپنے ذہن میں قائم کر سکتے تھے۔ پھسلواں زمین پر پاؤں جماتے، درختوں کا سہارا لیتے، ایک دوسرے کی کمر سے رسّیاں باندھ کے، کہیں زمین سے چپکتے اور رینگتے کھائیوں اور کانٹے دار جھاڑیوں سے بچتے اور اپنی چاپیں دباتے ہوئے گہرے اندھیرے میں جس طرح ہم نے یہ مختصر فاصلہ عبور کیا، وہ خود ہمارے لیے تعجب انگیز تھا۔ کئی جگہوں پر عمودی چڑھائی نے ہمارا راستہ کاٹ کاٹ دیا اور ہم گھومتے ہوئے پھر اپنے راستے پر آ سکے۔ بعض جگہ تو سامنے ایک دیوار سی کھڑی معلوم ہوتی تھی۔ ہمیں تقریباً ساری رات لگ گئی مگر اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اُوپر پہنچنے کے لیے ہم ایسا کوئی راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ آخر کار قدیم مندر کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی عمارت ہمارے سامنے تھی۔ ممکن ہے سیڑھیوں پر اب بھی بستی کے آدمی بیٹھے ہوں لیکن ہمیں اُنھیں دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ عقبی دروازے سے ہم اندر داخل ہوئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور ابا جان مشعل کی مدھم روشنی میں وہاں مراقبے میں ڈوبے ہوئے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم زیرِ زمین کمرے میں موجود تھے۔ زنبیلوں میں کمبلوں کے نیچے دو کدالیں رکھی تھیں۔ اِن میں سے ایک پیرو لایا تھا۔ کھانے پینے کا سامان، خشک لکڑیوں کا گٹھا، چائے، کیتلی، مشکیزے ہمارے ساتھ تھے۔ شاید تجّل کو یقین تھا کہ ابا جان باقی تین دروں پر نشانات لگانے میں غلطی نہیں کریں گے۔ اُس نے چار دن مقرر کیے تھے۔ تیسرے دن رات ہی کو ہم اپنا کام ختم کر چکے تھے لیکن وہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہمارا باہر نکلنا مناسب نہیں تھا۔ ہم نے چوتھا دن لمحے لمحے گن گن کے گزارا۔ ان تین دروں سے مجموعی طور پر زیادہ بڑا ذخیرہ برآمد ہوا تھا۔ ہم آٹھ آدمیوں کے کپڑوں کی جیبوں، ابا جان کے کشکول، اُن کے لبادے میں چھپی ہوئی ہمیانی اور بندی ہی میں بہت سے پتھر آ گئے تھے۔ بڑا حصہ ہم نے زنبیلوں میں محفوظ کر لیا تھا۔ جو باقی بچا، اُس کی پوٹلیاں بنا لی تھیں۔ جہاں تک ہو سکا ہم نے زیادہ سے زیادہ حفاظت اور کم سے کم مدت میں وہ سب سمیٹنے کی کوشش کی تھی۔ ابا جان کو جار اور دوسرے برتن وہیں چھوڑ جانے کا افسوس تھا۔ تیسرے در سے نکلنے والا منقش بکس البتہ ہم نے جوں کا توں رہنے دیا تھا۔ ابا جان نے پہلے در کا خزانہ جو ایک جگہ چھپا رکھا تھا، وہ پہلے ہی اُسے واپس کمرے میں لے آئے تھے۔

چار دن تک ہم نے آسمان نہیں دیکھا۔ کمرے میں ہر طرف بے ترتیبی

تھی۔ چھ دروں کا ملبا، زر و جواہر کا انبار، ساتھ لایا ہوا سامان اور ہم نو آدمی۔ دیواروں میں جا بجا لگے ہوئے شیشوں اور نگینوں کی روشنی آنکھوں میں کھبنے لگی تھی۔ تیسرے روز تک تو ہم باریاں تبدیل کرتے، نیند لیتے اور لکڑیاں جلا کے چائے بناتے رہے۔ چوتھے دن لیٹنے کے سوا ہمیں کوئی کام نہیں تھا۔ کسی نے بے ضرورت کمرے سے باہر قدم بھی نہیں نکالا تھا۔ ضرورت کے لیے اباجان نے وہیں ایک میخ ٹھکوا کے رسی باندھ دی تھی جو باہر کسی ایک سُرنگ میں کچھ ہی دُور تک جاتی تھی۔ وہاں دن اور رات کا کوئی امتیاز نہیں ہو پاتا تھا۔ تجمل کے پاس گھڑی تھی۔ سب وقفے وقفے سے اُس سے وقت پوچھتے تھے کہ کہیں تجمل سے اُس کے حساب میں کوئی چوک نہ ہو جائے۔ وقت کہیں چپکے سے نکل نہ جائے۔ سب کو اتنی عمریں شب و روز کاٹتے ہوئے ہو گئی تھیں لیکن لگتا تھا کہ یہ اُن کی زندگی کا پہلا دن ہے اور اُس سے پہلے وقت گزرنے کا انھیں کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ دن کے دس بجے تجمل نے کسی کے پوچھنے پر وقت بتایا تو انھیں یقین نہیں آیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ شاید گھڑی خراب ہو گئی ہے۔ پھر کان لگا کے وہ اِس کی ٹِک ٹِک غور سے سُنتے تھے۔ انھیں ڈر تھا کہ کھدائی کرتے کرتے گھڑی پر کوئی ضرب نہ پڑ گئی ہو، سوئیاں آگے پیچھے نہ ہو گئی ہوں۔ سوئیاں ٹھیک ہی تھیں مگر وہ بس چکر لگا رہی تھیں اور وقت تھم گیا تھا۔ جیسے آدمی مر جائے اور اُس کی کلائی میں بندھی گھڑی چلتی رہے۔ سب گرے گرے جاتے تھے۔ سب نے برسوں تنگ کوٹھڑیوں میں بتائے تھے۔ یہاں چند دن بھی گزارنا دوبھر ہو گیا تھا۔ وہاں سورج تو نکلتا تھا۔ نئی ہوا تو چلتی تھی۔ یہاں برسوں پُرانی ہوا بند تھی۔ زنگ لگی ہوئی شکستہ، بوڑھی ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہم بھی اس عرصے میں بوڑھے ہو گئے ہیں۔ یہاں آئے ہوئے ایک مدت ہو گئی ہے، چاندنی، دھوپ دیکھے ہوئے زمانہ گزر گیا ہے۔

تجمل نے ٹھیک گیارہ بجے کا وقت مقرر کیا تھا اور اُن کی تسلی کے لیے جیبی گھڑی فرش پر رکھ دی تھی تاکہ وہ خود اُسے دیکھتے رہیں۔ آدھ گھنٹے پہلے ہی وہ سب کھڑے ہو گئے تھے۔ ہمارا سامان کب کا تیار پڑا تھا لیکن تجمل نے وقت پورا کیا۔ چلتے وقت کسی نے پلٹ کے کمرے کو نہیں دیکھا۔ اباجان ہم سب سے آگے تھے اور اُن کی رفتار کسی قدر تیز تھی۔ سب سے پہلے وہی باہر نکلے پھر اُن کے اشارے پر ہم سب۔ باہر آتے ہی چکر سے آنے لگے تھے۔ چند لمحوں تک ہم دیواروں کی آڑ میں اپنی سانسیں درست کرتے رہے۔ ٹھنڈی تازہ ہوا سے سینے میں برف سی جمنے لگی تھی۔ عمارت میں مکمل سناٹا تھا۔ کسی جانب سے کوئی آواز جھنکار نہیں تھی اور ہر طرف دھند چھائی ہوئی تھی۔ وہ تو بارش نہیں تھی ورنہ پھر ہمیں واپس سُرنگوں میں جانا پڑتا۔

ہمیں اُسی راستے سے واپس جانا تھا جس سے چار دن پہلے ہم یہاں آئے تھے اور وہ سارا کا سارا نشیب تھا۔ اُوپر کسی طور چڑھ گئے تھے لیکن اب نیچے اُترنے کے خیال سے جی گھبرا رہا تھا۔ نیچے قدم قدم پر کھائیاں، پھسلن اور خاردار جھاڑیاں تھیں۔ ہمارے پاس رسّی تھی اور ہم نے یہی طے کیا تھا کہ اُوپر کسی درخت یا چٹان سے رسّی باندھ کے اس کے سہارے نیچے اُترتے رہیں گے، جہاں رسّی ختم ہو جائے گی، وہاں سے پھر اپنی آنکھوں اور پیروں سے کام لیں گے۔ نشیب کی ڈھلواں زمین کا حصہ اتنا بڑا نہیں تھا۔ رسّی کے آسرے ایک چوتھائی راستہ آسانی سے ضرور کٹ جاتا۔ باقی تین چوتھائی ہمیں خود طے کرنا پڑتا۔ اُس کے بعد زمین ہمارے قابو کی تھی۔ ہم چبوترے سے اُترا ہی چاہتے تھے کہ تجمل نے ہمیں روک دیا اور دیوار کے ساتھ چلتے ہوئے سامنے کے دروازے کی طرف جھانکنے لگا۔ بستی سے ہماری اچانک گم شدگی کو چار دن ہو گئے تھے۔ اُس سے پانچ چھ دن پہلے ہم نے راتوں کو مندروں کے علاقے میں آنے کا سلسلہ موقوف کر دیا تھا۔ سُولم، مارٹی، زورا، پلٹو اور جینی کے بستی سے جانے کے بعد دن میں ہم ایک ہی مرتبہ اِدھر آئے تھے۔ اُس وقت عمارتوں پر بیٹھے ہوئے قبیلے کے آدمیوں کی تعداد کم تھی۔ ممکن ہے انھوں نے انھیں بالکل ہی ہٹا لیا ہو یا تعداد دوگنی کر دی ہو۔ تو دس راتوں تک مسلسل یہاں ہمارے نہ آنے سے اُن کی جستجو میں کمی آ جانی چاہیے تھی۔ تجمل یہی دیکھنے گیا ہوگا کہ وہ اِدھر موجود ہیں یا نہیں۔ اگر قدیم مندر کی سیڑھیوں پر نہیں ہیں تو اور عمارتوں پر بھی نہیں ہوں گے۔ نہ ہونے کی صورت میں ہم نشیب کے پُرخطر راستے سے جانے کے بجائے مندروں کے علاقے کی ہموار زمینوں پر چلتے رہتے۔ ہمیں بستی واپس نہیں جانا تھا۔ آگے جا کے ایسے پہاڑ تھے جہاں اتنی ڈھلان نہیں تھی۔ ہم انھیں عبور کرتے ہوئے بستی سے بچتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچ سکتے تھے۔ تجمل کو اس حقیقت کا احساس ہوگا کہ قدیم مندر کی سیڑھیوں پر قبیلے کے آدمیوں کا نہ ہونے کا مطلب دوسری تمام عمارتوں سے اُن کی دست برداری نہیں ہے۔ وہ راستے میں کسی اور جگہ بھی ہمیں مل سکتے تھے۔

تجمل لپکتا ہوا واپس آیا اور اُس نے اشاروں میں ہمیں بتایا کہ حسبِ سابق وہ موجود ہیں مگر چار سے زیادہ نہیں۔ ہم سمجھ گئے کہ اُس کا ارادہ کیا ہے۔ اُس کا مقصد تھا کہ کیوں نہ ہم عقبی راستے سے آگے بڑھیں جیسے پہلے یہاں آتے تھے۔ سب یہی چاہتے تھے مگر انھوں نے جلدی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ تجمل اباجان کا ہاتھ پکڑ کے عمارت کے پچھواڑے چلنے لگا تو سب اُس کے پیچھے پیچھے ہو گئے۔ سلطان کے اوسان ٹھکانے نہیں تھے۔ اُس کی گھٹی ہوئی چیخ سے جیسے ساری عمارت لرز اُٹھی۔ سلطان نے اپنی تیزی میں کسی چوکھٹ یا پتھر سے چوٹ کھائی تھی اور سامان سمیت چبوترے کے فرش پر لڑھک گیا تھا۔ یکا یک عمارت میں بھاگم دَوڑ مچنے لگی۔ وہ بیدار ہو گئے تھے اور ایک لمحے کی رعایت دیے بغیر مشعل اُٹھائے بھاگتے ہوئے اُس طرف آ رہے تھے۔ جدھر سے آواز آئی تھی۔ سامان وہیں چھوڑ کے اُسی لمحے ہم بھی ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے راہ داری میں سمٹ گئے تھے۔ تجمل اور جامو، پیرو اور ہلاکو وسطی کمرے کی دوسری راہ داریوں کی طرف دَوڑ پڑے۔ مشعل کی روشنی اور اُن کے جوتوں کی دھمک جیسے ہی راہ داری کے قریب آئی ہم چاروں کہیں اُوپر سے گرنے کے انداز میں باہر نکلے۔ ہماری طرف دو ہی آدمی تھے۔ ہم ایسی تیزی سے اُن پر جھپٹے تھے کہ انھیں ہمارا چہرہ دیکھنے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ ایک کے ہاتھ سے مشعل چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ صرف ایک بار اُن کی آواز اُبھری پھر وہ بے حس و حرکت ہو گئے۔ اُدھر سے جامو اور ہلاکو باقی دو کو کندھوں پر ڈالے ہوئے آ گئے تھے۔ جامو، سلطان اور ہلاکو نے انھیں نشیب میں پھینک دیا۔

قدیم مندر سے دُور تک راستہ صاف ملنے کا امکان تھا۔ اندھیرے اور دھند کی وجہ سے چلنے میں اگر دشواری پیش آ رہی تھی تو اُن کی پناہ بھی ہمیں حاصل تھی۔ جس راستے سے ہمیں پھر نیچے آنا تھا، وہاں تک درمیان میں اور بھی مندر پڑتے تھے۔ ہم پگ ڈنڈیاں بدلتے ہوئے اُن سے دُور دُور ہی رہے۔ سارا سامان چار آدمیوں نے اپنے کندھوں اور سروں پر اُٹھا رکھا تھا۔ اباجان اور ہم چار آدمیوں کے ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ کسی جانب سے اُن کی آہٹ ملنے پر ہم پوری طرح تیار تھے لیکن وہ سب غالباً عمارتوں کی چوکی داری تک ہی محدود تھے۔ راستے میں اور کہیں اُن سے ہماری مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ بڑے مندر کے علاقے سے ہو کے اگر ہم آگے نکلتے تو فاصلہ اور کم ہو جاتا۔ وہ مرکزی جگہ تھی اور وہاں زیادہ آدمیوں کی موجودی کا اندیشہ تھا۔ اُس سے پہلے ہی ہم بستی کی مخالف سمت ایک نشیب میں اُتر گئے اور سامان ہم نے آپس میں بانٹ لیا۔ اباجان کے اصرار کے باوجود کسی نے انھیں بوجھ نہیں اُٹھانے دیا تھا۔ آگے درختوں کے درمیان ضرورت کے وقت ہم نے اُن کی چھوٹی بیٹری روشن کرنی شروع کر دی تھی۔ کئی گھنٹوں کی مسافت کے بعد ہمیں اطمینان ہوا کہ بستی بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ ہمارے قدم پھر اور تیز ہو گئے۔

یہ چوتھا دن اور پانچویں رات تھی۔ سُولم، مارٹی، جینی، پلٹو اور زورا کو بستی سے گئے ہوئے آٹھ دن ہو چکے تھے۔ اب انھیں اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں پیرو کو چھوڑ کے ہم بستی میں داخل ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ صندوق بھی تھے اور دوسرا ضروری اسباب بھی۔ جانگ قبیلے کے قُلیوں نے انھیں اپنی حدود سے باہر پہلی بستی میں پہنچا دیا ہوگا۔ وہاں سے وہ قلی بدل کے کچھ اور آگے قریب کی ایک اور بستی میں چلے گئے ہوں گے۔ وہاں سے انھوں نے پھر قلی بدلے ہوں گے اور ہندوستان کی سمت بڑھنے کے بجائے واپس جانگ قبیلے کی بستی کی طرف لَوٹ گئے ہوں گے۔ اُسی جگہ پر جو جانگ قبیلے کی حدود کے پار بھی تھی اور اُس کے قریب بھی۔ متن میاں نے جہاں دم توڑا تھا۔ جب تک ہم نہ پہنچیں، کسی نہ کسی عذر سے انھیں اپنے ساتھ لائے ہوئے قلیوں کو روک کے رکھنا تھا یا باقاعدہ اُن کے یاکوں کا سودا کر لینا تھا۔ دو بستیوں تک جانے اور قلی بدلنے سے مقصد صرف یہ تھا کہ جانگ قبیلے کے قلی اپنی بستی میں واپس جا کے اُن کے بارے میں آگے بڑھنے ہی کی اطلاع دیں۔ ہم نے حساب لگا کے سات دن مقرر کیے تھے۔ آج آٹھواں دن ختم ہو گیا تھا۔ اب انھیں پہنچ ہی جانا چاہیے تھا۔ پھر ہمیں وہاں ٹھیرنا نہیں تھا۔ انھیں لے کے چلتے ہی رہنا تھا۔

بستی کی حدود کا آخری پگوڈا آ چکا تھا جو جانگ قبائل کے علاقے میں داخل ہونے کے لیے ایک طرح سنگِ میل یا دروازے کا درجہ رکھتا تھا۔ پگوڈا ایک اُونچی پہاڑی پر واقع تھا اور اُس کی حیثیت محض علامتی تھی۔ جانگ قبیلے کی فضیلت کا نشان ہم اُس کے نیچے نیچے پہاڑیوں پر گزر رہے تھے کہ سلطان نے یک بارگی ہم سب سے ٹھیرنے کو کہا۔ اُس کا لہجہ بوکھلایا ہوا تھا۔ ”کیا ہے رے؟“ تجمل نے ناگواری سے پوچھا۔

”ذرا میرے سنگ آؤ۔“

”کدھر؟“ تجمل نے سامان زمین پر رکھ دیا۔

”ذرا میری بات سنو۔“

”کیا بولنا چاہتا ہے؟“

”کچھ دیر کے لیے ٹھیر جاؤ۔ میں اُوپر پگوڈا تک جا کے آتا ہوں۔“

سُلطان کے لہجے میں عاجزی تھی۔

”اُدھر کیا ہے رے؟“

”اُدھر وہ ہے؟“

”وہ کون!“ تجمل نے برہمی سے پوچھا۔

”وہی.... وہی“ سلطان ہکلانے لگا۔

”صاف منہ کیوں نہیں پھاڑتا؟“

”میں نے آج رات اُس سے یہاں آنے کو کہا تھا، وہ پگوڈا کے پاس ہی کسی جگہ ہوگی۔ میں اُسے لے کے آتا ہوں۔“

تجمل نے اُس کے منہ پر زور سے طمانچہ مارا۔ سلطان گرتے گرتے بچا۔ ”سیدھی طرح چل۔“ تجمل درشتی سے بولا۔

”وہ اِدھر ہی ہوگی اُستاد!“

”ہونے دے۔“ تجمل نے دہاڑ کے کہا۔

”وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔“ سلطان ہذیانی لہجے میں بولا۔

”کیا کرے! تُو نے اُسے بولا تھا کہ ہم اِدھر سے آئیں گے؟“ غصے سے تجمل کی آواز کانپنے لگی تھی۔

”ہاں بولا تھا۔“

تجمل اُس کا سَر پکڑ کے جھٹکے دینے لگا۔ ”چلتا ہے کہ نہیں۔“

”نہیں اُستاد! تجمل بھائی! نہیں۔“

”چلتا ہے کہ نہیں“۔ تجمل نے اُس کے گال تھپڑا دیے۔

"نہیں اُستاد! تم کچھ اور مت سمجھو وہ اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں بولے گی۔ ایسا ہوا تو سلطانے تمھارے پیروں پر اپنا سَر کاٹ کے رکھ دے گا۔"

"اُدھر اپنے سر تیرے پیروں پر ہوں گے۔"

"ایسا نہیں ہوگا اُستاد!"

"اور ایسا ہو گیا تو!....." جھل گرجنے لگا۔

"تو کیا ہوا۔ ! تم میری خاطر اتنا بھی نہیں کرو گے۔"

"تیری خاطر... تیری خاطر۔" جھل ہانپتے ہوئے بولا۔ "تیری خاطر ہی بول رہا ہوں سور کے جنے۔ حرام کے تخم...."

"تم جو دل چاہے کہو۔ پر تم غلط سمجھ رہے ہو۔ تم کو اپنی اتنی فکر ہے تو مجھ کو اِدھر ہی چھوڑ دو۔ میں اُس کے بنا نہیں جاؤں گا۔"

"کتنی دیر تک نہیں جائے گا۔"

"جتنی دیر تک بھی۔"

"تو اپنے آپے میں نہیں ہے سلطانے!" جامو بیچ میں بولا۔

"میں بالکل آپے میں ہوں اُستاد ہوش میں نہیں ہے۔"

"اس کو بولو کہ اپنے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔" جھل کی آواز سَرد پڑ گئی تھی۔ جامو اُس کے اور سلطان کے درمیان میں آ گیا۔

"وہ اِس بستی کی لڑکی ہے سلطانے اُستاد! ناگ کو ساتھ لے جائیں؟" ہلاکو نے دبی زبان میں کہا۔

"تم اس کے بارے میں ٹھیک نہیں سوچ رہے۔"

"وہ اِدھر نہیں آئی ہو گی۔" جامو نرم لہجے میں بولا۔ "اِس جاڑے اور اندھیرے میں لڑکی جات نے اکیلے کیسے سفر کیا ہوگا۔"

"نہیں آئی ہوگی تو ٹھیک ہے۔ میں بھی اِدھر ہی رہوں گا۔ تم لوگ آگے چلے جانا۔ سلطانے کی قسمت اُس کے ساتھ ہے۔"

"ہم تیرے بھلے کے لیے کہہ رہے ہیں۔" سارٹے آہستگی سے بولا۔

"میں اپنا بھلا تجھ سے اچھا جانتا ہوں۔"

"ہم تیرے دشمن نہیں ہیں سلطانے!"

"اور دوستی بھی نہیں کر رہے۔ میں اُس کو اُسی رات اُوپر مندر کی طرف بلا سکتا تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی تہہ خانے جاتی۔ پر سوچا، اُس کا اُدھر جانا ٹھیک نہیں ہے۔ پہلے کام ختم ہو جائے۔ سو میں نے اُس کو یہاں اتنی دُور آنے کو بولا تھا۔ وہ اِدھر تک آئے اور سلطانے چلا جائے۔ تم لوگ ساتھ نہیں دیتے تو سلطانے تم سے بھیک نہیں مانگتا۔"

"تو سمجھتا کیوں نہیں ہے؟" ہلاکو چیخنے لگا۔

"شور مت کرو۔"

"رہنے دے ہلاکو! اس کا ٹائم شاید آ ہی گیا ہے۔" جھل دھیمے لہجے میں بولا۔

"میرا نہیں، اُس کا بھی۔"

جھل نے اُس کا گریبان کھینچ لیا۔

"سلطانے کی بات مان لو جھل بھائی!" ابا جان کی موجودگی کے باوجود میں نے اُس سے عاجزی سے کہا۔

"لاڈلے!" اُس نے مجھے جھڑک دیا۔

"پیرو، سلطان کو سمجھانے لگا۔ ابا جان گُم صُم کھڑے سب کچھ سُن رہے تھے سلطان جھٹ اُن کے پیروں پر گر گیا۔ "بڑے صاحب! آپ ہی اِن لوگوں سے کچھ بولو۔ میں اُس کے بنا نہیں جاؤں گا۔"

ابا جان نے جھل کی طرف سَر اُٹھا کے دیکھا۔ جواب میں جھل نے سلطان کے کولھے پر ٹھوکر مار کے اُسے ابا جان کے پیروں سے جُدا کر دیا۔ سلطان لڑھکتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

جامو نے اُسے پھر بازو سے پکڑ لیا۔ "کدھر ہے وہ؟" وہ تلخی سے بولا۔

"اُوپر ہی کسی جگہ ہو گی۔ شاید اُس نے اپنی آوازیں سُن لی ہوں۔" سلطان نے مضطرب لہجے میں کہا۔

جھل سے پوچھے بغیر جامو اُسے دھکے دیتا ہوا سامنے بگوڑا کی پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ اُنھیں گئے ہوئے دیر ہو گئی۔ اُن کے جانے کے بعد کسی نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا تھا۔ سب چپ وہیں بیٹھے رہے پیرو جھل کے پاس بیٹھا اُس کا زانو دبا رہا تھا۔

خاصی دیر بعد اُوپر سے چاپیں اُبھریں تو جھل کے سِوا سبھی دیکھنے لگے۔ وہ سلطان اور جامو ہی تھے اور اُن کے ساتھ وہ بھی تھی، سکڑی سمٹی ہوئی تشانم۔ اُس کا سَراپا کانپ رہا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے میں اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ سلطان نے اُترتے ہی اُسے جھل کے آگے کر دیا۔ لمحوں بعد پیرو کے ٹوکنے پر جھل کے جسم میں جنبش ہوئی۔ وہ اُس کا شانہ تھپ تھپاتے ہوئے ایک طرف نکل گیا۔

ہم بڑھتے رہے۔

سویرا ہوتے ہوتے ہم آخری فاصلہ طے کر رہے تھے۔ دُور ہی سے اُونچائی پر دھند میں لپٹے ہوئے اُن کے ہیولے ہمیں نظر آنے لگے تھے اور وہ زورا، سُولم، مارٹی، جینی اور پلٹو کے سوا کوئی نہیں تھے۔ اُنھوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا اور ناچنے اُچھلنے لگے تھے۔ اُنھیں پڑاؤ کیے ہوئے ایک دن ہی ہوا تھا۔ تین قلیوں کو اُنھوں نے کسی طرح روک کے رکھا تھا جن کے ساتھ یاک تھے۔ ہمیں آتا دیکھ کے اُنھیں قلیوں کے سامنے ناچنا، اُچھلنا اور شور نہیں مچانا چاہیے تھا۔ ہم وہاں اتنی ہی دیر ٹھہرے جتنی دیر اپنے ساتھ لایا ہوا سامان صندوقوں میں منتقل کر سکتے تھے۔ دھوپ ابھی پھیلی نہیں تھی کہ ہم نے سفر شروع کر دیا تھا۔ قلی ہماری رہبری کر رہے تھے۔ دو دن گزر گئے۔ قلیوں کے انکار کے باوجود ہم نے انھیں نہیں

چھوڑا تھا۔ تیسرے دن رات بھر کے پڑاؤ کے بعد صبح صبح اپنے خیمے اور دوسرا اسباب سمیٹ کے ہم نے ایک منزل سَر کی ہو گی کہ ایک سرسبز وادی میں آ گئے۔ وادی کے چاروں طرف پہاڑوں کی ایک فصیل تھی۔ وہ جگہ اتنی خوب صورت تھی کہ وہاں سے آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ مارٹی کی فرمائش پر قلی گانا گانے لگے تھے۔ ہم ایک تنگ گھاٹی سے گزر رہے تھے کہ یکا یک جامو کے پہلو سے نکلتا ہوا ایک تیر زمین پر آ کے لگا۔ چشم زدن میں ہم یاکوں کی آڑ میں ہو گئے۔ اُوپر پہاڑوں پر ہر طرف آدمی موجود تھے اور وادی اُن کی صداؤں سے گونج رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے جھل کھڑا ہو گیا۔

یاکوں کی آڑ میں ہوتے ہی ہم نے تمنچے نکال لیے تھے اور جن کے کاندھوں پر بندوقیں لٹک رہی تھیں، اُنھوں نے چشم زدن میں انھیں آمادہ کے اپنے ہاتھوں پر اُٹھا لیا تھا مگر وہ کسی ایک جانب نہیں تھے۔ وادی کے اُوپر پہاڑوں کی اُونچی نیچی دیواروں پر تقریباً ہر جگہ وہ موجود تھے۔ اُن کی تعداد سو سوا سو کے قریب ہو گی۔ جھل کے کھڑے ہو جانے کے باوجود کوئی تیر نہیں چلا۔ چند لمحوں تک ہم نے انتظار کیا پھر یاکوں کی غیر محفوظ اوٹ سے نکل کے اُن کے سامنے ہو گئے۔ اُن کی آوازیں ایک دم بند ہو گئی تھیں لیکن اُن کی کمانیں کھنچی ہوئی تھیں۔ اُن میں سے کئی کے ہاتھ میں نیزے تھے۔ فاصلہ زیادہ تھا اور ہم اُن کی شکلیں واضح طور پر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جھل نے فوراً ہاتھ اُٹھا کے ہمیں بندوق نہ چلانے کا اشارہ کیا اور تیزی سے بولا۔

"جانے پہچانے دِکھتے ہیں۔"

سب کی نظریں سلطان اور تشانم پر آ کے رُک گئیں۔ "براتی ہیں اُستاد! اپنے سلطانے شاہ کو بدھائی دینے آئے ہیں۔" جامو نے زہرخند سے کہا۔ "سمدھیانے کو نہیں پہچانتے۔"

"نہیں، نہیں۔" سلطان نے تشانم کو کھینچ کے اپنے بازو سے چپکا لیا۔ "اِس نے اُنھیں نہیں بتایا۔ یہ نہیں بتا سکتی۔" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ "اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ ماں قسم یہ....." جھل کو گھورتے دیکھ کر اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"سُن رہے ہو اُستاد!"

"جامو!" جھل نے درشتی سے کہا۔ "کھینچ کے رکھ۔"

"وہ نیچے اُتر رہے ہیں۔" اچانک ہلاکو بھنچی ہوئی آواز میں بولا۔

جھل نے بھی دیکھ لیا تھا۔ نیزے اور کمانیں تانے ہوئے وہ چند قدم اور آگے آ گئے تھے۔ ہمارے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک کوشش کی جا سکتی تھی کہ اِدھر اُدھر جھپٹ کے ہم اِردگرد کی چٹانوں، جھاڑیوں یا درختوں کی آڑ لے لیں، اس طرح نشانہ لینے میں کچھ آسانی ہو جاتی مگر اُن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ہی ایسا کرنا ممکن تھا۔ شاید سب نے جان لیا تھا کہ اب کوئی اور کوشش بے سود ہے۔ سو ہم پوری طرح تیار تھے۔ اتنے فاصلے پر تمنچوں اور بندوقوں کے صحیح نشانوں کا کسی کو بھی یقین نہیں تھا۔ اُنھیں آگے آنا چاہیے تھا اور ہمیں اُس وقت تک کوئی گولی ضائع نہیں کرنی چاہیے تھی جب تک وہ خود پہل نہ کریں۔ پہل کرنے کی صورت میں ہمارے پاس اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم فاصلے اور نشانے کی پروا کیے بغیر فیر کرنا شروع کر دیں اور جس کو قریب جو جگہ ملے، وہ وہیں چھُپ جائے۔ اُن کی تعداد دس گنی کے لگ بھگ ہو گی۔ یقیناً وہ قبائلی قزاق نہیں تھے جو پہاڑوں پر قافلوں کی تاک میں رہتے ہیں۔ وہ ہوتے تو اتنا انتظار نہ کرتے، نہ ایک تیر چلا کے دوسرا چلانے میں دیر کرتے۔ سبھی کو یہ تحقیق کرنے کی جستجو تھی کہ وہ کون لوگ ہیں اور کیوں اس طرح چاروں سمت سے ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔

دردِ تنگ بستی کے نزدیک جہاں سُولم، مارٹی، جینی پلٹو اور زورا نے ہم سے پہلے پہنچ کے پڑاؤ کیا تھا، وہاں سے ہمیں چلے ہوئے دو دن ہو گئے تھے۔ اُنھی کے روکے ہوئے قلی ہمارے ساتھ تھے۔ جہاں تک بن پڑا، شام کو اندھیرا گہرا ہونے کے بعد بھی ہم نے اپنا سفر جاری رکھا۔ رات کو چلنا مشکل تھا ورنہ ہم کسی جگہ نہ ٹھہرتے۔ سب کا مقصد یہی تھا کہ جلد سے جلد دردِ تنگ بستی سے دُور ہو جائیں۔ راستے میں کسی قافلے سے ہماری مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی اور نہ ہم نے اپنے تعاقب کی کوئی آہٹ محسوس کی تھی۔ قلی بھی پرانے نہیں تھے۔ دردِ تنگ بستی سے نکل کے سُولم نے آگے دو منزلوں پر اُنھیں تبدیل کیا تھا اور اُس کے کہنے کے مطابق کسی جگہ اُنھیں مشکوک نگاہوں سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ سولم، مارٹی، جینی، پلٹو کو سفر کے لیے ضروری اسباب سمیت ہم نے دس دن پہلے رخصت کیا تھا۔ اُن کے جانے کے تین دن بعد باقی ہم سب بستی سے اچانک غائب ہو گئے تھے۔ ہو سکتا ہے اُنھوں نے ہمارے پیچھے اِدھر اُدھر اپنے آدمی دوڑائے ہوں لیکن ہم بستی سے کہیں اور گئے ہی نہیں تھے جو انھیں مِل جاتے۔ ہم بستی میں چند میل اُوپر ہی مندروں کے علاقے میں واقع قدیم مندر کے تہہ خانے میں مسلسل چار دن تک چھپے رہے تھے۔ تہہ خانے سے دوبارہ برآمد ہوتے وقت ہر سُو گہرا اندھیرا مسلط تھا۔ مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کو ہماری سُن گُن مِل گئی تھی مگر وہ کسی کو کچھ بتانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ دوسرے روز اُنھیں اُن کے اکڑے ہوئے جسم ہی مِلے ہوں گے۔

گویا بستی کے لوگوں کی نظر میں ہمیں وہاں سے چلے ہوئے سات دن ہو گئے تھے۔ یہ عرصہ ہمارے دُور نکل جانے کے لیے کافی تھا۔ اب اُنھیں ہماری اُمید ترک کر دینی چاہیے تھی لیکن وہ

پھر ہمارے سامنے موجود تھے۔ وہ نہیں تھے تو پھر اور کون لوگ تھے۔ اگر تشانم نے اپنے باپ چن وسا کو بتا دیا تھا کہ سلطان نے چار دن بعد اس سے بستی کی سرحدوں پر مقدس پگوڈا کے علاقے میں ملنے کو کہا ہے تو انھوں نے مزید دو دن کیوں توقف کیا۔ جہاں تشانم ہمیں ملی تھی، وہیں وہ ہمارے راستے کی دیوار کیوں نہ بن گئے۔ اور انھوں نے تشانم کو ہمارے ہاتھوں میں کیوں جانے دیا۔ سولم، مارٹی وغیرہ کے دوبارہ ہمارے ساتھ شامل ہو جانے کے بعد انھیں پھر کس کا انتظار تھا۔ بستی کے قریب ہی انھوں نے ہمارے اطراف اس طرح اپنے آدمی کیوں نہیں کھڑے کر دیے۔ جامو کی طرح سبھی کو انھیں دیکھ کے فوراً ہی گمان ہوا تھا کہ تشانم نے انھیں ہماری خبر دی ہو گی لیکن جلد ہی سب کو احساس ہو گیا کہ یہ محض بدگمانی ہے، ایک بے جواز شبہ ہے۔ تشانم دو دن سے ہمارے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ سب اُس کی باتیں، اُس کا چہرہ جیسے بھول گئے تھے۔ اُس کے چہرے پر پھولوں کی سی معصومیت اور اُس کی باتوں میں بچّوں کی سی سادگی تھی۔ جب کوئی اُس کے سامنے سلطان کا نام لے کے چھیڑتا تو وہ بُری طرح شرما جاتی۔ دو دن سے سبھی اُسے چھیڑتے رہے تھے۔ جب اُس نے پہلی بار ہمارے سامنے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں بات کی تو سب کو حیرت ہوئی حالانکہ سبھی کو معلوم تھا کہ وہ سلطان سے اسی زبان میں بات کرتی ہو گی۔ کورا کو بھی ایسی ہی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی آتی تھی۔ کورا کے مانند سوچ سوچ کے، کوشش کر کر کے بولنا، پلکیں پٹ پٹانا، کوئی لفظ سمجھ میں نہ آنے پر گھبرانا، بے چارگی سے مسکراتا اور شرمانا۔ ابّا جان کو بھی اُسے دیکھ کے کورا کی یاد آئی ہو گی۔ سلطان نے اُسے اشارہ کیا ہو گا جبھی وہ زیادہ تر ابّا جان کے ساتھ رہتی تھی، اُن کے پہلو بہ پہلو۔ دو دن سے وہی ہمارے لیے شکار کیے ہوئے گوشت کا کھانا پکا رہی تھی۔ تشانم اپنے گھر سے ہمیشہ کے لیے وداع ہو کے آئی تھی جیسے کورا ایک رات ہمارے گھر آئی تھی۔ ابّا جان نے نہیں سمجھا کہ وہ واپس جانے کے لیے نہیں آئی، وہ تو اُن کی بیٹی بننے کے لیے آئی ہے۔ وہ اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیتے تو وہ اُن کی اپنی بیٹیوں سے زیادہ اُن کی خدمت کرتی۔

کمانوں اور نیزوں سے مسلّح اِن لوگوں کو کسی اور ذریعے سے خبر ہوئی تھی۔ سولم کے ساتھ آنے والے قلیوں کو ہماری منزل کا پتہ نہیں تھا کیونکہ بجھل کی ہدایت کے مطابق دوسری منزل پر انھیں بدلتے ہوئے سولم نے اُن سے ہندوستان کی طرف جانے کے لیے طے کیا تھا لیکن کچھ دُور آ کے اُس نے انھیں جانگ قبیلے کی طرف چلنے کا حکم دے دیا۔ سفر کی اس اچانک تبدیلی سے یہی مراد تھی کہ قلی چلتے وقت اپنی بستی کے لوگوں کو سولم کی منزل کی غلط نشان دہی کر کے آئیں۔ بس ایک ہی بات ممکن تھی کہ بڑے مندر کے تہہ خانے سے ہمارے نکلنے کے دوسرے دن جب انھیں وہاں موجود پہرے دار نظر نہیں آئے ہوں گے تو انھوں نے اُن کی تلاش کی ہو گی اور بڑے مندر کے نشیب میں اُن کی لاشیں پڑی ہوئی مل گئی ہوں گی۔ لاشیں بول نہیں سکتی تھیں لیکن اُن کی ناگفتنی صاف غمازی کرتی ہو گی کہ ہم گزشتہ رات یہاں موجود تھے۔ ہمارے سوا اُن کی موت کا کوئی اور سبب نہیں ہو سکتا چنانچہ انھوں نے ہمارا پیچھا کرنے کے بجائے سیدھے ہندوستان کے راستے کی سمت کوچ کیا۔ وہ پہاڑوں کے درمیان راستے ہم سے بہتر جانتے تھے اور گھوم کے ہم سے پہلے ہماری منزل پر پہنچ سکتے تھے۔

بجھل نے کسی کو کوئی ہدایت نہیں دی تھی لیکن ہم سب نے خود ہی اپنی اپنی جگہیں متعیّن کر لی تھیں۔ اگر وہ وادی کے اطراف پہاڑوں پر ایک دائرے کی صورت میں بڑھتے ہوئے ہمارے گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے تو ہمارے تمنچوں اور بندوقوں کا رُخ بھی اُنھی کی جانب تھا۔ پہرہ کا رُخ کسی اور سمت تھا تو زولا کا کسی اور سمت۔ ہر ایک کی نگاہ اُوپر اُٹھی ہوئی تھی اور سب نے غیر ارادی طور پر سمتیں اپنی اپنی نگاہوں کے حصّے میں تقسیم کر لی تھیں۔ ابّا جان، تشانم اور قلی درمیان میں تھے اور اُن میں سے کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ بجھل نے بھی اپنے کندھے پر لٹکی ہوئی بندوق ابھی تک نہیں اُتاری تھی اور نہ اپنا تمنچا جیب سے باہر نکالا تھا۔ وادی کے نشیب کی زمین مسطّح نہیں تھی۔ درمیان میں ایک تیز ندی گزرتی تھی جس کے کناروں کی زمین کہیں کہیں اتنی اُوپر اُٹھی ہوئی تھی کہ ایک گھاٹی سی بن جاتی تھی۔ ہم نے فاصلہ کم کرنے کی غرض سے ندی کے کنارے کنارے چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ منظر بھی بہت دل کش تھا۔ دھوپ نکل رہی تھی اور ندی کا چاندی جیسا پانی شور مچا رہا تھا۔ اِسی شور کے سبب ہمیں اپنے پیچھے اُن کی نقل و حرکت کا پتہ نہیں چلا۔ ہمارے وادی میں اُترنے سے پہلے وہ اُوپر کسی ایک سمت چھپے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ہم نے وادی میں اُترنا شروع کیا، وہ اطراف کے پہاڑوں پر پھیلتے گئے اور انھوں نے اُس وقت پہلا تیر پھینکا اور صدائیں بلند کر کے ہمیں اپنی جانب متوجّہ کیا جب ہم وادی کے مین بیچوں بیچ پہنچ گئے۔ خصوصاً اُس مقام پر جہاں نشیب گہرا تھا اور ہمارے فرار کا امکان اور مقاموں کی نسبت کم ہو جاتا تھا۔ وہ ایک گھاٹی کی شکل کا راستہ تھا مگر ندی کے دونوں طرف اُٹھی ہوئی زمین ڈھلوان تھی۔ اِسی ڈھلوان کی وجہ سے ہم اُوپر چاروں طرف دیکھنے پر قادر تھے اور وہ ہمیں دیکھ سکتے تھے۔

وادی میں کسی جگہ ندی کے دونوں کناروں پر اُٹھی ہوئی زمین عمودی ہوتی تو یہاں کے بجائے وہ اُسی جگہ کا انتخاب کرتے مگر ایسا کوئی مقام وادی میں شاید کہیں نہیں تھا۔ نشیب کا یہ گھاٹی نما حصّہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اُنھیں ذرا سی دیر ہو جاتی تو ہم آگے نکل چکے ہوتے۔ سب کو چند لمحوں اور چند جستوں کے اِسی ایک موقع کی تلاش تھی۔

سب بتوں کے مانند گُنگ کھڑے بجھل کی طرف سے کسی اشارے کے منتظر تھے۔ بجھل تبھی کوئی اشارہ کرتا جب اُسے کسی لمحے کوئی رعایت یا گنجائش نظر آتی۔ ہمارے کسی بھی غلط فیصلے کی تلافی ممکن نہیں تھی۔ بجھل سر اُٹھائے گھوم گھوم کے اُنھیں دیکھتا رہا۔

یکایک ماسٹر مارٹی کی گھٹی ہوئی چیخ پر سب اُس کی طرف متوجّہ ہو گئے۔ مارٹی ابّا جان کو روک رہا تھا جو ہم سے کچھ کہے بغیر اچانک درمیان سے نکل کے قریب کے ایک ٹیلے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ اُن کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ابّا جان کا یہ اقدام اتنا غیر متوقع اور ناقابلِ فہم تھا کہ سب ایک لمحے کے لیے جیسے اپنے حواس کھو بیٹھے۔ جامو، سلطان اور میں نے اُنھیں روکنے کے لیے بیک وقت بھاگنے کا ارادہ کیا مگر بجھل کی آواز نے ہمارے قدم جامد کر دیے۔ ابّا جان کی رفتار میں تیزی نہیں تھی۔ ہم سے کچھ دُور ایک ٹیلے پر پہنچ کے وہ ٹھہر گئے۔ میرا دم آنکھوں میں اٹکا ہوا تھا۔ اُوپر جا کے اُنھوں نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر لیے اور پہاڑوں سے اُترتے ہوئے لوگوں سے اشاروں اشاروں میں کچھ کہنا چاہا اور ہمیں یہ جان کے حیرت ہوئی کہ اُن کے اشاروں کے جواب میں وہ لوگ رُک گئے ہیں۔ جب اُنھوں نے اپنے سر جھکا کے ابّا جان کو تعظیم دی تو ہم سب کی سمجھ میں آیا کہ ابّا جان نے یوں آگے بڑھ جانے کی جرأت کس اعتبار میں کی ہے۔ وہ بھکشوؤں کے لباس میں تھے۔ اپنے مخصوص حلیے کے سبب دُور ہی سے وہ ہم میں سب سے الگ نظر آتے تھے۔ کھڑے کھڑے میں ہانپنے لگا تھا۔ جامو نے میرا بازو پکڑ لیا۔ "لاڈلے!" وہ آہستگی سے بولا۔ "نظر کو کسی ہی رکھنا۔"

"جامو بھائی!" میری آواز حلق میں گھُٹ کے رہ گئی۔

"لاڈلے جانی!" اُس نے میرے بازو میں اپنی انگلیاں گڑو دیں۔ "کبھی تُو نے یہ نہیں پوچھا کہ تیرے جامو بھائی نے کیسی کاٹی ہے؟"

میں نے پلٹ کے اُسے دیکھا۔ جامو اپنی آنکھیں جھپکانے لگا۔ اُس کے ہونٹوں پر لرزتی ہوئی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ میرا جی چاہا کہ اُس کے گلے سے لپٹ جاؤں۔ جامو نے کولھا مار کے مجھے چونکایا اور سامنے دیکھتے رہنے کی تلقین کی۔

ابّا جان کے ہاتھ ابھی تک اُٹھے ہوئے تھے۔ تمنچے کے کھٹکے پر میری انگلی جمی ہوئی تھی اور میری نگاہوں نے اُن کے گرد ایک ہالہ سا بنا رکھا تھا۔ اِدھر وہ لوگ ٹھہرے، اُدھر سلطان نے لپکتے ہوئے لہجے میں بجھل کو مخاطب کیا۔ "اُستاد! یہ تشانم بولتی ہے، اِدھر آگ لگانے کا مطلب سفید جھنڈی ہے۔"

"ہتھیار بڑھا لو۔" بجھل نے بوجھل آواز میں کہا۔ "سلطانے! تُو آگ لگا دے۔" یہ کہہ کے وہ نپے تلے قدموں سے ابّا جان کے پاس اُوپر ٹیلے پر چڑھ گیا۔ باقی سب لوگ نیچے ہی رہے۔ سلطان نے قلیوں اور تشانم کی مدد سے ایک مشعل میں آگ لگا دی۔ دھوپ میں اُس کے شعلے مرجھا رہے تھے تاہم اُوپر والوں نے اُسے دیکھ لیا ہو گا۔ صرف مشعل جلانے پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ آڑے وقت کے لیے باکوں پر خشک لکڑیوں کا جو ڈھیر بندھا رہتا تھا، اُسے اُتار کے اُس میں بھی آگ بھڑکا دی گئی۔ اس طرح اُوپر سے گھیر کے آنے والوں کو ہماری طرف سے یہ پیغام منتقل کر دیا گیا کہ ہم مزاحمت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ سب نے بجھل کی ہدایت پر ہتھیار نیچے کر لیے تھے۔ جاتے جاتے وہ اشارہ کرتا گیا تھا کہ سامان نیچے چھوڑ کے ہم سب اُوپر آنے کی کوشش کریں۔ جس موقع کے ہم دیر سے منتظر تھے، اُس کی اُمید بندھ چلی تھی۔ اِس سے پہلے کہ وہ ابّا جان کی اپیل پر نظرِ ثانی کرتے یا رائے بدل دیتے، ہم نے ایک دوسرے کو نگاہوں سے ٹھوکے مارے۔ آگ جلانے کے بعد ہم نے چند ثانیوں کی تاخیر کی ہو گی کہ ایک ساتھ سب اِدھر اُدھر منتشر ہوتے ہوئے ٹیلے پر چڑھ گئے۔ ہم نے رفتار میں کسی عجلت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہاں ہم زیادہ بہتر طریقے سے اُنھیں دیکھ سکتے اور زیادہ محفوظ انداز میں اپنا دفاع کر سکتے تھے۔ یہاں جگہ خاصی کشادہ تھی۔ پتھریلی چٹانوں میں آڑ لینے کے لیے کئی گوشے موجود تھے۔ ہم نے دوبارہ اپنے ہتھیار اُوپر نہیں کیے۔ "ابھی ان کو اور نیچے آ جانا تھا بڑے صاحب!" بجھل شکایتی لہجے میں ابّا جان سے بولا۔

"اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔" ابّا جان نے مایوسی سے کہا۔

"پر اُن کا ابھی اور نیچے آنا ٹھیک تھا۔"

"میرا خیال ہے ہمیں اُن سے بات کر کے دیکھنی چاہیے۔"

"وہ جو بولیں گے، وہ آپ بھی جانتے ہو بڑے صاحب!"

"لیکن ہمارے پاس اُن کی بات سُننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"

"ہاں بڑے صاحب!" بجھل نے گہری سانس لے کے کہا۔ "شاید اپنے کو بھی بعد میں یہی کرنا پڑتا۔ پر ذرا پہلے اُن کو نزدیک سے دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔"

"اُن کے پاس کثیر تعداد میں ہتھیار ہیں اور ہماری نسبت وہ زیادہ بہتر جگہ پہ ہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں کوئی خطرہ مول نہیں لینا

چاہیے۔صورتِ حال سمجھ لینی چاہیے۔" اباجان نے تذبذب سے کہا۔

"آپ اِدھر آرام سے بیٹھے رہو۔ ابھی ہم لوگ اُدھر جاکے اُن سے بات کرتے ہیں۔" تجھل نے سولم، پیرو اور مجھ سے آگے بڑھنے کے لیے کہا۔

"نہیں!" اباجان تندی سے بولے۔ "اگر میری رائے آپ لوگوں کی نظر میں کوئی حیثیت رکھتی ہے تو میں آپ کو اُن کے پاس جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ میں خود جاکے بات کرتا ہوں۔ آپ سے زیادہ یہ سب کچھ دیکھنے کا صدمہ مجھے ہوگا لیکن اِس کا امکان ہر وقت موجود تھا۔ ہماری ذرا سی بے احتیاطی ہمارے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ دو میں سے ایک بات کا فیصلہ ہمیں ابھی کرلینا چاہیے کہ ہم زیادہ قیمتی ہیں یا ہمارا مال و اسباب۔"

"آپ کیا بول رہے ہو بڑے صاحب!" تجھل نے بے چینی سے کہا۔

"میں درست ہی کہہ رہا ہوں۔ میری رائے میں کسی قسم کی الجھن میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ سامنے ہمارے لیے اندیشے زیادہ، تحفظات کم ہیں۔ سب کچھ اُن کے حوالے کرنے کے لیے ذہن آمادہ کرلیجیے۔ اس آمادگی کے سوا کوئی اور تدبیر ہو تو مجھے بتائیے۔"

"آپ جو سوچ رہے ہو، صرف اتنا نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟"

"وہ نہیں جانتے کہ اپنے پاس کیسا سامان ہے۔ اُن کو اُس کا ابھی کچھ پتہ نہیں ہے۔ وہ تو ہم کو لینے آئے ہیں۔"

"لیکن ہمارے پاس اور کیا ہے۔ یہ سب اُن کے اطمینان کے لیے کافی ہوگا۔" اباجان نے بھاری لہجے میں کہا۔

"بہت تھوڑا ہے بڑے صاحب! اتنے سے اُن کا بھلا نہیں ہوگا۔ ہم نے اُدھر جاکے اُن سے بولا تھا کہ ہم اُن کے کھوئے ہوئے کاغذ واپس لانے کا جتن کریں گے۔ اُن کو یہ بولے بغیر ہم روز اُدھر اُوپر نیچے آجا نہیں سکتے تھے۔ مجھ کو یاد پڑتا ہے، میں نے پہلی بار آپ کو سب بول دیا تھا۔ اِن پتھروں کی نہیں، اُن کو کاغذ کی ضرورت ہے۔"

"لیکن کاغذات ہمارے پاس نہیں ہیں۔ مجھے یاد ہے آپ نے مجھ سے یہ کہا تھا مگر آپ نے بقول آپ کے کوئی حتمی وعدہ نہیں کیا تھا۔ بہتر ہے اُنھیں ہمارے سامان کی تلاشی لینے دیجیے۔"

"وہ ہم کو واپس لینے نہیں آئے ہیں۔ ہم نے اُن سے پورا وعدہ نہیں کیا تھا۔ پر نو سال تک کسی نے اِدھر آکے اُن سے ایسا بولا تھا۔ نو سال سے وہ سارے ہندوستان میں سر مارتے رہے ہیں۔ سمجھنے کی کوشش کرو بڑے صاحب!"

"میں سمجھ رہا ہوں لیکن کاغذ یہاں نہیں ہیں۔"

"یہ بات آپ مجھ سے بول رہے ہو۔ اُن کو کیسے بولا جائے؟"

"آپ اُن سے کہہ دیجیے کہ ہمارا وعدہ ابھی تک قائم ہے۔ ہم کاغذات اُنھیں واپس کردیں گے۔ اگر اُنھیں حاصل کرنا مقصود ہے تو ہماری بات کا یقین کرنا ہوگا۔"

"آپ اُن کو اپنے ساتھ لے چلو گے؟"

"جی!" اباجان ہچکچا کے بولے۔

"میں بولتا ہوں، وعدہ پورا کرنے کے لیے آپ اُن کو اپنے ساتھ لے چلوگے؟ وہ ایسا بولیں تو آپ کیا جواب دو گے؟"

"نہیں۔ میں ایسا نہیں چاہوں گا۔"

"بڑے صاحب!" تجھل نے نرم لہجے میں کہا۔ "آپ نے ان کو روک دیا ہے۔ ابھی آپ اِدھر ٹھیرو۔ ہم جاکے اُن کو دیکھتے ہیں۔ آپ سے وہ کچھ بولیں تو ہم سے آپ اپنے کو الگ بولنا۔"

"آپ سمجھتے ہیں کہ یہ آپ کے لیے سودمند ہے تو بہتر ہے، میں اُن سے یہی اظہار کروں گا لیکن آپ خود اُوپر جاکے اُن سے کیا بات کریں گے؟"

"ابھی اُدھر جاکے دیکھتے ہیں بڑے صاحب!"

"میں سمجھتا ہوں، میری بات شاید وہ مان جائیں۔"

"پر آپ ایسی بات ہی کیوں بولو جس کے نہ ماننے سے آپ کا بھرم بھی جاتا رہے۔"

"ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ ہم سخت خطرے میں ہیں۔"

"اپن لوگ سب خطرے کی گھڑی میں جنم لیے تھے۔" پیرو آگے آکے تیزی سے بولا۔ "یہ اپن کے راجا کے بارے آپ ٹھیک جانتے ہوگے بابا!" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔ "پر اپن کو ایک دم یقین ہے، راجا بھی ایسی گھڑی میں ادھر آیا ہوگا۔ آپ بالکل ٹھکانے سے بیٹھو۔ اپن نے آپ سے بولا تھا، بولا تھا کہ اُودر سے سارا حساب چکتا کرکے آنا ہے۔"

"مگر، مگر..." اباجان نے آنکھیں بند کرلیں۔

"بڑے صاحب! آپ ادھر ہمارے ساتھ ہی رہو۔" سولم نے لجاجت سے کہا۔

"درست ہے، درست ہے۔" اباجان اُکھڑی ہوئی سانسوں سے بولے۔

دیر ہو رہی تھی۔ وہ دُور کھڑے ہم لوگوں کو آپس میں باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے لیکن ہماری آواز اُن تک نہیں پہنچ رہی ہوگی۔ ہماری جانب سے وہ جلد از جلد کسی اقدام کے منتظر ہوں گے۔ تجھل نے اباجان کی طرح چاروں طرف گھومتے ہوئے اپنے ہاتھ اُٹھا دیے۔ سولم، پیرو اور میں نے اُس کی تقلید کی۔ کچھ توقف کے بعد ایک طرف سے جواب میں ہاتھ بلند کیے گئے۔ تجھل نے پھر دیر نہیں کی۔ باقی لوگوں کو وہیں ٹھیرے رہنے کی تاکید کرکے وہ اُوپر پگ ڈنڈی پر چلنے لگا۔ جس جانب سے جواب آیا تھا، وہاں سے چند آدمی بھی ہماری طرف بڑھنے لگے۔ راستے میں تجھل نے ہم سے کوئی بات نہیں کی۔ ہم تیز تیز قدموں سے درمیان کا فاصلہ کم کرتے رہے۔ کبھی سامنے درختوں اور چٹانوں کی وجہ سے کہیں کہیں وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔ ہم نے ہتھیار ہاتھوں میں نہیں اُٹھائے تھے۔ آدھ گھنٹے کے وقفے میں ہم اُن تک پہنچ گئے تھے۔ اُن میں سے آگے آنے والے آدمی اپنے پیچھے رہ جانے والوں سے اتنی دُور نہیں آئے تھے جتنے ہم اپنے لوگوں سے دُور ہو گئے تھے۔ جو لوگ سامنے آئے تھے، وہ جانگ قبیلے ہی کے آدمی تھے۔ گنتی میں چھ، عمروں میں مختلف، نُور میں یکساں، اُنھوں نے کسا ہوا لباس پہن رکھا تھا اور اُن کے چہروں پر سفر کی تھکن کے آثار نہیں تھے بلکہ تازگی کھلی ہوئی تھی، پوری طرح چاق و چوبند اور مستعد۔ ایک تبتی سپاہی کے پاس میدانِ جنگ میں جتنے ہتھیار ہو سکتے ہیں، اُن کے جسم اُن سب سے مزیّن تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کا نسبتۂ بلند اور تن درست و توانا شخص اُن میں سب سے نمایاں تھا اور ہمارا صورت آشنا تھا۔ اُس کی کمر سے ایک تلوار بھی لٹک رہی تھی۔ ہم نے اُسے قبیلے کے سردار کے خاص کمرے میں کئی بار دیکھا تھا۔ دوسرے آدمیوں کے ملنے اور دیکھنے کا اتفاق ہمیں شاید نہیں ہوا تھا۔ صورت شکل میں تمام تبتی ایک جیسے لگتے ہیں۔ ممکن ہے اُنھیں بھی ہم نے سردار کے مکان یا بستی میں کہیں دیکھا ہو۔ سب کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ہمی پر مرکوز تھیں۔ اُن کے چہرے انگارا ہو رہے تھے۔ کچھ دیر ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر تجھل نے کسی تمہید کے بغیر تدھم لہجے میں پوچھا: "سردار نے بھیجا ہے؟"

سولم نے فوراً اُسی کے لہجے میں ترجمانی کردی۔

"ہاں!" ادھیڑ عمر شخص نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

"سردار کدھر ہے؟"

"بستی میں ہے۔"

"ہم کو ساتھ لے جانے کو آئے ہو؟"

"ہاں!" اُس نے مختصر جواب دیا۔

"اتنے بہت سے آدمی بلانے بھیجے ہیں؟"

"پیچھے اور بھی ہیں۔"

"اچھا!" تجھل نے سکون سے کہا۔ "پر کیوں؟"

"یہ ہم نہیں جانتے۔" وہ نخوت سے بولا۔

"سردار سے بولو کہ ہم اُدھر واپس آئیں گے۔ ابھی ہمارا بہت سا سامان اِدھر پڑا ہے۔ ہم نے اپنی طرف سے سردار کو جو بات بولی تھی، وہ ہم کو یاد ہے۔ اُس کو پورا کرنے کی ہم کوشش کریں گے۔" تجھل نے متانت سے کہا۔

"سردار نے ہمیں ایک ہی حکم دیا ہے، تمھیں واپس لایا جائے۔"

تجھل سر ہلانے لگا۔ "تم کو پتہ ہے، ہم نے سردار سے کیا بولا تھا؟"

"تھوڑا بہت۔" اُس نے سر جھٹک کے کہا۔

"ابھی ہم کو کچھ نہیں ملا ہے۔"

"یہ سردار کو ہی جاکے بتانا۔"

"سردار سے تو ہم نے ساری بات صاف کرلی تھی۔ ہم نے بول دیا تھا کہ چار مہینے تک کدھر بھی آئیں، کدھر بھی جائیں۔ وہ بیچ میں روڑا نہیں ڈالے گا۔ چار مہینے بعد اگر ہم کو کچھ ہاتھ نہیں لگا تو اپنا کالا منہ لے کے اُس کے پاس نہیں لوٹیں گے۔ تم لوگوں نے نو برس جیسی چلائی ہے، ابھی تین ایک مہینے کے لیے کیوں آتا سیدھا کررہے ہو؟"

"ہم سے کوئی صفائی مت کرو، جو کچھ کہہ رہے ہو، سردار سے جاکے اُس کی وضاحت کردو۔"

"اُدھر جانے سے نہ سردار کا بھلا ہے نہ اپنا، تمھارے پاس اچھا بدن ہے، بھیجا بھی اچھا ہوگا۔ ابھی ہمارے پاس کچھ نہیں ہے تو جاکے سردار کو کیا دھینڈس دیں گے۔ ہمارا راستہ کیوں کھوٹا کرتے ہو؟"

"ہم نے سردار کا حکم تمھیں بتادیا ہے۔"

"اور ہم تم سے یہ نہیں بولیں گے کہ یہ سردار کا علاقہ نہیں ہے۔ تم یہ نہ کہہ کے اچھا ہی کروگے اور ہماری بات مان کے اور اچھا، سردار سے جاکے خود بات کرلو۔ ابھی بستی زیادہ دُور نہیں ہے۔"

"چار آدمی بھیج کے سردار ہی کو اِدھر بلالو، ہم اُس کا انتظار کرلیں گے۔" یہ کہنے سے نہ جانے تجھل کا کیا مقصد تھا۔

اُس نے منہ بنایا۔ "ہمارے لیے سردار کا ایک ہی فرمان ہے۔"

"کوئی دوسرا نہیں؟" تجھل نے سرد لہجے میں کہا۔

"دوسرا بھی ہے۔"

"اُس کو بھی بولو۔"

"اُس کے بتانے کا وقت ابھی نہیں آیا۔" اُس نے ناگواری سے کہا۔

"تم اِدھر کب سے ہو؟" غالباً تجھل کو یہ جاننے کی جستجو تھی کہ وہ بڑے مندر کے علاقے میں اپنے چار آدمیوں کی موت کی اطلاع سُن کے آئے ہیں یا پہلے سے موجود ہیں۔ اُن کے تیور کو ترازو کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری تھا۔

"تمھیں اِس سے کوئی غرض نہیں۔"

"غرض کیوں نہیں ہے سور ماتیاں؟" معلوم نہیں سُولم نے تیاں کا کیا ترجمہ کیا ہوگا۔ اُس شخص کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

"تمھاری طرف سے کیا جواب ہے؟" اُس کی آواز بگڑنے لگی۔

"کیا جواب دیں پیرو دادا!" تجھل نے پیرو کی طرف دیکھ کے کہا۔

"ابھی کیا بولیں استاد!" پیرو کڑواہٹ سے بولا: "سالا اَڑیل ہے منہ کو لگام مانگتا ہے۔ اپن اتنی بات نہیں سُنتا۔"

تجھل چند لمحے چپ کھڑا رہا۔ ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے آدمیوں کے ہاتھوں میں کمانیں تنی تھیں۔ ہماری ایک ایک جنبش اُن کی نگاہوں کی زد میں تھی۔ وادی میں ندی کی آواز کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ "اپنے لیے واپس جانے میں تمھارا ہی گھاٹا ہے۔" تجھل نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ہم اپنا گھاٹا برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ ہم تو ایک زمانے سے گھاٹے میں ہیں۔" سردار کے پیغام بر کی آواز تپی ہوئی سی تھی۔

"بولو پیرو دادا!"

پیرو نے تجھل کو جواب دینے کے بجائے سولم سے کہا: "اِس سے بولو سُولم! سالا سردار کو اپن کچھ جاستی پسند آگیا ہے کیا۔ اُودر اپن کے لیے اپنی ماں بہن کو سامنے کریں گا یا خود اپنے کو!... اِس سے بولو کہ ابھی اپنا کچھ آدمی اپن کے ساتھ باندھ دے۔ پھر اپن دونوں ساتھ ساتھ ہندوستان کا سیر ماریں گا اور گھوڑے گھولے ردّی کاغذ کھوجیں گا۔"

میں نے پیرو کا ہاتھ دبا کے اُسے روکا۔ پیرو کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔

سُولم نے اپنی طرف سے قطع و برید کر کے پیرو کی پیش کش دُہرا دی۔

"اِس کا فیصلہ بھی سردار کرے گا۔"

"یہ چرچٹی مار تو اپن کو ایک دم حکم کا غلام لگتا ہے۔"

"پالتو ہے دادا!"

"آپن میل بولنے کو تھا۔" پیرو چمک کے بولا۔

"تمھارے سردار کو کاغذات چاہئیں یا ہم؟" تجھل تھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

وہ جواب دیتے ہوئے ہچکچانے لگا: "کاغذات۔"

"تو ابھی اپن اُودر جا کے سردار سے منع بول دے تو کیا ہوئیں گا۔" پیرو نے تجھل کے کچھ کہنے سے پہلے درمیان میں دخل دیا: "تم بھی قبیلے کا آدمی ہے۔ ایدر تمھارے ساتھ اور سب لوگ قبیلے کا ہے سب سرملا کے آگے پیچھے کی سکوٹ کر لو اور سمجھو کہ ابھی اپن کیا لوم مارنا ہے۔ کاغذ ایدر نہیں ہے، اپنا سامان تلاشی کر لو۔ اپن اُسی کی جگاڑ میں اُودر جا رہا ہے بابا! اپن کو بھی مال بنانے کی جلدی ہے۔" پیرو بیزاری سے کہنے لگا: "اپن سے گھٹالا مت کرو۔ نو سال کیا، سالا نو ہزار سال لگ جائیں گا سب ایک ایک کر کے سو جائیں گا۔ رونے والا بھی نہیں ہوئے گا۔ سُولم! اِس کو بولو کہ ایدر بھی تمھارا لوگ کم نہیں ہے۔ جو اپن ایدر بول رہا ہے اُودر بھی جا کے اتنا بولے گا۔" پیرو کی زبان میں لکنت آگئی تھی: "سُولم! اِس کو بولو، کھوپڑی سیدھی رکھو اور اپنے آدمیوں سے سوچ بچار کر لو، اپن ایدر ہی ہیں۔ بولو کہ اپن کا منڈ ہیں۔"

مجھے حیرت تھی کہ تجھل اور پیرو ایسی اور اتنی باتیں کیوں کر رہے ہیں، بالکل فضول۔ انھیں ابتدا ہی میں اندازہ لگا لینا چاہیے تھا کہ وہ کوئی اور بات سُننا نہیں چاہتے۔ گو سُولم نے احتیاط برتی تھی، ترجمانی کرتے ہوئے پیرو کا لہجہ منتقل نہیں کیا تھا۔ وہ رواں اور ستھرے انداز میں انھیں اُس کی کہی ہوئی باتیں منتقل کرتا رہا تھا لیکن وہ سب اگر ہندوستانی نہیں جانتے تھے تو پیرو کا لہجہ اُن سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف شعلہ بار آنکھوں سے دیکھا اور اُن میں سے ایک معمر شخص سر اُٹھا کے بولا: "ہم سمجھیں تم انکار کر رہے ہو؟"

"اپن سمجھیں تم انکار کر رہے ہو؟" پیرو بھڑک کے بولا۔

"دونوں کا انکار بُرا ہے دادا!" یکایک تجھل نے دھیرے سے کہا۔

"پھر کیا... کیا ہے تجھل بھائی؟" پیرو چونک پڑا۔

"سردار کی عزت تم سے بڑی ہے۔"

"مطلب، تم... تم واپس جانے کو بول رہے ہو کیا؟" وہ تعجب سے بولا۔

"ہاں دادا!" تجھل نے کسمسا کے کہا۔

پیرو کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ تجھل کو مشتبہ نظروں سے گھورنے لگا جیسے اُس نے جو سنا ہے وہ تجھل نے نہیں کہا ہے مگر وہ تجھل ہی نے کہا تھا۔ پیرو کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں جب تجھل نے سُولم سے کہا: "بولو کہ چلو۔ پر اب کاغذ کا دھیان چھوڑ دو۔ اب تمھارا باپ اُن تک نہیں پہنچ سکتا۔ بولو کہ سردار نے کانٹا بیچ میں ڈال کے اپنا وعدہ توڑ دیا ہے۔ ہم بھی اب اُس کے پابند نہیں ہیں۔ کاغذ کو بھول جاؤ، اُدھر سردار نے اُس شام تم میں سے بہت سے ہوں گے جب اُس نے ہم کو تولنے کے لیے اپنے آدمیوں کو اُٹھک بیٹھک کرائی تھی اور ہم نے اُس کو بولا تھا کہ اپنے کو اکیلے جانا ٹھیک نہیں لگتا۔ گنتی تمھاری زیادہ رہے گی۔ ہم تو اُدھر اپنے ٹھکانے سے سر کو اُدھار جان کے چلے تھے۔"

سردار کا پیغام بر فوراً کوئی جواب نہیں دے سکا، وہ نہ اُس کا کوئی ساتھی۔ انھیں بھی پیرو کی طرح جیسے تجھل کی بات پر اعتبار نہیں تھا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ وہ چپ کھڑے اضطراری نگاہوں سے ہمیں تکتے رہے، پھر سردار کے پیغام بر نے سٹ پٹاتے ہوئے کہا: "تم نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔"

"جو بھی کیا ہے تم سے اُس پہ ٹھپّا نہیں لگوانا ہے۔"

"اپنے ہتھیار اُتار دو۔"

"تھوڑی دیر میں بولنا، اپنے کپڑے اُتار دو۔"

"سرِدست ہتھیار ہی اُتار دو۔"

"ہاں ہاں۔" تجھل کے نتھنے پھولنے لگے: "ہتھیار بھی اُتار دیں گے بلما! اپنے لیے پھر کیا چوڑیاں لائے ہو۔ بولو گے تو اُن کو بھی پہن لیں گے پر تمھارے پہننے کے بعد۔"

"ہم کہتے ہیں اپنے سارے ہتھیار ہمارے حوالے کر دو۔"

"تم بھی ایسا کرو گے تو اپنے کو کیا انھیں چاٹنا ہے۔"

"ہم.... ہم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"ادھر تمھارے ساتھ یہ سب حرام کے جنے ہیں کیا! ایک بار پھر گنتی کر لو، بھوسا بھر کے نہیں لائے ہو گے۔ دادا! سُنا؟ ہتھیار اُتارنے کو بولتے ہیں۔"

"اپنے کو سالے اُلّو کا پٹھا سمجھتے ہیں۔" پیرو پھنکارتے ہوئے بولا۔

"تمھارے ہتھیار ہمارے پاس محفوظ رہیں گے، سردار کے پاس جا کے یہ تمھیں واپس مل جائیں گے۔" اُن میں سے ایک نوجوان تیزی سے بولا۔

"اور تمھارے اپنے پاس۔"

"اِس کا مطلب ہے تم انکار کر رہے ہو، تم چلنا نہیں چاہتے۔"

"ہم نے جو بول دیا ہے، اُتنا ہی ٹھیک ہے۔"

"چھوڑو تجھل بھائی! یہ سالا کُتّے کی دم ہے۔" پیرو نے تلملا کے کہا: "سُولم! ابھی اِس کو بولو کہ فیصلہ کرے۔ اپنے کو لے جانا مانگتا ہے تو ہتھیار کے سنگ۔ اپن سالا قبیلے سے سردار کی ماں بھگا کے نہیں لایا ہے۔ ایدر ایک چھوکری اُودر کی اپنی مرضی سے آئی ہے، مرضی بدلے تو لوٹ جائے۔ اپن نہ ایدر کا آدمی ہے، نہ سردار کا بچا کھاتا ہے۔ سالا ایک کے برابر ڈزن ڈزن بھر ہے۔ پھر لو تنا ہے ہتھیار نکال دو۔ پھر بولیں گا، آنکھ الگ کر دو، کان الگ کر دو۔" پیرو منہ چڑا کے بولا: "مسخری ملتا ہے۔ قسم سے ابھی اُستاد بادشاہ کا خیال ہے۔ اپن کا خون بہت گندا ہے۔"

وہ تنا تم کے ذکر پر ایک لمحے کے لیے چونکے تھے۔ شاید اُن کے لیے یہ اطلاع نئی تھی مگر انھوں نے پلٹ کے نہیں پوچھا کہ قبیلے کی کون سی لڑکی ہمارے ساتھ آئی تھی۔ تاہم اُن کے چونکنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ بڑے مندر کے تہ خانے سے ہمارے نکلنے اور تنا تم کے ساتھ ہونے سے پہلے انھوں نے یہاں پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ انھیں یقین ہو گا کہ اگر ہمیں ہندوستان کی طرف جانا ہے تو ہم اِس جگہ سے ضرور گزریں گے۔ پیرو نے کہا تھا کہ وہ چاہیں تو ہمارے سامان کی تلاشی لے لیں۔ انھوں نے اِس پر توجہ نہیں دی۔ وہ طے کر کے آئے تھے کہ ہمیں بستی واپس لے کے جائیں گے تو ہمارا سامان چھیڑنا لاحاصل تھا۔ یہ کام وہ بستی میں جا کے بھی کر سکتے تھے۔ پیرو کہہ چکا تھا کہ ہم کوئی مجرم نہیں ہیں جو ہتھیار اُتار کے چلیں، انھوں نے بحث نہیں کی حالانکہ وہ کہہ سکتے تھے کہ پھر بستی سے کوئی اطلاع دیے، کسی سے کچھ کہے سُنے بغیر ہمیں یوں غائب ہو جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اطلاع دینے میں کیا عذر تھا۔ یہ کوئی منظم پروگرام ہی ہو گا، دوسرا قافلہ بھی ہمارے ساتھ تھا جسے ہم نے اپنے جانے سے تین دن پہلے بستی سے روانہ کیا تھا۔ پیرو اور تجھل نے سردار کے سامنے خود کو دو قافلوں کے طور پر پیش کیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے آئے تھے۔ اب وہ دونوں ساتھ تھے۔ ہزار قسم کے وسوسے اُن کے ذہن میں گردش کرتے ہوں گے۔ کاغذ کی متبرک حیثیت کے علاوہ اُن کے بارے میں اور بھی بے شمار روایتیں مشہور تھیں۔ ہرچند کوئی بات واضح نہیں تھی۔ اِس سلسلے میں اُن کا علم سُنی سُنائی باتوں سے زیادہ نہیں تھا۔ کسی مخفی خزانے کی روایت بھی اُن میں سے ایک ہو گی۔ اشاروں کنایوں میں انھوں نے اُس کا تذکرہ بھی کیا تھا مگر وہ یقیناً بڑے مندر کے تہ خانے میں چھپے ہوئے عظیم الشان خزانے کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔ کبھی انھوں نے اِن کاغذات کی تحقیق کی باقاعدہ کوشش ہی نہیں کی تھی۔ ایک تو وہ انھیں چھوتے ہوئے ڈرتے تھے یا پھر وہ اُن کے رموز جاننے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ ممکن ہے کبھی کسی نے ان کی تحقیق کی جرأت کی ہو اور قبیلے میں فساد کے خوف سے خاموش رہا ہو۔ اگر کبھی ایسی کوئی کوشش کی گئی تھی تو اُس کا علم چند لوگوں تک محدود رہا ہو گا۔ جس زمانے میں قبیلے کا سردار کورا کا باپ مارا گیا تھا، اُس زمانے میں اُس کے اتالیق اخین نے، ہو سکتا ہے، کوئی رمز دریافت کر لی ہو جس کا علم کورا کے چچا کو بھی ہو گیا ہو اور اُس نے محض اسی سبب سے اپنے بڑے بھائی کو راستے سے ہٹا دیا ہو مگر اخین کاغذات اور کورا کو لے کے اُس کی دست بُرد سے دُور ہو گیا۔ بہرحال کاغذات سے متعلق اَن گنت روایتیں، قبیلے میں ہماری اچانک آمد اور ہمارے متضاد طرزِ عمل کے پیشِ نظر وہ ہمارے بارے میں اَن گنت قیاس آرائیاں کرنے میں حق بجانب تھے مگر انھوں نے اِدھر اُدھر اُلجھنے کے بجائے بس اپنا مقصد سامنے رکھا تھا کہ وہ کسی طور ہمیں سردار کے سامنے زندہ پیش کر دیں۔

پیرو اور تجھل کی زبانی ہتھیار اُتارنے سے حتمی انکار سُن کے وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ ادھیڑ عمر شخص جو اُن میں سب سے بڑا عہدے دار تھا، ہمارے ہتھیار ہمارے ساتھ رکھنے پر آمادہ نہیں تھا مگر اُس کے دوسرے

ساتھی اُس کے ہم نوا نظر نہیں آتے تھے۔ اِس دوران ہیرو بڑبڑاتا رہا۔ تجمل نے اُس کی کمر تھپک کے اُسے کسی طرح چپ کیا اور ہم سب اُن کے فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔ اب کوئی اور اُمید باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ہتھیار چھن جانے سے ہماری تعداد نہ ہونے کی برابر رہ جاتی۔ تجمل، ہیرو، سولم اور میں، چاروں اُن کی نا آمادگی کی صورت میں اپنے تمنچے اور چاقو نکالنے کے لیے مستعد تھے اور ہمیں اندازہ تھا کہ ہماری کسی بھی حرکت پر ایک لمحے میں چاروں طرف سے تیر برسنا شروع ہو جائیں گے۔ تیر چلنے کی نوبت آئی تو ہم میں سے کوئی بھی زیادہ دیر تک نہیں ٹھیر سکتا تھا۔ میں نے طے کر رکھا تھا کہ ایک ہاتھ میں تمنچا، دوسرے میں چاقو لے کے جھٹ اُن کے غول میں گھس جاؤں گا۔ وہ اپنے آدمیوں کو اشارہ کرنے سے پہلے ہمارے جواب کا انتظار ضرور کریں گے۔ اسی مہلت میں ہم اُن پر جھپٹ سکتے تھے۔ تجمل، ہیرو، سولم نے بھی یہی سوچ رکھا ہوگا۔ اس موقع پر تمنچے سے کارگر کوئی اور ہتھیار نہیں ہوگا۔ نیچے ابا جان کے ساتھ کھڑے ہوئے ہمارے سارے آدمیوں کی نظر ہم پر ہوگی۔ وہ اب ایک ٹیلے پر تھے اور اُن کی بندوقیں اُوپر کھڑے ہوئے لوگوں کا نشانہ لے سکتی تھیں۔ وہ آخر دم تک نشانے لگاتے رہیں گے اور کسی کو بھی کسی حیران کن نتیجے کی توقع نہیں ہوگی۔ ہم کتنی گولیاں چلائیں گے۔ ہمارے پاس کارتوس یقیناً اُن کی تعداد سے بہت زیادہ تھے مگر اُنھیں استعمال کرنے کا موقع ملتا تب نا۔ یوں بھی اُن کے ساتھ جانا تھا لیکن ہتھیاروں کے بغیر زندہ جانا بھی مُردوں کے مانند جانا تھا۔

ہتھیار اُن کے حوالے کرنے تھے تو بھرے ہوئے ہی کیوں، بندوقیں اور کارتوس خالی کر کے اور خنجروں، چاقوؤں کی دھار کند کر کے ہی کیوں نہیں۔ ایک پل، دو پل کی دیر تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کے نیچے کھڑے ہوئے ابا جان کی طرف دیکھا۔ اُن کا سر جھکا ہوا تھا، میرے لیے دعا کر رہے ہوں گے۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ پھر اُن کا چہرہ دیکھنے کا وقت ملے گا یا نہیں۔ آنے والی گھڑی کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اگر مجھے ابا جان سے دو باتیں کرنے کا موقع مل جاتا تو میں اُن سے زریں، نیساں، شہ پارہ کے لیے کچھ کہتا اور اپنی بنڈی میں رکھی ہوئی چیک بک اُن کے حوالے کر دیتا۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ ابا جان پر ہاتھ نہیں اُٹھائیں گے لیکن اُن کی موجودی میں ابا جان میری لاش کو بھی اپنے سینے سے نہیں لگا سکیں گے۔ اُن چند لمحوں میں نہ جانے کیسے کیسے خیال آئے کہ میرا سارا وجود لرز لرز گیا۔ کچھ دیر پہلے ہیرو نے ابا جان سے کہا تھا کہ میں خطرے کی کسی گھڑی میں پیدا ہوا ہوں گا۔ خطرے کی نہیں تو وہ نحوست کی گھڑی ضرور تھی۔ میرا وجود ہی نحس تھا۔ سب ایک آدمی کے سبب سے تھا۔ وہ نہ ہوتا تو اتنے لوگ اس دور افتادہ، اجنبی جگہ پر یوں زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا نہ ہوتے۔ کاش عدالت میں تین آدمیوں کے قتل پر اُسے ابتدا ہی میں موت کی سزا مل جاتی! کتنے چاقو اُس کے جسم کے لیے کھلے تھے۔ کوئی ایک اُن میں سے لگ جاتا تو یہ وقت نہ آتا۔ معلوم نہیں، وہ چند آدمی دنیا سے کیوں نہیں اُٹھ جاتے جو خود بھی زندہ نہیں رہتے، دوسروں کو بھی چین سے نہیں رہنے دیتے۔ میرے قریب تجمل پُر سکون انداز میں کھڑا تھا۔ ہیرو بھی بظاہر مطمئن نظر آتا تھا۔ اندر ایک طوفان مچا ہوگا۔ اُس کی بیٹی گیتا اور بیوی کی پرچھائیاں آنکھوں میں لرز رہی ہوں گی۔ کاش وہ سب مل کے پہلے مجھے مار دیتے۔

ادھیڑ عمر شخص اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے جیسے ہی ہماری طرف متوجہ ہوا، میرے ہاتھ تیزی سے اپنی جیبوں کی طرف لپکے لیکن ہتھیار باہر نکالنے کی ضرورت نہیں پڑی، ایک لمحہ جاتا تھا کہ میرے تمنچے کی گولی اُس کے سینے میں پیوست تھی۔ اُس نے سر کی جنبش سے اپنے اقرار کا اظہار کر دیا تھا۔ کسی تاخیر کے بغیر "چلو!" اُس نے اُونچی آواز میں ہمیں حکم دیا۔

☆ تجمل اور ہیرو پھر ایک پل کے لیے بھی اُن کے سامنے نہیں ٹھیرے۔ چپ چاپ نیچے ٹیلے پر آ گئے جہاں سب ہمارے منتظر تھے اور یہ جاننے کے لیے مضطرب کہ ہم کیا طے کر کے آئے ہیں۔ شاید وہ کسی عجوبے کی توقع کر رہے تھے۔ تجمل نے اُن سے سامان اُٹھانے اور چلنے کے لیے کہا تو اُن کی گردنیں ڈھلکنے سی لگیں مگر اُنھوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا یا کوں کا رُخ فوراً موڑ دیا گیا۔ جانگ قبیلے کے سارے آدمی اُوپر ہی رہے اور اطراف سے ایک جانب سمٹتے گئے۔ وادی سے نکلتے ہی وہ ہمارے اِردگرد ہو گئے۔ اُنھوں نے خود کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ کچھ لوگ ہمارے آگے تھے، کچھ پیچھے، کچھ دائیں بائیں۔ کچھ ہم سے قریب تھے تو کچھ دُور۔ جو قریب تھے، اُن کے ہاتھوں میں نیزے تھے۔ دُور چلنے والوں کے ہاتھوں میں کمانیں تھیں، ابا جان اور تشانم ہمارے ساتھ ہی تھے۔ ایک بزرگ شخص نے ابا جان کے پاس آ کے اُنھیں الگ ہو جانے کی پیش کش کی تھی۔ ابا جان نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ ایسے حالات میں وہ اُن لوگوں سے جُدا ہونا مناسب نہیں سمجھتے جن کی رفاقت میں اُنھوں نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ ہمارے ہمراہ اُن کی واپسی کا جواز موجود تھا۔ اِن دشوار گزار راستوں میں تنہا سفر کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ ہمارے لوٹنے کے بعد ابا جان اکیلے سفر نہیں کر سکتے تھے۔ اُنھیں راستے میں کسی دوسرے قافلے کی ہم رکابی کے عذر تک ہمارے ساتھ واپس چلنا تھا۔ بھکشوؤں

...کے قافلوں کی سفری رفاقت کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ...اریاں کم کرنے کے لیے کبھی تاجر بھکشوؤں کے قافلے ...و جاتے تھے، کبھی بھکشو تاجروں کے ساتھ۔ یہی وجہ تھی ...نے ہمارے ہمراہ ابا جان کی موجودی پر کسی شبہے کا اظہار ...۔ قریب آ کے اُنھوں نے تشانم کا چہرہ بھی دیکھ لیا تھا ...بُرا بھلا کہا، نہ ابا جان کی طرح اُسے ہم سے جُدا ہونے ...ی کی۔ جب سب بستی ہی کی طرف جا رہے تھے تو تشانم ...یا اُدھر، بات ایک ہی تھی۔

...نے بہت سے مرحلوں کے درمیان تشانم صرف ایک لڑکی ...کا سن کے اُس کے سُرخ و سفید چہرے پر زردی چھا ...۔ لمحہ جیسے اُس کا خون سوکھ رہا ہو۔ تجمل نے اُسے ...پر بٹھا دیا تھا مگر اُس کے بدن کی لرزش کم نہ ہوئی۔ سلطان ...یب ہی تھا اور سرگوشیوں میں اُسے بار بار نہ جانے کیا ...سے دے رہا تھا۔ پھر تجمل بھی اُس کے پاس پہنچ گیا اور اُس ...ہاتھ تھام کے اُس کے بدن کو ہلکے ہلکے جھٹکے دیے "گڑیا! ...ہوئے بولا۔ "رنگ کیوں بدلتی ہے۔ وہ لال رنگ ہی ...چھا لگتا ہے۔"

...انم کے ہونٹ سسکنے لگے۔

"...نا۔" تجمل اُس کی انگلیاں چومتے ہوئے بولا۔ "تیرا کیا ہے ...دھر ہی ہے۔ سنگ سنگ جانا۔"

...م نے اُسے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔ دو دن سے وہ ...تھی۔ تجمل نے اُسے پہلی بار مخاطب کیا تھا۔ "بیچ میں چار ...ے اور گھر سے پگڑا کا رستہ بھی چھوٹا نہیں تھا۔ جب ...دیا نواب کا ہے کا دھواں ہے سجنی! بے رُت برکھا ...لگتی، وہ ہنس کے بولا۔ "یہ لوٹ پھیر تو ساری زندگی ...کر اُجلا ہی رکھ، جیسا لے کے آئی تھی ویسا۔ سمجھتی ہے نا؟" ...نہیں تشانم کی کچھ سمجھ میں آیا یا نہیں مگر دیکھتے دیکھتے اُس ...رنگ واپس آنے لگا۔ اُس کا مرجھایا ہوا بدن جیسے پھر سے ...سہ پہر ہو گئی تھی، ابھی ہم نے وادی سے چند میل آگے ...لیا ہوگا، اندھیرا گہرا نہیں ہوا تھا کہ اُنھوں نے اچانک سفر ...وہ ایک کشادہ اور ہموار جگہ تھی۔ قریب ہی پڑاؤ کے لیے ...بکر ملنی مشکل ہوگی اسی لیے اُنھوں نے یہیں ڈیرے ڈال ...کے ساتھ بار برداری کے لیے بیس کے لگ بھگ ...باقی سامان بڑے بڑے تھیلوں میں اُن کی پیٹھ سے ...تھا۔ وہ فاصلے فاصلے سے ہمارے اردگرد مختلف مقامات ...تھے۔ اندھیرا ہوتے ہی اُنھوں نے مشعلیں روشن کر دیں اور الاؤ جلا دیے۔ اُن میں سے چند لوگ ہماری پہرے داری چھوڑ کر کھانا تیار کرنے کے کام میں مصروف ہو گئے۔ جامو اور ہیرو نے صبح صبح کئی پرندوں کا شکار کیا تھا لیکن انھیں ہم نے محفوظ رہنے دیا۔ سولم نے اُن سے پوچھ لیا تھا کہ وہ ہمارے لیے بھی کھانا تیار کر رہے ہیں یا نہیں۔ وہ منع نہیں کر سکے۔ سو ہم تین خیمے نصب کر کے اور بستر لگا کے لیٹے رہے۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ اُنھوں نے اِدھر اُدھر کئی چھوٹی بڑی چھول داریاں کھڑی کر لی تھیں اور ہمارے خیموں کے باہر متعدد آدمی پھیلا دیے تھے۔ جب تک اُنھوں نے کھانے کے لیے آواز نہیں دی، ہم باہر نہیں نکلے۔ سارا جسم ٹوٹ رہا تھا اور بخار سا محسوس ہو رہا تھا۔ اُنھوں نے وافر کھانا بھیجا تھا۔ کسی کو بھوک ہی نہیں تھی، سب نے ایک دوسرے کے خیال سے تھوڑا بہت حلق سے اُتار لیا۔ ابھی رات کا ابتدائی پہر تھا۔ کھانا کھا کے ہم کچھ دیر ہی باہر ٹھیرے ہوں گے کہ پھر خیموں میں آ کے پڑ گئے۔ تجمل نے سب کو تاکید کی تھی کہ پوری رات آرام سے سوئیں مگر سب آنکھیں کھولے کروٹیں بدلتے رہے۔ کسی کے پاس دوسرے سے کہنے کے لیے شاید کچھ نہیں تھا، باہر الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کے گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تجمل، ابا جان، تشانم، وزیر اور سولم الگ خیمے میں تھے۔ میں، جامو، مارٹی، زورا اور جینی دوسرے میں، تیسرے میں ہیرو، سلطان، پلٹو، ہلاکو اور دو قلی تھے۔ تیسرا قلی تجمل کے خیمے میں تھا۔ سب قریب ہی قریب تھے۔ کوئی زور سے بات کرتا تو دوسرے خیمے کے لوگ سُن سکتے تھے۔ رات گزرنے پر ہم سب نے باری باری خیمے کی جھریوں سے جھانک کے دیکھا۔ اتنی سخت سردی میں وہ باہر ہی موجود تھے۔ نہ جانے اُنھوں نے چھول داریاں کیوں نصب کی تھیں۔ کھانے کے دوران ایک شخص نے آ کے ہمیں متنبہ کرنا ضروری سمجھا تھا کہ فرار کی کوشش ہمارے لیے انتہائی عبرت ناک ہوگی۔ آگے کی منزلوں پر بھی اُن کے قبیل جانگ قبیلے کے گروہ موجود تھے۔ سب سُن کے خاموش رہے۔

جیسے جیسے رات بڑھتی گئی، سردی میں اضافہ ہوتا گیا۔ میرا خیال تھا کہ سردی سے گھبرا کے وہ آخر کار چھول داریوں میں پناہ لیں گے۔ ممکن ہے تجمل کے ذہن میں ہو کہ اُس لمحے باہر نکلنے کی ہم کوئی کوشش کر سکتے ہیں اور بارش ہو گئی تو لازماً اُنھیں اندر گھسنا پڑے گا۔ الاؤ بھی بجھ جائیں گے، مشعلیں بھی گُل ہو جائیں گی۔ آسمان صاف تھا۔ کہیں کہیں بادلوں کی ٹکڑیاں ستاروں اور چاند پر چھا جاتی تھیں۔ بارش کا امکان نہیں تھا مگر کسی وقت بھی بارش ہو سکتی تھی۔ یہاں ایسا ہی ہوتا تھا۔ اچانک بادل گھر کے آ جاتے اور موسلا دھار پانی برسنے لگتا لیکن جس طرح وہ بارش میں باہر

نہیں رہ سکتے تھے، ہم بھی اپنے خیموں سے نہیں نکل سکتے تھے بکل کے کتنی دُور جاتے! بارش کا سلسلہ نہ رُکتا تو کہاں سر چھپاتے۔ آسمان سے اولے نہیں پڑتے تھے تو برف کا پانی گرتا تھا جیسے اوپر سلیں رکھی ہوں اور پگھل رہی ہوں متن میاں کا جسم برف کے اسی پانی نے ٹھٹھرا دیا تھا۔ پھر سامان ساتھ تھا۔ قلیوں اور یاکوں کو اٹھا کے اندھیری رات اور بارش میں پگ ڈنڈیوں پر چلنا ممکن ہی نہیں تھا۔

رات بھر وہ جاگتے ہی رہے تھے اس لیے اولِ صبح کھڑے ہو گئے اور ناشتہ کرتے ہی آگے بڑھنے لگے۔ اتنے آدمیوں میں رفتار تیز نہیں ہو سکتی تھی پھر ہم نے خود اپنی رفتار دھیمی رکھی تھی۔ دو دن میں جتنا طویل سفر ہم نے کیا تھا، انھیں اس کے لیے تین دن لگتے۔ یہ دوسری بات تھی کہ وہ کسی اور راستے سے بستی میں داخل ہوں لیکن انھوں نے راستہ نہیں بدلا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ کوئی مختصر راستہ ہمیں دکھانا ہی نہ چاہتے ہوں۔ دوپہر کے کھانے کے وقت انھوں نے مکھن، خشک اناج اور رات کے بچے ہوئے گوشت اور چائے پر گزارہ کیا اور چلتے رہے۔ کل دوپہر سے اب تک اُن کے کسی آدمی نے ہمارے کسی آدمی سے غیر ضروری بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی، تشانم سے بھی نہیں اور اُن قلیوں سے بھی نہیں جو ہمارے ساتھ تھے۔ کئی مرتبہ مجھے ایسا لگا کہ اُن کی متجسس نظریں ہمارے سامان پر بھٹک رہی ہیں لیکن یہ ایک احساس ہی تھا، وہ چونک چونک کے بار بار ہماری نقل و حرکت دیکھتے رہتے تھے۔ کسی جگہ انھوں نے ہمارا سامان چھونے اور کریدنے کی زحمت نہیں کی۔ تمام ہیرے جواہر یہاں تک کہ تہہ خانے سے برآمد کیا ہوا منقش بکس بھی ہم نے ٹرنکوں میں محفوظ کر دیا تھا اور ٹرنکوں کا سامان تھیلوں میں۔ انھیں شاید کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان صندوقوں میں کیا چھپا ہوا ہے۔ کچی آنکھوں کا کوئی شخص دیکھے تو آنکھیں پھٹ جائیں۔ اگر انھیں معلوم تھا تو وہ سب انھی کے ملاتے میں انھی کے پاس واپس جا رہا تھا سو انھیں تشویش کرنے کی کیا ضرورت تھی مگر انھیں کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔

تمام راستے اباجان سر جھکائے کسی متحرک بُت کی طرح قدم بڑھاتے رہے۔ ہمارے ہمراہ ہونے کے باوجود بھی وہ سب سے الگ الگ تھے۔ انھوں نے اپنی جانب سے کسی سے کچھ کہنے، کچھ پوچھنے کی پہل نہیں کی البتہ وہ لوگ اُن سے وقفے وقفے سے پوچھتے رہتے تھے کہ انھیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ اباجان ہر مرتبہ کبھی سر ہلا کے کبھی تبتی کے دو ایک لفظوں میں منع کر دیتے تھے۔ نو سال میں انھوں نے تبتی زبان سے بڑی حد تک واقفیت حاصل کر لی تھی، پڑھنے میں تو انھیں ملکہ حاصل ہو گیا ہو گا تبھی کاغذات میں لکھی ہوئی ہزاروں سال پہلے کی زبان اُن کی سمجھ میں آئی ہو گی۔ تبتی بولنے میں پڑھنے جیسی روانی نہیں ہو گی۔ تبت کے مقدس خانقاہوں کی زیارت کرنے والے کسی راہب کے لیے لازم نہیں تھا کہ اُسے تبتی سے خوب آشنائی ہو۔ دنیا بھر سے راہب آتے تھے۔ اباجان نے تبتی محض کاغذات کا علم اخذ کرنے کے لیے سیکھی ہو گی۔ ہو سکتا ہے، وہ پہلے ہی اس میں کچھ شُد بُد رکھتے ہوں، وہ گیا میں پیدا ہوئے تھے، انھیں ہزاروں تبتی راہبوں سے پڑا ہو گا۔ کوئی بعید نہیں کہ کاغذات کسی اور زبان میں ہوں، اور چینی ملی ہوئی زبان۔ بہرحال وہ کسی بہت مشکل زبان ہی میں گے جو اباجان کو نو سال لگ گئے۔ یہ اُن کے نو سال کی ریاضت تھی جو صندوقوں میں پتھر اور دھاتوں کی شکل میں چھپی ہوئی تھی صندوقوں میں قیمتی اوراق کی روحیں بند تھیں۔ اباجان ہی ٹھیک جانتے تھے کہ اُن میں کیا کیا بند ہے۔

دوسرے دن سہ پہر ہونے تک ہم اس طرف کے پہاڑ کے آخری سرے پر پہنچ گئے تھے۔ اِس طرف کے یوں کہنا چاہیے ایک گہرا نشیب درمیان میں راستہ کاٹ دیتا تھا۔ دوسری بھی بلند و بالا پہاڑ تھے مگر اُن تک جانے اور آگے سفر جاری کے لیے آمنے سامنے دونوں پہاڑی سلسلوں کے بیچ رسیوں کے تختوں سے بنا ہوا پل عبور کرنا پڑتا تھا۔ نیچے ہزاروں فٹ میں دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کے چوڑے پاٹ کے سبب پل بھی تھا۔ یہاں سے ہم دو دن پہلے گزر چکے تھے۔ پل آنے پر سد نے بے اختیار تھجل کی طرف دیکھا لیکن تھجل کے ماتھے پر کوئی شکن آنکھ میں ہلکی سی چمک بھی نہیں ابھری۔ یہی ایک ایسی جگہ تھی سب کو سمٹ کے پل پار کرنا تھا۔ تھجل کی ہدایت پر وادی کے بعد اب تک ہم نے ہتھیار لیں ہی چھوڑ رکھے تھے۔ بندوقیں پر جھولتی رہی تھیں اور تمنچے، چاقو جیبوں میں پڑے رہے تھے بھی اِس مقام پر احتیاط کا احساس تھا۔ اول تو وہ قطار کے انداز بٹے ہی نہیں۔ پل کے اُس سرے پر دائیں بائیں پھیل گئے انھوں نے پہلے اپنے آدھے آدمی عبور کرا دیے تب ہم سے بڑھنے کہا۔ باقی آدھوں نے دوسری جانب ہمارے پہنچ جانے پر پل شروع کیا۔ دونوں اطراف اُدھر پہنچ جانے والے اور اِدھر رہ جانے والے لوگ ہمارے پل سے گزرنے کے دوران ہتھیار اٹھائے کھڑے رہے۔ انھوں نے بس ہمارے پیروں میں بیڑیاں اور ہاتھوں ہتھکڑیاں نہیں ڈالی تھیں۔ تھجل اور پیرو نے ہتھیار ساتھ پر اُن سے بے کار اصرار کیا تھا، یہ صرف ذہن کا دلاسا تھا۔ اُن کی نظریں ہم سے اوجھل نہیں رہی تھیں۔ ہر طرف اُن کا

ہیں۔ ہماری حالت اُس قیدی سے مختلف نہیں تھی جسے کے پیچھے ہتھیار دے دیا جائے۔ قیدی زیادہ سے زیادہ گا، قریبی پہرے دار پر جھپٹے گا یا پھر خود کو مار لے گا۔ سا نے کو تو وہ تمنچے اور چاقو سے نہیں کاٹ سکے گا۔

پل طے کرنے میں خاصا وقت لگ گیا تھا۔ ہم ایک آدھ اور چلے ہوں گے کہ ہلکی بوندا باندی ہونے لگی ویسے بھی اندھیرا دھندلی کرنے لگا تھا۔ وہ ایک مناسب جگہ ٹھہر گئے۔ بوندا باندی جاری نہیں رہی۔ شام کو آسمان خشک ہو گیا تھا۔ دن بھر چے راستوں پر چلتے چلتے پیر دُکھنے لگے تھے۔ میری پنڈلیاں میں اینٹھ رہی تھیں لیکن میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ ح سب کا یہی حال ہو گا۔ اونچائی پر ایک کوس کا سفر میدانی کے کئی کوس کی تھکن کے برابر ہوتا ہے۔ بستی تک تاخیر سے یہ بھی ایک سبب تھا کہ آگے بیشتر اونچائی تھی۔ پڑاؤ ل کے معمول کے مطابق وہ اپنے کاموں میں مصروف ہو چولداریاں نصب کرنے، کھانے پکانے، الاؤ جلانے اور ن روشن کرنے کے لیے چند آدمی الگ ہو گئے تھے۔ باقی کا کام ہماری نگہداشت کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہمارے ں انھوں نے ایک طرح کے مورچے قائم کر لیے تھے۔ تھجل جان، تشانم اور قلیوں کو خیموں میں بھیج دیا اور خود ہم سب کے باہر رہا اور ہم کسی ایک جگہ ٹک کے بیٹھنے کے بجائے ستار نے تک ایک محدود فاصلے میں خواہ مخواہ اِدھر سے اُدھر چکر رہے۔ کھانا کھاتے ہی تھجل نے الاؤ جلوا دیا تھا۔ سب موٹے اور کمبلوں میں لپٹے ہوئے اس کے گرد بیٹھے ہاتھ تاپتے رہے ہمارے اِرد گرد منڈلاتے رہے۔ ہم سب پر سکوت طاری تھا۔ توڑنے کے لیے پیرو بمبئی کے واقعات سنانے لگا۔ پھر تو قصوں ل کا ایک تانتا سا بندھ گیا۔ پیرو کی زبان اُس کے سنانے اور ت کے لیے ہاتھ کے اشاروں کا انداز اتنا تجسس انگیز تھا کہ کھو گئے تھے اور کچھ دیر کے لیے انھیں بالکل یاد نہیں رہا کہ ل اور کن لوگوں کے درمیان ہیں۔ پیرو کہیں اٹک جاتا یا بھول زورا اور مارٹی اُسے اُکساتے اور یاد دلا دیتے "یہ دلوا! وہ اُودر ال جامنی بائی کا سالا کیا لفڑا تھا؟" پیرو کے چپ ہوتے ہی نے کسمساتی آواز میں پوچھا۔

پیرو آدھر کے بولا "یہ کس کا نام لے دیا ماسٹر!"

"بولو نا دادا!" مارٹی نے اصرار کیا۔

"جانے دے ماسٹر! کیوں سوٹی مارتا ہے!"

"اپن اُس ٹیم چھنگا اُستاد کے پاڑے میں تھا۔" زورا اشتیاق سے بولا۔ "پر اپن کے کان بند نہیں تھے۔ سُنا تھا کہ سالی نے اُودر تمہارے بیچ لمبا پھندا ڈالا تھا۔"

"ابھی اپن کیا بولے۔" پیرو کی آواز کہیں کھو گئی۔ "ایک ٹیم تو اُس نے اپن کو نچا دیا تھا زورا دادا!"

"اپنے کو ایسا بول کے کیوں خوار کرتے ہو دادا!" زورا کان پکڑتے ہوئے بولا۔ "اپن ابھی تمہارے پیروں کا مٹی بھی نہیں، دادا کر کے سے ہو گیا!"

پیرو اُسے کوئی جواب دینے کو تھا کہ وزیر نے جھجکتے ہوئے لہجے میں اسے ٹوکا "یہ وہ جامنی بائی والا قصہ بول رہے تھے تم...."

"جامنی بائی! جانی! کس منہ سے بولے۔" پیرو ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگا۔ "ایک نمبر فنٹوش تھا وزیرے! ایک ٹیم پورا اودر اُس کا غلام تھا۔ کلر سالی کا بالکل جامن جیسا اور بدن! بدن کسی مندر کا مورت مانک تھا۔ روز اُس کو ہتھوڑی سے ٹھوکتا تھا یا چاقو سے کاٹ چھانٹ کرتا تھا۔ ایسا سنبھال کے رکھا تھا جیسا اودر بمبئی میں ڈولی رام اپنی دکان کے کانچ کے پیچھے گوری میم کی مورتی سنبھال کے رکھتا ہے۔ ایک دم نیچے سے اوپر تک کھنچا ہوا، قطب کی لاٹ کی طرح، آنکھ بڑا بڑا، ہرنی مافک، بال سالا بس پیروں تک آنے سے بچ گیا تھا۔ کلر جامنی نہیں ہوتا تو کسی محل کا رانی بنتا، رانی تو وہ اُس ٹیم بھی تھا۔ لوگ باگ اُس کو دادر کا رانی بولتا تھا۔ جب پاڑے سے نکلتا، لگتا شیرنی بن سے نکلتا ہے، اِیدر سے اُودر تک دادر کے جنگل میں سب کی بولتی بند ہو جاتا۔ پتہ نہیں سالی کدر سے آیا تھا۔ کچھ بولتا، بنگال سے آیا ہے، کچھ اُودر لنکا سے بولتا، جب آیا تو دادر کے پاڑے میں طوفان دادا بیٹھتا تھا۔ بولتے ہیں، جامنی بائی سے پہلے اُس کا بھائی تارہ بمبئی آیا تھا اور آ کے دادر میں ہی اونچا نیچا کام کرنے لگا تھا۔ طوفان دادا کے آدمی نے بھتا مانگا۔ تارہ بھی آدمی سونا تھا، بھتے کے بجائے طوفان کے آدمی کو ٹھینگا مارا، ہاتھ پاؤں الگ سمجھا دیا۔ بولتے ہیں، طوفان نے سالا حرامی پن کیا۔ اپن سب گٹے ہیں، پر وہ بہت نیچی جات کا تھا۔ لومڑی کا بچہ، ایک رات مالے پر جا کے طوفان کے آدمی نے تارہ کو بجھا دیا۔ پھر کچھ دن بعد جامنی بائی کا دادر میں ایک دن بجلی چمکا۔ اِس سے پہلے اُودر کسی نے اُس کو نہیں دیکھا تھا۔ جامنی سیدھا طوفان کے پاڑے پہنچا اور جا کے بولا کہ اپنے بھائی کا بدلہ لینا مانگتا ہے۔ طوفان دادا سمجھا چھوکری مسخری کرتا ہے۔ جامنی بائی تیار ہو کے آیا تھا اور پتہ نہیں سالی لوہا پی کے آیا تھا یا جادو کر کے۔ اُسی ٹیم طوفان کو نرکھ کا ٹکٹ کٹا دیا۔ اپن کا دادا ایک آدمی بھی اُودر تھا، بولتا تھا کہ جامنی کا ہاتھ اکھا خالی تھا۔ طوفان جیسا دیو آدمی کا اُس نے دیکھتے دیکھتے چٹنی پیس دیا۔ کیس چلا، کچھ تو عورت ہونے

کا سالی کو بخشش ملا، کچھ وکیل کے زور مارنے سے جامنی بائی کو صرف ۵ برس کا سزا پڑا۔ پانچ برس میں ابھی چار برس کاٹا تھا کہ جیل سے چھوٹ کے پھر دادر آگیا اور طوفان دادا کے پاڑے پر آکے ہی جم گیا۔ سالی کی عمر بھی کم تھا۔ چار برس بندی کے بعد بھی چھوکری لگتا تھا جیسے اُودر سالا بس شیشے کے سامنے بیٹھا رہا ہو۔ جیل سے بدن کو لپرا تیر کمان بنائے ہوئے نکلا تھا۔" پیرو کی آواز بہکنے لگی اور وہ بولتے بولتے گم سا ہو گیا۔ سب انتظار کرتے رہے۔ چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد پیرو خود ہی بولا۔"کیدر کیدر سے بولے۔ پورا آگن تھا سالا۔ جن اُٹھاتا تو پاڑے کے سارے آدمی کو تھرتھری لگ جاتا۔ کسی نے اونچا بوم مارا، اُس کو سدا کے لیے بنچا بٹھا دیا۔ گیرُوے اور نیلے رنگ کے سوا دوسرا کلر کا ساڑی نہیں پہنتا تھا۔ اِدھر دادر کے آزو بازو پاڑوں کے دادا لوگوں کو موت مانگتا تھا تو وہ اُودر جامنی بائی کے پاڑے کو اُن کا منہ پھیر دیتا تھا جس نے جامنی بائی سے مخول کیا' اپنے آپ سے مخول کیا۔ جامنی بائی کبھی خود سے کسی پاڑے میں نہیں گیا۔ وہ اُودر اپنے کو بند رکھتا تھا۔ پر دادا لوگ ایک عورت کا ٹن کے اپنی خواری سمجھتا تھا۔ اُس ٹیم دادر کے بازو میں جانگڑی دادا کا بہت مشہوری تھا، اُس کو لوگ بلڈ آگ بھی بولتے تھے۔ جامنی بائی نے کچھ نہیں بولا تھا کہ جانگڑی نے آدمی بھیج کے بولا، اپن سے شادی بناؤ۔ تم رانی' اپن راجا، دونوں کا پاڑا مل جائیں گا۔ جامنی بائی جانگڑی کے آدمی کی بات سنتا رہا پھر اپنے ہاتھ کی چوڑی اُتار کے بھیج دیا۔ جانگڑی سمجھ گیا کہ ابھی جامنی بائی کا کیا مطلب ہے۔ چاقو اُس کے ہاتھ میں پیرتا تھا۔ آنکھ کا گرم اور دل کا جوان تھا۔ بولا' اپن آتا ہے' تیار رہو۔ ابھی لال کلر کا ساڑی پہننا۔ جامنی نے جواب بولا۔ کبھی آؤ' اپن ایدر ہی ہے۔ دوسرے دن جانگڑی ہار پھول لے کے گیا تھا جامنی نے لال کلر کا ساڑی پہن رکھا تھا، ہار پھول لے کے ایک طرف رکھا' جانگڑی کے آگے چاقو پھینکا اور سامنے آگیا۔ جانگڑی نے چاقو اُٹھا لیا، چوما اور دس بارہ ہاتھ سے جاستی نہیں چلایا تھا کہ بازو پر نشان ڈلوا کے گر گیا۔ جامنی بائی کھڑا رہا۔ اُودر جانگڑی کا سارا آدمی بھی یہ تماشا دیکھتا تھا۔ جانگڑی نے پھر سے چاقو اُٹھا لیا۔ سب سمجھے کہ جامنی بائی پر پھینکے گا۔ پر جانگڑی نے اُس کو اپنی چھاتی میں اُتار لیا۔"

پیرو کہہ رہا تھا کہ جامنی بائی نے جانگڑی کی آخری خواہش کے طور پر لال رنگ کی ساڑی پہنی تھی۔ سب کی آنکھیں پیرو کی طرف مرکوز تھیں۔ پیرو چپ ہو جاتا تو وہ مچلنے لگتے۔ پیرو کو اُس کی بہت سی باتیں یاد تھیں' ناقابلِ یقین باتیں' وہ اُس کے چاقو چلانے اور داؤ پیچ کے انداز بتا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ بظاہر وہ ایک سیدھی سادی سی عورت لگتی تھی مگر جب چاقو اُٹھاتی یا سامنے آتا تو بالکل بدل جاتی۔ آنکھوں میں انگارے سے دہکنے لگتے۔ جامنی رنگ سُرخ ہو جاتا اور بدن پھڑکنے لگتا۔ پیرو کہتا تھا کہ داؤ تو اُس کی آنکھوں کے تھے جسے نظر بھر کے دیکھ لیتی وہ بھول جاتا۔ ہاتھ اُٹھاتی کہیں تھی' مارتی کہیں تھی۔ کوئی اُس کے پہلے سے تعین نہیں کر سکتا تھا۔ سامنے آتے ہی ہرن کی طرح بھرتی۔ اُسے پینترے بدلنے اور جھپٹ کے وار کرنے کا ہنر تھا۔ سب سمجھتے تھے کہ وہ کوئی جادو کرتی ہے لیکن اُسے تو داؤ آتے تھے نیزا، بلم، چاقو وغیرہ اور خالی ہاتھ کے داؤ۔ اتنی کم اُس نے نہ جانے یہ سب کچھ کہاں اور کیسے سیکھا تھا۔ عموماً وہ اپنے تک محدود رہتی تھی' نہ اُسے اپنا پاڑا بڑھانے کی خواہش تھی۔ اڈے اُس کی تحویل میں آئے' اُن سب کے اُستادوں نے خود سے چھیڑ خانی کر کے اُس کی گود میں ڈال دیے تھے۔ جن پر اُس نے یوں ہی چھوڑ دیا، کئی پر اپنے آدمی بٹھا دیے۔ خود اپنے پاڑے میں تمام اَلا بلا آدمی نکال کے منتخب آدمی رکھے اپنی دو نوکرانیوں کے سوا وہ سالے پاڑے میں تنہا رہتی تھی سے بھی اُس کے تعلقات ٹھیک رہتے تھے۔ علاقے سے کسی آدمی کی شکایت آتی تو وہ اُسے سدھرنے کا صرف ایک دیتی تھی، دوسری شکایت پر اُسے پاڑے سے نکال دیتی کی کہانیاں اُس کے بارے میں مشہور ہو گئی تھیں مگر وہ آن جیسے بے خبر تھی۔ اُس کے پاڑے کے آدمیوں کا کہنا تھا کہ کبھی کسی مرد کو قریب نہیں پھٹکنے دیا، پاڑے کے کسی آدمی زیادہ بات نہیں کی۔ علاقے کے لوگ اُسے جامنی دیوی کہنے لگے کہتے تھے کہ وہ کالی دیوی کا کوئی روپ ہے۔ پاڑے میں کوئی جاتا تو خالی ہاتھ واپس نہیں آتا تھا مگر اُس کے ساتھ کم زیادتی کی ہوتی تو وہ اُس کے ساتھ خود باہر آجاتی اور زیادتی والے سے بازپرس کرتی۔ دادر کے لوگ اپنے بعض فیصلے اُس سے کرانے لگے تھے۔ جانگڑی کی موت کے بعد ممبئی دادا نے پھر جامنی بائی کے علاقے کا رُخ نہیں کیا۔ سب لیا تھا کہ جامنی کو کریدنا اپنی موت کے مترادف ہے کو ایک ہی شوق تھا۔ گانے اور ناچ دیکھنے کا شوق نے گاتے ہوئے دیکھا نہیں تھا۔ جاتی رات کو کبھی پاڑے منزل سے' جہاں وہ رہتی تھی، کبھی کبھی اُس کے گانے کی آنے لگتی' اور وہ صرف رات کو گاتی تھی۔ پیرو کہتا تھا کہ اُس سننے کے لیے اُس کے پاڑے کے آدمی کان لگائے رہتے تھے رات کو گانا اُس کا معمول نہیں تھا۔ ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا اور

ج دیکھا ہوتا تو کسی طوائف کو بُلا کے کمرہ بند کر لیتی اور تنہا اُس کا ج دیکھتی رہتی۔ مہینے میں دو ایک بار وہ ضرور کسی طوائف کو بُلاتی تھی رات کا کھانا اُس کے ساتھ کھاتی تھی، اُسے ایک جوڑا پہناتی روپے دینے کے بجائے سونے کا کنگن یا چوڑیاں دیا کرتی تھی۔

"ابھی تم نے کبھی کالا گلاب دیکھا ہے؟" پیرو نے اچانک سے پوچھا۔

"دیکھا ہے دادا!" جامو نے جواب دیا۔

"بس سمجھو جامنی بائی بھی ایک کالا گلاب تھا۔" پیرو خوابیدہ واز میں بولا۔ "گلاب کی پتی جیسا، پر ٹہنی پر کانٹا بہت تھا۔"

جھل سر جھکائے پیرو کی باتیں سن رہا تھا اور بیڑی کے ش لگا رہا تھا۔ "آواز کیوں لٹک رہی ہے دادا؟" وہ سر اُٹھا کے لی مرتبہ درمیان میں بولا۔ "ابھی آگے زبان کھولو۔"

"آگے' آگے کیا زبان کھولے۔" پیرو ست پٹا سا گیا۔ "ابھی رات بھی جانے کو ہے۔ جامنی بائی ایک رات سے بہت بڑا تھا۔ اپن کتنا چھان کے بولے۔"

"اُدھر جامنی بائی نے تم کو کب دیکھا؟"

"تم کچھ جانتا ہے اُستاد!" پیرو چونک پڑا۔

"آگے بولو' دادا!"

"قسم سے جھل بھائی! اپنے کو بولو' تم جامنی بائی کو جانتا ہے؟"

"کبھی نام سُنا تھا۔"

"صرف نام! دیکھنے کی چیز تھا۔ اُودر ممبئی میں اپن نے تم کو پہلی بار دیکھا تو جامنی بائی بہت یاد آیا۔ تم اُس ٹیم ہوتا۔"

"اب وہ کہاں ہے دادا؟" بلاکو نے بے چینی سے پوچھا۔

پہرے دار ہمارے قریب آتے اور کن انکھیوں سے جھانکتے ہوئے گزر جاتے۔ کل کی طرح اپنے خیموں میں سونے کے بجائے ہمارا الاؤ کے گرد بیٹھے رہنا اُن کے لیے حیرانی کا باعث ہوگا۔ رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی۔ الاؤ کے شعلوں نے کم از کم ہمارے اطراف کی سردی دُور کر دی تھی۔ تاہم ہوا کا کوئی تیز جھونکا چل جاتا تو آگ بھی ٹھٹھرنے سی لگتی۔ سولہ نے دیر ہوئی چائے کی کیتلی انگاروں پر رکھ دی تھی۔ پانی کھولتے کھولتے سوکھ گیا۔ کسی کو چائے بنانے کا خیال نہیں آیا۔ جامو' ملٹو اور مارٹی' پیرو کو تنکے چبھو رہے تھے ابھی رات باقی تھی۔ پیرو کہنے لگا کہ اُس وقت جب جامنی بائی دادر کے علاقے میں اڈا جمائے ہوئے تھی اور بے تاج کی رانی تھی۔ پیرو کا ماہم کے علاقے میں ایک اڈا تھا' زیادہ بڑا تو نہیں مگر آمدنی کے اعتبار سے بڑے اڈوں سے کم نہیں تھا۔ کچھ جوئے خانے اور شراب کی کئی بھٹیاں علاقے میں چلتی تھیں۔ اِدھر اُدھر کے پاڑوں کے آدمی آ کے پیرو کو جامنی بائی کے قصے سناتے تھے۔ پیرو ماہم کا سچا تھا۔ ماہم کا اڈا اُس نے اپنے ہاتھ ہی کے بل پر حاصل کیا تھا۔ ممبئی کے اور داداؤں کی طرح پیرو کے دل میں کبھی یہ خیال آتا تھا کہ وہ جامنی بائی کے ہاتھ سے چاقو چھین لے لیکن پیرو اُس کے بہت سے واقعات سن چکا تھا اور جب جامنی نے کبھی اُس علاقے کو نہیں چھیڑا تھا تو اُسے خواہ مخواہ اُس سے بیر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ دوسرے دادا جامنی بائی کو دادر کے علاقے سے بے دخل کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ شاید اسی لیے انھوں نے مشہور کر دیا تھا کہ وہ کالا جادو کرتی ہے۔ پیرو کو ان روایتوں پر یقین نہیں تھا لیکن اگر اس میں ایک فی صد بھی سچائی تھی تو اُسے محتاط رہنا چاہیے تھا۔ پیرو کسی کے اُکسانے میں نہیں آیا۔

اِدھر چند دنوں سے پیرو کے آدمی اُس کے پاس شکایت لے کے آرہے تھے کہ جامنی بائی کے آدمی اُس کے علاقے میں گھس کے پیسہ بنا رہے ہیں' اور بھی پاڑوں کے داداؤں کو یہی شکایت تھی۔ جامنی بائی کی شہرت کی وجہ سے اُس کے آدمی بے مہار ہوتے جا رہے تھے۔ دادر کے علاقے میں جامنی بائی کے ڈر سے وہ کچھ نہیں کر پاتے تو دوسرے علاقوں میں جا کے لوگوں کو تنگ کرتے۔ انھیں معلوم تھا کہ اب کوئی بھی جامنی بائی کے اڈے آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ سب اُس سے دُور دُور الگ رہنا ہی مناسب سمجھتے ہیں۔ سو کسی کو اُن کی شکایت کی جرأت بھی نہیں ہوگی۔ ہوتا بھی یہی تھا کہ جامنی بائی کی وجہ سے لوگ انھیں درگزر کر دیتے تھے لیکن رفتہ رفتہ اُن کا کٹ کھنا پن بڑھتا گیا۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ جامنی بائی خود اپنے آدمیوں کو دوسرے پاڑوں سے چھیڑ چھاڑ کے لیے بھیجتی ہے۔ پیرو کے لیے یہ بات خاصی تشویش کی تھی کہ وہ اُس کے علاقے تک پہنچ گئے ہیں مگر پیرو نے جلدی نہیں کی۔ خود علاقے میں گیا، انھیں سمجھایا کہ مان جاؤ۔ وہ پیرو کے منہ لگنے لگے۔ پیرو نے پھر تحمل کیا اور اُسی دن شام کو دادر کے علاقے میں پہنچا اور جامنی بائی کو کہلوایا کہ ماہم کا پیرو دادا ملنا چاہتا ہے۔ جامنی نے فوراً بلوایا۔ پیرو اکیلا پاڑے میں داخل ہوا تو وہ ایک تخت پر بیٹھی تھی۔ پیرو نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا۔ پیرو کہہ رہا تھا کہ تخت پر وہ کوئی ملکہ معلوم ہوتی تھی۔ کچھ دیر کے لیے تو وہ بھول گیا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے' اُسے دیکھتا ہی رہا۔ اُس کا بدن ترشا ہوا تھا، سانچے میں ڈھلا ہوا، گردن لانبی' سر اُٹھا ہوا، قد بڑا، بال کھلے ہوئے۔ گیروے رنگ کی ساڑی سے اُس نے اپنا سارا بدن ڈھانپ رکھا تھا۔ کانوں میں تازہ پھولوں کے گجرے' ناک میں لونگ اور کلائیوں میں چوڑیاں چڑھی ہوئی

سوا بدن پہ کوئی زیور نہیں تھا۔ چمکتا ہوا جامنی رنگ، پیرو کے کہنے کے مطابق جیسے کوئی پکی ہوئی جامن شاخ سے توڑی جائے، زمین سے نہ اُٹھائی گئی ہو۔ عمر میں وہ بالکل لڑکی نظر آتی تھی۔ اُس لڑکی کے مانند جس کا شوہر شادی کے فوراً بعد چھن گیا ہو۔ سب سے نمایاں اُس کی آنکھیں تھیں، نیلاہٹ لیے ہوئے سیاہ آنکھیں جو گہری گہری، ڈوبی ڈوبی اور بڑی بڑی تھیں۔ اُن میں چنگاریاں سی لپکتی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ بھی پیرو کو دیکھ کے چپ رہی پھر پیرو ہی کو کچھ ہوش آیا۔ سنبھل کے بولا: "جامنی بائی! اپن تم سے کچھ بولنا مانگتا ہے۔"

جامنی مجسمے کے مانند ساکت بیٹھی رہی۔ پیرو نے تلخی سے کہا کہ وہ اپنے آدمیوں کو روک لے۔ جامنی بائی کی آنکھیں کھلی رہیں۔ اُس نے جواب نہیں دیا۔ پیرو کو عجیب سا لگا: "اپن پھر اپنے آدمی ادھر بھیجے کیا؟ ان کو روک لو جامنی بائی! اپن بھی ان سے اُدھر نمٹ سکتا تھا، پر سوچا، پہلے تم کو بول دے۔" پیرو نے اشتعال میں کہا۔

جامنی بائی پیرو کی آواز پر جیسے خواب سے جاگی اور اپنی لانبی لانبی پلکیں پٹ پٹاتے ہوئے آہستگی سے بولی: "دادا! ابھی آرام سے بیٹھو۔" پیرو کہتا تھا کہ اُس کی آواز کھن کھنا رہی تھی۔ پیرو جھجکتے ہوئے ایک طرف بیٹھ گیا۔ جامنی بائی نے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ پیرو کے سامنے اُسی وقت صراحی اور گلاس رکھ دیے گئے۔ پہلی مرتبہ جامنی بائی نے کسی کو اس طرح شراب پیش کرنے کا حکم دیا تھا۔ پیرو نے ایک گلاس پی لیا اور بولا: "ابھی تمھارا کیا جواب ہے جامنی؟"

جامنی نے اپنے پاڑے کے سارے آدمیوں کو اندر بُلا لیا اور پیرو سے پوچھا: "اِن میں سے کون تھا دادا!"

پیرو نے تین آدمیوں کی طرف اُنگلی اُٹھائی: "ابھی اپن ان کو پہچانتا ہے، اور لوگوں کا اپن کو پتہ نہیں۔"

پیرو نے جن آدمیوں کی نشان دہی کی تھی، اُن کے سوا کسی نے واویلا نہیں کیا۔ وہ پیرو کے آدمیوں کو اُلٹا الزام دینے لگے۔ "چپ رہو۔" جامنی نے ہاتھ اُٹھا کے کہا: "اُودر وہ تم کو کھینچ لے گئے تھے کیا؟ تم اپن سے کیوں نہ بولے؟"

انھوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن جامنی بائی کی آنکھوں میں آگ اور ہاتھ میں خنجر دیکھ کے کپکپانے لگے۔ پلک جھپکنے کی دیر تھی کہ جامنی کا خنجر اُٹھے اور اُن میں سے کسی ایک کے سینے میں پیوست ہو۔ خنجر اُس نے اُٹھا بھی لیا تھا مگر کچھ سوچ کے رُک گئی۔ بولی: "ابھی تم اپنا فیصلہ خود کرو۔" تینوں آدمی چند لمحے گم اُس کا چہرہ تکا کیے پھر ایک دم تیزی سے آگے بڑھے اور کتوں کی طرح پیرو کے قدموں سے لپٹ گئے۔

پیرو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے: "ٹھیک ہے جامنی۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولا: "اپن اب جاتا ہے۔" پیرو نے کہنے کو تو کہا مگر اُس کا جی وہاں سے جانے کو نہیں چاہتا تھا۔

"بیٹھو دادا! کوئی اور کام ہو تو بولو؟"

"اپن کو اتنا ہی کام تھا۔" پیرو نے مدھم لہجے میں کہا۔

"ابھی اپن اِن کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔ اپن کا نیم رہ گیا ہے۔" جامنی بائی سرد آواز میں بولی۔

"ابھی اتنا ٹھیک ہے جامنی بائی!"

پیرو کہہ رہا تھا کہ اُس نے اپنے سب آدمیوں کو باہر جانے کا حکم دیا۔ صرف وہ لوگ پیرو اُس بڑے کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ پیرو اُس کے قریب ایک مونڈھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ لوگوں کے جانے کے بعد وہ تادیر کچھ نہیں بولی۔ پیرو بھی خاموش رہا مگر اُسے خاموشی سے جلد ہی اکتاہٹ سی ہونے لگی۔ اُس کا جی چاہا جامنی بائی سے اُس کے بارے میں کچھ پوچھے۔ بے شمار سوال اُس کے دماغ میں اُٹھ رہے تھے لیکن پیرو زبان بند کیے رہا۔ جامنی نے پہل کی اور اُس سے ماہم کے علاقے کے متعلق پوچھنے لگی۔ پیرو کو شبہ ہوا کہ کہیں جامنی کی نظر اُس کے علاقے پر تو نہیں ہے مگر اُس نے کسی جھجک کے بغیر جواب دیا: "علاقہ چھوٹا پر بھلا ہے۔" پھر اُس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا: "کبھی اُودر اپنی طرف آؤ جامنی بائی!"

"تم بولتے ہو تو ضرور آئیں گے دادا!" وہ شگفتگی سے بولی۔

پیرو اُس سے کچھ اور نہیں کہہ سکا۔ وہ یہاں پہلی بار آیا تھا۔ نہ جانے جامنی بائی کیا سمجھتی اور خود اُسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ علاقے کا دادا ہو کے اُس پر اپنا تجسس ظاہر کرے چنانچہ اُس نے اختصار برتا اور رسمی طور پر جامنی بائی کا شکریہ ادا کر کے چلا آیا۔

پیرو بتا رہا تھا کہ وہ وہاں سے چلا آیا لیکن اپنے پاڑے آنے کے بعد اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے جامنی بائی کی آنکھیں اُس کے ساتھ آ گئی ہیں اور اُسے گھور رہی ہیں۔ ابھی ایک رات نہیں گزری تھی کہ صبح اُسے اطلاع ملی۔ جامنی بائی کے پاڑے کے قریب کوڑے کے ڈھیر پر تین آدمیوں کی لاشیں پڑی ملی ہیں، پولیس نے جامنی بائی اور اُس کے پاڑے کے کئی آدمیوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ پیرو کو اس خبر سے دُکھ ہوا۔ یقیناً یہ وہی تین آدمی ہوں گے جن کے بارے میں کل شام جامنی بائی نے کہا تھا کہ ابھی اُس کا فیصلہ باقی ہے۔ پیرو دن بھر بے چین رہا۔ وہ تیار تھا کہ پولیس اُسے بھی بلائے گی۔ پولیس کا کوئی آدمی اُسے بُلانے نہیں آیا اور دوسرے دن [illegible]

[illegible] ملی کہ جامنی بائی اپنے ساتھیوں سمیت تھانے سے پاڑے [illegible] آ گئی ہے۔ اُس کے تین دن بعد سرِ شام وہ پاڑے میں بیٹھا [illegible] کہ ایک آدمی نے آ کے اطلاع دی: "دادر کا جامنی بائی [illegible] پاڑے کی طرف آ رہا ہے۔"

پیرو بہت حیران ہوا، خود دوڑا ہوا پاڑے کے باہر گیا۔ [illegible] بائی تنہا دروازے پر موجود تھی: "دادا! اپن آ گئے۔" اُس نے [illegible] سے کہا۔

"تم؟ جامنی بائی!" پیرو وحشت سے بولا: "آؤ، آؤ، اندر آؤ۔ [illegible] اپن کوئی سپنا دیکھتا ہے کہ ایدر کھوپڑی کا کوئی کل اُلٹ [illegible] سا ہے۔"

جامنی بائی کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ سی کھِلی۔ وہ پیرو کے پیچھے اندر آنے لگی۔ پاڑے کے تمام لوگ اُسے دیکھ کے حیرت [illegible] اور اُس کی آمد کا مقصد جاننے کے لیے بے تاب [illegible] لیے جامنی بائی کے بارے میں کبھی نہیں سُنا گیا تھا کہ وہ کسی [illegible] میں خود آئی ہو۔ وہ کہیں آتی جاتی نہیں تھی۔ پیرو اُسے ایک [illegible] اور صاف کمرے میں لے آیا اور پوچھا کہ وہ اُس کی کیا خاطر [illegible]۔ جامنی بائی نے کہا کہ اُسے بھیڑ بھڑکا پسند نہیں ہے۔ پیرو نے [illegible] آدمیوں کو باہر نکال دیا: "تم نے بولا تھا، اپن اِدھر آ گئے۔" [illegible] سے دھیمے بولی۔

"تم نے ایدر آ کے اپن کو بہت، بہت خوش کیا۔" پیرو کو مناسب [illegible] نہیں مل رہے تھے: "ابھی بولو، اپن کیا... کیا کرے؟"

"بیٹھے رہو دادا!"

"بیٹھا تو اپن ایدر ہی ہے۔ پر اپنے کو..."

جامنی نے نظریں اُٹھا کے دیکھا تو پیرو بوکھلا گیا: "اپن [illegible] تم سے ملنے، تم کو دیکھنے آیا ہے۔" وہ ڈوبتی آواز میں بولی۔

"ہو، ہو۔" پیرو پہلو بدلنے لگا: "اپن تمھارے سامنے ہے۔"

"تم ایدر دادا کیسے ہو گئے؟"

"کیوں، کیوں۔" پیرو کا خون بھڑکنے لگا: "تمھارا مطلب؟ [illegible] یہ سب باپ مرتے ٹیم نہیں لکھ گیا تھا جامنی بائی!"

"جانتے ہیں دادا!"

"پھر تم، تم کیا بولنا چاہتا ہے؟"

"کچھ نہیں دادا!" وہ کسی قدر اُداسی سے بولی۔

"نہیں، تم کچھ بولنا چاہتا ہے؟" پیرو نے تندی سے کہا۔ اُس نے اپنی نظریں جھکا لیں اور بیٹھی جیسے کچھ سوچتی رہی۔ [illegible] نے بھی بات وہیں چھوڑ دی لیکن اُس کا اضطراب سوا ہو [illegible] تھا۔ اُسے کچھ بولنے میں اس لیے دشواری پیش آ رہی تھی کہ ابھی تک وہ جامنی بائی کی اچانک آمد کا سبب طے نہیں کر سکا تھا۔ دادر سے چلتے وقت اُس نے رسماً جامنی بائی سے آنے کو کہا اور اُس کا خیال تھا کہ رسماً ہی جامنی بائی نے حامی بھری تھی مگر اب وہ سامنے بیٹھی تھی اور اُس کے بدن سے اُٹھتی ہوئی بھینی بھینی اُبٹن جیسی خوشبو کمرے میں چھا گئی تھی۔ پیرو کا تذبذب بے جا نہیں تھا۔ اُسے اُس کے آنے سے ایک خوشی تھی تو کئی اندیشے بھی لاحق تھے۔ ممکن ہے اُس کا کوئی اور ارادہ ہو اور پیرو کو اپنی مروت کے اظہار پہ بعد میں پشیمانی ہو۔ وہ خواہ مخواہ جامنی بائی سے کوئی کد نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس چھیڑ کا کوئی جواز ہوتا تو ٹھیک تھا۔ بمبئی میں بہت سے علاقے تھے جہاں جامنی بائی کی طرح دادا پاڑا چلاتے تھے اور بے دلیل ایک دوسرے کے معاملے میں دخل دینا پسند نہیں کرتے تھے لیکن کوئی دلیل پیدا ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ بدنیتی بھی ایک دلیل ہے اور وہ کسی وقت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ چاقو اور زور بھی ایک دلیل ہے۔ پاڑوں میں یہی ایک دلیل چلتی ہے۔ پیرو کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ جامنی بائی کو ایک مہمان سے مختلف درجہ دے اور اُس کی خوشنودی کے لیے اپنی طبیعت کے خلاف کوئی بات کرے اور جامنی بائی پر کوئی ایسا تاثر قائم ہو جیسے وہ کسی دفاعی حالت میں ہے۔ اپنے بارے میں وہ جامنی بائی کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات سننے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ جامنی بائی کے بجائے کوئی اور دادا آتا تو پیرو کو اتنی اُلجھن پیش نہ آتی مگر وہ جامنی بائی تھی۔ پیرو کو خود اپنی جانب سے خدشہ تھا۔ اپنے خون کی گرمی سے، اور اُسے یہ گرمی عزیز بھی بہت تھی۔ وہ جامنی بائی کا ارادہ سونگھنے کی جستجو میں تھا اور جامنی بائی تھی کہ آ کے گم صم سی بیٹھ گئی تھی۔

پیرو موضوع بدل کے اُس سے پوچھے بنا اپنے علاقے کے بارے میں بتانے لگا۔ اُسے کچھ جاننا تھا تو اِس کی یہی ایک صورت سمجھ میں آتی تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ اُس کا علاقہ کتنا زرخیز ہے۔ یہاں کے لوگ، مکانات، کاروبار، گلیاں، یہاں کتنی بھٹیاں، کارخانے اور چھپے ہوئے گودام ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ کوئی دادا کسی دوسرے دادا کو اپنے علاقے سے متعلق ایسی باتیں نہیں بتایا کرتا جو پیرو نے اُس سے کہی تھیں۔ پیرو نے اُس سے کچھ نہیں چھپایا، نہ مبالغہ کیا۔ وہ اپنی کشمکش سے جلد از جلد نجات حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس دوران وہ پوری طرح کسی بھی بدلی ہوئی صورتِ حال کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے۔ کوئی ایسی مغایت نہیں جس میں شبکی کا کوئی پہلو نکلتا، پیرو کو اپنے اس عزم سے طمانیت محسوس ہوئی۔ وہ پیرو تھا، پیرو کی جگہ کوئی دوسرا دادا ہوتا تو شاید یہ

فیصلہ نہ کر پاتا۔ جامنی بائی اُس کے علاقے کا حال سُنتی رہی، نہ اُس نے اشتیاق کا اظہار کیا، نہ سرد مہری کا، سو پیرو کا تجسس کم نہیں ہوا۔ پھر اُس نے اُن تین آدمیوں کا ذکر چھیڑ دیا جو دو دن پہلے ختم کر دیے گئے تھے۔ پیرو نے کہا کہ وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔

"اُن کو جانے دو دادا!" جامنی بائی بے دلی سے بولی۔

"پر کیا اپن نے اُن کو معاف کر دیا تھا؟"

"اپن نے نہیں۔" جامنی نے زیرِ لب کہا۔ "ابھی اُن کی بات چھوڑو۔ وہ چلے گئے ہیں۔"

"چھوڑ دو۔" پیرو نے جھٹک کے بولا۔

"ابھی اِدھر کی زندگی کی بات کرو۔"

"جو بولے کرے۔" پیرو نے تیزی سے کہا۔

"ابھی تم سدا کے لیے اِدھر باڑے میں رہنا چاہتے ہو؟"

"ابھی اپن کے ہاتھ پاؤں ایک دم ٹھیک ہیں۔"

اُس نے نظر بھر کے پیرو کو دیکھا اور کہنے لگی: "اِدھر تمھارا بہت من لگتا ہے کیا؟"

"لگتا کیا ہے، بس بیٹھا ہے۔"

"تم اس کو بڑھانا چاہتے ہو کیا؟"

"ابھی اپن نے ایسا سوچا نہیں ہے۔" پیرو نے تذبذب سے کہا۔ "پر جامنی بائی! اپن کو بولو، ایسا بولنے سے تم کیا... کیا...؟"

"سوچتے ہیں تم کو دادا نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

پیرو نے برجستگی سے کہا: "تم کو بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"ہاں!" جامنی بائی سر جھکا کے بولی: "پر اپن دادا ہے۔"

"اور اپن بھی۔" پیرو نے اونچی آواز میں کہا۔

جامنی بائی نے منع کیا تھا لیکن پیرو کے آدمی مٹھائیاں، نمکین چیزیں اور چائے وغیرہ لے کے آگئے تھے، پیرو کے کہنے پر اُس نے چند کا جو منہ میں ڈال لیے اور چائے پی لی: "ابھی تم کچھ اور پیسے تو لائے؟" پیرو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"نہیں دادا!" جامنی بائی مخمور لہجے میں بولی۔

"اپن سوچا پہلے تم سے پوچھ لے۔"

چائے پینے کے بعد وہ پھر کسی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ آنکھیں نیم وا کیے۔ پیرو کے پاس اب کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ بھی سوچتا رہا اور جامنی بائی کے چہرے پر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آج بھی وہ گیروا ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ کھلے ہوئے بال اُس نے ایک ربن سے باندھ رکھے تھے۔ کانوں میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ ناک میں سنہری لونگ چمک رہی تھی۔ جامنی رنگ پر اُس کی چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ پیرو کہتا تھا کہ جب وہ بات کرنے کے لیے اپنے لبوں کو جنبش دیتی تو اُس کے سفید دانت موتیوں کے مانند لگتے۔ موتی جو پیازی رنگ کی مخمل میں ٹکے ہوں۔ اندر سے اُس کے ہونٹ، اُس کا منہ پیازی رنگ کا تھا، باہر سارا جامنی۔ یکایک جامنی بائی کچھ بے چین سی ہو گئی اور اُٹھتے

"چلتے ہیں دادا!"

"یہ کیا — کیا؟" پیرو تعجب سے بولا: "اپن اس کو کیا سمجھے۔ تم نے بولا تھا تو اپن..."

"پر اتنے ٹیم کے لیے نئیں۔ تم کو آئے دیر کتنا ہوا ہے۔ چلنے کو بولتا ہے۔" پیرو اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"پھر کبھی آئیں گے۔"

"وہ ٹھیک ہے۔ سو بار آؤ، ہزار بار آؤ، پر ابھی کیوں جا... ہے۔ یوں چلا جائے گا تو اپن سمجھے گا، اپنے سے مہمان کا خیال نئیں ہوا۔ اپن جنگلی ہے۔"

"نہیں پیرو دادا!" وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔

"پھر کیا ہے، بیٹھو۔ ابھی اپن بیٹھنے کو بولتا ہے جیسا اِدھر آ... کو بولتا تھا۔" پیرو نے کہا کہ وہ تو کچھ بولی ہی نہیں، وہی سر ہے... الاپتا رہا ہے۔

جامنی کچھ دیر کے لیے اور بیٹھ گئی اور اس اثنا میں اُ... نے پیرو سے آس پاس کے علاقوں کے بارے میں چند باتیں پو... کون سا علاقہ کس دادا کے پاس ہے، کیسا ہے۔ پیرو کو ان ... پر حیرت ہوئی جیسے جامنی کو کچھ معلوم نہیں تھا لیکن وہ اُسے بتا... رہا اور اُس نے ان باڑوں سے اپنے تعلقات پر کسی قسم کا تبـ... کرنے سے گریز کیا۔

وہ جانے لگی تو پیرو اُسے دروازے تک چھوڑنے آیا... نے ایک آدمی سے کہہ کے اُس کے لیے وکٹوریا منگوائی تھی۔ وکـ... میں سوار ہوتے ہوئے جامنی کے ہونٹوں پر لرزش تھی۔ اُس نے پیرو سے پھر کسی دن اپنے باڑے آنے کو کہا۔ پیرو نے وعدہ ک... جامنی بائی کے جاتے ہی پیرو کے آدمیوں نے اُسے گھیر لیا اور جا... بائی کے آنے کا سبب پوچھنے لگے۔ پیرو کو خود کچھ پتہ ہوتا تو و... انھیں بتاتا: "سب ٹھیک ہے بابا!" ظاہر ہے، پیرو کے اتنا... کہہ دینے سے وہ مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔

چار دن بعد کی بات ہے کہ پیرو کے باڑے میں ایک اجنـ... شخص مٹھائی اور پھلوں کی دو ٹوکریاں لے کے آیا اور اُس نے ... میں انھیں صرف پیرو کے حوالے کیا۔ شکل و صورت سے وہ کسـ... باڑے سے متعلق آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ٹوکریاں جامنی بائی... بھیجی تھیں۔ پیرو نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور تیسرے روز اپنی طرف سے...

پھلوں، پھولوں اور مٹھائیوں پر مشتمل چار ٹوکریاں جامنی بائی کو بھیجیں، اُس نے بھی اپنے باڑے کے بجائے باہر کا ایک آدمی منتخب کیا۔ باڑے میں کسی کو علم نہیں ہو سکا کہ جامنی بائی کی طرف سے کوئی سوغات آئی ہے اور پیرو نے بھی جواباً اُسے ٹوکریاں بھیجی ہیں۔ جامنی بائی نے انھیں شکریے کے ساتھ قبول کیا اور کہلوایا کہ ہفتے کی شام اپنے باڑے میں وہ پیرو کی منتظر رہے گی۔ بیچ کے دو دن پیرو کے لیے نہایت اضطراب کے تھے۔ جامنی بائی کے پاس دوبارہ جانے کے خیال سے اُس کے دل و دماغ میں عجب عجب احساس جنم لے رہے تھے۔ اِس دوران وہ کھا کے بناتا، بگاڑتا رہا اور جب ہفتہ آیا، سورج ڈوبنے لگا تو اُس نے داور کے علاقے کا رُخ کیا۔ وہ اپنے ساتھ کسی آدمی کو نہیں لے گیا تھا۔ جس وقت وہ جامنی بائی کے باڑے میں داخل ہوا، وہ نیلی ساڑی پہنے، ہونٹوں پر ایک ہلکی مسکراہٹ لیے اپنے مخصوص انداز میں دروازے پر کھڑی تھی۔ اُس کی چمکتی نظروں نے پیرو کا طواف کیا اور وہ اسے فوراً اندر لے گئی۔ سیاڑے میں کوئی اور شخص نہیں تھا۔ البتہ اُوپری منزل پر جامنی بائی کی دو خادمائیں موجود تھیں۔ پیرو ایک صاف ستھرے سجے ہوئے کمرے میں آکے بیٹھ گیا۔ کمرے کی دیواریں رنگین تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر ریشمی پردے لٹکے ہوئے تھے۔ کمرے کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی چاندنی کے وسط میں دیوار کے ساتھ ایک مختصر قالین نما دری بچھی ہوئی تھی اور ایک چھوٹی میز پر صراحی اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ جامنی بائی نے خود اُسے جام بنا کے دیا، اسی وقت گندمیں رنگ اور بوٹے قد کی ایک خوب صورت لڑکی زرق برق کپڑے پہنے، گھنگرو چھنکاتی اندر آئی اور اُس کے آتے ہی ہارمونیم اور ستار کی آواز گونجنے لگی۔ سازندے کمرے ہی میں کہیں تھے، نظر نہیں آرہے تھے لیکن جلد ہی پیرو کو پتہ چل گیا کہ وہ سامنے لٹکے ہوئے دبیز نیلے پردے کے پیچھے موجود ہیں۔ لڑکی نے دونوں کو جھک کے سلام کیا اور رقص کرنے لگی۔ پیرو کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سو رہا ہے اور کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ جامنی بائی ایک دوسرے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اُس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اُسے اس طرح بیٹھا دیکھ کے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی باڑے سے متعلق ہے اور چاقو اُٹھانا جانتی ہے۔ وہ بس ایک عورت تھی، ایک لڑکی۔ پیرو نے چاہا کہ وہ اُس کے اور قریب ہو جائے، بہت قریب ہو جائے لیکن وہ خود اپنی جگہ سے نہ ہٹ سکا، نہ جامنی کی طرف ہاتھ بڑھا سکا، نہ اُس سے اپنی خواہش کا اظہار کر سکا۔ جامنی بائی کی طرف نظریں اُٹھاتے ہی اُس کا ارادہ متزلزل ہو جاتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا: "وہ ایک دم رانی لگتا تھا۔ اپن سالا رانی سے کیسے بول سکتا تھا۔"

جامو نے درمیان میں دخل دے کے پوچھا: "دادا! اور تم؟ تم بھی بولو، تم اُس وقت کیسے لگ رہے تھے؟"

پیرو نے آہ بھر کے کہا: "اپن کیا جانے، پر ٹھیک ٹھاک ہی ہوگا۔"

پیرو نے اپنے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ وہ خود کیسا معلوم ہو رہا تھا۔ اب بھی اُس کا سرخ و سفید رنگ اُس کے گالوں پر دمکتا تھا۔ اُس کے گھنگریالے بالوں پر ابھی تک سیاہی غالب تھی۔ لگ بھگ بیس سال پہلے کی بات تھی، اُس وقت پیرو کا کیا حال ہوگا۔ قد کا بڑا، کاٹھی کا مضبوط، خط و خال کا تیکھا۔ بڑی آنکھیں، کھلی پیشانی، چوڑے شانے اور اُبھرا ہوا سینہ۔ وہ بھی کوئی شہزادہ معلوم ہو رہا تھا۔ کسی راج کمار سے کیا کم۔ جامنی بائی اپنی جگہ بیٹھی رہی اور پیرو کن انکھیوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے حواس میں ایک دھیما دھیما سرور رچ رہا تھا اور وہ یہ سرور توڑنے کے لیے اپنے آپ سے مزاحمت کر رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جامنی بائی کے سامنے مدہوش ہو جائے۔ لڑکی ناچتی رہی۔ جامنی بائی نے ناچ کے دوران اُسے دوسرا جام بنا کے دیا۔ پیرو نے منع نہیں کیا، وہ چسکیاں لیتا رقص دیکھتا رہا مگر اُس کا دھیان رقص میں نہیں تھا۔ وہ مسلسل جامنی بائی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ لڑکی نے ناچ کے دو تین بھاؤ بتائے ہوں گے کہ جامنی نے انگلی کے اشارے سے اُسے روک دیا اور پیرو سے پوچھا کہ کیا رقص جاری رکھا جائے؟ پیرو نے یوں ہی سر ہلا کے انکار کر دیا۔ اِس میں اُس کے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ پھر خادماؤں نے کھانا لگا دیا۔ کھانوں کی اقسام کم تھیں مگر وہ سب نفاست سے چنے ہوئے تھے اور نہایت لذیذ تھے۔ جامنی بائی اِس قدر تکلف سے کھا رہی تھی کہ پیرو کو کہنا پڑا: "ابھی تم تو کچھ کھاتا ہی نہیں۔ شاید ابھی تم سے اپن ہی بولے گیا۔"

"کھا رہے ہیں دادا!" وہ متبسم لہجے میں بولی۔

کھانے کے بعد جامنی بائی نے پھر اُس سے پوچھا کہ کب دوبارہ ناچ کا اہتمام کیا جائے۔ پیرو اس سے بات کرنا چاہتا تھا سو اُس نے کہا: "ابھی تمھارا مرضی ہو تو چلے گا۔"

جامنی بائی نے لڑکی کو نہیں بلایا اور اپنے لب جیسے سی کے بیٹھ گئی۔ پھر وہی خاموشی۔ پیرو کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا کہ وہ کیا کہے، کیا کرے۔ کیا یوں ہی بیٹھا کبھی دیواریں، کبھی جامنی بائی کو گھورتا رہے۔ سکوت کے ایک طویل وقفے کے بعد جامنی کے لبوں میں جنبش ہوئی، اُس کی پلکیں تھرتھرائیں اور اُس کے ہونٹ سکڑنے اور پھیلنے لگے جیسے وہ کسی اذیت میں مبتلا ہو: "دادا!" وہ سرگوشیانہ

لہجے میں بولی: "اپن تم سے کچھ بولنا چاہتے ہیں۔"
"اپن کو حکم دو۔" پیرو نے مچل کے کہا۔
"حکم نہیں ہے۔"
"جو بھی بولو، اپن سننے کے لیے بے کل ہے۔"
"ابھی اپن تم سے سب بولے دیتے ہیں۔" اس کی آواز سہمی ہوئی تھی۔
"ہاں، ہاں۔"
"پتہ نہیں، تم کیا بولو گے، پر اپن کو اس کی چنتا نہیں ہے۔"
"اپن کے من میں تمھارے لیے بہت جگہ ہے۔"
"اپن نے سوچا، تم سے سب کہہ دیں، کچھ نہ چھپائیں، جو کچھ اپنے پاس ہے، ابھی بول دیں، نہ تم روز ادھر آسکتے ہو، نہ اپن اُدھر جا سکتے ہیں۔"
"تم بولو گی تو اپن روز ایدر آئے گا۔"
"اپن کو بھی اُدھر آنے کے لیے کسی سے بولنے کی ضرورت نہیں ہے پر ایسا ٹھیک نہیں ہے۔" وہ آہستہ آہستہ بولی۔
"پھر جو ٹھیک ہے وہ بولو۔" پیرو نے بے تابی سے کہا۔
وہ چند لمحے چپ رہی پھر رُکی رُکی آواز میں بولی: "اپن سدا کے لیے تم کو اپنا اور اپنے کو تمھارا بنانا چاہتے ہیں۔"
پیرو کے کان سن ہو گئے: "جامنی بائی!"
جامنی بائی نے سر جھکا لیا: "اپن کو لاگ لپیٹ نہیں آتی، صاف بول دیے ہیں پر اس کو کچھ اور مت سمجھنا۔ اپن کی ایسی مرضی ہے۔"
"جامنی بائی!" پیرو کی سسکی نکل گئی۔
"تم کو بہت حیرت ہے کیا؟" وہ بولی۔
"نئیں، نئیں۔"
"کیا اپن کے لیے ایسا بولنا ٹھیک نہیں ہے؟"
"کیوں نئیں، کیوں نئیں۔" پیرو نے بدحواسی سے کہا۔
پیرو کا سارا جسم گنگ ہو گیا تھا۔ جو کچھ اس نے سنا تھا، اس کی بازگشت اس کے رگ و پے میں سن سنا رہی تھی۔ اس کے باوجود اسے اپنا سنا ہوا ایک سراب معلوم ہو رہا تھا۔ جامنی بائی کے اظہار میں کوئی بات صراحت طلب نہیں تھی۔ اس نے جو کہا تھا، اس میں کوئی تہ نہاں، کوئی رمز، کوئی آمیزش نہیں تھی۔ اسے صاف سنا، صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ وہ دن کی طرح اُجلا، رات کی طرح سیاہ تھا۔ پیرو کو ایسا محسوس ہوا جیسے جامنی بائی نے اسے اٹھا کے آگ میں پھینک دیا ہے۔ اس کے مساموں سے پسینہ رس رہا تھا۔ جامنی بائی نے ایک اضطراری نظر سے اسے دیکھا اور کہنے لگی کہ اسے احساس ہے، ایسا کتنا کتنا بڑا ہے، جو کہہ دیا اس کا لوٹانا کتنا مشکل ہے

لیکن اس نے سوچنے سمجھنے کے چند لمحوں کا عذاب بھگتا
سود و زیاں کے چند لمحوں کا گناہ بھی کیا ہے۔ اسے معلوم ہے
کا کہا ہوا ہے، اس کا سنا ہوا نہیں چنانچہ اس کا فیصلہ پیرو کے
انکار سے مشروط نہیں ہے۔ پیرو کو اختیار ہے کہ وہ اسے ت
یارد کر دے۔ اس کا نہ کوئی دعوا ہے، نہ حکم۔ اسے بے شک
میں خوشی ہوگی تو انکار میں دکھ مگر جو کچھ اسے ملے گا، وہ اُ
قسمت کا لکھا تصور کرے گی۔ اس نے پیرو کو اپنا دیوتا تسلی
ہے اور دیوتا کی مرضی اس کی داسی کے لیے ہر حال میں مق
ہوتی ہے۔ جامنی بائی کہنے لگی کہ زندگی میں پہلی بار اس نے
سے کچھ کہا ہے اور اس کی التجا ہے کہ پیرو اسے پاڑے
دادا کی فرمائش سمجھ کے قبول نہ کرے۔ اس نے اپنا سب
دیوتا کے حوالے کر دیا ہے اور یہ کوئی بھینٹ نہیں جس کے
دیوتا سے اس کی خوشنودی کا سودا کیا جائے۔ پیرو چاہے گا
ابھی پاڑا چھوڑ دے گی۔ پیرو کہے گا تو وہ یہیں رہے گی۔ پیر
جھونپڑی میں لے جائے یا کسی محل میں، سینے سے لگائے یا
سے پاش پاش کر دے لیکن اگر اسے اپنی آرزو کے اظہار کی
دی گئی تو وہ اپنے دیوتا کے ساتھ کہیں دور جانا پسند کرے
پیرو سکتے کی سی حالت میں سنتا رہا۔ اس کے
سب بہت خواب ناک، بہت عجیب تھا۔ اس دن جامنی
کے اپنے پاڑے میں آنے کے بعد سے اس نے بہت سے
بنائے تھے، ان میں ایسا کوئی خاکہ نہیں تھا۔ پیرو کی عمر زیاد
تھی۔ اس مختصر زندگی میں اس پر بہت سے وقت گزرے
وہ کسی ایسے وقت سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ اس نے زندگ
بہت سے سوالوں کے جواب دیے تھے، یہ سب سے مختلف سوا
"جامنی بائی!" اس نے بمشکل اپنے حواس بجا کیے
آواز میں بولا: "بس کرو، ابھی اپن تم کو کیا بولے۔"
"اپن نے کسی جواب کے لیے تم کو نہیں بولا ہے۔"
"جامنی بائی!" پیرو نے جھپٹ کے اسے اپنی با
میں بھینچ لیا۔ پیرو کہتا تھا کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے
تھیں لیکن وہ سب کہیں رکے ہوئے تھے جن کا علم پیرو
تھا۔ اس رات اس کی آنکھیں پھٹ پڑیں، اس کا سارا ج
گیا۔ جامنی بائی بھی سسک رہی تھی۔ وہ اسے کوئی جواب
دے سکتا تھا، کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ جامنی بائی نے بہت
کر دی تھی۔ پیرو کا دماغ ایک اور شخص کے خیال سے لبر
بھی کسی شہزادی سے کم نہیں تھی۔ اس کے سینے میں بھی دل

ں دھڑکتے تھے۔ پیرو لمحے گن رہا تھا کہ وہ کب آتی ہے۔ پیرو
اس سے کہا تھا کہ وہ آخری سانسوں تک اس کی راہ تکتا رہے گا۔
ڑکی کے گھر والے عزت شان کے لوگ تھے اور وہ اپنی نازک
بیٹی کے لیے کسی ریاست سے آنے والے ایک راج کمار
واب دیکھ رہے تھے۔ درمیان میں پیرو نے اس راج کمار کی جگہ
ل مگر پیرو کے پاس کوئی ریاست نہیں تھی، نہ اس کا کوئی شجرہ
نہ امتیاز، نہ پس منظر، نہ پیش منظر۔ ممبئی کے تھانوں میں اس
سرِ فہرست تھا۔ وہ کئی بار جیل جا چکا تھا، اس کا ہنر صرف
تھا۔ لڑکی والوں نے اسے مسترد کر دیا لیکن لڑکی نے نہیں۔
پنے گھر والوں کو آمادہ کر رہی تھی اور اس نے پیرو سے کہا تھا کہ
وہ انھیں منانے میں ناکام ہو گئی تو ایک دن سب کو چھوڑ کے
کے پاس چلی آئے گی اور وہ ایسی ہی تھی۔ پیرو کو یقین تھا کہ
بدل جائے گی، وہ نہیں بدلے گی۔ اسے ایک دن آنا ہے کیسی بھی لمحے
ساری زنجیریں، سارے بندھن توڑ کے اپنی منزل، اپنے مرکز پر آجائے
پیرو کی ذات میں جذب ہونے اور پیرو کو اپنی ذات میں جذب
نے۔ پیرو اس دن کا بے قراری سے منتظر تھا۔ اس نے جامنی بائی سے
میں چھپایا سب کچھ کہہ دیا۔ جامنی بائی کی آنکھوں کے سمندر میں
ٹانے کے لیے تلاطم سا برپا ہوا مگر دوسرے ہی لمحے اس میں ایک
راؤ آگیا۔ پیرو کو اس تلاطم سے اتنی وحشت نہیں ہوئی جتنی اس
سکون سے۔ جامنی بائی سر جھکائے خاموش رہی۔
رات گئے پیرو دادر کے پاڑے سے واپس آرہا تھا تو اس
پیر لڑکھڑا رہے تھے۔ اس کا سارا جسم جل رہا تھا اور سر خالی خالی
اسی عالم میں کئی دن گزر گئے۔ پیرو جامنی بائی کے پاس نہیں گیا مگر
نی بائی ہر لمحے اس کے سامنے ہی رہی۔ پھر ایک دن شام کو بے ارادہ
ا کے قدم دادر کے پاڑے کی طرف اٹھ گئے۔ جامنی بائی کے کان
اس کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ پیرو کو دیکھتے ہی اس کا سراپا
گیا اور اس نے والہانہ نظروں سے اس کا استقبال کیا لیکن اس کے
نٹوں پر سکوت کی مہر لگی رہی۔ پیرو اس کے بعد بھی کئی بار اس کے
ے میں گیا۔ جامنی بائی کی ڈبڈباتی نظریں اس کا سینہ کاٹتی تھیں۔
وہاں بیٹھا رہتا تھا۔ چپ چاپ، گم صم اور چلا آتا تھا۔ جامنی بائی کبھی
اس کے سامنے بیٹھی، کبھی اس کے پہلو میں سمٹی، جام بنا کے دیتی رہتی اور
انھیں حلق میں انڈیلتا رہتا۔ جب جام زیادہ ہو جاتے تو جامنی بائی
ہاتھ روک لیتی۔ گو پیرو اپنے پاڑے میں کسی کو اطلاع دے کے نہیں
جاتا تھا مگر جامنی بائی کے ہاں اس کے آنے جانے کی خبر روپوش
نہیں رہی۔ لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ وہ ان سے بے نیاز جامنی

بائی کے ہاں جاتا رہا۔ اس کے پاس اس سے کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا تب بھی وہ جاتا رہا۔ اس کے پاڑے کے ساتھی اسے متوحش نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ پیرو اب ان سے نہ علاقے کا حال پوچھتا تھا، نہ آمدنی کا حساب لیتا تھا۔ دن بھر یا تو وہ پاڑے کے کسی کمرے میں پڑا رہتا یا پھر کہیں نکل جاتا۔ اس نے پاڑے میں چاقو وغیرہ کی مشق کرانا اور زور کرنا چھوڑ دیا تھا اور سویرے ورزش کرنے کا معمول بھی بھول گیا تھا۔
پیرو کے جسم میں، اس کے قبول، دھواں سا بھرتا گیا۔ اتنا دھواں کہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا، آخر ایک روز اس نے اس لڑکی کو جامنی بائی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ جامنی نے اس سے کیا کہا ہے، اس نے اس سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ اسے امید تھی کہ وہ لڑکی کیا کہے گی کیونکہ اس کا دل پھول کی طرح نرم، شبنم کی طرح شفاف تھا۔ وہ پیرو کی مسیحا تھی، اس کا مداوا تھی۔ پیرو جب اپنا احوال کہہ کے اس کے پاس سے اٹھا تو اپنے آپ کو بے وزن محسوس کر رہا تھا لیکن وہ تقریباً ایک ہفتے تک جامنی بائی کے پاس نہیں گیا۔ ایک ہفتے بعد جب اس نے دادر کے پاڑے جانے کا فیصلہ کیا تو اس کا خون تیزی سے گردش کر رہا تھا مگر وہ اس کے عزم کی گردش تھی۔ سات دن بعد جامنی بائی نے پیرو کو دروازے پر دیکھا تو اپنے قابو میں نہ رہ سکی، اس کے بازوؤں میں چھپ کے بکھر سی گئی۔ وہ بہت کمزور نظر آرہی تھی: "ابھی اپن آگیا ہے۔" پیرو ہانپتے ہوئے بولا۔
"اتنے دن تم کدھر تھے دادا؟"
"اپن اپنے آپ کو بنا رہا تھا۔" جامنی بائی کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ اس کی سمجھ میں پیرو کی بات نہیں آئی تھی۔ پیرو نے اس کے کان میں چپکے سے کہا: "ابھی اپن تم کو ایدر سے لے جانا مانگتا ہے جامنی بائی!"
"دادا!" وہ تڑپ کے بولی: "تم کیا بولتے ہو؟"
"ہاں جامنی بائی! اپن نے بات کر لیا ہے۔"
"کس سے؟"
"اپنے آپ سے اور ابھی اس سے جس کا اپن نے بولا تھا۔ اس نے اپن سے بولا۔ پیرو! جاؤ، جامنی بائی کو لے آؤ۔ اس کو اپن نے ایک دم سب بول دیا تھا، سنتا رہا اور سن کے بولا، دادا جاؤ، جامنی سے بولو، اپن دونوں ساتھ ساتھ رہے گا۔ نہ مانے تو بولو، ہم اس کی نوکرانی بن کے رہے گا یا اس سے الگ رہے گا۔ پھر بھی نہ مانے تو بولو، اپن بالکل الگ ہو جائے گا۔ اپن نے بولا۔ تم نئیں ہوگا تو ایدر اپنا کیا ہوگا۔ بولا، ابھی تم ایدر سے جاؤ، جامنی بائی ایسا نئیں کرے گا، اپن کو یقین ہے۔"

جامنی بائی کی مبہوت آنکھیں اُس پر مرکوز رہیں۔

"تم نے سُنا جامنی بائی، اپن کیا بولتا ہے؟"

"سُن لیا دادا!" وہ نڈھال ہو کے بولی۔

"بس ابھی تم تیار ہو جاؤ، چاقو اُٹھاؤ۔"

"چاقو!" وہ اچنبھے سے بولی۔

"ہاں جامنی بائی! چاقو۔"

"چاقو کیوں دادا؟"

"ابھی اپن جانتا ہے کہ ایدر ویدر پاڑے کے داداؤں نے تم کو لے جانے کا کوشش کیا تھا اور تم نے بولا تھا، اپن کے ہاتھ سے کوئی چاقو گرا دے تو اپن پھر ایک پل نہیں ٹھہرے گا، اُسی کے ساتھ چلا جائے گا۔ ایسا بولا تھا نا؟"

"ہاں، پر تم سے نہیں بولے تھے۔"

"اپنے سے نہیں بولا، ٹھیک ہے پر اپن کو پتہ ہے اور اپن بھی ایک دادا ہے۔ اپن ابھی تمھاری بات پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔ تم کو چاقو کے بل پر لے جائے گا اور اپن کے چاقو میں بل نہیں تو سالا تم سے دُور ہو جائے گا، اپنا منہ سدا کو نہیں دکھائے گا۔"

"نہیں دادا! اپن تم سے نہیں لڑ سکتا۔"

"کیوں نہیں لڑ سکتا؟" پیرو تلخی سے بولا۔ "اپنے کو بھیک نہیں چلتا۔" اُس نے تیز و تند لہجے میں جامنی سے کہا کہ اگر وہ چاقو نہیں اُٹھائے گی تو اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس نے پیرو کے ساتھ رعایت کی ہے، بخشش کی ہے۔ پیرو ہمیشہ اس میں اپنی سُبکی محسوس کرتا رہے گا۔ زندگی بھر اُسے خلش رہے گی کہ جامنی بائی نے اُسے کسی سبب سے درگزر کیا ہے۔ وہ اپنے آپ سے نگاہ ملا کے رہنا چاہتا ہے، نگاہ چرا کے نہیں۔ اس کانٹے کے ساتھ نہیں کہ بمبئی کے ایک پاڑے کے دادا کی حیثیت سے وہ جامنی بائی کا اہل نہیں تھا۔ کوئی شک نہیں کہ جامنی نے پیرو کو ایک دادا کی صورت میں نہیں دیکھا تھا اور اُس نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ پیرو اُسے بھی ایک پاڑے کی دادا نہ سمجھے لیکن اپنی ذات کے سکون، آیندہ دنوں میں جامنی بائی کی نظروں میں اپنی سرخوشی کے لیے پیرو اُس سے چاقو اُٹھانے کا مطالبہ کر رہا تھا۔

جامنی بائی ششدر کھڑی تھی۔ اُس نے شدت سے انکار کر دیا اور بولی کہ یہ پیرو کا ہذیان ہے۔ کیا اُس نے اُس لڑکی سے بھی، جس کی اجازت لے کے وہ جامنی بائی کے پاس آیا ہے، اِسی طرح کا کوئی مطالبہ کیا ہے۔ اگر پیرو نے اُس لڑکی سے کچھ نہیں کہا اور اُسے جوں کا توں قبول کیا ہے تو جامنی بائی کے سلسلے میں اُس کی یہ خواہش کیوں ہے۔

"وہ جامنی بائی نہیں ہے، پاڑے میں نہیں ہے۔" پیرو جھنجلا کے کہا۔ "اُس نے پہلے کسی کو ایسا نہیں بولا۔ جیسا جامنی بائی نے بولا تھا۔"

"دادا! اپن تم سے نہیں لڑ سکتے۔" جامنی بائی ناتوانی سے [illegible]

پیرو نہیں مانا، کہنے لگا کہ جامنی بائی کے انکار کے معنی کے سوا کچھ نہیں کہ وہ پیرو کی شکست سے ہراساں ہے۔ اُسے [illegible] ہے کہ پیرو اُس پر قابو نہیں پا سکتا۔ پیرو کے لیے یہ صورتِ حال عذاب سے کم نہ تھی کہ اُس کے بارے میں ایسا سمجھا جائے۔

"پھر تم سمجھو اپن جو بولے تھے، اُس کو واپس لیتے ہیں [illegible] اُسی چھوکری کے پاس چلے جاؤ۔ اپن کا دھیان چھوڑ دو۔ اپن [illegible] تم کو بھول جائیں گے۔" جامنی بائی شکست خوردہ لہجے میں [illegible]

پیرو نے کہا کہ اس طرح وہ اُس کے شبہے کی تصدیق کر [illegible] ہے۔ وہ پیرو کو رُسوا کرنا نہیں چاہتی مگر پیرو کے لیے اس [illegible] بڑی رُسوائی کوئی نہیں کہ جامنی اُس کے خیال سے چاقو اُٹھا [illegible] سے باز رہے۔ "اپن جانتا ہے تم ایسا کیوں بولتا ہے۔ پھر تم بھی [illegible] کو ابھی پیرو مت جانو، ماہم کے پاڑے کا دادا جانو جو پچھلے [illegible] کی طرح تمھارے پاڑے میں چاقو چھنولنے آیا ہے۔" اُس [illegible] اشتعال میں کہا۔

"ایسا مت بولو۔" جامنی بائی ترشی سے بولی۔

پیرو ضد کرنے لگا۔ وہ ہم سے پوچھ رہا تھا، بتاؤ، [illegible] ایسے کیسے لے جاتا۔ پیرو کے احساسات سمجھنا ہمارے لیے [illegible] نہیں تھا۔ پیرو نے اپنی زبان سے نہیں کہا لیکن اُسے بہت احساس ہوں گے۔ دوسرے پاڑوں کے داداؤں کا اور سب [illegible] زیادہ اپنے آزار کا۔ وہ اُس عورت کو کیسے گھر لے جا سکتا تھا [illegible] پر کلی اختیار کا اُسے اعتماد نہ ہو۔ اگر جامنی بائی پیرو کے بیان [illegible] مطابق اُسی کے خیال سے پہلو تہی کر رہی تھی تو پیرو کے [illegible] ہمیشہ کا تازیانہ تھا۔

جامنی اُس سے التجا کرتی رہی لیکن جتنا وہ التجا کر[تی پیرو] کا اصرار اتنا ہی بڑھتا جاتا اور جب جامنی بائی نے یہ [illegible] کہ اُس کا اکراہ پیرو کے لیے اُلٹا مہمیز کا کام دے رہا ہے تو [illegible] خاموشی اختیار کر لی۔ پیرو کہتا تھا کہ اُس وقت اُس کے چہ[رے پر] گھٹا سی چھائی ہوئی تھی اور اُس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں [illegible] دیر اُس پر سناٹا طاری رہا۔ "ٹھیک ہے دادا!" وہ شکستہ [لہجے میں] بولی۔ "جیسا تم بولتے ہو، ٹھیک ہے۔"

پیرو نے آگے بڑھ کے اُسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ [illegible] بائی!" اُس نے رُندھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ابھی تم سمجھو [illegible] کیوں مانگتا ہے۔"

جامنی بائی کا سراپا اُس کی آغوش میں پھر کتا رہا۔ پیرو نے [illegible] کی۔ اُسے خدشہ تھا، جامنی بائی اپنا ارادہ نہ بدل دے۔ [پا]ڑے کے سارے آدمی کو بلا لو۔" اُس نے جامنی بائی سے کہا۔

"اُن کو کیوں دادا؟" جامنی بائی کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"اپن چاہتا ہے وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپن [اپ]نی تمھاری ماں کی، تمھارے بھگوان کی سوگند دیتا ہے، اگر چاقو میں کوئی چوری کیا، اپن کا دھیان کیا۔ پھر اپن چھاتی [میں] کو آنک لے گا، سمجھا!"

صبح قریب ہی تھی۔ ہمارے اِرد گِرد چکر لگاتے ہوئے پہرے دار لمحے کے لیے بھی نہیں بیٹھے تھے۔ نہ صرف وہ بلکہ اُن سے [ا]لگ بھی۔ اُن میں سے شاید کوئی نہیں سویا تھا۔ فاصلے فاصلے [پر ا]لاؤ جل رہے تھے اور اُن کے اطراف بیٹھے ہوئے منتشر آدمیوں [کے ہتھ]یار اپنے ہاتھوں میں تیار رکھے تھے۔ پیرو سانس لینے کے لیے [رک]ا تھا۔ ہم سب کی نگاہیں اُسی کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ تجسّل بھی اُسی کی جانب تھا۔ ہر شخص دم بخود سا تھا۔ جامنی بائی [کی] شکل و صورت پیرو نے بیان کی تھی، اُسے سُن کے سبھی کے [د]ل اُسے ایک بار دیکھنے کی خواہش جاگی ہوگی، ضرور تجسّل [کے د]ل میں بھی۔ دیر ہو گئی تو جامو نے پیرو کو ٹوکا۔

پیرو نے اپنا بھاری سر ہلایا۔ باتیں کرتے کرتے اُس کا منہ جیسے سُوج [گی]ا، بہکی بہکی آواز میں کہنے لگا کہ تھوڑی دیر میں جامنی بائی کے حکم پر [اُس] کے پاڑے کے سارے آدمی اکٹھے ہو گئے۔ اس دوران وہ [جامنی بائی] اپنے آپ میں گم بیٹھی رہی۔ پیرو اُس کے پاس تخت [کے] دوسرے سرے پر تھا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو وہ تخت [سے اُت]ر آئی۔ پیرو بھی اُس کے پیچھے پیچھے بیچ میں کھلی ہوئی جگہ پہنچ [گیا۔ ج]امنی بائی نے ساڑی کا پلّو کمر سے باندھ لیا اور اپنے بکھرے [ہوئے] بالوں کی لٹوں میں گرہیں لگا دیں، سر کو کئی جھٹکے دیے اور اُلٹا [ہاتھ ا]ُس جانب بڑھا دیا۔ پاڑے کے ایک آدمی نے فوراً چاقو [اُس کی ط]رف اچھالا۔ جامنی بائی نے پھرتی سے اُسے اُچک لیا۔ چاقو [ہاتھ میں] آتے ہی اُس کے سراپا میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ [اُس] نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں چند لمحوں کے لیے بھینچ لیں۔ اُس [کے سی]نے میں جوار بھاٹا سا اُٹھ رہا تھا۔ آنکھیں کھول کے اُس نے [پیرو پر] ایک نظر دیکھا۔ پیرو کو ایسا لگا جیسے اُس کی آنکھوں میں آگ بھڑک رہی ہے۔ "دادا!" اُس نے لرزیدہ آواز میں اُسے مخاطب کیا۔

"جامنی بائی!" پیرو نے وارفتگی سے کہا۔

مگر جامنی اُسے مخاطب کر کے رہ گئی۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹی اور یکا یک اُس کے بدن میں ایک بجلی سی چمکی یا کوئی شعلہ سا لپکا۔ اُس کے پیچھے ہٹتے ہی پیرو نے بھی اپنا چاقو تان لیا۔ چشم زدن میں وہ دونوں آمنے سامنے تھے۔ پیرو کی نظر اُس کے چاقو سے بندھی تھی۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ جامنی بائی کی آنکھیں اُس کے مقابل کو متزلزل کر دیتی ہیں۔ یہ آنکھیں پیرو کے لیے اجنبی نہیں تھیں۔ وہ ان میں جھانکتا رہا تھا لیکن آنکھیں ہی نہیں، جامنی بائی کے سارے بدن سے چنگاریاں اُٹھتی محسوس ہوتی تھیں۔ پیرو کو اپنی توجہ مرکوز کرنے میں کسی قدر مشکل پیش آئی۔ اُسے اس بات کی خوشی تھی کہ جامنی کے ہاں اُس کے لیے رعایت کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے گویا اُس نے اُس کی دی ہوئی قسم کا پاس کیا ہے۔ یہ دیکھ کے پیرو کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون اُبلنے لگا اور اُسے جامنی بائی کے دو تین ہی پینتروں سے اُس کے متعلق سُنی ہوئی روایتیں جھوٹ نظر آئیں۔ وہ نہ کسی جادو کا کرشمہ تھا، نہ اُس کی شرربار آنکھوں کا شعبدہ۔ وہ سب جامنی بائی کے چاقو کا تماشا تھا کہ اُسے چاقو تھامنا آتا تھا۔ پیرو نے بہت سے لوگوں کو چاقو اُٹھاتے، چاقو تولتے دیکھا تھا مگر جامنی بائی کا انداز سب سے جدا تھا۔ وہ اپنے مخالف کو اپنے ممکنہ داؤ کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتی تھی۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر، ایک پل میں اِس بازو، دوسرے پل میں اُس بازو، اس کا بدن ہوا کے مانند تھا، سمندر کی اُٹھتی ہوئی لہر، پھرکی کی طرح۔ پیرو کو ابتدا ہی میں اندازہ ہو گیا کہ درمیان میں سوچنے کا کوئی لمحہ ملنا دشوار ہے سو جامنی بائی کا چاقو منتشر کرنے کی ایک ہی صورت اُس کے ذہن میں آتی تھی کہ وہ خود اُسی کا تیور اختیار کرے۔ اُسے اپنے داؤ کی آہٹ کا احساس نہ ہونے دے جیسا کہ جامنی بائی کا طریقہ تھا۔ جامنی بائی کا یہ طریقہ کوئی حربہ یا ہتھکنڈا نہیں تھا۔ چاقو پر پڑے ہوئے ہاتھ اور جسم کی قابو یافتگی کے اعتماد کے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔ پیرو کی خواہش تھی کہ جو کچھ ہونا ہے، جلد سے جلد ہو جائے، دیر تک آمنے سامنے رہنے کی نوبت نہ آئے۔ وہ شروع ہی سے جامنی بائی کی کلائی پکڑنے کی فکر میں تھا۔ جامنی بائی نے اپنا ہاتھ اُس کے قریب نہیں پھٹکنے دیا اور پیرو پہلے ہی مرحلے میں اِدھر اُدھر سے بڑھ بڑھ کے جھپٹ جھپٹ کے اُسے دفاعی حالت میں لانے کی کوشش میں ناکام رہا۔ ظاہر ہے، پیرو نے اپنے جسم، دماغ

اور چاقو کی تمام صلاحیتیں آزما کے دیکھی ہوں گی۔ وہ بتا رہا تھا کہ جامنی بائی ہر مرتبہ اُس کے نرغے سے پھدک کے نکل جاتی اور آناً فاناً پینترا بدل کے اُس پر جھپٹتی۔ پیرو کسی نہ کسی طرح، کبھی جھک کے، کبھی تیورا کے، کسی طرف لپک کے اور اپنے آپ کو اچانک سمیٹ کے اُس کا وار اکارت کر دیتا اور پھر اُسی کی تدبیر پر عمل کرتا کہ پلک جھپکتے میں چاقو تانے اُس پر اُٹھتا، بڑھتا اور درانہ اُس پر چھانے کی کوشش کرتا۔

جامنی بائی کے لیے پیرو جیسے کسی شخص کا تجربہ نیا ہوگا۔ ہم نے ممبئی اور کلکتے کے پاڑوں میں اُسے اپنے آدمیوں سے بارہا زور آزمائی کرتے دیکھا تھا۔ اب بھی اُس میں ایسی پھرتی تھی تو جوانی کے وقت کیسی ہوگی۔ اب کی نسبت جب ایک ہی فرق ہوگا کہ پیرو کے ہاتھ میں گرمی کے ساتھ دماغ میں گرمی زیادہ ہوگی جو جھل کے نزدیک ایک نامناسب بات تھی۔ اُس نے کئی بار مجھے تاکید کی تھی، لاڈلے، چاقو اُٹھاتے ہوئے سر الگ رکھنے کی کوشش کرنا۔ خون کی گرمی کے اثر سے سر دُور ہی رکھنا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں کہ آدمی اپنے جسم کی کھولتی ہوئی گرمی گردن سے اُوپر نہ بڑھنے دے۔ جھل کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سر برف کے مانند منجمد ہونا چاہیے۔ اُس کی مُراد یہ تھی کہ سر میں حبس نہ ہو، کھلا ہی رہے تو بہتر ہے۔ پیرو کو بھی یہ بات معلوم ہوگی۔ اُس نے ماہم کا پاڑا یوں ہی حاصل نہیں کر لیا تھا۔ بہت سے آدمیوں میں وہی آدمی اڈّے کا مالک بنتا ہے جس کے جسم اور سر میں توازن ہو اور اِس لحاظ سے جامنی بائی ممبئی کے ایک پاڑے کی دادا تھی اور اُس نے کئی پاڑے یوں ہی لوگوں کے سپرد کر دیے تھے۔ وہ بھی اِس توازن سے ناآشنا نہ ہوگی۔

اُنھیں دس منٹ سے زیادہ گزر گئے تھے۔ مشہور تھا کہ جامنی بائی کو چند ہی لمحے لگتے ہیں۔ اُس کے آدمی چاروں طرف دم سادھے کھڑے تھے۔ بیچ میں پیرو کو ایک بار شبہ ہوا تھا کہ جامنی بائی اُس کے ساتھ رعایت تو نہیں برت رہی ہے مگر پھر خود ہی اُسے اِس وہم کی تردید کرنی پڑی۔ کوئی پل ایسا نہیں گزرا تھا جب جامنی بائی نے اُس کے وار سے بچنے یا اُس پر وار کرنے کا موقع کھویا ہو۔ دونوں پسینے میں شرابور ہو گئے تھے۔ پیرو اُسے اور تھکا دینا چاہتا تھا کہ اس صورت میں شاید کوئی وار کارگر ہو جائے۔ دونوں ایک دوسرے پر چاقو کا کوئی نشان ڈالنے سے بچ رہے تھے اور ایک دوسرے کو گڑبڑا دینے کے خیال سے چاقو کی بھبکیاں دے رہے تھے۔ دونوں میں سے کوئی اپنی اس تگ و دو میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ گڑبڑا کے کوئی بھی چاقو نہیں چھوڑ دیتا۔ چاقو ہر حالت میں ہاتھ سے چپکا رہنا چاہیے۔ ہاں کوئی چارہ نہ رہے تو دوسری بات ہے۔ جو گڑبڑا

کے چاقو چھوڑ بیٹھتا ہے، جھل کے کہنے کے مطابق اُ
چاقو نہیں تھامنا چاہیے پھر اُسے چاقو تھامنا نہیں آ
دوسرے کو متذبذب کرنے یا بوکھلا دینے سے اُن کا
کسی بہتر داؤ کے لیے راہ ہموار کرنا تھا۔ ٹانگ اَڑا کے
بازو سے قینچی ڈالنے۔ توازن بگاڑنے اور کسی خاص جگہ
پکڑنے وغیرہ میں کامیابی حاصل کرنا جو ابھی تک ممکن نہیں
جامنی بائی، پیرو سے وزن میں بہت کم ہوگی۔ کلائی بھی اُ
کی طرح مضبوط نہیں ہوگی۔ پنجے کی پکڑ بھی پیرو کے مُقا
کم زور ہونی چاہیے لیکن کمزوری اور مضبوطی کا تعلق داؤ
والوں سے ہوتا ہے۔ صحیح رگ اُنگلی کی زد پر آ جائے تو
بھی تڑپنے لگتا ہے۔ جامنی بائی کو اپنی گرفت کا کوئی
ہوگا جبھی وہ آس پاس کے پاڑوں کے داداؤں سے زو
ہوئے نہیں جھجکتی تھی۔ ہر طرف دائرے کی شکل میں کھڑے
کے بیچ میں کھلی جگہ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ پیرو متعدد مرتبہ
پھر کتا، پھڑ پھڑاتا بڑھتا تاکہ کسی ایک گوشے میں جا
جگہ تنگ ہو جائے اور اُس پر ہاتھ ڈالنا آسان ہو جا
اُس تنگ گوشے میں آنے سے پہلے ہی اُس کے ہا
طرح نکل جاتی تھی۔ اُس کے بدن میں بے حد لچک تھی
ہوتے اپنے آپ کو تہہ کرنے میں اُتنی دشواری نہ
جتنی پیرو کو ہوتی تھی۔ دونوں کے بیچ دیر تک چوہے
ہوتا رہا۔ پھر معاً پیرو کے ذہن نے کروٹ سی بدل لی یا ذہ
میں اُمید کی کرن پھوٹی۔ اُس نے کسی تاخیر کے بغیر اُس
کا ارادہ کر لیا۔

اُس نے طے کیا تھا کہ اب کے جب جامنی
ہوئے اُس پر لپکے تو وہ اِدھر اُدھر بچنے کے بجائے ایک
جامنی بائی کے قریب آنے پر ہی اُس کا بیٹھنا سودمند
زیادہ ہوتا تو وہ اُس کی طرف بڑھتے بڑھتے پلٹ جاتی،
جانے پر اُس کے لیے پلٹنا بہت وقت طلب تھا
میں پیرو پر لوٹ جاتی۔ اس گڑبڑاہٹ کے دوران اگر
پیرو کے جسم کے کسی حصّے پر لگ سکتا تھا اور اُس کا پنجہ
کے قبضے میں آ سکتا تھا۔ خود جامنی بائی کے لیے اتنے کم
سنبھلنا اور سنبھل کے پیرو کا پنجہ پکڑنا ممکن نہیں تھا
ہونے کے باوجود اتنی جلد ارادہ بدلنے کا امکان تو کم
ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اب تک وہ ایک دو
ٹلتے رہے تھے۔ اس بار بھی پیرو پر جھپٹتے وقت جامنی
ہوگی کہ پیرو کسی جانب بچ نکلے گا۔ پیرو کا یہ اقدام عا

ں دُور دُور تک نہیں ہوگا کہ وہ یوں اپنے آپ کو خطرے
ال دے گا۔ یہ ایک طرح کی وحشت تھی مگر جسے دیکھ کے
خود شت پٹا سکتی تھی۔ بہرحال پیرو اِس موقع کی تاک میں
ں ہی جامنی بائی اُس کی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی آئی،
نے چند قدم پیچھے ہٹ کے پہلے تو اُسے یہ تاثر دیا کہ وہ اُس
لنہ وار سے بچنے کے لیے تیار ہے لیکن۔۔۔ جیسے ہی جامنی
اُس کا فاصلہ ایک گز سے قریب رہ گیا تو دفعتاً وہ بیٹھ گیا۔
نے اپنے دونوں ہاتھ کھلے رکھے تھے اور اُس کا خیال تھا کہ
ت پڑی تو وہ اپنا چاقو بھی چھوڑ دے گا۔ جامنی بائی بیچ میں
پیرو کے جسم سے تیزی سے ٹکرائی مگر ابھی پیرو ہاتھ اُٹھا کے
ا بازو یا کلائی پکڑ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ اپنے بدن کی پوری
ن سے اُوپر اُچھلی اور پیچھے پیرو کے دوسری جانب لوٹ گئی،
پر دو ایک قلابازیاں کھاتی ہوئی وہ کچھ دُور جا کے کھڑی ہو گئی۔
پیرو کی آنکھوں میں ایک لحظے کے لیے دُھند سی چھا گئی
وہ جلد ہی اپنی جگہ سے اُٹھ کے کچھ پیچھے آ گیا اور اِس سے
راب جامنی بائی اُس پر لپکتی، وہ ترچھا ہو کے، ایک ہاتھ بڑھا،
رتاک کی سیدھ میں کیے چند قدم جست لگا کر پھر جامنی کے قریب
رائی اور بات اِس کے سوا اُس کے دماغ میں نہیں آ رہی تھی کہ
امنی بائی کا اور اپنا فاصلہ کم سے کم رکھے۔ اُس نے کچھ ایسا محسوس
ا کہ جامنی بائی فاصلہ کم رہنے سے کترا رہی ہے۔ اگر یہ اُس کا
ہم تھا، تو بھی اب زیادہ دیر تک پیرو یہ آنکھ مچولی جاری رکھنے
ر نہیں تھا۔ فاصلہ کم ہونے پر جلد سے جلد کوئی نتیجہ برآمد ہونے
لو تھی۔ اِدھر یا اُدھر، جو کچھ بھی ہو۔ پیرو کا چاقو والا ہاتھ اپنے
ے دراز رہنے کی وجہ سے جامنی بائی دائیں بائیں ہو کے اُس
ا اُچکنے کی کوشش کرتی یا پہلو سے بچ نکل کے پیرو کو پھر
پر مجبور کر دیتی۔ پیرو کی خواہش تھی کہ جامنی بائی اس موقع سے
اُٹھائے اور اُس کے پنجے پر جھپٹا مارے۔ بس یہیں سب
رجانا تھا کہ وہ جامنی بائی سے پنجہ چھڑا لیتا ہے اور خود اُس
قبضے میں کر لیتا ہے یا نہیں۔
پیرو کی نگاہیں چاقو پر جمی ہوئی نہیں تھیں کیونکہ اِس کی
ت نہیں تھی۔ جامنی سامنے سے اُس کے اُٹھے ہوئے ہاتھ
پا کی نوک پر آنے سے تو رہی اسی لیے پیرو اس طرف
بے فکر تھا اور سامنے دیکھنے کے بجائے اِدھر اُدھر جامنی بائی
ل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا اور ہر قسم کی صورتِ حال
لیے مستعد تھا۔ جامنی بائی اُسے بڑھتا ہوا دیکھ کے فوراً ہی
ی جانب ہوئی، پھر دائیں جانب۔ ایک آن میں اُس نے کئی

پینترے بدلے۔ پیرو نے اپنا ہاتھ سیدھا ہی رکھا اور اِس طرح جامنی بائی کو کوئی رائے قائم کرنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ جامنی کے لیے اِس میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ کسی طرف بھی ہو سکتی تھی مگر پیرو کا اِس انداز میں چاقو اُٹھائے، ہاتھ پھیلائے رکھنا اُسے شک میں ڈال سکتا تھا۔ وہ پیرو کے انتہائی بائیں جانب ہو گئی۔ نتیجتہً پیرو کو بھی رُخ بدلنا پڑا لیکن اُس نے اپنا ہاتھ ویسے ہی پھیلائے رکھا۔ جامنی بائی اِس اثنا میں بڑھ چکی تھی۔ پیرو نے رُخ بدلنے میں دانستہ دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ اُدھر سے بڑھی، اِدھر سے پیرو پلٹ کے جامنی کے سامنے ہو گیا۔ جامنی بائی اتنی تیزی میں تھی کہ پیرو کو اپنا ہاتھ کھینچنے کی مہلت نہیں ملی، وہ عین اُس کے مقابل آ چکی تھی اور چاقو ٹھیک اُس کے سینے میں پیوست ہوا، دوسرے ہی پل وہ پیرو کے بازو پر جھول رہی تھی اور پیرو کا سارا جسم چکرا رہا تھا۔

وزیرا در مارتی کی سسکیاں نکل گئیں۔ سبھی پتھرائی ہوئی نظروں سے پیرو کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ پیرو کا سر جھکا ہوا تھا اور اُس کا جسم ایک ڈھیر لگ رہا تھا۔ کسی کو کچھ اور پوچھنے کی ہمت نہیں پڑی۔ جھل بھی گم صُم بیٹھا تنکوں سے آگ کرید رہا تھا۔ خاصی دیر بعد جامو نے جھجکتے ہوئے زبان کھولی۔ "دادا! پر، پر ایسا کیسے ہو گیا؟" اُس کی آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔

"ہو گیا جانی! سب ایسا ہی ہوا۔" پیرو بھاری لہجے میں بولا۔ "جامنی بائی اپن سے مسخری کر رہا تھا۔ وہ سب ممول تھا جامو! اپن سالا سمجھتا تھا، اپن جامنی بائی کو نچاتا ہے۔ وہ اُودا اپنے کو نچاتا تھا۔ اتنے آدمیوں کے بیچ اپنے پیرو کو ذلیل کرنا نہیں مانگتا تھا۔ اتنا ٹیم اُس نے اپن کے لیے لیا تھا۔"

"نہیں دادا!" جامو منتشر لہجے میں بولا۔

"اپن نے آخری ٹیم اُس کا مسکان دیکھا تھا۔ وہ اُودا اپن کے بازو پر ہی پڑا تھا۔ ہنستا ہوا بولا، اپن ہار گئے دادا! اپن سے کچھ نہیں بولا گیا۔ بولا تو وہ کان بند کر چکا تھا۔ تم سمجھتا ہے جامو اُستاد! اپن نے پلٹنے میں دیر کی کہ اُودھر سے وہ چل پڑا تھا۔ وہ جان کے چل پڑا تھا جامو! وہ چاہتا تو کسی اور طرف کو جا پڑتا۔"

پیرو ٹھیک ہی کہتا تھا، جب اُس نے جامنی بائی سے جرار کیا تھا تبھی جامنی بائی نے یہ طے کر لیا ہوگا۔ جامو نے اُس سے کچھ اور نہیں کہا۔ پیرو کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ اُس نے درمیان میں جس لڑکی کا ذکر کیا تھا، اُس کا نام نہیں بتایا، نہ کسی نے پوچھا مگر میں اور جھل اُسے دیکھ چکے تھے۔ وہ گیتا کی ماں کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

الاؤ میں آگ دہک رہی تھی۔ آگ دھیمی ہو جاتی تو لکڑیاں اور جھونک دی جاتیں، رات بھر آسمان صاف رہا اور تارے ٹمٹماتے رہے اور پہرے دار ہمارے اطراف چکر لگاتے رہے۔ اندھیرا دُھندلا ہو تا جا رہا تھا۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ یوں بیٹھے بیٹھے نہ جانے کتنا وقت اور بیت گیا کہ سورج کی پہلی کرن نمودار ہوئی۔ جانگ قبیلے کے آدمیوں نے فوراً جھول داریاں لپیٹنی شروع کر دیں اور اُن کے کچھ آدمی ناشتہ تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ باقی سب ہمارے قریب ہی منڈلاتے رہے۔

اندھیرا پوری طرح چھٹ چکا تھا کہ اُنھوں نے ہمیں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ابتدا میں اُن کی رفتار تیز تھی، رفتہ رفتہ سست ہوتی گئی۔ گزشتہ دو دن میں وہ مسلسل چلتے رہے تھے یا جاگتے رہے تھے۔ جس رفتار سے وہ فاصلے طے کر رہے تھے، وردنگ بستی تک پہنچنے میں مزید ایک دن اور لگ سکتا تھا۔ نشانم اباجان کے ساتھ تھی۔ دونوں کی آنکھوں سے عیاں تھا کہ رات بھر خیمے میں کروٹیں بدلتے رہے ہیں۔ ہم نے اپنے تھیلے بھی یاکوں پر ڈال دیے تھے۔ دھوپ نکلنے سے سردی کچھ کم ہو گئی تھی۔ آگے اونچائی ہی اونچائی تھی۔ اونچائی پر مسلسل نہیں چلا جا سکتا۔ چنانچہ وقفے وقفے سے سب دم ضرور لیتے تھے۔ اب یہ وقفے پہلے سے طویل ہو گئے تھے۔ آگے جا کے اُن کی رفتار کچھ اور سست پڑ گئی اور ہم ایک اونچا پہاڑی راستہ طے کر کے پھر نیچے اُترنے لگے اور ایک مختصر وادی میں آ گئے۔

ابھی دوپہر نہیں ہوئی تھی کہ کھانا کھانے کے لیے وہ وہیں ٹھہر جاتے حالانکہ وادی نہایت خوب صورت تھی، چاروں طرف پہاڑ کے بیچ میں کسی بڑے کٹورے کی ہنڈی کے مانند۔ بڑے بڑے تودے پہاڑوں سے ٹوٹ کر کبھی نیچے آ گئے ہوں گے۔ جگہ جگہ وہی بکھرے ہوئے تھے۔ پانی کی افراط تھی۔ اُوپر سے گرتے ہوئے چشموں نے نشیب میں ایک جھیل سی بنا دی تھی۔ پتھروں کی وجہ سے درخت زیادہ نہیں تھے۔ کہیں کہیں اُن کے ساتھ ملی ہوئی جھاڑیاں زمین سے پھوٹ آئی تھیں۔ ہم سب ایک دوسرے کے آگے پیچھے تھے، اباجان اور نشانم سب سے پیچھے۔ ہمارے تینوں قلی یاکوں کے ساتھ تھے۔ تقریباً سارا سامان یاکوں پر لدا ہوا تھا۔ جینی اور پلٹو ہم سب سے آگے تھے، زیادہ دُور نہیں۔ جانگ قبیلے کے آدمیوں کی نگہداشت کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ہمارے ہتھیار بھی جیبوں میں پڑے ہوئے تھے اور بندوقیں شانوں پر لٹکی ہوئی تھیں۔ وادی کے درمیانی حصے میں آتے ہی یکایک جینی

اور پلٹو کی زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ [illegible] اُنھی کی طرف دیکھنے لگے۔ ابھی ہم کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہے [illegible] کہ اچانک پلٹو نے جینی کو کمر سے اُٹھا کے زمین پر پٹخ دیا [illegible] نکال لیا اور اس پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ ہم سب اُنھی کی طرف [illegible] جینی بُری طرح چیخ رہا تھا۔ بجھل نے پلٹو کا چاقو والا ہاتھ [illegible] ہم سب جھک کے جینی کو دیکھنے لگے، وہ زمین پر ٹانگیں پٹخ پٹخ [illegible] مار رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے جانگ قبیلے کے سارے آدمی ہماری [illegible] پڑے اور ہمارے گرد اُن کا ایک گھیرا سا بن گیا۔ ہر شخص جھک [illegible] کے جینی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ وادی میں شور مچ گیا تھا [illegible] کو پکڑ کے اُٹھایا۔ بجھل نے پلٹو کو اگ پکڑ رکھا تھا اور پلٹو [illegible] سے گالیاں اُبل رہی تھیں۔ بجھل نے چیخ کے اُسے چپ [illegible] تلقین کی اور ٹھیک اُسی لمحے ہم جیسے ہی جینی کو اُٹھا کے [illegible] اور ہمارے چہرے اُن کی متجسس آنکھوں کے مقابل ہوئے [illegible] ہاتھ اُٹھے ہوئے تھے اور خالی نہیں تھے۔ ہم نے بے دریغ [illegible] برسانی شروع کر دیں۔

وہ ہمارے بہت قریب تھے دوسری طرف پلٹو اور جینی [illegible] تمنچے تانے اُن پر گولیاں برسا رہے تھے۔ اُن کے گھیرے میں [illegible] کے جتنے آدمی تھے، وہ دھڑا دھڑ گرنے لگے اور جیسے ہی [illegible] کے آدمی آگے والوں کے ہٹنے پر سامنے آئے، اُن کا بھی [illegible] ہوا۔ ابھی وہ اس ناگہانی کو ٹھیک طرح سمجھ بھی نہیں پائے تھے [illegible] تیس آدمی وہیں ڈھیر ہو گئے، باقی اندھا دھند بھاگنے لگے [illegible] کے وہ کچھ فاصلے پر رُکتے اور ہم پر نیزے تانتے یا کمانیں [illegible] سب کو احساس تھا کہ آگے جا کے اُنھیں ایک لمحہ بھی [illegible] نیزے پھینک سکتے ہیں یا تیر چلا سکتے ہیں۔ اُنھیں کوئی [illegible] نہیں دینا تھا۔ ہماری گولیوں نے اُن کا دوڑتے ہوئے تعاقب [illegible] اور منتشر کر راستے میں ہی جا لیا۔ ہر سو اُن کی چیخیں گونج رہی [illegible] اور ہم میں سے کسی کو ایک دوسرے کی جانب دیکھنے کا ہوش [illegible] تھا۔ وہ دہشت زدہ انداز میں پیچھے بھاگ رہے تھے پھر جسے [illegible] قریبی پتھر کی آڑ ملی، وہ وہیں چھپ گیا۔

اُس وقت ہمارے کانوں میں بجھل اور پیرو کی آواز [illegible] چلا چلا کے ہمیں اور آگے بڑھنے کو کہہ رہے تھے تاکہ تمنچے [illegible] گولی کا فاصلہ اپنی حد ہی میں رہے، کوئی نشانہ خطا نہ [illegible] اُن کے مرے ہوئے اور تڑپتے ہوئے آدمیوں کو سرسری نظر [illegible] کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اُن کی ایک بڑی تعداد [illegible] ہو گئی ہے۔ سارے تمنچے بھرے ہوئے تھے اور ہر ایک کے [illegible] میں تمنچا تھا، بعض کے پاس دو بھی تھے۔ پتھروں کی آڑ میں [illegible]

نیزے سے ہم پر نشانہ لگانے کے لیے اُنھیں بہر صورت آڑ سے نکلنا پڑتا کیونکہ اُن کے پاس ہماری طرح بندوقیں اور تمنچے نہیں تھے۔ کچھ آگے بڑھ کے ہم بھی احتیاطاً ٹوٹی ہوئی چٹانوں کے اُن تودوں کے پیچھے ہو گئے جو وادی میں جا بجا پڑے تھے۔ ہم نے کچھ دیر انتظار کیا اور اسی اثنا میں اپنے خالی تمنچے بھر لیے۔ اُن میں سے کوئی باہر نہیں نکلا۔ اُنھیں وہاں سے نکالنے اور اپنی سمتوں کا اندازہ کرانے کے لیے ہم نے آپس میں صدائیں لگانی شروع کر دی تھیں۔ اُن میں سے چند ہی نے نشانہ لینے کی جرأت کی اور تیروں کے بجائے نیزے پھینکے۔ اُن کے آگے ہم نے فیر کر دیے تھے پھر بھی اُن کے کئی نیزے ہمیں لگتے لگتے بچے۔ ہم اپنی تعداد کے مطابق پتھروں کو نشانہ بنا سکتے تھے، پتھروں کی تعداد جہاں وہ چھپنے میں کامیاب ہو گئے تھے، ہم سے زیادہ تھی اور یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ سامنے جن پتھروں کو ہم نشانہ بنائے ہوئے ہیں، اُس کے پار وہ موجود بھی ہیں یا نہیں۔ ایک مرتبہ ہماری آوازوں پر اپنی اپنی آڑ سے نیزے پھینکنے کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ بہتر یہی تھا کہ ہم کچھ توقف کریں۔ وہ جاتے کہاں؟ وادی کے ہر طرف اُونچے پہاڑ تھے۔ اُن کی کوشش یہی ہونی چاہیے تھی کہ وہ کسی طرح اُن تک پہنچ کے وہاں پھیلے ہوئے درختوں کے جھنڈ میں جا چھپیں اور رینگ رینگ کے آگے بڑھتے رہیں یا وہاں سے ہم پر تیر اور نیزے پھینکیں۔ پہاڑوں پر پگ ڈنڈیوں کے بغیر چلنا مشکل تھا۔

دن کے بارہ بجے کا عمل ہو گا۔ دھوپ ساری وادی میں کھلی ہوئی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ دھوپ مُرجھانے کے وقت کا انتظار کریں۔ اندھیرے میں اُن کا پہاڑوں کی دیواروں کی جانب رینگنا آسان تھا۔ اس لیے ہمیں اُنھیں زیادہ وقت نہیں دینا چاہیے تھا۔ جتنی جلد ممکن ہو سکے باقی رہ جانے والے اُن تمام آدمیوں کو نشانہ بنا دینے میں ہمارے لیے بہتری تھی۔ آگے بڑھنے کی وجہ سے ہمارا دائرہ وسیع ہو چکا تھا اور ہم ایک دوسرے سے خاصی دُور ہو چکے تھے۔ آوازیں بلند کر کے ہی دوسرے کو مخاطب کیا جا سکتا تھا اور آوازیں بلند کرنا اب مناسب نہیں تھا۔ مجھے اباجان کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ اُنھیں دیکھنے کے لیے میں ایک تودے پر چڑھ گیا مگر اُن کا اور نشانم کا دور و نزدیک کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ بجھل اور جامو بھی میری طرح اُوپر تودوں پر آ گئے تھے۔ جامو کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے اُترنے اور آگے جانے کا اشارہ کیا۔ میرے قریب صرف سارٹے تھا۔ میں دوڑ کے اُس کے پاس پہنچا اور اُسے ساتھ لے کے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ جامو کے کہنے سے پہلے ہی میرا خیال تھا کہ انتظار کرنے کے بجائے ہم قریب قریب کی تمام جگہوں پر، جہاں اُن کے چھپنے

کا امکان ہے، خود ہی اُن کے سامنے پہنچ جائیں، دو آدمی ایک ساتھ چلیں۔ ہم پنجوں کے بل اپنی چاپیں انتہائی تدھم رکھتے ہوئے سامنے کے تودوں کے نزدیک ہوتے رہے۔ دونوں کُھلے ہوئے تھے کسی جانب سے بھی نیزا یا تیر آ سکتا تھا۔ بہت سے تودوں کے ساتھ جھاڑیاں بھی اُگی ہوئی تھیں اور وہ جھاڑیوں میں تودوں کی نسبت وہ زیادہ محفوظ تھے کیونکہ وہاں سے وہ نشانہ لے سکتے تھے۔ ہماری نگاہیں وہیں منڈلا رہی تھیں جہاں جھاڑیاں تھیں۔

میرے ایک ہاتھ میں چاقو، دوسرے میں تمنچا تھا۔ سارٹے کے دونوں ہاتھوں میں تمنچے تھے۔ ایک بڑے تودے کی دیوار سامنے آتے ہی ہم دونوں مخالف سمتوں میں تیزی سے بھاگے۔ سارٹے اُدھر سے، میں اِدھر سے۔ جیسے ہم اچانک زمین سے پھٹے ہوں، ہم دونوں دونوں اطراف سے اُن پر جھپٹے۔ وہاں پانچ چھ آدمی دبکے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے حواس باختگی سے نیزے پھینکنے چاہے مگر تمنچے کی گولیوں نے اُنھیں وہیں ختم کر دیا۔ میں نے کھٹکا دبانے کے ساتھ ساتھ چاقو بھی اُن پر پھینکا تھا اور میں چاقو ایک آدمی کے سینے سے نکال ہی رہا تھا کہ وادی میں گولیاں چلنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ یکے بعد دیگرے ایک دم گولیوں کا شور اُٹھتا۔ میں اور سارٹے آگے ہی بڑھتے گئے۔ ہم دونوں نے اچانک اُن کے سروں پر پہنچ پہنچ کے کوئی دس گیارہ آدمی ٹھکانے لگا دیے تھے۔ دوسری جانب گولیاں چلنے کی آوازوں [illegible] سے [illegible] ہوتا تھا کہ ہماری طرح اور بھی لوگ اُنھیں ڈھونڈنے [illegible] کامیاب [illegible] گئے ہیں۔ تقریباً ایک گھنٹے تک وقفے وقفے سے [illegible] گولیوں [illegible] دھماکے ہوتے رہے پھر خاموشی چھا گئی۔ ہم ایک [illegible] دُور تک چلے گئے تھے مگر ہمارا دُور آنا بے کار ثابت [illegible] وہ مجھے اور سارٹے کو نظر نہیں آئے۔

ابھی ہم لوٹنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ [illegible] زور سے بولنے کی آواز گھومنے لگی۔ ہم نے [illegible] کی کوشش کی مگر کوئی تبتی میں بول رہا تھا اور یہ سُولم ہی کی آواز ہو سکتی تھی۔ ہم نے پیچھے مُڑ کے دیکھا۔ سُولم پیرو کے ساتھ ایک اُونچے ٹیلے پر کھڑا دونوں ہاتھ منہ سے لگائے مخاطب تھا۔ سُولم کے مخاطب جانگ قبیلے کے بچے کھچے لوگ ہی ہو سکتے تھے۔ یقیناً وہ اُن سے کہہ رہا ہو گا کہ سامنے آ جائیں اور اپنے ہتھیار پھینک دیں مگر سُولم کی آواز کتنے آدمی سُن رہے ہوں گے گنتی کے چند آدمی۔ آدھے سے زیادہ وہ گولیوں کی پہلی دوسری باڑھ ہی میں تمام ہو چکے تھے۔ ابتدا میں آنا فانا [illegible] کچھ نہ ہوتا تو شاید اُن کے ہتھیار اُن کے کسی کام آ جاتے۔

بجھل نے پہلی رات سو کے اور دوسری جاگ کے لیں ہی نہیں

گنوائی تھی۔ پہلی رات ہمارے سوجانے کے بعد حفظِ ماتقدم کے طور پر انھیں جاگنا ہی تھا۔ دوسری رات ہم انھیں جگائے رکھنے کے لیے دانستہ جاگتے رہے۔ دو دن نیند کے بغیر، پہاڑوں پر مسلسل سفر اُن کے جسم بوجھل کر دینے کے لیے بہت تھا اور ابھی آدھا سفر بھی طے نہیں ہوا تھا۔ یقیناً آدھے کے خیال سے اُن پر ایک بوجھ سا طاری ہوگا اور ہماری جانب سے کسی وقت بھی کسی اقدام کا کھٹکا اُن کے لیے الگ ایک وحشت کا سبب ہوگا۔ صبح آگے بڑھتے ہوئے اُن کے قدموں میں پہلے جیسی مستعدی نہیں رہی تھی۔ ہنجل پرسوں یا کل کسی وقت بھی جینی اور ملیٹو کو اسی طرح آگے بھیج کے اور اُن کے درمیان جھگڑا کرا کے انھیں اپنے قریب کر سکتا تھا۔ ہم سب کا جینی اور ملیٹو کو آپس میں جھگڑے سے باز رکھنے کے لیے اُن کے پاس بھاگنا ایک فطری عمل تھا۔ ہم سب جب ایک جگہ اکٹھے ہو گئے تھے تو اُن کا بھی ہر طرف سے ہماری جانب بڑھنا لازم تھا لیکن اُن کے سان و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ہم بس اپنے قریب اُن کے گھیرے کا انتظار کر رہے ہیں، ملتے ہی اُن پر گولیاں چلا دیں گے اور انھیں ہتھیار تولنے کے لیے بھی ایک لمحہ نہیں ملے گا۔ پرسوں نہیں تو کل ہم انھیں یوں اپنے نزدیک بلا سکتے تھے مگر اچھا یہی تھا کہ دو راتوں اور دو دنوں کی تھکن اُن پر غالب آ جائے اور اس دوران انھیں کسی قدر یہ اطمینان بھی ہو جائے کہ کسی قسم کی مزاحمت کا امکان نہیں ہے۔ ہنجل نے اپنے اس ارادے کے بارے میں پہلے سے کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ جینی اور ملیٹو کو آگے بھیجنے کے بعد ہی اُس نے ہم سب کو بتایا تھا کہ تیار رہیں۔ سب اپنی جگہ چوکنے تھے۔ سبھی کے ذہن میں ایک شبہ تھا کہ ہنجل واپسی کے لیے ایسے ہی آمادہ نہیں ہو گیا ہوگا اسی لیے سب اُس کے اشارے کے منتظر تھے۔ جینی اور ملیٹو نے آپس میں اُلجھنے میں نہ دیر کی تھی، نہ جلدی۔ اُن کے کسی طور سے یہ ظاہر نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو نقل ہی مار رہے ہیں۔ ایک لمحے کو ہنجل کے کہنے کے باوجود مجھے کچھ ایسا لگا تھا کہ وہ حقیقتاً آپس میں بھڑ گئے ہیں۔ ملیٹو نے جینی کو کمر سے پکڑ کے زور سے زمین پر پٹخ دیا تھا اور چاقو تان کے اُسے مارنا ہی چاہتا تھا کہ ہنجل نے لپک کے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وادی میں سطح زمین زیادہ لمبی چوڑی نہیں تھی۔ آگے ایک اونچا پہاڑی سلسلہ تھا۔ جانگ قبیلے کے آدمیوں کے لیے فرار کے راستے مسدود تھے۔ اندھیرا ہونے میں خاصا وقت پڑا تھا۔ آگے ایسا کوئی موقع ملتا یا نہ ملتا۔

آمنے سامنے ہر جانب لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے اس سے پہلے کبھی ایک ساتھ اتنے آدمی مرے ہوئے نہیں دیکھے تھے۔ زمین بہت سی جگہوں پر لال ہو گئی تھی۔ جابجا خون کے لوتھڑے اور چکتے پڑے ہوئے تھے۔ ہم انھیں پھلانگتے ہوئے اُس مقام تک جا پہنچے جہاں سے چلے تھے۔ میری سانس اکھڑ رہی تھی اور دل دھڑ دھڑا رہا تھا۔ پتہ نہیں سارنٹے کا کیا حال تھا لیکن اُس کی آنکھیں بھی پھٹی ہوئی تھیں۔ سُولم اور پیرو کو تو ہم نے تودے پر کھڑے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ آگے بڑھنے پر جب جامو، ملیٹو، بلاکو، مارثی اور ہنجل کے چہرے نظر آئے تو ہمارے حواس کسی قدر بجا ہوئے۔ ابا جان اُن میں نہیں تھے، نہ تشانم تھی۔ ضرور ہنجل نے جینی اور ملیٹو کو اشارہ کرتے ہوئے انھیں بھی کچھ اور پیچھے ہو جانے اور اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی تلقین کی ہوگی اور وہ یہیں کہیں کسی آڑ میں چھپے ہوں گے۔ ایک طرف جامو بندوق تانے جانگ قبیلے کے پانچ آدمیوں کو روکے کھڑا تھا۔ مارثی پشت سے اُن کے ہاتھ رسّیوں سے باندھ رہا تھا۔ جامو کے ماتھے پر خون بہہ رہا تھا۔ نیزا اُس کی آنکھ اور گال سے گزرتا ہوا گردن تک چلا گیا تھا۔ ہمیں دیکھ کے اُس کے ہونٹ بڑبڑانے لگے اور وہ چیخ کے بولا۔ "لاڈلے! سلطانے کو دیکھ۔"

سلطان کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جامو سے کچھ دور ہنجل، جینی، زورا، بلاکو اور ملیٹو کسی پر جھکے ہوئے تھے۔ یقیناً کوئی بہت زیادہ زخمی ہو گیا تھا۔ میں اُن کی طرف نہیں گیا اور اِدھر اُدھر پڑی ہوئی لاشوں میں سلطان کو تلاش کرتا رہا۔ سارنٹے دوسری جانب نکل گیا تھا۔ سُولم اور پیرو بھی تودے سے اُتر کے میرے آس پاس منڈلا رہے تھے۔ جانگ قبیلے کے آدمی اپنے مخصوص لباس کی وجہ سے علیحدہ پہچانے جا سکتے تھے، سو اُن کے اوندھے جسم سیدھے کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سلطان اپنے چوڑے چکلے جسم اور کپڑوں کے سبب دور سے نظر آ جاتا۔ میں اُسی کو ڈھونڈ رہا تھا کہ ایک بڑے پتھر کے نزدیک کسی کی کراہ میرے کانوں میں پڑی۔ وہ سلطان ہی تھا اور اپنے بل پر اُٹھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اُس کی پنڈلی میں نیزا لگا تھا اور گوشت پھاڑتا ہوا گزر گیا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھولے جاتے تھے، سلطان بے حال تھا، آواز بھی حلق سے نہیں نکل رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں مگر اسی اثنا میں اُسے ڈھونڈتا ہوا پیرو بھی اُس طرف آ نکلا اور سلطان کا زخم ایک نظر دیکھتے ہی اُسے اپنے کندھے پر ڈال کے جھیل کی سمت بھاگنے لگا۔ اُس نے مجھے ہدایت کی کہ میں مرہم پٹی اور دواؤں کا صندوقچہ لے کے اُس کے پاس پہنچوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ سامان میں یہ صندوقچہ کدھر رکھا ہے۔ اتنا مجھے یاد تھا کہ ہنجل نکلتے ہی سے اُسے اپنے ساتھ لے کے چلا تھا اور جانگ قبیلے سے چلتے وقت بھی سامان میں رکھنا نہیں بھولا تھا لیکن سارا سامان راستے میں اُلٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ سارنٹے نے بھی پیرو کو سلطان کا جسم کندھے پر لادے جھیل کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی اُدھر جا رہا تھا مگر میں نے اُسے روک لیا اور صندوقچے کے بارے میں پوچھا۔ مجھے کچھ بتانے کے بجائے وہ خود سامان کھنگالنے چلا گیا۔ جتنی دیر میں سارنٹے واپس آتا، میں اُس طرف لپکا جدھر ہنجل، بلاکو، جینی اور ملیٹو تھے۔ وہاں وزیر بے سدھ پڑا تھا اور وہ سب اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وزیر کا ایک شانہ خون میں نہایا ہوا تھا اور اُس کی سانس آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ جس وقت میں اُن کے پاس پہنچا، ہنجل وزیر کو آہستہ آہستہ پکار رہا تھا۔ وزیر نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ دیکھتے دیکھتے اُس نے سانس بھی بند کر لی اور اُس کے ہاتھ میں دبا ہوا تمنچا چھوٹ پڑا۔ سب ایک دوسرے کو ویران آنکھوں سے دیکھا کیے۔ ہنجل نے جلد ہی وزیر کے منہ پر کپڑا ڈال دیا۔ سب اُس کے پاس سے اُٹھ گئے تھے، سارنٹے کو سامان میں صندوقچہ نہیں ملا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر پڑا تھا۔ جیسے ہی اُس نے لوٹ کے سلطان کے بارے میں ہنجل کو بتایا، سب جھیل کی طرف دوڑ پڑے۔ مجھ سے چلا نہیں گیا۔ میں وزیر کا سر اپنی گود میں بھینچے وہیں بیٹھا رہا۔

وزیر کی قبر ایک اونچی جگہ کھودی گئی۔ بڑے مندر کے تہہ خانے میں پتھریلی دیواریں کھودنے کی ہمیں مہارت ہو ہی گئی تھی۔ مٹی کی قبر کھودنے میں کیا دیر لگتی۔ چاروں طرف سناٹا ہو جانے کے بعد ابا جان اور تشانم بھی کسی چھپی ہوئی جگہ سے باہر نکل آئے تھے۔ ابا جان اور پیرو نے مل کے وزیر کو جھیل پر نہلایا اور ابا جان ہی نے بھکشوؤں کے لباس میں اُس کی نماز ادا کی۔ ہم سب سر جھکائے کھڑے رہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر متّن میاں کی طرح وزیر کو بھی منوں مٹی کے نیچے دبا دیا گیا اور ہم اُسے ویرانے میں تنہا چھوڑ کے آگے بڑھ گئے۔

سلطان کی پنڈلی کی مرہم پٹی کر دی گئی تھی مگر اُس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ زورا، جامو اور ہنجل بھی زخمی ہوئے تھے۔ بلاکو کے سر پر کسی نے پتھر کھینچ مارا تھا۔ ہنجل کا پیر بھاگتے ہوئے رپٹ گیا تھا اور اُسے چلنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ زورا کی پسلیوں سے نیزا اچھلتا ہوا گزر گیا تھا۔ قسمت تھی جو بچ گیا۔ سلطان کے مقابلے میں سب کے زخم معمولی تھے۔ ہمارے تینوں قلیوں میں سے ایک ہی زندہ بچا تھا۔ باقی دو نے موقع دیکھ کے قبیلے کے لوگوں کے ساتھ بھاگنے کی غلطی کی اور نشانے پر آ گئے۔ قبیلے کے زندہ رہ جانے والے پانچوں آدمیوں کے ہاتھ ہنجل نے کھلوا دیے تھے اور انھیں اپنے ساتھ ہی رکھا تھا۔ بہت سے یاک مر گئے تھے۔ ہمارے اور اُن کے یاکوں کو ملا کے کُل گیارہ یاک تھے۔ اتنوں کی ضرورت نہیں تھی لیکن زندہ یاکوں کو بے آسرا چھوڑ دینے سے بہتر تھا کہ انھیں ساتھ لے کے ہی چلیں۔ چھولداریاں، کھانے پینے کا سامان، کدالیں اور سفر کے لیے دیگر ضروری اشیا کا ایک بڑا ذخیرہ ہمیں قبیلے کے لوگوں کے اسباب میں ملا تھا۔ ہم نے وہ سب کا سب اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ ضرورت کے مطابق ہی اُس میں سے کچھ رکھ کے باقی وہیں چھوڑ دیا۔ سورج ڈوبنے میں ابھی دیر تھی کہ ہم وادی سے چل پڑے اور اندھیرا تیز ہونے کے بعد بھی چلتے رہے۔ مشعلوں کی اب ہمارے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ آگے بیشتر نچائی تھی۔ مارثی اور زورا بیٹریاں اور مشعلیں روشن کر کے راستہ دکھاتے رہے۔ جب سردی بہت بڑھ گئی اور بادل چھانے کی وجہ سے اندھیرا گہرا ہو گیا تو ہمیں ٹھہر جانا پڑا۔ لکڑیاں رسّی سے باندھ کے سلطان کے لیے ایک چارپائی نما جھلنگا سا اسٹریچر بنا دیا گیا تھا جس کے آگے پیچھے نکلے ہوئے کنارے قبیلے کے آدمی اُٹھائے ہوئے تھے۔ کبھی ہم بھی اُسے کندھا دے دیتے تھے۔ تشانم اُسی کے سرہانے کے ساتھ بندھی ہوئی چل رہی تھی۔ سہ پہر سے اب تک سلطان کو ہوش نہیں آیا تھا۔ تشانم کے منہ کو چُپ لگ گئی تھی۔ ابا جان کا بھی یہی حال تھا۔ وادی سے چلنے کے بعد وہ بھی سلطان کے اسٹریچر کے ساتھ ساتھ ہی تھے۔

پڑاؤ کی جگہ رُکتے ہی ہم نے سلطان کے لیے ایک علیحدہ خیمہ لگا دیا۔ تشانم اور ابا جان کو اُس کی دیکھ بھال کے لیے وہیں رہنے دیا۔ کسی کو نیند نہیں آ رہی تھی اور کوئی کسی سے نہیں بول رہا تھا۔ رات کو کئی بار ہم لوگ سلطان کو دیکھنے گئے۔ تشانم رات بھر اُس کے بالیں بیٹھی رہی تھی۔ قبیلے کے آدمیوں کو بھی ہم نے ایک الگ خیمے میں بند کر دیا تھا۔ باری باری ایک ایک گھنٹے کے لیے سب پہرا دیتے رہے مگر کسی نے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ صبح ہوتے ہی ہم نے خیمے اکھاڑ لیے اور سامان سمیٹ کے یاکوں پر لاد دیا۔ دوپہر کو سلطان کی حالت کسی قدر سنبھل گئی تھی، اُس نے آنکھیں کھولیں مگر چند لمحے اِدھر اُدھر دیدے گھما کے وہ پھر غافل ہو گیا۔ اُسے تیز بخار چڑھ گیا تھا۔ قبیلے کے لوگوں نے اُس کے لیے کئی بوٹیاں تجویز کیں۔ جامو نے انھیں سلطان کو کھلانے سے پہلے خود قبیلے کے آدمیوں پر اُن کا تجربہ کیا کہ کہیں وہ کوئی دھوکا نہ کر رہے ہوں۔ درمیان میں پڑنے والا رسّیوں کا پل ہم نے سویرے ہی عبور کر لیا تھا۔ دوسرے دن رات تک ہم نے ایک بڑا فاصلہ طے کر لیا تھا اور اُسی سرسبز و شاداب، وسیع و عریض وادی تک آ گئے تھے جہاں سے ہمیں لوٹنا پڑا تھا۔ چلتے چلتے ہنجل کا پیر بھی سوجنے لگا تھا۔ رات کو زورا اور مارثی نے یاک کے مکھن میں نمک ملا کے مالش بھی کی مگر صبح اُس کی تکلیف اور بڑھ گئی تاہم وہ چلتا رہا۔ دوپہر کے کھانے کے لیے ہم ایک جگہ آدھ پون گھنٹے کے لیے ٹھہرے تھے۔ تیسرے د

اندھیرا ہونے تک ہم نے اپنے راستے میں پڑنے والے پہاڑوں کی اور کئی ویرانیں عبور کر لی تھیں لیکن چوتھے دن صبح رات بھر کے پڑاؤ کے بعد صرف ایک میل کے قریب آگے آئے ہوں گے کہ آسمان پر یکایک کالے بادل گھر آئے اور ہم خیمے نصب کرنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر ہی رہے تھے کہ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ سلطان بھی بھیگ گیا۔ ہرچند ہم نے اُس کے اسٹریچر پر فوراً پھول داری ڈال دی تھی۔ خیموں کی میخیں ٹھونکتے ٹھونکتے ہم سبھی شرابور ہو گئے تھے۔ بارش جس تیزی سے آئی تھی، اُسی تیزی سے گزر گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں مطلع صاف ہو گیا اور تازہ دھوپ چمکنے لگی لیکن بجھل نے پھر آگے بڑھنے سے سب کو روک دیا تھا۔ سلطان کے جسم پر کپکپی طاری تھی۔ اسٹریچر کے جھٹکوں اور بارش نے اُس کے رہے سہے اوسان بھی چھین لیے تھے۔ سب اُسے مختلف قسم کی دوائیاں دیتے رہے اور اُس کے گرد ہی بیٹھے رہے۔ سلطان کسی طرح قابو میں نہیں آیا۔ جتنا اُس کا دھیان کرتے، وہ اتنا ہی اور بکھر جاتا۔ پھر اُسی دن شام کو اُس نے نہ جانے کیسے آنکھیں کھول دیں، پٹ پٹاتی پلکوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ تشانم اُس کی نظروں کے سامنے بیٹھی تھی۔ اُس پر نظر پڑی تو مسکرایا۔ پھیکی پھیکی مسکراہٹ۔

"کیا ہے سلطانے؟" بجھل نے بے چینی سے پوچھا۔

"اُستاد!" بمشکل وہ ڈوبتی اور لرزتی آواز میں بولا۔ "اِس کا دھیان رکھنا۔ اب تمھی اس کا..."

"کیا بولتا ہے رے۔" بجھل مضطربانہ اُس کا گال تھپ تھپانے لگا۔

"اپنے پاس وقت نہیں ہے۔" سلطان کی آواز پر غشہ طاری تھا۔

"نہیں رے!" بجھل نے تندی سے کہا۔

معلوم نہیں، بجھل کی آواز اُس کے کانوں میں پہنچی بھی یا نہیں۔ وہ تشانم کو دیکھ رہا تھا اور اُس سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر کئی ٹیڑھی میڑھی لکیریں نمودار ہوئیں اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ تشانم پر آنکھیں جمائے لیٹا رہا۔ دیر تک اُس کی آنکھیں نہیں ہٹیں۔ بجھل نے پھر ہاتھ بڑھا کے اُنھیں خود ہی بند کر دیا۔

تشانم کے سینے سے نہ کوئی آہ بلند ہوئی، نہ اُس کے آنسو نکلے۔ وہ بُت کی طرح ٹکٹکی باندھے بیٹھی رہی۔ سلطان کو جب قبر میں اُتارا جا رہا تھا تو بھی وہ کچھ نہیں بولی۔ اس دوران بجھل، پیرو، جامو اور ابّا جان اُسے تھامے رہے، بازوؤں سے پکڑے، گردن میں ہاتھ ڈالے۔ آنسو اُس کی آنکھوں میں جیسے منجمد ہو گئے تھے۔ سبھی اپنے اپنے طور پر اُس سے کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ مارٹی، ملاکو، زودا، پلیتو، سولم جینی، سارنے اور میں نے بھی اُس سے بہت کچھ کہا لیکن اُس نے جیسے کسی کی بات ہی نہیں سُنی۔ اندھیرا ہونے لگا تھا لیکن ہم نے اُسی کے خیال سے جلدی کی کہ وہ سلطان سے جتنی جلد اور جتنی دُور ہو جائے اچھا ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ کون رہتا ہے۔ مرنے کا مطلب ایک مستقل دُوری ہے۔ سارے رشتے زندگی کے ہیں۔ رات کو ہم نے خاصا آگے جا کے یاکوں سے سامان اُتارا۔ اُس رات کسی نے کھایا پیا نہیں۔ جانگ قبیلے کے آدمیوں کو گوشت کے پارچے، مکھن اور بھنا ہوا اناج دے دیا گیا، وہی اُنھوں نے کھا لیا۔

ہم سب ایک ہی خیمے میں تھے۔ تشانم رات بھر ایک کونے میں ساکت و جامد بیٹھی رہی۔ بجھل اُس کے ماتھے، ہاتھوں اور گالوں کو پیار کرتا تھا، اُسے جھنجھوڑتا تھا مگر تشانم کا بدن سُن پڑا تھا۔ رنگ بالکل سفید ہو گیا تھا جیسے رفتہ رفتہ کوئی اُس کا خون چوستا رہا ہو۔ ساری رات کوئی بھی اُس کے پاس سے نہیں ہٹا۔ نہ بجھل، نہ ابّا جان، نہ پیرو۔ پیرو نے اُس کی دل جوئی کی سب سے زیادہ کوشش کی تھی۔ عمر میں تشانم اُس کی بیٹی گیتا کے برابر ہی ہو گی اور پیرو ہی کی کوشش سے تشانم کی آنکھیں پسیجیں۔ صبح ہونے سے کچھ پہلے پیرو نے اُسے اُٹھا کے اپنے سینے میں بھینچ لیا تھا اور اُس کا بدن گدگدانے لگا تھا۔ تشانم کی آنکھوں سے آبشار سا بہہ نکلا۔ ایسے بلک بلک کے روئی کہ میں نے کبھی کسی کو ایسے روتے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے ساتھ جیسے ہم سبھی کو رونا یاد آ گیا تھا۔

ہم شہزاپول سے بھی آگے بڑھ آئے۔ زاپول کی بستی میں داخل ہونے کے بجائے ہم دور ہی دُور سے راستہ کاٹ کے نکل گئے۔ راستے میں اور بھی کئی بستیاں پڑیں مگر جیسے ہی دُور سے اُن کے نشانات نظر آتے، ہم راستہ بدل دیتے۔ چاہے کتنا ہی چکر کاٹنا پڑتا۔ ندی، نالے، دریا، پل، ستواں پگ ڈنڈیاں۔ گھاٹیاں۔ سلطان کو دفن کرنے کے چار دن بعد تک ہم روز رات کو چند گھنٹوں کے لیے ٹھہر کے مسلسل چلتے رہے۔ جامو کا زخم سوکھ گیا تھا لیکن بجھل کے پیر کی سوجن بڑھتی جا رہی تھی۔ ہم اصرار کر کے اُسے یاک پر بٹھا دیتے اور دن میں دو بار اُس کے پیر پر لیپ کرتے۔ اسی وجہ سے سفر میں کچھ رکاوٹ نہیں پڑی۔ سردی کی شدت بھی کچھ کم ہو گئی تھی اور آگے راستے اتنے پیچیدہ نہیں تھے۔ ساری پیچیدگی ہمارے عام راستوں سے ہٹ جانے کے سبب سے تھی۔ پانچ دن تک تشانم ہمارے ساتھ رہی۔ کھوئی کھوئی سی ساتھ چلتی رہی۔ جب کہتے، اُٹھ جاتی۔ جب کہتے، بیٹھ جاتی۔ جب نظر پڑتی، اُس کی آنکھیں چھلکتی ہوئی دکھائی دیتیں سو ہر کوئی اُس کے چہرے کی طرف نگاہ کرنے سے پہلو تہی کرتا تھا۔ سولم تبتی سے خوب واقف تھا اور تشانم کو چونکہ ہندوستانی ٹوٹی پھوٹی ہی آتی تھی اس لیے بیشتر اُس کے قریب رہتا تھا، سائے کی طرح اُس کے ساتھ لگا ہوا۔ ابّا جان بھی اُس کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور لیں بھی۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ اُسے کچھ قرار آ گیا ہے۔ قرار اُسے ضرور آ گیا تھا لیکن پانچویں دن سہ پہر کے وقت ہم نے دو بلند پہاڑوں کے درمیان رسّیوں کا پل عبور کیا ہی تھا اور پل سے چند قدم آگے آئے تھے کہ تشانم کو اچانک نہ جانے کیا ہوا، وہ واپس دیوانہ وار پل کی طرف بھاگی۔ ملاکو نے اُس کا پیچھا کرنے کی کوشش کی مگر پل تک چند ہی قدم کا فاصلہ تھا۔ تشانم ہزاروں فٹ نیچے گھاٹی میں بہتے ہوئے دریا میں کود گئی۔ مارٹی بھی گرتے گرتے بچا۔ جب تک ہم سب وہاں پہنچے، دریا کی تیز لہریں اُسے بہا کے لے گئیں۔ سب نیچے جھانکتے رہ گئے۔ پیرو نے اپنا منہ کھسوٹ لیا اور ابّا جان سینے میں سر چھپا کے بیٹھ گئے۔

کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ تشانم چلی گئی ہے۔ سب کی نظریں اس طرح بھٹک رہی تھیں کہ شاید ابھی وہ کسی جانب سے واپس آ جائے گی۔ ہم بہت دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔ نیچے گھاٹی میں اُترنا مشکل تھا ورنہ ہم اُسے نیچے جا کے دیکھتے۔ نیچے جانے کا صرف ایک راستہ تھا کہ دریا میں چھلانگ لگا دی جائے۔ ہم اور آگے بڑھ گئے مگر سب کے پیروں کو جیسے زنگ سا لگ گیا تھا۔ گرتے پڑتے اندھیرا ہونے تک ہم پھر ایک جگہ آ کے ٹھہر گئے۔

تشانم بھی اُسی مٹی کی بنی ہوئی تھی جس کی کورا تھی۔ اُس کی بہت سی باتیں کورا سے ملتی جلتی تھیں۔ اُس کے لانبے بال، آنکھیں، پیشانی، اُس کے مسکرانے اور شرمانے کا انداز۔ تشانم کو اگر کورا کی طرح کوئی آسرا ہوتا کہ سلطان واپس آ جائے گا تو وہ کبھی ایسا نہ کرتی، ساری زندگی اُس کا انتظار کرتی رہتی لیکن اُس نے اپنی آنکھوں سے سلطان کو ہمیشہ کے لیے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُسے کورا جیسا کوئی آسرا نہیں رہا تھا۔ کورا کی طرح جھوٹ موٹ کا سہی۔ ہم نے تشانم سے کون سی بات کہنے کی کوشش نہیں کی تھی، جتنی بھی تسلیاں ممکن تھیں، دیتے رہے تھے۔ سب کا خیال تھا کہ اُنھوں نے روٹھی ہوئی تشانم کو منا لیا ہے۔ مجھے شبہ تھا کہ تشانم ایسے کیسے بہل جائے گی۔ جامو نے اُسے اپنی بہن بنا لیا تھا اور کہا تھا کہ اُس کے ہوتے ہوئے اُسے کسی بات کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ ابّا جان اور پیرو اُسے بیٹی بیٹی پکارتے تھے۔ اگر وہ سلطان کے بدلے سب سے کچھ نہ کچھ مانگتی تو جس کے پاس جو کچھ تھا، وہ اُس کے حوالے کر دیتا مگر کیا اس طرح سلطان کی قیمت ادا ہو جاتی۔ قیمتیں تو اُنھی چیزوں کی ہوتی ہیں جنھیں لوگ بیچنے اور خریدنے کے لیے آمادہ ہوں۔ یہاں تو صرف خریدار تھے۔ دُکھ کے بدلے سُکھ کا سودا کرنے کے خریدار، سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ بے شک تشانم کو سلطان کی قیمت مقرر کرنے کا اختیار تھا مگر وہ اُس کی کیا قیمت لگاتی، ہر چیز کی قیمت نہیں ہوا کرتی۔

کورا سے بھی لوگ ایسا ہی کہتے تھے، زہرو نے مجھے یہی کچھ بتایا تھا۔ جیسلمیر میں رانا مہتاب کی پیش کش، ارشد کا پیام اور نہ جانے اتنے عرصے میں کس کس نے کورا کے لیے مولوی صاحب کے آگے خزانے بچھائے ہوں گے اور صرف مولوی صاحب ہی جانتے ہوں گے کہ کورا کو کھلونوں سے قائل کرنا کتنا مشکل ہے۔ لوگ کہتے ہیں، وقت کے ساتھ بہت سی چیزیں بدل جاتی ہیں، عادتیں چھوٹ جاتی ہیں، آدمی زندہ رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ کپڑا نہ ہو تو پتوں سے ستر پوشی کر لیتا ہے، کھانا نہ ہو تو گھاس پھوس کھا لیتا ہے۔ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی بدل مل جاتا ہے۔ آدمی کا بدل بھی مل جاتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو دُنیا کب کی ختم ہو جاتی مگر سب کو نہیں ملتا۔ جن کا نصیب کالا ہو، اُنھیں نہیں ملتا۔ مولوی صاحب نے کورا کے لیے کیا کچھ نہیں کیا ہو گا۔ اُسے پڑھایا لکھایا، اُس کے لیے اپنا گھر بار، اپنا وطن چھوڑ دیا۔ دربدر مارے مارے پھرتے رہے۔ اُنھوں نے کورا کو اپنی دانست میں ہزار تسلیاں دی ہوں گی مگر یہ اُن کی تسلیاں نہیں تھیں جو کورا کی آنکھیں روشن تھیں۔ وہ اُس کی اپنی تسلی تھی۔ وہ اپنے آپ سے بھی تو کچھ کہتی ہو گی، اُس کا دل بھی اُس سے کچھ کہتا ہو گا۔ اُس کا دل کہتا ہو گا کہ میں اُسے کہاں کہاں ڈھونڈ رہا ہوں۔ میری نظریں اسے اپنے بدن پر چبھتی محسوس ہوتی ہوں گی کیونکہ اُس کی نظریں بھی مجھے اپنے اِردگرد محسوس ہوتی تھیں۔

مولوی صاحب نے اُسے جو کچھ بتایا ہو، امکان اِسی بات کا زیادہ ہے کہ اُنھوں نے اُسے میرے مرکھپ جانے کا یقین دلانا چاہا ہو گا۔ وہ میرا آسرا چھوڑ دے، اُن کے خیال میں کورا کو اِسی صورت میں صبر آ سکتا ہے۔ اُنھیں نہیں معلوم تھا کہ کورا نے اُن کی بات کا بالکل یقین نہیں کیا ہے۔ وہ چُپ ہے تو اِس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اُس کے دل میں اُمید کی ساری کونپلیں جل گئی ہیں۔ اُس نے مولوی صاحب سے حجت نہیں کی ہو گی کہ وہ نہیں مانتی۔ بس وہ چُپ ہو گئی ہو گی۔ اتنے عرصے کورا کے ساتھ رہنے کے باوجود مولوی صاحب کو پتہ نہیں چلا تو اور کتنے عرصے نہیں چلے گا۔ آخر وہ تھک جائیں گے اور ایک دن اُنھیں احساس ہو گا کہ اُنھوں نے میری طرف سے بے خبری برت کے کتنا بُرا کیا ہے۔ میرے ذہن میں بار بار یہی بات آتی تھی ورنہ پھر کیا وجہ تھی کہ مولوی صاحب نے کبھی پلٹ کے میری خبر نہیں لی۔ وہ ایسا کر سکتے تھے۔ میں مر تو نہیں گیا تھا اور مر گیا تھا تو اُنھیں کم از کم اس کی تصدیق ضرور کرنی چاہیے تھی۔ وہ میری طرف سے بالکل ناطمئن ہوں گے۔ بجھل نے ایک بار

اشارۃً مجھ سے کہا تھا، لاڈلے! کیا پتہ، مولوی صاحب ابھی تک اُن بھکشوؤں سے خوف زدہ ہوں جو کورا کی تلاش میں سارے ہندوستان میں منڈلا رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کبھی اُن بھکشوؤں سے اُن کا کوئی واسطہ پڑا ہو اور انھیں شبہ ہو کہ مجھ سے رابطہ قائم کرنے کے بعد کورا اتنی محفوظ نہیں رہے گی جتنی اُن کے پاس ہے۔ میں جھل کی بات سن کے خاموش ہوگیا تھا۔ بحث کرنے سے کیا حاصل تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایسا کہنے سے جھل کی مُراد مجھے سمجھانا ہی تھا۔ ایسا تھا تو بھی مولوی صاحب اپنا بوجھ کم کرنے کے لیے میری تلاش ضرور کرتے۔ وہ مجھے تلاش کرنا ہی نہ چاہتے تھے۔ وہ کورا کو اپنے پاس سے جُدا کرنا ہی نہ چاہتے ہوں گے۔ انھیں خدشہ ہوگا کہ کورا پھر اُن سے چھن جائے گی اور یہ سب تو اُن کے اپنے اندر کی باتیں تھیں۔ کورا سے انھوں نے کیا کہا ہوگا۔ میرے نہ آنے کی کیا تاویل دی ہوگی۔ جو کچھ بھی دی ہوگی۔ یہ مولوی صاحب کی بھول تھی کہ انھوں نے جو کہا ہے، کورا نے اُسے قبول کرلیا ہے۔ کورا اپنی تاویل سے قائم تھی۔ اپنے دل کی تاویل سے۔ اور تشانم! وہ کس تاویل پر بھروسا کرتی۔ اُس کے سامنے کوئی پردہ نہیں پڑا تھا۔ وہ خود کو کیا باور کراتی!—

انھی راستوں سے ہمیں ہندوستان میں داخل ہونا تھا جن سے ہم یہاں آئے تھے۔ سرحدی چوکیوں اور بستیوں سے گزر کے نہیں، اور اب کے ہمیں زیادہ احتیاط کرنی تھی کہ ہمارے پاس دُنیا کا بیش قیمت سامان تھا۔ زر و جواہر، لعل و یاقوت، ہزاروں سال پہلے کے برتنوں اور زیوروں سے بھرے ہوئے صندوق۔ آدھے سے زیادہ راستہ ہم نے کسی نہ کسی طرح طے کرلیا تھا۔ ہر دن ہمیں ہندوستان کی سرحد سے اور قریب کردیتا تھا۔ کوئی بیسویں اکیسویں دن پہلی بار ایک بڑا قافلہ ہمیں ہندوستان کی سمت سے آتا نظر آیا۔ ہم آگے بڑھنے کے بجائے ٹھیر گئے اور قافلے کے کچھ قریب ہونے کا انتظار کرنے لگے مگر وہ سب بھکشو تھے جو اپنے مخصوص لباس کے باعث دُور سے پہچانے جاتے تھے۔ ویسے تو کوئی بات نہیں تھی لیکن ہمارے ہمراہ جانگ قبیلے کے چار آدمی اور ایک تبتی قلی تھا۔ ایک آدمی کو حکم عدولی پر جامو نے گولی مار دی تھی۔ قافلے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے وہ شور مچا سکتے تھے۔ زورا، ہلاکو اور سُولم نے انھیں اُس کے سامنے ہی نہیں ہونے دیا۔ وہ تینوں فوراً انھیں دُور لے گئے۔ ابا جان کی وجہ سے قافلے کے بھکشو کچھ دیر کے لیے رُک گئے۔ ابا جان اور اُن کے درمیان چند جملوں کا تبادلہ ہوا۔ انھوں نے ہماری خیریت بھی پوچھی اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ہم نے سکون کی سانس لی۔ ہوسکتا تھا کہ آگے جاکے اُن سے کوئی ہمارے بارے میں استفسار کرتا لیکن ہماری گنتی کم تھی۔ ابا جان ہمارے ہمراہ تھے اور اس دوران ہمارے حلیے یکسر بدل گئے تھے۔ چہرے پر داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں۔ انھیں دیکھ کے ہم نے بندوقیں پہلے ہی چھپا دی تھیں۔

اس سے پہلے بھی راستے میں اکا دکا چھوٹے موٹے قافلے ٹکرائے تھے مگر اُن کے سامنے وہ ایک لفظ نہیں بولے۔ انھیں اندازہ تھا کہ ہماری بندوقیں اور تمنچے اُن کی کسی بھی آواز پر چلنے لگیں گے اور صرف وہی نہیں جائیں گے، قافلے کے لوگ بھی ختم ہوجائیں گے۔ انھیں یہ بات پہلے بتا بھی دی گئی تھی۔ بھکشوؤں کا قافلہ بہت بڑا تھا اور ویسے بھی اُن پر بندوق اُٹھاتے ہوئے ہمارا جھجکنا لازم تھا اسی لیے ہمیں انھیں ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل کرنا پڑا کہ وہ اس موقع سے کوئی فائدہ اُٹھانے کی غلطی نہ کریں۔

ڈیڑھ مہینے کی مسلسل مسافت کے بعد ہم ہندوستانی سرحد کے خاصے نزدیک ہوگئے۔ قبیلے کے آدمی اور قلی ہمارے ساتھ تھے لیکن انھیں مزید آگے لے جانا مناسب نہیں تھا مگر ہمیں اُن کی اب بھی ضرورت تھی۔ وہ وقت آپہنچا تھا جب ہمیں اُن کے بارے میں کوئی نہ کوئی فیصلہ کرلینا تھا۔ جامو کی رائے تھی کہ انھیں مار دیا جائے۔ ہلاکو، جینی، مارش اور سارٹے بھی اُس کے ہم نوا تھے۔ جھل بیچ میں نہیں بولا۔ پیرو نے منع کردیا اور انھیں اپنے ساتھ ہی رکھا مگر دوسرے دن جیسے ہی ایک گہری گھاٹی پر نظر پڑی، پیرو نے ہمیں ٹھیر جانے کا حکم دیا۔ قبیلے کے آدمیوں اور قلی کو رسیوں سے باندھ کے یکے بعد دیگرے نیچے گھاٹی میں اُتار دیا گیا۔ کدالیں، میخیں، ایک خیمہ، مشکیزے اور سفر کا ضروری سامان بھی اُن کے اُترنے کے بعد نیچے چھوڑ دیا گیا۔ ہزاروں فٹ گھاٹی کی تہہ سے انھیں اوپر چڑھنے اور کسی قریبی بستی پہنچنے میں کئی دن لگتے اور اس دوران ہم کب کے تبت کی سرحد پار کرچکے ہوتے۔ انھیں ایسے چھوڑ دینے پر کوئی بھی تیار نہ ہوتا، اگر ہمیں یہ اندیشہ ہوتا کہ وہ ہمارے سامان کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ وہ صندوق میں بھری ہوئی چیزوں کے متعلق قطعاً لاعلم تھے۔ جس وقت بڑے مندر کے تہہ خانے سے نکل کے راتوں رات ہم اُس مقام پر پہنچے تھے جہاں سُولم ہمارا انتظار کر رہا تھا تو ہم نے اپنی جیبوں اور تھیلوں میں بھرا ہوا سامان اُس کے ساتھ لائے ہوئے صندوقوں میں منتقل کرتے وقت اس بات کی خاص احتیاط کی تھی کہ تینوں قلی اُسے نہ دیکھ پائیں۔ انھیں اِس دوران دُور رکھا گیا تھا۔

اونچے پہاڑوں کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا مگر سردی میں بتدریج کمی ہو رہی تھی۔ دن میں ہم اپنے اوورکوٹ اُتار دیتے تھے۔ سردی کا موسم بھی بدل گیا تھا۔ راستے میں باری باری سبھی بیمار پڑے تھے۔ سب کے بدن کی کھال جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ منہ کھولتے ہوئے ہونٹ دکھتے تھے، رات کو لیٹتے تو رگیں تڑخنے لگتیں۔ ابا جان بہت کم کسی سے بولتے تھے، مجھ سے بھی نہیں۔ تقریباً سبھی کے منہ سلے ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھ اب کوئی رہبر نہیں تھا۔ صرف ایک اندازہ تھا کہ ہم سرحد کے قریب ہو رہے ہیں، سرحد اب آیا ہی چاہتی ہے۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ کہیں بھی سرحدی بستیوں کے آثار نظر نہیں آئے۔ اُس وقت ہمیں راستہ بھٹک جانے کا شبہ ہوا۔ اب تک ہم بستیاں کاٹ کاٹ کے گزر رہے تھے مگر اب ہمیں خود اُن کی تلاش تھی۔ اونچائی سے ہم چاروں طرف نظریں دوڑاتے رہتے کہ کہیں انسانی زندگی کے نشانات دکھائی دے جائیں۔ کئی دن تک ہم اِسی تگ و دو میں رہے۔ اس عرصے میں کسی بھی قافلے سے ہمارا آمنا سامنا نہیں ہوا۔ یقیناً ہم کسی ویران جگہ آگئے تھے۔ یہاں سبزہ بھی برائے نام تھا اور آگے دُور تک عموماً چٹیل پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جن پر کہیں کہیں برف پڑی ہوئی تھی۔ اگر سرحد اتنی ہی دُور تھی تو ہمیں قبیلے کے آدمیوں اور قلی کو گھاٹی میں نہیں اُتارنا چاہیے تھا۔ شاید انھوں نے ہی ہمارا رُخ کسی دوسرے راستے کی طرف موڑ دیا تھا لیکن سمت کی پہچان مشکل نہیں تھی۔ ابا جان کے پاس قطب نما کی ایک چھوٹی ڈبیا تھی۔ سورج سے بھی سمت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ ہم نے اپنے اندازے کے مطابق جنوب کی سمت سفر جاری رکھا اور زمین جیسے ہمارے پیروں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی گئی۔ ہر سُو پہاڑ ہی پہاڑ، میدانوں کو دیکھے ہوئے مہینے گزر گئے تھے۔ سب کی رفتار تیز تھی۔ ہندوستان کی سرحد نزدیک آنے کے خیال سے سبھی کے قدم اُٹھ رہے تھے لیکن ایسا لگتا تھا، یہ پہاڑ کبھی ختم نہیں ہوں گے، ساری زندگی ہم انھی کے گرد گھومتے رہیں گے۔ سامنے جب کوئی اونچا پہاڑ دیوار بنا کھڑا نظر آتا تو جی چاہتا، برمے سے اِس میں سوراخ کردیں۔ ایک مختصر فاصلہ طے کرنے کے لیے ایک پہاڑ کے کئی چکر کاٹنے پڑتے تھے، تب کہیں وہ سامنے سے ہٹتا تھا مگر اُس کے ہٹتے ہی دوسرا سامنے آجاتا تھا۔ تبت کی پہلی سرحدی چوکی کا نام ساما تھا اور اُس کے پاس بہت سی چھوٹی بڑی بستیاں آباد تھیں۔ ساما یا کسی دوسری بستی کی دُور دُور تک کوئی علامت موجود نہیں تھی۔ قبیلے کے لوگوں کو جدا ہوئے دس روز سے زیادہ ہوچکے تھے۔ ہم چلتے رہے۔ چلنے ہی کی صورت میں کوئی بستی ملنے کا امکان تھا اور آخر گیارھویں روز بلندی سے مشرقی نشیب میں واقع ایک چھوٹی بستی ہم نے ڈھونڈ ہی لی۔ کسی سیاح کو دنیا کا کوئی نیا خطہ دریافت کرنے کی اتنی خوشی اور حیرت نہیں ہوئی ہوگی جتنی ہمیں گنتی کے چند مکانوں پر مشتمل وہ بستی دیکھ کر ہوئی۔ سب لوگ آگے جا کے رُک گئے اور سُولم اور پیرو تقریباً بھاگتے ہوئے بستی کی جانب بڑھے۔ جب تک وہ نہیں لوٹے، ہم اُن کا بے چینی سے انتظار کرتے رہے اور جب وہ لوٹے تو اکیلے نہیں تھے، اُن کے ہمراہ یاکوں کے ساتھ چار آدمی بھی تھے۔ یقیناً وہ قلی ہی ہوسکتے تھے اور وہ قلی ہی تھے۔ انھی کے ذریعے ہمیں معلوم ہوا کہ ہم آسام کی طرف جانے کے بجائے جنوب مغرب میں بھوٹان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ بھوٹان کا سارا علاقہ عبور کرکے ہی ہندوستان میں داخل ہوا جاسکتا تھا۔ وہ جگہیں اور وہاں کے لوگ ہمارے دیکھے بھالے نہیں تھے۔ بھوٹان زیادہ دُور نہیں رہ گیا تھا لیکن ہم نے قلیوں کو آسام کی سرحد کی جانب چلنے کو کہا۔ انھیں ایک بڑے معاوضے کی پیش کش کی گئی تھی اور کچھ رقم پیشگی بھی دے دی گئی تھی۔ ساتھ ہی اُن سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر وہ ساما کی سرحدی چوکی تک ہمارے ساتھ چلیں گے تو ہم اپنا بچا ہوا تجارتی سامان اور چند یاک بھی اُن کے حوالے کردیں گے۔ وہ آنا کانی کر رہے تھے لیکن ابا جان کا اصرار کارگر ثابت ہوا، وہ مان گئے۔ آیندہ ایک ہفتے کی مسافت سے ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم کتنے مختلف راستے پر اپنی منزل سے کتنی دور چلے گئے تھے۔

ایک ہفتے بعد جب قلیوں نے ہمیں بتایا کہ ساما کی سرحدی چوکی اب ایک دن کے فاصلے پر رہ گئی ہے تو سب ایک دوسرے کو ناقابلِ یقین نظروں سے دیکھنے لگے۔ گویا چند میل کے فاصلے پر ہندوستان تھا۔ دو یا تین دن کا سفر۔ سبھی کی بجھی ہوئی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ ہم نے قلیوں سے کہہ دیا تھا کہ ساما آنے سے کچھ دُور پہلے ہی وہ ہمیں مطلع کردیں۔ اب تک ہم نے انھیں نہیں بتایا تھا کہ ہندوستان میں واپس ہونے کے لیے ہمارے پاس راہداری کا باقاعدہ پروانہ نہیں ہے ورنہ وہ شروع ہی میں آئیں بائیں شائیں کرتے۔ ابا جان کا کچھ نہیں تھا۔ بھکشو پروانۂ راہداری کی قید سے آزاد تھے۔ جیسا کہ ہمیں توقع تھی، یہ سن کے قلی منہ بنانے لگے اور انھوں نے پروانے کے بغیر ہمیں آگے لے جانے سے صاف انکار کردیا۔ یہاں تک آکے ہم اُن سے کوئی ضد بھی نہیں کرسکتے تھے۔ بستیاں قریب تھیں اور ہمارا کوئی بھی ناروا عمل ہمیں اُن کی نظروں میں مشکوک کرسکتا تھا۔ جاتے وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ پروانے

کے بغیر قلی بڑی مشکل سے ہمیں تبت میں داخل کرانے کے لیے تیار ہوئے تھے۔ ہم نے اُنھیں ایک بڑی رقم کی پیش کش کی اور اپنے تمام کے تمام یاک اور ایک بندوق بھی اُن کے حوالے کردینے کا وعدہ کیا۔ پچھلے تجربے کے مطابق ہمیں اندازہ تھا کہ اُن کا انکار ہماری طرف سے محض رقم میں مزید اضافے کے لیے ہے۔ وہ انکار کرتے رہے اور جب اُنھیں یہ یقین ہو گیا کہ اب ہم اس سے زیادہ نہیں بڑھیں گے تو وہ چُپ ہو گئے۔

ہم ساما نہیں گئے بلکہ کچھ پیچھے لوٹ کے ایک جانب پہاڑوں پر چڑھنے لگے۔ ایک دن، دو دن، تین دن، پورے پانچ دن بعد ہمارے ڈگمگاتے قدم ہندوستان کی زمین چھو رہے تھے۔ ہم ہندوستان کی پہلی سرحدی چوکی والنگ کے اطراف گھومتے ہوئے اُس سے کچھ آگے ساتی نامی ایک قصبے کے گرد و نواح میں آ گئے تھے۔ ساتی سے ہم پہلے بھی گزر چکے تھے۔ یہاں دُہری شہریت کے لوگ رہتے تھے۔ جُز وقتی تبتی، جُز وقتی ہندوستانی۔ ہم ساتی کی بستی میں بھی نہیں گئے۔ قلیوں نے ہمیں وہاں چھوڑ کے واپس جانا چاہا تھا۔ ہم نے اُنھیں کسی نہ کسی طرح اور آگے چلنے پر آمادہ کر لیا اور دو دن کی مزید مسافت کے بعد وہ ہمیں قصبہ من زانگ کے علاقے میں لے آئے۔ ہمیں یاد تھا کہ من زانگ سے دوسری منزل قصبہ موچی ما کا فاصلہ تقریباً آٹھ میل کے برابر ہے اور ان آٹھ میلوں میں بڑے پاٹ کے دریا، گھاٹیاں، اُونچی چوٹیاں، کیڑے مکوڑے، جنگلات اور درندوں کی کثرت ہے۔ چن وتی سے ہمیں جیپیں مل سکتی تھیں۔ قلی من زانگ سے آگے بڑھنے پر قطعاً تیار نہیں تھے لیکن اُن کے بعد بار برداری کے لیے خچروں اور نئے قلیوں کی تلاش میں ہمیں مجبوراً قصبہ من زانگ میں داخل ہونا پڑتا۔ خچروں اور یاکوں کے بغیر آٹھ میل کا یہ دشوار گزار راستہ طے کرنا ہمارے لیے ناممکن تھا۔ قلی ہماری کمزوری سے خوب واقف تھے۔ سامان تو ہم کسی طرح اپنے کندھوں پر اُٹھا لیتے مگر تجمل کے لیے پیر کی سوجن کی وجہ سے زیادہ دُور چلنا نقصان دہ ثابت ہوتا۔ وعدے کے مطابق ہمیں اپنے تمام یاک اُن کے رخصت ہونے پر اُن کے حوالے کر دینے تھے۔ جامو کو اُن پر غصہ آ رہا تھا۔ پیرو نے اُسے تھامے رکھا اور جھول داریاں، کدالیں، خیمے، باقی بندوقیں، گرم کپڑے اور مزید نقدی کے معاوضے پر اُنھیں ہموار کر لیا۔ قلیوں کو بھی واپس جانے کی جلدی تھی۔ اُنھوں نے ہمیں ایک ہی دن میں من زانگ سے چن وتی پہنچا دیا۔ جس وقت ہم چن وتی کی سرزمین میں داخل ہوئے، سورج چمک رہا تھا۔ گُنگنی سی ہوا چل رہی تھی۔ اجنبی اجنبی سی ہوا۔ جسم چھپائے جاتے تھے۔ ہمارے سامنے کچھ فاصلے پر لکڑی اور بانس کے مکانات کے جھنڈ تھے مگر ہم اُن سے دُور ہی رہے۔

سب کے پیر جیسے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ مارٹی نے قلیوں کو اپنی گھڑی بھی دے دی۔ سردی بے حد کم ہو گئی تھی۔ ہم نے جتنی چیزوں کا اُن سے وعدہ کیا تھا، اُس سے بڑھ کر جو کچھ ہمارے پاس زائد تھا، سب اُن کے سپرد کر دیا۔ یوں بھی ہمیں اپنا سامان کم کرنا تھا۔ قلیوں کے جانے کے بعد اور جیپوں کی تلاش میں نکلنے سے پہلے ہم نے اپنے حلیے ٹھیک کیے۔ سب نے شیو کیا، ایک دوسرے کے بالوں کی لٹیں قینچی سے تراشیں اور نئے کپڑے بدل لیے۔ ابا جان نے بھی اپنا بھکشوؤں کا لباس اُتار دیا۔ اُن کے پاس کوئی اور لباس نہیں تھا۔ میرا کُرتا، پاجامہ اور صدری پہن کے اُنھوں نے اُوپر سے بنڈی پہن لی۔ زرّیں نے یہ سارے کپڑے اپنے ہاتھوں سے سیے تھے۔ سورج ڈوبتے وقت جیپیں ملنا ممکن نہیں تھا اس لیے ہم نے سُولم اور جامو کو جلد سے جلد آگے روانہ کر دیا اور خود اپنے سروں پر صندوقوں کا بوجھ اُٹھائے چن وتی کی بستی کی طرف بڑھنے لگے۔ مجھے یقین تھا کہ میری طرح سبھی کے دل دھڑک رہے ہوں گے۔ ابھی ہم بستی کے کنارے پہنچے تھے کہ سُولم اور جامو واپس ہوتے دکھائی دیے۔ اُن کے ساتھ خچر اور قلی تھے۔ کچھ پوچھنا بیکار تھا۔ اُنھیں جیپیں نہیں مل سکی ہوں گی۔ ہم نے سامان خچروں پر لاد دیا۔ چن وتی سے اگلا قصبہ نالا سات میل کی دوری پر تھا مگر وہاں پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو گیا۔ قلی اندھیرے کے باوجود ہمیں بستی تک پہنچانے کے لیے تیار تھے لیکن پیرو نے اُنھیں روک دیا۔ اُسے بدھوں کا ایک مندر نظر آ گیا تھا۔ بستی میں جانے سے بہتر تھا کہ رات ہم مندر کی عمارت میں گزار دیں۔ پھر قلی بھی ہمارے ساتھ ٹھہر گئے۔ ابھی صبح پوری طرح نمودار نہیں ہوئی تھی کہ جامو اور سُولم کسی سے کچھ کہے بغیر پھر جیپوں کی تلاش میں نکل گئے۔ واپس آئے تو اُن کے ساتھ دو جیپیں تھیں۔ نالا سے قصبہ موچی ما، پھر سارما، تھرونال پانگ، پھر ونگ انگ۔ تین دن بعد کہیں خچروں، کہیں جیپوں کے ذریعے شب و روز سفر کرتے ہوئے قصبہ دری ای میں آ کے ہم نے دم لیا مگر بس دم لینے کی حد تک۔ ہمیں معلوم تھا کہ دری ای میں ہندوستان کے پولی ٹیکل ایجنٹ، انٹیلی جنس افسر اور ٹریڈ ایجنٹ کے دفاتر موجود ہیں اور پولیس اسٹیشن بھی۔ صندوقوں میں بھرے ہوئے سامان کی وجہ سے ہمیں خود کو چھپائے رکھنا پڑ رہا تھا۔ زیادہ احتیاط میں بھی اندیشے تھے، کوئی بھی شک کر سکتا تھا۔ چن وتی سے جتنے قلی اور ڈرائیور ہمیں ملے، ہم نے اُنھیں یہی بتایا کہ ہم انھی قصبوں کے اطراف تجارت کی غرض سے گھوم رہے

تھے۔ اب واپس اپنے گھروں کو جا رہے ہیں اور ہم دو قافلے ہیں جو چن وتی میں اتفاق سے ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ ہم نے اپنے چہروں، لباس اور انداز سے طویل سفر کے نشانات مٹا دینے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ بہرحال اُنھیں ہم پر شک نہیں ہوا۔ ہم پر نہ ہمارے سامان پر، اور جیسے جیسے ہم پہاڑی علاقوں سے میدانی علاقوں کی طرف بڑھتے گئے، ہمارے اندیشے بھی کم ہوتے گئے لیکن کسی قدر اطمینان سب کو اُسی وقت حاصل ہوا جب ہم نے تن سکیا ریلوے اسٹیشن پر کلکتے جانے کے لیے ریل گاڑی میں قدم رکھے۔

ساری بندوقیں قلی لے گئے تھے، تمنچے، چاقو البتہ ہماری جیبوں میں موجود تھے۔ چیکنگ، پولیس والوں اور مسافروں کی نظروں سے بچنے کے لیے ہم نے فرسٹ کلاس کے ٹکٹ لیے تھے حالانکہ ہمارے کپڑے فرسٹ کلاس مسافروں جیسے نہیں تھے۔ کاش ہمیں کسی مقام پر اپنے صندوق سوٹ کیسوں سے بدلنے اور نئے کپڑے بنوانے کا وقت مل جاتا مگر کسی جگہ زیادہ دیر تک ٹھہرنا ہمارے لیے مناسب ہی نہیں تھا۔ جلد سے جلد سرحد سے دُور، انسانوں کی بھیڑ میں گم ہو جانا ہی قرینِ مصلحت تھا۔ اگر صندوق میں وہ سامان نہ ہوتا جو اب موجود تھا تو ہمیں قدم قدم پر یہ احتیاط کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک ڈبے میں بیٹھنے کے بجائے ہم دو ڈبوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ تجمل، ابا جان، میں، بلاکو، مارٹی اور سارٹے ایک ڈبے میں، دوسرے میں پیرو، جامو، پلٹو، سُولم، زورا اور جینج۔ لگ بھگ چھ مہینے ہو رہے تھے۔ چھ مہینے بعد ریل گاڑیاں، اسٹیشن، بجلی، قسم قسم کی اشیا، طرح طرح کے لوگ، بھاگتے چیختے چلاتے ہوئے آدمی پھر ہماری نظروں کے سامنے تھے۔ ہر طرف شور ہی شور۔ قصبہ دری ای میں بہت دنوں بعد ہم نے ہندوستانی طرز کا کھانا کھایا تو مرچوں سے منہ جل گیا۔ دودھ میں کھولتی ہوئی چائے کا ذائقہ بھی میٹھا میٹھا سا تھا۔ سب کچھ بدلا بدلا، نیا نیا سا تھا جیسے ہم کسی نئی دُنیا میں آ گئے ہوں یا ہم نے دوسرا جنم لیا ہو۔ مجھے اپنے ہر طرف پتنگے سے اُڑتے محسوس ہو رہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے میں سیدھا کورا کے پاس جا رہا ہوں۔ میری اُنگلیاں بے اختیار گردن میں پڑی اُس کی دی ہوئی مالا کے دانے ٹٹولتی تھیں اور ہر لمحے مجھے گمان ہوتا تھا کہ میری مالا کھو گئی ہے۔ اُس کی کوئی ایک ایسی چیز تو میرے پاس موجود تھی جسے میں چھو سکتا تھا۔ جب بھی مالا کے دانوں سے میری اُنگلیاں مَس ہوتیں، لگتا جیسے اُس کے ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہیں اور وہ میرے سینے سے لگی ہے، مجھے ٹوک رہی ہے، ٹہوکے مار رہی ہے، میں سو گیا ہوں تو مجھے جگا رہی ہے، وہ میرے سامنے کھڑی ہے۔ بس میں اُسے دیکھ نہیں سکتا لیکن میں اُسے چھو سکتا ہوں۔ میں اندھا یہ خواب ہی دیکھتا رہتا تھا۔

ہر لمحہ ہمیں کلکتے سے قریب کر رہا تھا، میری طرح ہر کوئی لمحے گن رہا ہو گا۔ گاڑی کسی بڑے اسٹیشن پر ٹھیرتی تو کبھی وہ دوسرے ڈبے سے ہمیں پوچھتے آ جاتے، کبھی میں، مارٹی، بلاکو، سارٹے اُن کے پاس چلے جاتے۔ سارٹے کو کلکتے پہنچنے کی سب سے زیادہ بے کلی تھی۔ کہتا تھا جب ہم اچانک اڈے پہنچیں گے تو کانتے اور کبن خاں حیران رہ جائیں گے۔ اتنے دن ہو گئے تھے، اُدھر اڈے پر وہ سب نہ جانے کیا سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم کبھی لوٹ کے آئیں گے بھی یا نہیں۔ تجمل نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ اُس کا ارادہ کس طرف جانے کا ہے مگر اُس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ واپس آنا نہ آنا اتفاق ہے، ایک حادثہ۔ اُنھیں معلوم تھا کہ اُس نے بارہ آدمی اُن لوگوں میں سے منتخب کیے تھے جن کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو، جن کے پیر بندھے ہوئے نہ ہوں۔ تمنچوں اور بندوق کی مشقیں، جانے سے پہلے تجمل کا دن دن بھر اڈے سے باہر رہنا، اُنھیں یہ سب باتیں یاد آتی ہوں گی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اُن کی پریشانی بھی بڑھتی رہی ہو گی۔ سب ایک دوسرے کا منہ تکتے ہوں گے کہ ہماری کوئی خیر خبر ملی؟ ہمیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟ کانتے کے نام زرّیں کے روز نہیں تو ہفتے میں ایک دو بار ضرور خط آتے ہوں گے۔ کانتے اُلٹے سیدھے جواب دیتا ہو گا۔ بمبئی سے جولین اور چمپا کے خط بھی اُس کے نام آتے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے، وہ جولین، اُس کی ماں اور چمپا بیگم کو فیض آباد ہی لے آیا ہو۔ کہتا تھا کہ استاد ناراض ہوں گے مگر ایک بار جب جولین فیض آباد آ ہی جائے گی تو استاد اُسے بمبئی واپس نہیں بھیج دیں گے۔ اگر کانتے واقعی اُسے فیض آباد لے آیا ہے تو حویلی میں ہر وقت ایک ہنگامہ رہتا ہو گا۔ منیر علی، زہرہ، سلمٰی، محمد میاں، ارشد، خانم، نیساں، جہاں گیر، روز ڈاکیے کا انتظار ہوتا ہو گا۔ نیساں پانچوں وقت مصلے پر بیٹھی دعائیں کرتی ہو گی، الٰہی! بابر بھائی کو سلامت رکھنا، اُنھیں کامیاب و کامران لوٹانا۔ اِس عرصے میں نیساں اور بڑی ہو گئی ہو گی۔ جہاں گیر نے بھی میٹرک کا امتحان پاس کر لیا ہو گا۔ نہ جانے کیا کیا بدل گیا ہو گا۔ منیر علی فیض آباد میں رہ سکے یا نہیں، واپس جیسلمیر جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا لیکن اگر رانا مہتاب کے آدمیوں کو اُن کا کوئی پتہ مل گیا ہو! میرے دماغ میں سب کی شکلیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ سینہ بھی بند ہونے لگتا، کبھی جیسے اس کے سارے دروازے کھل جاتے اور روشنی سی بھر جاتی۔

گاڑی تیز رفتاری سے بنگال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سب اپنی

نشستوں پر جمے کہیں گم تھے۔ بجھل کو نچلی برتھ پر لٹا دیا گیا تھا۔ اُس کے پاؤں میں تکلیف کچھ زیادہ ہی تھی۔ چہرے سے اس کا اظہار نہیں ہوتا تھا مگر اُس کی خاموشی بتا رہی تھی کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے اُس کے پیر اپنے زانوؤں پر رکھ لیے تھے۔ میرے مقابل ابا جان کھڑکی کی طرف منہ کیے گھومتی ہوئی زمین دیکھ رہے تھے۔ کر ڈبے کی دیوار سے ٹکی، آنکھیں خالی خالی، پیشانی پر شکنیں، معلوم نہیں کہاں کھوئے ہوئے تھے، تجسّس کہیں ترتیب نہیں لاتا تھا۔ میرا خیال تھا گاڑی میں بیٹھ مجھے اپنے پاس بلا کے ضرور پوچھیں گے کہ تو اتنے دن کہاں رہا، یہ لوگ کون ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں انھوں نے کوئی رائے ضرور قائم کی ہوگی۔ اتنے دن ساتھ رہنے کے بعد کوئی بات اُن سے ڈھکی چھپی نہیں رہی ہوگی مگر انھوں نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ سارے سفر کے دوران انھوں نے مجھ سے بہت کم بات کی تھی۔ ہاں مجھے دیکھتے ضرور رہے تھے۔ بارہا میرے دل میں آیا، اُن سے پوچھوں وہ فریال، فرخ، فارحہ اور اکبر کو کس کے پاس چھوڑ کے آئے ہیں لیکن ڈر لگتا تھا، نہ جانے کون سا جواب سننے کو ملے، اُن کے پاس بتانے کو کچھ ہو نہ ہو۔ شاید بجھل نے اُن سے کچھ پوچھا ہو۔ وہ دونوں آپس میں کبھی کبھی چپکے چپکے باتیں کرتے رہتے تھے۔ ممکن ہے بجھل نے انھیں بتایا ہو کہ اُن کی خواہش کے مطابق میں نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا تھا۔ وہ یہی چاہتے تھے کہ میں بہت پڑھوں لکھوں اور بڑا افسر بن جاؤں۔ شاید بجھل نے اُن سے نہیں کہا کہ میں نے قتل کے جرم میں سات سال جیل کی سزا کاٹی ہے، مجھے بہت اچھا چاقو چلانا آتا ہے۔ بلّم بھی، لاٹھی بھی۔ تیغا چلاتے ہوئے تو انھوں نے خود ہی دیکھ لیا ہوگا۔

مجھے احساس ہوتا تھا، ممکن ہے وہ اپنی جھجک کی وجہ سے مجھ سے توقع کرتے ہوں کہ میں اُن سے فتی، فریال، فرخ، فارحہ اور اکبر کے بارے میں پوچھوں گا۔ ممکن ہے سوچتے ہوں کیسا بھائی ہے جسے اپنی بہنوں اور بھائی کے نام بھی یاد نہیں رہے ہیں۔ بھائی اُن سے کیا کہتا، اگر اُس نے فتی کو بھوکی نظروں کے درمیان بیٹھا نہ دیکھا ہوتا تو کسی اور کے بارے میں پوچھتے ہوئے اُس کی ہمت یوں جواب نہ دے جاتی۔ غالباً ہم دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں خود ہی جواب نظر آتے رہیں تو ٹھیک ہے۔ میں نے بجھل سے یہ معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی کہ وہ کلکتے جا کے ٹھہر جائے گا یا سیدھا فیض آباد جانے کا ارادہ ہے جہاں جہاں گیر ہے۔ ابا جان اُسے دیکھنے کے لیے بے چین ہوں گے۔ ایک مدت بعد وہ اُن کے سامنے آئے گا تو اُن کا کیا حال ہوگا اور جہاں گیر بھی سکتے میں رہ جائے گا۔ ہو سکتا ہے بجھل نے اُن سے کہا ہو کہ دو چار دن کلکتے میں ٹھہر کے پھر فیض آباد چلیں گے۔ بہرحال ابا جان کو معلوم ہوگا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور اُن کے ذہن میں آگے کے بھی خاکے ہوں گے۔ وہ فیض آباد میں رہیں گے یا کہیں اور۔ اب اُن کا اپنا کوئی گھر نہیں ہے۔ ظاہر ہے، اب وہ گیا تو نہیں جائیں گے اور زرّیں انھیں کیوں جانے دے گی۔ حویلی میں جا کے ابا جان سب سے زیادہ اُسی کو پسند کریں گے۔ وہ اُن کا اسی طرح خیال رکھے گی جس طرح بجھل کا۔ شاید وہ دوسروں کا خیال رکھنے ہی کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ فتی کی بہت سی خصوصیات اُس میں موجود تھیں۔ ابا جان نے فتی کو کھو دیا مگر زرّیں سے مل کے بڑی حد تک فتی کا ازالہ ہو جائے گا مگر یہ سب میرے اپنے ذہن کے خیال تھے۔ میں ابا جان کے دل میں چھپا نہیں بیٹھا تھا۔ نو سال میں انھوں نے بہت سے خواب دیکھے ہوں گے۔ اب ان کی تعبیر کا وقت آیا ہے۔ اتنی بڑی دولت سے وہ کیا کیا خریدیں گے۔ محلات، جاگیریں، کوئی ریاست۔ ان پتھروں سے وہ اپنے خوابوں کی کیسی کیسی تعبیریں تراشیں گے۔ اُن کا شمار دُنیا کے مال دار ترین لوگوں میں ہونا چاہیے۔ اب خزانہ اُن کے ساتھ تھا اور وہ خزانے کے ساتھ۔

بجھل آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ ساری رات گزر گئی۔ ابا جان تھوڑی دیر کے لیے لیٹے، پھر اُٹھ کے بیٹھ گئے۔ وہ کھڑکی سے کبھی کبھی نظر اُٹھا کے میری طرف دیکھ لیتے۔ رات کو انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں بھی لیٹ جاؤں مگر مجھے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ میں رات بھر بیٹھا رہا۔ صبح سویرے گاڑی نیو کوچ بہار سے ایک میل تک آئی ہوگی کہ اچانک رک گئی۔ ہم نے دروازہ کھول کے دیکھا۔ گاڑی دونوں طرف سے پولیس نے گھیر لی تھی۔ ابھی گاڑی ٹھیرے چند لمحے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ ایک پولیس افسر دو سپاہیوں کے ساتھ ہمارے ڈبے میں داخل ہوا۔ پہلے اُس نے انگریزی میں دخل اندازی کی معافی چاہی لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے ہی اُس نے ہماری صورتیں دیکھیں، صورتیں کیا لباس دیکھے تو ناک بھوں چڑھا کے بولا "تم لوگوں کے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہے؟" اُس نے انگریزی میں کہا۔ اُس کی نگاہیں ہمارے چہروں اور سامان پر مچل رہی تھیں۔ اُسے یقین نہیں تھا کہ ہمارے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہوگا۔

"بابو کیا گٹ پٹ کرتا ہے رے؟" بجھل نے بوجھل آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"ٹکٹ کو پوچھ رہے ہیں۔" میں نے ترشی سے جواب دیا۔ مجھے پولیس افسر کے لہجے پر غصہ آ رہا تھا۔ اُس کی نظروں میں حقارت تھی۔ "ہمارے پاس ٹکٹ ہیں۔" میں نے آہستگی سے انگریزی میں کہا۔

مجھے انگریزی میں بات کرتے دیکھ کے وہ چونکا ہوا اور جھجک کے بولا "دکھاؤ۔" اُس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا تھا۔

میں نے سوچا، کہوں دکھاتے ہیں مگر پہلے بات کرنے کی تمیز سیکھو۔ میں چپ رہا۔ بجھل نے اپنی جیب سے ٹکٹ نکال لیے تھے۔ "دکھاوے بابو صاحب کو۔"

میرے ہاتھ سے ٹکٹ لینے کے باوجود اُس کا شک کم نہیں ہوا۔ اُلٹ پلٹ کے کبھی ٹکٹ کو دیکھتا، کبھی ہمیں، کبھی سامان کو۔ "ٹھوک بجا کے دیکھ لو، جعلی نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ لوگ کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"ٹکٹ میں لکھا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"ہوں!" وہ سر ہلانے لگا اور کچھ توقف کے بعد متجسس انداز میں بولا "آپ لوگ کیا کرتے ہیں؟"

"کیا ٹکٹ کے ساتھ یہ سب بتانا بھی ضروری ہے؟"

"نہیں۔ اتنا بھی ٹھیک ہے۔" اُس کے لہجے میں نرمی آ گئی تھی، نرمی اُسی لمحے آ گئی تھی جب میں نے اُسے انگریزی میں جواب دیا تھا۔ بجھل نے مجھے اشارہ کر دیا تھا ورنہ میں اُس سے چند باتیں ضرور پوچھتا۔ بجھل کا خیال ہوگا کہ وہ پولیس افسر ہے۔ ہمارے سامان پر بھی شک ظاہر کر سکتا ہے، کسی وقت بھی کوئی حکم چلا سکتا ہے اور ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ساری گاڑی پولیس والوں نے گھیر رکھی ہے۔ ڈبے میں موجود اُس کے ساتھ آنے والے دونوں سپاہیوں کی نظریں صندوقوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اِس سے پہلے کہ وہ اپنے افسر کو کوئی اشارہ کرتے، افسر نے مجھ سے وضاحت کی اور کہنے لگا کہ گاڑیوں کی یہ چیکنگ مسافروں کے فائدے کے لیے ہے۔ میں نے اپنے لفظ منہ ہی میں دبائے رکھے۔ وہ واپس چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد گاڑی روانہ ہو گئی۔

میں نے مڑ کے دیکھا، ابا جان کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ مجھے احساس ہی نہیں رہا تھا کہ ابا جان بھی ڈبے میں بیٹھے ہیں اور وہ انگریزی بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ خود بولنے کے بجائے مجھے اُن کے پولیس افسر سے بات کرنے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ پولیس افسر کسی نہ کسی طرح واپس چلا گیا تھا اور گاڑی بھی روانہ ہو گئی تھی لیکن جاتے وقت اُس کی آنکھوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ٹکٹ سے ضرور مطمئن ہو گیا ہے، ہم سے نہیں۔ وہ اپنا اطمینان کرنے پھر واپس آ سکتا تھا یا گاڑی کے ساتھ چلنے والی پولیس کو چوکنا کر سکتا تھا کہ وہ ہم پر نگاہ رکھیں۔ مجھے اُس سے اتنی درشتی سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مبادا وہ ناراض ہو جاتا، پھر سب خاک ہو جاتا۔ ملدانتے بھر مجھے پچھتاوا ہوتا رہا۔ ہرچند میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی تھی لیکن مارٹی کے بقول افسر تو افسر ہی ہوتا ہے۔ تمام راستے مجھے بے چینی رہی۔ جہاں گاڑی رکتی، میں سب سے پہلے باہر جھانک کے دیکھ لیتا کہ پولیس نے گاڑی کے گرد دوبارہ تو گھیرا نہیں ڈال دیا ہے۔ مجھے خزانے کی فکر نہیں تھی۔ اُس کا مجھے کیا کرنا تھا مگر جہاں تک ابا جان کہتے، ہمیں بہ حفاظت اُسے وہاں تک پہنچا دینا تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ گاڑی تیزی سے کلکتے کے نزدیک ہوتی گئی۔ پھر کوئی نہیں آیا۔ میں سوچ رہا تھا، اگر بجھل نے ابا جان کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے تو میرے رواں انگریزی بولنے پر انھیں ضرور حیرت ہوئی ہوگی۔

ابھی کلکتہ آنے میں درمیان کے دو ایک اسٹیشن باقی تھے کہ بجھل نے پیرو، زورا، مارٹی اور ابا جان کو ایک ڈبے میں کر دیا اور خود دوسرے ڈبے میں چلا آیا۔ میں بھی اُس کے ساتھ آ گیا۔ ہم نے وہ سب صندوق بھی اُسی ڈبے میں منتقل کر دیے تھے جس میں ابا جان تھے اور اپنے ساتھ صرف وہ سامان رکھا تھا جس میں خزانہ نہیں تھا۔ یہ احتیاط سب کی سمجھ میں آتی تھی اس لیے کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ بجھل چھ مہینے بعد کلکتے واپس جا رہا تھا۔ سامان مختلف ہوتا تو بات اور تھی۔ ہمارے پیچھے کلکتے میں بہت کچھ بدلا ہوا ہو سکتا تھا۔ پیرو، زورا اور مارٹی کا تعلق بمبئی کے باڑوں سے تھا، انھیں کلکتے میں اڈّے کے چند آدمیوں کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ گاڑی سے اُترتے وقت ہمارا ایک دوسرے سے جدا جدا رہنا ہی بہتر تھا۔ اب کے اسٹیشن پر کوئی ہمیں لینے کے لیے آنے والا نہیں تھا لیکن وہاں مختلف اڈّوں کے چند آدمی ہمیشہ موجود رہتے تھے۔ اسٹیشن تقریباً ہر وقت مسافروں سے بھرا ہوتا تھا۔ کسی بھی اڈّے کا آدمی ہمیں وہاں مل سکتا تھا۔

گاڑی گونجتی ہوئی ہاوڑا کے پلیٹ فارم میں داخل ہوئی تو میری رگوں میں خون جمنے لگا۔ ہم پہلے اترے، بعد میں پیرو اور ابا جان وغیرہ۔ بجھل لنگڑا کے چل رہا تھا۔ پلیٹ فارم سے گزر کے ایک دوسرے کے پیچھے جب ہم گیٹ سے باہر آ گئے تھے اور ٹیکسیوں کی طرف بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ سامنے سے ایک آدمی بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ وہ بدرو تھا، بھیم پورہ کے اڈّے کا آدمی۔ آتے ہی اُس نے بجھل کے پیر پکڑ لیے اور ہانپتے ہوئے بولا۔

"استاد تم!"

"کیسا ہے رے بدرو؟" بجھل اُسے بدرو ہی کہتا تھا۔

"تم... تم کدھر تھے استاد!" وہ حواس باختگی سے بولا۔

"ذرا دور چلے گئے تھے۔"

"دور چلے گئے تھے۔" اُس کی آواز بھرّا رہی تھی۔ "پر تم اِدھر

کب آئے؟"

"ابھی اُترے ہیں رے!" بجھل نے ٹھنک کے کہا۔

"ابھی!" وہ گھبرا کے بولا۔

"ہاں رے!"

"لوگ اِدھر نہ جانے کیا کیا بولتے تھے۔"

"اُن کو بولنے دے۔ کانتے کیسا ہے؟"

"کانتے! کانتے تو جیل میں ہے استاد!"

"جیل میں! کب سے ہے؟"

"مہینے سے! تم کو کچھ نہیں پتہ؟" وہ سٹ پٹا کے بولا۔

بجھل نے اُس کے بال پکڑ لیے۔ "کھل کے بول۔"

"قسم سے اُستاد! تم کو کچھ نہیں پتہ؟" وہ گھگھیانے لگا۔

"منہ کھلا رکھ۔" بجھل نے گرجتے ہوئے پوچھا۔

بدرو لڑکھڑا گیا۔ "استاد! استاد! تم کو کچھ پتہ نہیں ہے تو ابھی اِدھر سے لوٹ جاؤ۔" وہ بدحواسی سے بولا۔ "پولیس تم سب کو ڈھونڈ رہی ہے۔ اِدھر سب اُلٹا ہو گیا ہے۔ کبن خاں کو مار کے رتنا حرامی تمھارے اڈّے پر بیٹھا ہے۔ شولی، لالہ، فجا، سب، سب ایک دم۔"

بجھل بے اختیار اس کا منہ تھپڑانے لگا۔

سب نے بدرو کے گرد گھیرا ڈال دیا تھا۔

بدرو بھاگا نہیں، وہیں کھڑا بجھل کے سامنے سر جھکائے گھگھیاتا رہا۔ بجھل کے طمانچوں سے اُس کا منہ لال ہو گیا تھا۔

"مَیں، میں سچ بولتا ہوں۔" وہ خوف زدہ آواز میں بولا۔

"وہ لوگ کدھر ہیں؟" جامو نے بڑھ کے اُس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔

"کچھ اِدھر جیل میں، کچھ کبن... کبن خاں کے ساتھ......"

"منہ سے پھوٹتا کیوں نہیں؟" جامو وحشت سے بولا۔

"شولی، فدا، دلن، بسوا، لالہ..."

"ہاں ہاں، صاف صاف بول۔"

"سب سب ختم ہو گئے۔" بدرو نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں۔" جامو ہذیانی انداز میں بولا۔ اُس کی انگلیوں نے بدرو کا گریبان پھاڑ دیا تھا۔ وہ اُسے جھنجوڑنے لگا۔

کسی میں کچھ اور سُننے کی ہمت نہیں تھی۔ اسٹیشن پر چلتے ہوئے مسافر ہماری طرف متوجہ ہونے لگے تھے۔ پیرو، مارتی، زورا، ابا جان ہم سے پیچھے تھے۔ ہم بدرو کے پاس ٹھیرے تو وہ ہمارے پہلو سے گزرتے ہوئے ہم سے آگے نکل گئے لیکن کچھ ہی دُور جا کے رُک گئے۔ اسٹیشن پر شور مچا ہوا تھا۔ البتہ اُن کے کانوں تک بدرو کی باتیں ضرور پہنچی ہوں گی اور نہ بھی پہنچی ہوں تو ہمارے چہرے تو اُن کے سامنے ہی تھے۔ ہم سب کی آنکھیں اُبل کے جیسے باہر نکل آئی تھیں۔ پیرو نے ہمارے پاس آنے میں پھر چند لمحوں ہی کا توقف کیا ہو گا۔ زورا، مارتی اور ابا جان کو وہیں روک کے وہ فوراً ہماری جانب جھپٹا اور اُس کی مضطربانہ نگاہیں ہم پر منڈلانے لگیں۔ "کیا لفڑا ہے بجھل بھائی؟" وہ تذبذب سے بولا۔ "یہ چڑی مار کون ہے؟"

"کچھ نہیں دادا!" بجھل نے بھاری آواز میں کہا۔ "تم آگے بڑھو۔"

"اپن بڑھے گا، پر یہ بدرو کیا بولتا ہے؟"

"بولتا ہے کچھ اُلٹ پلٹ ہو گیا ہے۔"

"کیسا؟" پیرو نے حیرانی سے پوچھا۔

اِسی اثنا میں سارنگے، بدرو کو جامو سے چھین کے الگ لے گیا تھا۔ ہم سب کے ایک جگہ اکٹھے ہو جانے اور بدرو کا کُرتا پھٹ جانے کی وجہ سے آتے جاتے لوگ رُک رُک کے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ سارنگے بدرو کو دُور نہ لے جاتا تو ہمارے اِردگرد بھیڑ اکٹھی ہو جاتی۔ ہمیں فوراً منتشر ہو جانا چاہیے تھا مگر کسی کے بدن میں جان ہی نہیں رہی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑ دھڑا رہا تھا۔ جامو نے اپنا سر بلاکو کے شانے پر رکھ دیا تھا اور بلاکو کسی بُت کے مانند بے جان کھڑا تھا۔ جینی، پلٹو، شولم پھٹی ہوئی آنکھوں سے بجھل کو گھور رہے تھے۔ بجھل کے ماتھے پر شکنوں کا جال بڑھتا جا رہا تھا۔ بدرو ہم سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا مگر میری طرح کسی کو یقین نہیں آ رہا ہو گا کہ اُنھوں نے جو کچھ سُنا ہے، وہ سب سچ ہے اور بدرو ہم سے مذاق نہیں کر رہا ہے۔ پتہ نہیں سارنگے بدرو کو ایک کونے میں لے جا کے اُس سے اور کیا پوچھ رہا تھا اور بدرو اُسے اور کیا بتا رہا تھا۔ ابا جان ہم سے کچھ فاصلے پر تھے اور اضطراری انداز میں ہم پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ بجھل کے بجائے جینی نے جھجکتے ہوئے زبان کھولی اور مختصراً بدرو سے سُنا ہوا معاملہ پیرو کو بتایا تو پیرو کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ "ایسا!" وہ سر جھٹک کے بولا۔ "یہ رتنا کُتیا کا جنا کون ہے؟ اپن نے اِس کا نام پہلے نہیں سُنا۔"

"وہ اِدھر پہلے کلکتے میں ہی تھا۔ روز چھینا جھپٹی، ٹِن ٹِن کرتا رہتا تھا۔ استاد نے آخری بار بلا کے بولا کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر کلکتے سے منہ کالا کر لو۔ سالا اُس وقت چلا گیا تھا۔ بعد کو معافی کے لیے آدمی بھیجا۔ استاد بولا، ہم اپنا فیصلہ واپس نہیں لیتا۔" جینی کی آواز غصے سے تمتما رہی تھی۔

"ابھی اِدر کیا کھڑے ہو؟" پیرو پھنکارتے ہوئے بولا۔ "اڈّے کی طرف چلو۔ چلو۔" اُس نے جامو کو دھکا دے کے دو قدم آگے کر دیا۔

"چلتے ہیں دادا!" بجھل نے سر ہلا کے آہستگی سے کہا۔

"ابھی اپن دیکھے گا، وہ کس کا تخم ہے؟"

"دکھائے گا دادا! پر تم ابھی اِدھر سے جاؤ۔ بڑے صاحب اُدھر کھڑے ہیں، ہم اندر جاتے ہیں۔" بجھل نے سرد لہجے میں کہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔ "لاڈلے! تو دادا، زورا، مارتی اور دادا کے ساتھ ابھی فیض آباد نکل جا۔ پیچھے ہم آتے ہیں۔"

"فیض آباد جانے کا بولتے ہو بجھل بھائی!" پیرو نے تلخی سے کہا۔

"ہاں دادا! تم اُدھر لاڈلے کے ساتھ چلے جاؤ۔ میں بھی آنے میں دیر نہیں کروں گا۔ دیر ہو جائے تو اُدھر ہی سے بمبئی چلے جانا۔ یہاں سے تم کو آئے ہوئے ٹائم ہو گیا ہے۔"

"بجھل بھائی! اپن سے کوئی غلطی ہو گیا ہے کیا؟"

"بات مان لو دادا! بڑے صاحب کا فیض آباد پہنچ جانا ٹھیک ہے۔"

"پر اپن کیسے جا سکتا ہے۔"

"تم کو جانا ہی ہے دادا! کوئی سی بھی گاڑی پکڑ لو۔ اُدھر بھی تمھارا ایک بیٹا ہے۔ اپنی گیتا کی خاطر جاؤ، جلدی کرو۔"

"کیسا بولتا ہے اُستاد!"

"ہٹ مت کرو دادا! ہٹ مت کرو۔" بجھل نے جھنجلا کے کہا۔

"اپن ایک دم نہیں جائے گا بجھل بھائی!" پیرو درشتی سے بولا۔

"بڑے صاحب کے ساتھ کوئی ہونا چاہیے دادا!"

"پھر کسی اور کو بولو۔"

"لاڈلا بھی جا رہا ہے۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" میں نے تیزی سے حتمی لہجے میں کہا۔

بجھل نے اپنی سُرخ آنکھیں مجھ پر مرکوز کر دیں۔ "چُپ رہ۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔ میرے بجائے کسی اور کو بھیج دو۔"

"تو نہیں جائے گا تو پھر کون جائے گا رے۔" بجھل نے بکھری ہوئی آواز میں کہا۔ "سمجھتا کیوں نہیں ہے۔"

"میں سب سمجھ رہا ہوں۔"

"جا کے جلدی لوٹ آنا۔ دادا تم بھی اس کے ساتھ....."

"نئیں بجھل بھائی!" پیرو نے بجھل کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ "اپن سے جاستی مت بولو۔ اِدھر سے ابھی کوئی بھی نئیں جائے گا، سمجھا، کوئی بھی نئیں۔ ٹیم جا رہا ہے۔ اپن کے پاس ٹیم کی کمی ہے۔"

"ٹائم تو تم برباد کر رہے ہو دادا!"

"ابھی تم سب کچھ اپن پہ چھوڑ دو۔ تم بڑے صاحب کے ساتھ اُدھر چلے جاؤ۔ پیچھے ہم آتا ہے۔ تم کو آرام کی ضرورت ہے پر بہت سوچ گیا ہے۔ ابھی اس کو اور زیادہ مت پریشان کرو۔" پیرو نے نرمی سے کہا اور جامو کی طرف دیکھ کے بولا۔ "کیوں جامو اُستاد! اپن ٹھیک بولتا ہے نا؟"

"ہاں۔" جامو بے خیالی سے بولا۔ وہ نہ جانے کہاں کھویا ہوا تھا۔ "جیسا تم بولتے ہو، ٹھیک ہے دادا!"

"ابھی استاد کو فیض آباد جانے دو۔" پیرو نے دوبارہ کہا۔

"ہاں استاد!" جامو دھیرے سے بولا۔ "تم چلے جاؤ۔"

جامو کی زبان سے یہ مشورہ سُن کے بجھل نے آنکھیں بھینچ لیں، اُس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی اور نتھنے پھڑکنے لگے تھے۔ اُس نے اپنا سوجا ہوا پیر زور سے زمین پر پٹخا اور کوئی آہ بلند نہیں کی۔ پیرو چُپ ہو گیا، جامو کو بھی فوراً احساس ہو گیا کہ اُس نے پیرو کی تائید کر کے بجھل کو دُکھ پہنچایا ہے۔ کلکتے اُتر کے اور اتنا کچھ سُن کے بجھل کے یوں واپس چلے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جامو اُس کے سامنے سے ہٹ گیا۔ کچھ دیر تک سب خاموش رہے، سارنگے ابھی تک بدرو کے ساتھ دُور کھڑا اپنے کانوں میں آگ لگا رہا تھا۔ ہمارا اسٹیشن پر اس طرح زیادہ دیر ٹھیرے رہنا مناسب نہیں تھا۔ ابھی صرف بدرو ہی نظر پڑا تھا اڈّے کے دوسرے آدمی بھی اسٹیشن پر موجود ہوں گے۔ کسی لمحے وہ ہمیں دیکھ سکتے تھے۔ جامو، میں اور پیرو، ہم تینوں میں سے کسی ایک کا ابا جان کے ساتھ جانا ضروری تھا مگر تینوں میں سے کوئی بھی آمادہ نہیں تھا۔ بجھل نے کسی اور سے نہیں کہا تھا۔ اُن میں سے شاید ہی کوئی کبھی بجھل کے ہمراہ فیض آباد گیا ہو۔ ہم تینوں کے سوا بجھل کسی اور سے کہتا تو وہ بھی انکار کر دیتا۔

بہر حال ہمیں جلد ہی کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے تھا۔ جتنا وقت گزر رہا تھا، بجھل کی بات مجھے ٹھیک ہی لگ رہی تھی کہ ابا جان کو پہلی گاڑی سے یا کسی بھی ذریعے سے فیض آباد کی طرف روانہ کر دیا جائے۔ میں نے سوچا، بجھل سے کہہ دوں، میں ہی چلا جاتا ہوں۔ ابھی ہم اسٹیشن پر ہیں۔ اسٹیشن سے نکلنے کے بعد کسی کو پتہ نہیں ہے کہ آگے کیا حالات پیش آئیں۔ کوئی اُن کے ساتھ نہیں گیا تو پھر ابا جان کہاں جائیں گے۔ کلکتے میں اپنے اڈّے پر رتنا بیٹھا ہوا ہے۔ دوسرے اڈّے بھی اُسی کے زیرِ اثر ہوں گے۔ بدرو کے بقول پولیس ہماری تلاش میں تھی۔ اتفاق سے پولیس کے کسی آدمی نے ہمیں اب تک نہیں دیکھا تھا لیکن چھ مہینے میں سارے پولیس والے بدل نہیں گئے ہوں گے کہ بجھل اور دوسرے لوگوں کے چہرے نہ پہچان سکیں۔ اسٹیشن سے نکلتے ہی ہمارا اور اُن کا سامنا ہو سکتا تھا۔ پھر نہ معلوم کیا ہو۔ بجھل نے اسی خیال سے زورا، مارتی، پیرو

اور ابّا جان کو پہلے ہی اپنے سے جُدا کر دیا تھا کہ ہمیں اپنے پیچھے گزرنے والے شب و روز کا کوئی علم نہیں تھا۔ اُس وقت جُھجل کی یہ احتیاط مجھے فضول لگی تھی۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ گاڑی سے اُترنے کی دیر ہے' بدرو چنگاریاں لیے کھڑا ہے۔ مونجھار کے ختم ہونے کے بعد دو ایک بار صرف گھوشی نے پچھنا کیا تھا۔ جُھجل کئی کئی مہینے میرے ساتھ اڈے سے بے خبر کبھی جنوبی ہندوستان کبھی وسطی ہندوستان گھومتا رہا تھا۔ جب میں نے بمبئی میں کرشنا جی کو ختم کرنے والے لوگوں کو پہچاننے کے لیے چھنگا اُستاد سے پالا لیا تھا تو اُس درمیان جُھجل بھی وہیں آ گیا تھا اور اُس کے ساتھ کانتے' جامو وغیرہ بھی تھے۔ اڈا چلتا رہا۔ ہم واپس آئے تو کہیں سے کوئی شکایت نہیں ملی تھی۔ تبت کی طرف جاتے وقت جُھجل شہر کے تمام اڈوں پر عود گیا تھا اور اُسے یقین ہو گا کہ اُس کے پیچھے کوئی اُلٹی سیدھی حرکت نہیں کرے گا تبھی اُس نے سفر کا ارادہ کیا ہو گا اور تبھی اُس نے کبن خاں اور کانتے پر بھروسا کر لیا تھا ورنہ وہ جامو کو ہمیں چھوڑ دیتا۔ ایک سلطان محبت کرتا تھا مگر جُھجل اُسے اپنے ساتھ لے گیا تھا اور سلطان سے یہ توقع بھی نہیں تھی کہ وہ جُھجل کے خاص اڈے پر اُس کی عدم موجودگی میں کوئی گڑبڑ کرے گا۔ جامو سے اُس کی نہیں بنتی تھی مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اُس کی نگاہیں جُھجل کے اڈے پر لگی ہوئی ہیں۔ گھوشی کو اپنی غلطی کی سزا فوراً مل گئی تھی۔ پہلی بار تو میں نے ہی اُسے جُھجل کے پاس لا کے معافی دلوائی تھی' جُھجل تیار نہیں تھا' میں نے سفارش کی تھی اس لیے اُسے درگزر کر دیا تھا۔ گھوشی کے دماغ میں خنّاس سمایا ہوا تھا۔ باز نہیں آیا۔ دوسری بار پھر غدّاری کی اور جامو نے اُسے ہمیشہ کے لیے چپ کر دیا۔ اُس کے بعد دُور دُور کوئی دوسرا گھوشی نظر نہیں آتا تھا۔ ہمارے روانہ ہوتے وقت تمام اڈے ٹھیک ٹھاک چل رہے تھے۔

جُھجل کبن خاں اور کانتے کے بجائے اڈے پر اپنی مُورت رکھ جاتا تو بھی سب کچھ ایسے ہی رہنے کی اُمید تھی۔ تاہم جُھجل نے اپنی مورت نہیں رکھی تھی' وہ کبن خاں اور کانتے کو اپنی جگہ چھوڑ گیا تھا۔ کانتے کا خون کچھ زیادہ گرم تھا لیکن کبن خاں اُسے سرد رکھنے کے لیے موجود تھا۔ مشہور تھا کہ چاقو ہاتھ میں آتے ہی کبن خاں کا رنگ بدل جاتا ہے' وہ کوئی دوسرا آدمی نظر آتا ہے پھر اُس کا چاقو ہوا سے باتیں کرتا ہے۔ وہ چاہتا تو لکھنؤ شہر کے سارے اڈے اُس کے چاقو کی نوک پر ہوتے مگر وہ اپنے ایک ہی اڈے میں مست رہتا تھا اور وہاں بھی ٹِک کے نہیں بیٹھتا تھا' کبھی فیض آباد' کبھی کلکتے' کبھی آگرے' کبھی دلّی۔ جہاں جہاں سے اُسے خبر ملتی کہ کوئی اچھی گانے والی اور اچھے ناک نقشے والی آئی ہے' کبن خاں سارے کام چھوڑ کے پہلے وہیں کا رُخ کرتا۔ مہینے میں دو ایک بار

زرّیں کی خیر خبر لینے فیض آباد ضرور جاتا تھا۔ کبھی وہ خالی ہاتھ نہ جاتا۔ زرّیں کو اپنی بہن کی طرح سمجھتا تھا۔ شکل و صورت سے وہ کوئی نواب لگتا تھا۔ ململ کا کرتا' دوپلی ٹوپی۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ اُسے ہتھیار اُٹھانا آتا ہے۔ اُجلی نکھری رنگت' سُرمئی مائل' ڈیل ڈول میں کسرتی جسم کا' عمر بھی درمیانی تھی۔ جس کام کا ارادہ کر لیتا' اُس میں جُٹ جاتا۔ لکھنؤ میں لاڈو میاں کی بڑی دھوم تھی کہ اُس کے پاس بازار کا علاقہ تھا۔ ایک مدّت تک یہ دستور رہا کہ لکھنؤ کے کسی دوسرے اڈے کا کوئی آدمی بازار کا رُخ کرتا تو پہلے لاڈو میاں کے اڈے پر اپنی آمد کی خبر کرا دیتا یا وہاں متعین لاڈو میاں کے کسی آدمی کی ہمراہی میں اندر داخل ہوتا۔ یہ ایک رسم بن گئی تھی جس کا لاڈو میاں کی وجہ سے سبھی پاس کرتے تھے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ لاڈو میاں نے اپنے بڑے سے بڑے مخالف کو بازار میں داخل ہونے سے منع کیا ہو۔ اطلاع دینا شرط تھی اور اطلاع ہو جانے پر کبھی کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی جاتی تھی۔ اس میں نہ کوئی الجھاؤ تھا' نہ جواب کا انتظار کرنا پڑتا تھا اس لیے لوگ اطلاع دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ کہتے ہیں' ایک زمانے سے لاڈو میاں بازار کے اڈے پر جما ہوا تھا۔ یہ سب سے زیادہ آمدنی کا علاقہ تھا اور شہر و اطراف کے منتخب آدمی وہاں موجود تھے۔ دن بھر یہ لوگ شہ زوری کرتے رہتے' رات کو بن ٹھن کے بازار میں نکلتے۔ لکھنؤ کے اڈوں کی صورت دوسرے شہروں کے اڈوں سے کچھ مختلف تھی۔ وہاں بڑے نواب اور راجا لوگ ہر ماہ ایک مخصوص رقم بھجواتے تھے' باقاعدہ طور پر اڈے صرف کہیں کہیں قائم تھے لیکن اپنے اپنے علاقے موجود تھے جو ایک طرح سے اڈوں کی حیثیت رکھتے تھے۔

وہ کبن خاں ہی تھا جس نے پہلی مرتبہ بازار میں اپنی آمد کی رسمی اطلاع لاڈو میاں کے اڈے پر نہیں بھجوائی۔ یہاں تک بھی کوئی بات نہیں تھی۔ کبن خاں رات کو علاقے میں داخل ہوتے وقت ناکوں پر بیٹھے ہوئے لاڈو میاں کے آدمیوں سے بھی کہہ سکتا تھا کہ وہ گانا سُننے اندر جا رہا ہے۔ لاڈو میاں نے شہر کے دوسرے اڈوں کے چند خاص آدمیوں کو اس رسم سے مستثنا قرار دے رکھا تھا مگر کبن خاں کا شمار اس زُمرے میں بھی نہیں تھا۔ کبن خاں کے ساتھ اپنے اڈے کا صرف ایک آدمی تھا۔ جب وہ وہاں پہنچا اور اُس نے لاڈو میاں کے کسی آدمی سے رابطہ قائم نہیں کیا تو اُنھیں فکر ہوئی اور ابھی کبن خاں ایک بالاخانے پر چڑھنے کے لیے قدم بڑھا ہی رہا تھا کہ ایک شخص نے اُس کا راستہ روک لیا۔ کبن خاں نے دو تین واروں میں آسے اپنے سامنے سے ہٹا دیا اور اُوپر چلا گیا۔ اُس نے دیر تک گانا سُنا' ناچ دیکھا اور وہیں کے کسی آدمی کے ذریعے اُسے خبر ملی کہ نیچے لاڈو میاں اپنے

ساتھیوں سمیت موجود ہے۔ یہ سُن کے گانے والی نے گانے سے انکار کر دیا تھا۔ کبن خاں نے اُس کے اور اپنے درمیان چاقو رکھ دیا۔ نتیجتہً محفل جمی رہی اور وہ ناچتی گاتی رہی۔ آدھی رات کے وقت جب کبن خاں اُٹھا تو نیچے سب سے پہلے لاڈو میاں سے اُس کی مُڈبھیڑ ہوئی۔ لاڈو میاں نے اُسے یاد دلایا کہ یہاں کا کیا دستور ہے۔ کبن خاں نے ہنس کے جواب دیا' معلوم ہے' پر اپنا بھی کوئی دستور ہے۔ لاڈو میاں نے فیصلہ کرنے میں تاخیر نہیں کی۔ دوسرے ہی لمحے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا مگر کبن خاں نے کسی اعتماد ہی میں یہ خطرہ مول لیا تھا۔ چند پل گزرے ہوں گے کہ اُس نے لاڈو میاں کے آدمی کا ہاتھ ننگا کر دیا تھا۔ لاڈو میاں کے لیے یہ خلافِ توقع تھا۔ پہلے تو وہ خیرہ کُن نظروں سے کبن خاں کو دیکھتا رہا پھر کسی اور آدمی کو آزمانے کے بجائے اُس نے خود چاقو سنبھال لیا اور کبن خاں کے مقابل آ گیا۔ کبن خاں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ لاڈو میاں کو زندگی میں بہت کم ہتھیار اُٹھانے کی ضرورت پڑی تھی۔ یا تو وہ ہتھیار اُٹھاتا ہی نہیں تھا۔ اُٹھا لیتا تھا تو چاقو پوری طرح اُس کے قابو میں ہوتا تھا۔ اپنی مرضی کا فیصلہ کر کے ہی لاڈو میاں ہتھیار بند کرتا تھا۔ کبن خاں پر وار کرنے سے پہلے اُس نے اُسے موقع دیا کہ وہ چلا جائے اور آئندہ ایسی غلطی نہ کرے۔ کبن خاں نے جواب میں اُس پر چاقو تول لیا۔ گلی میں اُس وقت سنّاٹا چھا گیا تھا۔ قریب قریب کے تمام بالاخانوں پر ناچ گانا بند ہو گیا تھا اور راہ گیر ان کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ کبن خاں کو دو ایک ہی مرتبہ لاڈو میاں کے داؤ سے بچنا پڑا ہو گا کہ دیکھتے دیکھتے وہ پہلو سے اُچھل کے تیزی سے چیتے کی طرح لاڈو میاں کے جسم پر گرا اور اُس کے چاقو والے بازو میں اپنے بازو سے پیچ ڈال دیا۔ کبن خاں نے ایک لمحہ نہ جانے دیا۔ دوسرے ہی لمحے اُس نے دوبارہ اُچھل کے اس زور کا جھٹکا دیا کہ چاقو تو لاڈو میاں کے ہاتھ سے گرا ہی گرا تھا' اُس کے کلائی کی ہڈّی بھی ٹوٹ گئی۔ بہت سے لوگوں نے یہ منظر دیکھا تھا۔ کبن خاں نے منٹ سے زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔ لوگوں نے بس دو باتیں دیکھیں۔ کبن خاں کا اچانک لاڈو میاں سے بھڑنا اور اگلے چند لمحوں میں لاڈو میاں کا ہاتھ جھٹکنا۔ لاڈو میاں کے کسی اور آدمی نے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ چلتے چلتے کبن خاں اُس سے کہتا گیا کہ صبح سورج نکلنے سے پہلے وہ بازار کے اڈے پر نظر نہ آئے۔

اور یہی ہوا۔ سویرے کبن خاں ابھی سو کے نہیں اُٹھا تھا کہ لاڈو میاں کے آدمی اُس کے گھر کے باہر کھڑے تھے' وہ اُسے اپنے اڈے پر لے جانے آئے تھے۔ کہتے تھے کہ لاڈو میاں رات کو اڈے واپس نہیں آیا۔ وہیں سے کہیں اور چلتا بنا۔ اب کبن خاں آ کے اڈا سنبھالے۔ کبن خاں نے انکار کر دیا اور کہا' وہ اپنے ہی آدمیوں میں سے کسی کو چُن لیں اور بس آئندہ لاڈو میاں کی ڈالی ہوئی رسم کا اعادہ نہ کریں۔ کبن خاں نے جان بوجھ کے منع کر دیا تھا۔ ایک تو وہ اپنا اڈا ہی نہیں دیکھ پاتا تھا' دوسرے اس طرح وہ لاڈو میاں کے ساتھیوں کا آپس میں جھگڑا کرا کے اُن کی طاقت کمزور کر دینا چاہتا تھا۔ اڈے کی گدّی کے لیے ساتھیوں کا آپس میں لڑنا لازم تھا۔ لاڈو میاں کے جانے کے بعد کئی آدمی مارے گئے۔ ایک کے بعد ایک' کبن خاں بیٹھا سُنتا رہا۔ پھر بازار میں لاڈو میاں کا ایک پُرانا آدمی گگّو کسی طور جم گیا۔ گگّو نے بعد میں اپنا نام بدل کے گلباز رکھ لیا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک کان میں بالا پہنتا تھا۔ گلاب کا پھول اُس میں ٹنکا رہتا اور گردن میں موتیا کا ہار پڑا رہتا تھا۔ جب بھی کبن خاں بازار جاتا' گلباز بالے سے پھول نکال کے فوراً جیب میں رکھ لیتا اور گردن سے ہار اُتار کے کبن خاں کی کلائی میں باندھ دیتا۔ لاڈو میاں کے بازار سے جانے کے بعد جتنے بھی آدمی اُس کی جگہ آئے' سب کبن خاں کا اتنا ہی لحاظ کرتے تھے۔ کبن نے کبھی کسی سے کوئی مطالبہ نہیں کیا' کوئی حکم نہیں چلایا تھا' درمیان میں کبھی دخل نہیں دیا تھا۔ اڈے پر لاڈو میاں کے پُرانے ساتھی ہی قابض تھے مگر ہر طرف یہی چرچا تھا کہ بازار کے اڈے پر اصل راج کبن خاں ہی کا ہے۔ بازار میں جب بھی کوئی نئی لڑکی آتی تھی' اُسے لاڈو میاں کے ساتھیوں کے سامنے ناچ اور گانے کا ایک دَور ضرور کرنا پڑتا تھا مگر اب اس تقریب کا اہتمام صرف کبن خاں کے لیے ہوتا تھا۔ کبن خاں کو اور کیا چاہیے تھا' اُس کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ جامو نے ایک بار مجھے کبن خان کا واقعہ سنایا تھا۔ اُس وقت یہ واقعہ گزرے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ کبن خاں کے بارے میں اور بھی عجیب اور انوکھی باتیں مشہور تھیں۔ عجب پاگل سا تھا۔ ایک دفعہ ایک نواب نے اُس کی کسی بات سے خوش ہو کے اُسے دس ہزار روپے دیے۔ کبن خاں رقم لے کے اپنے اڈے واپس جا رہا تھا کہ راستے میں ایک جگہ بھیڑ دیکھی۔ ہندوؤں کا مجمع تھا اور پنڈت زیرِ تعمیر مندر کے چبوترے پر کھڑا مندر کی عمارت مکمل ہونے کے لیے دان مانگ رہا تھا۔ کبن خاں نے چپکے سے اپنے آدمی کے ہاتھ نوٹوں کی گڈیاں اُسے بھجوا دیں اور اس سے قبل کہ پنڈت اُس کا شکریہ ادا کرتا' کبن خاں فوراً وہاں سے کھسک گیا۔ سب لوگ دیکھتے رہ گئے۔ اُس کی صرف ایک بہن اور ماں ہی زندہ تھی۔ بہن کی شادی ہو گئی تھی۔ ماں سیتا پور میں رہتی تھی۔ معلوم نہیں' اُنھیں خبر بھی ہوئی یا نہیں۔

یہی کچھ تھا جو بجھل نے کبن خاں کو کلکتے کا اپنا خاص اڈا سونپ دیا تھا۔ کبن خاں نے غیر ذمے داری اور غفلت نہیں برتی ہوگی۔ کوئی اور بات ہوئی ہوگی۔ شولی، لالہ، فدا، اڈے پر جتنے لوگ تھے سبھی کی گرفت چاقو پر مضبوط تھی۔ کانتے پلک جھپکتے میں دوسرے کو بے بس کر دیتا تھا۔ اُس سے چاقو گروا لینا یا چھیننا ایسا آسان نہیں تھا۔ شہر میں سبھی جانتے تھے کہ بجھل کے آدمیوں سے چھیڑ چھاڑ کا نتیجہ لمحوں میں نکل آتا ہے اور کبھی اچھا نہیں نکلتا۔ نہ جانے اُن سب کو کیا ہو گیا تھا۔

اباجان کے ساتھ سامان اُٹھائے ہوئے قلی بے چین ہو رہے تھے اور اباجان بھی۔ مارتی بھی ہمارے پاس آ گیا تھا۔ وہاں اُن کے پاس صرف زورا رہ گیا تھا یا قلی۔ زریں کا پتہ بتا کے سامان کے ساتھ صرف اباجان کو فیض آباد بھیج دینا بھی کسی حال میں درست نہیں تھا۔ پھر فیض آباد ہی کیوں۔ اباجان اپنے ٹھکانے پہ ہی کیوں نہ جائیں جہاں فرخ، نرپال، فارہہ اور اکبر کو چھوڑ کے آئے ہیں۔ میں نے اُن سے اُن کا ٹھکانا نہیں پوچھا تھا مگر کوئی ایسی جگہ ہوگی جہاں اُنھیں واپس جانا ہوگا۔ ساری حجت تو اس سامان کے سبب سے تھی جس میں بچھو بھرے ہوئے تھے۔ ممکن ہے اباجان خود بھی تنہا سفر کرنا پسند نہ کریں، نہ اُنھیں ایسا مشورہ دینا مناسب تھا لیکن سرِ دست کوئی بجھل سے الگ ہونے اور اُن کے ساتھ جانے پر تیار نہیں تھا تو پھر یہاں اُنھیں کہاں ٹھیرایا جائے یا اپنے ساتھ ہی رکھا جائے! دوسرے اڈوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بدلو کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ آخر ہم کیوں پولیس کو مطلوب ہیں لیکن اب کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ پولیس کی نظر ہمارے بعد فوراً انھی صندوقوں پر پڑے گی۔ اتنے بڑے شہر میں انھیں چھپانے اور اباجان کو کسی محفوظ جگہ ٹھیرانے کا کوئی گوشہ، کوئی تہہ خانہ کم از کم میرے علم میں نہیں تھا۔ ہر جگہ مشکوک تھی۔ ایک کانسٹیبل کے نگاہ بھٹکنے اور صندوق کھولنے کی دیر ہوتی کہ سارے شہر کی پولیس حرکت میں آ جاتی۔ اِن میں بہت سے پتھر ایسے تھے جن کی چمک سے آنکھیں پھٹ جائیں، صندوق کھلتے تو بات کہاں سے کہاں پہنچ سکتی تھی پھر نہ ہم کچھ پتہ بتاتے نہ وہ کچھ کھوج پاتے۔ دونوں صورتوں میں سلاخیں مقدر تھیں۔ اباجان کے لیے بھی، ہمارے لیے بھی۔

میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ میں بجھل سے کہہ دیتا ہوں، میں ہی چلا جاتا ہوں لیکن ارادے کے باوجود میری زبان نہیں کھلی۔ اباجان کو حویلی میں پہنچا کے میں فوراً لوٹ سکتا تھا۔ ایک ڈیڑھ دن کا فرق پڑتا۔ دوسرے دن میں پھر کلکتے میں ہوتا مگر یہ رات کوٹھی مجھے پہاڑ معلوم ہوتی تھی۔ میں انھیں چھوڑ کے چلا جاؤں کیونکہ اباجان اور اُن کے ساتھ دُنیا کا قیمتی ترین سامان ہے؟ میرا دماغ بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔ ٹھیک ہے بجھل بھائی! ابھی اِن کی بات سنو۔ یکایک پیرو نے اچک کے نرم لہجے میں بجھل کو مخاطب کیا۔ پیرو بھی یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ ہم میں سے کوئی فیض آباد نہیں جائے گا۔ سب یہیں رہیں گے۔ اباجان بھی اور جس طرح ہم دو اسٹیشن پہلے ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے تھے، فوراً پھر الگ ہو جاتے ہیں۔ پیرو، زورا، مارتی اور اباجان شہر کے کسی ہوٹل میں ٹھیر جاتے ہیں، بجھل اور دوسرے لوگ اِدھر اُدھر کی سُن گُن لینے کے لیے روانہ ہو جائیں یا سیدھے اڈے کی طرف نکل جائیں۔ بجھل نے نہ ہاں کی، نہ ناں۔ وقت نہیں تھا۔ جاموں نے کسی توقف کے بغیر اُسے محمد علی اسٹریٹ پر واقع اوسط درجے کے ایک ہوٹل کا پتہ بتا دیا۔ بجھل کی خاموشی ہی تائید تھی۔ پیرو نے اُس سے باقاعدہ طور پر پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی، مارتی کو لے کے آگے بڑھ گیا اور مسافروں کے ہجوم میں گم ہو گیا۔ میں اُن کے ساتھ نہیں گیا۔ بجھل نے مجھے پہلے ہی اُن سے الگ کر دیا تھا۔ پیرو مجھے لے جانا بھی چاہتا تو میں نہ جاتا۔ اُدھر جینی سانٹے کو بُلانے کے لیے بھاگتا ہوا اُس کے پاس پہنچا، چند قدم کا فاصلہ طے کر کے ہم اسٹیشن سے باہر تھے۔

اچھا یہی تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے اباجان جلد سے جلد شہر سے اور ہم سے دُور ہو جائیں۔ ہوٹل بھی کوئی مناسب جگہ نہیں تھی۔ کسی کو بھی شک ہو سکتا تھا مگر ایسی صورت میں پیرو ہی کی تجویز بہتر تھی۔ کلکتے میں رہ کے وہ ہم سے قریب بھی رہے گا، دُور بھی۔ کسی وقت اُس کی ضرورت پڑی تو وہ برابر موجود ہوگا، وہ ہم سے اور ہم اُس سے رابطہ رکھ سکتے تھے۔ پیرو پہلی بار کلکتے آیا تھا۔ اڈوں کے کم ہی لوگوں نے اُس کا چہرہ دیکھا ہوگا۔ درمیان میں کچھ مہینے کی مدت کا فاصلہ تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اُس کے نقوش اُن کی آنکھوں میں محفوظ رہے ہوں۔ ابھی صرف بدرو نے پیرو کو ہمارے ساتھ دیکھا تھا، کسی اور کی نظر نہیں پڑی تھی۔ شاید بدرو نے توجہ نہ دی ہو۔ جس وقت اُس نے ہمیں اسٹیشن پر دیکھا تھا، پیرو ہمارے ہمراہ نہیں تھا۔ پیرو کے ہمارے پاس آتے آتے سانٹے اُسے دُور لے جا چکا تھا اور بدرو کو اُس وقت کسی اور طرف دیکھنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی لیکن اگر بدرو نے پیرو کو دیکھ لیا ہے تو وہ ہم سے جُدا ہو کے یہ خبر عام کر سکتا تھا۔ ہم اُسے منع کرتے تو وہ خواہ مخواہ وہم میں پڑ جاتا۔ بدرو کیا، آگے کچھ اور آدمی بھی پیرو کو پہچان سکتے تھے۔ پیرو، مارتی اور زورا کے چہروں پہ نقاب

پڑی تھی۔

اِدھر بجھل کی کلکتے میں آمد کی خبر پھیلتی، اُدھر اتفاق سے پیرو کو پہچان لیتا یا بدرو کے پیٹ کو سہارا نہ ہوتی تو رتنا نے ملانے والے اپنی عادت سے باز نہ آتے۔ دونوں کی ایک کلکتے میں آمد، دونوں کا الگ الگ ہو جانا۔ پیرو کا ہوٹل میں تاک جھانک کرنے والوں کو چونکانے کے لیے بہت تھا۔ پتہ کن کن اڈوں کے آدمی بجھل کے لیے اپنے سینے میں زہر ئے ہوئے ہوں گے۔ موجدار کے اڈے کے لوگ اُن میں پیش تھے۔ رتنا نے اُنھیں اُکسایا ہوگا تو اُنھوں نے در پردہ کا ساتھ دیا ہوگا اور سب کو فکر ہوگی کہ بجھل کسی دن کلکتے ں نہ آ جائے، سب سے زیادہ فکر رتنا کو ہوگی۔ اُنھوں نے طور پر ضرور یہ طے کیا ہوگا کہ جیسے ہی بجھل کلکتے آئے، اُسے لے کی مہلت نہ دی جائے۔ پہلے ہی ہلے میں اُسے اُس ساتھیوں سمیت کلکتہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا جائے۔ دوسرے وں کی مدد کے بغیر رتنا تنہا یہ کام انجام نہیں دے سکتا تھا یا ہو تا ہے اُس نے سوچا ہو کہ ایک بار بجھل کے خاص اڈے قبضہ کر لیا جائے، بعد میں اِدھر اُدھر کے اڈے خود بخود ساتھ جائیں گے۔ رتنا نے اُنھیں یقین کی حد تک فریب دیا ہوگا کہ ھل کا واپس آنا ممکن نہیں ہے اور اگر وہ آ بھی جائے گا تو اڈا ھن جانے کے بعد وہ پہلے جیسا بجھل نہیں ہوگا۔ رتنا نے انھیں لانے کے لیے بہت حربے اختیار کیے ہوں گے، طرح طرح باتیں بنائی ہوں گی۔

مگر خود رتنا نے اپنے آپ کو کس طرح مطمئن کیا ہوگا؟ ہر لمحے بجھل کی واپسی کا دھڑکا ہوگا۔ کیا اُس کے ذہن ایسا کوئی امکان نہیں تھا یا وہ اُس کی واپسی کو کوئی اہمیت یں دیتا تھا۔ وہ بجھل کو بھول گیا تھا یا اُسے بجھل کی عمر گزر نے، بوڑھا ہو جانے کا گمان ہو چلا تھا۔ رتنا اتنے سال کلکتے باہر رہ کے اپنے اعتماد کا زور کرتا، اُسے پروان چڑھاتا رہا وہ اکیلا کلکتے نہیں آیا ہوگا، رتنا کو یقیناً بجھل کے اڈے کے آدمی سے بھنک مل گئی تھی کہ بجھل کسی لمبے سفر پہ روانہ ہوا ہے لتا گیا ہے کہ اُس کی واپسی مشکوک ہے، اُسے کسی نے بتایا ہوگا نے سے پہلے بجھل نے اپنے بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر کے ھا کہ اُسے بارہ ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو اپنے آگے بچھے کی فکر نہ رکھتے ہوں اور جو اپنا سب کچھ تج کے اُس کے ساتھ جا سکیں، اُس نے اُن میں سے بارہ آدمی چنے تھے۔ جو رہ گئے وہ سب بجھل کے پرانے آدمی تھے مگر کسی نازک لمحے اُن

کے منہ سے بات نکل گئی ہو یا کبن خاں اور کانتے ہی سے کوئی ناراض ہو گیا ہو۔ آدمی کا کیا بھروسا۔ کوئی پتھر مار دے تو چپ رہے اور ایک تنکا چبھ جائے تو چیخ پڑے۔ کچھ بھی ہو۔ رتنا نے خوب سوچ سمجھ کے ہی بجھل کے اڈے کی طرف قدم بڑھائے ہوں گے۔ ہتھیار سنبھالنے کا سلیقہ اُسے کچھ زیادہ ہی آ گیا ہوگا مگر رتنا کے لیے یہ خبر کہ بجھل کلکتے آ پہنچا ہے کسی حادثے کا درجہ نہ رکھتی ہو۔ پیرو کا الگ ٹھیرنا تشویش کا سبب بن سکتا تھا۔ پیرو اور اُس کے ساتھی وہاں کیوں موجود ہیں۔ اُن کے ساتھ وہ بزرگ شخص کون ہے اور اُن صندوقوں میں کیسا سامان بھرا ہے۔ یہ لوگ اتنے دنوں تک کہاں تھے، کہاں سے آ رہے ہیں؟ بجھل اور پیرو کا بیک وقت کلکتے میں نظر آنا محض اتفاق نہیں ہوگا اور ضروری نہیں کہ انھیں یہیں آ کے اپنے اڈے کے متعلق خبر ملی ہو، وہ کوئی منصوبہ بنا کے نہ آئے ہوں۔ بہر صورت رتنا کے آدمی ہمارے پیچھے تو سائے کی طرح لگے ہی ہوں گے۔ قدم قدم پہ پیرو کی نگرانی بھی کرتے رہیں گے۔ سو پیرو کا ہوٹل میں ٹھیرنا کچھ زیادہ سود مند نظر نہیں آتا تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ پیرو سامنے کا آدمی نہیں ہے۔ ممکن ہے رتنا کے آدمی بے سبب اُس سے اُلجھتے ہوئے ترتیں پیرو پر آڑی ترچھی نگاہیں ڈالنا ایسا آسان بھی نہیں تھا۔ شاید انھیں معلوم ہو کہ پیرو کون ہے۔ رہا پولیس کا، تو پولیس کا بھی کسی الزام کے بغیر پیرو کے گرد حصار ڈالنے کا امکان نہیں تھا۔ کلکتے کی پولیس میں اُس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے، نہ بمبئی سے کلکتے آنے جانے پر کوئی پابندی عائد ہے، نہ ہوٹل میں ٹھیرنا جرم ہے۔ ان تمام باتوں کے سوا پیرو خود بھی تو ہر ممکن احتیاط کرے گا، اپنے لیے نہیں تو اباجان کے لیے۔ اُسے اندازہ ہوگا کہ ایک ذرا سی چوک کتنے بڑے حادثوں سے دوچار کر سکتی ہے۔

دھوپ چڑھ رہی تھی اور اسٹیشن کے باہر حسبِ معمول انسانوں کا سمندر بہہ رہا تھا۔ وہی عمارتیں، وہی سواریاں، وہی لوگ، وہی چیخ پکار مگر سب اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا۔ ہم کسی سواری میں نہیں بیٹھے۔ بجھل لنگڑا لنگڑا کے چل رہا تھا۔ اِس وقت سب کے ذہن میں یہی تھا کہ ہم سیدھے اڈے کی طرف جائیں گے۔ باہر آ کے احساس ہوا کہ مزید کچھ جانے بوجھے بغیر اڈے کا رُخ کرنا قرینِ عقل نہیں ہے۔ ابھی ہم کچھ بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہو گیا۔ بدرو نے صرف چند باتیں بتائی تھیں جنھیں سُن کے حواس ہی برقرار نہیں رہے۔ وہی باتیں اتنی اچانک تھیں کہ کچھ اور جاننے کی سکت نہیں تھی۔ سانٹے بدرو کو الگ لے گیا تھا مگر باہر آ کے اُس نے اپنے ہونٹ بند رکھے، نہ کسی نے اُس

سے کچھ پوچھا۔ پہلے ہمیں سکون کی کسی جگہ بیٹھ کے اپنے اوسان درست کرنے چاہئیں تھے۔ بدلسو ہمارے ساتھ ہی تھا۔ پلٹو نے اُسے ایک چادر دے دی تھی جس سے اُس نے اپنا گریبان چھپا رکھا تھا۔ اسٹیشن سے ہم نے سو گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اپنے ہی اڈے کا ایک آدمی نظر آ گیا۔ ہلاکو نے جینی کو، جینی نے جامو کو ٹوکا اور جامو نے اُسے آواز دی۔ وہ ہریالا تھا۔ دُبلا پتلا، لمبا، ادھیڑ عمر۔ ہریالے نے مڑ کے دیکھا اور اُچھل پڑا۔ ہمیں دیکھ کے اُس کا بھی وہی حال ہوا جو بدرو کا ہوا تھا۔ جیسے ہم بھوت ہوں اور مرنے کے بعد دوبارہ نمودار ہوئے ہوں۔ ہریالا پہلے تو سٹپٹایا سا رہا، پھر بجھل کے پیروں پر جھک گیا۔ بجھل نے اُس کی گدی پکڑ کے کھڑا کیا تو ہریالے کا جسم اُس کی انگلیوں میں جھول گیا جیسے اُس کی جان نکل گئی ہو۔ "سیدھی طرح کھڑا رہ۔" بجھل نے جھن جھناتی آواز میں کہا۔

ہریلے سے بولا نہیں جا سکا۔

سامنے ایک ہوٹل تھا۔ جامو نے ہریالے کو اُسی طرف چلنے کا اشارہ کیا اور اندر بیٹھنے کے بجائے ہم باہر پڑی ہوئی تپائیوں پر بیٹھ گئے۔ ایک ایک پل کاٹنا دو بھر ہو رہا تھا۔ سب کا دل یہی جی چاہتا ہوگا کہ اُڑ کے اڈے پہنچ جائیں اور رتنا سے پہلے کسی اور کو نہ دیکھیں۔ ہریالے کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ "مجبور تھے استاد! بہت مجبور تھے۔"

"آگے بول سُور کی اولاد!" جامو نے گرج کے کہا۔

"ماں قسم اپنے کا کوئی دوش نہیں ہے۔" وہ لرزیدہ آواز میں بولا۔ "ہم تو خوار ہو گئے۔ ایک دم تختے بن گئے جامو استاد!"

"تو ابھی زندہ کیوں ہے حرام زادے!" ہلاکو نے غصے سے کہا۔

"سب جگاڑ میں لگے ہوئے تھے پر پر...."

فضول کی باتیں کرنے سے کیا حاصل تھا۔ بجھل نے ہاتھ اُٹھا کے ہلاکو کو روک دیا اور پھر جو کچھ ہریلے نے بتایا، اُسے سُن کے سب کے چہروں سے خون پھوٹنے لگا۔ ہریالے کے کہنے کے مطابق یہ کوئی ڈیڑھ مہینے پہلے کی بات تھی، وہ چھ بجے شام کو اڈے پر گیا تھا۔ کبن خاں اڈے کے دوسرے آدمیوں کے ساتھ بیچ صحن میں رکھی ہوئی چوکی پر بیٹھا تھا۔ نورا اُس کی انگلیاں چٹخا رہا تھا اور کبن خاں بہت خوش نظر آتا تھا۔ ہریالا اُسے سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ کبن خاں نے اُس کی خیریت پوچھی۔ ہریالا بتا رہا تھا۔ اُس نے پوچھا "استاد کب آ رہے ہیں؟" کبن خاں نے مسکرا کے جواب دیا۔ "جلد ہی آ جائیں گے۔ بس آتے ہوں گے۔ جلدی آ جائیں گے۔" بجھل کے بارے میں پوچھنے والوں کو وہ یہی جواب دیا کرتا تھا۔ کالے تے وہاں موجود نہیں تھا۔ کبن خاں نے کہ وہ کہیں گیا ہوا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ کلکتے سے باہر ہے۔ ہر ا حسبِ معمول تھی۔ کبن خاں سے کسی کو کوئی شکایت نہیں تھی۔ میں کم از کم ایک بار رات کو محفل جمتی تھی۔ روز صبح اُٹھ کر علاقے کا چکر لگاتا، دوسرے تیسرے روز دوسرے اڈوں علاقوں کا کالے تے کا بھی یہی معمول تھا۔ درمیان میں سیالدہ کے لوگوں نے من مانی کرنے کی کوشش کی تھی۔ تھوڑا سا مچھٹول ہوا، کالے تے اور کبن خاں نے جا کے معاملہ رفع دفع کر دیا۔ اپنے اڈے کے لوگوں کو کبن خاں سے ایک ہی شکایت تھی کہ وہ حد سے زیادہ درگزر سے کام لیتا ہے۔ دوسرے اڈوں سے آمدنی کا بھتا بھیجنے میں لوگ ٹال مٹول کرنے لگے تھے۔ اِدھر اُدھر کے علاقے کے لوگ بھی دھندے کی چوری کرتے تھے۔ کبن خاں بہت دیر میں سختی کرتا تھا۔ کالے تے ہی عموماً کر کے لاتا تھا۔

ہریالا تھوڑی سی دیر بیٹھ کے چلا آیا۔ رات کو وہ اڈے پر نہیں تھا۔ اُسے ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔ سارے کے سارے لوگ اڈے پر نہیں رہتے تھے۔ ہریالا اڈے سے مستقل وابستہ نہیں تھا۔ صبح علاقے میں شور مچا تو وہ بھاگا ہوا اڈے پہنچا۔ پولیس پہرا دے رہی تھی اور بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ اِردگرد کی ساری دکانیں بند تھیں۔ اُسے قریب نہیں جانے دیا گیا۔ اُس وقت اُس کا وہاں سے فرار ہو جانا ہی ٹھیک تھا لیکن اُسے لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ کبن خاں، شولی، لالہ، فدا، بسوا، نضیرا وغیرہ اڈے کے بہت سے لوگ مارے گئے ہیں، ۱۴ آدمی۔ دوپہر کو اُن کی لاشیں علاقے کے لوگوں کے حوالے کر دی گئیں۔ سب خون میں لت پت تھے۔ اِدھر پولیس نے اڈے کے آدمیوں کو تھوک کے گرفتار کرنا شروع کر دیا تھا لہٰذا مرنے والوں کی تجہیز و تکفین کریا کرم کا کام مشکل ہو گیا تھا۔ علاقے کے باسی لاشیں چھوتے ہوئے ڈرتے تھے۔ شام تک لاشیں پڑی رہیں۔ بہر حال کچھ لوگوں نے مل کے انھیں قبروں میں چھپا دیا یا جلا دیا۔ آئندہ چھ سات روز تک کہیں چھپا رہا کیونکہ پولیس کا خیال تھا کہ یہ سب اپنے اڈے کے آدمیوں ہی کا کیا دھرا ہے۔ لہٰذا آپس کے جھگڑے کا نتیجہ ہے۔ وہ کالے تے کی تلاش میں تھے لیکن کلکتے میں موجود نہیں تھا۔ جیسے ہی وہ واپس آیا، اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ شاید دوسرے یا تیسرے ہی روز واپس آ گیا تھا۔ نصیب میاں اڈے پر کہیں چھپے ہوئے تھے، انھیں بھی پولیس پکڑ کے لے گئی۔ پندرہ بیس روز تک اڈا سنسان پڑا رہا۔ پھر بنا پہرا چند دن بعد ہی اُٹھا لیا تھا اور علاقوں سے بھی متعدد پکڑے گئے۔ رفتہ رفتہ وہ چھوٹتے گئے لیکن کالے تے اور کئی کو انھوں نے اب تک نہیں چھوڑا ہے۔

بیشتر الزام کالے تے پر آ رہا ہے اور یوں طرح طرح کی باتیں گرم ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ کبن خاں اور کالے تے نے مل کے بجھل اور اُس کے ساتھیوں کو سفر میں کسی جگہ ختم کروا دیا۔ بجھل اڈے کی خبر سُن کے مزید واپس آتا یا کسی کو بھیجتا، پھر کالے تے نے کبن خاں کو راستے سے ہٹا دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ کلکتے سے عدم موجودگی کا عذر پیش کر کے بے گناہی ثابت کر سکے یا شاید کر بھی سکے۔ کچھ لوگ بجھل ہی کو اصل سبب سمجھتے ہیں، کہتے ہیں یہ سب اُسی کی کوئی ترکیب ہے، اُس کے اشارے پر ہوا ہے اور باہر چلا گیا تاکہ اُس پر کوئی حرف نہ آئے اور اس طرح اپنے ناپسندیدہ لوگوں کو اُس نے رستے سے ہٹا دیا۔ یہ لوگ سر چڑھ گئے اور آگے جا کے مشکلیں پیدا کر سکتے تھے۔ کچھ کہتے ہیں کہ بجھل کبن خاں سے خوف زدہ تھا یا اُن کے درمیان ایک عورت کا جھگڑا تھا۔ بجھل کبن خاں کی بہن کو اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ کچھ کہنا تھا کہ اڈے کے دوسرے آدمی بجھل کے فیصلے سے ناخوش تھے کہ اُس نے لکھنؤ کے ایک اجنبی آدمی کو اڈے پر استاد بٹھا دیا ہے جب کہ یہ حق پرانے آدمیوں کا تھا۔ اُس نے آدمیوں پر اعتبار نہیں کیا اور کالے تے نے نہیں انھی ناخوش لوگوں نے کبن خاں کو ہٹا کے گویا بجھل سے بدلہ لیا ہے۔ ہریالا بتلانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ ہم نے بیچ میں دخل نہیں دیا۔ جو وہ کہتا سنتے رہے۔ اِن باتوں پر توجہ دینا وقت ضائع کرنا تھا۔ ہریالا پھر خود کہنے لگا۔ یوں لوگ عجب عجب باتیں کرتے ہیں مگر کسی کو اُن پر یقین نہیں ہے اور وہ یقین کرنا بھی نہیں چاہتے۔ سب جانتے ہیں وہ کون ہو سکتا ہے مگر وہ کھلے عام اُس کا نام نہیں لے سکتے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا ہے۔ رتنا واقعے کے پندرہ دن بعد کلکتے میں دکھائی دیا تھا۔ آنے کے بعد وہ مختلف اڈوں پر آتا جاتا رہا۔ پھر کوئی بیس بائیس دن پہلے وہ اپنے اڈے کے علاقے میں آیا۔ اُس نے سیٹھ مول جی سے اڈے کی عمارت کرائے پر لینے کا مطالبہ کیا۔ معلوم ہوا کہ سیٹھ نے انکار کر دیا تھا، کہتا تھا کہ اُسے استاد بجھل کے آنے کا انتظار ہے، جب تک نہیں آ جائے گا، وہ عمارت کسی کو نہیں دے گا لیکن رتنا نے اُس کی ایک نہیں سُنی اور چابی لیے بغیر نہیں ٹلا۔ ہریالے کو معلوم نہیں تھا کہ عمارت بجھل کی ملکیت ہے۔ بجھل نے احتیاط کے طور پر اُسے مول جی کے نام کر دیا تھا اور خود کو اُس کا کرائے دار ظاہر کرتا تھا۔ مول جی بجھل سے کوئی اَڑ چڑ پیدا نہیں کر سکتا تھا۔

اڈے پر بیٹھ کے رتنا تین چار دن تو چپ چپ رہا، پھر اُس نے لوگوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا۔ دوسرے اڈوں کے آدمیوں کی آمد و رفت بڑھ گئی خصوصاً موچی پاڑے کے اڈوں کے آدمیوں کی۔ پھر رتنا علاقے میں غتر بود کرنے لگا۔ اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کے اَن گنت آدمی تھے۔ اُس نے بجھل کے پرانے ساتھیوں کو پیش کش کی کہ وہ حسبِ سابق دھندا کرتے رہیں اور اڈے سے اپنی وابستگی جاری رکھیں۔ جس نے انکار کر دیا، اُس کے لیے اپنے ہی علاقے میں دھندا کرنا مشکل کر دیا گیا۔ کچھ لوگ انتظار کرتے رہے کہ شاید کوئی پلٹ کے آ جائے، استاد بجھل، جامو، سارنگ، ہلاکو، جینی، پلٹو وغیرہ میں سے کوئی بھی۔ ممکن ہے لاڈلا ہی آ جائے۔ پر اُن کی کہیں سے کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ رتنا سے وابستگی کے بغیر دھندا کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ بجھل کے پرانے آدمیوں کے پیچھے ایک ایک پر چار چار آدمی سائے کی طرح لگے رہتے تھے اور اپنے آدمی باہر ہی کتنے رہ گئے تھے۔ وہ یا تو جیل میں تھے یا مارے گئے تھے یا کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ جو چھوٹے موٹے رہ گئے تھے، اُن کا کوئی ولی وارث نہیں تھا۔ پھر بھی یہ لوگ ہریالے کے بقول استاد فیضو اور استاد پنجابی کے پاس گئے اور کہا کہ وہ بجھل کے دوست ہیں اور خاموش بیٹھے ہیں۔ دونوں نے ایک ہی قسم کا جواب دیا کہ ابھی خاموش رہنا بہتر ہے۔ پولیس کے تیور بگڑے ہوئے ہیں۔ لوگ اور بھی کئی جگہ گئے۔ تقریباً ہر جگہ سے مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ لوگوں کو کالے تے اور اپنے اڈے کے دوسرے آدمیوں کے چھوٹنے کا انتظار تھا اور یقین تھا کہ کالے تے ہی آ کے کچھ کرے گا۔ اُسے پولیس نے نہیں چھوڑا۔ ہریالا کہہ رہا تھا کہ پولیس نے ہمارے متعدد آدمیوں کا چلکا لیا تھا اور تھانے پر اُن کی صبح و شام حاضری لازمی قرار دے دی تھی۔ پولیس کے اِس رویے سے تنگ آ کے کچھ لوگ دانستہ اُلٹے سیدھے ہاتھ ڈال کے جیل میں چلے گئے۔

ہریالا رتنا کے اڈے سے اپنے تعلق کی ہزار تاویلیں دے رہا تھا اور بار بار ٹھہر کے ہمارے چہرے دیکھتا تھا۔ وہ رُک جاتا تو جینی، پلٹو اور ہلاکو جو اُس کے پاس ہی بیٹھے تھے، اُسے زور سے کہنیاں مارنے لگتے۔ "بھونکتا رہ۔" وہ چیخ کے کہتے اور ہریالا بوکھلا کے پھر بولنے لگتا۔ وہ بتا رہا تھا، رتنا نے اڈا سنبھالتے ہی شہر کے تمام اڈوں پر کہلا بھیجا تھا کہ اب انھیں بھتا بھیجنے کی ضرورت نہیں، یہ بھتا وہ اپنے پاس رکھیں۔ پھر اُس نے کچھ دن پہلے رنڈی نچوائی، اُس میں شہر کے کئی استاد شریک ہوئے۔ استاد فیضو اور استاد پنجابی نہیں آئے تھے لیکن اُن کے اڈے سے کچھ لوگ ضرور شامل ہوئے تھے۔ رات بھر رنڈی ناچتی رہی اور شراب

پی جاتی رہی۔ رتنا نے علاقے کے عام لوگوں کے لیے کھانے کا انتظام کروایا تھا۔ تقریباً سارا کھانا بے کار گیا۔ علاقے سے گنتی کے چند فقیر بھکاری ہی شریک ہوئے یا وہ لوگ جنھیں زبردستی وہاں لایا گیا تھا۔ ہریالا کہہ رہا تھا کہ علاقے میں رہنے والے ایک دوسرے سے تجھل کے متعلق پوچھتے ہیں اور کوئی کسی کو جواب نہیں دے پاتا۔ رتنا نے شروع شروع میں سختی کی تھی پھر نرمی کرنے لگا۔ علاقے میں وہ تین چار دن کے وقفے سے گھوم لگاتا ہے مگر کسی سے زیادہ بات نہیں کرتا، گزرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ لوگ اُس سے بات کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ علاقے کی دکانیں اب جلد ہی بند ہو جاتی ہیں۔ رات کو لوگ اپنے گھروں پر ہی رہتے ہیں۔ اڈے کے اردگرد کی تمام گلیوں کی عورتیں صرف ضرورت کے وقت باہر نکلتی ہیں، مکانوں کی کھڑکیاں اور فلیٹوں کی بالکنیاں خالی رہتی ہیں۔

ابتدا میں آسنسول سے استاد موتی آیا تھا۔ سُنا ہے جیل میں کاٹنے سے ملنے گیا تھا اور دو تین اڈوں کے بھی اُس نے چکر لگائے تھے لیکن پولیس نے اُس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ لوگ کہتے ہیں، ایک دن اُسے حوالات میں بھی رکھا۔ تین چار دن بعد پھر اُسے کسی نے کلکتے میں نہیں دیکھا، اڈے پر بیٹھے ابھی رتنا کو دو ایک روز ہی ہوئے تھے کہ ایک شام پولیس افسر دت چند سپاہیوں کے ساتھ اُس کے پاس آیا تھا۔ آیا اور چلا گیا۔ معلوم نہیں دونوں کے درمیان کیا بات ہوئی۔ علاقے میں پولیس گشت کرتی رہتی ہے۔ کئی دن پہلے کی بات ہے، رتنا بازار سے گزر رہا تھا، اُس کے ساتھ کچھ اور آدمی بھی تھے کہ اچانک تیجا ایک گلی سے نمودار ہوا اور کھلے چاقو کے ساتھ رتنا کے عین سامنے آگیا۔ رتنا کے ساتھی اُس پر دوڑے مگر رتنا کو خود چاقو کھولے دیکھ کے پیچھے ہٹ گئے۔ تیجا نے اتنا وقت دیا تھا کہ رتنا چاقو کھول سکے۔ وہ چاہتا تو جھپٹ کے اُس کے سینے میں چاقو گھونپ دیتا یا اُس کی جانب اچھال دیتا۔ گلی میں سکوت چھا گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ تیجا نے اپنی طرف سے بہت کوشش کی، رتنا کو کئی بار پچھاڑا مگر آخر رتنا نے اُس سے چاقو چھین لیا۔ رتنا تیجا کو مار سکتا تھا۔ اِس کے بجائے اُس نے تیجا کا چاقو اُسے واپس کیا اور ایک طرف چل دیا۔

تیجا کھڑا دیکھتا رہ گیا اور اُسی دن اُس نے علاقے کی ایک دکان سے چوری کی، ایسی چوری کہ پکڑا جائے۔ تیجا اُسی دن جیل چلا گیا۔ اُس نے اتنے دنوں تک اپنے آپ کو کہیں چھپائے رکھا تھا۔ ہریالا بتا رہا تھا کہ تیجا نے رتنا کے ہاتھوں اپنا چاقو چھنوایا۔ ہم نے تبصرہ نہیں کیا لیکن کسی کو یقین نہیں آتا تھا۔ تیجا کا ہاتھ خوب رواں تھا۔ اُس کے جسم میں بجلی بھری ہوئی تھی۔ بچپن ہی سے وہ تجھل کے ساتھ تھا اور اڈے کا خاص آدمی تھا۔ تبت جانے سے پہلے اُس نے ہمارے ساتھ تمنچا چلانے کی بھی مشق کی تھ تجھل نے اُسے کلکتے میں چھوڑ دیا تھا۔ تیجا کو بھی نہ جانے کیا اس کا مطلب یہی تھا کہ رتنا نے اپنا ہاتھ خوب مانجھ کے ا کا رُخ کیا ہے۔

چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ کسی نے ایک گ بھی حلق سے نہیں اُتارا تھا۔ سب یکایک کھڑے ہو گئے۔ ہ تجھل اُٹھ گیا تھا۔ یہ بند کر دے ! اُس نے تمتمائے ہوئے لہجے لے کہا اور اکیلا ہی آگے چل پڑا۔ ہریالا اور بدلو بھی ہمارے چلتے رہے۔ ہماری رفتار خاصی تیز تھی۔ کچھ دُور جا کے سڑک پہ چنگاما مل گیا۔ ہمیں دیکھ کے اُس کا رنگ ایک لمحے کے سفید پڑ گیا۔ چنگاما کا تعلق چاٹگام شہر سے تھا۔ نام اُس کا تھا مگر سب اُسے چنگاما ہی کہتے تھے۔ استاد دھوی کے اڈ آدمی تھا۔ جب میں جیل میں تھا تو وہ وہاں کبھی کبھی چار، چھ مہ آجاتا تھا۔ ہم نے چنگاما سے کچھ نہیں پوچھا تھا مگر شاید بدرو ہریلے نے اپنے کہے ہوئے کی تصدیق کے لیے اُسے ا کر دیا تھا۔ چنگاما نے کم و بیش وہی باتیں بتائیں جو پہلے ہ ہریالا منہ سے پھوٹ چکے تھے۔ البتہ چنگاما کا کہنا تھا کہ دتہ آگے موجدار کے آدمی تھے اور رتنا خود بھی باہر سے آدمی لا رات کو انھوں نے اڈا چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ اڈے کا انھی کے ایک آدمی نے کھولا تھا جو کئی دن سے کتین خاں ک سے اڈے ہی پہ رہتا تھا۔ پولیس کو وہ آدمی اب تک نہیں تجھل کچھ اور سننا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے نگاہ اُٹھا کے چ کو چپ ہو جانے کی تلقین کی۔ چنگاما کی زبان جیسے منجمد ہو گئی۔

اڈے کا فاصلہ چار پانچ میل سے کم نہیں ہو گا۔ اسٹیشن خاصی دُور تک پیدل آگئے تھے۔ میں نے سوچا ٹیکسی کو آواز جتنی دیر ہو رہی تھی، دل اُڑتا جا رہا تھا۔ جسم میں کوئی چیز جل تھی جیسے کوئی چیز اٹک گئی ہو، سارے جسم میں پھانسیں چ ہوں۔ راستے میں اڈوں کے اور آدمی بھی مل سکتے تھے۔ اس سے کہ کوئی ہم سے پہلے پہنچ کے رتنا کو اطلاع دے، ہمیں خود ہی اپنی آمد کی خبر کر دینی چاہیے۔ درمیان میں کہیں ہمیں پولیس بھی سکتی تھی لیکن معلوم نہیں، تجھل کیا سوچ رہا تھا۔ جب اڈے ا طرف جانا مقصود تھا تو کسی سواری میں کیوں نہیں۔ دیر کا تھی۔ کیا ابھی کچھ اور جاننے اور سوچنے کو رہ گیا تھا۔ تجھل جلد پاؤں میں تکلیف کے باوجود تیز تیز۔ بیچ میں ہاوڑا کا بڑا پڑتا تھا۔ ہم وہاں سے راستہ کاٹ کے بھی نکل سکتے تھے وہ اُسی طرف جا رہا تھا۔ تھانے کے قریب اُس نے مڑ کے دیکھا اور سولم کو بلایا۔ چاہے تو نکل جائے ! اُس نے آہ

ولم سے کہا۔

سُولم بڑھ کے اُس کے گلے سے لپٹ گیا۔ سُولم چاٹگا کے اڈے سے وابستہ تھا۔ تجھل نے تبت جاتے ہوئے سے اُسے اپنے ساتھ لیا تھا۔ اڈے کے چند خاص آدمیوں واکسی کو معلوم نہیں تھا کہ سُولم ہمارا ہم سفر ہے اور وہ ہمارے بھی نہیں گیا تھا، ہم سے پہلے جامو اور بیرو وغیرہ ایک دن ڈبروگڑھ کے لیے کلکتے سے روانہ ہوئے تھے۔ سُولم بھی کے ساتھ تھا۔ سُولم اُسی وقت ہم سے الگ ہو سکتا تھا۔ اگر پولیس کا کوئی چکر پڑنے والا تھا تو اس طرح سُولم صاف مگر سُولم کیسے جاتا۔ تبت میں وہ قدم قدم پہ ہمارے پہلو رہا تھا، تیرے میرے عذاب میں خواہ مخواہ کا شریک۔ بیمار پڑا، مرتے مرتے بچا۔ کبھی شکایت کا ایک حرف زبان لایا، ہمیشہ کی طرح اُس کا چہرہ مسکراتا ہی رہا۔ اب وہ کیسے جاتا ! تجھل نے اصرار بھی کیا۔ سُولم کی آنکھیں بھر آئیں۔ تجھل پھر کے شانے پر ہاتھ رکھے بڑھتا رہا اور اس وقت ایک ثانیے لیے میرا سارا جسم جھنجھنا سا گیا جب تجھل آگے جانے کے بجائے نے کے پھاٹک میں داخل ہونے لگا۔ دروازے پر تعینات ی نے اُسے غور سے دیکھا اور زور سے سیٹی بجائی۔ جواب میں بھی سیٹیاں بجنے لگیں اور ہم عمارت کے آگے چھوٹا ہوا مختصر عبور کر کے چبوترے پر نہیں چڑھے تھے کہ سپاہی چاروں طرف اُبل پڑے اور ہمارے گرد پھیل گئے۔ اُسی لمحے ایک دراز قد، بڑی عمر افسر بھاگتا ہوا اندر سے آیا اور ٹھٹک کے ہم سے کچھ فاصلے ہماری صورتیں گھورنے لگا۔ "استاد تجھل ! "وہ حیرت سے بولا۔

" ہاں سورتی بابو !" تجھل نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

" تم، تم ۔ ۔ ۔ سب ۔" انسپکٹر کی آواز گلے میں اٹک گئی۔

" سوچا، ہمی چلے جائیں، تمھیں تکلیف ہو گی۔ شہر اُترتے ہی پتا چلا کہ تم لوگوں کو اپنی تلاش ہے۔" تجھل نے رُک رُک کے کہا۔

" تلاش، مگر تم لوگ، تم سب کہاں تھے ؟"

" اِدھر سے دُور تھے ۔"

" آؤ، آؤ۔ اندر آجاؤ ۔"

" اندر ہی جانے کے لیے آئے ہیں ۔"

انسپکٹر سورتی جیسے ابھی سو کے اُٹھا ہو اور خواب دیکھتا ہو، وہ کچھ اس طرح ہڑبڑاتی پلکوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا، کبھی کبھی سپاہیوں کو اور اپنے آپ کو۔ تجھل دو قدم چل کے چبوترے پر چڑھ گیا۔ انسپکٹر جھجکتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھا، کے پیچھے پیچھے ہم چلے۔ "بیٹھ جاؤ۔" اُس نے تذبذب سے کہا۔ کرسیاں چار سے زیادہ نہیں تھیں، تجھل کھڑا رہا۔

" ٹھیک ہے سورتی بابو !"

سورتی نے دوبارہ بیٹھنے کو نہیں کہا۔ "ہمیں تمھاری تلاش تھی، تمھیں ٹھیک بتایا گیا۔ ہمیں تمھاری تلاش تھی۔" سورتی کی آواز لپک رہی تھی۔

" اِسی کارن ہم خود آگئے ۔"

" مگر یہ سب کیا ہوا ہے ؟" سورتی اضطراب سے بولا۔

" یہی اپنے کو بھی تم سے پوچھنا ہے ۔"

" تم کچھ نہیں جانتے ؟" اُس کے لہجے میں مضحکہ تھا۔

" تھوڑا بہت جانا ہے پر اصل تو تم سے پوچھنا ہے۔"

" ٹھہرو !" وہ ایک دم اُٹھ کے بولا۔ "ڈی ایس پی صاحب بھی یہیں ہیں۔ ڈی ایس پی راجندر ماتھر۔" سورتی تیز قدموں سے باہر چلا گیا اور اُسی لمحے واپس آگیا۔ وردی میں ملبوس ایک شخص کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ درمیانہ قد، بھاری جسم، سر کے آدھے بال اُڑے ہوئے، چھوٹی آنکھیں، سرمئی رنگ۔ وہ یقیناً ڈی ایس پی ماتھر ہو گا۔ تجھل نے ایک ہاتھ اوپر اُٹھا کے اُسے سلام کیا۔

" سلام ساب ۔"

" سلام۔" وہ گردن ہلا کے گونجتی آواز میں بولا۔ "استاد تجھل !"

" ہاں ساب ۔" تجھل نے نرمی سے کہا۔

" تم کہاں تھے ؟"

" سفر پہ تھے ماتھر جی !"

" کون سے سفر پہ ؟"

" ذرا دُور چلے گئے تھے ۔"

ماتھر کے ہونٹ باہر نکل آئے۔ "کہاں ؟"

" کوئی ایک جگہ ہو تو نام لیں۔ دُور دُور گھوم رہے تھے ۔"

" بتانا نہیں چاہتے۔" وہ جز بز ہو کے بولا۔

" اِدھر کلکتے میں نہیں تھے ماتھر جی !"

" مگر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کون سی جگہ تھے ؟"

" دھیرج رکھیں ساب ! وقت آئے گا تو اُس کو بھی بول دیں گے۔" تجھل نے کسمسا کے کہا۔ "آپ کو اپنی جو کارروائی کرنی ہے، کرو ۔"

" جانتے ہو تم پر کیا الزام ہے ؟"

" اپنی ساری زندگانی الزام ہے۔ اب کیا کوئی پیچھے سے بڑھ کے ہے ۔"

" بہت بڑھ کے اُستاد !" ماتھر کی آواز کڑک رہی تھی۔ "یاد ہے، میں نے پہلے بھی کئی بار کہا ہے، ایک آخری وقت ضرور

آئے گا۔ تم بچ نہیں سکو گے۔"

"یاد ہے مائی باپ! اپنی بھی ایک بات شاید سرکار کو یاد ہو۔ میں نے بولا تھا، آخری وقت آئے گا تو کون روکے گا۔ ہر بار ایسا لگتا ہے کہ اب کے آگیا، پر نٹ کھٹ بغل سے ہو کے نکل جاتا ہے۔" تجمل نے مدھم لہجے میں کہا۔

"ہمیں اُوپر سے سخت حکم ہیں۔"

"ہم آپ کے سامنے ہیں ماتھر جی! اسٹیشن سے آگے پہلا بڑا تھانا یہی پڑتا تھا، سو ہم اِدھر ہی آگئے۔"

ماتھر نے ہنکاری بھری اور کنپٹیاں مسلتا ہوا تیزی سے بولا۔ "تو تم کہتے ہو تم یہاں اس شہر میں نہیں تھے؟"

"ہاں ساب! ایسا ہی بولا ہے۔"

"مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ تم یہاں تھے یا نہیں۔"

"آپ ٹھیک بولتے ہو، پھر آپ کیا پوچھتے ہو۔ آپ کے لیے نہیں پڑتا، پر اپنے لیے بہت پڑ گیا ہے۔"

"کتنے دنوں سے تم باہر تھے؟" وہ پہلو بدل کے بولا۔

"آدھے سال سے اوپر ہونے کو ہوگا۔"

"باہر کیا کر رہے تھے؟"

"ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں۔" تجمل نے تنک کے کہا۔ "سارے سوال اِدھر ہی کر لو گے تو اُدھر کے لیے کیا بچے گا۔ باہر کبوتر اُڑا رہے تھے۔"

ماتھر کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں کچھ بولتے بولتے رہ گیا۔ کمرہ بڑا تھا۔ میز کے پیچھے اور ہمارے دائیں بائیں کئی سپاہی مستعد کھڑے تھے۔ ماتھر نے چاروں طرف ایک اچٹتی نظر ڈالی اور انسپکٹر سورتی سے سرگوشیانہ لہجے میں کچھ کہنے لگا۔ سورتی فوراً باہر چلا گیا۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔ ہلاکو میرے قریب میرا بازو پکڑے کھڑا تھا، جامو تجمل کے پاس تھا۔ باقی سب پیچھے تھے۔ یکلخت ماتھر سپاٹ لہجے میں بولا۔ "میں نے تم سے بولا ہے۔ اُوپر سے بہت زور ہے۔"

"ہوگا، ضرور ہوگا۔ پر زور تو دونوں طرف سے لگ رہا ہے۔ اُوپر سے بھی، نیچے سے بھی۔ نیچے والے بھی کم زور نہیں ہوتے۔ پھونکوں سے آگ جلا دیتے، بجھا دیتے ہیں۔ آپ کوئی نئے تو نہیں ہو، جانتے ہو، اُوپر کا زور کب تک چلے گا۔ نیچے والے سارا دھواں اُڑا دیں گے۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"اپنا کہنا کیا، سرکار کی دہائی دیتے ہیں۔"

"استاد تجمل!" ماتھر نے اُونچی آواز میں کہا۔ "بہتر ہے سیدھی سادی بات کرو۔ جو کچھ ہوا ہے، وہ نہایت سنگین ہے۔ ابھی تک ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچے ہیں لیکن سب کا خیال ہے کہ ...."

"پھر دیر کس بات کی ہے۔" تجمل بیچ میں بولا۔

"دیر شاید تمھارے آنے کی تھی۔" ماتھر نے تلخی سے کہا۔

"ہمارے سر تمہارے ساتھ ہیں۔"

"سروں کا فیصلہ بھی ہو جائے گا لیکن اس سے پہلے تمھارے پاس موقع ہے، تمھیں جو کچھ کہنا ہو، کہہ سکتے ہو۔"

"ایک ہی جگہ پھر سب بول دیں گے۔"

"تمھارا یہاں کا بیان بھی اُدھر کام دے گا۔"

"آپ کے سنگ رہتے ہوئے اپنے کو بھی تھوڑی بہت جانکاری ہو گئی ہے۔ بیان کا پلٹا کرنے میں صرف زبان ہلتی ہے۔"

"تو تم یہاں کچھ کہنا نہیں چاہتے؟"

"ایک ہی بار جو بولنا ہوگا، بول دیں گے۔ اُدھر بولنے کو اڈّے بند نہیں ہو جائیں گے۔ آپ حکم کرو۔"

"ہمارے پاس تمھارے وارنٹ نہیں ہیں۔"

"آپ کی انگلی ہی وارنٹ ہے، وارنٹ بننے میں کیا ٹائم لگتا ہے۔"

"لیکن اگر تم چاہو تو اس کی نوبت نہیں آئے گی۔"

ماتھر کی بات سن کے تجمل کے ہونٹوں پر جمی ہوئی پپڑی تڑخنے سی لگی۔ اُس کا باچھا چھل گیا۔ جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال کے اُس نے بیڑی سلگائی۔ "ذرا پانی پلاؤ حوالدار!" اُس نے قریب کھڑے ہوئے حوالدار سے کہا۔ ماتھر کے اشارے پر وہ ایک کے گلاس میں پانی لے آیا۔ تجمل نے ایک ہی سانس میں سارا پانی حلق میں انڈیل لیا اور بیڑی کے دو ایک لمبے کش کھینچ کے بولا "ابھی گاڑی سے اُترتے سب سے پہلے یہ جھٹکے کا مال بدرو ملا تھا بولتا تھا، لوٹ جاؤ، پولیس تمھاری تلاش میں ہے۔ پھر [illegible] ہر یلا بنا، حرام کا جنا ملا۔ یہ بھی یہی بولتا تھا پر ہم آگے پیچھے کدھر بھی نہیں گئے۔ سیدھے اِدھر ہی آ رہے ہیں۔ ہم کہیں اور بھی جا سکتے تھے اتنا سن کے اپنے کو بھی پولیس کی تلاش تھی۔"

"تمھارے کہنے کا مطلب ہے؟" ماتھر کی آنکھیں سکڑ کے اور چھوٹی ہو گئیں۔ "یہاں آنے سے پہلے تمھیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا؟"

"ایسا ہی سمجھو۔"

"یعنی تم اس عرصے میں بالکل بے خبر رہے؟"

"اتنے دنوں بعد پھر آپ کے درشن نہیں ہوتے۔"

"ہوں استاد تجمل!" ماتھر اُچک کے بولا۔ "تم ایسی کون سی جگہ تھے جہاں تمھیں اپنے آدمیوں کی بھی خبر نہ مل سکتی ہو۔ شاید اُن لوگوں نے تمھیں بتایا ہو۔" ماتھر کے لہجے کا طنز چھپا ہوا نہیں تھا۔ "اس واقعے کو ڈیڑھ مہینہ ہو رہا ہے۔ گلی گلی اس خبر کا چرچا ہے۔ تمھیں [...]نے نہیں بتایا کہ تمھارے پیچھے کلکتے میں کیا ہوا، کیا ہو رہا ہے [...]م نے بھی لوٹ کے خبر نہیں لی؟"

ڈی ایس پی ماتھر لوٹ پھیر کے ایک ہی بات کی تکرار [...]ہا تھا جس کا تجمل کے پاس جواب نہیں تھا۔ کھڑے [...] ٹانگیں دکھنے لگی تھیں۔ سینے میں ایک زمانے سے یوں ہی [...]ہوں، میرا دل کہیں دھنسا جا رہا تھا۔ ہمیں شاید سیدھے اڈّے [...]ی طرف جانا چاہیے تھا۔ بعد میں یہاں آنا پڑتا تو اتنی گھٹن نہ [...]۔ ماتھر کی چمکتی نظریں تجمل پر مرکوز تھیں۔ "ہم کچھ بولیں گے تو تم [...] سمجھو گے۔" تجمل نے سانس لے کے کہا۔

"ہمیں سمجھاؤ، استاد تجمل! ہم سمجھنا چاہتے ہیں۔"

"اپنے لیے یہ بعد کی بات ہے۔"

"اور پولیس کے لیے پہلی۔"

"رسّی کا ایک سرا نہیں ہوتا اور ٹوٹی ہوئی ہو تو بہت سے ہوتے ہیں۔"

"پولیس تمھارے باہر ہونے کی شہادت طلب کرے گی۔"

"اور ہم اپنے اِدھر ہونے کی پولیس سے نہیں کریں گے، جانے دو ماتھر جی! اس بات کو جانے دو۔" تجمل نے زہر خند سے کہا۔

"مگر اس بات پر تم گرفتار کیے جا سکتے ہو اور یہی بات [...]یں آگے جا کے ثابت کرنی پڑے گی۔" ماتھر دھمکتے لہجے میں بولا۔

"اور ہم کیا بول رہے ہیں۔ آگے والوں کو بھی کچھ ثابت کرنا [...]ے گا۔ آگے والے ایک آنکھ سے دیکھتے، ایک کان سے سنتے [...]ں کیا! وہ پہلے اپنے ماتھے کا ٹھپا دیکھیں گے، پھر بات کریں [...]ے، جیسا تم کر رہے ہو۔"

"ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا، تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"کچھ سمجھنے کے لیے آنکھیں بدلنا پڑیں گی ماتھر جی! ساون کے [...]ے کو ایک ہی رنگ سوجھتا ہے۔ اپنے کو تم نے سدا سلاخوں [...]ر زنجیروں کے ساتھ دیکھا ہے، من میں ایک ہی مورت بنائی ہے۔ [...]بار ہمی پہ بجلی گرے گی سرکار! جس کے جلدی ہوئی ہے اُسی سے [...]چھتے ہو، وہ کدھر کو تھا۔ ٹھپے پر ٹھپا ہی لگاتے جاؤ گے۔" تجمل [...]ی آواز چیخنے لگی تھی۔ "گریبان کسی کو پکڑنا آتا ہے کیا! ہم کو اُوپر [...]ڑھنا نہیں آتا۔"

"دیکھو تجمل! بگاڑ کرنے سے بگاڑ پیدا ہوگا۔" ماتھر نے اپنا لہجہ [...]م رکھنے کی ناکام کوشش کی۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے [...]لک رہے تھے۔ "اپنی یہ مورت تمھی نے بنائی ہے، تمھی اسے مٹ [...]سکتے ہو۔ معاملہ اُلجھانے کی کوشش مت کرو۔ اس طرح کی باتیں کر کے [...] کیا جتانا چاہتے ہو۔ میں کہتا ہوں، تم اپنے لیے بُرا کر رہے ہو۔ شاید [...]ت بُرا۔ تم کس کے سامنے بیٹھے ہو، کسی ایسے شخص کے سامنے نہیں جو تمھیں نہ جانتا ہو، میں تمھیں اُس وقت سے جانتا ہوں، جب میں ایک معمولی سپاہی تھا اور میں کیا، یہاں سبھی جانتے ہیں کہ تجمل...."

"کوئی نہیں جانتا ماتھر جی!" تجمل اُس کی بات کاٹ کے بولا۔

"کون نہیں جانتا کہ وہ کون ہے، کیا کرتا ہے، کہاں رہتا ہے۔ کتنے دن گھر میں، کتنے دن گھر سے باہر۔ کن لوگوں کے ساتھ اُس کا اُٹھنا بیٹھنا ہے۔ اُس کی جیب میں ہمیشہ ایک ہتھیار رہتا ہے۔ اُس کے اشارے پر زندگی اور موت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اُس کی کوئی کل سیدھی نہیں، اُس کی نہ دوستی اچھی ہے، نہ دشمنی۔ کتنے فائل بھرے ہوئے ہیں۔ کیا میں اُن سب کو گنواؤں جو میرے علم میں ہیں۔ جو میرے علم میں نہیں، اُن کی تعداد اور زیادہ ہوگی۔ تمھارا سارا ریکارڈ کاغذوں میں محفوظ ہے۔ ستارے اچھے لے کے آئے ہو، ہر بار ساتھ دے جاتے ہیں مگر کب تک...."

ڈی ایس پی ماتھر کی زبان میں جیسے آگ سلگی ہوئی تھی۔ اس دوران انسپکٹر سورتی واپس آگیا۔ ماتھر نے رُک کے اُس کی طرف بے چینی سے دیکھا۔ سورتی نے اثبات میں گردن ہلائی اور انگریزی میں کچھ کہا جسے میں سن نہیں سکا۔ سورتی کو اپنے قریب رکھی کرسی پر بیٹھنے کا حکم دے کے ماتھر بگڑے ہوئے منہ سے بولا۔ مگر اُس کے لہجے میں کسی قدر ٹھہراؤ آگیا تھا۔ "سنو، ہم نے شہر میں اپنی تمام کوشش کی ہے۔ کوئی کونا نہیں چھوڑا ہے۔ ہم نے متعدد آدمیوں کو پکڑا اور اُن سے کچھ اگلوانے، کچھ جاننے کا ہر جتن کیا ہے۔ کہیں سے کوئی سراغ نہیں ملا، کوئی سرا جسے پکڑ کے ہم آگے بڑھ سکتے۔ استاد تجمل اچانک اپنے آدمیوں کے ساتھ کہیں چلا جاتا ہے، اپنا پتہ دیے بغیر۔ اُس کے خاص آدمی نہیں جانتے کہ وہ کس طرف گیا ہے، وہ لکھنؤ کے ایک بدنام شخص کبّن خاں کو اپنے اڈّے پر چھوڑ جاتا ہے۔ کبّن خاں کی موت سے تین دن پہلے استاد تجمل کا ایک اور خاص آدمی کانتے یکایک شہر سے غائب ہو جاتا ہے اور اُس کی غیر حاضری میں وہ سب کچھ ہو جاتا ہے جس کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ جب کانتے واپس آتا ہے تو آئیں بائیں شائیں کرتا ہے۔ نہیں بتاتا کہ کہاں گیا تھا۔ وہی کچھ بولتا ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ تم واپس آتے ہو تو تم بھی لاعلمی ظاہر کرتے ہو۔ پھر پانی کہاں گرے! نگاہ کس طرف بھٹکے! ہم کون سا سرا پکڑیں؟"

تجمل نیم وا آنکھوں سے سنتا رہا۔ "جواب دو تجمل؟" ماتھر وحشت سے بولا۔

"کیا جواب دیں ماتھر جی! آپ سارا کچھ بول دیے ہو۔ اب اپنی زبان کھولنے کو کیا رہ جاتا ہے۔" تجمل نے زیرِ لبی سے کہا۔

"ایسی صورت میں کیا یہ نہ سمجھا جائے کہ تمھیں سب تسلیم ہے؟"

"آپ کی خوشی اس میں ہے تو تسلیم قبول۔"

"تم ایک پولیس اسٹیشن پر بیٹھے ہو استاد تجمل! اور ایک ذمے دار آدمی سے مخاطب ہو۔" ماتھر نے بیزاری سے کہا۔

"ہتھکڑیاں منگواؤ اور ڈال دو ہم سب کے ہاتھوں میں۔"

"میرا خیال ہے تم سے مزید گفتگو کرنا بے کار ہے۔"

"پر ایک بات رہ گئی ہے آپ کی مرضی ہو تو بولیں۔" تجمل نے سرد لہجے میں کہا اور اپنی ٹانگ اُٹھا کے ایک جھٹکا دیا۔ مسلسل کھڑے رہنے سے اُس کی تکلیف اور بڑھ گئی ہوگی۔

"تم..... تم بیٹھ جاؤ استاد!" بلاکو نے جھجکتے ہوئے اُسے مشورہ دیا۔ تجمل نے اُلٹے ہاتھ سے جھٹ اُس کے منہ پر طمانچہ رسید کیا۔ بلاکو میرا بازو پکڑے ہوئے تھا، اُس کی جھونک میں، میں بھی کرسی پر گرتے گرتے بچا۔

"حواس میں رہو تجمل!" سورتی نے ناراضی سے کہا۔

ماتھر نے انسپکٹر سورتی کی مداخلت پر منہ بنایا اور میز پر تھپکی دے کے اُسے چپ رہنے کی تلقین کی۔ "تم کیا کہہ رہے تھے؟" دوسرے ہی لمحے اُس نے تجمل سے پوچھا۔

"بولتا تھا، ایک بات رہ گئی ہے آپ کی مرضی ہو تو بولیں۔"

"ہاں ہاں کہو۔" ماتھر نے تجسس سے کہا۔

"اپنے آدمی، اپنے کو واپس کر دو۔"

ماتھر اپنی کرسی پر سیدھا نہیں رہ سکا۔ "کیا..... کیا؟"

"ہم آپ سے اپنے آدمی واپس مانگتے ہیں۔" تجمل نے ملکی آواز میں کہا۔

"تمھارے آدمی تمھیں واپس کر دیں۔" ماتھر نے اضطراب سے دُہرایا۔ "یہی کہہ رہے ہو تم؟"

"آپ نے ٹھیک سُنا ہے۔"

"تم..... تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟"

"کیوں ساب! ہم اُن کو آپ سے نہیں مانگ سکتے؟"

"تم کیا، کیا بک رہے ہو؟"

"ٹھیک ہی بک رہے ہیں ماتھر جی! اِدھر اُدھر کی بات چھوڑو۔ ساری دنیا کی چوکی داری کرتے پھرتے ہو، اپنے آدمیوں کی رکھوالی نہیں کی گئی۔ ہم کس کے پاس جائیں اور اُن کو آپ سے پھر کون واپس مانگنے آئے گا۔ مدعی بننے کا حق صرف تمھی کو ہے، ہم کو نہیں ہے؟"

ماتھر لمحوں تک ساکت نظروں سے تجمل کی صورت دیکھتا رہا۔ اُس نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا پھر جیسے اچانک اُسے کچھ خیال آگیا ہو، اُس کے ہونٹوں پر استہزائی مسکراہٹ کھل اُٹھی۔

"خوب، خوب استاد تجمل! اچھا پینترا بدلا ہے تم نے۔"

"کیوں سرکار! ہم نے زبان کھولی تو پینترا ہو گیا۔"

ماتھر کے چہرے پر درشتی کی لکیریں اُبھر آئیں۔ "تمھارے دماغ میں اگر یہ خناس ہے کہ یوں دھیان بٹا کے اور معاملے اُلجھا کے تم کچھ حاصل کر سکو گے تو اسے نکال دو۔ اِس طرح تھوڑا شاید کچھ وقت ضرور مِل جائے مگر دُور جا کے نتیجہ وہی نکلے گا، ان حالات میں نکلنا چاہیے۔ اچھی طرح کانوں میں ڈال لو، پولیس اس مرتبہ تمھیں کوئی بخشش دینے کو تیار نہیں ہے۔"

"میری بات کا جواب دو ماتھر جی! اپنے آدمی کدھر ہیں؟"

"میری جیب میں ہیں۔" ماتھر بھڑک کے بولا۔

"ہم بولتے ہیں، اُن کو ہمیں واپس کر دو۔"

"ورنہ، ورنہ تم کیا کرو گے؟" ماتھر کی جھلتی آواز گونجی۔

"جو بن پڑے گا، کریں گے۔"

"تجمل! تجمل! فضول کی باتیں نہ کرو۔" ماتھر جھنجلا کے بولا۔

"اپنی باتیں فضول لگتی ہیں ساب! ہمارے آدمی چلے گئے، ایک نہیں کئی۔ ہمی سے بولتے ہو گھنٹی مت بجاؤ، شور مت کرو، ہم اپنے آدمی اِدھر چھوڑ گئے تھے۔ ایک سے ایک ہیرا تھا اُن میں۔ آپ اُن کو نہیں جانتے۔ ہم جانتے ہیں، وہ کون تھا، اُن کا ہاتھ کتنا بھاری تھا، اُن کے پٹھوں میں لوہا بھرا ہوا تھا، رگوں میں بجلی دوڑتی تھی۔ اُن کے دل کی چادر بہت بڑی تھی، سب کچھ اُس میں سما جاتا تھا۔ اُن کا بدل تمھارے تینوں میں صرف اتنا ہے کہ وہ اتنے کے آدمی تھے۔ پر اپنے وہ بھائی تھے، بیٹے تھے، ہمارے ہاتھ پیر تھے۔ ہم سے ٹھٹھول کرتے ہو کہ تم نے اپنی ہی ہڈیاں چبا لیں، اپنی ہی بوٹیاں نوچ لیں، آپ بولتے ہو کہ ہمارے پاس تمھارے پچھلے کا غذ الماریوں میں بند ہیں۔ اُن میں کہیں لکھا ہے کہ تجمل نے پیچھے سے کبھی چھرا گھونپا ہے، اُلٹی طرف سے ناک پکڑی ہے۔ اُن کو آگے سے ہٹانا ہوتا تو اُن کا سُرمہ بھی آپ کو نہیں ملتا۔ چار پانچ مہینے پہلے کلکتے سے جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کپتن خاں اپنے ہی آدمیوں کے بیچ بیٹھا تھا ماتھر جی! کپتن خاں نے اپنا کوئی خزانہ چھپا لیا تھا یا اپنی جاگیر پر قبضہ کر لیا تھا؟ اُس نے اپنی ماں کے ساتھ حرام کیا تھا تو دوسروں نے کیا کیا تھا؟ ہم اُسے اُدھر بٹھا کے گئے تھے۔ کچھ سوچ سمجھ کے ہی بٹھایا ہوگا۔ اُدھر آپ کے سر کی جگہ اُوپر پیر آگ آنے ہیں تو بھی آپ کو سامنے نظر آتے ہیں۔"

تجمل کی آواز پھیلی ہوئی تھی۔ سرد، سپاٹ۔ کمرے میں ایک اُسی کی آواز گونج رہی تھی اور جیسے ہر چیز بے آواز ہو گئی

دیواروں کے ساتھ کھڑے ہوئے سپاہی ٹکٹکی باندھے اُسی تک رہے تھے۔ بُتوں کے مانند بے حرکت۔ انسپکٹر سورتی اور ماتھر کے چہروں پر دُھند سی چھائی ہوئی تھی۔ تجمل نے ایک لمحے کو اپنا سوجا ہوا پیر اُٹھا کے دوبارہ زمین پر ٹکایا اور کہنے لگا۔ "کوئی نہیں ملا۔ بولتے ہو شہر کا کونا کونا چھان مارا۔ کوئی نہیں ملا! کسی کو دیکھنا نہیں چاہا! اُن سُور کی اولادوں نے آنکھوں پر چربی چڑھا دی۔ سامنے موٹا ہی موٹا دکھائی دیا۔ اُنھی لوگوں پر کانٹا پھینک جو سالے پہلے ہی تڑپ رہے تھے۔ کدھر دیکھا! کدھر کو دیکھا؟ تمھارا اپنا ریکارڈ ہے تو اپنے پاس بھی وردی والوں کا ریکارڈ ہے۔"

تجمل چُپ ہو گیا۔ میرے جی میں آئی کہ میں بولوں، میں ڈی ایس پی ماتھر سے ایک سوال کروں لیکن تجمل کی طرف دیکھ کے میں نے خاموشی مناسب سمجھی۔ ماتھر کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ تجمل کے چُپ ہو جانے پر وہ چونک سا پڑا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے اِن تمام پہلوؤں پر غور نہیں کیا ہوگا۔ ہم نے کوئی..... " وہ بھن بھناتے ہوئے لہجے میں بولا اور اُس کی بات منہ ہی میں رہ گئی کیونکہ باہر سے سیٹیاں بجنے اور گاڑیاں رُکنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ انسپکٹر سورتی یک لخت کھڑا ہو گیا۔ پھر ماتھر بھی۔ دونوں سپاہیوں کو اشارہ کرتے ہوئے فوراً ہی باہر چلے گئے۔ سائبان میں گونجتی ہوئی سیلوٹ کرنے اور جوتوں کی کھٹ کھٹ کی آوازیں ہم سے قریب آ رہی تھیں مگر پھر وہ دُور ہوتی گئیں۔ ماتھر اور سورتی دیر تک نہیں آئے، اس دوران ہم ایک دوسرے کو بس دیکھا کیے۔ کسی نے ایک لفظ دوسرے سے نہیں کہا، نہ تجمل نے۔ سب وہیں کھڑے ماتھر کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ ماتھر نہیں آیا۔ آٹھ دس منٹ بعد انسپکٹر سورتی تیز رفتاری سے اندر داخل ہوا اور تردد آمیز لہجے میں بولا۔ "میرے ساتھ آؤ۔"

تجمل کی آنکھوں سے سُرخی اُبلنے لگی لیکن وہ کچھ کہے بغیر سورتی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ سائبان میں دبا دبا مَرا مَرا سا شور اُٹھا ہوا تھا اور سپاہیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ سب کے سب فاصلے فاصلے پر منظم کھڑے تھے۔ بیچ کے دو تین کمرے چھوڑ کے سورتی ایک کشادہ گلی نما راستے میں مُڑ گیا اور کچھ آگے جا کے ایک بڑے کمرے میں آگیا جو ایک ہال سے مشابہ تھا۔ کمرے کی چھت اُونچی اور گنبد کی شکل کی تھی۔ وہاں کئی پولیس افسران بیٹھے تھے۔ اُن کی وردیوں اور بیجوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اعلا افسران ہیں۔ ڈی ایس پی ماتھر بھی اُن میں موجود تھا۔ وسط میں ایک چوڑی میز کے اُس طرف کی کرسیوں پر وہ سب بیٹھے ہوئے تھے۔ اِس طرف کی کرسیاں خالی تھیں۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے، جیسے ہی ہم اندر

پہنچے، ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ "استاد تجمل! بیٹھ جاؤ۔" سورتی نے بلند آواز سے کہا۔ تجمل نے اس بار کوئی تعرض نہ کیا۔ بدرُو، ہریالا اور چنگا ماہی ہمارے ساتھ آگئے تھے، انسپکٹر سورتی نے اُن تینوں کو باہر چلے جانے کا حکم دیا لیکن تجمل نے انھیں روک لیا۔ ماتھر، سورتی کو ایک جانب بیٹھنے کو کہہ کے ہم سے مخاطب ہوا اور بتانے لگا کہ ہمارے سامنے کون کون افسران موجود ہیں، اُس کے کہنے کے مطابق اِن میں دو ایس پی، دو ڈی ایس پی، تین انسپکٹر اور ایک سب انسپکٹر تھے۔ انسپکٹر داؤدیال کا تعلق خاص ہمارے علاقے سے تھا اور وہی کپتن خاں کے معاملے میں تفتیش پر مامور کیا گیا تھا۔ سب کی مضطرب نظریں ہم پر جمی ہوئی تھیں۔ ایس پی رائے کے سوا اُن میں سے میں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ رائے اُس زمانے میں سب انسپکٹر تھا جب تین آدمیوں کے قتل کے جُرم میں مجھے پہلی بار تھانے لایا گیا تھا۔ اب اُس کا ڈیل ڈول خاصا بڑھ گیا تھا، چہرہ بھی بھاری ہو گیا تھا۔ رائے نے شاید مجھے نہیں پہچانا۔

"میں نے ضروری سمجھا کہ یہ لوگ بھی موجود ہوں۔" ماتھر شائستگی سے بولا۔ "جو کچھ تم کہنا چاہو، ان کے سامنے کھل کے کہہ سکتے ہو۔"

"اپنے کو ایک بات بار بار بولنا نہیں آتا۔" تجمل نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ "جو ہم نے بولا ہے، ایک دم کھل کے بولا ہے۔ آپ ہی اِن کو بتا دو۔"

"میں نے، میں نے انھیں بتایا ہے۔" سورتی کی جھجکتی ہوئی آواز اُبھری۔ "لیکن اچھا ہے تم براہِ راست اُنھی لوگوں سے بات کرو جن کا تعلق اس معاملے سے ہے۔"

"آپ آگے بولو، اپنے کو کچھ اور نہیں بولنا۔"

"سب کے بیچ بیٹھے ہوئے افسر ایس پی جوشی نے ایس پی رائے سے کچھ کہا۔ رائے نے اپنے قریب موجود ماتھر کو متوجہ کیا۔ چند منٹ تک وہ آپس میں کانا پھوسیوں کے انداز میں باتیں کرتے رہے، جوشی کی بات سُن کے ماتھر نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ "استاد تجمل! کیا دوبارہ تمھیں یہ جتانے کی ضرورت ہے کہ تمھارے سامنے اس وقت پولیس کے اعلا عہدے دار موجود ہیں۔ رات دن ڈیڑھ مہینے سے یہ اِسی کیس کی تفتیش میں مصروف ہیں۔"

"مَولا بھلی کرے سرکار۔"

"تم جانتے ہو گے کہ یہ پولیس کے منتخب لوگ ہیں۔"

"یہ بھی اپنے کو اچھی طرح جانتے ہوں گے۔"

"تمیز سے بات کرو تجمل!" انسپکٹر داؤدیال نے بھنّائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ اڈّا نہیں ہے۔"

"اِدھر اڈّے کے لوگ اُدھر اڈّا ہے داؤ جی!" تجمل نے

تلخی سے کہا۔ "تم کیا اپنے رشتے داروں سے بات کر رہے ہو؟"

"یہ انتہاہے سر!" داؤدیال اشتعال سے بولا۔ "ہی از اسلیپوٹلی اے باباس۔۔۔" اُس نے اپنی آواز بھینچ لی۔

"اپنے کو زیادہ یاد ہیں داؤ جی!" بجھل نے اُس کے لہجے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ انسپکٹر داؤدیال انگریزی میں گالی بک رہا ہے یا بکنا چاہتا ہے۔ اچھا ہی ہوا جو داؤدیال نے اپنی آواز کی لگام تھام لی ورنہ اس کا جواب میں اُسے ضرور دیتا۔

"نو۔ نو!" ایس پی جوشی نے ہاتھ کے اشارے سے داؤدیال کو تنبیہ کی اور انگریزی میں بولا۔ "تم کن لوگوں سے مخاطب ہو! ایک ذرا تحمل کرو۔" پھر اُس نے ماتھر سے کہا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔ ماتھر نے اُس سے درخواست کی تھی کہ اُسی کو بولتے رہنے دیا جائے۔

"اُستاد بجھل!" ماتھر کے لہجے میں ملائمت تھی۔ "میں تم سے کہہ رہا تھا کہ ہم نے ہر پہلو پر غور کیا ہے، یقیناً یہ بات ہمارے لیے بھی تعجب کی تھی اور ہے کہ بجھل نے اُس شخص کو کیوں ختم کر دیا جو چار مہینے سے اُس کے اڈے پر بیٹھا ہوا تھا اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا، وہ تمھاری مرضی سے بیٹھا تھا بے شک! مجھے یاد نہیں پڑتا کہ تمھارے ریکارڈ میں پشت سے چھرا گھونپنے والی کوئی روداد لکھی ہو۔ سب تم سے واقف تھے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بجھل اپنے ہی گھر کو کیوں آگ لگا لے گا، اپنا ہی گلا کیوں گھونٹ لے گا۔" مجھے ماتھر کی باتوں پر بہت حیرت ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "تمھیں کبن خاں سے بقول تمھارے ایسی ہی کوئی کد ہو گئی تھی تو تم نے یہ طریقہ ہی آخر کیوں اختیار کیا، تم سامنے آ کے بھی بات کر سکتے تھے کبن خاں کے متعلق بھی ہم نے معلومات حاصل کیں۔ پتہ چلا کہ وہ لکھنؤ کا ایک بڑا استاد تھا اور بظاہر اُس کا تم سے کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ وہ تمھاری عزت کرتا تھا اور پوچھنے پر لوگوں کو بتایا کرتا تھا کہ استاد بس آ ہی رہے ہوں گے۔ پھر کون سی ایسی نازک بات تھی جو تمھارے اور کبن خاں کے بیچ تناتنی کی بنیاد بن گئی۔ ہمیں بالکل یقین نہیں آتا تھا اور ہمیں۔۔۔۔۔"

ماتھر جوشی کی طرف دیکھ کے تذبذب سے بولا۔ "ہمیں اب بھی یقین نہیں ہے۔ اُس وقت ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پکڑ لیں۔ اُسی دن ڈیڑھ سو کے لگ بھگ آدمی تھانوں میں لائے گئے۔ دوسرے دن بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور ابھی تک کسی نہ کسی حد تک ہے۔ تمھارا یہ خیال کہ پولیس نے نظر پ جبرا کے کام لیا ہے تو یہ تمھاری غلطی ہے، صرف بدگمانی۔ ہم نے تقریباً سارے ہی اڈوں سے آدمی پکڑے تھے۔ اس واقعے کے متعلق وہ خود بھی حیرت کا اظہار کرتے تھے اور اُن کی رایوں میں بہت فرق تھا۔ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ اُن کے ساتھ اڈوں کے اُستادوں کو بھی تھانے میں بلایا گیا۔"

"تمھیں یہ سُن کے شاید دُکھ ہوگا، اچنبھا بھی کہ اُنھوں نے تمھارے نام پر کوئی خاص دلچسپی ظاہر نہیں کی، اُن کا برتاؤ سرد تھا ہاں گنتی کے چند اُستادوں نے ضرور تمھارے لیے باتیں کیں مگر اُن میں اکثریت ایسے اُستادوں کی تھی جو تم سے ہمدردی نہیں رکھتے تھے۔ وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں تمھاری طرف اشارہ کر رہے تھے اور ہمیں معلوم تھا کہ اُن کا یہ رویہ بے وجہ نہیں ہوگا۔ اس کے پیچھے بہت سے غصے ہوں گے، برسوں پرانے غصے، برسوں پرانی جھونجھل۔ وہ شہر کے تمام اڈوں پر تمھارا راج کیوں کر مانتے ہوں گے۔ ہر وقت داؤ کی تاک میں لگے رہتے ہوں گے کہ کب موقع ملتا ہے۔ اس سے اچھا موقع اُن کے پاس اور کب آتا کہ تم کلکتے میں موجود نہیں تھے۔ سو ہم نے تمھارے خلاف اُن کے بیانات پر زیادہ دھیان نہیں دیا لیکن اُنھیں ٹٹولنے اور کریدنے کے کام میں بھی غفلت نہیں برتی، نتیجہ صفر رہا۔ وہ کسی کا نام نہیں لیتے تھے کسی کا بھی، تمھارا بھی کھل کے نہیں۔ ساتھ ساتھ ہم نے ملا کے اَن گنت لوگوں کے بیانات قلم بند کیے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اُن میں تقریباً سبھی نے تمھارے لیے اچھی رائے کا اظہار کیا۔ اُنھوں نے کبن خاں کو بھی بُرا نہیں کہا۔"

ماتھر کا انداز خطابت کا سا تھا مگر نرم، دھیما اور صاف صاف۔ اُس میں کوئی اُلجھاؤ نہیں تھا۔ اُس کی زبان رواں اور عام پولیس افسروں سے الگ تھی۔ میری طرح سبھی نے سکون کی سانس لی ہوگی۔ ماتھر وہی سب کچھ کہہ رہا تھا جو ہم کہتے۔ اُس نے بتایا کہ کسی نے اقرار نہیں کیا اور پولیس کو ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس کی مدد سے وہ واضح طور پر کسی طرف کا رُخ کر سکتی۔ کوئی نشان نہیں تھا، جن لوگوں کو پکڑا گیا، اُنھوں نے اُس رات اپنے اڈوں، گھروں یا کسی اور جگہ اپنے موجود رہنے کی شہادتیں دلوا دی تھیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے اڈے کے لوگوں نے مختلف نام لیے جن میں موجدار کا اڈا سرِ فہرست تھا۔ پولیس کا سب سے زیادہ زور موجدار کے اڈے کے آدمیوں ہی پر رہا لیکن وہاں سے بھی اُنھیں کچھ حاصل نہیں ہوا۔ جس رات لوگ اڈے میں داخل ہوئے تھے، اُنھیں کسی نے آتے جاتے نہیں دیکھا۔ اُس پاس گشت کرنے والی پولیس نے بھی نہیں۔ باہر پہرا دینے والا لٹو نامی شخص صبح بدمست پڑا تھا۔ دنوں پہلے اڈے پر آنے جانے والے لوگوں کے بارے میں بھی پوچھ گچھ کی گئی اور کچھ ایسے آدمیوں

سامنے آئے جن کا تعلق کلکتے سے نہیں تھا اور جو اُس رات کے بعد کبھی نہیں دیکھے گئے۔ پولیس کا خیال ہے کہ وہی لوگ ہوں گے مگر وہ کہاں چلے گئے۔ کلکتے کے گرد و نواح میں بھی اُن کی تلاش کی گئی لیکن اُن جیسے حلیوں کے کسی ایک شخص کی بھی نشان دہی کسی نے نہیں کی۔ پھر وہ کون تھے؟" ماتھر بلند آواز میں جیسے پوچھ رہا تھا۔ "کون تھے وہ بجھل؟ اگر ہماری جگہ تم ہوتے تو کس نتیجے پر پہنچتے؟"

بجھل نے کوئی جواب نہیں دیا، ماتھر کہنے لگا۔ "اور پولیس کو صرف اُن تین چار آدمیوں کی کھوج ہی نہیں تھی جو چند روز پہلے کبن خاں کی اجازت سے اڈے پر آ کے ٹھہر گئے تھے۔ اُن کے ساتھ بھی چند اور آدمی ہوں گے جنھوں نے اُنھیں وہاں بھیجا تھا۔ چار آدمیوں کے لیے یہ مشکل تھا کہ وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچائے بغیر ایک ہی حملے میں اڈے کے گیارہ چاقو باز آدمیوں کو ختم کر دیں اور اُنھیں ایک پل کی مہلت نہ دیں، اُس رات باہر سے بھی لوگ اُن کی مدد کو اِدھر آئے ہوں گے اور جس طرح اندھیری رات اور سنسان گلی میں روپوش ہو کے آئے تھے، اُسی طرح واپس چلے گئے۔ یکے بعد دیگرے وہ یا تو صبح سویرے شہر سے نکلے یا اُنھیں اڈے کے قریب مقررہ وقت پر کوئی گاڑی آ کے لے گئی۔ بہرحال وہ کس وقت آئے، کس طرح آئے، اس کی تفصیل میں جانے سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ کون تھے۔ کہاں چھپ گئے؟ بتاؤ بجھل! وہ کون ہو سکتے ہیں؟"

"آپ جیسا بولو، جواب دے دیں۔" بجھل نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "پھر تو وہ ہم بھی ہو سکتے ہیں۔"

"ہاں! وہ تم بھی ہو سکتے ہو، تم یا تمھارے آدمی۔ کرائے کے آدمی، کلکتے سے دُور کے آدمی۔ شہر میں اور کسے یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ استاد بجھل کے اڈے پر اس طرح جانے کی جرأت کر سکے۔"

"تالی بجاؤ بچو!" بجھل نے ہماری طرف منہ کر کے تیزی سے کہا۔ کسی نے تالی نہیں بجائی اور ماتھر نے بھی بجھل کی بات سُنی اَن سُنی کر دی۔ انسپکٹر داؤدیال کو کرسی جیسے کاٹ رہی تھی، وہ بار بار ایس پی جوشی اور ایس پی رائے کو دیکھتا تھا مگر اُن دونوں کی نظریں ایک ہی جانب مرکوز تھیں، ہماری جانب۔

"تمھارے سامنے ہمیں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے لیکن بہتر ہے کہ تم خوب سوچ سمجھ لو۔ حقیقت جھٹلانے کے بجائے اُسے تسلیم کرنے کے لیے تمھیں یہ سب بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہم اُن افواہوں سے بے خبر نہیں رہے ہیں جو اس بیچ تمھارے اور کبن خاں کے بارے میں شہر میں اُڑتی رہی ہیں۔ شاید تم بھی جانتے ہو گے کہ لوگ کیا کچھ کہتے ہیں۔ اِن افواہوں کو سہارا بنانے کے بجائے ہم نے ٹھوس شہادتوں ہی پر اپنی نگاہ جمائے رکھنی چاہی ہے لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ ہم اُن کی جانب سے اپنے کان بالکل بند رکھیں۔ کہیں حقیقت اُنھی میں نہ چھپی بیٹھی ہو، یہ افواہیں کوئی ایسا خاکہ کھینچنے پر ہمیں اُکساتی رہتی تھیں جو کسی حقیقت کے لگ بھگ ہو۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ہم نے کتنے خاکے بنائے اور مٹا دیے ہوں گے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے سے اُنھیں اِدھر اُدھر مارتے رہنا ہی ٹھیک تھا۔"

اُسی لمحے سب انسپکٹر سہائے اُٹھ کے دبے پاؤں ماتھر کے پاس آیا اور میز پر اُس کے سامنے ایک کاغذ رکھ کے واپس اپنی کرسی پر چلا گیا، داؤدیال نے اُسے بھیجا تھا۔ ماتھر نے کاغذ پر ایک سرسری نظر ڈالی اور سر ہلانے لگا اور مزید کوئی توقف کیے بغیر بجھل کی طرف سر اُٹھا کے بولا۔ "کبن خاں تمھارا دوست تھا، اچھا دوست، تم اُسے اپنے ساتھ کلکتے لائے تھے۔ یہاں کا رنگ ڈھنگ لکھنؤ سے الگ تھا، اُس کے لیے نیا اور چونکا دینے والا تھا۔ وہ تمھاری مرضی سے آیا تھا مگر ایک دن اُس نے تم پر چاقو کھول لیا اور مطالبہ کیا کہ اڈے سے نکل جاؤ۔ تم نے بھی چاقو کھول لیا لیکن تمھارے چاقو نے زندگی میں شاید پہلی بار تم سے دھوکا کیا۔ اڈے کی ریت کے مطابق تمھیں اڈا فوراً چھوڑ دینا اور کبن خاں کا حق مان لینا چاہیے تھا، تمھیں یہ بھی قبول نہ ہوگا کہ تم اڈے کے دوسرے آدمیوں کی طرح اُسے اُستاد مان کے وہیں رہو، نہ کبن خاں اس پر تیار ہوتا، اُس نے تمھارے ساتھ رعایت کی کہ تم جلد از جلد کلکتہ چھوڑ دو، جن لوگوں کے سامنے چاقو نکلے تھے، اُن سب کے ساتھ۔ اڈے کے باقی آدمیوں کو قابو میں رکھنے کے لیے کبن خاں کو ایسا جتانا لازم تھا کہ تم نے اپنی مرضی سے اڈا چھوڑا ہے کیونکہ تمھارے بعد یہاں اُسے اپنے پیر جمانے کے لیے اُن کے ساتھ کی ضرورت تھی۔ جاں بخشی کے بدلے اور عزت سے کلکتے سے نکل جانے کے لیے تمھیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ تم نے اپنے خاص آدمی کانتے سے بھی یہی کہا، دوسرے آدمیوں سے بھی۔ سُنا ہے تم نے اُن سے کہا تھا کہ تم ایک لمبے سفر پر روانہ ہو رہے ہو جہاں سے تمھاری واپسی ناممکن ہو سکتی ہے، تم نے ایک لمبے سفر کا ڈھونگ رچایا تھا مگر تم نے یہ فیصلہ دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ تمھارے ساتھ جانے والے بھی تمھیں ٹوکتے، کھٹکاتے رہے ہوں گے۔ تم نے کبن خاں کو وقت دیا تھا اور تم اُس سے دوبارہ چاقو کھلوانے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ تمھارا جب تمھی اپنا چاقو کھو کر بیٹھے تھے تو اڈے سے تمھارے ساتھ نکلنے

والے دوسرے کیسے کپتن خاں کے آگے آنے کی ہمت کر سکتے تھے۔
"کپتن خاں جانتا تھا کہ اڈّے پر کانتے ہی ایک ایسا آدمی ہے جو اُس کے لیے پریشانی پیدا کر سکتا ہے' اُس نے تمھاری زبانی کانتے کو بہکانے کی کوشش کی کہ اڈّے میں وہ بھی اُس کا برابر شریک ہے۔ کانتے یہی سمجھتا رہا کہ اُستاد واپس آ جائیں گے۔ وہ کپتن خاں تمام لوگوں سے یہی کہتا رہا کہ ایک دن اُستاد کو واپس آنا ہے مگر کانتے کو کپتن خاں کے لچھن سے کھٹکا ہو گیا تھا یا تمھارے کسی آدمی نے اُس سے مل کے تمام حقیقت سے باخبر کر دیا تھا۔ کانتے نے کپتن خاں پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ سب جان چکا ہے۔ وہ آدمی جو تین چار دن پہلے اڈّے پر آ کے ٹھیرے تھے' ہو سکتا ہے کانتے ہی نے کپتن خاں سے اُن کی سفارش کی ہو پھر کانتے ایک دن' غائب ہو گیا اور واپس آیا تو!..." ماتھر نے ایک گہری سانس بھر کے کہا "تم نے سُنا اُستاد تجھل!"
"آپ کو اُدھر کچہری میں ہونا چاہیے تھا ساب!"
"نوٹنکی میں زیادہ اچھا رہتا اُستاد!" پیچھے سے ہلاکو نے سرگوشی کی۔
"انکار کرو تجھل! ہم تمھارا انکار سننے کے لیے تیار ہیں" ماتھر کی آواز دوبارہ گونجی "تمھارے پاس شاید کوئی جواب نہیں ہے!"
"لگتا ہے یہ اُدھر ہی کہیں پیچھے چھپا بیٹھا تھا اُستاد!" جامو بڑبڑاتے ہوئے بولا۔
"اُستاد وہ جواب مانگتا ہے" جینی نے تجھل کو ٹوکا۔
"کیا بولیں اسے"
وہ سب ایسی نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے جیسے ہم کپڑے نہ پہنے ہوئے ہوں۔ میرا خیال تھا کہ یہ سُن کے تجھل زور زور سے قہقہے لگائے گا یا ماتم کرے گا لیکن کرسی پر اُس کا جسم ڈھیری بنا رہا جیسے اُسے پہلے سے معلوم تھا کہ یہ سب سُننا پڑے گا۔ ماتھر کے خاکے میں کوئی عیب نہیں تھا۔ حقیقت سے کتنا ہی دُور ہو مگر اُس میں حقیقت کا رنگ ضرور جھلکتا تھا۔ بہت سی باتوں کی ہم تردید ہی نہیں کر سکتے تھے اس لیے کہ تان تو ایک ہی بات پر آ کے ٹوٹتی کہ پھر ہم کہاں روپوش تھے۔
تجھل کو فوراً اپنی ٹانگ کسی کو دکھانی چاہیے تھی۔ آرام کے بغیر زخم اور پھیل جانے کا اندیشہ تھا۔ بار بار میرے دل میں ہمک اُٹھتی تھی کہ ایک بار ہمت کر کے سب کچھ صاف صاف کہہ دوں۔ بس کریں' وہ ان لوگوں سے باز پرس کیوں کر رہے ہیں' صرف مجھے پکڑ لیں' مجھے پھانسی دے دیں۔ بے کار باتوں سے کیا فائدہ۔ سب کا خون میری گردن پر ہے۔ تبت میں مرنے والے سو سے اُوپر آدمیوں کا منّی میاں کا' وزیر کا' تشانم کا' سلطان کا۔ یہاں اڈّے ختم ہونے والے سبھی لوگوں کا اور نہ جانے کس کس کا' مجھے تو نام بھی نہیں رہے۔ میں نہ ہوتا تو ان میں سے کوئی بھی مرنے والا نہیں' اتنی جلدی تھوڑی مر جاتیں۔ اُن کے دل میں بہت سی آرزوئیں تھیں اور قسمت نے ابھی دیکھا ہی کیا تھا کرشنا جی کہتے تیری وجہ سے میری زندگی بڑھ گئی ہے' کاش انھیں معلوم ہو میں اُن کی زندگی کم کرنے کے لیے اُن کے پاس آیا ہوں۔ افسانے تراشنے' اتنی باتیں کرنے اور کھوج لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک ہی شخص کو پکڑ لیا جائے' اُسے کیوں نہ مار دیا جائے۔
"بولو تجھل! چپ کیوں ہو گئے؟" ماتھر نے تیکھے لہجے میں کہا "تمھاری زبان سُن کیوں ہو گئی ہے؟ کہہ دو کہ سب جھوٹ ہے"
"ابھی کتھا کا زور تو ٹوٹے ماتھر ساب!" تجھل خوابیدہ آواز میں بولا۔
"اندازہ تھا کہ تم یہی کچھ کہو گے۔ کون جانے یہ زور کس کو توڑ کے ٹوٹے گا"
"پھندا اتنا اندھا نہیں ہوتا سرکار! گردن پہچانتا ہے" تجھل نے بیڑی سُلگاتے ہوئے کہا۔ صبح سے اب تک وہ مسلسل بیڑی پی رہا تھا اور کھانس رہا تھا۔
"کیس عدالت میں ہے' فیصلہ اُسی کو کرنا ہے۔ پر ان حالات میں وہ کیا فیصلہ کر سکتی ہے۔ تمھارے آدمی اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے کیس سلجھانے کے بجائے پیچیدہ اور پُراسرار بنا رہے ہیں۔ کانتے چُپ ہے۔ نہیں بتاتا کہ کہاں گیا تھا؟"
"وہ کیوں بتائے گا؟"
"کیوں؟ وہ کیوں نہیں بتاتا؟"
"جو کارن اپنے ساتھ ہے' وہی کچھ اُس کے ساتھ ہوگا۔ اڈّے والے اپنا اتا پتہ بتانے لگیں تو کتنے دن جئیں گے۔ تو اڈّے والے پھر اپنے گلے میں پھندا ڈال لیں گے"
"اس کا ٹائم آئے گا تو وہ دیکھ لے گا" تجھل نے بیزاری سے کہا۔
"اس کا ٹائم آنے میں دیر ہی کیا ہے"
"اپنا گلا اتنا سستا نہیں ہے ماتھر ساب! میں آپ کو بولا تھا' یہ بعد کی بات ہے' آپ زیادہ عجلت مت کرو"
"لیکن تجھل! اگر تم ابتدا ہی میں یہ اُلجھن دُور کر دو تو اس میں تمھارا بھی بھلا ہوگا' ہمارا بھی"
"ہمارا بھلا چھوڑ دیوتا! اپنا سوچو۔ آپ کو دکھائی نہیں دیتا تو ہم بولتے ہیں' اس طرف دھیان مت دو"
"ہم نے ایسا ہی کیا تھا اُستاد!"
"کدھر کیا تھا ساب! پھر آپ ایسے سر میں نہیں گا- آگے جا کے ہم نے بول دیا کہ ہم اُدھر اپنی ماں بہن بچوا رہے ہیں تو آپ کون سی کتھا سناؤ گے پھر کس پہ کمبل ڈالو گے؟"
"یقیناً ہمیں اپنی سوچ کا رُخ بدلنا ہوگا"
"پھر پہلے ہی ایسا کر لو۔ ہم بھی کسی آدمی کے جنے ہیں"
"مگر' مگر تم اپنے آپ کو..." ماتھر کہتے کہتے رہ گیا۔
درمیان میں بیٹھے ہوئے ایس پی جوشی کی بھاری آواز نے خاموش کر دیا تھا "اُستاد! تم کو بولو' ہم پھر اور کس طرف دھیان دیں؟"
"ابھی ہم اِدھر آئے ہیں جوشی ساب!" تجھل نے نرمی سے کہا۔
"لیکن تمھارے دماغ میں شک کی کوئی دِشا (سمت) ضرور ہوگی"
"ابھی کوئی نہیں ہے ساب بہادر! پر جدھر بھی ہے' اپنے سے زیادہ دُور نہیں ہے" تجھل نے کہا۔
"تم سمجھتے ہو کہ تم اُن تک پہنچ جاؤ گے؟"
"نہیں پہنچے تو ماں کا دودھ حرام ہوگا"
"تمھارے کہنے کا مطلب ہے تمھیں جانے دیا جائے؟"
"اب نہیں تو آپ دس دن بعد جانے دو گے۔ ہم تب بھی اُن کے پاس پہنچیں گے۔ پر شاید ذرا دیر لگ جائے۔ اُن حرام کے پلّوں کو ٹائم مل جائے گا"
"مگر دیر تو تمھیں انھیں ڈھونڈنے میں لگ سکتی ہے کیونکہ تم بولتے ہو' تم کو ابھی کچھ معلوم نہیں ہے"
"اپنے کو زیادہ دیر راس نہیں آتی"
"کتنا سمے لگے گا؟"
"بہت زیادہ نہیں" تجھل کی آواز تپ رہی تھی۔
"پر اتنے وشواس سے تم تبھی کہہ سکتے ہو' جب تم کو کسی آدمی' کسی ٹولی یا کسی خاص دِشا پر شک ہو"
"اپنے پاس آپ کی آنکھیں نہیں ہیں"
"لیکن تم کو اِدھر سے جانے دینے کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ تم کو مار دھاڑ اور خون خرابے کی کھلی چھٹی دے دیں؟"
"ہم اتنے اُلّو کے پٹھے نہیں ہیں جوشی ساب!" تجھل نے تندی سے کہا "پھر ہم سیدھے اِدھر کو نہیں آتے' اپنا کوئی ایک آدمی اُدھر جیل میں بند نہیں ہے"
"مگر اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم...."
تجھل اُس کی بات کاٹ کے بولا "آپ کو ایسا نہیں بولنا تھا۔ ایسا اتنی فوج پھر کا ہے کو اکٹھی کر رکھی ہے۔ ضمانت اپنے کو کیا دینا ہے"
ایس پی جوشی کا چہرہ کچھ اور بھاری ہو گیا۔ غیر اختیاری طور پر اُس کی نظریں اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے افسروں پر پھلنے لگیں اور ایس پی رائے پر آ کے ٹک گئیں۔ رائے کسمسانے لگا۔
"آئی ڈونٹ تھنک" وہ انگریزی میں بولا "اب بھی کوئی گنجائش موجود ہے۔ سب ہمارے جانے پہچانے لوگ ہیں۔ موقع کا استحصال کرنے والے' داؤ پیچ کے ماہر' ریاکاری جن کی سرشت میں داخل ہے" رائے کی آواز اچٹتی ہوئی تھی۔
"یعنی' یعنی انھیں روک کے رکھا جائے؟" جوشی نے تذبذب سے کہا۔
"ان حالات میں یہی مناسب نظر آتا ہے"
"مگر جناب!" ماتھر بیچ میں بولا "میرا خیال ہے ہمیں ایک بار از سرِ نو غور کرنا چاہیے' یہ فیصلہ تو ہم کسی وقت بھی کر سکتے ہیں"
"ماتھر جی!" ایس پی رائے نے اضطراری انداز میں کہا "کوئی معمولی رعایت بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔ ان کو کھلا اور بنا ڈالے بغیر چھوڑ دینے کے ساتھ ہمیں کچھ اور خونی خبروں کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ کیا انھیں گلی گلی بھونکنے' کاٹنے کی اجازت دے دی جائے؟" وہ حقارت سے بولا "ہمیں ہر لمحے یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنی ہے کہ یہ کون ہیں۔ کتنے بڑے کمینے' کتنے بڑے گُنڈے"
مجھ سے بیٹھا نہیں گیا' اس سے پہلے کہ رائے کی زبان سے کچھ اور نکلتا' میں کھڑا ہو گیا "یہ کسی نئے خطاب سے نوازیے جناب! یہ سب تو بہت پُرانے ہو چکے ہیں" میری آواز بھرّانے لگی تھی۔ جامو نے پیچھے سے ٹھوکا مار کے مجھے خاموش رہنے کی تلقین کی لیکن میں کھڑا رہا۔
"وہ سب اچھل سے گئے" "تم واز ہی؟" جوشی اضطراب سے بولا۔
"یہ لاڈلا ہے" انسپکٹر داؤ دیال نے تیزی سے جواب دیا۔
"لاڈلا! کیا یہ نووارد ہے؟"
"نہیں جناب! خاصا پُرانا آدمی ہے"
"یہ انگریزی کچھ سمجھتا ہے؟" جوشی تعجب سے بولا۔
"کیا' کیا یہ وہ تو نہیں ہے جس نے قتل کے جرم میں لمبی سزا کاٹی تھی اور جیل میں اعلا تعلیم بھی حاصل کی تھی؟"
"وہی ہے جناب!"
"اس کے باوجود یہ' یہ انھی لوگوں میں ہے"
"منہ کو خون لگ گیا ہے جناب!"
"ہاں ہاں" جوشی نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور مجھ سے انگریزی میں پوچھا "تھی ہُو وہ؟"
"میں کوئی بھی ہوں جناب مگر مجھے آپ کا یہ انداز بالکل اچھا نہیں لگا" میں نے ہندوستانی میں جواب دیا "آپ اس

لہجے اور طور طریق کے بغیر بھی کوئی رائے قائم کر سکتے ہیں۔ ہم آپ کی چار دیواری ہی میں بیٹھے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں ہمارے فتنے اب کون سا حساب باقی ہے جو آپ اِس طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ کیا آپ نے ہم سے ہمارے پچھلے تمام گناہوں کے واجبات وصول نہیں کیے ہیں۔ آپ ہمیشہ اُنھی کے حوالے سے ہمیں پہچانتے رہیں گے۔ کوئی اور پیمانہ نہیں ہے آپ کے پاس؟" میرے منہ میں جو آیا میں نے کہہ دیا۔

اُن سب کی آنکھیں ایسے کھلی ہوئی تھیں جیسے ۔۔ تے سن رہے ہوں۔ نظر چوکی تو تماشا ختم ہو جائے گا۔ "تعجب ۔۔ یہ بہت، بہت عجیب ہے۔" جوشی بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"مجھے یاد پڑتا ہے یہ فرسٹ کلاس طالب علم تھی۔" ۔۔ نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا "کیا ایسا نہیں تھا؟"

"اُس سال اِس نے ٹاپ کیا تھا۔"

"تمھیں دیکھ کے خوشی ہوئی اور ..." جوشی نے جھجکتے ہوئے کہا "افسوس بھی ..." میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تو وہ بولا "تم کو کچھ اور کہنا ہے؟ میں سمجھتا ہوں ہمیں تم سے بات کرنے میں آسانی رہے گی۔" اُس نے راٹھے کی بدزبانی پر ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

"مجھے کچھ نہیں کہنا۔ سب جھل بھائی کہہ چکے ہیں۔ میں وہی کچھ دُہراؤں گا اور میں ان کے سامنے کیا بول سکتا ہوں۔" میں نے ترشی سے کہا "لیکن مجھے ایک بات کہنی ہے۔ راٹھے صاحب نے ایک طرح سے اعتراف کر لیا ہے کہ وہ ہم نہیں تھے ورنہ ہمیں چھوڑ دینے سے اُن کے ذہن میں یہ اندیشے پیدا نہ ہوتے جن کا اظہار ابھی انھوں نے کیا ہے۔ دوسرے ایک بات اور، ہم نہیں بتا رہے کہ ہم کہاں تھے، کدھر اپنے سر پھوڑ رہے تھے۔ آگے جا کے بھی ہم نے اِس معاملے میں زبان بند ہی رکھی تو کیا صرف اس بنیاد پہ گیارہ آدمیوں کے خون کا فیصلہ کر دیا جائے گا؟"

وہ سُنتے رہے، اُن میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"بیٹھ جا رے!" جھل نے مجھے جھڑک دیا۔

لیکن میں نہیں بیٹھا "یہ کون آپ کے آگے ہاتھ باندھے کھڑا ہے" میری آواز خود بخود تیز ہوتی گئی حالانکہ میں ایسا نہیں چاہتا تھا "ہمیں ہٹ جانے دیجیے، بالکل ہٹ جانے دیجیے لیکن ایک بات پہ اچھی طرح غور کر لیجیے کہ آدمی ہمارے گئے ہیں اور ہمیں صرف ہتھیار چلانا نہیں آتا، کچھ اور بھی آتا ہے۔ کچھ ہم بھی جانتے ہیں کہ کیا کچھ ہوتا ہے۔ ایک در کے بعد کون سا در ہے۔ ہمارے پاس ارادے کی کمی ہے، نہ اُسے عمل میں لانے کے لیے ذرائع کی۔ میرا مطلب آپ خوب سمجھ رہے ہوں گے۔ یوں تو ابھی ہم بڑی سے بڑی ضمانت آپ کے سامنے پیش کر سکتے ہیں مگر اِس کی ضرورت نہیں، تین چار دن یا دس پندرہ دن کے پھیر سے بہت بڑا فرق نہیں پڑے گا۔ ہمیں معلوم ہے کہ آگے جا کے کیا کچھ ہوگا۔ جو مر گئے ہیں، وہ واپس نہیں آ سکتے مگر اُن کا خون اتنا ارزاں نہیں تھا۔ اُن کی روحوں کو جواب ہمیں دینا ہے، آپ کو نہیں۔ وہ ہمارے آدمی تھے۔" میری آواز تھرانے لگی تھی۔ "آپ جو دل چاہیں کریں۔ جیسا کہ چاہیں بنائیں۔ خوب تاویل کریں۔ آپ کو اختیار ہے لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم بھی اپنے اختیار سے ناآشنا نہیں ہیں۔" میں نے بہت روکا مگر میری آنکھوں میں بُری طرح کھولن ہو رہی تھی۔ میں اپنا منہ چھپا کے ایک دم بیٹھ گیا۔ جھل میری کمر پہ تھپکیاں دینے لگا۔

"کدھر منتی کر رہا ہے رے!" وہ ناراضی سے بولا۔

دیر تک سکوت رہا۔

کمرے میں اُن کی دبی دبی سرگوشیاں بھن بھناتی رہیں۔ میں نے نہ پھر اُن کی کوئی بات سُننے کی کوشش کی تھی نہ اُن کی طرف دیکھنے کی۔ میں نے اُسی لمحے اپنا بوجھل سر اُٹھایا جب ماتھر کی آواز کانوں میں پڑی "تم لوگ ذرا باہر بیٹھو۔" وہ جھل سے کہہ رہا تھا۔

اُسی وقت انسپکٹر سورتی درمیان کا فاصلہ عبور کر کے ہمارے پاس آیا اور اُس نے ہمیں باہر چلے جانے کا اشارہ کیا۔ ہم سب اُٹھ گئے۔

"جلدی کرتا ساب! سالی ساری دوپہر پالیٹ لی۔" چلتے چلتے جھل نے پلٹ کے اونچی آواز میں کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

انسپکٹر سورتی نے سائبان میں پڑی ہوئی بینچوں پر ہمیں بٹھا دیا۔ آس پاس، دور نزدیک مسلح سپاہی جمے ہوئے کھڑے تھے۔ تھانے کا یہ حصہ عام لوگوں کے لیے ممنوع کر دیا گیا تھا۔ سائبان کے اُس طرف، احاطے میں موجود لوگ اُچک اُچک کے ہمیں دیکھنے کے لیے بے چین نظر آتے تھے۔ ہریالا، بدروا، چنگاما ابھی تک ہمارے ساتھ تھے۔ ہمیں وہاں بٹھا کے سورتی واپس چلا گیا۔ دیر ہو گئی، کسی نے لوٹ کے خبر نہیں لی۔ سب گُنگ گُم صُم ایک دوسرے کے بازوؤں سے بازو ٹکائے بیٹھے تھے۔ دھوپ پیلی پڑ گئی تھی۔ صبح سے اب تک ایک کھیل بھی کسی کے منہ میں نہیں گئی تھی، صبح کسی اسٹیشن پر بس ایک ایک چائے سب نے پی تھی اور خیال تھا کہ کلکتے اتر کے، ۔۔۔ پی لیں گے۔

آدھ گھنٹا گزر گیا، پھر ایک گھنٹا۔ ہر لمحے سائبان سے بڑے ۔۔ کی طرف جاتے ہوئے راستے پر کسی کی آمد کا گمان ہوتا تھا ۔۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا گزر جانے کے بعد بھی اندر سے کوئی نہیں ۔۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ کیا حکم آئے گا۔ میرا سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ نہ جانے میں نے کیا کیا اول فول بک دیا تھا۔ ۔۔ مجھے چپ ہی رہنا چاہیے تھا۔ میری کسی بات سے اُن پر غلط اثر پڑ گیا تو کوئی بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔ گو باہر ۔۔ نے کے بعد کسی نے ایک لفظ بھی مجھ سے نہیں کہا تھا لیکن تسلی آدمی اپنے آپ کو بھی تو دیتا ہے۔ اگر انھوں نے ہمیں نہ ۔۔ نے دیا تو پھر معلوم نہیں، کتنے دن لگ جائیں۔ پیرو کب تک ۔۔ ل میں ٹھیرا رہے گا اور ابا جان!... پیرو اکیلا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ اگر انھوں نے واقعی ہمیں نہ جانے دیا اور وقت ۔۔ گیا تو اس مدت میں وہ پیرو تک بھی پہنچ سکتے ہیں اور ابا جان تک اور اُن کے مال و اسباب تک اور پیرو یہ سُن ۔۔ کہ ہمیں روک لیا گیا ہے، ہوٹل میں خاموش نہیں بیٹھا رہے ۔۔ وہ خود ہم تک پہنچنے یا ہماری ضمانت کا بندوبست کرانے کی کوشش کرے گا۔ کوئی بعید نہیں کہ وہ سیدھا رتنا کے پاس فیصلہ کرنے پہنچ جائے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا، اسٹیشن سے رخصت ہوتے وقت جھل نے پیرو سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اپنے اڈے پہ جانے کے بجائے تھانے جا رہا ہے۔ پیرو کے لیے یہ خبر نئی ہوگی اور وہ کوئی اُلٹا سیدھا قدم اُٹھا سکتا ہے ۔۔ بردو کی زبانی پیرو نے یہ ضرور سُنا تھا کہ پولیس ہماری تلاش میں ہے۔ امکان تو نہیں کہ وہ سوچے سمجھے بغیر کوئی ارادہ کرے، ۔۔ کو خیال ہوگا کہ اُس کی غیر معمولی نقل و حرکت سے ہوٹل والے اُس علاقے کے آدمی جہاں ہوٹل واقع ہے، مشکوک ہو گئے تو ۔۔ کے لیے ابا جان کو چھپانا مشکل ہو جائے گا اور ابا جان کے ۔۔ یاں ہونے کا مطلب ہے، سب کچھ عیاں ہو جانا۔ تیجروں ۔۔ زبان مل جائے گی۔ ہیرے جواہر لے لیں گے۔ اس دوران رتنا ۔۔ بھی خبر مل سکتی تھی کہ ممبئی کا پیرو دادا ہوٹل میں ٹھیرا ہوا ہے۔

ہم نے ان سے کہنے کو تو کہہ دیا تھا کہ وہ چاہیں تو ہمیں اندر ۔۔ لیں چونکہ ہمیں چند دنوں بعد پھر باہر آ جانا ہے لیکن ہم بھی جانتے ۔۔ کہ یہ چند دن ہمارے لیے کتنے جان لیوا اور عذاب ناک ۔۔ ل گے۔ ابا جان کے ساتھ فیض آباد جانے کے لیے میں اور ۔۔ دونوں آمادہ نہیں ہوئے تھے تو ہم بھی ایک گاڑی سے وہاں جا سکتے اور انھیں حویلی تک پہنچا کے دوسری گاڑی سے واپس آ سکتے تھے۔ صرف ایک دن کا بل پڑتا لیکن کتن خاں اور اُس کے ساتھ مرنے والے ہماری جگہ ہوتے اور انھیں یوں ہمارے ختم ہو جانے کی خبر ملتی تو کیا وہ اس ایک دن کی تاخیر گوارا کر لیتے۔ وہ تو تھانے تک بھی نہ آتے۔ آندھی اور طوفان کی طرح پہلے اڈے کا رُخ کرتے اور لال ہاتھوں، لال کپڑوں اور کھلے چاقوؤں کے ساتھ پھر تھانے آتے۔ جھل نے تو اتنا بھی اپنے سینے پر جبر کر لیا تھا۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد بڑے کمرے کی جانب سے اُن کے بوٹوں کی گونج سنائی دی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے ڈی ایس پی ماتھر، انسپکٹر واڈیال، انسپکٹر سورتی ہمارے سامنے تھے۔ ماتھر کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "استاد جھل!" وہ کسی قدر بے تران آواز میں بولا "تم جا سکتے ہو۔"

میری رگوں میں ایک بجلی سی چمکی۔ سب نے ایک دوسرے کی طرف چونک کے دیکھا اور سبھی کے چہروں پر جیسے آگ بھڑکنے لگی۔ "آگے بولو ماتھر ساب!" جھل نے آہستگی سے کہا۔

"آگے کچھ نہیں استاد لیکن تم جانتے ہو گے، ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں کتنی دشواری ہوئی ہوگی۔ خیال رکھنا کہ کسی بھی صورت میں پہلے تم پولیس کو مطلع کرو گے اور ہمارے بھروسے کو ٹھیس نہیں پہنچاؤ گے۔"

جھل کے ہونٹ بند رہے۔

"تمھیں صرف اس اُمید پہ جانے کی اجازت دی جا رہی ہے کہ تم پولیس کی مدد کرو گے۔ یہ مت سمجھنا کہ ہم تم سے کہیں دُور رہیں گے اور یہ بھی جان لو کہ ابھی تمھارے باقی تمام آدمی جیل میں ہیں، تمھاری کوئی بھی خلافِ قانون حرکت اُن کے لیے اور مصیبتیں کھڑی کر سکتی ہے۔ تم نے فرار ہونے کی کوشش کی یا ذرا سی بھی غلطی کی تو اُن سب کا ہرجانہ اُنھی کو ادا کرنا ہوگا اور تم بھی نہیں بچ سکو گے۔ بہتر یہی ہے کہ احتیاط سے قدم اُٹھانا۔ تمھاری بات مان لی جائے کہ کتن خاں کو کچھ اور لوگوں نے ختم کیا ہے تو اب تمھیں یہاں دیکھنے کے بعد وہ تم پہ ہتھیار پھینکنے کے لیے بے چین ہوں گے اِس لیے بھی تمھیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اِس سلسلے میں اگر تمھیں مستقل طور پر یا کسی وقت بھی پولیس کی رکشا کی ضرورت پڑے تو پولیس تمھاری مدد کے لیے تیار رہے گی۔"

"آپ آرام کرو ساب! اپنی فکر چھوڑ دو۔ اپنے کو جس دن بیساکھیوں کی ضرورت پڑی، اُس دن یہ ہتھیار" جھل نے جیب میں پڑے ہوئے چاقو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "آخری بار اپنا کام ضرور دکھائے گا۔ دوسروں کے لیے ہی نہیں، یہ اپنے

لیے بھی ہے۔"

"تم نے سُنا کہ ہم نے کیا کہا ہے؟" ماتھر ترشی سے بولا۔

"سُن لیا ہے سرکار!"

"سُن لیا ہے تو ٹھیک ہے، یہ بھی سُن لو کہ اگر تم نے غیر ضروری طور پر ہمیں اُلجھانے اور غیر متعلق لوگوں سے بدلہ لینے کے لیے استعمال کیا تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔ پولیس کوئی خون خرابہ، جھگڑا، فساد پسند نہیں کرے گی۔"

"پھر پولیس کا کام کیسے چلے گا؟"

ماتھر نے جیسے سُنا ہی نہیں، منہ بنا کے بولا۔ "ایک بات اور تم سے کہنی ہے۔ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ تمھارے پُرانے اڈّے پر اب رتنا نامی ایک آدمی بیٹھا ہے۔ تم جانتے ہو کہ انسپکٹر داؤ دیال جی کا تعلق تمھارے علاقے سے ہے اور اُنھوں نے اُس کے بارے میں ہر طرح کی پوچھ گچھ کر لی ہے۔ رتنا نے تمھارا اڈّا باقاعدہ طور پر عمارت کے مالک سے لیا ہے اور انسپکٹر داؤ دیال کو ہر طرح مطمئن کیا ہے۔ اڈّے پر اُس کے قبضہ جمانے سے ہمیں بھی اُس پر شبہ ہوا تھا کہ کہیں اُس نے تم سے کوئی پرانا بدلہ تو نہیں لیا ہے۔ ہو سکتا ہے، اڈّا لیتے وقت اُس کے دماغ میں یہی بات ہو لیکن اِس کے سوا کچھ نہیں۔ جیل میں بند تمھارے آدمیوں کی شکایت پر ہم نے اُس کے بارے میں پوری انکوائری کی ہے۔ شروع شروع میں تمھارے آدمی اُس کا نام نہیں لیتے تھے لیکن جب وہ اڈّے پر بیٹھ گیا تو صرف اُسی کا نام لینے لگے۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے اُس کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھی ہے مگر ہمیں کوئی ایسی بات دکھائی نہیں دی، جس سے ہمارا شک آگے بڑھتا۔ وہ واقعے کے کوئی پندرہ دن بعد کلکتے آیا تھا اور اُس کے بیان کے مطابق یہ اُس کے اُستاد، اُستاد تجھل کا پُرانا اڈّا ہے اس لیے جیسے ہی اُس نے یہ سب سُنا، وہ اڈّا جمانے کے لیے اِدھر آ گیا۔ ممکن ہے تم اپنی پرانی جگہ پر اُس کی بیٹھک پسند نہ کرو اور اُسے ہٹانے کی کوشش کرو، وہ خود ہٹ جائے تو کسی کو اعتراض نہ ہوگا لیکن تم نے اُس کے ساتھ زور زبردستی کی تو پولیس تماشا نہیں دیکھتی رہے گی۔ میں نے تمھیں بتا دیا ہے کہ رتنا وہاں عمارت کے مالک کی اجازت سے بیٹھا ہے۔"

"داؤ جی نے بھروسا کر لیا ہے تو پھر ٹھیک ہی ہوگا۔" تجھل انسپکٹر داؤ دیال کی طرف نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "آپ کو کچھ اور بولنا ہو تو بولو۔"

"اور کچھ نہیں۔" ماتھر نے نرمی سے کہا۔

"چوڑیاں ابھی رہ گئی ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اپنے کو چوڑیاں پہنا کے بھیجو۔"

"دیکھو تجھل!" ماتھر کا لہجہ بگڑ گیا۔ "میں تمھیں وارن کرتا ہوں۔"

"اب آپ کے سامنے کیا بولیں ماتھر ساب! کوئی دوسرا ہوتا تو زبان سالی اینڈتی نہیں، اِدھر زندگی بھر سوچا کہ پولیس یہ گورکھ دھندا کیسے چلاتا ہے، اپنے کو آج پتہ چلا کہ اُدھر آپ بھی تو ہوتے ہو۔"

"جاؤ، جاؤ تجھل!" ماتھر اُس کا شانہ تھپ تھپاتے ہوئے بولا۔

وہ تجھل کے ساتھ چبوترے کے زینے تک آیا۔ "اپنے آپ یاد رہو گے۔" نیچے اُترتے ہوئے تجھل نے زیرِ لبی سے کہا۔

ماتھر نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں میچ لیں اور رُکی رُکی آواز میں بولا۔ "جاؤ اُستاد! اپنا بھروسا تمھارے ساتھ ہے۔"

تجھل نے اُس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔

شام ہو چکی تھی مگر سورج ابھی چھپا نہیں تھا۔ گلی میں معمول کے مطابق چہل پہل تھی۔ ساری دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ نکڑ پر واقع ملباری کے نکونے ہوٹل میں زور زور سے گراموفون بج رہا تھا۔ اُس سے ملحق دھرما پان والا نیلی قمیص پہنے اور گلے میں تازہ نوٹوں کا ہار ڈالے اپنی دکان پر گاہکوں میں مصروف تھا۔

تجھل، جامو، بلاکو، جینی، بلٹو، سُولم، سارٹے میں اور بدرو چینگا سمیت ہم کل گیارہ آدمی تھے۔ ٹیکسیوں سے ہم ... ہی پر اُتر گئے اور بغیر گلی میں داخل ہو گئے۔ تھانے سے یہاں تک راستے میں کسی جگہ رُک کے ہم نے ایک گھونٹ بھی نہیں پیا تھا۔ شاید کسی کو بھی بھوک پیاس نہیں لگ رہی ... سب کو جلد سے جلد علاقے پہنچنے کی بے کلی تھی۔ پولیس ... سے اتنا کچھ سُننے کے بعد مجھے کچھ شبہ ہونے لگا تھا کہ ہو ... ہے وہ رتنا نہ ہو، کوئی اور ہی ہو۔ ضروری نہیں کہ جو کچھ ... اور چینگا نے رتنا کے بارے میں بتایا تھا، وہ حرف بہ حرف ٹھیک ہی ہو۔ اڈّے پر قبضہ جمانے کی وجہ سے وہ سب رتنا کو سب کچھ سمجھ رہے ہوں، ممکن ہے، رتنا بعد ہی میں آیا ... اڈّا بے آسرا دیکھ کے اُس کی نیّت خراب ہو گئی ہو مگر ... نے تھانے سے نکل کے ٹیکسی ڈرائیوروں کو کسی اور علاقے ... پتہ نہیں بتایا۔ سیدھے اڈّے ہی چلنے کی ہدایت کی اور اب ... خاص اڈّے کی گلی میں موجود تھے۔ ٹیکسیوں سے اُترتے وقت ... اتفاق سے کسی کی نظر ہم پر نہیں پڑی لیکن جیسے ہی ہم چند ... آگے بڑھے، گلی میں چوڑیوں کی دُکان کے مالک ادھیڑ عمر آدم

بھائی نے ہمیں دیکھ لیا۔ "اُستاد!" اُس کی ٹھٹکی ہوئی آواز نے ہمارے قدم روک لیے۔ آدم بھائی ہمارے سامنے ششدر کھڑا تھا۔

تجھل نے اُس کا بازو پکڑ کے پوچھا۔ "کیسے ہو کنھیّا جی؟"

ہر وقت چوڑیاں پہننے والی عورتوں کا ہجوم اُس کے گرد لگا رہتا تھا اس لیے تجھل اُسے کنھیّا کہتا تھا۔

آدم بھائی اُچھل کے تجھل کے سینے سے چمٹ گیا اور سُبکنے لگا۔ آدم بھائی کے نظر پڑنے کی دیر تھی، ہم نے بہ مشکل چند گز کا راستہ طے کیا ہوگا کہ گلی میں ایک شور سا مچنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے راہ گیروں اور دکان داروں کی ایک بڑی تعداد ہمارے اطراف جمع ہو گئی تھی۔ وہ سب مبہوت نظروں سے ہمیں دیکھتے تھے۔ غالباً اُن سب کو باور کرا دیا گیا تھا کہ ہم کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ وہ ہمارے قریب آ آ کے، ہماری آوازیں سُن سُن کے جب تک یقین نہ کر لیتے تھے، اُن کی آنکھوں کی حیرت دُور نہیں ہوتی تھی۔ اِس سرے سے اُس سرے تک گلی خاصی لمبی تھی۔ ابھی ہم اِس سرے پر تھے کہ دُور دُور تک ہماری آمد کی خبر پہنچ چکی تھی اور ہم اپنے ہی علاقے میں تماشا سے بن گئے تھے۔ دونوں طرف سے لوگ بھاگ بھاگ کے، اُمڈ اُمڈ کے ہمیں دیکھنے ہماری طرف بڑھے چلے آتے تھے اور اوپر جدھر دیکھو، بالکنیوں اور کھڑکیوں میں عورتوں اور بچّوں کے چہرے نظر آتے تھے۔ ہمارے لیے چند قدم آگے بڑھنا دشوار ہو گیا۔ گلی کے پُرانے مکین پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمارے پاس آتے، تجھل کو سلام کرتے، خیریت پوچھتے اور ایک ہی سانس میں نہ جانے کیا کیا کہنے لگتے۔ کوئی کپتن خاں کا نام لیتا، کوئی زورا کا، کوئی شولی، لالہ کا۔ سب کا ایک ہی سوال تھا کہ ہم کہاں منہ کالا کرنے چلے گئے تھے۔ اڈّے کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا مگر اس طرح وہاں تک پہنچنے میں رات ہو جاتی۔ معلوم نہیں، تجھل نے نکڑ پہ اُترنے کو کیوں ترجیح دی تھی۔ ٹیکسیاں اڈّے کی عمارت تک بھی آ سکتی تھیں۔

یہ سلسلہ دیر تک نہ رُکتا اگر تجھل انھیں اپنے قریب آنے کے بجائے دُور ہٹانا نہ شروع کر دیتا۔ ہم سبھوں کو بھی وحشت ہونے لگی تھی چنانچہ سبھی نے لوگوں کو پیچھے ہٹ جانے کی تاکید کی۔ شروع میں مشکل پیش آئی لیکن پھر لوگ خود بہ خود پیچھے ہٹتے اور کنارے ہوتے گئے۔ وہ کچھ سہم سے گئے تھے اور اُن کے چہروں سے ظاہر تھا کہ ہمارے رویّے کی یہ اچانک تبدیلی اُنھیں اچھی نہیں لگی ہے۔ پھر کوئی قریب نہیں آیا اور خاموشی بھی طاری ہو گئی۔ ہمارے لیے راستہ صاف ہو گیا تھا۔ لوگوں کے اتنے قریب آنے سے تجھل کے پیر کو ضرور تکلیف پہنچی ہوگی مگر وہ تیز قدموں سے لنگڑا لنگڑا کے فاصلہ کم کرتا رہا۔ جب ہم اڈّے کی عمارت کے نزدیک پہنچے تو اردگرد سنّاٹا چھا گیا تھا حالانکہ وہ سب وہیں موجود تھے۔ ہم سے کچھ دُور وہیں گلی میں دیواروں، دکانوں اور مکانوں کی سیڑھیوں اور چبوتروں پر سمٹے ہوئے۔ چند لمحے بعد اڈّے کی عمارت ہمارے رُو بہ رُو تھی۔ تجھل نے سر اُٹھا کے ایک نظر ساری عمارت کا جائزہ لیا۔ رتنا نے نیا رنگ روغن کرایا تھا۔ بڑا دروازہ بند تھا۔ دروازے کے قریب ٹلوا کے بیٹھنے کی چوکی خالی پڑی تھی البتہ دروازے کے باہر دو آدمی کواڑوں سے چمٹے کھڑے تھے۔ میں نے اُنھیں پہلے نہیں دیکھا تھا۔ دونوں کی عمریں تیس سال سے کم ہوں گی۔ جسم کے ہلکے اور رنگ کے کالے تھے۔ دونوں پوری طرح تیار تھے۔

جامو اور بلاکو میرے ساتھ تھے۔ اُنھیں کسی پہلو قرار نہیں تھا، اُن کے جسم پھڑک رہے تھے اور سارا خون جیسے آنکھوں میں اُتر آیا تھا۔ میرے ہاتھ پیروں پر بھی ایک لرزش سی طاری تھی۔ ظاہر ہے، رتنا کو پہلے سے اطلاع مل گئی ہوگی۔ یہ ناممکن تھا کہ گلی میں ایسا شور مچا ہو اور گلی کے اڈّے کے کانوں تک نہ پہنچا ہو۔ ممکن ہے، رتنا کو ہمارے گلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی خبر ہو گئی ہو۔ جس وقت ہم پولیس افسروں کے سامنے موجود تھے، مجھے حیرت تھی کہ تجھل وہاں رتنا کا نام کیوں نہیں لے رہا ہے، اشارتہً بھی نہیں۔ ایک بار میں نے ارادہ بھی کیا کہ اُسے یاد دلاؤں لیکن یہ خیال کر کے چپ رہا کہ تجھل خود اُس کا نام کیسے بھول سکتا ہے۔ چلتے چلتے ایس پی ماتھر ہی نے رتنا کا ذکر کیا تھا اور تجھل اس پر بھی اپنی آنکھیں بجھائے بیٹھا رہا۔

"رتنا جی سے بولو، تمھارے مہمان آئے ہیں۔" تجھل نے سرد لہجے میں ان دونوں آدمیوں سے کہا جو دروازے پہ تالا بنے کھڑے تھے۔

"رتنا اُستاد ابھی آرام کرتا ہے۔"

اِدھر سے جامو اُدھر سے تجھل نے پلک جھپکتے میں ہاتھ بلند کر کے اُن کے سروں پر مارے۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ دونوں وہیں بیٹھ گئے اور ابھی چیخ بھی نہیں سکے تھے کہ جامو اور تجھل نے بال پکڑ کے اُنھیں اوپر اُٹھایا اور گردن کو ہلکا سا جھٹکا دے کے اُنھیں دائیں بائیں دھکیل دیا۔ جینی نے بڑھ کے دروازے پر ٹھوکر ماری۔ دروازہ مقفل نہیں تھا، چوپٹ کھُل گیا۔ اندر کمروں اور دروازوں کے مابین کھُلی ہوئی مختصر جگہ پر پانچ آدمی چاقو تولے کھڑے تھے۔ ہمارے چاقو جیبوں ہی میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ منتظر تھے۔ ہمیں اندر گھستا دیکھ کے وہ ایک دم ہم پر جھپٹے لیکن ہماری

نگاہوں نے اُنھیں تاک لیا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہوا، ہمیں کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ میں نے اپنے قریب موجود صرف جامو کو دیکھا تھا۔ وہ چیختا ہوا ایک آدمی پر اُچھلا اور اُس کی جھونک میں اُس نے دو اور آدمیوں کو گرا دیا۔ میں نے بھی کچھ یہی کیا تھا۔ جب مجھے اپنی سُدھ بُدھ ہوئی تو وہ پانچوں زمین پر پڑے تھے اور اُن کے چاقو اِدھر اُدھر گرے ہوئے تھے۔ اُنھیں دوبارہ چاقو اُٹھانے کی فرصت نہیں ملی۔

سامنے کے دونوں کمروں کے دروازے بند تھے مگر دفعتہً ایک دروازہ کھلا اور ایک ساتھ کئی آدمی تیزی سے باہر نکلے۔ تجھل کے چہرے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اِن میں رتنا نہیں ہے لیکن یہ کون سا طریقہ تھا کہ خود آنے کے بجائے اُس نے پھر اپنے چند آدمی بھیج دیے تھے۔ کیا اُس کے دماغ میں یہ تھا کہ تجھل اڈے تک آ کے اوسان آدمیوں کو دیکھ کے واپس ہو جائے گا یا وہ تجھل کا ارادہ آزمانا چاہتا تھا یا اُس کا خیال یہ تھا کہ اس طرح ہم آدھے ہو کے اُس کے مقابل پہنچیں گے۔ اڈوں پر کہیں ایسا نہیں ہوتا مگر اڈے ایسے حاصل بھی نہیں کیے جاتے جیسے رتنا نے کیا تھا۔ "کیا، کیا ہے؟" اُن میں سے ایک دراز قد اور پھیلے ہوئے جسم کے ایک شخص نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ "یہ رتنا اُستاد کا اڈا ہے۔"

"اُسی کے دوار پہ آئے ہیں لے۔" تجھل مدھم لہجے میں بولا۔
"تم کو باہر بولا نہیں کہ ابھی رتنا اُستاد کے آرام کا ٹیم ہے۔"
"اُس گیدڑ کے تخمے کو بول، اکٹھا آرام کر لینا۔" جامو کی آواز بھڑک رہی تھی۔ "ابھی اِدھر اُس کی ماں کے پچھلا اُتار آئے ہیں۔"
"چمڑی سے مت پھٹ کنجر!" وہ دہاڑ کے بولا۔ "اندر ہی رہ کے بول۔"

جامو کا سارا جسم ایک لمحے کے لیے بل کھا گیا۔ وہ جلاکو، عینی اور سارنے بیک وقت اُن پر جھپٹنے والے تھے کہ تجھل کی آواز سُن کے رُک گئے۔

"ہاں! اِن کو پرے ہی رکھو تجھل!" رتنا کے آدمیوں میں سے ایک نے زمین پر تھوک کے کہا۔ "ابھی اِدھر جو اِس کی بہن کے جُتنیا سوار کھڑے ہیں، وہ اس کو نہیں ٹیپتے؟"

تجھل جواب دینے کے بجائے لنگڑاتا ہوا خود اُن کے پاس جانے لگا لیکن درمیان ہی میں جامو اُس کے آڑے آ گیا۔ "تم پیچھے ہٹو اُستاد!" وہ چیخ کے بولا۔ تجھل رُک گیا۔ جامو نے بولائے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور ایک جھرجھری لے کے جیسے جسم کی گرد جھاڑ رہا ہو، اُن کی جانب آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔ وہ اُسے ٹھہر جانے کا حکم دیتے رہے مگر جامو اپنی اُبلی ہوئی آنکھیں اُن پر مرکوز کیے بڑھتا رہا اور اُن کے مقابل ہی جا کے ٹھیرا۔ تین اطراف سے وہ اُن کے نرغے میں تھا۔

میری سانس سینے میں اٹکنے لگی تھی۔ سب کے پاس تمنچے تھے۔ میری جیب میں بھی لیکن کسی نے تمنچا باہر نہیں نکالا۔ جامو اُن کے بیچ میں پہنچ کے بُت کی طرح جم گیا تھا۔ اُس کی حالت کسی پاگل سانڈ جیسی تھی جو سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا راہ گیروں پر پلٹ کے وار کرنے کے لیے تیار ہو اور اپنے سینگ تول رہا ہو۔ کتن خاں اور جامو کا بچپن سے سنگ ساتھ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو بالکل بھائیوں کی طرح سمجھتے تھے۔ جامو کی نظروں میں اُسی کا چہرہ سمایا ہو گا۔ اسی جگہ وہ اُسے چھوڑ کے گیا تھا۔

اُنھوں نے چاقو نہیں چلائے کیونکہ جامو اُن کی دسترس سے قطعاً دُور نہیں تھا اور اُنھوں نے دیکھ لیا تھا کہ اُس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ "لوٹ جاؤ، ہم بولتے ہیں لوٹ جاؤ۔ تمھارا ٹیم گیا۔ یہ اڈا اب رتنا اُستاد کا ہے۔" اُن میں سے ایک آدمی نے ہکلا کے کہا۔ وہ سب جامو کے گرد چاقو گھما رہے تھے۔ "اپنا وقت تو دم کے ساتھ ہے۔ جا کے اُس زنخے کو بول، دیری نہ کر، جھنجھنا لے کے آ جا۔" جامو نے اس کے بازو کو تھپکی دی تو سب بدک پڑے۔

"ابھی پیچھے رستہ کھلا ہے۔ زیادہ اٹکل مت کر۔" پھیلے ہوئے جسم کا آدمی دھتکارتے ہوئے لہجے میں جامو سے بولا۔ "یقتنیا پھیر لے۔"

جامو نے پھر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ جس شخص کے بازو پہ تھپکی دینے کے لیے اُس نے ہاتھ بڑھایا تھا، چشم زدن میں اُس کی گردن پہ ہاتھ ڈال کے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور صرف اُسی کو نہیں، اُس نے دوسرے ہاتھ سے اُس کے مقابل کھڑے ہوئے آدمی کی گردن بھی دبوچ لی تھی۔ ایک ساتھ کئی چاقو چلے۔ وہ جامو کا داؤ بالکل نہیں سمجھ پائے تھے۔ جامو نے پل بھر کی مہلت میں اُن کے ساتھیوں کے ٹینٹوے پر ایسی جگہ چٹکی بھری تھی کہ وہ بُری طرح تڑپنے لگے تھے۔ اُن کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی اور اِن میں جامو کی پکڑ سے خود کو چھڑانے کے سوا کوئی سکت نہیں تھی۔ جامو نے اپنے دونوں ہاتھوں کی دو دو انگلیاں اُن کی ٹھوڑی کے نیچے پیوست کر دی تھیں، کسی کانٹے کی طرح۔ اُن کے پھڑکتے اور ملکتے جسموں کا سارا زور بھی جامو کے اُن کانٹوں سے چھٹکارا پانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ دونوں مکمل طور پر جامو کے قبضے میں تھے اور اُن کے اطراف اُن کے

ساتھی جیسے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ جامو نے ایک ثانیے میں متعدد پینترے بدلے تھے اور اُنھیں اپنی انگلیوں کی میخوں میں پیوست کیے اِدھر اُدھر تھرکتا گھومتا رہا تھا۔ ہر طرف جامو کے پاس اُن کی ڈھال موجود تھی۔ جامو کے بجائے چاقو اُنھی کے جسموں پر لگتے۔ نتیجتہً باقی آدمیوں کو پیچھے ہونا پڑا۔ اگر وہ آگے آتے تو اُن کے چاقوؤں سے اُنھی کے ساتھیوں کے جسم چھلنی ہوتے۔ جامو اپنی جگہ جما ہوا نہیں کھڑا تھا۔ لمحے بھر بعد اُس کے بدلے ہوئے پینترے کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ اپنے ہاتھ آگے پیچھے کرتا تو اس کی چنگی میں جکڑے ہوئے دونوں آدمی لازماً اُسی کے ساتھ جدھر وہ چاہتا، گھوم جاتے۔

ہم سب قریب ہی کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ جامو سے ذرا بھی چوک ہو جاتی تو چاقو اُس کے جسم سے دُور نہیں تھے۔ دونوں آدمی نڈھال سے ہونے لگے۔ جیسا کہ تجھل اکثر مجھ سے کہتا تھا کہ داؤ میں بس لمحوں کا لَوٹ پھیر ہونا چاہیے۔ جامو نے اس سے زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔ تجھل بھی اُن کے سامنے جا کے یہی کچھ کرتا جو جامو نے کیا تھا اور کوئی بھی شخص جس کی انگلیاں لوہے کی طرح سخت اور چاقو جیسی دھار رکھتی ہوں۔ ترازو کی اُس ڈنڈی کے مانند جو بہت بڑا بوجھ سہار لیتی ہے۔ زیادہ آدمیوں کے درمیان اسی قسم کا کوئی غیر متوقع داؤ سودمند ہوتا ہے لیکن جامو کو دیر تک اس پر قائم نہیں رہنا تھا، فوراً کوئی نیا رُخ بدلنا چاہیے تھا۔ زیادہ وقت ایک ہی داؤ پر اڑے رہنے سے مقابل کے لوگوں کو اپنے بچاؤ کے علاوہ جوابی حربے اختیار کرنے کا بھی موقع مل جاتا ہے اور جامو کو اُنھیں یہ موقع نہیں دینا تھا۔ میرا خیال تھا، جامو جلد ہی ان دونوں نیم جاں آدمیوں کو اُن کے ساتھیوں پر دھکیل دے گا اور اسی اثنا میں دوسرے آدمیوں کو پکڑے گا یا خود چاقو سے اُن پر وار کرے گا۔ اپنے دو ساتھیوں کی جاں بلبی دیکھ کے اُن کے ہاتھ پیر ویسے ہی ٹھیک طرح کام نہیں کریں گے۔ وہ جامو کے پنجے سے اُنھیں چھڑانے کے لیے اپنے چاقو زمین پر بھی پھینک سکتے تھے۔ اسی بات کا امکان زیادہ تھا۔ اس طرف ہم بھی اُن کے قریب موجود تھے اور ہمارے اتنی دیر خاموش رہنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم ہر صورت میں یوں ہی کھڑے رہیں گے۔ اُن کے پیچھے ہو جانے کے باوجود جامو گھوم گھوم کے اُنھیں اُکسا رہا تھا تاکہ وہ اُس پر وار کرنے کا پھر ارادہ کریں اور اپنے ہی ہاتھوں اپنے ساتھیوں کو چاقو گھونپ دیں۔

جامو کے ذہن میں کچھ اور بھی ہو سکتا تھا لیکن اُسے کچھ اور سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اندر سے یک بارگی چند آدمیوں کے بھاگنے کی آوازیں آئیں۔ جامو نے پھر بھی اُنھیں نہیں چھوڑا۔ آنے والے چھ آدمیوں میں سب سے نمایاں جو آدمی تھا، وہی رتنا ہو گا۔ مجھے اُس کا چہرہ کچھ کچھ جانا پہچانا محسوس ہوتا تھا۔ شاید کبھی جیل میں دیکھا ہو مگر اب اُس کے جسم اور شکل و صورت میں بہت فرق ہو گیا تھا۔ اُس کا جسم پہلے کی نسبت بندھا ہوا تھا۔ درمیانہ قد، سانولا رنگ، گول چہرہ اور مسوں، نشانوں کی بھرمار، تنگ پیشانی، لمبی ناک، پتلے پتلے ہونٹ، آنکھیں بڑی نہ چھوٹی، بال سلیقے سے کڑھے ہوئے۔ درمیان میں مانگ، کُرتا پاجامہ، اُوپر سے واسکوٹ، گلوبند میں ملبوس اُودے رنگ کے بڑے سے نگینے کی انگوٹھی، کلائی میں سُرخ ڈورا۔ اُس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ وہ تیز قدموں سے باہر آیا تھا۔ آتے ہی اُس کی نظر جامو پر پڑی جو اُس کے دو آدمیوں کو اپنی انگلیوں سے تھامے ہوئے تھا۔ رتنا دروازے کے پاس ہی رُک گیا۔ اُس کے ساتھ آنے والے آدمی جامو سے لپٹنے کے لیے جست لگانا ہی چاہتے تھے کہ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُنھیں جھڑک دیا اور سر گھما کے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے دیدے مچل رہے تھے۔ ہر چیز جیسے بے دم، بے آواز ہو گئی تھی۔ جامو نے دونوں آدمیوں کو اِدھر اُدھر دھکیل دیا تھا لیکن خود وہیں کھڑا رہا۔ رتنا نے اُس کی طرف توجہ نہیں دی۔ اُس کی گھومتی ہوئی نظریں تجھل پر آ کے ٹھیر گئی تھیں۔ تجھل بھی اسی کو گھور رہا تھا۔ رتنا کے سکڑے ہوئے ہونٹ پھیلتے گئے۔ "جان پڑتا ہے، کہیں دیکھت ہیں۔" یکایک وہ استہزائی لہجے میں بولا۔

تجھل کے لبوں میں جنبش نہیں ہوئی۔
"اوہو! ہو۔" وہ اچک کے بولا۔ "تجھل اُستاد آئے ہیں۔"
"ذرا جلدی پہچان لیا۔" تجھل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
"پر اس کو، اس کو کیا بولے ہیں؟" اُس نے زمین پر اوندھے پڑے اپنے آدمیوں کی طرف نگاہ کرتے ہوئے چلبلے پن سے پوچھا۔
"بولنا بھی آ گیا ہے تجھ کو۔"
"اور بھی بہت کچھ آوے ہے تمھارے سر کی قسم۔"
"تو پھر دیر کاہے کو کرتا ہے؟"
"اندر چل کے کچھ جل پانی کر لیو، پہلی بیر اِدھر آئے ہو۔"
"اب تو تیرا خون ہی پئیں گے۔"
"بہت کڑوا ہے اُستاد! لگے ہے، نجر یا بھی بدن کے سنگ کچھ ڈھلک گیو ہے۔ آتے کسی نے بولا نہیں کہ رستہ

کدھر کو جاوے ہے؟"

اُس کا وجود میری طرح کسی کو بھی ایک پل کے لیے برداشت نہیں ہو رہا ہوگا اور وہ اس قسم کی باتیں کر رہا تھا۔ ایک نظر دیکھنے سے معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ اُس کے منہ ہی لگنا فضول تھا۔ ہم سب بجھل کے اشارے کے منتظر تھے جابو رتنا کے قریب ہی کھڑا تھا اور ہم میں سے بھی کسی کو اُس کے پاس پہنچنے میں دیر نہ لگتی۔ ایسے آدمی کے لیے سوچنا ہی کیا تھا۔

"زیادہ چر چر مت کر۔" بجھل نے بھاری آواز میں کہا۔ "جو بچار کرنا ہے کر لے۔ تیرے پاس ابھی تھوڑا ٹائم ہے۔"

"اب بھی کوئی بچار رہو رہے ہے؟" وہ آنکھیں مٹکا کے بولا۔ "ہتھیار کو تجھ پر اُٹھتے لجا آئے گی۔ اچھا ہے اس کو بیچ میں مت لا۔ اپنا فیصلہ خود ہی کر لے۔ ہم لوٹ آئے ہیں۔"

"او تو ہم کو بھی دِکھے ہے، تم لوٹ آیو ہو پر ذرا دیر سی میں آیو ہو۔ اِدھر سارا کچھ بدل گیو ہے۔ بنتے اِدھر ہی آئے ہے بڑ؟"

بجھل نے جواب میں چاقو نکال لیا۔

"اپنے پلّے بھی ہوئے ہے استاد! اس کو بھیتر ہی رکھ لیو تو ٹھیک ہے۔ ہم بول دیں کہ بڑا گھاٹا ہوئے گا۔ ابھی تمھاری کھوپڑیا میں پہلے کا کوئی دھیان ہے تو اُس کو نکال دیو۔ اڈّے پر اب ہم بیٹھے ہیں اور کسی سے مار کے نہیں بیٹھے ہیں۔ دمڑی دے کے لیو ہے اور جب لیو ہے تو جانے بھی ہیں کہ اُس کو رکھا کیسے جاوے ہے۔ ہم ادھر نا ہی آتے تو بدلے کوئی آ جاتا۔ بہت سے حرامیوں کے تن میں چوہے دوڑے تھے۔ شکر کر یو کہ ہم آئی گئے۔ تمھارا سارا آدمی سالا ناک کٹائے کے بیٹھ گیو تھے۔ کچھ اِدھر بکرا بنے، باقی اُدھر پنجرے میں چلے گیو۔ بولت ہیں کہ اپنوں کو ڈس لیو۔ تمھارا کانٹا ابھی تک من میں چبھے ہے۔ پر تمھارا سمے پھر گیو ہے۔ تم سے کیا بولیں۔ سمجھے کہ نا ہیں؟ آیو ہو تو ادھر دھیرج سے بیٹھو، پر اڈّے کا بچار من سے نکال دیو۔"

"ضرور تجھے کسی چھنال نے جنا تھا۔"

"کسی دھوکے میں مت رہیو استاد! بعد کو بڑی نندا ہوئے گی۔ تمھارے نکل لینے کے بعد ہم اُدھر رات دن برسوں سالا مکھی نا ہی مارت تھے۔ چھاتی میں تمھاری بات اٹکائے کے گیو تھے۔"

پتہ نہیں، بجھل کو کس بات کا انتظار تھا، وہ اور کیا سننا چاہتا تھا۔ رتنا کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی اور بجھل کا چاقو اُس کے ہاتھوں میں سرد پڑا تھا۔ اندھیرا تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ میں نے بے چینی سے بجھل کی طرف دیکھا مگر وہ جیسے اپنے آپ میں گم تھا۔ رتنا کے خاموش ہو جانے کے بعد چند لمحے وہ سُن کھڑا رہا۔ "کا سوچن لاگے استاد!" رتنا نے ہی تمسخرانہ لہجے میں اُسے ٹوکا۔

بجھل نے اپنا چاقو اُس کی جانب اُچھال دیا۔ رتنا کو اِس کی توقع نہیں تھی۔ غیر اختیاری طور پر وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن چاقو زمین پر گرنے ہی والا تھا کہ اُس نے پھرتی سے اُسے ہاتھ میں اُچک لیا۔ "نا ہی مانو گے۔ لاگے ہے آج دن آ یو گیا۔" وہ چاقو کی دھار پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔ "ابھی اتنا بہت ہے استاد!" اُس کی آواز ایک دم بدل گئی۔ "اُلٹے پیروں اِدھر سے لوٹ لیو۔" اُس نے چاقو واپس بجھل کی طرف پھینک دیا۔ بجھل نے ہاتھ بڑھا کے اُسے تھام لیا۔ رتنا نے اس دوران اپنا چاقو بھی نکال لیا تھا۔

"جلدی کر بھانڈ کے جنے! اندھیرا بڑھ گیا ہے۔ دن میں ہی تجھ کو ٹھیک دکھائی نہیں دیتا، اندھیرے میں کیا سوجھے گا۔"

"لاگے ہے آج دن آ یو گیا۔" وہ سر جھٹک کے بولا۔ "بچپن میں ایک کہاوت سنیو تھے۔ گیدڑ کی موت آوے ہے تو شہر کی طرف بھاگے ہے۔ ہے کالی میّا! من میں تیرے داس کی ایک ہی اچھا تھی کہ تیرے چرنوں استاد بجھل کے خون کا چڑھاوا دیویں۔" رتنا اپنا چاقو چومتے اور آسمان کی طرف نگاہ کرتے ہوئے ہذیانی انداز میں بولا۔ اُس نے چاقو بجھل پر تول لیا تھا مگر اچانک رُک گیا اور اچھل کے کہنے لگا۔ "پر اِدھر نہیں، اندر چلو! اندر چلو! اُدھر جگہ بڑی ہے۔ تم کو بھی شکایت نہیں ہوئے گی اور اُدھر کالی میّا کی مورتی بھی درشن دیوے ہے۔ اس کے آگے ہی بلی ہوت۔" یہ کہتے ہی وہ مُڑ گیا۔

بجھل بھی غالباً یہی چاہتا تھا۔ اُس نے اعتراض نہیں کیا۔ اس طرف جگہ بہت تنگ تھی۔ پیچھے گلی کے کُھلے دروازے سے لوگ اندر جھانک رہے تھے مگر اُن میں سے کوئی اندر نہیں آیا تھا، اُن کا گھٹا گھٹا شور ہمارے کانوں میں گونج رہا تھا۔

بیچ کا کمرہ پھلانگ کے ہم صحن میں آ گئے۔ صحن کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ فرش دھلا ہوا، دیواروں پر نئی سفیدی ہوئی دی تھی۔ دیوار کے ساتھ لگی بڑی چوکی پر گیروے رنگ کی چادر بچھی تھی۔ سامنے مونڈھے پڑے تھے۔ صحن کی یہ صفائی ستھرائی کبن خاں کی زندگی میں ہوئی ہوگی۔ وہ کپڑے بھی صاف ستھرے پہنتا تھا اور ہر وقت بنا سنورا رہتا تھا۔ صحن خاصا کشادہ تھا۔ اندر پہلے سے کچھ اور آدمی موجود تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ رتنا نے اپنے خاص آدمیوں کو باقاعدہ اکٹھا کیا ہوا تھا یا وہ اڈّے کے گرد ہی گھومتے رہتے تھے اور گلی میں ہمارے اطراف بھیڑ دیکھتے ہی یہاں آ گئے تھے۔ اُن میں سے چند کے چہرے مجھے دیکھے ہوئے لگتے تھے۔ شاید وہ موجمدار کے اڈّے کے لوگ تھے یا کسی اور اڈّے کے ہوں گے۔ بجھل، ملاکو، جامو، سارٹے وغیرہ انھیں خوب جانتے ہوں گے۔ صحن میں آتے ہی رتنا اُس طاق کی طرف مُڑ گیا تھا۔ جہاں زبان نکالے ہوئے کالی دیوی کی سیاہ مورتی رکھی تھی۔ وہ ہاتھ جوڑے طاق کے کونے سے سر رگڑ رہا تھا اور اُس کا چاقو مورتی کے قدموں میں پڑا تھا۔ باقی لوگ صحن میں ہر طرف دربانوں اور پہرے داروں کے مانند کھڑے تھے۔ انھیں آپس میں اشارے کرنے کے سوا اور وقت نہیں ملا ہوگا۔ اُن کے پیچھے ہم فوراً اندر آ گئے تھے۔

صحن میں روشنی کی کمی نہیں تھی، تمام بتیاں جلی ہوئی تھیں۔ کالی دیوی کے پاس سے ہٹ کے رتنا چوکی کے سرے پر پاؤں لٹکا کے بیٹھ گیا۔ ہم سب چوکی کے نزدیک ایک طرف موجود تھے، اپنے ہی گھر میں اجنبی بنے ہوئے۔ ہر پل جسم کاٹتا ہوا گزر رہا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے ہم یہاں نہیں آئے تھے۔ سب اپنے ہاتھ پیروں کو بہ مشکل روکے ہوئے تھے۔ کسی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ آگے بڑھ کے رتنا کی انتڑیاں نکال دے، اُس کی کھال ادھیڑ دے، آنکھیں پھوڑ دے۔ اگر بجھل یہ سمجھتا تھا کہ وہ رتنا ہی ہے جس نے کبن خاں اور اپنے دوسرے آدمیوں کو آنکھیں کھولنے کی مہلت نہیں دی تھی تو سامنے آنے کے بعد رتنا بھی اتنی دیر کا مستحق نہیں تھا مگر بجھل کا جی شاید پتھر کا ہو گیا تھا۔ چاقو اُس کے ہاتھ میں موجود تھا اور وہ رتنا کے چوکی سے اُٹھنے کا منتظر تھا۔ جب بجھل نے اڈّے کی عمارت کے بجائے گلی کے نکڑ پر ٹیکسیاں رکوائی تھیں اور گلی کے لوگوں نے ہمیں آ گھیرا تھا، اُس وقت مجھے خدشہ ہوا تھا کہ کہیں رتنا اِس عرصے میں اڈّے سے نکل نہ جائے۔ اڈّے کا ایک دوسرا راستہ پچھلی گلی میں کُھلتا تھا لیکن رتنا نہ تو پچھلے دروازے سے باہر گیا، نہ اُس نے چاقو اُٹھانے سے اجتناب کیا بلکہ کچھ ایسا لگتا تھا جیسے اُسے ہمارا انتظار ہی ہو۔ جس شخص نے کبن خاں کو اس طرح راستے سے ہٹایا ہو، ہماری آمد کی اطلاع سُن کے وہ یوں اڈّے پر بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر شاید وہ رتنا نہیں تھا۔ بجھل بھی کچھ یہی سمجھ رہا تھا مگر یہ رتنا کی کٹ حجتی بھی ہو سکتی تھی۔ اس طرح وہ ہم لوگوں پر کچھ اور ثابت کرنا چاہتا ہوگا جو اُس نے پولیس پر ثابت کیا تھا اور رتنا تبھی کچھ ثابت کرنے کی کوشش کر سکتا تھا جب اُسے اپنے بازوؤں کا کچھ زیادہ ہی اعتماد حاصل ہو، خالی خولی نہیں۔ اڈّے پر قبضہ جمانے کے لیے پہلے کبن خاں کو ایسے ہی ختم کیا جانا چاہیے تھا۔ سامنے آ کے وہ کبن خاں، لالہ، شولی، فدے، کانتے، کس کس کا سامنا کرتا۔ ایک کبن خاں ختم ہو جاتا تو اڈّا اُس کے ہاتھ میں نہ آتا اور ایک وقت کو آ بھی جاتا تو دوسرے چین نہ لینے دیتے۔ اڈّے پر ایک سے ایک آدمی موجود تھا۔ اس طرح اڈّے پر کوئی باقی نہیں رہا تھا اور اڈّا حاصل کرنے کے بعد وہ اُس کے بازوؤں ہی کا زور تھا جو کلکتے کے دوسرے اُستادوں کو اُس سے دور رکھے ہوئے تھا اور اب وہ اسی کس بل پر بجھل کے سامنے موجود تھا۔ اُس بجھل کے سامنے جسے وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اُس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا مگر خوف اور گھبراہٹ کے آثار نظر نہیں آتے تھے یا وہ اُنھیں چھپانے پر قادر تھا۔

مورتی کے پاس سے ہٹ کے چند ثانیوں تک وہ سر جھکائے چپ کا بیٹھا رہا پھر اچانک کالی دیوی کا نعرہ لگا کے چوکی سے اُٹھ گیا۔ ہم نے روکنا چاہا مگر بجھل چند قدم چل کے اُس کے مقابل آ گیا۔ رتنا نے اُس کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی دونوں ہاتھ پھیلا دیے تھے۔ بائیں ہاتھ میں چاقو چمک رہا تھا مگر یکایک وہ پیچھے ہٹ گیا جیسے اُسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ "ہائیں!" وہ متوحش لہجے میں بولا۔ "پیر میں چوٹ لگے ہے۔ تم سے ٹھیک تنی چلا بھی نہ جاوے ہے۔"

"آگے بڑھ۔" بجھل نے بپھری ہوئی آواز میں کہا۔

"بڑھنے کو بڑھ جاویں گے پر کالی میّا کا بولے گی؟ چوٹ کھائے کی بھینٹ سویکار نا کرے گی۔"

"آگے بڑھ۔" بجھل کی آواز صحن میں گونجنے لگی۔

"نائیں استاد! ہم کو مجبور مت کریو، ابھی پاؤں ٹھیک کر لیو پھر جاوے تو ہم کدھر جاوے ہیں۔"

"یہ گو تو بھلا چنگا ہے رستم کے ٹھوکے۔"

"او تو تم کو پتہ چل جائے گا۔ رستم کے ٹھوکے ہیں پر رستم یہ ٹھوکتے ہیں۔ اپنے پاؤں کی یہ حالت ہوتی تو تم کیا آگے بڑھ جائے تے! نا نا استاد! اپنے دھرم میں چوٹ کھائے پہ ہتھیار اُٹھانا پاپ ہے۔"

بجھل نے اُس سے نہیں کہا کہ ہتھیار اندھوں پر اُٹھانا پاپ نہیں ہے، اُسے چوری سکھانا پاپ نہیں ہے۔ بجھل کے بولنے سے پہلے جامو سنسناتی آواز میں بولا۔ "جان دے اُستاد کو تو نے معاف کر دیا ہے تو اِدھر سے کوئی دیوی کے لیے چن لے۔"

"تمھارے من کی حسرتیا بھی نکال لیو دیں گے۔ پہلے جڑ کو تو

کاٹ دیویں اور تم کو ایسے ہی کھُجلی ہو رہے ہے تو ادھر کھڑے آدمی تالی بجانے کو نا ہی ہیں، کل کر اپنی بھنالے کے آؤ اور بولیو کہ رتنا اُستاد ابھی پہلے اِس پہ ہتھیار اُٹھاؤ تو کا ہم تمھاری بات مان لیویں گے۔ پہلے استاد کو دیکھ لیویں اور استاد ہم کو۔ برسوں ان ہاتھوں کی گھسائی پھر کس کارن کیے تھے تم بولو گے تو تمھارا المبر بھی آجادے گا۔ اڈّے پر بیٹھے ہیں اپنی ماں ... "

وہ گالی دے کے لپلا۔ تجھل کی آنکھیں بھاری ہوگئی تھیں۔ میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔ اب اُسے کچھ اور نہیں سننا چاہیے تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھ گیا۔ رتنا کو جلد ہی احساس ہوگیا کہ وہ فضول باتیں کر رہا ہے۔ تجھل کو آگے آتے دیکھ کے ایک آن میں اُس نے اپنا جسم سیدھا کیا اور اُس کے ہاتھ پیر پھڑپھڑانے لگے۔ "میا کی سوگند" وہ چیختے ہوئے بولا۔ "کچھ اور مت سمجھیو ای کہ ہم کوئی رسّی تڑادے ہیں، ہم کو کا معلوم نہ تھا کہ ایک دن الیو آوے گا، سومیا کو تمھارا ہی بچن دیو تھے۔" وہ دیوانوں کی طرح اپنا سر ہوا میں پٹخنے لگا۔ "نہیں مانت ہو تو ٹھیک ہے، میا ملنے! او خود دیکھ رہو ہے۔" اُس نے طاق میں رکھی مورتی پر ایک نظر ڈالی اور ہاتھ جوڑ کے نعرہ لگایا۔ "جے بھوانی کی۔" اُس کے دونوں ہاتھ تجھل کو اپنے شکنجے میں کسنے کے لیے پھیل گئے۔

اُس نے اُچھل کے تجھل سے اپنا فاصلہ اور کم کر لیا۔ تجھل کا چاقو بھی بائیں ہاتھ میں تھا۔ وہ رتنا کی طرح اُچھلا اور کودا نہیں، کچھ آگے جا کے رُک گیا۔ رتنا کو بھی ٹھیرنا پڑا مگر اُس کے ہاتھ پہلے ہی تلے میں تجھل کا نشانہ لینے کے لیے بے قرار تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ رتنا کے ہونٹ بھنچے ہوئے، نتھنے پھولے ہوئے تھے اور اُس کی آنکھیں سر سے پاؤں تک تجھل کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ وہ ہاتھ جھٹک جھٹک کے تجھل کو جنبش کرنے پر اُکسا رہا تھا جو اپنی جگہ جم سا گیا تھا۔ رتنا کو اُس پر حملہ کرنے کے لیے بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں تھی مگر تجھل کی اِس بے حرکتی نے اُسے اور زیادہ محتاط کر دیا تھا اور وہ کچھ تلملانے لگا تھا۔

صحن میں سکوت مسلط تھا۔ ہر طرف حصار بنائے رتنا کے آدمی جیسے لمحے گن رہے تھے۔ اُن کی گردنیں آگے نکلی ہوئی تھیں، آنکھیں پھٹی ہوئی۔ ہم بھی ایک کونے میں دم روکے کھڑے تھے۔ ہلاکو اور سالے میرے بازوؤں سے چپکے ہوئے تھے۔ جامو اپنا گال کھرچ رہا تھا۔ سب کی نظریں ایک ہی طرف لگی ہوئی تھیں۔ بہت دنوں بعد تجھل کسی کے سامنے یوں چاقو کھولے کھڑا تھا، ہمیں کسی اور بات کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی رتنا کی طرف سے تھی۔ اُس سے کوئی بھی حرکت بعید نہیں تھی اور اِدھر تجھل کا پیر سُوجا ہوا تھا۔

رتنا کے جسم پر ایک ہیجان طاری تھا۔ تجھل کو ایک جگہ جمے دیکھ کے اُس کی حالت کچھ اور اضطراری ہوگئی تھی۔ وہ پیچھے نہیں ہٹا البتہ ایک طرف ہو گیا جو پیچھے ہٹنے ہی کے مترادف تھا۔ تجھل وہیں کھڑے کھڑے مُڑ گیا۔ رتنا نے اُسے ایک جھپکی دی، کارگر نہیں ہوئی تو وہ دائیں طرف ہو گیا۔ تجھل کو پھر دائیں طرف اپنا رُخ بدلنے میں دشواری نہیں ہوئی۔ تین چار بار وہ یہی عمل دُہراتا رہا۔ اُس کا خیال ہوگا کہ تجھل کے لیے اس حالت میں چلنا مشکل ہے چنانچہ وہ اُسے جتنا تھکا سکتا ہو، تھکا دے لیکن تجھل جدھر وہ چلا جاتا، ایک پل میں اُسی طرف منہ کر لیتا، اُس نے ایک قدم بھی نہیں بڑھایا۔ وہ رتنا سے جو کچھ کہنا چاہتا تھا، رتنا بھی اُسے سمجھ گیا تھا اس لیے وہ اُس کے قریب آنے اور ایک جگہ جمے رہنے کے موقع سے فائدہ اُٹھانے کے بجائے پہلے اُسے تھکا دینے کی تگ و دو میں تھا۔ رتنا کے لیے یہ صورتِ حال عجیب اور وحشت انگیز تھی کہ کوئی اِس طرح چاقو تانے کھڑا رہے۔ ایک انچ بھی ہل کے نہ دے اور وہ اُس کے قریب نہ جا سکے۔ اگر تجھل نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ یوں ہی اپنے محور پر گھومتا رہے گا تو رتنا نے بھی اُسی تکرار کی ٹھان لی تھی۔ رتنا کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو کچھ دُور جا کے اور فاصلہ بڑھا کے تجھل کی طرح ایک جگہ جم جاتا اور جب تک وہ حرکت نہ کرتا، اُس وقت تک تحمّل کرتا۔ شاید اِس طرح تجھل کو بڑھنا ہی پڑتا مگر رتنا کو ہر دم یہ احساس ہوگا کہ اُس کے سامنے کون ہے اس لیے وہ اُس کے قریب آنے اور اُس پر جھپٹنے سے پہلو بچا رہا تھا، مبادا تجھل کچھ اور ہی سوچے ہوئے ہو کیں پر بھی یہ احساس ہر دم غالب رہتا۔ مشہور تھا کہ تجھل کو صرف ارادے کی دیر لگتی ہے۔ اُس کے اُٹھے ہوئے ہاتھ ہوا میں اُڑتے ہوئے پرندوں کے مانند ہوتے ہیں جن کا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس طرف مُڑ جائیں گے، کون سی شاخ پر جا بیٹھیں گے۔

تجھل کے ہاتھ گرے ہوئے نہیں تھے۔ رتنا کی طرح وہ بھی اُنھیں پھیلائے ہوئے تھا۔ اُس کا سر، آنکھیں، کاندھے متحرک تھے مگر وہ ایک جگہ کھڑا تھا۔ خاصی دیر بعد رتنا کے ذہن میں وہی تدبیر آئی جس پر اُسے پہلے ہی عمل کرنا چاہیے تھا یعنی اُس نے اپنا فاصلہ زیادہ کر لیا۔ تجھل پھر بھی نہیں ہٹا۔ رتنا کے لیے یہ ناقابلِ برداشت تھا۔ کچھ دیر تو وہ انتظار کرتا رہا، پھر "جے بھوانی" کا نعرہ لگا کے دہاڑتا ہوا آگے آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سیدھے

تجھل کے پیٹ میں چاقو گھونپ دے گا لیکن وہ صرف آزمانشاً آیا تھا۔ تین چار فٹ کا فاصلہ رہ گیا تو وہ اچانک پلٹ کے دائیں طرف ہو گیا۔ پھر وہیں سے اُلٹے قدموں واپس آگیا۔ اس تیزی سے آکے اُس کا ایک دَم پلٹ جانا آسان کام نہیں تھا۔ اُس سے اُس کے جسم کی پھُرتی اور زور کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اُسے اپنے جسم پر پورا قابو حاصل تھا۔ اُس کی بات اس حد تک درست ہی لگتی تھی کہ وہ برسوں خالی نہیں بیٹھا رہا ہے، جسم کو تراشتا خراشتا رہا ہے۔ یہ سب اُس کے کینے ہی نے کرایا ہوگا جو کلکتے سے نکالے جانے پر وہ تجھل کے لیے اپنے دل میں بھر کے گیا تھا۔ کوئی بات ضرور ہو گی جو اتنے عرصے بعد اُس نے کلکتے واپس ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایک فاصلے پر لَوٹ کے وہ چند لمحے اپنی سانسیں درست کرتا رہا، پھر زقند کے انداز میں اُس نے دوبارہ تجھل کی جانب دوڑ لگائی مگر اس بار وہ کچھ اور ہی ارادہ کر کے گیا تھا۔ تجھل کے قریب جا کے پہلے تو اُس نے حسبِ سابق اپنی بھونک سنبھالی اور دائیں طرف مڑا۔ وہ واپس ہونے کے بجائے بائیں طرف آنا چاہتا تھا کہ تجھل نے دفعتاً اپنا چاقو پھینک دیا اور عین اُسی لمحے ایک قدم آگے بڑھ کے دائیں ہاتھ کو زور سے جھٹکا دیا۔ میری کھُلی آنکھوں کی بینائی شاید ایک لمحے کو جاتی رہی تھی۔ دوسرے لمحے تجھل کا پنجہ رتنا کے چاقو والے ہاتھ کا پہنچا پکڑے ہوئے تھا۔ ابھی ہمیں اپنے دیکھے ہوئے پر یقین نہیں آیا تھا کہ رتنا نے بگڑ کے تجھل کے زخمی پیر پر ٹھوکر ماری اور اپنے دوسرے ہاتھ سے اُس کی ٹھوڑی پر ضرب لگانی چاہی۔ تجھل کو اندازہ ہوگا کہ رتنا یہی کچھ کرے گا اسی لیے اُس نے اُس کا دوسرا ہاتھ کھُلا رہنے دیا تھا۔ رتنا دیکھ نہیں سکا کہ تجھل نے اس اثنا میں اپنا خالی ہاتھ سر کے اُوپر موڑ کے رکھا ہوا ہے، اگر اُس نے دیکھ لیا تھا تو سمجھ نہیں سکا یا اُس وقت دیکھا جب وہ ضرب کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا چکا تھا۔ تجھل نے کچھ آگے کھسک کے اُس کی ضرب اور یقینی بنا دی اور ضرب برداشت کر لی مگر اِدھر رتنا کا ہاتھ اُس کی ٹھوڑی تک پہنچا کہ اُدھر اوپر کسی کلھاڑی کے مانند اُس نے اپنے اُٹھے ہوئے ہاتھ سے ضرب لگائی۔ تجھل نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ جس وقت وہ اُوپر سے اپنی ٹھوڑی تک رتنا کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر ضرب لگائے تو رتنا کا ہاتھ ٹھوڑی سے نیچے گر کے اپنے اور اُس کے درمیان معلق فاصلے کے درمیان جھولتا نہ رہ جائے ورنہ ضرب کا نتیجہ نہ نکلتا۔ کوئی نتیجہ اِسی صورت میں برآمد ہو سکتا تھا کہ رتنا کا ہاتھ کہیں اٹک جائے۔ آگے کھسکنے کی یہی وجہ تھی۔ رتنا کا ہاتھ تجھل کی ٹھوڑی سے ہٹ کے اُس کے سینے پر آ کے ٹکا تھا۔ صحن رتنا کی چیخ سے گونج اُٹھا۔ تجھل نے ساتھ ہی اُس کے چاقو والے ہاتھ پر پنجے سے زور دیا تھا۔ چاقو اب رتنا سے سنبھلا نہیں رہ سکتا تھا، وہ تو گرا ہی تھا، رتنا بھی لڑکھڑانے لگا۔ تجھل نے اپنے زخمی پیر سے اُس کے پیٹ میں ٹھوکر ماری اور جیسے ہی وہ زمین پر چِت گرا، تجھل نے بڑھ کے اُس کی ٹھوڑی پر اپنا پیر جما دیا۔ رتنا میں اُٹھنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی۔ اُس کا ایک ہاتھ ٹوٹ چکا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اُس نے تجھل کا پاؤں پکڑنے کی کوشش کی مگر نیچے اُس کی ٹھوڑی دبی ہوئی تھی۔ جتنا وہ زور کرتا، ٹھوڑی پر تجھل کے پیر کا دباؤ اُتنا ہی بڑھتا جاتا۔ تجھل نے جھک کے اُس کا چاقو اُٹھایا اور صحن میں چاروں طرف سر گھُما کے دیکھا۔ رتنا کے آدمی اُسے گھور رہے تھے۔ رتنا کے دوبارہ زقند لگانے اور زمین پر چِت گرنے کے درمیان کا عرصہ اتنا مختصر تھا کہ سب کو اپنی آنکھوں کا دھوکا معلوم ہوتا ہوگا مگر رتنا اُن کے سامنے فرش پہ پڑا کراہ رہا تھا۔

ہم سب نے اپنے اپنے چاقو نکال لیے تھے مگر جامو کے پکارنے پر رتنا کے آدمی آگے نہیں بڑھے اور پھر ہر طرف سے گرنے والے چاقوؤں کی جھنکار فرش پر اُٹھی۔ اُنھوں نے اپنے چاقو تجھل کے پیروں پر ڈال دیے تھے۔

ہم سب فوراً صحن میں بکھر گئے۔ سُولم نے تمنچا نکال لیا تھا لیکن رتنا کے آدمیوں کو ایک طرف سمٹے اور ننگے ہاتھوں دیکھ کے اُس نے تمنچا واپس جیب میں رکھ لیا۔ شاید اُسے اُن لوگوں کو یہ جتانا مقصود تھا کہ ہمارے پاس تمنچے بھی ہیں۔ سُولم کی یہ احتیاط اب بے معنی تھی۔ صحن کا ایک چکر لگا کے جامو لپکتا ہوا تجھل کے پاس پہنچا۔ "تم ابھی ہٹ جاؤ۔" وہ جھرجھراتی آواز میں ضد کرنے لگا کہ رتنا کو اُس کے حوالے کر دیا جائے۔

تجھل نے پہلے انکار کر دیا مگر پھر مان گیا۔ "اُٹھا کے اُدھر بیٹھک میں پھینک دے۔" اُس نے تُرشی سے کہا۔

"مورتی کو بھی پھر اُدھر لے جاؤں استاد؟ دیوی کے سامنے ہی اس کی بلی ہوتے۔" جامو مچل کے بولا۔

"اتنے جلدی چھٹکارا دلادے گا، اُدھر لے جا کے ذرا اس کی خاطر تو کر لے رے! اڈّے کا استاد ہے یہ۔"

رتنا بھی یہ سب سُن رہا تھا، اُس نے کراہتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی کہ تجھل نے اُس کے منہ سے پیر ہٹا کے کولھے پہ ٹھوکر ماری۔ رتنا ٹانگیں پھینکنے اور بلکنے لگا۔ اُسے اُٹھاتے ہوئے جامو نے اُس کا وہی ہاتھ پکڑا جو ٹوٹ چکا تھا۔ رتنا کی چیخیں نکل

گئیں مگر جامو اُسے ٹھوکریں مارتا ہوا صحن سے لے گیا۔ اُدھر سے جینی اُس کے پیچھے بھاگا۔ تجھل ہی نے اُسے جامو کے ساتھ جانے کا اشارہ کیا ہوگا۔

میں جامو کے ساتھ اندر نہیں گیا تھا۔ رتنا کے گرنے ہی صحن میں کچھ دیر کے لیے کھلبلی سی ہوئی تھی، پھر جیسے ہر چیز ٹھہر تی گئی۔ ہریالا، بدرو اور چیکا ما ایک کونے میں دبکے ہوئے تھے۔ رتنا کے آدمیوں کی جانب سے اطمینان کرنے کے بعد میں لوٹا تو تجھل صحن کے وسط میں اُسی جگہ خاموش کھڑا تھا۔ میں اُس کا ہاتھ تھام کے چوکی تک کھینچتا ہوا لے آیا۔ "بیٹھ جاؤ۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

اُس نے بجھی بجھی نظروں سے مجھے دیکھا اور میری بات مان لی۔ پھر میں نے فرش پر اکڑوں بیٹھ کے اُس کا پیر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا۔ "سب ٹھیک ہے رے آ" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا لیکن میں نے اُس سے پوچھے بغیر پٹی کھول دی۔ کپڑے کا رنگ سفر کی گرد اور چیل سے میلا چیکٹ ہو گیا تھا۔ وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ پورا پیر پھولا ہوا تھا۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ اندر سے پک چکا ہے اور اوپر تک پہنچ رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ اُسے دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں خود پھولنے لگے تھے۔ پٹی کھول کے میں نے غلطی کی تھی۔ تجھل کو بھی اُسے دیکھنے کا موقع مل گیا اور صحن میں کھڑے ہوئے دوسرے لوگوں کو بھی۔ گلی میں اڈے کے قریب مدن پہلوان نامی ایک جراح رہتا تھا مگر باہر لوگوں کا ہجوم تھا، مدن بھی اُنھی میں شامل ہوگا۔ ایسے میں اُسے ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔ مجھے یاد تھا کہ بیٹھک کے برابر والے کمرے میں مرہم اور دواؤں کا ایک صندوقچہ رکھا رہتا ہے، ممکن ہے اب بھی وہ اُسی جگہ ہو لیکن اب عارضی دواؤں کا وقت نکل چکا تھا۔ مدن کو فوراً تلاش کرنا چاہیے تھا۔ میں کسی کو بلا کے اور اُسے تجھل کے پاس چھوڑ کے باہر مدن کے پاس جانے کو سوچ ہی رہا تھا کہ گلی میں شور اُمڈا اور سیٹیاں بجنے لگیں۔ ابھی میں کچھ سمجھ نہیں پایا تھا کہ چند سپاہی، انسپکٹر داؤ دیال اور پولیس کا ایک اور افسر تقریباً بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ داؤ دیال اور دوسرے افسر، دونوں کے ہاتھوں میں تمنچے تھے۔ تمام دروازے کھلے ہوئے تھے۔ گلی میں لوگوں کی بھیڑ تھی۔ پولیس کی آمد کسی وقت بھی متوقع تھی لیکن مجھے یہ دیکھ کے حیرانی ہوئی کہ ملاکو بھی اُن کے ساتھ تھا۔ ابھی چند منٹ پہلے میں نے اُسے یہیں دیکھا تھا۔ داؤ دیال گھبرایا ہوا آیا تھا اور تمنچا تانے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہا تھا۔ "آؤ داؤ جی، آؤ۔ بڑی دیر کر دی۔" تجھل نے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، میں نے اُسے اُٹھنے نہیں دیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ابھی ادھر اپنے پاس رسان سے بیٹھو۔"

"رتنا کدھر ہے؟" داؤ دیال کی نظریں ہر طرف منڈلا رہی تھیں۔

"اُدھر بیٹھک میں بلی کے لیے تیار ہے۔"

"اپنے ماتھر ساب بہادر کدھر ہیں؟" تجھل نے اُس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

"وہ بھی آ رہے ہوں گے لیکن لیکن تجھل یہ سب کیا ہے؟"

"اس کو ہی دکھانے کے لیے آپ کو بلوایا تھا۔ اچھا ہوا، رستے میں مل گئے۔ سب ٹھیک ہے ساب! تمنچے کو اندر پیٹی میں ڈال لو۔ بھاری بہت لگتا ہے۔"

داؤ دیال خود ہی دیکھ رہا تھا کہ تمنچے کی ضرورت نہیں ہے۔ اُس نے اُسے ہولسٹر میں اُڑس لیا، اُس کے ساتھی افسر نے بھی۔

"مگر یہ، یہ اندر کون چیخ رہا ہے؟" داؤ دیال وحشت سے بولا۔ بیٹھک سے بار بار رتنا کی چیخیں اُٹھ رہی تھیں۔ جامو کے ہاتھ نہیں رُکے ہوں گے۔

"آواز بھی نہیں پہچانتے؟ اور کون ہوگا داؤ جی۔"

"تھیں، تھیں اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

"اپنے گیارہ بالکوں کو مٹی کرنے کی اجازت پھر آپ ہی نے دی ہوگی۔ ابھی دھیرج رکھو، ماتھر ساب کو آجانے دو۔"

"بیٹھک کا دروازہ کھلواؤ۔" وہ حکمیہ لہجے میں بولا۔

"دروازے پر تالا نہیں پڑا ہے۔ پر اندر جانے کی کیا ضرورت ہے، اِدھر یہ سلطانیے حاضر ہیں۔" تجھل رتنا کے آدمیوں کی طرف منہ اُٹھا کے بولا۔ "پہلے انھی کو دیکھ لو۔ دو چار کام کے مل جائیں گے۔ ویسے سبھی اپنے کو اُٹھائی گیرے دکھائی دیوے ہیں۔"

انسپکٹر داؤ دیال نے تجھل کی بات آدھی سُنی، آدھی نہیں سنی، سرپٹ بیٹھک کی طرف دوڑا۔ بیٹھک کا دروازہ بند تھا مگر اندر سے کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی سپاہی بھی اندر دوڑ پڑے اور اُنھوں نے جامو اور جینی کو پکڑ کے باہر دھکیل دیا لیکن رتنا کی چیخیں بند نہیں ہوئیں۔ تجھل بھی پھر چوکی پر بیٹھا نہیں رہا، کسی تاخیر کے بغیر میرے زانو سے اُس نے اپنا پاؤں کھینچا اور تیز قدموں سے لنگڑاتا ہوا بیٹھک کی طرف جانے لگا۔ ابھی وہ اندر نہیں گیا تھا کہ ڈی ایس پی ماتھر، ایس پی جوشی اور ایک دوسرا افسر کئی سپاہیوں کے ساتھ بڑبڑاتے ہوئے صحن میں داخل ہوئے۔ تجھل رُک گیا۔ "آپ ہی کا انتظار تھا ماتھر ساب!" تجھل نے اُس کے قریب جا کے زیرلبی سے کہا۔

"شاید مجھ سے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہوگئی ہے استاد تجھل!" ماتھر تمتمائی ہوئی آواز میں بولا۔ اُس کا چہرہ بھی لال ہو رہا تھا۔

"آپ ہی کے بولوں کا خیال تھا سرکار، ورنہ اُس بے ہنگے کی اِدھر راکھ بھی نہیں ملتی۔ ہاں اپنے ہاتھوں میں زندگی بھر اینٹھن ہوتی رہے گی۔"

"ماتھر پلکیں پٹ پٹانے لگا۔ "مجھے یقین تھا، مجھے یقین تھا کہ تم نہیں بھولے ہوگے۔" وہ جوش میں بولا۔

"آپ نہیں ہوتے تو شاید بھول بھی جاتے۔"

"مگر تم، تم یہاں، یہ سب ....؟" ڈی ایس پی ماتھر سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولا اور کچھ کہے بغیر تجھل کا منہ تکنے لگا۔

کوئی جواب دینے کے بجائے تجھل بیٹھک کی طرف مڑ گیا۔ ماتھر اور جوشی بھی اُس کے ساتھ اندر چلے گئے۔ انسپکٹر داؤ دیال وہاں پہلے سے موجود تھا۔ تجھل کے سوا ہم میں سے کوئی بھی اندر نہیں گیا۔ جامو اور جینی کو سپاہیوں نے پکڑ رکھا تھا، وہ اُن سے اپنے آپ کو چھڑانے کی بے کار کوشش کر رہے تھے۔ اندر سے رتنا کے بلکنے کی آوازیں اچانک اور تیز ہوگئیں، دیر تک وہ باہر نہیں نکلے۔ تجھل کے پیر پر اب پٹی نہیں تھی۔

جس وقت سپاہی رتنا کو تھامے باہر لائے، اُس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ جامو نے اُسے اَدھ مُوا کر دیا تھا۔ منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ جامو نے شاید اس کی کہنیاں زمین سے رگڑی تھیں، وہ بھی زخمی تھیں۔ اُس کی گردن ڈھلکی ڈھلکی جاتی تھی۔ پیروں کی انگلیاں کچلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ گریبان چاک تھا اور پھٹی ہوئی واسکوٹ کندھے پر جھول رہی تھی۔

"تم سب بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔" ایس پی جوشی نے باہر آ کے حکم دیا۔

تجھل نے سر اُٹھا کے تند نظروں سے جوشی کو دیکھا، پھر ماتھر کو۔ میں درمیان میں بولنا چاہتا تھا کہ ہم سب کو لے چلو، تجھل کو یہیں رہنے دو لیکن جب تجھل ہی کے ہونٹ پھڑپھڑا کے رہ گئے تو میں بھی خاموش رہا۔

سپاہیوں کی تعداد کم تھی اور رتنا کے آدمیوں سمیت ہماری زیادہ۔ اُنھوں نے پہلے رتنا کے آدمیوں کو ہنکاتے ہوئے باہر نکالا۔ جب سے پولیس اڈے پر آئی تھی، اُن کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ ممکن ہے اُن میں سے کسی نے بھاگنے کا بھی ارادہ کیا ہو لیکن اتنے لوگوں کی موجودگی میں اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پلٹو، سارنگے، شولم کے ساتھ ہریالا، بدرو اور چیکا ما مسلسل اُن پر نظر رکھے ہوئے تھے اور پھر پولیس بھی موجود تھی۔

گلی میں اب بھی لوگوں کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ باہر رہ جانے والے سپاہی سیٹیاں بجا بجا کے اور لاٹھیوں کے زور پر اُنھیں عمارت سے دُور رکھے ہوئے تھے۔ آگے پیچھے پولیس کی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ احتیاطاً وہ پورا انتظام کر کے آئے تھے۔ رتنا باہر نکلا تو پولیس کو ایک دوسرے پر ٹوٹتے ہوئے لوگوں کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ ہر سو چیخ پکار مچنے لگی جیسے بھیڑ میں کسی کو سانپ نظر آ جائے۔ اس کے پیچھے ہم تھے۔ رتنا اور تجھل کو علیحدہ ایک جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ پھر ایک بڑی بند گاڑی میں وہ ہمیں ٹھونسنے لگے۔ میں اور ملاکو گاڑی سے نیچے تھے کہ اچانک ایک کنکری میرے سینے پر آ کے لگی۔ میری نظر ٹھیک اُسی سمت گئی جدھر سے کنکری آئی تھی۔ وہاں مجھے لوگوں کے بیچ میں بند دکان کے ایک چبوترے پر پیرو دادا کھڑا ہوا نظر آیا۔ میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ پیرو نے آنکھ کے اشارے سے مجھے تسلی دی اور اپنا چہرہ لوگوں کے پیچھے چھپا لیا۔ اُسی وقت سپاہیوں نے ہماری پیٹھ پر ہاتھ مار کے ہمیں گاڑی پر چڑھنے کا حکم دیا اور لوگ بھر گئے، نیچے کوئی باقی نہ رہا تو وہ کونے میں بندوقیں اُٹھائے کھڑے ہو گئے۔ دروازہ بند کر دیا گیا اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ گاڑی کے اُوپری حصے میں لوہے کی جالیاں لگی ہوئی تھیں، میں نے اُن سے جھانک کے دوبارہ پیرو کو ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن اُس کا چہرہ مجھے پھر نظر نہیں آیا۔

علاقے کا تھانا دُور نہیں تھا۔ گاڑیوں کی رفتار سڑک پر لوگوں کی بھیڑ ہونے کی وجہ سے تکلیف دہ حد تک سست رہی۔ گلی کی ساری دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ چند منٹ بعد جب گاڑی کا دروازہ کھلا تو ہم تھانے کے احاطے میں تھے۔ سپاہی بندوقیں اور سنگینیں لیے ہر جانب پھیلے ہوئے تھے۔

سب کو ایک کمرے میں کر دیا گیا۔ وہ حوالات تو نہیں تھی لیکن آنے کے بعد وہاں سے باہر نکلنے پر پابندی عائد تھی۔ دروازے پر سپاہی پہرا دے رہے تھے۔ رتنا کے آدمیوں کو کسی دوسرے کمرے میں رکھا گیا ہوگا۔ کمرے میں سیلن کی بساند پھیلی ہوئی تھی اور ایک چھوٹی میز، دو کرسیوں اور دیواروں کے ساتھ لوہے کی متقفل الماریوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ درمیان میں چھت سے لٹکا ہوا کم روشنی کا ایک بلب ٹمٹما رہا تھا۔ فرش ننگا تھا۔ میرے جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔ سب دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے فرش پر بچھ سے گئے۔ پہلے ہی سب کے کپڑے گندے تھے اور گندے ہو جانے

سے کیا فرق پڑتا تھا۔ مینی سب سے زیادہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ ٹانگیں سکیڑ کے لیٹ گیا۔ ہلاکو اُس کی ٹانگیں دبانے لگا۔ رات کا ابتدائی حصہ تھا۔ ہمیں وہاں آئے ہوئے گھنٹے بھر سے زیادہ ہوگیا۔ کوئی ہمیں پوچھنے نہیں آیا، نہ تجھل لَوٹا۔ مچھروں نے بیٹھنا دشوار کردیا تھا۔ ملٹو ابتدا میں گالیاں بک رہا تھا۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو گھٹنوں میں سر دیے چپ بیٹھ گیا۔

اڈے پر یا اس کمرے میں لانے سے پہلے انھوں نے ہماری تلاشی بھی نہیں لی تھی۔ تلاشی لیتے تو تمنچے دیکھ کے اُن کی آنکھیں ضرور خیرہ ہوتیں۔ رات دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی۔ کسی کے پاس گھڑی نہیں تھی لیکن جھینگروں کے شور اور پہرا دیتے ہوئے بولوں کی گونج بڑھ جانے سے وقت کا اندازہ ہوتا تھا۔ سب کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ کئی گھنٹے گزر گئے ہوں گے۔ تجھل واپس نہیں آیا۔ سپاہیوں نے ہم سے کھانے کو بھی نہیں پوچھا تھا۔ سُولم نے اُن سے پانی منگوا لیا تھا۔ صبح سے اب تک ہم نے صرف پانی پیا تھا۔ تجھل کے نہ آنے کی وجہ سے سبھی بے چین تھے۔ معلوم نہیں انھوں نے اُسے ہم سے علیحدہ کیوں کردیا تھا۔ اب کون سی بات پوچھنے کو رہ گئی تھی۔ اُس کے روکنے کا کوئی مقصد ضرور ہوگا۔ رتنا تھانے آکے مُکر گیا ہوگا یا ہوسکتا ہے ہم سے چوک ہو رہی ہو، رتنا کے سوا کسی اور طرف ہمارا دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ ایسی حالت میں کوئی بھی اعتراف کرلیتا مگر جیسے ہی رتنا کے حواس درست ہوئے ہوں گے اُسے اپنے کیے ہوئے کی اہمیت کا اندازہ ہوا ہوگا مگر ایک رتنا ہی اکیلا نہیں تھا، اُس کے ساتھی بھی اُس کے شریک تھے اور جیسا کہ تجھل نے انسپکٹر داؤ دیال کو اشارہ کیا تھا کہ سلطانی گواہوں کی موجودی میں رتنا کو تنگ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اتنے بہت سے آدمیوں میں دو ایک آدمیوں کو زندگی یقیناً زیادہ عزیز ہوگی۔ ہم میں سے کوئی ماتھر اور جوشی کے ساتھ بیٹھک میں نہیں گیا تھا مگر جب وہ واپس رتنا کو لے کے آئے تھے تو اُن کے چہروں پر چھائے ہوئے اضطراب سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ سمجھ کے، کچھ جان کے آئے ہیں۔ کوئی ایسی بات جو اُن کی توقع کے خلاف تھی۔ پھر تھانے لے چلنے کے لیے جوشی کا حکم سُن کے تجھل کے متوحش ہونے کا بھی یہی سبب ہوگا کہ یہ تجھل کے لیے ناقابلِ فہم تھا۔ وہ اُسے تھانے لے کے آگئے اور اب اُسے روکے ہوئے تھے۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ کب تک یہاں رہنا پڑے۔ ساری رات، سارا دن اور نہ جانے کتنے دن، سب کے جسم فرش پر اینڈے ہوئے، لوتھڑے سے پڑے تھے، ایک دوسرے پر ڈھئے ہوئے جیسے اب اِن میں کچھ باقی نہ رہا ہو، سب ہار گئے ہوں۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے لیکن مجھے ہر لمحے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ مجھ کو اپنے دل میں بُرا بھلا کہتے ہوں گے۔ کہتے ہوں گے کہ اِس کا سایہ ہی منحوس ہے۔ ہر روز ہزاروں کی گنتی کم ہوجاتی ہے، اِسے موت کیوں نہیں آجاتی۔ کبن خاں کا خیال کرکے جامو کے سینے میں دھواں بھر جاتا ہوگا۔ شولی، لالہ، سارٹے ساتھ ہی جوان ہوئے تھے۔ ہر بات زبان ہی سے نہیں کہی جاتی، آنکھیں کہتی ہیں، چہرہ کہتا ہے۔ اُن کی چبھتی نظریں مجھے اپنے چہرے، اپنے سارے جسم پر محسوس ہوتی تھیں اور مجھے خود اُن کے سامنے نگاہیں اُٹھاتے ڈر سا لگتا تھا۔

آدھی رات کا وقت ہوگا، ہلاکو نے مجھے جھنجوڑا۔ "لاڈلے سُن رہا ہے؟"

میں نے ہڑبڑا کے اُسے دیکھا۔ تھانے میں اچانک کسی کے چیخنے چلّانے کی آوازیں اُٹھنے لگی تھیں۔ کوئی بُری طرح آہ و بکا کر رہا تھا، آوازیں قریب کی نہیں تھیں۔ سب چونک اُٹھے۔ ایک خیال میرے دل میں سردی کی لہر کی طرح اُٹھا اور میں نے فوراً اُسے جھٹک دیا، کوئی جانی پہچانی آواز نہیں تھی۔ پھر وہ صدائیں بڑھتی گئیں۔ مینی بھی اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ سُولم نے دروازے کے پاس جا کے سپاہیوں سے پوچھا: "کس کی شامت آئی ہے؟"

"تیرے بھائی بند ہی ہوں گے رے!" وہ حقارت سے بولا۔

سُولم کا پوچھنا بے کار تھا۔ سپاہیوں کو کیا معلوم ہوگا۔ وہ تو کب سے یہیں کھڑے پہرا دے رہے تھے۔ سڑاک سڑاک اور چیخیں۔ ایک کے بعد ایک بدلتی ہوئی آواز۔ یہ آوازیں بہت دیر تک تھانے کے در و بام میں سنسناتی رہیں، کبھی مدھم کبھی تیز۔ پھر ایک دم گہری خاموشی طاری ہوگئی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد ہمیں اپنے کمرے کے باہر چاپیں سنائی دیں۔ وہ ہماری ہی طرف آرہے تھے۔ سب کھڑے ہوگئے۔ اُن میں تجھل کی چاپ الگ سے پہچانی جاسکتی تھی۔ میرا سر گھومنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں انسپکٹر داؤ دیال کے ساتھ تجھل کمرے میں داخل ہوا۔ میری نظر سب سے پہلے اُس کے پیر پر گئی اور میری گردن خود بہ خود جامو کے شانے پر ڈھلک گئی۔ جامو نے مجھے زور سے چمٹا لیا۔ تجھل کے [illegible] میں سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔

داؤ دیال دروازے ہی سے لَوٹ گیا۔ تجھل فرش پر بیٹھ گیا۔ سب اُس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ "[illegible] آثار دو رے۔ یہ جگہ بھی بُری نہیں ہے۔ کچھ کھایا [illegible] نہیں ہوگا؟"

"بھوک ہی سالی نہیں ہے استاد!" سارٹے منہ بنا کے بولا۔

"سویرا ہونے میں زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ تھوڑی دیر پڑ رہو۔ ڈال لو۔" تجھل نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"نیند بھی نہیں پٹ رہی ہے استاد!" ہلاکو دبے لہجے میں بولا اور مچل کے کہنے لگا: "تم بولو، کیسی رہی؟"

"سویرا لوٹنے دے رے۔" تجھل ٹانگیں پھیلا کے فرش پر لیٹ گیا۔ سارٹے اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ کے آہستہ آہستہ دبانے لگا۔

صبح ہونے میں ابھی بہت دیر تھی۔ سبھی کروٹیں بدلتے رہے۔ تجھل کو بھی نیند نہیں آئی تھی۔ دروازے پر کھڑے ہوئے پہرے دار بھی بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔ تجھل نے کچھ نہیں بتایا تھا اور جاننے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ پیرو، زورا، مارٹی اور ابّا جان بھی اُدھر ہوٹل میں جاگ رہے ہوں گے۔ ابّا جان نے پیرو سے ضرور پوچھنا چاہا ہوگا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ نہ جانے پیرو نے انھیں کیا جواب دیا ہوگا۔ کہا ہوگا "بڑے صاحب! آپ کیوں فکر کرتے ہیں، ابھی بہت سے لوگ زندہ ہیں۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سورج آتے آتے کہیں رُک گیا ہے یا رستہ ہی بھول گیا ہے۔ رات کھنچتی ہی جارہی تھی! امّی جان بچپن میں ہم سب سے کہا کرتی تھیں، خدا نے ہر چیز کی ایک مدت مقرر کی ہے، خدا کے سوا کسی کو بھی دوام نہیں ہے۔ شاید اندھیرے کی مدت بھی تمام ہوگئی تھی۔ رات کی چادر کھنچتے کھنچتے آخر پھٹ گئی۔ امّی جان کی باتیں اُس وقت کبھی ہماری سمجھ میں آتی تھیں، کبھی نہیں۔ میں اُن سے طرح طرح کے سوال کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے، جب اُن سے کوئی جواب نہ بن پڑتا تو وہ ڈانٹ کرکہتیں، بس ایسا ہی ہے۔ تو بہت نُتی ہے، بال کی کھال نکالتا ہے۔ وہ ہوتیں تو میں اُن سے پوچھتا، امّی! بہت سی مدتیں تو کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ بہت سے اندھیرے تو کبھی ختم نہیں ہوتے۔ رات ہوتی ہے، دن نکلتا ہے مگر اندھیرا نہیں جاتا، بہت سے اندھیرے سورج کی روشنی بھی دُور نہیں کرسکتی، نہ اندھیرا جاتا ہے، نہ موت آتی ہے۔

صبح ابھی پوری طرح نمودار نہیں ہوئی تھی کہ کسی سپاہی نے دروازے سے آواز لگائی: "استاد تجھل! تیار ہو جاؤ۔"

تجھل نے سارٹے کے زانو سے سر اُٹھایا اور آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ کسی کی آنکھ ہی نہیں لگی تھی جو اُٹھنے میں وقت لگتا۔ تجھل کے کہنے پر سب یک لخت کھڑے ہوگئے۔ دروازے پر کھڑے ہوئے سپاہی ایک طرف ہٹ گئے اور ایک سپاہی ہمیں تھانے کے عقبی حصے میں لے آیا۔ وہاں کھلے ہوئے نلوں سے شرشر پانی بہہ رہا تھا۔ تجھل، جامو، سارٹے اور میرے سوا سبھی نے اپنے سر نلوں کے نیچے کر دیے۔ منہ ہاتھ دھو کے ہم واپس اُسی کمرے میں آئے تو میز پر ناشتہ لگا ہوا تھا۔ کچوریاں، سلائس، مکھن اور چائے۔ ایک سپاہی گلاسوں میں چائے انڈیلتا رہا۔ منہ کو سب کچھ اجنبی سا لگ رہا تھا۔ ہر ایک نے دو دو گلاس چائے پی اور کچھ نہ کچھ ضرور کھایا پھر بھی پلیٹوں میں بچا رہ گیا۔ ناشتہ کرتے کرتے کمرے میں خاصا اُجالا ہوچکا تھا مگر ہم اُس وقت تک وہیں رہے جب تک دوسری بار سپاہی نے آکے ہمیں باہر آنے کو نہیں کہا اور وہ کوئی دس پندرہ منٹ بعد ہی آگیا تھا۔

دالان میں ہمارے پہنچتے ہی ایک جانب سے انسپکٹر داؤ دیال آگیا اور اُس کے ساتھ ایک دوسرا افسر سب انسپکٹر سُورتی۔ دونوں کے چہرے نکھرے، دُھلے ہوئے تھے، لباس بے شکن تھا اور داڑھیاں مُنڈی ہوئی تھیں مگر بھاری پپوٹے اور ماتھے کی شکنیں چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ رات بھر جاگتے رہے ہیں۔ ہمیں دیکھ کے دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ دالان کے سامنے وہی گاڑی کھڑی تھی جو گزشتہ رات ہمیں اڈے سے لائی تھی۔ داؤ دیال ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ سب انسپکٹر سُورتی اور دوسرے سپاہی گاڑی کے پچھلے بند حصے میں ہمارے ساتھ بیٹھے۔ آدھ پون گھنٹے کی مسافت کے بعد گاڑی جس عمارت میں جا کے ٹھیری، وہ میری اچھی طرح دیکھی بھالی ہوئی تھی۔ جس وقت میرا مقدمہ جاری تھا، مجھے روز ہی جیل سے یہاں لایا جاتا تھا۔ تجھل آہستگی سے نیچے اُترا۔ پھر اُس نے جامو کو بُلایا اور سارٹے کو بھی۔ مجھے یا اور کسی کو نہیں۔ باقی سب کو وہیں بیٹھے رہنے کی ہدایت کرکے وہ چلا گیا۔ سپاہیوں میں بھی صرف دو سپاہی ہماری نگرانی کو رہ گئے تھے، دھوپ خوب چڑھ آئی تھی اور کچہری میں لوگوں کا ہجوم بڑھ گیا تھا۔ گاڑی کھلی ہوئی تھی اور ہم آتے جاتے لوگوں کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ وہی لوگ، اُسی طرح کے لوگ۔ ہتھکڑیاں لگے، منہ چھپائے، سر جھکائے لوگ۔ عمارت میں اُتنی ہی بھیڑ تھی جتنی نو سال پہلے ہوتی تھی۔ جیسے کل کی بات ہو، جیسے کل رات ہی کورا مجھ سے جُدا ہوئی ہو۔ مجھے پسینہ آنے لگا۔ تجھل کوئی دو گھنٹے بعد لَوٹا۔

گاڑی کا دروازہ پھر بند کردیا گیا اور کچھ دیر بعد جب اُسے دوبارہ کھولا گیا تو ہماری آنکھیں چُندھیا گئیں۔ گاڑی اڈے کے باہر کھڑی تھی۔ سب کے حواس گُنگ تھے۔ چند لمحوں تک تو سب پر سکتہ سا طاری رہا، پھر سب ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

پلٹو مُہرک مُہرک کے رونے لگا اور اُس نے سبھی کی آنکھیں بھگو دیں۔ انسپکٹر داؤ دیال بھی گاڑی سے اُتر آیا تھا اور ایک طرف بھجّل کا بازو تھامے کچھ کہہ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ گلی میں دیکھتے دیکھتے لوگ پھر جمع ہونے لگے۔ اڈّے کے رسمی مالک مول جی نے آ کے تالا کھولا۔ ساری عمارت ویران پڑی تھی۔ بڑے دروازے سے کمرے تک کے کھلے حصّے میں سامنے فرش پر رتنا کے آدمیوں کا کل کا خون جما ہوا تھا۔ سارے کمروں کے دروازے کھول دیے گئے تھے۔ گلی کے لوگ عمارت میں گھس آئے اور پھر تو اُن کا ایک تانتا سا بندھ گیا۔ جو بھی آتا، کچھ نہ کچھ لے کے ضرور آتا۔ پھولوں اور مٹھائی کے دونوں کا انبار لگ گیا۔

ہم سب ایک دوسرے کے چہرے دیکھ رہے تھے۔ بھجّل صحن کے وسط میں پڑی ہوئی چوکی پر آ کے بیٹھ گیا تھا اور حقّے کی نَے اُس کے منہ میں دبی ہوئی تھی۔ نتھیا منھیار اُس کے لیے تازہ حقّہ بھر کے لایا تھا۔ سب ایک خواب سا معلوم ہوتا تھا۔ آنے والوں کو بھی اس خبر پر یقین نہیں آیا ہوگا کہ بھجّل اڈّے پر واپس آ گیا ہے اس لیے وہ خود اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھنے آ رہے تھے۔ کوئی اُس کے ہاتھ پکڑتا، کوئی پیر چھوتا، کوئی سلام کرتا، خیریت پوچھتا، رتنا کی شکایت کرتا، کوئی رونے لگتا اور کپتن خاں کا ذکر چھیڑ دیتا۔ اس دوران ہریالا اور بدرو اُس ہوٹل سے ہمارا سامان لے آئے تھے جہاں کل صبح اسٹیشن سے نکلنے کے بعد ہم نے اُسے چھوڑ دیا تھا مگر کسی نے کپڑے نہیں بدلے۔ سہ پہر بھجّل کو ایک لمحے کی فرصت نہیں ملی اور سہ پہر کو ہی گلی میں ایک بار پھر شور اُمڈا۔ ہم سب باہر کی طرف بھاگے۔ وہ سب آ رہے تھے، وہ سب۔ سب سے آگے کانتے تھا، برابر میں نصیب میاں، لکھوا، گلّو، لیلا، ہرچرن اور اُن کے پیچھے وہ سب۔ گلی میں دُور دُور تک اُنھی کے سر نظر آتے تھے۔ سب کی داڑھیاں بڑھی ہوئی، بال بکھرے ہوئے، آنکھیں ویران اور چہروں پر وحشت برس رہی تھی۔ کانتے نے جیسے ہی دیکھا، دیوانگی سے میری طرف چیختا ہوا لپکا، اِدھر سے میں بڑھا۔ اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور میری گردن سے سر رگڑنے لگا۔ وہ بار بار میرا چہرہ دیکھتا اور مجھے جکڑ لیتا، میرے گالوں کو پیار کرتا۔ کبھی میری ٹھوڑی چومتا، کبھی پیشانی۔ پھر میرے سینے پر اُس کا سر ڈھلک گیا، وہ سسکنے لگا۔

میں اُسے سنبھالنا چاہتا تھا مگر میرا جسم خود ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ اُسے دلاسا دیتے ہوئے میری زبان کانپنے لگی اور آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے۔

اچھا ہی ہوا کہ جامو نے جھٹ بیچ میں آ کے اُسے میرے بازوؤں سے کھینچ لیا اور نصیب میاں میرے سینے سے لپٹ گئے۔ پھر گلّو، لیلا، برہمن، اکبر، لکھوا، پتّن، کسی کو کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ ہوش اُس وقت آیا جب بھجّل کی بھاری آواز گونجی۔ "اندر چلو رے۔"

بھجّل کو دروازے پر کھڑا دیکھ کے سب ہمیں چھوڑ کے دیوانہ وار اُسی کی جانب دوڑ پڑے اور اُنھوں نے اُس کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ "اندر چلو۔" بھجّل نے آنکھیں میچ کے کہا۔

اندر آ کے وہ بالکل پاگل ہو گئے تھے۔ بار بار گلے ملتے، کوئی دوڑ کے اُس کے پاس جاتا، کوئی اِس کے پاس۔ کسی ایک جگہ کوئی ٹکتا ہی نہ تھا اور کسی کے پاس کہنے کے لیے شاید کچھ نہیں تھا۔ کوئی زبان کھولنے کی کوشش کرتا تو آواز ساتھ نہ دیتی۔ بس وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے پھر جھپٹ کے اپنی آغوش میں بھر لیتے۔ ہماری واپسی کی اُنھیں کوئی اُمید ہی نہ رہی ہوگی یا اُنھوں نے بہت شدّت سے انتظار کیا تھا۔ سب ٹوٹے پھوٹے، بکھرے ہوئے سے تھے، لگتا تھا، ڈیڑھ مہینے سے وہ اپنی آنکھوں، اپنے سینے پر جبر کرتے رہے ہیں۔ اُنھیں اڈّے پر موجود ملاقے کے لوگوں کا بھی خیال نہیں آیا۔ بھجّل سر جھکائے بیٹھا تھا اور وہ اُس کی گود میں، اُس کے ہاتھوں، اُس کے پیروں پر سر رکھے بچّوں کی طرح بلک رہے تھے۔ کانتے دیر تک بھجّل کے زانوؤں پر سر رکھے سسکیاں بھرتا رہا۔ بھجّل نے اُس سے ایک لفظ نہیں کہا تھا مگر کانتے کی آنکھوں کی جھڑی نہیں تھمی۔ اُدھر جامو بیٹھک کے قریب نصیب میاں سے چمٹا ہوا ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ نصیب میاں نہ جانے اُس سے کیا کیا کہہ رہے تھے۔

اب تک کسی نے دھیان نہیں دیا تھا مگر لیلا کو خیال آ ہی گیا۔ میرے پاس آ کے وہ بے قراری سے پوچھنے لگا۔ "وزیر کدھر ہے؟" میں اُسے کیا جواب دیتا۔ میری خاموشی پر اُس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ میں نے اُسے نہیں بتایا کہ صرف وزیر ہی نہیں، سلطان اور مٹّن میاں بھی..... لیکن لیلا نے پھر کسی کے بارے میں پوچھا ہی نہیں۔ اُس کا منہ بگڑنے لگا تھا۔ میں نے اُسے اپنے سینے میں دبوچ لیا۔

اڈّے پر پہلے ہی خاصے لوگ موجود تھے۔ اُن کے آنے سے صحن بھر گیا۔ باہر سے لوگوں کی آمد رات تک جاری رہی۔ سیٹھ مول جی اور گلی کے دوسرے لوگوں نے سب کے لیے رات کے کھانے کا انتظام کیا تھا۔ کپتن خاں اور اُس کے ساتھ جانے والوں کی موت کے کھانے کا اُدھار اُن پر واجب تھا۔ کسی کا

جی کھانے کو چاہتا ہی نہیں تھا لیکن سب نے اصرار کر کے فرش پر بچھے ہوئے دسترخوان پر ہمیں بٹھا دیا۔

رات گئے ملاقے کے سبھی لوگ واپس چلے گئے مگر اڈّے کے وہ سارے آدمی جن کے گھر موجود تھے، اپنے گھروں کو نہیں گئے۔ سارٹے بھجّل کو اُوپر والے کمرے میں لے گیا۔ سب اِدھر اُدھر مختلف کمروں میں پڑ گئے یا صحن ہی میں دریاں بچھا کے لیٹ رہے۔ کانتے، جامو، لیلا اور جینی کے ساتھ میں بھی اُوپری منزل کے ایک کمرے میں چلا گیا۔ زین کو جب میں لسترن کے جنگل سے چھڑا کے اڈّے پر لایا تھا تو وہ یہیں ٹھیری تھی۔ سب گم صُم سے تھے اور ایک دوسرے سے کچھ پوچھتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ نصیب میاں بھی کچھ دیر بعد اُوپر آ گئے اور ہمیں چپ دیکھ کے تسلّیاں دینے لگے اور وہ خود ہی سب کچھ بتانے لگے۔ پھر لیلا بھی چپ نہ رہ سکا اور کانتے کی زبان بھی آگ اُگلنے لگی۔ ساری رات یوں ہی گزر گئی۔ اُوپر آسمان پر کبھی تارے نکل آتے، کبھی بدلیاں چھا جاتیں۔ صبح کے قریب ہلکی ہلکی بوندیں گرنے لگیں مگر سب چارپائیوں پر پڑے رہے۔ اُن کے چہرے پہلے ہی بھیگے ہوئے تھے، رات بھر بھیگتے رہے تھے۔ کسی کو ایک پل کے لیے نیند نہیں آئی تھی۔

میں سمجھ رہا تھا، جیسے ہی پیرو کو تھانے سے ہماری اڈّے واپسی کی اطلاع ملے گی، وہ سیدھا اڈّے کا رُخ کرے گا لیکن وہ رات تک نہیں آیا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اُسے خبر نہ ہوئی ہو۔ کل تھانے جانے کے لیے ہم گاڑی میں بیٹھ رہے تھے تو وہ موجود تھا۔ گویا وہ سارے دن ملاقے ہی میں منڈلاتا رہا تھا چونکہ اُسے یقین ہوگا کہ اسٹیشن سے نکلنے کے بعد کہیں اور جانے کے بجائے ہمارے قدم سیدھے اڈّے کی طرف بڑھیں گے لیکن ہم آگے گئے ہی نہیں، وہیں اسٹیشن سے قریب پڑنے والے پہلے بڑے تھانے کی چار دیواری میں داخل ہو گئے۔ ممکن ہے، وہ ملاقے کے تھانے کے اطراف بھٹکتا رہا ہو۔ ہم وہاں ہوتے تو اُسے دکھائی دیتے مگر رات کو اُس نے اپنی آنکھوں سے ہمیں پولیس کی گاڑیوں میں بیٹھتے دیکھا تھا اور اُسے خوب اندازہ ہوگا کہ ہم اپنے ملاقے ہی کے تھانے میں جا سکتے ہیں چنانچہ اس نے کسی بھی ذریعے سے سُن گُن لینے کی کوشش ضرور کی ہوگی، تھانے کے قریب کسی ہوٹل میں بیٹھ کے کسی سپاہی سے رابطہ قائم کر کے۔ ہم صرف ایک رات وہاں رہے تھے، صبح ہوتے ہی کچہری چلے گئے تھے۔ رات کو تھانے کے گرد اُس کا چکّر لگانا مشکوک ہوتا اور اُسے کچھ پتہ بھی نہ چلتا لیکن ہم دوپہر کو تو اڈّے واپس آ گئے تھے۔ ہمیں تھانے جاتے ہوئے دیکھنے کے بعد کیا وہ مایوس ہو کے ہوٹل کے کمرے میں بند ہو گیا؟ اُس کے خیال میں تھانے سے ہمارا ایک تو لوٹنا مشکل تھا اور اس کا اِدھر اُدھر کے لوگوں سے ہمارے بارے میں پوچھنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ یقیناً ایسا نہیں ہوگا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اُسے سب معلوم ہو گیا ہوگا۔ جاننے کے باوجود وہ نہیں آیا۔ اُسے کچھ اطمینان ہو گیا ہوگا یا وہ بھجّل کی جانب سے بلاوے کا منتظر تھا۔ اڈّے پر ہماری واپسی اور رتنا کے اندر جانے کے بعد وہ زیادہ محفوظ ہو گئے تھے۔

مجھے بار بار خیال آتا تھا، اگر ہم سیدھے اڈّے پر چلے آتے! تو شاید سب کچھ بدلا ہوا ہوتا۔ ہم ایک دن بعد اس طرح اڈّے پر موجود نہ ہوتے۔ کہاں ہوتے؟ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بے شک پھر سینے پر اتنا بوجھ نہ ہوتا، رتنا اور اُس کے آدمیوں کو لاشوں میں تبدیل کرنے کے بعد ہی ہم اڈّے سے نکلتے اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا، دیکھ لیتے لیکن اِس کے بعد کیا ہوتا؛ جتنے لوگ یہاں موجود تھے، اُن میں سے پھر کوئی بھی باہر نہ آتا۔ کانتے، نصیب میاں، لیلا اور دوسرے سب لوگوں کے چہرے پھر کہیں اور ہی دیکھنے نصیب ہوتے۔ رتنا کو ختم کرنے اور اڈّے پر بیٹھ جانے کے بعد پولیس کو ہمارے پاس پہنچنے میں دیر نہ لگنی چاہیے۔ ہم رتنا اور اُس کے آدمیوں کو زندہ زمین میں دفن کر دیتے اور اُن کی ہڈیوں کی راکھ پر بھی کسی کی نظر نہ پڑنے دیتے لیکن پولیس ہمارے ہی پاس اُن کا پتہ پوچھنے آتی۔ ہم تصوّر ہی کر سکتے تھے کہ پھر کیا کچھ ہو سکتا تھا۔ بدرو کی باتیں سننے کے بعد سب کی آنکھوں میں خون کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بھجّل جب اچانک تھانے کی چار دیواری میں جانے لگا تھا تو سب کو اچنبھا ہوا تھا اور پولیس افسروں کے سامنے اتنی دیر تک اُس کی فضول باتیں سُن کے سبھی کے جسم تلملا رہے تھے۔ اُس وقت کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ سب کے دل میں ایک ہی بے کلی تھی کہ وہ کسی طرح جلد از جلد اڈّے پر پہنچ جائیں۔

اندھے پن میں ہمارے پیر کہیں بھی پڑ سکتے تھے۔ بدرو اور ہریالے نے جو کچھ کہا تھا، اُس کی تصدیق پولیس کے سوا کسی اور سے نہیں ہو سکتی تھی۔ یوں بھی بدرو کے بقول پولیس کو ہماری تلاش تھی تو ہمیں اُس سے چھپنا بھی نہیں چاہیے تھا ورنہ بدرو نے مشورہ دیا تھا کہ ہم اسٹیشن ہی سے لوٹ جائیں۔ پولیس ہی سے ہمیں اپنی تلاش کی اصل وجہ معلوم ہو سکتی تھی۔ ہم اڈّے کی طرف جا رہے تھے لیکن ہو سکتا تھا کہ ہم کبھی وہاں تک نہ پہنچ پاتے، راستے

ہی میں ہمارے آگے رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتیں اور پھر پولیس کا طور یہ نہ ہوتا۔ اُن کے طور کا اندازہ ہمیں ابتدا ہی میں ہو گیا تھا۔ اُس وقت جب تھانے میں ہمارے آنے سے کھلبلی مچ گئی تھی۔ اُن کا رویّہ اس سے قطعاً مختلف ہوتا اگر وہ ہمیں خود کھینچ کے لاتے اور ہماری تلاشی لے کے تمنچے اور ہتھیار برآمد کرتے، وہ ہم سے پوچھتے کہ ہم اتنے دنوں کہاں رہے ہیں، ہم وہی جوابات دیتے جو ہم نے دیے تھے۔ ہم اُنھیں کبھی نہ بتاتے کہ ہندوستان میں تھے ہی نہیں لیکن شاید وہ اِس طرح نہ سمجھ پاتے جس طرح اُنھوں نے اب سمجھا بوجھا تھا۔

رتنا کیوں اندر نہیں گیا؟ رتنا نہیں تو پھر اور کون تھا؟

کبن خاں نے اتنے مختصر عرصے میں اتنے بڑے دشمن کیسے پیدا کر لیے۔ ہمیں تو اتنا بھی پتہ نہیں تھا کہ ہمارے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں یا نہیں۔ اُنھوں نے وارنٹ غالباً اس لیے جاری نہیں کیے تھے کہ ہم کسی طرح کلکتے واپس آ جائیں۔ تھانے سے نکل کے جیسے ہم علاقے میں داخل ہوئے تھے ویسے کبھی نہ جا پاتے۔ نہ اڈّے پر رتنا کے سامنے ہم یوں اپنے ہاتھ روک کے رکھ سکنے پر قادر ہوتے، ہماری آنکھیں بھٹکتی رہتیں اور ہمارے پاؤں اوندھے سیدھے پڑتے۔ پولیس بھی اڈّے پر آنے میں اتنی دیر نہ لگاتی اور نہ بجھل رتنا کو اتنا وقت دیتا۔ وہ اڈّے کی عمارت کے بجائے گلی کے نکڑ پہ نہ اُترتا۔ ہم اپنے ہی گھر چوروں کی طرح داخل ہوتے۔ اُنھوں نے ہماری عدم موجودی میں ہمارے بارے میں جو ذہن میں بٹھا لیا تھا، وہ ہماری اپنی ہی وجہ سے تھا کہ ہم موجود نہیں تھے۔ اُنھوں نے دوسرے شہروں کی پولیس سے بھی ہمارے متعلق یقیناً کوئی رابطہ رکھا ہوگا اور ہر جگہ سے اُنھیں نفی میں جواب ملا ہوگا۔ دو تین دن حوالات میں رکھ کے ہمیں جیل بھیجنے کی اجازت حاصل کر لینا اُن کے لیے مشکل نہیں تھا اور پتہ نہیں، وہاں سے ہماری واپسی کب ہوتی۔ اڈّے سے نکلنے کے بعد یا اڈّے پر ہماری موجودی کے دوران وہ ہم تک پہنچتے تو پھر واپسی اُنھی کی مرضی پر منحصر ہوتی اور اس بات پر کہ ہم نے رتنا کے ساتھ کتنی رعایت کی ہے یا کوئی رعایت نہیں کی یا دھر شہر کے اڈّوں کے اُستاد پولیس کے کانوں میں روز نیا شوشہ چھوڑ کے ہمارے دن بڑھاتے رہتے۔

اڈّے پر اُس رات ایک نصیب میاں ہی تھے جو بچ گئے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ سب کچھ اچانک ہوا۔ معمول کے مطابق رات گئے عمارت کے دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ اندر پندرہ آدمی تھے، تین وہ جنھیں چار دن سے کبن خاں نے اُس وقت تک رہنے کی اجازت دے دی تھی جب تک وہ اپنا کوئی انتظام نہ کر لیں۔ تینوں کلکتے میں نووارد تھے۔ اُنھوں نے بتایا تھا کہ وہ دلّی سے آئے ہیں اور پولیس اُن کا پیچھا کر رہی ہے۔ اُس رات تینوں اچانک غائب ہو گئے۔ نصیب میاں یا کسی اور کے ذہن میں دُور دُور تک گمان نہ تھا کہ وہ رتنا کے آدمی ہو سکتے ہیں۔ پوچھ گچھ کے وقت وہ کسی کی طرف اشارہ نہیں کر سکے مگر پندرہ دن بعد اُنھیں جب رتنا کے اڈّے پر بیٹھنے کی خبر ملی تو اُن کے ساتھ سبھی نے شور مچایا۔ اُن کے پچھلے بیانات مختلف تھے پھر بھی پولیس نے رتنا کے سلسلے میں ہر طرح کی تفتیش کی ہو گی لیکن رتنا نے ہر گوشہ بند کر رکھا تھا، کوئی روزن کھلا ہوا نہیں تھا۔

کانتے کہتا تھا کہ جیسے ہی وہ کلکتے واپس آیا، اُسے اڈّے تک نہیں پہنچنے دیا گیا۔ راستے ہی میں روک لیا گیا۔ وہ بتا سکتا تھا کہ وہ فیض آباد اور بمبئی گیا ہوا تھا لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ پولیس جولین کے گھر یا زرّیں کی حویلی پہنچے، وہ یہ بات کسی وقت بھی بتا سکتا تھا جب کوئی چارہ نہ ہوتا۔ گاڑی سے اُترنے کے بعد اُس کے لیے بھی سب کچھ عجیب اور ناقابلِ فہم تھا۔ وہ سیدھا اڈّے کی طرف جا رہا تھا لیکن اُسے جیل پہنچا دیا گیا۔ وہاں اڈّے کے دوسرے ساتھی بھی موجود تھے، کانتے نے اُن کی باتوں اور پولیس کے رویّے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ ابھی جیل سے باہر نکلنا اُس کے اور دوسروں کے لیے مفید نہیں رہے گا۔ شاید اس دوران بجھل واپس آ جائے یا پولیس خود اصل لوگوں تک پہنچ جائے۔ اُسے کلکتے میں چلنے والی ہوائیں یکسر بدلی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ پولیس نے اُس پر بید برسائے، پوچھ گچھ کا کوئی ایسا طریقہ نہیں رہ گیا تھا جو روا نہ رکھا گیا ہو۔ کانتے انکار کرتا رہا اور دانستہ چُپ رہا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اُس کا دماغ ہی ٹھیک کام نہیں کرتا تھا۔ اڈّے کے اتنے لوگوں کے بیچ میں بھی وہ خود کو تنہا تنہا محسوس کرتا تھا۔ جو مناسب سے مناسب بات اُس کے سر میں آ سکتی تھی، وہ یہی تھی اور وہ اس پہ کاربند رہا۔ اس عرصے میں فیض آباد سے جمرو، بمبئی سے ماچھی، چھیدا، آسنسول سے اُستاد موتی اُس کی خبر لینے آئے۔ پولیس اُن کے بھی پیچھے پڑ گئی۔ کانتے نے یہ کہہ کر اُنھیں لَوٹا دیا کہ اُستاد بس اب آ ہی رہے ہوں گے اور وہ اُنھیں کسی وقت بھی بلا سکتا ہے۔ جیل میں اُس کے ساتھی ہر لمحے اُس پر زور دیتے تھے۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے جیل سے فرار ہونے کا خاکہ بھی بنایا۔ کانتے نے اُنھیں منع کر دیا اور ایک بار رتنا کی طرف سے ایک آدمی نے آ کے اُسے پیش کش کی کہ وہ جیل سے چھوٹ کے اپنے پرانے اڈّے ہی پر واپس آئے۔ رتنا اُسے اپنا منتظر ملے گا۔ رتنا نے کہلوایا تھا کہ وہ اُستاد بجھل کا اڈّا خالی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کانتے نے جواب میں رتنا

کی طرف سے بھیجے جانے والے آدمی کو ہاتھ پھیلانے کو کہا۔ جب اُس نے ہاتھ پھیلایا تو کانتے نے اُس کی ہتھیلی پہ تھوک دیا اور دبا جا کے اسے رتنا کے منہ پر مل دینا۔

کانتے بتا رہا تھا کہ اُس نے ڈیڑھ مہینے کا عرصہ جیل میں نہیں، جیسے کسی بھٹّی میں گزارا ہے۔ بار بار اُس کے جی میں آتا تھا کہ وہ واقعے کے دوران اپنی عدم موجودی کا ثبوت فراہم کر کے یہاں سے نکل جائے، کانتے کو بھی احساس ہو گا کہ رتنا نے کسی برتے پر یہ جرأت کی ہوگی۔ اپنے اور دوسروں کے بل پر، مبادا اُس سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے اس لیے کانتے خود کو تھامے رہا، وہ بمبئی سے پیرو دادا کے آدمیوں، فیض آباد سے جمرو کے ساتھیوں، لکھنؤ سے کبن خاں کے دوستوں اور آسنسول سے اُستاد موتی کے شاگردوں کو کلکتے بلا کے اڈّے کا رُخ کر سکتا تھا مگر اُسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ اوروں کے کندھوں پہ بندوقیں رکھ کے چلائی جائیں۔ وہ خود ہی وہاں جانا چاہتا تھا اور کسی مناسب موقع کا منتظر تھا۔ اُسے بجھل کا بھی انتظار تھا۔

بجھل جیسا کہ اکثر کہا کرتا تھا کہ ہتھیار اُٹھانے سے پہلے تیشہ دیکھ لو، ہتھیار سر پہ رکھ کے چلاؤ۔ ظاہر ہے بجھل کی مراد نہ تو باقاعدہ تیشہ دیکھنے سے تھی، نہ ہتھیار سر پہ رکھنے سے۔ ہمارے پاس بالکل وقت نہیں تھا۔ پیرو یا میں ابا جان کو لے کر فیض آباد چلے جاتے تو وقت کی تنگی کا اتنا احساس نہ ہوتا۔ جتنی دیر ہمیں تھانے میں لگی تھی، اتنی دیر میں رتنا کو پیرو، زورا اور مارتی کے بارے میں یہ خبر نہیں مل پائی ہو گی کہ وہ ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے ہیں۔ بدرو نے اگر پیرو کو ہم سے باتیں کرتے اسٹیشن پر دیکھ لیا تھا تو بدرو ہمارے ساتھ ہی تھا۔ شام ہی کو ہم رتنا کے پاس پہنچ گئے تھے، شام کو ہم اُس کے پاس نہ پہنچ پاتے، تھانے میں ہمیں کچھ اور وقت لگ جاتا، ایک رات اور، ایک دن یا کئی دن تو شاید رتنا کلکتے میں پیرو کی موجودی سے بے خبر نہ رہتا اور یہ جاننے کے بعد اُسے جاتو اُٹھا کے پیرو کے سامنے پہنچ جانے کی ضرورت نہیں تھی، پولیس کو اشارہ کر دینا کافی تھا۔ پیرو کے پاس رتنا کی بے خبری جتنا ہی وقت تھا۔ پیرو تک پولیس کے پہنچ جانے کا مطلب ابا جان تک پہنچنا تھا جن کے پاس جادو کے پتھر صندوقوں میں رکھے ہوئے تھے۔ اُن کی ایک جھلک سے نہ صرف ابا جان اور پیرو کے سامنے کے دروازے بند ہو جاتے، ہماری باقی زندگیوں کا فیصلہ بھی ہو جاتا۔ جتنے کم سے کم وقت میں ہم تھانے سے نکل جاتے، اتنا ہی ہمارے لیے بہتر تھا۔ آنے والا ہر لمحہ لٹکتی ہوئی تلوار کے مانند تھا جو کسی وقت بھی ہماری گردن پر گر جاتا، گو پیرو کسی دیوار، کسی تلوار سے کم نہیں تھا۔ وہ کسی کے خود تک پہنچنے سے پہلے ہی اُس کی آہٹ سونگھ لیتا لیکن ہمیں اپنے طور پر اُسے اُلجھن میں ڈالنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا۔ ہمارے لیے بس یہی ایک بہتر صورت تھی کہ ہم دوبارہ تھانے واپس آئیں تو رتنا اور اُس کے ساتھی بھی ہمارے ہمراہ ہوں۔

سب سویرے ہی اُٹھ گئے اور نہا دھو کے کپڑے بدل کے، ناشتہ کیے بغیر اڈّے سے نکل گئے۔ علاقے کے بہت سے لوگ بھی ہمارے ساتھ ہو گئے تھے۔ پہلے ہم شمشان گھاٹ گئے۔ اتنے دنوں میں لالہ بسوا، مندھرا اور کرمے کی راکھ بھی ہوا کہاں سے کہاں لے گئی ہو گی۔ جتنی دیر مندر کے پنڈت جی کچھ پڑھتے رہے ہم چُپ چاپ کھڑے رہے۔ وہاں سے ہم قبرستان گئے۔ جن لوگوں نے کبن خاں، شولی، فیضو، دلّن، نصیرا، بندے اور سادو کو دفن کیا تھا، اُنھی نے اُن کی قبروں کی نشان دہی کی۔ گلی میں رہنے والے قاضی صاحب نے تلاوت کی۔ جامو کے ہوش و حواس جاتے رہے تھے، وہ کبن خاں کی قبر سے چمٹ کے پھوٹ پھوٹ کے روتا رہا۔ بجھل نے بہ مشکل تمام اُسے وہاں سے اُٹھایا۔ واپسی میں راستے بھر جامو گنگ بیٹھا رہا۔

اڈّے پر آ کے بجھل نے کئی آدمیوں کو شہر کے مختلف اڈّوں کی طرف جانے کی ہدایت کی اور کہا، اُستادوں سے جا کے بول دیں، آج رات تک رُکا ہوا جتنا اڈّے پر پہنچ جائے۔ بجھل نے اور کوئی دوسری بات نہیں کی تھی۔ مجھے یہ سب قبل از وقت معلوم ہوتا تھا۔ اڈّے کے آدمی اُس کا پیغام پہنچا کے سہ پہر تک لَوٹ آئے تھے۔ شام ہی سے اُستادوں کی آمد شروع ہو گئی اور رات ہونے تک جن جن کو بجھل نے کہلوایا تھا، شاید ہی اُن میں سے کوئی باقی رہ گیا ہو۔ کوئی اُستاد نہ آ سکا تھا تو اُس نے رقم بھیج دی تھی اور جس نے رقم نہیں بھیجی تھی، اُس نے خود آ کے بجھل سے مہلت مانگ لی تھی۔ بجھل نے اُن سے اپنے پیچھے ہونے والے واقعات کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ خود ہی طرح طرح کی باتیں کرتے رہے، بجھل چُپ چاپ سنتا رہا۔

مرگھٹ اور قبرستان سے لَوٹ کے بجھل دن بھر بیٹھا ہی رہا تھا مگر صبح چلنے سے اُس کا زخم اور بگڑ گیا۔ دن میں دو بار مدن پہلوان نے مرہم پٹّی کی تھی اور اُسے مشورہ دیا تھا کہ وہ ایک جگہ بیٹھا رہے یا بستر پہ آرام کرے۔ دوپہر کو اُسے تیز بخار آ گیا تھا لیکن وہ بیٹھک میں آنے والے اُستادوں اور دوسرے لوگوں سے ملتا رہا اور حقّہ پھونکتا رہا، دوسرا دن بھی گزر رہا تھا۔ پیرو، زورا اور مارتی میں سے کوئی بھی اڈّے پر نہیں آیا۔ بجھل جیسے کلکتے میں اُن

ں موجودی بھول گیا تھا یا وہی کہیں راستہ بھٹک گئے تھے۔ میں کئی بار سوچا رہیں ہی تجھل کو اشارہ کروں اور کہوں کہ ب میں آبا جان کو لے کے فیض آباد چلا جاتا ہوں لیکن تجھل کا جسم پھنک رہا تھا۔ ایسی حالت میں اُسے چھوڑ کے ایک لمحے کو بھی میرا کہیں جانے کو جی نہیں کرتا تھا۔ اگر وہ خود ہی فیض آباد جانے کا ارادہ کرتا تو اس سے اچھی کوئی بات نہیں تھی۔ وہیں اُسے آرام مل سکتا تھا۔ زرّیں کی دیکھ بھال سے وہ چند دن میں ٹھیک ہو جاتا۔ زرّیں اُسے اُٹھنے ہی نہ دیتی اور زرّیں کی بات وہ ٹال ہی نہیں سکتا تھا مگر ایک تو یہ وقت اُس کے کلکتے سے ہٹنے کا نہیں تھا، نہ اُس کی حالت فیض آباد تک کے سفر کی متحمل تھی۔ وہ اُنھیں بھولا تو نہیں ہوگا۔ اُس کے ذہن میں کوئی ایسی ہی بات ہو گی جو اُس نے اُنھیں اڈّے پر نہیں بلایا یا کوئی آدمی اُدھر نہیں بھیجا، مجھ سے بھی اُنھیں جا کے دیکھنے کو نہیں کہا اور جب اُس نے خود مجھے اجازت نہیں دی تھی تو میرے کہنے کا کیا سوال پیدا ہوتا تھا۔

رات کو اُوپری منزل پر سونے کے لیے ہم لیٹے تو کانتے میری چارپائی پر ہی آگیا اور مجھ سے لپٹ کے ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگا۔ اُس سے ایک بات پوچھنے کے لیے کئی مرتبہ میرے دل میں ہمک اُٹھی تھی لیکن کوئی مناسب موقع ہی نہیں ملا جو میں اُس سے شبہ پارہ کے متعلق پوچھتا۔ مجھے یقین تھا کہ دوسرے تیسرے دن رقم ادا کر کے وہ اُسے کریمن بیگم کے ہاں سے لے آیا ہوگا۔ بیعانہ تو وہ میرے ساتھ ہی دے آیا تھا۔ میں نے جھجکتے ہوئے سرگوشی میں اُس سے شبہ پارہ کا ذکر کیا تو وہ بے چین ہو گیا۔ "مجھ کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ تُو نے اب تک اُس کے بارے کوئی بات کیوں نہیں کری۔" وہ اداسی سے بولا۔ "کیا تو جانتا تھا کہ اُس رات مَیں نے تجھ سے جھوٹ بولا تھا؟"

"کیسا جھوٹ؟" میں اُٹھ کے بیٹھ گیا۔

"تجھ کو میری بات کا یقین آگیا تھا؟"

"کیا کہہ رہا ہے؟" میں نے ترشی سے کہا۔

"میں نے اُس رات تجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ تجھے نیچے چھوڑ کے چیک ہاتھ میں تھامے جب میں اُوپر پہنچا تو سوائے باجے طبلے والوں کے اُدھر کوئی نہیں تھا۔ اُن لوگوں نے بولا کہ کریمن سویرے ہی اِدھر سے شپارے کو لے کے بھاگ گئی ہے۔"

"نہیں، نہیں۔" میں نے ڈولتی آواز میں کہا۔

"تجھ کو اُستاد کے ساتھ جانا تھا اس واسطے میں نہیں بولا، وہ حرام زادی اُسے اُسی دن لے کے شہر سے نکل گئی تھی۔ [illegible]

نے اُس سے زیادہ دینے کو کہا تھا۔ پھر وہ اُسے کیوں لے گئی۔"

"لے گئی، دل میں خرابی آگئی تھی اور ہو سکتا ہے کہ پھر چند سیٹھ نے اپنے آنے کے بعد کچھ بڑی بولی دے کے کسی کو بھیج ہو۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ شپارے کی قسمت ہی خراب تھی۔

"میں اُسے کدھر ڈھونڈتا۔" کانتے بولا۔ "پر میں نے سوچ لیا تھا، اپنے کو پتہ چل گیا تو اُس سالی حرام کی پِلّی کی آنکھیں ضرور نکال لوں گا۔ میں نے جمرو کو فیض آباد، کبن خاں کے لنگوٹیوں کو لکھنؤ اور ماچھی کو بمبئی چٹھی ڈال دی تھی کہ آس پاس جدھر بھی اس چوکھٹے کی عورت دکھائی دے، اپنے کو ترت لکھو۔"

"تو کیا تجھے وہ مِل گئی؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہ نہیں ملی، یہ تیسرے دن کی بات ہے۔ میں نیچے بیٹھک میں آ کے بیٹھا تھا کہ ٹلو بھاگا بھاگا ہوا آیا، بولا، کانتے استاد! ابھی اُدھر ایک مائی بُرقع اوڑھے کھڑی تمھارا نام لیتی ہے۔ اپنا سر گھوم گیا، جا کے دیکھا تو وہ ایک کونے میں دبکی کھڑی تھی، منہ ڈھکا ہوا تھا۔ مت پوچھ لاڈلے! اپنا کیا حال ہوا، دیر تک سر سے پیر تک اُس کو دیکھتا رہا۔"

"کیا وہ شپارے تھی؟" میں نے اچھل کے پوچھا۔

"یہی تو میں بولتا ہوں۔ اپنا مغز بالکل پھر گیا تھا۔" کانتے نے مجھے زور سے دبوچ لیا۔ "وہ شپارے ہی تھی۔" وہ تیزی سے بولا اور کہنے لگا کہ وہ اکیلی تھی، اُس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ گلابی پاؤں خ... دھول میں اَٹے ہوئے تھے۔ بُرقعے پر شکنیں پڑی ہوئی۔ کانتے اُسے کسی تانجر کے بغیر اُوپر کے فلیٹ میں لے آیا۔ اُس نے نقاب اُلٹی تو کانتے کو اُس کا چہرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ شبہ پارہ کے رخساروں پر سفیدی چھائی ہوئی تھی، آنکھیں ویران اور سہمی ہوئی تھیں۔ "کانتے بھائی! میں آگئی ہوں۔" اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کانتے سے کہا اور بتایا کہ کریمن بیگم اُسے زبردستی یہاں سے لے گئی، اُس نے لاکھ منع کیا، کریمن نے اُس کی ایک نہ سُنی۔ وہ اُس کے ساتھ چلی تو گئی لیکن راستے بھر روتی ہوئی اور اُس نے راستے ہی میں دل پکا کر لیا۔ بنارس کے اسٹیشن پر گاڑی ٹھیری تو کریمن بیگم سو رہی تھی۔ شبہ پارہ نیچے اُتر آئی اور دوسرے پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ گاڑی الٰہ آباد جا رہی تھی۔ الٰہ آباد سے وہ کلکتے جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ زنانے ڈبے میں بیٹھ کے ڈبے سے تبھی اُتری جب کلکتہ آ گیا۔ رکشے میں بیٹھ کے وہ سیدھی اڈّے پر چلی آئی۔ کانتے نے [اُ]سے سینے سے لگا لیا۔

وہ بہت نڈھال تھی۔ کانتے نے اُس کے لیے دوپہر تک

[ج]وڑا سلوایا۔ اڈّے پر شولی، لالہ اور کبن خاں کے سوا کسی اور [نے] اُس نے شبہ پارہ کی صورت نہیں دیکھنے دی۔ کبن خاں دن میں [کئی م]رتبہ اُسے پوچھنے جاتا تھا۔ لالہ اور شولی بھی ہر وقت اُس کی [خدمت] ہی میں رہتے تھے۔ چار دن تک وہ زرّیں کی طرح اڈّے ہی [میں ر]ہی۔ کانتے کہتا تھا، جب تک اُس کا اصل رنگ چہرے پر واپس [نہیں] آیا، اُسے نیند نہیں آئی۔ چار دن میں وہ سب سے بہت [مانو]س ہو گئی تھی۔ کبن خاں کو بھائی صاحب کہتی تھی اور کبن خاں [اُس]ے بِھتّو کہہ کے مخاطب کرتا تھا۔ یہاں اُس کا زیادہ دنوں تک [رہن]ا ٹھیک نہیں تھا اور نہ کلکتے میں کوئی مکان لے کے اُسے [وہاں] رکھا جا سکتا تھا۔ کبن خاں کا اصرار تھا کہ میری واپسی تک [شبہ] پارہ کو گاؤں میں اُس کی ماں کے پاس بھیج دیا جائے۔ کانتے [نے] اُس کا مشورہ نہیں مانا، وہ اُسے فیض آباد زرّیں کی حویلی [میں] لے جا سکتا تھا مگر وہاں پہلے ہی خاصے لوگ تھے۔ چار دن [بعد] رات کو کانتے اُسے لے کے اڈّے سے باہر نکلا اور بمبئی [جا]نے والی گاڑی میں بیٹھ گیا، دوسری طرف سے کبن خاں، لالہ [اور ش]ولی اسٹیشن پر آگئے۔ شولی نے اُسے بالیاں، لالہ نے چوڑیاں [اور کب]ن خاں نے بہت سی چیزیں دے کے رخصت کیا۔

جولین شبہ پارہ سے مل کے بہت خوش ہوئی۔ کانتے [نے] اُسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ جولین بھی اکیلی اکیلی ویران ویران [ر]ہتی تھی۔ شبہ پارہ کے آجانے سے جیسے اُس کا کوئی کھویا ہوا [د]ل مل گیا تھا۔ کانتے نے جب اُس سے کہا کہ جولی! یہ لاڈلے [کی ا]مانت ہے تو بولی، میرے لیے اُن کی جگہ ہے۔ وہ وہاں ٹھیرا [صر]ف دو دن لیکن یہ اطمینان کر کے ہی اُس نے واپسی کا ارادہ [کیا کہ] شبہ پارہ وہاں خوش رہے گی۔ چار مہینے میں وہ چار بار بمبئی [گیا او]ر ہر مرتبہ فیض آباد ہوتا ہوا آیا۔ کانتے کے مطابق اُس کے [نام پ]ر منتقل کیے ہوئے روپوں میں سے اُسے ایک چھدام نکالنے [کی ض]رورت نہیں پڑی۔ میں نے بینک میں اُس کے نام کرشنا جی [کے د]یے ہوئے روپوں میں سے ڈھائی لاکھ روپے منتقل کیے تھے۔ [سوا لاک]ھ پچیس ہزار شبہ پارہ کے لیے اور پچیس ہزار احتیاطاً مزید کسی [ضرورت] کے لیے۔ کریمن بیگم کے نصیب میں یہ دولت نہیں تھی تو [وہ او]ر کانتے کیا کر سکتے تھے۔

میں نے کانتے کے ہاتھ چوم لیے۔ رات بھر وہ مجھے اُسی کی [باتیں] سُناتا رہا۔ میرا بس چلتا تو میں اُسی وقت اُڑ کے شبہ پارہ کو [دیکھنے پ]ہنچ جاتا۔ گھریلو لباس میں وہ بالکل بدلی ہوئی نظر آتی ہوگی۔ [اپن]ی گھر میں نظر آتی تھی۔ بکھرے بال، سر پہ نہ دوپٹے کا ہوش۔ [چپلو]ں میں جوتی۔ گھر میں اِدھر سے اُدھر پُھدکتی ہوئی۔ آوازیں

پڑتی رہیں۔ ایک لمحے باورچی خانے میں، دوسرے لمحے چھت پر کپڑے پھیلانے۔ چمپا بیگم کے کوٹھے پہ اُس کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ کسی گڑیا کی طرح سجی ہوئی جسے جہاں چاہو اُٹھا کے رکھ دو، تی جیسے اپنی روح کے بغیر زندہ تھی۔ کانتے کہہ رہا تھا۔ جب بھی وہ بمبئی جاتا، شبہ پارہ پہلا سوال یہی کرتی۔ "کانتے بھائی! کوئی خط آیا؟ کب آرہے ہیں؟" کانتے ہر مرتبہ اُس سے جھوٹ بول کے چلا آتا۔

تیسرے دن صبح تجھل نے ٹیکسی منگوائی اور مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کو کہا۔ میں سمجھا کہ وہ پیرو سے ملنے جا رہا ہے۔ پیرو اور آبا جان کو دیکھے ہوئے تین ہی دن ہوئے تھے لیکن معلوم ہوتا تھا، ایک مدت گزر گئی ہے۔ ٹیکسی شہر کی سڑکوں پر گھومتی رہی اور سیالدا اسٹیشن پر آ کے ٹھیر گئی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی، تجھل سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا پُل عبور کر کے پلیٹ فارم پہ آگیا۔ گاڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے میں جا کے برتھ پر لیٹ گیا۔ ہمارے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا۔ "کہاں جا رہے ہو؟" مجھ سے ضبط نہیں ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔

"بٹیا کے پاس۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"اور وہ لوگ؟" میں نے جھجک کے پوچھا۔

"آجائیں گے رے۔"

ابھی گاڑی چلنے میں کچھ ہی دیر ہوگی کہ پیرو، زورا، مارٹی اور آبا جان مجھے قلیوں کے ساتھ پلیٹ فارم پر آتے دکھائی دیے۔ وہ گاڑی کے پچھلے حصّے کی طرف جا رہے تھے کہ میں اُتر کے اُن کے پاس پہنچ گیا۔ "اِدھر اِدھر، تجھل بھائی اِدھر ہیں۔" میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

پیرو نے مجھے ٹانگوں سے اُٹھا کے اُوپر کر لیا۔ میری نظر فوراً آبا جان پر گئی۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ اتنے دنوں بعد میں نے اُن کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔ پیرو مجھے اُٹھائے اُٹھائے اُن کے پاس لے گیا۔ "بڑے ساب! ابھی اِس کو دیکھتے ہو، ایک دم عربی گھوڑا کے مافک ہے۔ کیا بولتے ہیں اس کو ڈل ڈول ڈل ڈل۔" وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا اور اُس نے مجھے اُوپر اُچھال کے فرش پر پھینک دیا۔ آبا جان میری کمر پہ تھپکی دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ڈبے میں داخل ہوتے ہی وہ سب تجھل کی برتھ کی طرف لپکے۔ پیرو تجھل کا جسم جگہ جگہ سے ٹھونکنے لگا۔ تجھل نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے سب کو باری باری دیکھا اور اُٹھنے کی کوشش کی تو پیرو نے اس کی چھاتی پر ہاتھ مار کے اُسے اُٹھنے نہیں دیا۔ آبا جان تجھل

کے سرھانے بیٹھ کے اُس کا ماتھا چھُونے لگے۔ اُنھوں نے اُس کی نبض بھی دیکھی۔ تجمل نے گردن اُن کے ہاتھوں پہ ڈال دی اور اباجان نے اُس کا چہرا اپنے ہاتھوں میں بھینچ لیا۔

شاید اُن کے آنے ہی کی دیر تھی، گاڑی پلیٹ فارم پر رینگنے لگی۔ اُنھوں نے سامان سوٹ کیسوں اور چرمی تھیلوں میں بھر لیا تھا۔ دو ایک ٹین کے بکسے بھی تھے سب کے کپڑے صاف ستھرے اُجلے تھے۔ اباجان کا خط بنا ہوا تھا۔ سر پہ دو پلی ٹوپی، کرتا پاجامہ اُوپر سے بنڈی پہنے ہوئے تھے اور چہرہ بھی اُجلا اُجلا، نکھرا نکھرا تھا تبت میں ہم نے جس بھکشو کو دیکھا تھا، وہ اِس سے قطعی مختلف تھا لیکن وہ بہت دُبلے اور کمزور لگ رہے تھے۔ ہڈیاں گنی جا سکتی تھیں۔ راستے میں صرف دو ٹکٹ چیکر، ایک بردوان اسٹیشن پر، دوسرا مغل سرائے پر ٹکٹ چیک کرنے آئے تھے اور مطمئن ہو کے چلے گئے مگر جب تک گاڑی فیض آباد تک نہیں پہنچ جاتی تھی، ہمارے مطمئن ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پچھلا تجربہ سامنے تھا۔ گاڑی کسی جگہ ٹھیرتی تو پولیس کے آنے کا دھڑکا لگا رہتا، کوئی ایک معمولی سپاہی ڈبے میں اچانک آ کے ہمارے سامان پر اُنگلی اُٹھا سکتا تھا، وہ تلاشی کا مطالبہ کرتا تو انکار کیسے کیا جاتا۔ انکار میں زور تبھی ہو سکتا ہے جب ایسا سامان ساتھ نہ ہو جو ہم چھپائے ہوئے تھے۔ محل، قلعے، ہاتھی، گھوڑے، غلاموں کی فوج، باندیاں، زرنگار ملبوسات، عزت، شان، سبھی کچھ ان صندقوں میں بند تھا جس کی نظر پڑتا، سُن ہو جاتا، دماغ پھٹ جاتا، فرسٹ کلاس کے مسافروں کے سامان کی اِس طرح تلاشی نہیں لی جاتی لیکن یہ کوئی قانون نہیں تھا، کسی کو کسی جگہ بھی شک ہو سکتا تھا۔

گاڑی کی رفتار ابتدا میں تیز تھی، بعد میں سُست پڑ گئی۔

ایک اسٹیشن پر لیٹ ہوئی تو لیٹ ہوتی گئی۔ آسنسول سے آگے میں اباجان کی برتھ پر جا کے بیٹھ گیا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ فرخ فرمال، فارحہ اور اکبر کے بارے میں اُن سے پوچھوں مگر اباجان ہی کے خیال سے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی، کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو میرے کریدنے پر اُن کے زخم تازہ ہو جائیں گے۔ پھر یہ بھی خیال آتا تھا، وہ اپنے دل میں کہیں یہ نہ سوچ رہے ہوں کہ نو سال میں میرے ذہن پر دھول جم گئی ہے تاہم میں نے لب نہیں کھولے آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں اُنھیں بتانا ہی تھا مجھے نہیں تو جہاں گیر کو میری طرح جہاں گیر کو اُن سے پوچھتے ہوئے کوئی جھجک نہیں ہو گی کیونکہ اُس کے سامنے فتی گھر سے تو نکلی مگر اُس نے اُسے محفل میں ہار سنگھار کیے بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔ فیض آباد قریب آتے آتے گاڑی لیٹ ہونے کے سبب دُور ہو جاتا تھا گاڑی کو رات میں کسی وقت پہنچنا تھا لیکن وہ ساری رات گزار کے کہیں صبح پانچ بجے فیض آباد کے علاقے میں داخل ہوئی۔ یہیں دروازے پر دستہ تھامے اسٹیشن آنے کا انتظار کر رہا تھا، زریں، خانم، نیسار منیر علی، زہرہ، جہاں گیر سب کے چہرے بار بار سامنے آ جاتے تھے۔ میری رگوں میں سنسناہٹ سی ہونے لگتی تھی، مارٹی بھی میرے پہلو میں دروازے پر آ کے کھڑا ہو گیا تھا۔

تجمل کو پھر اُٹھنا پڑا۔ اسٹیشن پر مسافروں کا میلا لگا ہوا تھا ہم نے کچھ دیر بھیڑ چھٹنے کا انتظار کیا، تب باہر نکلے گیٹ پر ٹکٹ چیکر نے ایک سرسری نظر ہمارے ٹکٹوں پر ڈالی، پھر سامان پہ ایک پل کو اُس کی آنکھوں میں تلخی سی اُبھری مگر وہ کے دوسرے مسافروں کی طرف دیکھنے لگا، قلیوں نے ہمیں فوراً تانگوں تک پہنچا دیا۔ تانگے کے جھٹکے تجمل کے پیر کے لیے تکلیف دہ ہوتے لیکن کوئی اور سواری ہی نہیں تھی۔ اسٹیشن سے کچھ دُور چنگی پڑتی تھی۔ تانگا آگے نکل جاتا مگر سڑک کے بیچ میں ایک دُبلے پتلے پستہ قد آدمی نے ہاتھ اُٹھا کے اُسے رُکنے کا اشارہ دیا۔ "کچھ نہیں ہے میرے سرکار!" کوچوان نے گھوڑے کی باگیں تھامتے ہوئے ہنس کر کہا۔

چنگی والے نے اُس کی بات نہیں سُنی اور پائدان پر پیر رکھتے ہوئے بکسے چھُو کے منہ بناتے ہوئے بولا۔ "کیا ہے؟"

"ہیرے جواہرات ہیں۔" تجمل نے گونجتی آواز میں کہا۔

اُس نے ناراضی سے تجمل کی طرف سر اُٹھا کے دیکھا لیکن پلکیں جھپکا کے رہ گیا۔ "ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔" وہ کسمسا کے بولا۔

"ٹھیک ہی بولا ہے، اِدھر چنگی میں ہیرے جواہرات کے کیا دام ہوتے ہیں۔" تجمل نے نرمی سے کہا۔ "رونہ کاٹ دو۔"

"سامان کھول کے دکھاؤ۔"

"شامت کر بلو شاہ۔" پیرو نے درشتی سے کہا۔ "اپن کو ...ہے۔" اُس نے دس روپے کا نوٹ نکال کے اُس کے حوالے کیا۔ "رونہ کاٹ کے رکھنا، واپسی میں اپن اِدھر سے لے لیں گے۔"

"سامان دکھا کے دام لگیں گے۔" چنگی والا تانگے کا بم تھام کے بولا جیسے تانگا روک لے گا۔

کوچوان نے اُسے بیچ میں سمجھانے کی کوشش کی اور ...سے بولا۔ "دس روپے اور دے دو جنابِ عالی! دس روپے رونہ کٹ جائے گا تو باقی کیا بچے گا، کچھ غریب لوگوں کا بھی خیال..."

"ایسا ہے۔" پیرو نے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ اور نکالا۔ "ایسا ہے تو پہلے بولنا۔ اِدھر یہ خالی پیلی آنکھیں کیوں ... ہے، سالا اپنے کو کیا سمجھ کے رعب مارتا ہے۔"

کوچوان نے چنگی والے کو آنکھ مار کے اشارہ کیا، اُس نے ...ڑے کھڑے چنگی پر بیٹھے ہوئے منشی کو دونوں بیچ کھول کے ...بندسہ بنایا اور دو نوٹ کے رسید لے آیا، چلتے چلتے وہ سلام ...ں بھولا۔ "ناراض مت ہونا جناب!"

تانگے والے نے چابک اُٹھا کے گھوڑے پہ زور سے مارا، ...رپٹ شہر جانے والی سڑک پر دوڑنے لگا۔

ہمارے پاس چنگی کی رسید تھی لیکن آگے کسی موڑ پر کسی ...ں نے ہمیں نہیں روکا، صرف مٹھائی اور دودھ کی اِکا دُکا دکانیں ...ہوئی تھیں، سڑکوں پر ویسے سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بازار سے ...ے حویلی تک جانے والا راستہ مختصر تھا۔ میرے دل میں سائیں ...ں سی ہو رہی تھی۔ حویلی قریب آ رہی تھی۔ اباجان کو دیکھ کے ...یر کی کیا حالت ہو گی اور زریں تجمل کو دیکھ کے کیا کہے گی، ...نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ ہی دیر میں حویلی ہمارے سامنے تھی۔

"آگے پھاٹک پر پہنچ لے بلما!" میرے بولنے سے پہلے ...نے اونچی آواز میں کوچوان سے کہا۔ اُس نے باگیں کھینچ لیں ...انگا ہچکولے کھاتا ہوا ٹھیر گیا۔ سب سے پہلے میں نیچے اُترا۔ حویلی ...ک بند تھا۔ بوڑھا چوکی دار شیرا وہاں موجود نہیں تھا۔ پیرو ...تجمل کو سہارا دے کے نیچے اُتارا۔ اباجان، زورا اور مارٹی نظریں ...ٹھا کے حویلی دیکھ رہے تھے، باہر سے ساری عمارت کا رنگ ...تھا اور وہ کسی چھوٹے قلعے سے مشابہ تھی۔ میں بھاگ کے دروازے ...نچا اور میں نے زور زور سے کُنڈا کھٹ کھٹانا شروع کر دیا۔

"کون ہے؟" اندر سے شیرا کی لڑکھڑاتی آواز گونجی۔ ساتھ ہی اُس ...پھاٹک کی کھڑکی کھول دی۔ مجھے سامنے دیکھ کے وہ آنکھیں مسلنے ...اور لوکھلائے ہوئے لہجے میں چیخا۔ "لاڈلے میاں!"

"شیرا چاچا۔" میں نے اُسے کولیا میں بھر لیا۔ مجھے احساس ...نہیں رہا کہ اباجان پیچھے آ رہے ہیں۔

جیسے ہی شیرا کی نظر تجمل پر پڑی، وہ اُچھلنے لگا اور میری گرفت ...آزاد ہو کے اُس کی جانب بھاگا۔

"ابھی تک چل رہا ہے رے؟" تجمل اُس کا بازو جھنجوڑتے ...بولا۔

"تم نے جو ادھر باندھ رکھا ہے۔ بٹیا روکے ہوئے ہے۔"

"بٹیا کیسی ہے؟" تجمل نے تمتمائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اپنے سے مت پوچھو، خود ہی دیکھ لینا۔"

"جا کے جلدی بول، اِدھر کیا سستا رہا ہے۔"

...یرا جستیں لگاتا، چیختا ہوا اندر عمارت کے دروازے پر جا کے کواڑ دھڑ دھڑانے لگا۔ کوچوان، پیرو، مارٹی اور زورا جلدی جلدی سامان اُٹھا لائے۔ شیرا کو زیادہ چلانے کی ضرورت نہیں پڑی، کسی نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور ڈرے ہوئے پن سے پوچھا۔ "کیا بات ہے شیرا چاچا؟" میں نے آواز پہچان لی۔ وہ زریں ہی تھی۔

"دیکھو کون آیا ہے۔" شیرا نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

زریں نے کچھ اور نہیں پوچھا، ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ میری آنکھیں دھندلا گئیں۔ زریں کے سراپا کا ایک جھماکا سا ہوا، پہلے تو وہ ذرا سی ٹھٹکی، پھر کسی سہمی ہوئی ہرنی کی طرح، بجلی کی طرح کوندتی، چبوترے کی سیڑھیاں پھلانگ کے تجمل کے سینے سے آ لگی۔

تجمل اُس کے سر پہ اپنا سر رکھے آنکھیں میچے لمحوں تک چپ کھڑا رہا، زریں بُری طرح سسکنے لگی تھی۔ "تا، تا۔" تجمل بوجھل لہجے میں بولا۔ "آ گیا ہوں ری! اب کے تو جب بولے گی جبھی لوٹوں گا۔ نہیں بولے گی تو نہیں جاؤں گا۔" تجمل نے اُس کی ٹھوڑی اُٹھا کے چہرہ سامنے کیا اور اُس کی پیشانی چومنے لگا اور اُس کی پگھلتی ہوئی آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ زریں سر تا پا لرز رہی تھی، اُسے یہ بھی دھیان نہیں رہا تھا کہ کچھ اجنبی لوگ بھی کھڑے ہیں۔ ہم سب اُسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میری سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ پیرو نے سر جھکا لیا۔ "سنبھل ری۔" تجمل نے اپنے بازوؤں کا حصار کھول کے اباجان کی طرف اشارہ کیا۔ "اِدھر دیکھ، پہچان تو کون ہیں یہ؟ چہرہ کچھ جانا پہچانا لگتا ہے؟"

زریں کی بھیگی پلکیں پٹ پٹانے لگیں۔ اُسے فوراً اپنے دوپٹے کا ہوش آیا۔ تجمل نے اپنی آستین سے اُس کی آنکھیں پونچھ دی تھیں۔ زریں کا چہرہ آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ اُس نے لرزتے ہونٹوں سے گردن خم کر کے سٹ پٹائے ہوئے انداز میں اباجان کو سلام کیا۔

"ابھی سنبھالو اِسے بابا! دیکھ لو فتی جیسی ہے نہیں۔"

فتی کے نام پر اباجان چونکے، زریں بھی۔ اُس نے حواس باختگی سے پہلے میری طرف دیکھا، پھر اباجان کی طرف اور اُنھیں دوبارہ سلام کیا۔ اباجان نے آگے بڑھ کے اپنے کانپتے ہاتھ اُس کے سر پہ رکھ دیے اور کچھ بولے نہیں کہ تجمل نے فتی کا نام کیوں لیا ہے، وہ گنگ سے ہو گئے تھے۔

اُسی لمحے جہاں گیر اندر کے دروازے پر سمندر کی لہر کے مانند اُمڈتا ہوا آیا۔ اُس نے پہلے مجھے دیکھا تھا اور میری طرف بڑھا تھا لیکن تجمل سے جا کے لپٹ گیا، اباجان زریں کے سامنے دروازے کی جانب پشت کیے کھڑے تھے اِس لیے

اُس کی نظراُن پرنہیں جا سکی اور اُس کے سان وگمان میں بھی نہ ہوگا کہ ابا جان یہاں آ سکتے ہیں، وہ اکہری ہڈی کا شروع ہی سے تھا، اب اور لمبا ہوگیا تھا۔ بانس کی طرح اُوپر اُٹھا جا رہا تھا۔ ببّھل نے اُس کے کولھے پکڑ کے اُسے اُوپر اچھال دیا۔ "کیسا ہے شینو پیا؟" وہ اپنا سر اُس کے پیٹ سے رگڑتے ہوئے بولا۔ "پہلے منّھی تو دے دے۔"

"بابا! ہم آپ سے بہت ناراض ہیں۔" وہ مچل کے بولا۔

"ایک خط بھی نہیں لکھا، ایک سطر بھی۔"

"اُنگلیاں ہی جام ہوگئی تھیں لیے۔"

"آپ وعدہ کر کے گئے تھے۔ کسی سے دو لفظ نہیں کہلوا سکتے تھے؟ چھ مہینے میں پانچ منٹ بھی آپ کو نہیں ملے؟"

"معاف کر دے شہزادے! غلطی ہوگئی۔"

جہاں گیر اُس کے گلے میں بانہیں ڈال کے جھول گیا۔

"بابا! روز آپ کا انتظار ہوتا تھا۔ زرّیں باجی صبح وشام شیرا ماما سے پوچھتی تھیں، ڈاکیا گزر گیا؟ آپ ایسے کہاں چلے گئے تھے؟ کتنی دور؟ وہاں سے خط بھی نہیں آ سکتا تھا کیا؟" وہ ایک ہی سانس میں نہ جانے کیا کیا کہتا رہا اور ببّھل سر ہلاتا رہا۔

"ذرا دیدے کھول، دیکھ تو تیرے لیے کیا لایا ہوں۔"

"کیا ہے؟" جہاں گیر بے تابی سے بولا۔ "مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ آپ اور بابر بھائی آ گئے، یہی بہت ہے۔ دل میں عجیب عجیب ہَول آتے تھے۔ سبھی دعائیں کرتے تھے۔"

"اِدھر تو دیکھ، پیچھے کون کھڑا ہے۔"

"کون؟" جہاں گیر نے مُڑ پلٹ کے دیکھا۔ ابا جان اُس کی باتیں سُن رہے تھے اور اُن کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری تھے۔ جہاں گیر اُنھیں دیکھ کے مبہوت رہ گیا۔ ابا جان نے اپنے ہاتھ پھیلا رکھے تھے۔ وہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح اُن کے بازوؤں میں چھپ گیا، پھر جیسے سوتا پھوٹ پڑے، ایسا گرج گرج کے رویا کہ سبھی کی آنکھیں چھلنے لگیں۔ اندر سے منیر علی، خانم، زہرہ، سلمٰہ، ججّو میاں، ارشد اور نیساں سبھی آ گئے تھے۔ نیساں اور بڑی ہوگئی تھی۔ مجھے دیکھا تو دیوانی سی ہوگئی، اُسے دیکھنے کو میرا دل بہت چاہتا تھا۔ پہاڑوں میں کتنی ہی بار مجھے اُس کا خیال آیا تھا اور کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ نیساں میرے ساتھ ساتھ ہی چل رہی ہے۔ شکر سنا جی کہتے تھے کہ آدمی کبھی کہیں اکیلا نہیں جاتا، اُس کے ہم سفر بہت سے لوگ ہوتے ہیں، جنھیں وہ چھو نہیں سکتا پر جنھیں دیکھتا رہتا، جن سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ نیساں کی پرچھائیں بھی جیسے میرے ساتھ ہی گئی تھی اور مجھے ایک ہی بات ستاتی رہتی تھی کہ کہیں وہ حویلی میں آ کے پچھتاتی نہ ہو، کوئی اُس سے ناراض نہ ہوگیا ہو، جیکے چپکے روتی نہ ہو۔

اُس کا رنگ اور کھل گیا تھا، شہابی شہابی، ایسی بدلی ہوئی لگ رہی تھی جیسے میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ میرے پاس دوڑی ہوئی آئی اور قریب آ کے ایک لمحے کو سہم کے رُک گئی۔ "بابر بھائی!" وہ سسکاری بھرتے ہوئے بولی۔ دوسرے ہی لمحے اُٹھا میں نے اُسے کھینچ کے اپنے پہلو میں سمیٹ لیا۔ میں اُسے سنبھالتا نہیں تو شاید وہ اپنے پیروں پر تھمی نہ رہتی، صرف ایک بار اُس نے منہ اُٹھا کے مجھے بسورتی نظروں سے دیکھا اور اپنا چہرہ میرے شانے میں چھپا کے بلکنے لگی، میں اُسے روکنا چاہتا تھا کہ دوسری طرف سے سفید ساڑی میں ملبوس خانم میرے پہلو میں آ کے کھڑی ہوگئی تھی۔ وہی رنگ روپ، جھیل جیسی آنکھوں میں موتی لرزتے ہوئے۔ خانم کی عمر بڑھتے ہوئے وقت کے ساتھ کچھ گھٹ رہی تھی۔ چہرے پر نور سا بکھرا ہوا تھا۔ میں نے بڑھ کے اُس کے کندھے پر اپنا ماتھا ٹکا دیا۔ خانم کی نرم و نازک لمبی لمبی انگلیاں جن سے وہ ستار بجایا کرتی تھی، میری گردن پر منڈلانے لگیں۔ اُس کے پیچھے زہرہ سمٹی کھڑی تھی، منیر علی لپکتے ہوئے میری جانب بڑھے، وہ دونوں پیچھے ہٹ گئیں۔

پھاٹک اور عمارت کے درمیان کھلے، کشادہ حصے پہ سبزہ اُگا دیا گیا تھا، احاطے اور عمارت کی دیواروں کے ساتھ والی کیاریوں میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے، اندر حویلی میں اب کوئی موجود نہیں رہا ہوگا، تمام ملازم بھی وہیں آ گئے تھے دیر تک کسی کو ہمارے کھڑے رہنے کا احساس نہیں ہوا، کوئی کبھی میری طرف بڑھتا، کبھی ببّھل کی طرف۔ جہاں گیر کو ابا جان کی آغوش میں مسلسل سسکتے دیکھ کے پیرو نے اُسے اُن سے الگ کر کے اپنی چھاتی سے چمٹا لیا تھا۔ خانم کے ٹوکنے پر ببّھل نے اندر جانے کے لیے قدم بڑھائے تو لنگڑانے لگا۔ ایک بار پھر سبھی اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ زرّیں نے نظر بھر کے دیکھا تو ببّھل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں ری، ذرا چوٹ لگ گئی ہے۔" وہ جلد ہی زرّیں کے کندھے کا سہارا لیے بدلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

مردانہ حصے کے پہلے بڑے کمرے کا رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ فرش پر قالین، دیواروں کے ساتھ آرام کرسیاں، چھت کے بیچ میں ایک چھوٹا فانوس لٹکا ہوا۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ ایک بڑا تخت بچھا ہوا تھا۔ ببّھل وہیں جا کے بیٹھ گیا۔ ابھی آئے چند ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ زرّیں نے ایک چھوٹا ... کے ببّھل کے آگے رکھ دیا، نیساں ایک ملازم کے ساتھ چائے کی پیالیاں رکھ گئی۔ ہم نے ناشتہ نہیں کیا تھا۔ حویلی میں بھی ... ابھی سو کے اُٹھے ہوں گے۔ زرّیں، نیساں، زہرہ، خانم، سلمٰہ، ججّو میاں سبھی بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ زرّیں کے اشارے ... ببّھل نے ہم سب کو نہانے اور کپڑے بدلنے کا مشورہ دیا۔ مارتی ... زورا جھجکی رہے تھے۔ سب کے کپڑے میلے ہو گئے تھے اور ... کے پاس دُھلے ہوئے کپڑے تھے بھی نہیں مگر ببّھل کے ... پر سبھی اُٹھ گئے۔ منیر علی ابا جان کو بھی ایک طرف لے گئے۔ ... کر کے جب سب واپس مردانے میں آئے تو سبھی نئے کپڑے ... ہوئے تھے جیسے اُنھیں معلوم تھا کہ ہمارے ساتھ اور لوگ ... ہوں گے۔ زرّیں نے میرے اور ببّھل کے لیے کپڑے سی کے ... رکھے ہوں گے، پیرو اور زورا کو ببّھل کے جوڑے ٹھیک آ ... ہوں گے اور مارتی کو میرے کپڑے، ابا جان پہلے ہی ... کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کرتوں اور پاجاموں میں چھوٹے ... سائز کا اتنا فرق محسوس نہیں ہوتا، مارتی کو میں نے پہلی بار ... لباس میں دیکھا تھا۔ ململ کے کڑھے ہوئے کرتے اور چھوٹی مہری ... پاجامے میں وہ عجیب سا لگ رہا تھا، بانکا سا، خود کو بار ... دیکھتا تھا۔ وہیں تخت پر ایک لمبا دسترخوان بچھا دیا گیا۔ اتنی ... میں نہ جانے اُنھوں نے کیا کیا تیار کر لیا تھا۔ قیمہ، پراٹھے، آلو ... ترکاری، پوریاں، حلوہ، جھینگا، ٹوسٹ، بسکٹ اور چائے۔ دعوت ... کا سماں تھا، سب چیزیں دسترخوان پر چُن دی گئیں تو ببّھل نے ... نیساں وغیرہ کو بھی ہمارے ساتھ بیٹھ جانے کو کہا۔ ابا جان ... کچھ نہیں تھا۔ پیرو، زورا اور مارتی سے اُنھوں نے پردہ پہلے ... نہیں کیا تھا کیونکہ وہ ببّھل کے ساتھ آئے تھے اس لیے ... نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی ہوگی۔ زہرہ بھی نیلی چادر ... ڈالے وہیں موجود تھی، نیلی چادر میں اُس کے چہرے کا ... جیسا رنگ دمک رہا تھا، منیر علی اور ارشد بھی پہلے سے ... نظر آتے تھے، ارشد بالکل تن درست معلوم ہوتا تھا، مجھے یہی ... تھا کہ فیض آباد کی آب و ہوا اور ماحول سے منیر علی اُکتا تو ... گئے ہوں گے۔ خانم، زرّیں، نیساں یا جہاں گیر کی کوئی بات ... کے لیے ناگوار خاطر ہو سکتی تھی، اپنا گھر بار یاد آتا ہو گا اب ... سے لگتا تھا جیسے وہ برسوں سے یہیں رہ رہے ہوں، اسی ... میں۔ مردانے میں سب سے اُونچی آواز اُنھی کی تھی، سب ... بادا جان کہتے تھے، خانم بھی۔

ببّھل کی ہدایت پر تقریباً سارے بکسے لائبریری کے نیچے ... ہوئے تہہ خانے میں رکھ دیے گئے۔ ابا جان نے اُنھیں کھول ... دوبارہ دیکھنے کا تجسس ظاہر نہیں کیا، اُن پر تو جیسے سکوت سا چھا گیا تھا۔ سر اُٹھا کے سب کو تکنے لگتے اور کسی کے مخاطب ہونے پر چونک جاتے، نہ جانے کیا سوچ رہے تھے مگر چہرے سے کوئی خاص بے چینی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ ببّھل نے نام لے لے کے پیرو، زورا، مارتی کو اُن سب سے ملوایا تھا۔ زرّیں ببّھل سے کچھ کہنے کے لیے سامنے آئی تو وہ پیرو سے کہنے لگا۔ "یا بنی گیتا ہے دادا!"

"اپنی جان ہے ببّھل بھائی!" پیرو نے دونوں ہاتھوں سے زرّیں کا چہرہ تھام لیا اور ٹکٹکی باندھ کے اُسے دیکھتا ہوا بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اِبن ببّھل بھائی کا غلام ہے، اپنی گیتا بھی ایک دم تیرے مانک ہے، بالکل ایسا ہی گڑیا جیسا۔"

"کہاں ہیں وہ؟" زرّیں نے زیرِ لب پوچھا۔

"ابھی اُس کو ادھر بلائے گا یا تم کو ہی اُودھر لے جائے گا، کیوں ببّھل بھائی! گیتا اس کو دیکھ کے کتنا خوش ہوئے گا۔"

"راج کماری کو ادھر ہی بلالو، رانی کو بھی۔"

"ہاں ہاں یہیں بلا لیجیے۔" زرّیں چہک کے بولی۔

"اندر آ کے تو پھر وہ واپس جانے کو نہیں بولیں گی۔"

"ٹھیک ہے، پھر وہ ہمارے ساتھ ہی رہیں گی۔"

"ارے ببّھل بھائی!" پیرو ہنس کے بولا۔ "اِس کا دل بھی تمھارے جیسا ہے۔"

"اِس کا دل کسی نے نہیں دیکھا دادا! پاتال سے نیچے ہے۔" ببّھل نے سانس بھر کے کہا۔ "بغیر ہتھیار کے لڑتی ہے۔"

"لوگ باگ جیسا بولتا ہے، اپنے کو ایسا ہی لگتا ہے، اُوپر والے نے اس کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔"

زرّیں شرما کے بھاگ گئی۔

دوپہر ہونے سے پہلے جامو کا چھوٹا بھائی اور فیض آباد کے اڈّے کا اُستاد جمرو ڈگمگاتے قدموں سے مردانے میں داخل ہوا اور ببّھل کے گلے لگ کے بین کرنے لگا۔ وہ اکیلا نہیں آیا تھا، اڈّے کے اور بھی لوگ اُس کے ساتھ تھے۔ جمرو کو کلکتے میں ہونے والی ہر بات کا علم تھا، کانتے نے بتایا تھا کہ وہ جیل میں اُس سے ملنے کے لیے آیا تھا مگر کانتے نے اُسے لوٹا دیا۔ پچھلی مرتبہ یہیں اسی جگہ کبن خاں اور جمرو میں کسی عورت پر جھگڑا ہو رہا تھا، دونوں ببّھل کو اپنی اپنی کہانی سنا رہے تھے مگر دونوں ایک دوسرے پہ جان چھڑکتے تھے۔ جامو نے کبن خاں سے کہا تھا کہ وہ گاہے گاہے لکھنؤ سے آ کے فیض آباد کے اڈّے کو دیکھتا رہے اور جمرو کو اُلٹی سیدھی حرکتوں سے باز رکھے۔ ابھی جمرو نے کبن خاں ہی کے بارے میں سنا تھا، اُسے معلوم نہیں تھا کہ ہم اُس کے ساتھ چلے بڑھے ہوئے ممتن میاں کو واپس نہیں لا سکے

ہیں۔ تجمل کو کسی نہ کسی لمحے آ سے یہ بتانا ہی تھا۔ اُس کے آنے پر منیر علی اباجان کو دوسرے کمرے میں لے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد میں بھی وہاں سے اُٹھ گیا۔ مجھ سے جمرو کی لال آنکھیں دیکھی نہیں جاتی تھیں۔ جمرو کو آئے دیر نہیں ہوئی تھی کہ زرّیں نے شیرا سے کہہ کے اُسے اندر بُلوالیا اور جلد سے جلد کسی ڈاکٹر کو لے آنے کو کہا۔ پہلے بھی ایک بار جمرو میرے لیے فیض آباد کے ایک مشہور ڈاکٹر کو لایا تھا۔ زرّیں ہی نے اڈّے پر کہلایا ہوگا کہ ہم لوگ حویلی میں ہیں۔ زرّیں کی بات جمرو کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی، وہ فوراً باہر چلا گیا اور آدھ گھنٹے کے اندر واپس آیا تو ڈاکٹر اُس کے ساتھ تھا۔

زرّیں نے تجمل کا پلنگ وہیں مردانے میں لگوا دیا تھا اور اُسے اُٹھنے سے بالکل منع کر دیا تھا۔ تجمل نے پھر وہاں سے جنبش نہیں کی، ضرورتہً ہی اُٹھا ہو تو اُٹھا ہو۔ زرّیں کے کہنے پر دوپہر کا کھانا جمرو نے ہم لوگوں کے ساتھ ہی کھایا، پھر اڈّے کے تمام لوگوں کو لے کے چلا گیا۔ پیرو، زورا، مارٹی اور اباجان کے لیے الگ الگ کمروں کا انتظام کیا گیا تھا لیکن وہ تینوں ایک ہی کمرے میں آ گئے۔ منیر علی، اباجان کے ساتھ سائے کی طرح لگے ہوئے تھے، جہاں گیر بھی اُنھی کے ساتھ تھا۔ شام کو جمرو پیرو اور زورا کو اڈّے پر لے گیا۔ مارٹی میری وجہ سے وہیں رہ گیا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا۔ رات کو تجمل کو پھر بخار آ گیا۔ زرّیں نے اُسے گرم دودھ کے ایک کٹورے اور دواؤں کے سوا کچھ کھانے کو نہیں دیا اور رات گئے تک سرھانے بیٹھی اُس کا سَر دباتی رہی۔

تین دن تک وقت کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا، کوئی مصروفیت بھی نہیں تھی مگر ایک دوسرے کو دیکھنے اور باتیں کرنے ہی سے کسی کو فرصت نہیں ملی تھی۔ اباجان بھی جیسے ساری دُنیا سے بے خبر ہو گئے تھے۔ دوسری صبح وہ منیر علی کے ساتھ زمینوں پر چلے گئے۔ رات کو لوٹے تو منیر علی اُنھیں اندر لے گئے۔ میں نے اندر جا کے دیکھا تو ایک طرف سلمہ اُن کے پہلو میں بیٹھی تھی، دوسری طرف نیساں۔ دونوں کی زبانیں چہک رہی تھیں۔ وہ کبھی نیساں کی بات سُنتے، کبھی سلمہ کی، کبھی جہاں گیر بیچ میں بولنے لگتا۔ زہرہ اور خانم بھی وہیں موجود تھیں۔ منیر علی کے قہقہے گونج رہے تھے۔ مجھے خدشہ ہوا کہ اباجان کا غصّہ تیز ہے، نیساں اور سلمہ کوئی گستاخی نہ کر بیٹھیں لیکن اباجان اُن کے درمیان بچّے بنے بیٹھے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ حویلی میں دو ایک پہر ٹھیرنے کے بعد واپس جانے کے لیے اصرار کریں گے، فرّخ، فریال، فارحہ اور اکبر کے پاس۔ چار دن تک اُنھوں نے اُن کا ذکر ہی نہیں کیا اور نہ کہیں جانے کا کوئی اشارہ کیا۔ کئی مرتبہ میں نے جہاں گیر کو اُن سے چپکے چپکے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ جہاں گیر نے اُن سے ضرور پوچھا ہوگا۔ میں جہاں گیر سے معلوم کر سکتا تھا لیکن نہ جانے کون سی بات مجھے روک لیتی تھی۔ اس دوران اباجان کو زرّیں، خانم، منیر علی اور میرے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا ہوگا۔ وہ، جہاں گیر اور منیر علی آپس میں صرف موسم کی باتیں تو نہیں کرتے رہتے ہوں گے۔ اباجان کے چہرے سے طویل سفر کے آثار دھٹ رہے تھے اور اُن کے ہونٹوں پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ رچنے لگی تھی۔ چار دن تک اُنھوں نے تہہ خانے کا سامان بھی نہیں ٹٹولا تھا۔

پیرو، زورا اور مارٹی کو بھی شاید واپسی کی جلدی نہیں تھی، وہ یکسر بدلے ہوئے تھے۔ ارشد زیادہ تر اُنھی کے ساتھ رہتا تھا۔ نیساں، سلمہ، مجو میاں، زہرہ، خانم ہمہ وقت اُن کے اِردگرد رہتی تھیں یا پھر وہ جمرو اور اڈّے کے آدمیوں میں گھرے رہتے تھے۔ زرّیں تو مستقل تجمل کے پلنگ سے بندھ گئی تھی حالانکہ اب تجمل کی طبیعت نسبتہً بہتر تھی۔ زخم سکڑنا شروع ہو گیا تھا، بخار بھی پھر نہیں آیا تھا۔

حویلی میں ایک دُھوم سی مچی ہوئی تھی۔ جسے دیکھو بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔ نیساں، زہرہ باورچی خانے میں کھانا پکا رہی ہیں، سلمہ سبزی کاٹ رہی ہے۔ خانم ملازماؤں سے صفائی کرا رہی ہیں۔ بستروں کی چادریں بدلوا رہی ہیں۔ صحن میں چھڑکاؤ کروا رہی ہیں۔ کبھی شربت آ رہا ہے، کبھی چائے۔ صبح و شام انواع و اقسام کے کھانے پک رہے ہیں۔ پکانے کے دوران حسبِ معمول نیساں چہکتی رہتی تھی، بابر بھائی! بریانی کیسی ہے! اُلٹے پلٹے کیسے ہیں؟ جس چیز کے بارے میں وہ پوچھتی تھی، اس کا مطلب تھا کہ اس نے پکائی ہے۔ میں اُسے چڑانے کے لیے کہہ دیتا "بہت بے مزہ ہے" وہ میرے سامنے سے جھٹ پلیٹ اُٹھا لیتی اور صورت رُمسی ہو جاتی۔ جب تک میں اُس کے ہاتھ سے پلیٹ واپس نہ لے لیتا، اُس کے گالوں کی سُرخی واپس نہ آتی۔ آتے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ جہاں گیر نے اچھے نمبروں سے میٹرک کر لیا ہے اور فرسٹ ایئر کی تیاری کر رہا ہے، ارشد بھی ایم اے کر رہا ہے۔ وہ جہاں گیر، نیساں، سلمہ، مجو میاں کو روزانہ کئی گھنٹے پڑھاتا اور منیر علی کے ساتھ زمینوں پر نکل جاتا، اُس کے علاوہ دو اور ٹیوٹر بھی اُنھیں پڑھانے آتے تھے، نیساں نے مجھے بتایا کہ خانم اب اُسے زیادہ نہیں ڈانٹتی ہیں، وہ کبھی کبھی کمرے میں بند ہو کے ستار بجا لیتی ہیں۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے منیر علی کا لڑکا تنویر علی

علی گڑھ سے آ جاتا ہے۔ وہ دو تین دن سے زیادہ نہیں رہتا مگر اُس کے آ جانے سے بہت رونق ہو جاتی ہے۔ زرّیں بہن کتابیں پڑھتی رہتی ہے یا وہ اور خانم مل کے گھر سجاتی رہتی ہیں۔ کبھی زرّیں، خانم سے فرمائش کرکے ستار سنتی ہے مگر اُن دونوں کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ نیساں کہتی تھی کہ زرّیں باجی ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں، بعض اوقات تو اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتیں۔ رات کو دیر تک باغ میں اکیلی بیٹھی رہتی ہیں لیکن جب بھی باوا (منیر علی) یا خانم اُن کے پاس جا کے طبیعت پوچھتے ہیں، گھبرا جاتی ہیں جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔ باوا جب بھی باہر جاتے ہیں تو وہ دروازے تک اُنھیں رخصت کرنے آتی ہیں اور جب وہ لوٹتے ہیں تو پہلے اُنھی کو پوچھتے ہیں۔

اتنے دن ہو گئے تھے، زرّیں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اُس رات میں کمرے میں آ کے لیٹا ہی تھا کہ زرّیں کی خوشبو مجھے دروازے پر محسوس ہوئی، خوشبو بھی چاپ کی طرح ہوتی ہے۔ کوئی آہٹ نہیں ہوئی تھی، وہ دبے پاؤں دروازے پر آئی تھی لیکن مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ کوئی آیا ہے اور یہ وہی ہو سکتی ہے۔ میں ایک دم اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ "آؤ، وہاں کیوں کھڑی ہو؟ اندر آ جاؤ۔" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔

وہ جھجکتی سمٹتی اندر آئی۔ لمبے بال کھلے ہوئے تھے اور دوپٹے سے لٹیں جھانک رہی تھیں۔ ہرا دوپٹا اُس کے سُرخ و سفید رنگ پر کھِلتا تھا۔ میں اُسے کن انکھیوں ہی سے دیکھ رہا تھا، اب اُس کا سراپا میری کھلی آنکھوں کے سامنے تھا۔ آڑا پاجامہ اور کُرتا اُس کا خاص لباس تھا۔ اس میں اُس کا نکلتا ہوا قد اُمڈ نکل آتا تھا۔ صرف چوڑیاں کلائیوں میں تھیں یا کانوں میں بالے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی نئی زرّیں کو دیکھ رہا ہوں۔ "بیٹھ جاؤ۔" میں نے بھری ہوئی آواز میں کہا۔ اُس سے کہنے کو کوئی بات ہی میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ سَر جھکائے بیٹھ گئی تھی، اچھا ہوا جو اُس نے سَر جھکا لیا تھا۔ مجھے اُسے دیکھنے کا خوب موقع مل گیا۔ "اباجان کو دیکھا؟" میں نے یوں ہی پوچھ لیا، مجھے کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔

"بالکل تمھارے ہی اباجان ہیں۔" وہ مسکرا کے بولی۔

"کیا مطلب؟" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"میرا مطلب ہے تمھارے جیسے۔" وہ تیزی سے بولی۔ "اُن کا چہرہ، ناک نقشہ تم سے اور جہاں گیر سے کتنا ملتا ہے، وہی لمبی ناک، دنچا قد، گہری بھویں، اچھا تو بہت ہی ملتا ہے۔"

"تمھیں اُنھیں ہمارے ساتھ دیکھ کے تعجب تو بہت ہوا ہوگا۔"

"نہیں۔" وہ اعتماد سے بولی۔ "مجھے یقین تھا ایک دن وہ ضرور مل جائیں گے۔"

"تمھاری بات ہوئی؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"ہر وقت ہی ہوتی ہے۔"

"کیا بات کرتے ہیں؟"

"بہت خوش ہیں، بہت ہی خوش۔"

"میرے بارے میں کچھ کہتے ہیں؟" میں نے تذبذب سے پوچھا۔

"پوچھتے رہتے ہیں۔"

"کیا، کیا پوچھتے رہتے ہیں۔"

"تم سامنے نہیں ہوتے تو اُنھیں گھبراہٹ سی ہونے لگتی ہے۔"

"ہُوں۔" میں نے ہنکاری بھری اور چپ ہو گیا۔

"تم تو ایسے معلوم کر رہے ہو جیسے تمھاری اُن سے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ تم اُنھیں دیکھتے بھی جیسے نہیں ہو۔"

"سچ پوچھو تو ایسا ہی ہے، اتنے دنوں سے وہ ساتھ ہیں اور میری اُن سے کبھی ایک آدھ جملے سے زیادہ بات نہیں ہوئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، اُن سے کیا کہوں، اُن کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوگا۔"

"تمھیں اُن کا خیال رکھنا چاہیے۔"

"مجھ سے اُن کے سامنے بولا ہی نہیں جاتا۔"

"وہ تم سے بہت سی باتیں کرنے کے آرزومند ہوں گے۔"

"ہو سکتا ہے لیکن زرّیں! مجھے ..... مجھے اُن سے ڈر لگتا ہے۔" وہ کھِل کھلا کے ہنس پڑی۔ کمرے میں جیسے ستار سے جھنجھنا گئے۔

"میں تم سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"تمھیں تو شاید سبھی سے ڈر لگتا ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"ہاں زرّیں!" میری آواز ڈوب گئی۔ "شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔"

"یا شاید تم اپنے آپ سے ہی اتنی باتیں کر لیتے ہو کہ پھر کسی اور سے کچھ کہنے سُننے کو دل نہیں کرتا ہوگا۔"

میں اُس کی صورت دیکھنے لگا اور میرا جی چاہا کہ اپنا منہ کھسوٹ لوں۔ آتے ہوئے میں سوچ رہا تھا، اب کے زرّیں سے ڈھیر سی باتیں کروں گا۔ اُس سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ زرّیں اپنے دل میں سمجھتی ہوگی کہ میں اُس پر اعتبار نہیں کرتا یا اُسے دُور سمجھتا ہوں۔ ہر بار فیض آباد آتے وقت میں ایسا ہی سوچتا تھا اور ہر بار میری زبان پر فالج سا گر جاتا تھا۔ "زرّیں! تم، تم نہ جانے کیا سوچتی ہوگی، میں جانتا ہوں، اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے جذباتی انداز میں کہا۔

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" وہ سراسیمگی سے بولی۔

"میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں، میں تمھیں کیا بتاؤں زرّیں۔"

"میں سمجھتی ہوں۔" اُس نے مجھے کچھ کہنے نہیں دیا۔

"کیا سمجھتی ہو؟"

"مایوسی گناہ ہے، ایک دن ضرور ایسا آئے گا۔" وہ وثوق سے بولی۔ "جیسے تم اپنا کہہ سکو۔"

"شاید کبھی نہ آئے۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"اللہ میاں نے چاہا تو ضرور آئے گا۔"

"کوئی اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتا ہے۔"

"اباجان کے مِل جانے کے بعد ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔"

"شاید میں بہت تھک گیا ہوں زرّیں!" میں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب میرا دل کچھ اور چاہتا ہے۔"

"کیا چاہتا ہے؟"

"مرجانے کو چاہتا ہے، مجھے سنکھیا دے دو۔"

"تم نے پھر ایسی باتیں شروع کر دیں۔" وہ بے چینی سے بولی۔

"میں سب کو بہت دُکھ دیتا ہوں، تم سمجھتی ہو، مجھے اِس کا احساس نہیں ہے۔ میری وجہ سے کتنے لوگ پریشان رہتے ہیں، مر تک جاتے ہیں۔"

"مرنا تو سب ہی کو ایک دن ہے، جس کا وقت آئے گا، اُسے کون روکے گا۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو کسی کے لیے مر تک جاتے ہیں۔"

"جو چاہے کہہ لو اور آدمی خود کو کس طرح تسلی دے۔"

"تم بھی تو دوسروں کے لیے خود کو داؤ پر لگا دیتے ہو، دوسرے بھی تو تمھیں تنگ کرتے ہیں، وہ نہیں سوچتے ہوں گے کہ مر جائیں تو شاید تمھیں کچھ سکون مل جائے، تمھارا بوجھ کچھ کم ہو جائے۔"

"زرّیں!" میری آواز حلق میں پھنس گئی۔

"سبھی تمھارے لیے دعائیں کرتے ہیں۔" وہ ڈگمگاتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"لیکن میں تو کسی کے لیے کچھ بھی نہیں کرتا، میں نے تمھارے لیے کیا کیا ہے۔ میرا جی تمھارے لیے بہت کچھ کرنے کو چاہتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تم ہر وقت خوش رہو۔ مجھے معلوم نہیں کہ تم یہاں کس طرح رہتی ہو، تمھیں میرا، میرا اتنا خیال ہے۔ زرّیں! تم مجھے بہت یاد آتی تھیں۔ کاش! کاش میں ہمیشہ تمھارے پاس رہتا اور تمھارے ماتھے پر ایک شکن بھی نہ آنے دیتا۔ میں تمھارے لیے..." میں نہ جانے کیا کیا کہہ گیا تھا۔ اُس کی لبریز آنکھیں دیکھ کے میری زبان ٹھٹھر گئی۔ اُس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔

میں پلنگ سے اُٹھ کے بے اختیار اُس کے پاس پہنچ گیا اور میں نے اُس کے شانے تھام کے اُسے اُٹھا لیا، زرّیں کو چکر سا آگیا تھا۔ میرے ہاتھ بھی کپکپانے لگے تھے۔ میں نے اُسے جلدی سے پھر کرسی پر بٹھا دیا۔ اُس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔ میں فرش پر اُس کے پیروں کے نزدیک بیٹھ کے ہانپنے لگا اور پتا نہیں مجھے کیا ہوا، میرا سر اُس کے پیروں پر جھک گیا۔ میں اُس کے پیروں پر اپنا سر رکھ کے رونا چاہتا تھا کہ اُس نے پاؤں کھینچ لیے اور کرسی سے اُٹھ کے خود بھی میرے مقابل فرش پر بیٹھ گئی اور گھٹنوں میں منہ چھپا کے سسکنے لگی۔ میں بیٹھا اُسے تکتا رہا۔ میرا سارا جسم بے جان سا ہو گیا تھا۔ بے شمار لمحے گزر گئے ہوں گے۔ زرّیں کو دیکھنے کوئی بھی اِس طرف آسکتا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ "مت... زرّیں! خدا کے لیے مت رو۔" میں نے بدقت کہا۔ "تمھیں رُلانا مقصود نہیں تھا۔ میں تو تمھیں بتانا چاہتا تھا کہ تم... تم کہیں... کہیں مجھے..."

"کچھ مت کہو، مجھے معلوم ہے۔" وہ ٹوٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"میں نے سوچا ہے، صرف ایک بار اور جاؤں گا پھر ہمیشہ آجاؤں گا۔"

"خدا نے چاہا تو تمھیں پھر جانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی اور اگر، اگر خدانخواستہ تم یونہی واپس آ گئے تو میں تم سے دوبارہ جانے کو کہوں گی۔ کیا اِس سے بڑا کوئی اور مقصد ہو سکتا ہے؟"

"زرّیں! تم، تم کتنی..." میرے ہونٹ بھنچ کے رہ گئے۔

"کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟" وہ سادگی سے بولی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو مگر زمین بہت بڑی ہے۔"

"آدمی کا حوصلہ زمین سے بڑا ہوتا ہے۔ کاش میں بھی تمھارے ساتھ چلتی۔"

"ضرور لے چلتا، تمھیں اندازہ نہیں کہ کہاں کہاں جانا پڑتا ہے۔ گلیوں میں، بازاروں میں، کیسے کیسے گلی کوچوں میں، کبھی اِس دروازے کبھی اُس دروازے۔ صبح یہاں، شام وہاں، بے منزل۔"

"مجھے اندازہ ہے لیکن جلدی جلدی گھر تو واپس آسکتے ہو۔"

"ہر بار یہ خیال آتا ہے کہ یہاں تک آ گئے ہیں تو اور آگے دیکھ لیں، اِسی میں وقت گزر جاتا ہے۔ کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔"

وہ اپنی گونجتی، کھنکتی آواز میں مجھے تسلیاں دیتی رہی۔ میری خاموشی پر اُس نے موضوع بدل دیا اور خانم، نیساں، زہرا وغیرہ کی باتیں کرنے لگی۔ اِس طرح کبھی اُس نے مجھ سے اتنی باتیں نہیں کی تھیں۔ کمرے میں جیسے کوئی مینا چہچہا رہی تھی۔ مجھے یہ سب عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ مائیوں میں بیٹھی دلھن کے مانند سمٹی بیٹھی تھی اور اُس کی پلکیں پٹ پٹ جھپک رہی تھیں۔ گھڑی نے دو بجائے تو وہ چونک اُٹھی۔ "میں اب جاتی ہوں۔"

"کچھ دیر اور بیٹھو۔"

"بابا کی دوائی کا وقت ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے، ٹھیک چھ چھ گھنٹے بعد انھیں گولیاں دیتے رہنا چاہیے، تواتر میں فرق نہیں آنا چاہیے۔"

"میں تمھیں پہنچا آتا ہوں۔"

"اب تم آرام کرو، رات بہت ہو گئی ہے۔"

"رات تمھارے لیے نہیں ہوئی؟"

"مجھے دن میں کون سا کام ہوتا ہے۔"

"اور میں تو یہاں دن بھر بچھاڑا چلا مارتا رہتا ہوں۔"

اُس نے مسکراتی، جھلملاتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور دروازے تک جاتے جاتے بولی۔ "دودھ پی لینا۔"

دالان میں چاندنی چٹک رہی تھی اور خنک ہوا چل رہی تھی۔ مردانے تک وہ میرے ساتھ چلتی رہی۔ سارے کمرے بند تھے۔ میں نے سوچا، کہوں، تجمل کو دوا پلا کے پھر واپس آ جائے، مجھے بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں اور نیند بھی نہیں آ رہی۔ تجمل کے کمرے کے دروازے پر اُس نے ہلکی سی تھپکی دی اور پلٹ کے مجھے سرگوشی میں شب بخیر کہتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

صبح ناشتے کے بعد ہم سب تجمل کے پاس چوکی پر بیٹھے تھے۔ تجمل نے اپنا پیر کھول رکھا تھا اور دبا دبا کے دیکھ رہا تھا۔ مُرجھا گیا تھا۔ اتفاق سے اُس وقت مردانے میں، پیرو، زورا، رئی، اباجان اور میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ چار دن کی چھٹی کے بعد ارشد جہاں گیر کو پڑھانے کے لیے لائبریری میں چلا گیا تھا، منیر علی تھوڑی دیر پہلے کسی کام سے اُٹھ کے اندر چلے گئے تھے۔ تجمل نے اباجان سے کہا۔ "آپ، آپ چلے جاؤ بابا!" وہ اپنا پیر ٹھونکتے ہوئے بولا۔ "ابھی اِدھر دیکھ لو، سب ٹھیک ہے۔ بٹیا جانے دیتی تو میں بھی آپ کے ساتھ ہو جاتا، پر پیرو دادا تو ساتھ ہے۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔

"اپن کا اِدھر سے چھوٹنے کو جی نہیں بولتا۔" پیرو نے اُداسی سے کہا۔ "بمبئی سے نکلے ہوئے دن ہو گئے دادا! وہ تمبوڑا ماچھی بھی دکھ گیا ہو گا، گیتا اور رانی بھی دروازہ دیکھتی ہوں گی۔"

"ایسا تو اپن بھی سوچتا ہے تجمل بھائی۔"

"پھر آجانا۔"

"ٹھیک ہے، جیسا تم بولتا ہے۔"

"لیکن مجھے، مجھے بھی آپ لوگوں سے کچھ کہنا تھا۔" اباجان سلسلے ہوئے بولے۔

"بولو بابا!" پیرو نے اضطراب سے کہا۔

"مناسب لفظ نہیں مل رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا، کس طرح کہنا چاہیے۔"

اباجان کی زبان اٹک رہی تھی۔ "یہاں وہ سب لوگ، جامو وغیرہ بھی موجود نہیں ہیں لیکن بہرحال آپ تو یہیں ہیں، خدا کے لیے کچھ اور مت سمجھیے۔ میری درخواست ہے کہ..."

"بولو بابا! ایسی کیا بات ہے۔" تجمل تردد سے بولا۔

"میری خواہش ہے کہ اُن..." اباجان کہتے کہتے پھر رُک گئے۔ "میری خوشی اِسی میں ہو گی اگر آپ۔" چند لمحوں کے توقف سے وہ دھیمی آواز میں بولے۔ "اگر ان پتھروں میں بھی شریک ہوں۔"

"بس بس بڑے صاحب!" تجمل کا قہقہہ مردانے میں گونجنے لگا۔ "دادا! سُنتے ہو، بابا کیا بولتے ہیں۔"

"سُنتا ہے تجمل بھائی!"

اباجان کے چہرے پر سُرخی چھا گئی۔ "آپ نے انکار کیا تو میرے لیے بھی یہ پتھر رہیں گے۔ یہ بہت ہیں، پشتوں تک چلیں گے اور ختم نہیں ہوں گے۔ میں انھیں رکھ کے کیا کروں گا۔ میں اکیلا انھیں اتنی بڑی تعداد میں لا بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ سب آپ..."

"رہنے دو بابا!" تجمل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ابھی بس کرو۔"

"انکار کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"نہیں آئے گی بابا! نہیں آئے گی۔"

"آخر آپ کو عذر کیوں ہے؟"

"ابھی کیا بولیں بابا!" تجمل نے تنک کے کہا اور چاقو نکال کے بولا۔ "اپنے کو اِس سکے کی لت پڑ گئی ہے۔ یہی اپنا دھن ہے۔"

اباجان متذبذب نظروں سے تجمل کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"ہم تو اُدھر آپ کو دیکھنے گیا تھا بابا! گیتا کی قسم لے لو، اپنے من میں کوئی چکر ٹکر نہیں تھا۔"

"مجھے علم ہے لیکن کیا یہ اچھا نہیں ہو گا کہ ہم سبھی اِس میں شریک ہوں کیونکہ سب اِس میں برابر کے شریک رہے ہیں۔ شاید وہیں میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے اُن سے زیادہ اپنے کھوئے ہوئے کو دیکھنے کی جستجو تھی مگر یہ جستجو بھی کسی سبب سے تھی۔ بے شک سب سے بڑا سبب یہی سب کچھ تھا لیکن یقین کیجیے، میرے دماغ میں اتنا کچھ نہیں تھا، نہ میری استطاعت تھی کہ میں اتنا کچھ لا سکوں۔ یہ دُنیا کے بیش قیمت نوادر ہیں۔ مجھے تھوڑی بہت شُدبُد ہے مگر اِس کی صحیح قیمت کا اندازہ کرنا میرے لیے بھی مشکل ہے، اِس سے ہم نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں اور اِسے استعمال کرنے کا، میں جہاں تک سمجھتا ہوں، ہمیں جائز حق پہنچتا ہے۔ جس چیز کی طرف آپ اشارہ کر رہے ہیں اُس

میں اس کی کارفرمائی کا بھی دخل ہے، نہیں ہے کیا؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں یہ سب سمیٹ کے خوش رہ سکوں گا؟ مجھے سکون مل جائے گا؟"

۔ ابھی آپ ایسا کیوں سوچتے ہو؟ آپ کے پاس ہے تو اپنے پاس ہے۔ اِدھر سب آپ کے لاڈلے جیسے ہیں، ضرورت ہوئے گی تو آپ ہی کے در پہ آئیں گے، اپنے بابا کے پاس۔"

اباجان اصرار کرتے رہے۔ مامی اور زورا بھی تشدد سے بیچ میں بولنے لگے تھے، انھوں نے اباجان کی کوئی بات نہیں سُنی۔ کہنے لگے، سمجھ لیجیے، ہمارا حصّہ آپ کے پاس امانت ہے۔ طرح طرح کی دلیلیں دے کے انھیں خاموش کر دیا۔ میں چپ سُنتا رہا۔

اُسی دن کچھ دیر بعد ہی اباجان، میں اور بیرو تہہ خانے میں داخل ہوئے۔ بیرو اور میں نے تھیلے کھولے۔ اباجان نے جھیلی پہ جانچ کے دس بارہ پتھر الگ کر لیے اور اُسی دن دوپہر کو ہم تینوں لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ وہاں حضرت گنج کے علاقے میں واقع کارلٹن ہوٹل میں ٹھیرے، یہ لکھنؤ کا سب سے بڑا ہوٹل تھا۔ شام کو ہم پہنچے تھے اور شام ہی کو میں اور بیرو مزانے کی طرف نکل گئے۔ رات تک جوہریوں کی آمد کا سلسلہ بندھا رہا۔ دوسرے دن صبح اُن کے ساتھ چند نواب بھی آئے۔ تیسرے دن رات کو ہم واپس فیض آباد پہنچے تو تینوں کی بنڈلیوں میں ڈھائی لاکھ روپے موجود تھے۔ اباجان کو بہت جلدی تھی، سودے بازی کرتے تو شاید تین لاکھ تک رقم ہو جاتی۔ چلتے وقت انھوں نے لکھنؤ سے سب گھر والوں کے لیے بہت سی چیزیں خریدیں۔ سب کے لیے سونے کی چوڑیاں، کپڑے، جوتیاں، پھل اور مٹھائیاں، کچھ رقم رکھ کے باقی سب انھوں نے منیر علی کے پاس جمع کرا دی۔ منیر علی بھی نوٹوں کی اتنی گڈّیاں دیکھ کے حیرت زدہ رہ گئے۔

راستے میں اُن کی اور بیرو کی باتوں سے مجھے پتہ چل گیا تھا کہ وہ فرخ، فریال، فارعہ اور اکبر کو بمبئی میں اپنے دوست مولوی محمد اکرم کے ہاں ٹھیرا آئے ہیں۔ مولوی محمد اکرم سے میں بھی ملا تھا۔ وہ نہایت شریف آدمی تھے۔ یقیناً اباجان کی نظر میں اُن سب کی حفاظت کے لیے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہوگی لیکن انھیں گھر سے نکلے ہوئے سال سے کم کیا لگا ہوگا، چھ مہینے تو ہمی کو ہو گئے تھے۔ ہم پہنچے تھے تو وہ وہاں موجود تھے بھکشوؤں کے طور طریق سیکھنے کسی قافلے کے ساتھ جانے، تبت تک کے سفر، بڑے مندر اور خزانے والے مندر تک رسائی حاصل کرنے میں انھیں سال سے زیادہ کا عرصہ بھی لگ سکتا ہے۔ جب سے میں نے یہ سُنا تھا، اس کے باوجود کہ میں مولوی اکرام کے گھر جا چکا تھا میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ میں یہ کیسے بھول سکتا تھا کہ فتی اسی علاقے سے گھر سے باہر نکلی تھی۔ مولوی اکرم کے رہن سہن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بس عزت سے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ اباجان نے چلتے ہوئے انھیں کوئی بڑی رقم دی ہوگی۔ میں جلد سے جلد بمبئی جانا چاہتا تھا، چاہے اباجان ابھی جانے کا ارادہ نہ کریں مگر اباجان نے دوسرے ہی دن صبح بمبئی جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ زرّیں، خانم، نیساں اور زہرہ نے سفر کی تیاری شروع کر دی تھی۔ جاں گیر بھی ہمارے ساتھ جانے کے لیے مچل رہا تھا، خانم کے کہنے پہ چپ ہو گیا۔ صرف ایک رات درمیان میں تھی مگر مجھ سے یہ رات کاٹی نہ جاتی تھی۔ رات کے کھانے کے وقت ہم گھر پہنچ گئے تھے، مجھ سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ فرخ، فریال، فارعہ اور اکبر کے چہرے نظروں میں گھوم رہے تھے۔ اب وہ بہت بڑے ہو گئے ہوں گے۔ مجھے شاید پہچان بھی نہ پائیں۔ کاش میں اباجان اور بیرو کے درمیان ریل میں اِن سب کے متعلق ہونے والی باتیں نہ سُن پاتا، اسی لیے میں اباجان سے نہیں پوچھتا تھا۔

کھانے کے بعد خانم میرے قریب آ کے چپکے سے بولی۔

۔ بابر میاں! مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

۔ کیا بات ہے آپی!" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

۔ تم میرے کمرے میں آ جانا ویسے کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

۔ پھر بھی کچھ تو بتائیے؟"

۔ پریشان مت ہو۔ شاید میں تم سے ابھی نہ کہتی مگر تم جا رہے ہو اس لیے تمھیں بتا دینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔"

میرے جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔

رات گئے تک خانم کو فرصت نہیں ملی۔ میں کئی بار اُس کے کمرے کی طرف گیا لیکن وہاں کوئی نہ کوئی بیٹھا ہوتا تھا۔ ضرور ایسی کوئی بات تھی جو خانم صرف مجھی سے کرنا چاہتی تھی۔ جب تک میں خانم کے کمرے میں نہیں گیا، مجھے وحشت ہوتی رہی۔ "میں نے تمھیں پریشان کر دیا۔" خانم مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ۔ میں نے کہا تھا ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے تم کھڑے کیوں ہو، اطمینان سے بیٹھو۔"

میں نے اُس کی ہدایت پر عمل کیا۔

۔ بات یہ ہے کہ ابھی کوئی دو ہفتے ہوئے، باوا نے مجھ سے ایک مشورہ لیا تھا۔" خانم رازدارانہ انداز میں بولی۔

۔ کیسا مشورہ؟"

۔ انھوں نے زرّیں کا ذکر کیا تھا۔ کہہ رہے تھے، میری خواہش ہے کہ زرّیں کو اپنی بٹیا بنالوں، ویسے وہ مجھے زہرہ ہی کی طرح عزیز ہے۔ میں تم سے مشورہ کر رہا ہوں، بات نہیں دے رہا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ بہت نازک معاملے ہوتے ہیں اور پھر ایک گھر میں رہنے سے تو اور بھی زیادہ نازک۔ وہ تنویر علی کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ جی چاہتا ہے زرّیں گھر سے کہیں اور نہ جائے، البتہ جب تک میری طرف سے اشارہ نہیں ملے گا، وہ اپنی تمنا کبھی زبان پر نہیں لائیں گے اور اگر میری طرف سے انھیں کوئی اُمید افزا جواب نہ ملا تو وہ اس کا بالکل بُرا نہیں مانیں گے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انھوں نے بھی دوبارہ اشارۃً کنایۃً بھی مجھ سے نہیں پوچھا۔ میں نے تمھیں یہ سب اس لیے بتایا ہے کہ تم سے مشورہ کروں؟"

۔ آپی! میرا مشورہ، میں... میں۔" میں نے سٹ پٹاتے ہوئے کہا۔

۔ میں نے کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ تنویر لائق لڑکا ہے، سب کا دیکھا بھالا ہے۔ میں نے سوچا تم سے ذکر کر دوں۔"

۔ میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں، آپ تجمّل بھائی اور خود زرّیں سے پوچھ لیجیے۔" میری آواز بھرّانے لگی تھی۔

۔ مجھ سے پوچھا نہیں جاتا بابر میاں!"

۔ پھر، پھر میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

۔ تم نے سُنا ہوگا کہ لڑکیاں گھر میں اُگی بیری کی طرح ہوتی ہیں۔ پتھر تو آئیں گے اور یہ کوئی پتھر نہیں۔ اِسی طرح رشتے ہوتے ہیں۔ لڑکیوں بالیوں کو دیر تک گھر میں بٹھانا اچھا نہیں سمجھا جاتا، کبھی نہ کبھی تو ہم سب کو اس مسئلے پر غور کرنا ہوگا۔"

مجھ سے کوئی جواب نہ دیا جا سکا۔

۔ تم سوچ لو، باوا کو کہے ہوئے دو ہفتے سے زیادہ ہو رہے ہیں۔ انھوں نے لوٹ کے نہیں پوچھا، وہ بہت سمجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ دوبارہ نہیں کہیں گے لیکن بالفرض انھوں نے پھر ذکر چھیڑا تو میں کیا جواب دوں؟"

۔ آپ جو مناسب سمجھیں، کہہ دیجیے گا۔"

۔ میری تو عقل کام نہیں کرتی۔"

۔ مجھ سے کچھ مت پوچھیے، میں کیا بتا سکتا ہوں۔"

۔ زرّیں کا ہمارے سوا کون ہے۔"

۔ آپ مجھ سے زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہیں۔"

۔ مگر تم نے اس بارے میں کبھی غور تو کیا ہوگا؟

۔ شاید کبھی نہیں۔"

۔ تمھاری رائے ہو تو میں بابا (تجمّل) سے ذکر کروں۔"

۔ آپ کر دیجیے، چاہیں تو پہلے زرّیں سے پوچھ لیجیے۔" میں نے یوں ہی کہہ دیا۔

۔ زرّیں بے چاری کیا کہے گی۔"

۔ تو پھر جیسا آپ کا جی چاہے۔"

۔ تم بھی کچھ بتاؤ، تمھاری کیا رائے ہے۔ آگے بات کروں یا چپ رہوں؟ ضروری نہیں کہ تم فوراً جواب دو۔ میں نے کہا نا کہ انھوں نے باقاعدہ بات نہیں کی ہے۔ محض اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اُن کی جگہ میں ہوتی تو میں بھی یہی کرتی۔ زرّیں ہے ہی اتنی اچھی، ہر کوئی اُسے اپنے گھر کی دُلھن بنانا چاہے گا۔"

نیساں دھمکتی ہوئی کمرے میں اچانک داخل ہوئی تو خانم چپ ہو گئی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ نیساں نہ آتی تو نہ جانے کب تک مجھے خانم کی یہ اجنبی اجنبی باتیں سُننی پڑتیں۔ خانم سے کچھ کہے بغیر میں نیساں ہی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ "آپ یہاں چھپے بیٹھے تھے، ہم نے حویلی کا کونا کونا چھان لیا۔" نیساں چہکتے ہوئے بولی اور میری اُنگلی پکڑے پکڑے ایک طرف چل پڑی۔ پھر مجھے اُس وقت کچھ ہوش آیا جب میں نے اپنے سامنے زہرہ کو کھڑے دیکھا۔ زہرہ جیسے میرے ہی انتظار میں کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کے اُس کا کُندن دمکنے لگا۔ "لائیے زہرہ آپا!" نیساں شوخی سے بولی۔ "بابر بھائی آپ ذرا آنکھیں تو بند کیجیے۔ بند کیجیے نا۔" میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دوبارہ نیساں کے حکم پر کھولیں تو وہ میرے سامنے ایک سوئٹر لہرا رہی تھی۔ "بتائیے، کیسا ہے؟"

۔ اچھا ہے، بہت اچھا..."

۔ رنگ پسند ہے آپ کو؟"

۔ ہاں، سب کچھ پسند ہے۔"

۔ زہرہ آپا نے اپنے ہاتھوں سے بُنا ہے۔ ذرا آپ اِسے پہن کے دکھائیے۔" وہ مچلتے ہوئے بولی۔ میں نے اُس سے حجت نہیں کی ورنہ وہ ضد کرنے لگتی۔ اُس نے نیچے سے اور کندھوں سے سوئٹر کھینچ کے درست کیا اور گھوم گھوم کے جائزہ لینے لگی۔ "سچ بابر بھائی! آپ اِس میں کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔" وہ جوش میں بولی۔ "ایک رتی کم نہ زیادہ، بالکل نپا تلا آیا ہے۔ معلوم ہے، زہرہ آپا نے صرف اندازے سے بنایا ہے۔"

میں نے زہرہ کو ایک نظر دیکھا، وہ سر جھکائے اُنگلیاں چٹخا رہی تھی اور ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ میں اُس کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا۔

"زہرہ آپا کہتی ہیں کہ آپ اُن لوگوں کو لے کے جلدی آئیے گا، سب انھیں دیکھنے کے لیے بے چین ہیں۔" نیساں تیز تیز لہجے میں بولی۔ میں نے اُس سے یہ بھی نہیں کہا کہ زہرہ خود کیوں نہیں بولتی، وہ گونگی تو نہیں ہے۔ نیساں کو شاید احساس

ہو گیا کہ میں اُس کی باتیں توجہ سے نہیں سُن رہا ہوں، اُس کا چہرہ بجھنے لگا، وہ رُک کے مُشتاق آنکھوں سے مجھے تکنے لگی۔ وہ پریشان سی ہو گئی تھی، میری طبیعت پوچھنے لگی۔ میں نے اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا، اُس کے ہاتھ چومے اور اس سے پہلے کہ اُس کی مُتمنی آنکھیں چھلکنے لگتیں، میں منہ پھیر کے چلا آیا اور اپنے کمرے میں آ کے میں نے دروازہ بند کر لیا۔ مجھے اپنا جسم خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ کھوکھلا، راکھ کا ڈھیر۔ ساری رات میں دیواروں پر روشنی کے لرزتے سائے دیکھتا رہا۔ کسی نے دروازے پر دستک دی تو پہلی دستک پر میں نے اُٹھ کے دروازہ کھول دیا۔ میں سمجھا، شاید زرّیں ہو گی مگر وہ جہاں گیر تھا اور یہ بتانے آیا تھا کہ اب مجھے تیار ہو جانا چاہیے۔ میں نے چونک کر اُسے دیکھا، بالکل دھیان نہیں رہا تھا کہ صبح ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا ہے۔

گاڑی صبح چھ بجے جاتی تھی۔

ہم ٹھیک ساڑھے چار بجے حویلی سے نکل گئے تھے۔ رات کو شاید کوئی نہیں سویا تھا۔ منیر علی، ارشد، جہاں گیر، جمرو اور ڈھے کے دوسرے لوگ ہمیں اسٹیشن تک رخصت کرنے آئے تھے۔ گاڑی وقت پہ روانہ ہوئی۔ ہمیں ایک ڈبّا خالی مل گیا تھا۔ مُجھل کی ہدایت پر پیرو نے ٹکٹ فرسٹ کلاس ہی کے لیے تھے۔ نشستیں بہت آرام دہ تھیں۔ کچھ دیر تک وہ سب باتیں کرتے رہے پھر برتھوں پر لیٹ گئے۔ لکھنؤ اسٹیشن گزر گیا اور سندیلہ آیا تو مجھے سمت کا اندازہ ہوا، لکھنؤ سے براہِ راست بمبئی جانے کے بجائے ہم دلّی کی طرف جا رہے تھے گویا دلّی سے پھر ہمیں بمبئی جانے والی گاڑی میں بیٹھنا تھا۔ اسٹیشن پہ اسٹیشن گزرتے رہے۔ بریلی اسٹیشن پر مارتی نے مٹھیاں کھول دیں۔ سب یہ دیکھ کے ہنسنے لگے کہ زرّیں نے اتنا بہت سا کھانا ساتھ کر دیا ہے۔ میں بھی دسترخوان پر بیٹھ گیا اور آخر تک اُن کا ساتھ دیتا رہا۔ یہ بریلی اسٹیشن تھا۔ بریلی سے مُراد آباد صرف باون میل کی دوری پر واقع ہے۔ درمیان میں رام پور کا شہر آئے گا، پھر مُراد آباد۔ مراد آباد کی طرف سے گزرنے کے خیال سے میرے ذہن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اتنے دن گزر گئے تھے۔ جیسلمیر سے منیر علی کو لے کے ہم سیدھے فیض آباد چلے آئے تھے، اس کے بعد تبت کی طرف روانہ ہو گئے۔ مولوی صاحب کہیں اس عرصے میں اپنے شہر واپس نہ آ گئے ہوں، انھیں کہیں عافیت نہ ملی ہو تو آخر انھوں نے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ گاڑی بریلی سے چل چکی تھی، جیسے جیسے مُراد آباد قریب آتا جا رہا تھا، میرا گمان جڑ پکڑتا جا رہا تھا۔ ایک نظر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ کتنا فرق پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ چند گھنٹوں کا مگر میں ابّا جان سے کس طرح کہہ سکتا تھا کہ ایک پہر کے لیے مُراد آباد رُک جائیے۔ یوں بھی ہمیں شام کو دلّی پہنچ کے رات کے ۹ بجے تک بمبئی کی گاڑی کا انتظار کرنا تھا اور صبح کو نہیں، شام کو ہم بمبئی پہنچیں تو کون سا گھاٹا ہو جائے گا، بعد میں پھر کب اس طرف آنا ہو۔ میں سوچتا رہا کہ ان سے کس طرح کہوں، وہ کُرید کرنے لگیں گے۔ گاڑی تیز رفتاری سے مراد آباد کی سمت بڑھ رہی تھی، میری بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی، کھانے کے بعد ابّا جان نے سامنے کی برتھ پر لیٹ کے آنکھیں موندیں تو مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے پیرو کو جھنجھوڑا۔ ”دادا! میری ایک بات مانو گے؟“ میں نے اُس سے سرگوشی میں التجا کی۔

”بول جانی!“ وہ تعجب سے بولا۔ ”کوئی گھپلا ہے!“

”گھپلا دپلا کچھ نہیں، تم ابّا جان سے کوئی بہانہ کر کے کچھ دیر کے لیے مراد آباد رُک جاؤ تو تمھارا بڑا احسان ہو گا، انھیں مت بتانا کہ میں نے کہا ہے۔ مجھے وہاں بس تھوڑی دیر لگے گی۔ شام کو مراد آباد سے ایک گاڑی پانچ چھ بجے کے قریب دلّی جاتی ہے، اُس سے بھی بمبئی کی گاڑی کا میل بنتا ہے۔ سفر میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ دادا! ابّا جان کو تم کسی طرح سمجھا دو۔“

پیرو نے ایک دو لمحے کے لیے سوچا اور عجیب سی نظروں سے میری صورت دیکھتے ہوئے سر ہلانے لگا۔ وہ ابّا جان کے پاس جانے کے لیے اُٹھ گیا تو میں رُخ بدل کے کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا معلوم نہیں، پیرو نے ابّا جان سے کیا کہا۔ مجھے تبھی پتہ چلا جب اُس نے اُوپر کی برتھوں پر لیٹے ہوئے مارتی اور زورا سے نیچے آ کے سامان سمیٹنے کو کہا۔

رام پور اسٹیشن سے مُراد آباد کا فاصلہ صرف سولہ میل تھا آدھے گھنٹے میں گاڑی پہنچ جاتی تھی مگر یہ آدھا گھنٹا جیسے پھیل گیا تھا۔ کٹ گھر کے اسٹیشن سے پہلے رام گنگا کے پُل پر گاڑی ٹھہر گئی۔ دریا میں پانی زیادہ تھا۔ جب تک پُل صاف نہیں ہو گیا، گاڑی کھڑی رہی پھر گھسٹ گھسٹ کے چلنے لگی۔ میں اکیلا ہوتا تو کٹ گھر پر ہی اُتر جاتا۔ یہاں سے مولوی صاحب کا محلّہ فیض گنج زیادہ قریب تھا۔ تانگا دس منٹ میں مجھے اُن کے محلّے پہنچا دیتا۔ میری مالا کے دانے سینے میں چبھ رہے تھے لو میرا رُواں رُواں کانپ رہا تھا۔ کیا عجب کہ زرّیں کی بات سچ ہی ہو جائے۔

دس منٹ کی تاخیر سے گاڑی مُراد آباد کے اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ اسٹیشن کے سامنے ہی اسلامیہ مسافر خانہ تھا۔ میں وہاں پہلے بھی جا چکا تھا۔ ہمارے پاس سامان زیادہ نہیں تھا۔ ایک ہی

قلی نے اُسے مسافر خانے تک پہنچا دیا۔ مسافر خانے کے منتظم کو سب صوفی جی کہتے تھے۔ رجسٹر پر انھوں نے ہمارے ناموں کا ندراج کیا۔ پیرو، زورا اور مارتی کے نام ہم نے بدل دیے، خواہ مخواہ وہ چونکتے۔ اُوپر کی منزل کے ایک روشن اور صاف ستھرے کمرے ں ابّا جان، زورا اور مارتی کو ٹھہرا کے میں اور پیرو فوراً مسافر خانے سے نکل آئے اور تانگے پر بیٹھ کے محلّہ فیض گنج جا کے ہی رُکے مولوی صاحب کے مکان کی گلی میں پہنچنے میں ہمیں دو چار نٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ میں نے دھڑکتے ہاتھوں سے دروازہ ٹ کھٹایا، اندر سے کسی لڑکی کی آواز آئی، میرا دل دھک دھک ر رہا تھا۔ ”کیا مولوی محمد شفیق صاحب یہیں رہتے ہیں؟“ میں نے لکاتی آواز میں پوچھا۔

دوسرے ہی لمحے میرا دل ڈوبنے لگا۔ ”مولوی محمد شفیق احب“۔ اُس نے کواڑ کی آڑ میں کھڑے ہو کے تذبذب سے ہرایا۔ ”اب وہ یہاں نہیں رہتے، ہم نے یہ مکان اُن سے ریدلیا ہے۔“

”آپ نے خرید لیا ہے! کب؟“

”ڈیڑھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوا۔“

”کیا وہ یہاں آئے تھے؟“

”جی ہاں، اُنھی سے ہم نے لیا ہے۔“

”آپ کے گھر میں اِس وقت کوئی مرد نہیں ہے؟“

”بھائی سو رہے ہیں۔“

”کب تک اُٹھ جائیں گے؟“

”آپ ابّا جی کی دُکان پہ چلے جائیے، منڈی چوک میں اُن بسلاخانے کی دکان ہے۔“

”کس نام سے؟“

”وہ جھجک کے بولی۔ ”حافظ صاحب کی دُکان کسی سے پوچھ یے گا۔“

”آپ کا بہت شکریہ۔“

”آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟“

”ہم پردیسی ہیں، مولوی شفیق صاحب کے واقف کار۔“

منڈی چوک بھی دُور نہیں تھا۔ حافظ صاحب کی دُکان ن کرنے میں ہمیں دیر نہیں لگی۔ دُکان پر ایک پستہ قد شخص ا ہوا تھا۔ چھوٹی خشخشی داڑھی، سرمئی رنگ، سر پہ بید کی ٹوپی۔ ی صاحب کا نام سُن کے وہ گھبرا سا گیا۔ ”سُنا ہے آپ ہی اُن کا مکان خریدا ہے؟“

”جی ہاں! ابھی حال میں خریدا ہے۔“ وہ کسی قدر ترشی سے بولا۔

”تو کیا وہ یہاں آئے تھے؟“

”اُن کے بغیر سودا کیسے ہو سکتا تھا۔“

”کب آئے تھے؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”یہی کوئی ڈیڑھ مہینے پہلے کی بات ہے۔“

”پھر وہ کہاں چلے گئے؟“

”میں نہیں کہہ سکتا، وہ ایک عرصے بعد مراد آباد آئے تھے۔ صرف دو دن کے لیے مسافر خانے میں ٹھہرے تھے۔ برتلا سے آگے اُن کی کچھ زمین تھی اور یہ مکان، دونوں کا سودا کر کے واپس چلے گئے۔“

”زمین کن صاحب نے خریدی؟“

”میں واقف نہیں ہوں۔“ وہ اُلجھ کے بولے۔ ”البتہ مجھے اتنا علم ہے کہ انھوں نے زمین بھی بیچی ہے۔“

”کیا انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ کہاں سے آ رہے ہیں، کہاں رہتے ہیں؟ ظاہر ہے، آپ نے پوچھا تو ہو گا؟“

”حیدر آباد میں کہیں قیام بتا رہے تھے۔“

”حیدر آباد میں! وہاں اُن کی ایک بہن بھی رہتی تھیں، کیا وہ کوئی پتہ دے گئے ہیں؟“

”کاغذ پر انھوں نے مراد آباد ہی کا پتہ لکھوایا تھا۔“

”کیا اُن کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟“

”ہو سکتا ہے، میں نے عرض کیا نا، وہ مسافر خانے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کوئی نو دس سال میں وہ مراد آباد واپس آئے تھے۔ اِس عرصے میں دُنیا بدل گئی۔“

”لیکن میں کچھ اور پوچھ رہا ہوں۔“

”جو آپ پوچھ رہے ہیں، اُسی کا جواب دے رہا ہوں۔“

”وہ یہاں اور لوگوں سے بھی ملے ہوں گے، یہ اُن کا شہر ہے، کیا آپ مجھے چند ایسے لوگوں کے نام نہیں بتا سکتے ہیں جن سے وہ ملے ہوں؟ ممکن ہے، انھیں انھوں نے اپنا پتہ بتایا ہو۔ دیکھیے ہم بہت دُور سے آ رہے ہیں۔ ہمیں مولوی صاحب سے ایک ضروری کام ہے۔ آپ ہماری کوئی مدد کر سکتے ہوں تو مسافر سمجھ کے کر دیجیے۔ خدا آپ کو اِس کا اَجر دے گا۔“

”عزیزم! مجھے جو کچھ معلوم تھا، میں نے بتا دیا۔ مجھے مکان سے غرض تھی، کچھ اور جاننے بوجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اپنی ہی اُلجھنیں کیا کم ہیں، آپ چاہیں تو میں کچھ نام بتا تا ہوں، اِن لوگوں سے مل لیں مگر میرا خیال ہے، آپ کو ناکامی ہو گی۔ مولوی صاحب بہت جلدی میں آئے تھے۔ جلد سے جلد سودا کرنے کی فکر تھی۔ آئے اور چلے گئے۔“

اُس کے بتانے پر ہم دوبارہ فیض گنج گئے اور وہاں دو

تین آدمیوں سے ملے۔ مولوی صاحب کی اُن سے ملاقات ہوئی تھی اور اُنھیں اتنا ہی معلوم تھا، جتنا بساطی حافظ صاحب کو۔ مولوی صاحب بہت مجبوری ہی کی حالت میں یہاں آئے ہوں گے اور اُنھوں نے زیادہ لوگوں سے ملنا گوارا نہیں کیا ہوگا۔ اچانک میرے ذہن میں آیا کہ مولوی صاحب نے مسافر خانے میں مسافروں کی آمد و رفت کے رجسٹر پر اپنا پتہ ضرور لکھوایا ہوگا۔ میں اور پیرو کہیں اور جانے کے بجائے تانگے میں بیٹھ کے فوراً مسافر خانے واپس پہنچے۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن مہتمم صوفی جی ہمیں رجسٹر دکھانے سے کترانے لگے۔ میں نے بہت اِلتجا کی تو کہنے لگے: "آپ عادل صاحب سے مل لیجیے۔ وہ کہہ دیتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

عادل صاحب کا دفتر مسافر خانے کے وسط میں واقع تھا۔ وہ لمبے قد، گندمیں رنگ، کشادہ پیشانی کے ایک نرم خو شخص تھے۔ عمر چالیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ سفید بے داغ شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس تھے۔ میں نے اُن سے درخواست کی اور بتایا کہ مجھے مولوی صاحب کے پتے کی شدید ضرورت ہے، آپ کا بڑا کرم ہوگا۔"

اُنھوں نے صوفی جی کو اندر بُلا لیا اور مجھے رجسٹر دکھانے کو کہا۔ ڈیڑھ مہینے پہلے کے مسافروں کی فہرست دیکھ کے اِس کی تصدیق ہوگئی کہ مولوی صاحب مسافر خانے میں ٹھیرے تھے اور اُن کے ساتھ ایک بُرقع پوش خاتون بھی تھیں یعنی اُن کی بیگم۔

"کیا اُن کی بیگم بھی اُن کے ساتھ تھیں؟"

"رجسٹر تو یہی بتا رہا ہے جناب!" صوفی جی منہ بنا کے بولے۔

"کیا آپ نے اُنھیں دیکھا تھا؟"

"میاں!" وہ ناراضی سے بولے: "ہم یہاں آپ کے خیال میں دوسروں کی عورتوں کو تکتے رہتے ہیں؟ یہاں شُرفا ٹھیرتے ہیں۔"

رجسٹر پر لکھے ہوئے لفظ میرے سامنے تھے۔ اُنھیں دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ اگلے خانوں میں مولوی صاحب کا پتہ درج تھا۔

"آپ پتہ دیکھ رہے تھے؟" عادل صاحب نے مجھے ٹوکا۔ اُن کی آواز مجھے کہیں دُور سے آتی محسوس ہوئی۔

اُسی لمحے صوفی جی نے میرے سامنے سے رجسٹر اُٹھا لیا۔ پیرو دادا نے پیچھے سے مجھے کہنی ماری: "راجا! صاحب کیا پوچھ رہے ہیں؟"

میں نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے عادل صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے گھور رہے تھے۔ میں نے نہیں سُنا تھا کہ اُنھوں نے مجھ سے کیا کہا ہے۔

"اُنھی صاحب کا پتہ آپ کو درکار تھا؟" عادل صاحب تذبذب سے بولے۔

"ہاں!" میں نے سر جھکا کے ڈولتی آواز میں کہا۔

"آپ کو کچھ اور پوچھنا ہے؟"

"نہیں، کچھ اور نہیں۔" میں جلدی سے کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"روز بچاسوں مسافر آتے جاتے ہیں لیکن مولوی صاحب کا آنا مجھے یاد ہے۔ کچھ یوں بھی کہ ایک زمانے میں اُن کا تعلق بھی اِسی شہر سے تھا۔ میں اِن دِنوں مسافر خانے کی نئی عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں مصروف ہوں اِس لیے ایک ہی بار اُن سے ملاقات ہو سکی، وہ بھی سرسری۔ مولوی صاحب بھی کچھ جلدی میں تھے، دو تین ہی روز رہے ہوں گے۔" عادل صاحب جیسے اپنے آپ سے کہہ رہے تھے، اُن کی آواز دھیمی تھی۔ "مجھے کچھ بتائیے؟" وہ چونک کے بولے: "شاید میں آپ کے کسی کام آ سکوں۔"

"اپن اُس کی کھوج میں ہے۔" پیرو نے تیزی سے کہا۔ "ام وہ کچھ اور بولتا تھا کیا اپنا مطلب ہے کہ آپ؟..."

"نہیں" عادل صاحب پیرو کی بات کاٹ کے بولے: "ولا عرصہ ہوا، وہ یہ شہر چھوڑ کے جا چکے ہیں۔ پہلے بھی وہ گھومتے ہی رہتے تھے، پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ ایسے لوگ عموماً تنہائی پسند ہوتے ہیں۔ وہ مجھ سے خاصے بڑے ہیں۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ لیے دیے رہنے والے شخص ہیں۔ سلام دعا، مزاج پُرسی ہی تک بات ہوئی۔ مسافر خانے کی نئی عمارت کا نقشہ دیکھ کے بہت خوش ہوئے، کہنے لگے، سارے شمالی ہند میں یہ اپنی نوعیت کا واحد مسافر خانہ ہے۔ میں نے کہا، بس دُعا کیجیے، یہ کام کسی طرح تکمیل پا جائے۔ کوکب کے متعلق پوچھا جو مسافر خانے کی تعمیر میں پیش پیش ہیں۔ کوکب صاحب ایک مشاعرے میں امروہہ گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو مولوی صاحب جا چکے تھے۔ میں نے اُن سے مولوی صاحب کا ذکر کیا تو ملاقات نہ ہونے کا افسوس کرنے لگے۔ صورت یہ ہے جناب، یہاں از خود کوئی دفتر میں آ جاتا ہے تو ملاقات ہو جاتی ہے ورنہ اپنی جانب سے مسافروں کے معاملات میں غیر ضروری طور پر مخل نہیں ہوتے۔" چند لمحے رُک کے عادل صاحب بولے: "افسوس کہ اُن کے بارے میں مجھے کچھ اور معلوم نہیں ہے۔ کوئی اور خدمت ہو تو فرمائیں؟"

"آپ کا شکریہ صاحب!" پیرو نے سیلوٹ کے انداز میں سلام کرتے ہوئے کہا: "آپ کی مہربانی...."

میں عادل صاحب کو سلام کیے بغیر باہر چلا آیا۔ میرے ڈگمگا رہے تھے اور مجھے چکر سے آ رہے تھے۔ پیرو میرے ساتھ نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں وہ عادل صاحب سے اور کیا باتیں کر رہا تھا، خواہ مخواہ وہ کسی شک میں پڑ جاتے! مولوی صاحب کے بارے میں اُنھیں اِس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا، معلوم ہوتا تو چھپاتے نہیں۔ وہ طبیعت کے گھُنے، بات چھپانے والے آدمی نظر نہیں آتے تھے۔ میں مسافر خانے سے باہر اسٹیشن روڈ پر آ کے کھڑا ہو گیا۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی اور سارے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ سامنے ہی اسٹیشن تھا جہاں مسافروں کی بھیڑ لگی تھی۔ تانگے والوں کے شور میں ہر آواز دب گئی تھی۔ شاید ابھی ابھی کوئی گاڑی آئی تھی۔ ممکن ہے، آنے والی گاڑی کہیں آگے جا رہی ہو! یکایک میرے ذہن میں آیا، میں اسی گاڑی سے نکل سکتا ہوں۔ ابّا جان، زورا اور مارتی مسافر خانے کی اوپری منزل کے ایک کمرے میں موجود تھے۔ اِس سے پہلے کہ اُن میں سے کسی کی نظر مجھ پر پڑے، مجھے جلد سے جلد یہاں سے دُور ہو جانا چاہیے، اُوپر جاؤں گا تو مجھے اُنھی کے ساتھ جانا پڑے گا مگر ابّا جان کے خیال سے میں ٹھیرا رہا۔ اِس طرح میرے چلے جانے پر وہ بہت پریشان ہو جائیں گے۔ نہ جانے کیا کیا سوچیں اور کتنی دیر تک انتظار کرتے رہیں حالانکہ پیرو فوراً سمجھ جائے گا کہ میں کس طرف جا سکتا ہوں مگر وہ ابّا جان کو کس طرح مطمئن کر سکے گا۔ بہتر ہے کہ ایک رُقعہ لکھ کے کسی آدمی کے ہاتھ ابّا جان کے کمرے میں بھیج دوں کہ وہ میرا انتظار نہ کریں، میں چند روز بعد اُن سے بمبئی آ ملوں گا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے پیرو آ گیا اور میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے واپس اندر لے گیا۔ میں اُس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

چند منٹ بعد ہم سب سامان کے ساتھ مسافر خانے سے نکل آئے اور تیز قدموں سے اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگے۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ گاڑی تیار کھڑی تھی، ہمیں ایک دو منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو چھُوٹ جاتی۔ دو مسافروں کے سوا سارا ڈبّا خالی پڑا تھا۔ کچھ دُور تک تو گاڑی رینگ کے چلتی رہی پھر اُس نے رفتار پکڑ لی۔ مراد آباد سے حیدر آباد جانے کے لیے یہی ایک سیدھا راستہ تھا۔ اگر میں اُن سے جُدا بھی ہوتا تو مجھے اسی طرف دِلّی سے گزر کے آگے جانا پڑتا۔ یہاں نہیں تو دِلّی اسٹیشن پر میں اُن کی نظروں سے اوجھل ہو سکتا تھا۔

مسافر خانے کے روزنامچے پر لکھے ہوئے لفظ میری آنکھوں میں گھوم رہے تھے۔ ہر جگہ وہی لفظ لکھے ہوئے نظر آتے تھے۔ حمایت نگر کا علاقہ حیدر آباد میں تھا اور میں پہلے بھی اِس علاقے سے گزرا تھا۔ ہو سکتا ہے اُس مکان کے اِردگرد بھی گیا ہوں جہاں مولوی صاحب نے اپنا قیام لکھوایا تھا۔ ہم نے علاقے کی تمام مسجدوں، مدرسوں میں اور جہاں جہاں ممکن تھا، جا کے پوچھ لیا تھا مگر مولوی صاحب وہاں کہیں ہوتے تو کوئی بتاتا۔ وہ اُن دنوں حیدر آباد سے سینکڑوں میل دُور جیسلمیر میں بسے ہوئے تھے۔ جیسلمیر کے بعد ہمیں دوبارہ حیدر آباد جانے کا موقع نہیں ملا۔ میں نے طے کیا تھا کہ سب سے پہلے وہیں جاؤں گا۔ حیدر آباد میں صاحبِ علم لوگوں کی بڑی قدر ہوتی ہے۔ جیسلمیر سے مولوی صاحب سارا گھر چھوڑ کے چلے تھے، اُنھیں کسی ایسی جگہ جانا چاہیے تھا جہاں اُن کے چند شناسا موجود ہوں۔ جن حالات میں اُنھیں جیسلمیر سے دُور ہونا پڑا تھا، خصوصاً ایسی صورت میں، جب ایک نوجوان لڑکی بھی اُن کے ساتھ تھی، اُنھیں دربدر مارے مارے پھرنے کے بجائے کسی ایسے ٹھکانے کا رُخ کرنا چاہیے تھا جہاں ہاتھ پھیلائے بغیر کوئی سہارا مل جانے کی توقع ہو، عارضی طور پر سہی۔ چلتے وقت اُن کے پاس پیسے بھی کم تھے۔ صرف اتنے جو رستم خاں نے جیسلمیر سے فرار کراتے ہوئے اُنھیں دیے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ عرصہ ہوا، حیدر آباد میں اُن کی اکلوتی بہن بیاہی گئی ہے۔ میں اُس کا گھر تلاش نہیں کر سکا تھا لیکن مولوی صاحب کو اپنی بہن کا پتہ معلوم ہوگا، اُس کے شوہر کے رشتے دار، جان پہچان والے وہاں موجود ہوں گے۔ جیسلمیر سے آنے کے بعد تجمل نے اچانک تبت جانے کا ارادہ کر لیا ورنہ میں ایک مرتبہ حیدر آباد ضرور جاتا۔

رجسٹر میں مولوی صاحب نے اپنے ساتھ سفر کرنے والی لڑکی کو اپنی بیگم کی حیثیت سے درج کرایا تھا۔ ظاہر ہے، مراد آباد میں وہ اُس سے اپنا کوئی اور رشتہ نہیں بتا سکتے تھے۔ یہاں سب جانتے تھے کہ اُنھوں نے شادی نہیں کی ہے۔ کورا کو وہ اپنی بیٹی نہیں بتا سکتے تھے۔ جیسلمیر سے عزّت و عافیت کے ساتھ نکلنے کے بعد وہ معلوم نہیں اور کہاں کہاں سر چھپاتے پھرے ہوں۔ اُنھیں کوئی ایسا ہی اندیشہ ہوگا، اِسی لیے وہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اب بھی کورا کو افشا نہیں کرتے تھے۔ یقیناً گزشتہ برسوں میں اُنھیں کورا کی تلاش میں گھومنے والے جانگ قبیلے کے لوگوں سے کوئی واسطہ پڑا ہوگا جبھی وہ اتنی احتیاط برتتے تھے۔ اب اُنھیں جیسلمیر کے رانا مہتاب کے آدمیوں سے بھی خدشہ ہوگا کہ وہ اُنھیں دوبارہ نہ تلاش کر لیں۔ میرا دل نہیں مانتا تھا مگر ایک اور بات بھی ہو سکتی تھی جس سے مولوی صاحب خوف زدہ ہوں۔ مبادا اُنھیں میرا خیال ہو کہ میں کہیں اُن سے اپنی امانت واپس لینے نہ آ جاؤں۔ ممکن ہے میری ہی وجہ سے ایسا ہو۔ تھوڑا بہت قاعدہ قانون اُنھیں بھی معلوم ہوگا کہ مجھے قتل کی سزا میں کم سنی کی وجہ سے رعایت مل سکتی ہے یا پھر اُنھیں میرے مقدمے کے فیصلے کا علم ہو گیا تھا۔ اُنھیں پورا

یقین ہوگا کہ سات سال بعد جیل سے باہر آنے کے بعد میں اُسی کو تلاش کروں گا، کہیں اور نہیں جاؤں گا، جیل کے سات سال میں ایک ایک دن، ایک ایک لمحہ گن گن کے ہی کاٹوں گا، ایک ہی اُمید مجھے وہاں زندہ رکھے گی کہ باہر کوئی میرا منتظر ہے، جیل کا دروازہ کھلنے کی دیر ہوگی کہ میری آنکھیں پھر قریے قریے اُسے دیکھنے کے لیے بھٹکتی پھریں گی۔ اُنھیں خوب اندازہ ہوگا کہ وقت کی دھول میرے سینے سے اُس کی تصویر مٹا نہیں دے گی۔

میری خبر رکھنا اُن کے لیے مشکل نہیں تھا۔ جیل کے سوا میرا تو کوئی اور ٹھکانا نہیں تھا۔ میرا پتہ بہت آسان تھا۔ وہ مجھے خط لکھ سکتے تھے، مجھ سے آ کے مل سکتے تھے، خود نہیں تو اپنا کوئی پیغام بر بھیج سکتے تھے اور اُن کے دل میں اِس رسم و راہ سے اگر کوئی وسوسہ تھا کہ اِس طرح جیل کے حکام کو میرے حوالے جاننے کا موقع مل جائے گا اور نتیجتہً اُن کے اور کورا کے سکون میں کوئی رخنہ پڑ سکتا ہے تو وہ کوئی اور تدبیر اختیار کر سکتے تھے۔ شروع میں نہیں تو تین چار سال بعد وہ اپنے نام اور پتے کے بغیر اپنی اور کورا کی خیریت کا دو سطری خط لکھ سکتے تھے۔ میرے لیے تو ایک اشارہ بہت ہوتا۔

جیل میں اُن کا خط نہ آنے اور میری خبر نہ لینے کی میں نے اپنے طور پر بہت سی تاویلیں کر رکھی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ مولوی صاحب نے یہ خاموشی جان بوجھ کے اختیار کی ہوئی ہے۔ میں نے اُنھیں اپنے اور کورا کے بارے میں تقریباً سبھی کچھ بتا دیا تھا۔ وہ سمجھتے ہوں گے کہ جس رات دریا کے کنارے اجنبی لوگوں نے ہم پر حملہ کیا تھا اور کورا کو ہم سے چھین لے جانے کی کوشش کی تھی، وہ جانگ قبیلے کے لوگ یا اُن کے بھیجے ہوئے آدمی بھی ہو سکتے ہیں۔ اُس رات وہ ناکام ہو گئے، میں جیل چلا گیا لیکن مولوی صاحب کے خیال میں جیل میں بھی وہ میری طرف سے پوری طرح چوکنا ہوں گے۔ اُنھیں سرا پکڑنے کی فکر ہوگی۔ مولوی صاحب بھی اُسی روز کلکتے سے چلے گئے ہوں گے اور اُنھوں نے خط یوں نہیں لکھا کہ میں اُن کے آبائی شہر سے واقف ہی تھا۔ یہ میرے اور اُن کے درمیان کی بات تھی، کسی تیسرے کو اِس کا علم نہیں تھا۔ میں سمجھا تھا کہ مولوی صاحب نے حفظِ ماتقدم کے لیے مجھ سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا ہے، یہی سوچ کر کہ رہا ہونے پر میں سیدھا مراد آباد ہی آؤں گا اور مراد آباد جیسے شہر میں اُنھیں ڈھونڈنا میرے لیے دشوار نہیں ہوگا۔ اِس دوران کورا نے بھی اُنھیں اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا ہوگا چنانچہ جانگ قبیلے کے لوگوں کے سلسلے میں وہ اور حساس ہو گئے ہوں گے۔ اُنھیں قدم قدم پر اُن کی طرف سے خطرہ ہوگا۔ جیل سے نجات پانے کے بعد میں نے سیدھے مراد آباد ہی کا رُخ کیا تھا۔ مولوی صاحب میرے لیے وہاں کوئی خبر نہیں دے کے گئے تھے۔ وہ میرے سے مراد آباد گئے ہی نہیں، مجھے کچھ بھی نہیں معلوم تھا کہ اُس رات کے بعد اُن دونوں کو کیا اُفتاد پیش آئی۔ پہلی بار جیسلمیر میں منیر علی کا گھر ملنے ہی پر اُن کے بارے میں ٹھیک پتہ چل سکا اور پہلی بار مجھے کچھ ایسا گمان ہوا کہ اُنھیں میرا اندیشہ بھی ہو سکتا ہے۔

مجھ سے میرے سائے سے کورا کو دُور رکھنے کے لیے اُنھوں نے یہ سب کچھ کیا ہوگا۔ وہ ایک سزا یافتہ آدمی کو کورا کے لیے مناسب نہیں سمجھتے ہوں گے، اُن کا ایسا سوچنا بھی ایک طرح سے برحق تھا۔ میرا اُن سے رشتہ ہی کون سا تھا، دِنوں کی ملاقات تھی۔ رشتہ اُن کا کورا سے تھا جو اِتنے دنوں تک اُن کے ساتھ رہی، میں اُن کا کون ہوتا تھا۔ جیل میں اکثر لوگ بدل جاتے ہیں، اُنھیں کیا پتہ تھا کہ میں نے وہاں تعلیم بھی جاری رکھی ہے۔ میں ہر لمحے اُس کے لیے دعائیں کرتا تھا۔ اُس کا چہرہ میرے سامنے رہتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اُس نے میرے بغیر بہت دُکھ اُٹھائے ہیں۔ میں اِدھر جیل میں ہوں تو وہ بھی زندگی جیل کے مانند کاٹ رہی ہوگی۔ مجھے تو سلاخوں کا بہانہ تھا، وہ تو سلاخوں کے بغیر قید ہوگی۔ اِس لیے مجھے جیل سے اُس کے لیے ایک مکمل آدمی، ایک ستون بن کے نکلنا چاہیے۔ راتوں کو جاگ جاگ کے میں اسی لیے پڑھتا رہتا تھا۔ اُسی کی وجہ سے میں نے جیل میں رہنے کے باوجود ٹاپ کیا تھا، اُسی کی وجہ سے میں نے بتھل سے ہنر سیکھے تھے۔ مجھے تجربہ ہو گیا تھا کہ زندگی گزارنے کے لیے آدمی کو ہر اعتبار سے مستعد اور مسلح رہنا چاہیے، سب کچھ مجھے خود ہی کرنا ہے، اپنا گھر بنانا ہے۔ میں اُس کا پاسبان ہوں، میری چھاؤں میں آ کے وہ گزرا ہوا سب کچھ بھول جائے گی۔ بتھل نے بھی کبھی مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ رہا ہونے کے بعد مجھے اڈّے پر کام کرنا ہے، وہ تو میرے لیے وہی خواب دیکھتا تھا جو میں خود دیکھا کرتا تھا۔ وہ مجھے ایک بڑا وکیل بنانا چاہتا تھا۔ مولوی صاحب کو میری فکر ہوتی تو اُنھیں یہ سب معلوم ہوتا۔ اُن کے ذہن میں بس ایک ہی بات ہوگی کہ میں جیل چلا گیا ہوں، تین آدمیوں کے قتل کے جرم میں۔ سو میرے بدن پر کوڑھ نمودار ہو گیا ہوگا، میرا چہرہ سیاہ ہو گیا ہوگا۔ اُن کے خیال میں جیل جا کے ہر شخص کا چہرہ، رنگ روپ بدل جاتا ہوگا۔

وہ اُنھیں اتنی عزیز ہو گئی ہوگی کہ اُسے جُدا کرنے کا تصوّر اُن کے لیے عذاب ہوگا۔ وہ اُس کے لیے کسی ایسے شخص کی تلاش میں ہوں گے جو اُنھی کے ساتھ رہے، کورا کو اُن کی آنکھوں سے دُور نہ لے جائے۔ ایسا ایک شخص اُنھیں جیسلمیر میں ملا تھا، ارشد، منیر علی کا بھتیجا۔ منیر علی کے خاندان کو وہ اچھی طرح پرکھ چکے تھے۔ ارشد

تعلیم یافتہ لڑکا تھا، اُنھوں نے اُسے بھی مسترد کر دیا۔ منیر علی کے بہ قول رانا مہتاب نے اُنھیں بہت بڑی دولت کی پیش کش کی تھی، مگر اُس کی دولت کو بھی خاطر میں نہیں لائے۔ اِس عرصے میں نہ جانے کتنے لوگوں، کتنے خاندانوں نے اُن سے کورا کے لیے درخواست کی ہو گی۔ مولوی صاحب نے کہیں حامی نہیں بھری تھی۔ کیا اُنھیں اِس حقیقت کا احساس نہیں تھا کہ ایک نہ ایک دن کورا کو اُن سے جُدا ہو جانا ہے۔ ہر لڑکی کو ایک گھر سے رخصت ہو کے دوسرا گھر بسانا پڑتا ہے۔ میں سامنے نہیں تھا اور میں مطلوب بھی نہیں تھا تو وہ کورا کے لیے کس شخص کی تلاش میں تھے؟ اُنھیں کس دن اور کس شخص کا انتظار تھا؟ کون آنے والا تھا؟ شاید کوئی بھی نہیں۔ نہ میں، نہ کوئی اور۔ بس اُنھیں ایک ٹمٹماتی اُمید، موہوم سی توقع ہوگی کہ کسی دن کورا خود تھک جائے گی اور پھر وہ جو چاہیں گے، اُس کے لیے فیصلہ کر سکیں گے۔ اُنھوں نے جتنے لوگوں کو مسترد کیا ہوگا، بیشتر کورا کے سبب سے کیا ہوگا۔ اُنھوں نے دیکھ لیا تھا کہ وقت نے کورا کا ارادہ اور فروزاں کر دیا ہے۔ میں اُس کے پاس نہیں تھا لیکن میری سانسیں اُس کے سینے میں بسی ہوئی ہیں، میری پرچھائیاں ہر لمحے اُسے حصار میں لیے رہتی ہیں۔ وہ مولوی صاحب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اُن کے ساتھ نہیں ہے، اُس کی اپنی الگ ایک دنیا ہے۔

بعد میں زہرہ نے اِس کی تصدیق کر دی تھی۔ ہرچند کہ مجھے اِس تصدیق کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ وہی ہوگی، اُس کا قد بڑھ گیا ہوگا، اُس کا رنگ نکھر گیا ہوگا، شکل و صورت میں وہ پہلے سے بہت بدل گئی ہوگی لیکن وہ ہوگی وہی۔ جہاں، جس رات وہ مجھ سے جُدا ہوئی تھی، ویسی ہی۔ زہرہ نے کہا تھا کہ وہ ہر وقت کچھ سوچتی رہتی ہے، کھوئی کھوئی رہتی ہے۔ نہ اُسے لباس کا شوق ہے، نہ زیور کا۔ کوئی آ کے خود اُسے پوچھ جائے تو ٹھیک، نہ آئے تو شکایت نہیں کرتی، گھنٹوں تنہا بیٹھی دیواریں تکتی رہتی ہے۔ اتنا عرصہ مولوی صاحب کے جاننے کے لیے کافی تھا کہ اُس کی منزل تو ایک ہی ہے، اُسے ایک ہی شخص کا انتظار ہے، وہی اُس کی نیند، وہی اُس کا خواب ہے، وہی اُس کی رُوح ہے۔ وہ اُس کے لیے زر و جواہر اکٹھے کر دیں یا اُسے دیواروں میں بند، تہہ خانوں میں محبوس کر دیں، بیڑیاں ڈال دیں یا ساری دنیا کی خوشیاں اُس کے قدموں میں بکھیر دیں، اُس کی خوشی تو ایک ہی شخص میں نہاں ہے۔ نو برس گزر چکے تھے۔ مولوی صاحب کو اور کتنے برسوں کا انتظار تھا۔ نو برس کیا، نو صدیاں، نو جگ بیت جائیں، وہ تو وہی رہے گی۔ مولوی صاحب نہیں جانتے تھے کہ کبھی کبھی دو آدمیوں سے ایک آدمی کی تکمیل ہوتی ہے۔ وہ دو آدمی جو بظاہر الگ الگ نظر آتے ہیں، بباطن ایک ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب کا خیال ہوگا کہ وقت دُنیا بدل دیتا ہے، وقت ایک دن اُسے بھی منقلب کر دے گا۔ اُنھوں نے اُس سے جانے کیا کیا کہا ہوگا کہ میں مر گیا ہوں مگر اُنھوں نے ایسا نہیں کہا ہوگا اور کہا ہوگا تو اُس نے تسلیم نہیں کیا ہوگا۔ اُس کا دل بھی ایک آئینہ ہے، وہ بھی اُس سے کچھ کہتا ہوگا جیسے میرا دل کہتا ہے۔ مولوی صاحب نے جینے کے لیے اُسے طرح طرح کے آسرے دیے ہوں گے لیکن وہ ایک ہی آسرے پر زندہ تھی، اپنے آسرے پر۔

زہرہ تو مجھے بہت بعد میں ملی تھی۔ زہرہ سے ملنے سے پہلے ہی میں اُس کے بارے یہ سب کچھ جانتا تھا، میرا یہ یقین ہی میری زندگی تھا۔ مولوی صاحب اُسے دُور دُور لیے پھرتے رہیں، سات سمندر پار لے جائیں۔ ایک دن اُنھیں میری یاد ضرور آئے گی۔ ایک دن وہ خود نڈھال ہو جائیں گے۔ وہ کورا پر ایک سب سے بڑی مہربانی ضرور کریں گے جسے اب تک وہ نہیں سمجھے تھے اور سمجھتے تھے تو اپنے آپ سے ضد کر رہے تھے۔ بے شک اُنھیں کورا بہت عزیز ہو سکتی تھی۔ اُن کا بھی زندگی میں کوئی اپنا نہیں تھا۔ ایک کورا ملی تھی اور کورا کون تھی، وہ جو سر بہ سر ایک نور تھی۔ اُس کا چہرہ جھلملاتا رہتا تھا۔ اُن کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو اُسے اتنا ہی عزیز رکھتا۔ ایک ابّا جان ہی تھے جنھوں نے اُس کی قدر نہیں کی۔ جب وہ گھر آئی تھی تو امّی نے بے ساختہ کہا تھا، بالکل گڑیا ہے، جی چاہتا ہے طاق میں سجا کے رکھ دوں اور بس دیکھتی رہوں۔ امّی کو بھی وہ اتنی اچھی لگی تھی کہ اُنھوں نے بُری طرح اُس کی بلائیں لی تھیں، چشمِ بد دُور، خدا نظرِ بد سے بچائے۔ یہ کہتے کہتے اُن کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ ابّا جان ذرا سا تحمل کر لیتے تو دیکھتے، وہ امّی سے زیادہ اُن کی خدمت کرتی، اُنھیں اپنے بیٹوں بیٹیوں سے زیادہ وہ پیاری ہوتی۔ ابّا جان نے اُس کی طرف نگاہ بھر کے دیکھا ہی نہیں۔ اتنا بھی نہ سوچا کہ وہ اُن کی پناہ میں آئی ہے، اُس کا کوئی نہیں ہے۔ وہ بے سہارا لڑکی اُن کے گھر کو اپنا گھر سمجھ کے راتوں رات بُدھ گیا سے بھاگتی ہوئی آئی ہے، اُس نے کچھ سمجھا ہوگا تبھی اِس طرف کا رُخ کیا۔ ایسے کون کسی کے گھر آ جاتا ہے۔ ابّا جان کو اُس کا نہیں تو کم از کم میرا ہی پاس رکھنا چاہیے تھا۔ میں بھی اُسی گھر کا ایک فرد تھا۔ مجھے کسی کو اپنی مرضی سے اپنے گھر میں رکھنے کا حق نہیں تھا؟ ابّا جان وہاں اُس کا رہنا مناسب نہیں سمجھتے تھے تو کہیں اور بھیج دیتے۔ زمین اتنی تنگ نہیں تھی۔ وہ چاہتے تو اُس کے لیے ایک گھر بنا سکتے تھے۔ وہ خالی ہاتھ نہیں آئی تھی، اپنے ساتھ دولت بھی لائی تھی۔ ہیرے جواہر سے بھری پوٹلی۔ اُس کے لیے جو ابّا جان نہیں کر سکے، وہ مولوی صاحب، ایک اجنبی آدمی نے کیا۔

مولوی صاحب ایک بار میری ٹوہ لے کے تو دیکھتے کہ میری

گردن کتنی جھکی ہوئی ہے، مجھ سے اُن کے سامنے نگاہیں بھی نہیں اُٹھائی جاسکیں گی۔ میں نے اُن کا سکھ چین چھین لیا تھا۔ اُنھوں نے اُس کے لیے کتنی پریشانیاں اُٹھائی تھیں، ساری زندگی اُس پر قربان کردی تھی۔ زمانے بھر کی نگاہوں سے اُسے بچائے رکھے ہوئے تھے۔ میرے پاس اُن کے احسانات کا کوئی بدل نہیں تھا۔ مولوی صاحب نہ ہوتے تو آج وہ کہاں ہوتی۔ اُنھیں پیسوں کی کوئی تنگی ہوگئی تھی کہ وہ مرادآباد میں اپنی آبائی زمین اور مکان بیچنے آئے تھے۔ اُس مکان اور زمین سے اُنھیں کیا ملا ہوگا، چند ہزار روپے! کام بھی وہ ایسا ویسا نہیں کرسکتے تھے، ہر وقت اُنھیں دھڑکا لگا رہتا ہوگا۔ رانا مہتاب کے واقعے کے بعد وہ اُسے ایک لمحے کے لیے تنہا چھوڑنا نہیں چاہتے ہوں گے لیکن گھر چلانے کے لیے اُنھیں گھر سے باہر تو نکلنا پڑتا ہوگا۔ بھیک بھی جسم ہلائے بغیر نہیں ملتی۔ یہاں میری جیب میں خزانے کی کنجی رکھی تھی، کرشنا جی کی ساری دولت جوں کی توں بینک میں پڑی تھی۔ میں نے صرف نیساں کے لیے ساٹھ ہزار روپے کی رقم خرچ کی تھی، شہ پارہ کے لیے دی جانے والی رقم کرمن بیگم کے نصیب ہی میں نہ تھی۔ کانتے نے مجھے پچیس ہزار روپے والا پیشگی چیک واپس کردیا تھا اور کلکتے کے بینک میں جمع کیے جانے والے روپے میں سے ایک پائی بھی خرچ نہیں کی تھی۔

کرشنا جی نے یہ سب میرے لیے کیا تھا۔ میرے سوا کوئی اس کا مالک و مختار نہیں تھا۔ اُن کی روح بھی اس بات سے خوش ہوتی کہ وہ روپے میں نے خود پر خرچ کیے ہیں۔ میرے ہی سکھ کے لیے اُنھوں نے ایسا کیا تھا۔ جس وقت اُنھوں نے وصیت لکھوائی تھی، اُن کی ماں زندہ تھیں لیکن اپنی ماں کے نام اُنھوں نے کچھ نہیں لکھوایا اس لیے کہ وہ اُن کے لیے اپنی جگہ ایک اور بیٹا چھوڑ کے جارہے تھے۔ اُنھیں یقین ہوگا کہ اُن کے بعد میں اُن کی ماں کی خدمت میں کوئی دریغ نہیں کروں گا۔ کرشنا جی کی طرح اُن کی ماں نے بھی مجھے اس کا موقع نہیں دیا۔ وہ مجھ پر اتنا بڑا بوجھ لاد کے چلے گئے تھے۔ پتہ نہیں کیوں! جب اُنھیں معلوم تھا کہ مجھے پیسے خرچ کرنا نہیں آتا اور بہت سی چیزیں پیسوں سے خریدی بھی نہیں جا سکتیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اِن روپوں کا کیا کروں۔ بنڈی میں رکھی ہوئی چیک بک مجھے بہت بوجھل لگتی تھی۔ مولوی صاحب ہوتے تو میں یہ سب اُن کے حوالے کردیتا۔ کورا کی امانت رکھنے کے معاوضے کے طور پر نہیں۔ اُس کا تو معاوضہ ہی نہیں ہوسکتا۔ اُس کے لیے تو کرشنا جی کی دولت کیا، قارون کا خزانہ بھی ہیچ ہے۔ بس جیسے کرشنا جی کا جی چاہا تھا کہ وہ چلتے وقت میرے نام یہ سب کرجائیں، میرا بھی یہی جی چاہتا تھا کہ کرشنا جی نے مجھے اپنی جان بچانے کا معاوضہ نہیں دیا تھا۔ وہ مجھے اپنا عزیز، اپنا بھائی سمجھتے تھے۔ میں بھی مولوی صاحب کو اپنے ابّا جان، کرشنا جی اور بجھل کی طرح سمجھتا تھا۔ ایک بار وہ مُڑ کے دیکھتے، آزمائشاً ہی سہی، کورا کو مجھ سے دُور رکھ کے، تو اُنھیں مجھ سے اتنی مایوسی نہ ہوتی۔ میں اُن کا دست و بازو ہی بنتا، پھر اُنھیں سر چھپانے کے لیے بستی بستی کوچے کوچے خاک نہ چھاننی پڑتی۔ وہ دیکھتے تو سہی کہ کتنے لوگ اُنھیں پلکوں پر بٹھاتے ہیں۔ کوئی اور نہ بھی ہوتا تو میں اکیلا بہت تھا۔ میں اُنھیں کوئی کام نہ کرنے دیتا۔ میرے بازوؤں میں منوں بوجھ اُٹھانے کی طاقت ہے۔ کچھ اور نہیں تو میں مزدوری ہی کرسکتا ہوں، میرے ہاتھ بیراگی کی وجہ سے بندھے ہوئے ہیں۔ مجھ سے کوئی کام ہی نہیں ہوتا ورنہ میں کیا نہیں کرسکتا۔ کرشنا جی کی دولت ایک اتفاق ہے۔ میں نے نہ اس کی طلب کی تھی، نہ مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس کے بغیر بھی میں کچھ کرنے کی تھوڑی بہت اہلیت ضرور رکھتا ہوں، میرے ہاتھ کٹے ہوئے تو نہیں ہیں۔

شاید مولوی صاحب کو یہی گمان ہوگیا تھا کہ میں کورا کو اُن سے جُدا کردوں گا۔ میں ایسا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ مجھے اتنا کم ظرف، بے حس اور تنگ دل کیوں سمجھتے تھے۔ وہ مجھ پر ہی نہیں، کورا پر بھی جبر کر رہے تھے، کیا اتنے دنوں تک وہ نہیں جان سکے تھے کہ کورا اپنی بھی نہیں ہے۔ وہ اُس کے لیے بہترین لباس، غذائیں فراہم کرسکتے ہیں مگر کیا وہ اُس کے ہونٹوں کے لیے مسکراہٹ اور اُس کی آنکھوں کے لیے چمک بھی مہیا کرسکتے ہیں۔ اُنھیں کورا کا اس قدر خیال ہے تو ایک سامنے کی بات اُن کی عقل میں کیوں نہیں آرہی ہے، میری صورت، میری ہیئت کورا کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ میں اچھا ہوں یا بُرا، میرے چہرے پر سیاہی ملی ہوئی ہے یا سفیدی۔ میں جیل سے جانور بن کے نکلا ہوں یا آدمی۔ میں جیسا بھی ہوں، وہ مجھے اپنی قسمت سمجھ کے قبول کرلے گی اور یہی حال میرا ہے۔ اگر مجھے زہرہ سے یہ معلوم ہوتا کہ وقت نے کورا کی شکل بگاڑ دی ہے، وہ سب کچھ بھول گئی ہے، مولوی صاحب نے اُس کا ہاتھ ارشد کے ہاتھ میں دے دیا ہے یا وہ رانا مہتاب کے محل میں حکومت کرتی ہے تو میں یہ سب اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کے قبول کرلیتا۔ وہ جہاں ہوتی، جیسی ہوتی میرے لیے تو وہی تھی۔ اُس کا میرا کوئی مول تول کا رشتہ نہیں تھا کہ اگر یوں ہے تو اُس کا جواب یوں ہوگا، میری آنکھوں سے بینائی چلی جائے گی تو وہ مجھے اپاہج سمجھ کے مسترد کردے گی، وہ میری دسترس سے دُور ہوجائے گی تو اُس کی تصویر میرے سینے میں دھندلی پڑجائے گی۔

میری سفیدی پر اُس کی سفیدی کا انحصار نہیں تھا۔ مولوی صاحب کو زندگی میں کورا کی طرح کوئی شخص نہیں ملا تھا تو یہ میری یا اُس کی غلطی نہیں تھی۔ اب تو سب کچھ اُن کے سامنے تھا۔ کون اُنھیں جا کے بتاتا کہ ایک دن نہیں، ایک برس نہیں، اب نو برس سے اُوپر ہوچکے ہیں۔ جیل میں تو مجبوری تھی لیکن جیل سے باہر ایک ایک پل مجھے ڈستا رہا ہے۔ میں نے اُنھیں گلی گلی ڈھونڈا ہے، کہاں کہاں نہیں گیا ہوں، میرے پیروں میں چھالے تک پڑگئے، میری آنکھیں اُس کی پرچھائیں بھی نہ دیکھ سکیں۔ کون اُن سے جا کے کہتا کہ میری رگوں میں ہر وقت کھولن ہوتی رہتی ہے، جی اُکھڑا اُکھڑا رہتا ہے۔ سوچتا کچھ ہوں، ہو کچھ جاتا ہے۔ میں اپنے آپ کو بہت سمجھاتا ہوں لیکن دوسرے ہی لمحے سب بھول جاتا ہوں۔ کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو خوب طمانچے ماروں، اپنا جسم شکنجے میں کس لوں، کسی کنویں میں چھلانگ لگادوں یا ریل کے نیچے آجاؤں۔ مجھے موت بھی نہیں آتی۔ کتنے لوگ میری وجہ سے پریشان رہتے ہیں اور مجھ سے کسی سے سیدھے منہ بات بھی نہیں ہوتی۔ وہ سب بہت اچھے ہیں جو مجھے نہ جانے کیا سمجھ کے معاف کر دیتے ہیں۔ زرّیں میری خاطر کلستی رہتی ہے۔ نیساں میرے لیے جب دیکھو مصلّے پر پیشانی رگڑتی رہتی ہے، جولین کو میں ایک خط بھی نہ لکھ سکا۔ مولوی صاحب کچھ اور نہیں تو مجھے ایک چٹکی زہر ہی بھیج دیتے، ایک بار میرے سامنے آ کے چھُرا گھونپ دیتے۔ کون میری طرف سے جا کے اُن کے آگے ہاتھ جوڑے کہ وہ میری خطائیں معاف کردیں۔ خدا بھی اپنے بندوں کو معاف کردیتا ہے۔

گاڑی تیز رفتاری سے دلّی کی طرف بڑھ رہی تھی۔

میں کھڑکی پر سر ٹکائے بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کتنے اسٹیشن آئے اور گزر گئے ہیں۔ میرے سر میں بھی کوئی ریل سی چل رہی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر بعد کسی نے میری پشت پر تھپکی دی، میں ہڑبڑا سا گیا۔ مارٹی ہاتھ میں چائے کا گلاس لیے سامنے کھڑا تھا اور ابّا جان سمیت اُن سب کی نگاہیں مجھی پر منڈلا رہی تھیں۔ ڈبّے میں روشنی بہت کم ہوگئی تھی۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر ٹھیری ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم پر اُمڈتا ہوا شور ڈبّے میں گونج رہا تھا۔ میں سمجھا، دلّی آگئی ہے۔ میں نے سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں مارٹی سے پوچھا۔

وہ پلکیں جھپکانے لگا۔

"دلّی ابھی دُور ہے راجا اُستاد!" اُس نے چائے کا گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ "ابھی اید گڑھ نکلا ہے۔"

مجھے مارٹی کی بات کا یقین نہیں آیا لیکن دلّی آجاتی تو وہ سب اُترنے کی جلدی کرتے۔ گویا مرادآباد سے دلّی کا آدھا فاصلہ ابھی باقی تھا۔ میں نے مارٹی کے ہاتھ سے چائے کا گلاس لے لیا۔ منع کرتا تو وہ فضول میں اصرار کرنے لگتا۔ میرے مقابل کی نشست پر دیوار سے ٹیک لگائے ابّا جان نیم دراز تھے۔ پیرو اُن کے پاس بیٹھا تھا۔ زورا دروازے پر کھڑا تھا۔ مرادآباد سے چلنے والے دونوں مسافر اب ڈبّے میں موجود نہیں تھے۔ میں نے چائے ختم نہیں کی تھی کہ پیرو اُٹھ کے میرے پاس آگیا اور میری گردن میں بازو ڈال کے مجھے دبوچنے لگا۔ میں کسمسا کے رہ گیا۔ "ایسا بھی کیا سوچتا ہے لاڈلے جانی؟" پیرو مجھے گدگداتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔

میں سر جھکائے خاموش رہا۔

"اپنے کو نئیں بولے گا؟" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

میرے دل میں آیا پیرو سے کہہ کے دیکھوں، اچھا ہے، اُسے بتلونا چاہیے کہ میں دلّی سے اُن کے ساتھ جانے کے بجائے حیدرآباد جانے والی گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا۔ حیدرآباد سے بمبئی زیادہ دُور نہیں ہے۔ اُن کے پہنچنے کے دو تین روز بعد میں خود وہاں پہنچ جاؤں گا۔ پیرو سے کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ ابّا جان سے کوئی بھی عذر کر دے گا لیکن وہ اُن سے کیا عذر کرسکتا ہے۔ فیض آباد میں ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ابّا جان میرے اچانک راستہ بدل دینے اور ساتھ چھوڑ جانے سے بہت حیران ہوں گے۔ وہ پیرو سے طرح طرح کے سوال کریں گے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ خاموش ہوجاتے مگر اب وہ بہت شش و پنج میں پڑجائیں گے اور اگر کچھ کہیں گے نہیں تو اُن کے دل میں بے شمار وسوسے پیدا ہوں گے۔ یہ بہت عجیب بات ہے، نو سال بعد بھائی بہنوں کو دیکھنے کی صورت پیدا ہوئی ہے اور میں جارہا ہوں۔ ابّا جان کو خود بھی فرح، فریال، فارہہ اور اکبر کی صورتیں دیکھنے کی بہت بے چینی ہوگی۔ نو سال سے وہ جس دن کی آرزو کر رہے تھے، وہ دن قریب ہی تھا۔ اب وہ دن آنے میں بہ ظاہر کوئی رکاوٹ نہیں تھی، جہاں گیر بھی اُنھیں مل گیا تھا۔ امّی اور فہمی اُنھیں بہت یاد آرہی ہوں گی۔ ابّا جان جہاں گیر کو بھی فیض آباد سے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ بجھل نے روک دیا۔ بہرحال میں ساتھ تھا۔ فرح، فریال، فارہہ اور اکبر کے لیے میں مرچکا ہوں گا، مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کے اُن کی حیرت اور مسرت کا ٹھکانا نہیں ہوگا۔ ابّا جان مجھے اُن کے سامنے لے جا کے پہلے پہیلیاں بجھوائیں گے کہ پہچانو، یہ کون ہے۔ کچھ یاد آتا ہے کہ کہیں دیکھا ہے۔ شاید فرح پہچان لے یا سبھی۔ جہاں گیر پہلی نظر میں مجھے نہیں پہچان پایا تھا۔

ابّا جان کی اس وقت ایک ہی تمنا ہوگی کہ جلد سے جلد بمبئی پہنچ کے مجھے اُن کے سامنے کھڑا کردیں۔ یہ منظر دیکھنے کے لیے اُن کی آنکھیں ترس رہی ہوں گی۔ درمیان میں میرے چلے جانے سے

انھیں بے حد اذیت ہوگی۔ پیرو انھیں مطمئن کرنے کی ہرممکن کوشش کرے گا لیکن ظاہر ہے' وہ اتنی آسانی سے مطمئن نہیں ہوں گے۔ کاش میں خود اُن سے کہہ سکتا کہ صرف دو دن کے لیے مجھے اجازت دے دیجیے۔ میری آنکھیں بھی اُن سب کے چہرے دیکھنے کے لیے بےتاب ہیں' شاید ابّاجان سے زیادہ۔ فیض آباد میں وہ ٹھہر گئے تھے اور بمبئی جانے کے آثار نظر نہیں آتے تھے تو سب سے زیادہ بے کلی مجھی کو ہو رہی تھی۔ بمبئی میں مولوی اکرام کے فلیٹ پر میں کئی بار جا چکا تھا۔ کرشنا جی نے سارے ہندوستان کے تھانوں میں گشتی خط روانہ کیے تھے۔ انھی خطوط کے نتیجے میں ابّاجان کا سراغ مل سکا تھا۔ ابّاجان نے مجھے نہیں ڈھونڈا مگر میں نے بٹھل نے، کرشنا جی نے، ایس پی تسکلانے انھیں ڈھونڈا تھا۔ سلطان' سولم' جینی' پلٹو' وزیر' متن میاں' پیرو' زورا، مارتی' ہلاکو' سبھی اس میں شامل تھے۔ کبّن خاں' کلنتے اور بہت سے لوگ علیحدہ' غور کیا جائے تو وہ سبھی۔ ہم ابّاجان ہی کی وجہ سے تبت گئے تھے۔ یہاں بھی جہاں جہاں میں اور بٹھل جاتے رہے' مولوی صاحب کے ساتھ انھیں بھی پوچھتے تھے۔ بمبئی میں جوہریوں کے پاس جہاں وہ کورا کے لائے ہوئے ہیرے جواہر بیچتے تھے' میں نے اور کرشنا جی نے اُن سے اُن کا پتہ حاصل کرنے کے لیے کیا کیا جتن کیے تھے۔ ممکن ہے' ابّاجان کو بٹھل نے کچھ بتایا ہو کہ ہم نے کوئی در' کوئی گھر نہیں چھوڑا تھا۔ فیض آباد میں مجھے اگر ذرا سی بھنک مل جاتی کہ فرخ' فریال وغیرہ بمبئی میں مولوی اکرام کے فلیٹ میں ہیں تو میں شاید کسی سے کہے بغیر بمبئی چلا جاتا۔ میں اتنی دیر نہ ٹھہرتا۔ مجھے اپنی ننھی پارہ صفت فرخ اور بھوری آنکھوں بھورے بالوں والی فریال کو گلے لگانے کی ابّاجان سے زیادہ حسرت تھی۔ مجھے پہلے انھی کے پاس جانا چاہیے تھا۔ یقیناً میں دو دن بعد بھی بمبئی سے حیدرآباد جا سکتا ہوں لیکن دو دن کیا، مجھ سے تو ایک لمحہ بھی نہیں گوارا جا رہا۔ ایسی صورت میں میں انھیں کیا دیکھ سکوں گا اور اُن سے کیا بات کر سکوں گا۔ مجھے ہر لمحے حیدرآباد کا خیال رہے گا۔ اتنے عرصے بعد تو مولوی صاحب کا کوئی نشان ملا تھا۔ اُن کا کوئی بھروسا نہیں کہ کل وہ اپنا گھر چھوڑنے کا ارادہ کر لیں' کسی اور طرف نکل جائیں۔ جہاں تک میرے امکان میں ہے' مجھے کسی تاخیر کے بغیر مسافرخانے کے رجسٹر پر مندرج پتے پر پہنچ جانا چاہیے۔ مجھے ایک طرف سے تسلی ہو گئی تھی کہ فرخ' فریال وغیرہ مولوی اکرام کے ساتھ ایک گھر میں محفوظ ہیں۔ ابّاجان اُن کا انتظام کر کے ہی تبت کے سفر کو نکلے تھے اور اب ابّاجان انھی کے پاس واپس جا رہے تھے۔ پیرو، زورا اور مارٹی بھی اُن کے ساتھ تھے۔ ایک میرے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اُن سب سے بچھڑے ہوئے جہاں اتنے برس گزر گئے ہیں' وہاں دو دن اور سہی۔ جب تک میں وہاں پہنچ نہ جاؤں' بہتر ہے' ابّاجان اُن سے میرا تذکرہ ہی نہ کریں۔ اُدھر حیدرآباد میں وہ بہت اکیلی ہوگی، فرخ' فریال کو میرا انتظار نہیں ہے' انھیں میرے بارے میں کوئی علم ہی نہیں لیکن وہ تو اپنی آہٹ پر بھی چونک جاتی ہوگی۔ فرخ' فریال ایک دوسرے کے ساتھ ہیں' اُس کا وہاں کوئی بھی ہم زباں' ہم نفس نہیں ہوگا۔ زہرہ کہتی تھی کہ وہ کسی کو اپنا حال نہیں بتاتی، کسی سے کوئی شکایت نہیں کرتی۔ مولوی صاحب کی دیوار کے سائے کے باوجود وہ بے سایہ تھی، ہر دم' ہر پل اُس کی آس بندھتی' ٹوٹ جاتی ہوگی۔ ابّاجان کو نہیں معلوم کہ وہ کون ہے۔ میں انھیں کیا بتاؤں کہ یہ وہی لڑکی ہے جسے انھوں نے اپنے گھر میں پناہ دینے میں جیل وحجت کی تھی اور جس کے لیے میں گھر سے چلا آیا تھا۔ اُس کے لیے میں نے پورے سات سال جیل میں کاٹے تھے۔ ابّاجان کی وہ کوئی نہیں ہوتی تھی لیکن میرے لیے سبھی کچھ تھی۔ ابّاجان نے اب تک نہیں سمجھا تھا تو انھیں اب سمجھ لینا چاہیے کہ میں اُس کے بغیر شاید کچھ بھی نہیں ہوں۔ وہ مجھ سے دُور ہے' مجھ سے الگ نہیں۔ میں اُس کا کوئی روپ ہوں یا وہ میرا دوسرا روپ ہے۔

پیرو میرے پاس ہی بیٹھا تھا لیکن میں اُس سے حیدرآباد جانے کے متعلق اپنے ارادے کا ذکر کرتے کرتے رہ جاتا تھا۔ سامنے ابّاجان کی نظریں ہمی پر لگی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے انھیں میرے بارے میں کچھ شبہ سا ہو گیا ہے یا یہ میرا وہم تھا۔ وہ آنکھیں کھولے کسی سوچ میں گم تھے اور ایک دم چونک کے میری طرف دیکھنے لگتے تھے۔ میں اُن کے سامنے پیرو سے کوئی بات کرتا اور بعد میں پیرو اُن سے میرے حیدرآباد جانے کا کوئی جواز پیش کرتا تو وہ فوراً سمجھ جاتے کہ پیرو کو میں نے مجبور کیا ہے' پیرو کا کوئی کام نہیں' میرا ہی کام ہے۔ میں نے انتظار کیا کہ ابّاجان کی توجہ کسی دوسری جانب مبذول ہو تو میں پیرو کو بتاؤں۔ ہاپوڑ اسٹیشن بھی آکے گزر گیا۔ ہاپوڑ آنے کا مطلب تھا کہ دلّی صرف تیس میل دُور رہ گئی ہے۔ ڈبّے میں کم روشنی کے قمقمے روشن ہو گئے تھے اور کھڑکی سے باہر کچھ نظر آنا مشکل ہو گیا تھا۔ گڑھ مکتیشر کا پُل عبور کرنے کے بعد گاڑی کی رفتار کسی قدر سست پڑ گئی تھی۔ غازی آباد بھی آگیا۔ ابّاجان نے ایک پل کے لیے پلکیں نہیں جھپکائیں اور گاڑی دلّی کی حدود میں داخل ہو گئی۔ اب ایک ہی صورت تھی' اگر پیرو سے کوئی بات کرنے کا موقع نہیں ملتا تو زورا اور مارٹی کو سمجھا کے میں دلّی اسٹیشن ہی پر کہیں گم ہو جاؤں' دلّی اسٹیشن بہت بڑا ہے، میں وہاں ہجوم میں رَل مِل سکتا ہوں۔ میری جیب میں ایک دو روپے ہی پڑے تھے لیکن روپوں کے بغیر مجھے اپنا سفر کسی نہ کسی طرح جاری رکھنا تھا۔

دلّی اسٹیشن پر میرے قدم بہک سے رہے تھے۔ دس نمبر پلیٹ فارم پر گاڑی آکے ٹھہری تھی۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ سارا اسٹیشن روشنیوں سے جگمگا رہا تھا اور ہر طرف گاڑیوں' مسافروں' قلیوں کا شور پھیلا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ رات دس بجے کے قریب حیدرآباد کے لیے گاڑی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے' اس دوران وقت تبدیل ہو گیا ہو' تاہم میں ناگ پور تک جانے والی کسی گاڑی میں بیٹھ سکتا تھا یا ایسی کسی گاڑی میں جو اورنگ آباد تک جائے۔ ایسی ایک گاڑی بھوپال اور منماڑ سے گزرتی ہوئی بمبئی تک جاتی تھی اور منماڑ سے مجھے اورنگ آباد اور حیدرآباد کے لیے دوسری گاڑیاں مل سکتی تھیں۔ ابّاجان چند قدم آگے بڑھ گئے تھے۔ مارٹی اور زورا مختصر سامان کے ساتھ اُن کے ہمراہ تھے۔ میں کچھ دیر تک اُن کے پیچھے پیچھے پیرو کے ساتھ چلتا رہا پھر جب وہ کچھ اور آگے گئے تو میں نے پیرو کا ہاتھ پکڑ کے آہستگی سے کہا۔ "دادا! مجھے ایک بات کرنی ہے۔"

پیرو ایک ثانیے کے لیے رُک گیا اور میری طرف تند نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا: "اپن جانتا ہے' تو ابھی کون سی بات بولنا مانگتا ہے۔"

"تم کیا جانتے ہو؟" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"تم اکیلا کِدھر کو بھی نہیں جائے گا راجا!"

"دادا!" میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

وہ مجھے سینے سے چمٹاتے ہوئے بولا۔ "اپن جانتا ہے۔"

"دادا! میرا اُدھر جانا ضروری ہے۔" میری آواز بھرّا گئی۔

وہ سر ہلانے لگا: "اپن بھی تمھارے ساتھ چلے گا۔"

"نہیں دادا! تم ابّاجان کے ساتھ جاؤ، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں' جلدی واپس آجاؤں گا، دیر بالکل نہیں کروں گا۔ تم ابّاجان سے کوئی بہانہ کر دو، میری طرف سے مت کہنا۔"

"اپن نے بڑے صاحب سے بول دیا ہے۔"

"تم نے' تم نے اُن سے بات کر لی ہے؟"

"دلّی سے پہلے ہی اُس کو بولنا تھا۔"

"تم نے اُن سے کیا کہا؟"

"بول دیا راجا!" وہ تنک کے بولا۔ "اپن نے بولا' ابھی تم زورا اور مارٹی کے ساتھ سیدھا بمبئی جاؤ' اپن لَوٹ کے آتا ہے۔"

"پھر وہ کیا بولے؟" میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"تھوڑا دیر چپ رہا پھر بولا' ٹھیک ہے' اپن بھی تمھارے ساتھ چلے گا۔"

"نہیں، نہیں۔"

"اپن نے منع کرا' پر وہ بولا، ابھی سب ساتھ ساتھ ہی بمبئی چلے گا۔ دو تین دن سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دو تین دن بعد اپن لوگ بمبئی پہنچ سکتا ہے۔"

"مگر تم نے اُن سے کس طرح کہا تھا؟"

"وہی جو اپن بولتا ہے۔"

"میرا تو نہیں بتایا تھا؟"

اُس نے مجھے آگے کی طرف دھکا دیا۔ ابّاجان' زورا اور مارٹی آگے مسافروں میں گم ہو گئے تھے۔ "ابھی تھوڑا بہت چلتا ہے۔" وہ اپنے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"دادا! دادا!" میں نے اُسے روکنے کی کوشش کی۔ "میری بات سنو۔"

"گاڑی کا ٹیم نکلا پڑتا ہے راجا!"

"پہلے میری ایک بات سن لو۔"

وہ ٹھیر گیا: "ابھی سب ٹھیک ہے راجا!"

"دادا! اُن سے کہو وہ چلے جائیں۔ اُن کا ہمارے ساتھ جانا مناسب نہیں ہے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"اپن اُس سے ایسا نہیں بول سکتا۔"

"انھیں وہاں نہیں جانا چاہیے' اتنے بہت سے لوگوں کے چلنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں' تم بھی مت جاؤ۔ خواہ مخواہ تم سب پریشان ہو گے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں؟"

"اپن سب سمجھتا ہے۔" وہ ناراضی سے بولا۔

"میں کوئی غلط بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ تمھارا اور سب کا وہاں جانا بالکل لاحاصل ہے۔ تم بھی تنگ ہو گے' مجھ پہ بھی بوجھ رہے گا یا پھر... پھر ایسا کرو، صرف تم بھی چلو اور ان سب کو بمبئی کی گاڑی میں بٹھا دو۔"

"وہ لوگ نہیں مانے گا راجا! اپن نے بول کے دیکھا ہے۔"

"لیکن تم، تم...."

"ابھی اُودر جا کے دیکھے گا' پہلے ایدر سے نکلے۔"

"ٹھیک ہے' پھر میں بھی بمبئی چلتا ہوں۔"

پیرو میری بات سُنی اَن سُنی کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ ابّاجان، زورا اور مارٹی ہمارے انتظار میں آگے جا کے رُک گئے تھے۔ ہم اُن کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ حیدرآباد جانے والی گاڑی روانہ ہونے میں کچھ ہی دیر باقی ہے۔ میں نے اُن کے پیچھے پیچھے ہو کے وہاں سے بھاگ جانا چاہا لیکن پیرو میرے ساتھ ساتھ ہی رہا۔ اُس

نے جیب سے روپے نکال کے مارٹی اور زورا کو دیے اور انھیں پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ٹی ٹی سے ٹکٹ کی تبدیلی کے متعلق معلومات کرنے کی ہدایت کی۔ اُن کے واپس آنے سے پہلے ہم فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھ گئے تھے۔ میں نے باہر ڈبوں پر لگی ہوئی تختیوں میں حیدرآباد کا نام دیکھ لیا تھا۔ اب کہنے سننے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ تھوڑی دیر میں گاڑی بھی چل پڑی۔ میرے جسم پر رعشہ سا طاری تھا۔

آج کی رات، کل کا پورا دن، کل کی ساری رات، پھر کہیں دوسرے دن دوپہر کو یہ سفر ختم ہونا تھا۔ درمیان میں گاڑی لیٹ ہوجائے تو شام بھی ہوسکتی تھی، رات بھی۔ ریل گاڑی کے سوا اور کوئی تیز ترین ذریعہ نہیں تھا۔ دلی اسٹیشن کے دُور ہوتے ہی اُنھوں نے فرش پر چادر بچھا کے کھانا لگا دیا۔ انھوں نے مجھ سے کہا تو میں بھی اُن کے ساتھ فرش پر آ گیا۔ صبح فیض آباد سے چلتے ہوئے زریں نے اتنا بہت سا کھانا ساتھ کر دیا تھا کہ دوپہر کو کھانے کے باوجود باقی رہ گیا تھا۔ شاید میری طرح کسی کو بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ ابا جان نے چند لقمے لیے ہوں گے کہ ہاتھ کھینچ لیا۔ میں اُن سب کے خیال سے بیٹھا رہا۔ نوالے حلق میں اٹک رہے تھے۔ نیساں نے میٹھے چاول بطورِ خاص میرے لیے پکائے تھے۔ مجھ سے وہ بھی نہیں کھائے گئے۔ انھوں نے جیسے ہی کھانا سمیٹا، میں اوپر کی برتھ پر جا کے لیٹ گیا۔ ابا جان میری برتھ کے عین نیچے تھے اس لیے نہ وہ مجھے دیکھ سکتے تھے، نہ میں انھیں۔ ڈبے میں چھ مسافروں کی گنجائش تھی۔ دو پہلے سے موجود تھے۔ ایک خوش پوش، صحت مند، سانولے رنگ اور بھرے ہوئے چہرے کا نوجوان۔ دوسری اُس کے ساتھ سونے جیسی رنگت، کتابی چہرے کی ایک لڑکی۔ اُس نے کاسنی ساڑی پہن رکھی تھی۔ کانوں میں سفید آویزے لٹک رہے تھے، گلے میں ہار، ہاتھوں میں چوڑیاں۔ وہ نوجوان کی بیوی ہوسکتی تھی یا بہن بھی۔ ڈبے میں داخل ہوتے وقت میں نے اُسے ایک نظر ہی دیکھا تھا اور نہ جانے کیوں مجھے شبہ ہوا تھا جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ بعد میں مجھے اُس کا چہرہ نظر نہیں آیا۔ وہ ہم سب کی طرف پیٹھ کر کے اور ساڑی کا پلو سر پہ ڈال کے کونے میں بیٹھی رہی۔ ہم پانچ آدمیوں کو ڈبے میں دیکھ کے نوجوان نے دبے لفظوں میں اعتراض کیا لیکن پیرو نے اُسے سمجھایا کہ ایک مزید آدمی کی موجودگی سے اُسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ چپ تو ہوگیا مگر دیر تک اُس کے چہرے پر کھنچاؤ رہا۔ ڈبے میں برتھیں بھی صرف چھ تھیں۔ تین اوپر، تین نیچے کی برتھوں پر نوجوان، اُس کے ساتھ والی لڑکی اور ابا جان تھے۔ اوپر ایک پر میں، دوسری پہ پیرو، تیسری پہ ایک دوسرے کے سروں کی طرف پیر کیے زورا اور مارٹی۔ برتھ پر آ کے میں نے جیسے ہی آنکھیں موندنے کی کوشش کی، میرا دل ڈوبنے سا لگا جیسے میں کہیں گرنے لگا ہوں، میں نے پھر آنکھیں بند ہی نہیں کیں۔

رات کے سناٹے میں گاڑی کا شور بڑھ گیا تھا۔ رفتار بہت تیز تھی۔ ڈبے میں ہلکی روشنی کا بلب روشن کر دیا گیا تھا۔ پیرو، زورا اور مارٹی جلد ہی بے سدھ ہو گئے۔ گاڑی چلے ہوئے دیر ہو گئی تھی، اوپر میری طبیعت بہت گھبرانے لگی تو میں نے نیچے اُترنے کا ارادہ کیا مگر سب کی نیند میں خلل پڑنے کے خیال سے وہیں پڑا رہا۔ مجھے حبس سا محسوس ہو رہا تھا۔ نیچے ایک عورت بھی موجود تھی۔ میرا اُتر آنا ویسے بھی مناسب نہیں تھا۔ ظاہر ہے، میں ابا جان ہی کی برتھ پر جا کے بیٹھ سکتا تھا۔ باقی دو برتھوں پر نوجوان اور لڑکی آرام کر رہے تھے۔ اِسی دوران کسی لمحے میں نے کروٹ بدلی تو میری نظریں سیدھی اُس لڑکی پر گئیں جو نیچے میری برتھ کے عین مقابل لیٹی تھی۔ وہ بھی جاگ رہی تھی۔ کم روشنی کے باوجود میں اُس کا سانولا چہرہ اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ اُسے فوراً احساس ہوگیا کہ کوئی اُس کی جانب دیکھ رہا ہے۔ ایک ثانیے کے لیے اُس کے سارے بدن میں ایک لہر سی کوندی۔ وہ چادر اوڑھے ہوئے تھی، اُس نے اپنا منہ چشم زدن میں دوسری طرف پھیر لیا۔ مجھے پھر وہی گمان ہوا جو اُسے پہلی بار دیکھ کے ہوا تھا۔ میں نے یقیناً اُسے پہلے کہیں دیکھا تھا۔ کہاں اور کب؟ یہ کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا۔ ایک بار نہیں، کئی بار میں نے اُسے دیکھا تھا۔ پھر یکایک مجھے یاد آیا۔ ہو نہ ہو یہ سونیا ہے۔ سونیا کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔ جیل میں، مَیں نے امتحانات دینے شروع کیے تھے اور ایف اے میں اوّل آیا تھا تو جیلر صاحب اتنے خوش ہوئے کہ مجھے بیوی بچوں سے ملوانے اپنے گھر لے گئے۔ اُن کے گھر والے مجھے دیکھ کے سہمے ہوئے تھے۔ جیلر صاحب نے انھیں بتایا، "یہ ہے وہ قیدی لاڈلا۔ نام اس کا ظہیر خاں ہے مگر جیل میں سب اِسے لاڈلا کہتے ہیں۔" بعد میں، مَیں اُن کے گھر باقاعدہ آنے جانے لگا تھا۔ جیلر صاحب میری تعلیم میں خاصی دلچسپی لیتے تھے۔ ہر امتحان میں اوّل آنے پر وہ انعام میں مجھے کتابوں کا تحفہ دیا کرتے تھے۔ وہ جیلر صاحب کی لڑکی سونیا تھی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے
بقیہ واقعات تیسرے حصے
میں ملاحظہ فرمائیں